فقہی احکام و مسائل کا عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا

فقہ السنۃ

الهداية - AlHidayah

تالیف: فضیلۃ الشیخ سید سابق

ترجمہ: پروفیسر ڈاکٹر عبدالکبیر محسن

تحقیق: علامہ ناصر الدین البانی

نظر ثانی: شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ
MAKTABA ISLAMIA

الهدایۃ - AlHidayah

بسم الله الرحمن الرحيم
الهداية AlHidayah

کتاب

فقہ السنۃ

تالیف

فضیلۃ الشیخ سید سابق

ترجمہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکبیر محسن

الهداية - AlHidayah

ناشر ------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------- 2015ء

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

0300-8661763

/maktabaislamia1

www.maktabaislamiapk.com

maktabaislamiapk@gmail.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تمھارے صاحبِ امر (حکمران) ہیں، اگر تمہارا کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بات (تمھارے لیے) بہت بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھی ہے۔ (النساء:69)

فہرست

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر
❋ جن پر ترک اور قضا دونوں واجب ہیں	417
① عیدین کے دن	421
② ایامِ تشریق کے روزے رکھنے کی نہی	421
③ اکیلے جمعہ کے دن کو روزہ کے ساتھ خاص کرنا	421
④ ہفتے کے دن کا بطورِ خاص روزہ رکھنا	422
⑤ شک کے دن کا روزہ رکھنے سے نہی	423
⑥ صوم الدھر (یعنی روزانہ روزہ رکھنے) سے نہی	423
⑦ بیوی کا شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھنے کی کراہت مگر اس کی اجازت سے	424
❋ وصالِ صوم سے نہی	424
❋ نفلی روزے	424
① شوال کے چھ ایام کے روزے	424
② ذی الحجہ کے پہلے نو دن کے اور بطورِ خاص یومِ عرفہ کا روزہ اور یہ سب غیر حجاج کے لیے ہیں	425
❋ محرم میں روزے رکھنا اور بطورِ خاص یومِ عاشورا کا اور ایک دن اس سے قبل یا بعد کا بھی	425
❋ عاشورا کے دن کھانے پینے میں توسع کرنا	426
❋ شعبان کے اکثر ایام کا روزہ رکھنا	427
❋ حرمت والے مہینوں میں روزے	427
❋ سوموار اور جمعرات کے دنوں کا روزہ	428
❋ ہر مہینے کے تین ایام کے روزے رکھنا	428
❋ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن چھوڑنا	428
❋ نفلی روزہ توڑ لینا	429
❋ روزے کے آداب	430
① سحری	430
❋ سحری کیسے ثابت ہوگی؟	430
❋ سحری کا وقت	430
❋ طلوعِ فجر میں شک ہونا	431
② جلدی افطار کرنا	431
③ افطار کے وقت روزے کی حالت میں دعا مانگنا	432
④ روزے کے منافی کاموں سے احتراز کرنا	432
⑤ مسواک کرنا	433
⑥ اثنائے روزہ دریا دلی اور سخاوت کا مظاہرہ کرنا اور قرآن کا دَور کرنا	433
⑦ رمضان کے آخری عشرے میں عبادت میں خاص محنت کرنا	433
❋ روزے کے مباحات	433
① نہانا اور پانی میں غوطہ لگانا	434
② سرمہ لگانا یا دوائی ٹپکانا	434
③ بیوی کو بوسہ دینا	434
④ ٹیکہ لگوانا	435
⑤ سینگی لگوانا	435
⑥ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا	435
❋ روزہ فاسد اور باطل کرنے والی اشیا	437
③ عمداً قے کرنا	438
④، ⑤ حیض و نفاس	438
⑥ استمناء (یعنی قصداً منی نکالنا)	438
⑦ غذائیت والی چیز کو تناول کرنا	439
⑧ روزہ توڑنے کی نیت کرنا	439
❋ رمضان کے روزوں کی قضا	441
❋ جو فوت ہوا اور اس کے ذمہ روزے تھے	442
❋ وہ ممالک جہاں کے دن طویل اور راتیں چھوٹی ہیں	443
❋ شبِ قدر	443
❋ شبِ قدر کی فضیلت	443
❋ شبِ قدر کی تلاش و جستجو کا استحباب	443
❋ یہ کون سی رات ہے؟	443

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر
⑯ مکھی، جوں، چچڑی اور چیونٹی مارنا	618
⑰ پانچ فواسق اور ہر موذی کو مار ڈالنے کا جواز	618
احرام کے محظورات (یعنی وہ اشیا و افعال جن سے بچا جائے)	619
جو آدمی تہہ بند، بالائی دھڑ کی چادر اور جوتے نہ پائے	620
⑤ اپنایا (بطورِ ولی یا وکیل) کسی کا عقدِ نکاح کرنا	621
⑥، ⑦ ناخن کاٹنا اور کسی بھی طریقے سے بالوں کا بذریعہ حلق یا قص ازالہ کرنا	621
⑧ کپڑے یا بدن میں خوشبو لگا لینا	622
⑨ اس کپڑے کا پہننا جو خوشبودار چیز سے رنگا ہوا ہو	622
⑩ شکار سے تعرُّض	622
⑪ محرم کا شکار کا گوشت کھانا	622
❁ اس شخص کا حکم جس نے احرام کے محظورات میں سے کسی محظور کا ارتکاب کیا	622
❁ کچھ بال کٹوا لینا	625
❁ حالت احرام میں تیل لگانے کا حکم؟	625
❁ بھول کر یا لاعلمی کی بنا پر سلے کپڑے پہننے یا خوشبو لگا لینے میں کوئی حرج نہیں	625
❁ جماع کے ساتھ حج کا بطلان	626
❁ شکار کرنے کا ہرجانہ	627
❁ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر سلف کا اس ضمن میں فیصلہ	628
❁ بدلہ نہ دینے کی صورت میں	628
❁ طعام کھلانے اور روزوں کی کیفیت	629
❁ اگر کئی آدمیوں نے مل کر شکار کیا تو؟	629
❁ حرم میں شکار کرنا اور حدودِ حرم سے درخت کاٹنا	629
❁ حرمِ مکی کی حدود	630
❁ حرمِ مدنی	630
❁ کیا کوئی تیسرا حرم بھی ہے	632
❁ مکہ کا مدینہ سے افضل ہونا	632
❁ مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہونا	632
❁ مکہ اور بیت اللہ میں دخول کے لیے مستحبات	633
❁ طواف	634
❁ طواف کی فضیلت	634
❁ طواف کی کیفیت	634
❁ دورانِ طواف تلاوت کرنا	635
❁ طواف کی اقسام	636
❁ طواف کی شروط	636
❁ طواف کی سنن	638
❁ حجر اسود کی طرف منہ کرنا	638
❁ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے مزاحمت کرنا	639
② اضطباع (کندھا ننگا کرنا)	639
③ رمل (یعنی کندھے ہلاتے ہوئے قریب قریب قدم اٹھاتے ہوئے تیز تیز چلنا)	640
❁ رمل کا پس منظر	640
④ رکنِ یمانی کو چھونا	641
⑤ طواف کے بعد دو رکعتیں ادا کرنا	641
❁ حرم میں نمازی کے آگے سے گزرنا	642
❁ عورتوں اور مردوں کا اکٹھے طواف کرنا	642
❁ سوار ہو کر (یا کرسی پر بیٹھ کر) طواف کرنا	643
❁ کوڑھ زدہ کا لوگوں کے ساتھ طواف کرنے کی کراہت	643
❁ آبِ زمزم پینے کا استحباب	643
❁ زمزم پینے کے آداب	643
❁ زمزم کے کنویں کا پس منظر	644
❁ ملتزم کے پاس دعا کرنے کا استحباب	645
❁ کعبہ کے اندر اور حجر اسماعیل میں داخل ہونے کا استحباب	645
❁ صفا اور مروہ کے درمیان سعی	645

عرض ناشر

الحمدللّٰہ رب العٰلمین والصلوۃ والسلام علیٰ رسولہ الأمین، أما بعد:

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس کی تعلیمات زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہیں، عقائد ونظریات سے لے کر زندگی کے تمام اخلاقی و معاشرتی، معاشی و سیاسی اور تمدنی مسائل وغیرہ کے حل کے لیے ہمیں اس سے بھر پور رہنمائی میسر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں سیکھا اور سمجھا جائے، پھر اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالا بھی جائے اور اس سے متعلق قرآن وحدیث میں واضح احکام موجود ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾(۹/ التوبۃ: ۱۲۲)

''پھران کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ))

''اللہ تعالیٰ جس شخص سے خیر وبھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔''[1]

اور مذکورہ صفت کے حامل لوگ ہی قابل رشک ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''حسد (رشک) دو طرح کے آدمیوں ہی کے لیے جائز ہے: وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اسے راہِ حق میں خرچ کرتا ہو اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت (قرآن وحدیث کے علم) سے نوازا ہو اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہو۔''[2]

اور یہی لوگ نبی کریم ﷺ کی دعا اپنے حق میں سمیٹنے کے بھی مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَاءً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَحْفَظُ مِنْ سَامِعٍ))

''اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرم رکھے جس نے ہماری بات سن کر اسے دوسروں تک پہنچا دیا، کیونکہ بعض اوقات (براہ راست) سننے والے کی نسبت جسے حدیث پہنچائی جاتی ہے وہ زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔''[3]

---

[1] صحیح البخاری: ۷۱. [2] صحیح البخاری: ۷۳. [3] صحیح، سنن الترمذی: ۲٦٥۷، سنن ابن ماجه: ۲۳۲.

ایسی کتاب کا وجود کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جس میں علم وحکمت کے اکثر و بیشتر موتی ایک لڑی میں پرو دیے گئے ہوں۔ میری مراد مشہور و معروف کتاب ''فقہ السنۃ'' ہے اور اس کی شہرت ومقبولیت کی وجہ ہی یہ ہے کہ اس میں محدثانہ اسلوب کے مطابق عام فہم انداز میں تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، خرید وفروخت، نکاح وطلاق اور حدود و جہاد جیسے اہم مسائل مستند دلائل کے ساتھ یکجا کر دیے گئے ہیں۔

قارئین کرام! اُردو زبان میں پہلی بار ''فقہ السنۃ از سید سابق'' کا مکمل ترجمہ شائع کرنے کی سعادت مکتبہ اسلامیہ کو حاصل ہوئی ہے اور ہماری اس کاوش کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ہر روایت کی تخریج کی گئی ہے۔
- ہر روایت پر صحت وضعف کے اعتبار سے محدث العصر علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا حکم لگایا ہے، اگر کہیں علامہ البانی رحمہ اللہ کا حکم نہیں ملا تو محدث حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کا حکم لگا دیا گیا ہے۔
- عام فہم، سادہ اور بامحاورہ ترجمہ۔
- مستند علمائے کرام کی نظر ثانی۔
- بعض مقامات پر مسئلے کی توضیح وتوجیہہ کے لیے مترجم کے حواشی۔

ہم اس عظیم دینی خدمت پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنے کے بعد اپنے محسنین کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا، بالخصوص پروفیسر ڈاکٹر عبدالکبیر محسن حفظہ اللہ کا جنھوں نے بڑی محنت کے ساتھ کتاب کا ترجمہ کیا اور ترجمہ میں عوامی رعایت کو ملحوظ رکھا۔ ادارے کے ساتھ ان کی علمی شفقت عرصہ دراز سے ہے جسے ہماری خوش نصیبی ہی متصور کیا جائے گا۔

اسی طرح استاذ محترم شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ کہ جن سے جب بھی کتاب پر نظر ثانی کی درخواست کی تو انھوں نے بڑی محبت سے اُسے قبول کیا اور مفید مشوروں سے بھی نوازا، جزاھما اللّٰہ خیرًا۔

ادارے کے رفقاء قاری عمر فاروق راشد اور مولانا کاشف الرحمٰن سیف حفظہما اللہ نے بڑی جانفشانی سے کتاب کو تصحیح وتنقیح کے مراحل سے گزارا ہے۔ محمد ذیشان مشتاق اور محمد فیصل مقبول نے عمدہ کمپوزنگ کی اور عبدالواسع صاحب نے دلکش ٹائٹل بنا کر کتاب کا ظاہری حسن دوبالا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری ان محنتوں کو قبول فرمائے اور انہیں ہماری نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

محمد سرور عاصم

مدیر مکتبہ اسلامیہ

لاہور، فیصل آباد

مقدمۂ مؤلف

حمد وصلاۃ کے بعد!

یہ کتاب ''فقہ السنۃ'' ہے جو اسلامی فقہ کے مختلف مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں یہ مسائل کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں جنہیں دقیق بحثوں اور غیر ضروری فقہی اختلافِ آراء کے بیان سے گریز کرتے ہوئے آسان الفاظ میں عوام الناس کے افادہ کے لیے تحریر کیا گیا ہے، یہ کتاب اس فقہ اسلامی کا ایک صحیح اور جامع تصور پیش کرتی ہے جسے ہمارے نبی کریم ﷺ کو دے کر مبعوث کیا گیا، یہ لوگوں کے لیے دین کے فہم کا باب کھولے گی اور انہیں اندھی تقلید اور مسلکی تعصب سے بچا کر کتاب وسنت پر جمع کرے گی اور اُس باطل نظریے کا رد کرے گی کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

یہ کوشش ہم نے اپنے دین کی خدمت اور مسلمان بھائیوں کی منفعت کے جذبے سے کی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے نافع بنائے اور ہمارے اس عمل کو خالص اپنی رضا کے لیے کردے۔

وهُوَ حَسْبُنَا و نِعْمَ الْوَكِيْلُ

السید سابق

۱۵ شعبان ۱۳۶۵ھ

(مصر)

مقدمۂ مترجم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، والصَّلاةُ والسَّلامُ عَلىٰ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الأَوَّلِيْنَ والأخِرِينَ وعلىٰ آلِهِ وصَحْبِهِ و مَنِ اهْتَدىٰ بِهَدْيِهِ إلىٰ يَوْمِ الدِّين، أما بعد :

استاذ فضیلۃ الشیخ سید سابق رحمہ اللہ کے مقدمہ کی آخری عبارت میرے اس مقدمہ کالبِ لباب ہے، اس اضافہ کے ساتھ کہ اس کام سے کوئی دنیوی طمع اور منفعت مقصود نہیں بجز اس کے کہ اس حقیر کے ہاتھوں خدمتِ دین کا کوئی کام ہو جائے اور شاید مجھے بھی صالحین کے اس گروہ میں شامل ہونے کا موقع مل جائے جو اس دینِ حنیف کے خدام بنے۔

میرے خیال میں اس کتاب ''فقہ السنۃ'' کی سب سے نمایاں خصوصیت ہر مسئلے کا حوالہ مذکور ہونا ہے۔کوئی چھوٹا سا مسئلہ بھی بغیر کتاب وسنت کے حوالے کے درج نہیں کیا گیا، چونکہ کتابِ ہٰذا میں کچھ ضعیف روایات بھی شامل ہیں، چنانچہ ہر ضعیف روایت کی نشاندہی مذکور ہے، گویا جن روایات کے بارے میں یہ نشاندہی مذکور نہیں وہ صحیح ہیں، علاوہ ازیں کئی دیگر مفید حواشی بھی شامل ہیں، ان سب کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے، کتاب میں مستعمل چند اصطلاحات حسبِ ذیل ہیں:

① جماعت: اس سے مراد صحاح ستہ کے مؤلفین ہیں (یعنی بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ)

② شیخین: یہ امام بخاری اور امام مسلم ہیں (اگر صحابہ کے ضمن میں یہی اصطلاح استعمال ہو تو مراد سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں)

③ خمسہ: یعنی ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد۔

④ اربعہ: یعنی ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ۔

⑤ ثلاثہ: یعنی ابوداود، ترمذی اور نسائی۔

⑥ ائمہ اربعہ: یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔

امام ترمذی اور امام حاکم کئی دفعہ روایات کا حکم صحیح، حسن یا ضعیف، ذکر کرتے ہیں تو اگر کسی روایت کو ابوداود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا ہو اور حوالہ دیتے ہوئے یہ عبارت آئے: ''حسن قرار دیا'' تو اس کا تعلق صرف ترمذی سے ہوگا، نیز اس میں مذکور آیات اور احادیث کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے میرے، میرے اہل وعیال، آباؤ اجداد، اساتذہ، اس کارِ خیر پر آمادہ کرنے والوں، اچھا مشورہ دینے والوں اور اپنی دعاؤں میں شامل کرنے والوں کے میزانِ حسنات کا حصہ بنائے۔آمین یا رَبَّ العالَمِين.

ڈاکٹر حافظ عبدالکبیر محسن

صدر شعبہ عربی، گورنمنٹ اصغر مال کالج راولپنڈی

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ، بمطابق ۱۷/۳/۲۰۱۵

مؤلف کے مختصر حالاتِ زندگی

فضیلۃ الاستاذ سید سابق رحمہ اللہ کی ولادت جنوری ۱۹۱۵ء کو مصر کے ضلع منوفیہ کی ایک بستی اسطنہا میں ہوئی، ابتدائی تعلیم و تربیت الشیخ محمود خطاب سبکی کے مدرسہ جمعیۃ شرعیہ میں حاصل کی، حفظِ قرآن کے بعد جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۷ء میں شریعہ میں ایم اے پاس کیا، پھر اسی ازہر یونیورسٹی میں مدرس اور واعظ مقرر ہوئے، بعد ازاں مصر کی وزارتِ اوقاف میں ان کا تبادلہ ہوا اور اوقاف کی مساجد کے مہتمم بنائے گئے، سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض کی شاہ عبد العزیز یونیورسٹی، پھر مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دیے اور اولاً فیکلٹی آف شریعہ، پھر دراسات علیا کے صدر بنائے گئے، ان کے تلامذہ میں مشہور مسلم سکالر ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق نائب صدر ڈاکٹر احمد عسال بھی ہیں، جب شیخ حسن بناء نے اخوان المسلمین کی تشکیل کی تو یہ بھی ان سے بیعت ہوئے اخوان کے دورِ ابتلاء میں ان پر متعدد مقدمات ہوئے لیکن اللہ کے فضل سے بری ہو گئے، اس تناظر میں ۱۹۴۹ء میں جیل بھی کاٹی، جہاں نمازِ فجر کے بعد فقہی مسائل پر ان کے دروس کا سلسلہ مشہور ہوا، ۱۴۱۳ ہجری میں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازے گئے، فقہی مسائل سے ان کی رغبت شروع ہی سے رہی، اپنے زمانے کے مشہور علماء اور سکالرز سے ان کے رابطے تھے۔ جن میں الشیخ ابو زہرہ، الشیخ محمد شلتوت اور ڈاکٹر محمد الغزالی ہیں، سید سابق رحمہ اللہ کی فقہ پر دسترس کے سبھی معترف تھے، لہٰذا علماء و طلاب کثرت سے ان کے ہاں آتے اور فقہی استفادہ کرتے تھے۔

اس کتاب ''فقہ السنۃ'' کے اولین ابواب لکھنے کا آغاز انہوں نے پچھلی صدی کی پانچویں دہائی میں اخوان المسلمین کے ہفت روزہ رسالہ میں مضامین کی شکل میں کیا، پہلی جلد کی تکمیل اسی عہد میں ہوئی جس کا مقدمہ اخوان کے امیر اور بانی حسن بناء شہید نے لکھا، اسے بعد ازاں چار جلدوں میں مکمل کیا، اس کتاب کی خصوصیت دقیق فقہی اصطلاحات کا ترک اور عام فہم انداز اور سہل اسلوب میں روز مرہ کے مسائل مع کتاب و سنت کی ادلہ کے لوگوں کی آگہی کے لیے پیش کرنا ہے، اس ضمن میں فقہی اختلافات کے بیان سے حتی الامکان گریز کیا اور کسی ایک مسلک کے لیے تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کتاب و سنت کے دلائل کی روشنی میں بغیر کسی مسلک پر تنقید کے مسائل پیش کیے، کئی امور میں جہاں وجہ ترجیح ان کے لیے ظاہر نہ ہوئی تو وہاں معاملہ

قارئین پر چھوڑا تا کہ جس پر ان کی شرح صدر ہو وہ اسے اختیار کرلیں، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کوئی نیا فتویٰ یا رائے پیش نہیں کی بلکہ جسے کتاب وسنت کی روشنی میں صائب سمجھا اس کی وکالت کی اور حضرات ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کی آراء کا احترام کے ساتھ ذکر کیا، ان پر تنقید سے گریز کیا اور کسی ایک فقہی مسلک کی تقلید نہیں کی، ایک اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اس کتاب میں تفصیل سے بحث نہیں کی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کتاب بجائے علماء اور فقہاء کے عوام الناس کے استفادہ کے لیے لکھی گئی ہے، جنہیں دقیق اور تفصیلی علمی بحثوں سے کوئی غرض نہیں، وہ تو عام فہم اسلوب وانداز میں دینی احکام ومسائل کی معرفت چاہتے ہیں، مشہور محدث الشیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے باوجود کتاب ہٰذا میں کئی ضعیف روایات کے ذکر پر پکڑ کرنے کے اپنی کتاب ''تمام المنۃ'' کے مقدمہ میں اس کتاب کو دینی مسائل کی بہترین کتب میں شمار کیا اور اس میں حسنِ تبویب، سلاستِ اسلوب اور دقیق فقہی اصطلاحات کے عدم استعمال کی از حد تعریف کی اور اسے مسلم نوجوانوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے اہم قرار دیا۔

وفات

سید سابق کی وفات ۲۳ ذوالقعدہ ۱۴۲۰ھ ہجری بمطابق ۲۷ فروری ۲۰۰۰ء عیسوی کو پچاسی (۸۵) برس کی عمر میں ہوئی اور اپنی جائے پیدائش کے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے، رحمۃ اللّٰہ علیہ رحمۃً واسعۃً.

پانی اور اس کی اقسام

پہلی قسم: عام پانی

اس کا حکمِ شرعی ہے کہ یہ پاک ہے یعنی بذات خود پاک ہے اور اپنے غیر کو پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مثلاً: انسان، کپڑے، برتن اور جگہیں وغیرہ کو، اس کے تحت درج ذیل انواع ہیں:

① بارش، برف اور اولوں کا پانی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ﴾(الأنفال: ١١)

''(اللہ) تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں اس کے ساتھ پاک کرے۔''

مزید فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾(الفرقان: ٤٨)

''ہم نے آسمان سے طہارت دینے والا پانی نازل کیا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ تکبیرِ تحریمہ کہہ کر قراءت سے قبل کچھ دیر سکوت فرماتے تھے، میں نے عرض کی: آپ اس سکوت کی حالت میں کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ کلمات پڑھتا ہوں:

«اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ والْمَغْرِب، أَللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»

''اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان دوری کر دے جیسے تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری کر رکھی ہے، اے اللہ! مجھے گناہوں سے اس طرح پاک صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے، اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں کے ساتھ دھو دے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري: ٧٤٤؛ صحيح مسلم: ٥٩٨.

اسے سوائے ترمذی کے سب اصحابِ صحاح ستہ نے نقل کیا۔

② سمندر کا پانی

یہ بھی پاک اور پاک کرنے والا ہے، کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم سمندروں میں سفر کرتے ہیں اور اپنے ہمراہ زیادہ پانی نہیں لے جا سکتے، اگر اسے وضو میں استعمال کرتے رہیں تو پیاس بجھانے کے لیے نہیں ملے گا تو کیا سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ((هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ)) ''اس کا پانی پاک اور اسکا مردار حلال ہے۔''[1] اسے خمسہ نے روایت کیا، بقول ترمذی یہ حسن وصحیح حدیث ہے، کہتے ہیں: میں نے اس حدیث کی بابت امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ صحیح ہے۔

③ آب زمزم

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آب زمزم سے بھرا ایک ڈول منگوایا، اس سے پیا بھی اور وضو بھی کیا،[2] اسے احمد نے نقل کیا (بقول محشی احمد نے نہیں بلکہ ان کے بیٹے عبداللہ نے ''زیادات المسند'' میں نقل کیا ہے۔

④ ایسا پانی جو طویل عرصہ پڑا رہنے کی وجہ سے متغیر ہو چکا ہو

کچھ عرصہ ٹھہرے رہنے کے سبب یا اس میں ایسی چیزیں پڑنے کی وجہ سے جو عموماً اس سے الگ نہیں ہوتیں، مثلاً: کائی اور درختوں کے پتے تو علماء کا اتفاق ہے کہ اسے پانی ہی کہا جائے گا اور اس باب میں ضابطہ یہ ہے کہ جسے بغیر کسی تقیید کے (یعنی کسی اضافی صفت مثلاً: لیموں کا پانی، عرقِ گلاب وغیرہ) پانی کہنا درست ہو تو اسے طہارت کے حصول کی غرض سے استعمال کرنا صحیح ہوگا، قرآن میں ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا﴾ ''اگر پانی نہ پاؤ تو تیمم کرلو'' (المائدة: ٦) (یہاں بھی پانی کا لفظ استعمال ہوا)۔

دوسری قسم: ماءِ مستعمل

یہ وہ بقیہ پانی ہے جو وضو یا غسل کرنے والے کے اعضا سے گرتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ طہور (یعنی پاک) ہونے میں یہ عام (یعنی غیر مستعمل) پانی کی طرح ہے، اصل مدنظر رکھتے ہوئے کہ (استعمال سے قبل بھی) طہور تھا اور کسی سبب سے اپنی صفتِ طہوریت سے خارج نہیں ہوا، چنانچہ سیدہ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی صفت میں اس روایت کے مدِنظر جس میں ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ مبارک میں موجود تراہٹ یعنی جو عضو کے دھونے سے باقی بچی تھی اس سے سر کا مسح کیا۔[3] (یعنی نیا پانی نہ لیا) اسے احمد اور ابوداود نے تخریج کیا، ابو داود کے الفاظ ہیں: ''أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَسَحَ

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٨٣؛ سنن ترمذي: ٦٩۔ [2] مسند أحمد: ١/ ٧٦۔ [3] حسن، مسند أحمد: ٦/ ٣٥٨؛

رَأْسَهُ مِنْ فَضْلِ مَاءٍ كَانَ بِيَدِهِ"[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ کی کسی گلی میں سامنا ہوا جبکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جنبی تھے تو چپکے سے کھسک گئے اور جا کر غسل کیا، پھر آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کہاں چلے گئے تھے؟'' عرض کی: میں جنبی تھا تو نا گوار لگا کہ اس غیرِ طہارت کی حالت میں آپ کی مجالست کروں، آپ نے فرمایا: «سُبْحَانَ اللَّهِ، إِنَّ الْمُؤْمِنَ لاَ يَنْجِسُ» ''سبحان اللہ! بے شک مومن نجس نہیں ہوتا۔''[2] اسے جماعت نے نقل کیا، حدیث سے وجہِ دلالت یہ ہے کہ مومن جب (حالتِ جنابت میں بھی) نجس نہیں ہوتا تو پانی کی مجرد اس کے جسم سے لگنے سے طہوریت زائل نہیں ہوسکتی کیونکہ طاہر چیز کا طاہر چیز سے مس ہوا ہے اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا علی، ابن عمر، ابوامامہ رضی اللہ عنہم، عطاء، حسن، مکحول اور نخعی رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ جو سر کا مسح کرنا بھول گیا تو اگر اس نے اپنی داڑھی میں تریاہٹ پائی تو اسی کے ساتھ مسح کر لینا کافی ہوگا (یعنی اگر وہاں سے اٹھ کر یاد آیا کہ مسح نہ کیا تھا) کہتے ہیں: یہ دال ہے کہ ان کے خیال میں مستعمل پانی مطہر ہے (یعنی اسے طہارت کے لیے مزید استعمال کیا جا سکتا ہے) کہتے ہیں: میرا بھی یہی مسلک ہے، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اسے سفیان ثوری اور ابوثور رحمہما اللہ کی طرف بھی منسوب کیا، سب اہل ظاہر اسی پر عمل پیرا ہیں۔

تیسری قسم: ایسا پانی جس میں کوئی پاک چیز خلط ہو جائے

مثلاً: صابن، زعفران اور آٹا وغیرہ، ان اشیا میں سے جو عموماً پانی سے الگ ہوتی ہیں تو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جب تک یہ اپنے اطلاق پر قائم ہے (یعنی اگر صرف پانی کہا جا سکے تو) پاک ہے، اگر اس اطلاق سے نکل گیا بایں طور کہ اب اسے پانی نہیں کہا جاتا (بلکہ کوئی اور نام دیا جائے مثلاً: شربت وغیرہ) تو یہ فی ذاتہٖ تو طاہر ہے لیکن کسی دیگر کے لیے مطہر نہیں (یعنی اسے کسی اور چیز کی طہارت کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا) سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد تشریف لائے اور ہمیں ہدایت فرمائی کہ اسے تین، پانچ یا زیادہ مرتبہ غسل دو، اگر ضرورت محسوس کرو تو پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ اور آخری دفعہ غسل دیتے ہوئے (پانی میں) کافور بھی ملا لینا اور فارغ ہو کر مجھے خبر دے دینا، ہم نے فارغ ہو کر اطلاع پہنچائی تو آپ نے ہمیں اپنا تہہ بند دیا اور فرمایا: «أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ» ''کفن کے کپڑوں سے پہلے میری یہ چادر مرحومہ کے جسم پر لپیٹ دو۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، وجہِ دلالت یہ ہے کہ میت کو بھی اسی کے ساتھ غسل دیا جائے گا جس کے ساتھ زندہ کا پاکیزگی کے لیے غسل درست ہو، احمد، نسائی اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ کی سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ایسے برتن میں موجود پانی سے غسل کیا جس میں آٹے کے ذرات لگے تھے تو ان دونوں حدیثوں میں مذکور پانی مخلوط تھا، لیکن ابھی وہ مرحلہ نہ آیا تھا کہ اسے پانی کہنا

---

[1] حسن، سنن أبی داود: ۱۳۰. [2] صحیح البخاری: ۲۷۳؛ صحیح مسلم: ۳۷۱. [3] صحیح البخاری: ۱۲۵۸؛ صحیح مسلم: ۹۳۹؛ سنن أبی داود: ۳۱۴۲.

نادرست ہو اور پانی کے اسم کا اطلاق اس سے سلب ہو جائے۔

چوتھی قسم: وہ پانی جس میں کوئی نجاست پڑ گئی ہو

اس کی دو حالتیں ہیں:

① نجاست پڑنے سے اس کا ذائقہ، رنگ یا بو بدل گئی ہو، اس حالت میں بالا جماع اس کے ساتھ طہارت حاصل کرنا جائز نہیں، یہ بات امام ابن منذر اور امام ابن ملقن رحمہ اللہ نے لکھی۔

② پانی اپنے اطلاق پر باقی ہو یعنی اس کے مذکورہ تین اوصاف میں سے کسی میں کوئی تغیر نہ ہوا ہو تو ایسا پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، چاہے قلیل ہو یا کثیر، اس کی دلیل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا، لوگ اسے روکنے کے لیے لپکے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہرو (کرنے دو)! اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔''[1] اسے سوائے مسلم کے سب نے نقل کیا، اسی طرح سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: کہا گیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم بُضاعہ کنویں سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا: ''پانی طہور (یعنی طہارت دینے والا) ہے، اسے کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔''[2] اسے احمد، نسائی، شافعی، ابو داود، اور ترمذی رحمہم اللہ نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، بقول امام احمد رحمہ اللہ بئر بضاعہ والی یہ حدیث صحیح ہے، امام یحییٰ بن معین اور ابو محمد بن حزم رحمہما اللہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا، یہی سیدنا ابن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حسن بصری، ابن مسیب، عکرمہ، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، داود ظاہری، نخعی اور مالک رحمہم اللہ وغیرہم کی رائے تھی، امام غزالی رحمہ اللہ ایک جگہ لکھتے ہیں: کاش! پانی کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب بھی امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی طرح ہوتا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ» ''اگر پانی دو مٹکے ہو تو وہ گندگی پڑنے سے آلودہ نہیں ہوتا۔''[3] اسے خمسہ نے نقل کیا، یہ سند و متن کے لحاظ سے مضطرب ہے، امام ابن عبد البر رحمہ اللہ ''التمہید'' میں لکھتے ہیں: حدیثِ قلتین کی طرف استناد کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ کا اختیار کردہ مذہب نظری جہت سے ضعیف اور اثر کی جہت سے غیر ثابت ہے۔

سؤر (یعنی جوٹھا)

برتن میں کھانے یا پینے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے، اس کی کئی اقسام ہیں:

① انسان کا جوٹھا

مسلمان، کافر، جنبی اور حائض، سب کا جوٹھا پاک ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

---

[1] صحيح البخاري: ٢٢٠؛ سنن أبي داود: ٣٨٠. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٦٦؛ سنن ترمذي: ٦٦؛ سنن نسائي: ٣٢٥. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٦٣؛ سنن ترمذي: ٦٧؛ سنن ابن ماجه: ٥١٧.

﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ ﴾(التوبۃ:۲۸) ''بے شک مشرکین نجس ہیں۔'' تو اس سے مراد ان کی معنوی نجاست ہے، ان کے باطل اعتقادات اور اقذار و نجاسات سے عدم احتراز کی جہت سے، یہ نہیں کہ ان کے اعیان و ابدان نجس ہیں (کہ چھونا بھی نجس ہو) مسلمانوں سے ہمیشہ ان کا میل جول رہا ہے، ان کے سفیر اور ایلچی نبی کریم ﷺ کے پاس آتے رہے جو مسجد نبوی میں داخل ہوتے تھے اور کبھی آپ نے ان کی مس کی گئی جگہیں دھونے کا حکم نہ دیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں کچھ نوش کرتی، پھر برتن نبی کریم ﷺ کو پکڑا دیتی، آپ عین اس جگہ منہ مبارک لگا کر پیتے جہاں سے میں نے پیا ہوتا،[1] اسے مسلم (اور نسائی اور احمد) نے نقل کیا۔

۲ ماکول اللحم (جن کا گوشت کھانا حلال ہے ان) جانوروں کا جوٹھا

ان کا جوٹھا پاک ہے کیونکہ یہ پاک گوشت سے متولد ہیں تو اسی کے حکم میں ہے، امام ابوبکر بن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ ماکول اللحم کا جوٹھا پانی پینا اور اس کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے (یہ شرعی لحاظ سے اس کا حکم بیان کیا تو طبی لحاظ سے بھی دیکھ لیا جائے، اگر جدید تحقیقات کے مطابق کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو اجتناب کرنا اس حکمِ خداوندی کی رو سے غیر شرعی نہ ہوگا: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾(البقرۃ: ۱۹۵) ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'')

۳ خچر، گدھوں، درندوں اور شکاری پرندوں کا جوٹھا

یہ بھی حدیث سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی رو سے پاک ہے، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم گدھوں کے جوٹھے پانی سے وضو کرلیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! اور تمام درندوں کے جوٹھے سے بھی۔''[2] اسے امام شافعی، امام دارقطنی اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے تخریج کیا، امام بیہقی رحمہ اللہ نے لکھا: اس روایت کی متعدد اسانید ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کرتی ہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک سفر کے دوران نبی کریم ﷺ رات کو نکلے تو ایک شخص سے گزر ہوا جو ایک حوض کے پاس بیٹھا تھا تو ہمراہیوں میں سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: اے صاحبِ حوض! کہیں آج شب تمہارے حوض پہ درندے تو وارد نہیں ہوئے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مت بتلانا کیونکہ اس میں تکلف ہے، درندوں نے اپنا حصہ لیا اور ہمارے لیے جو بچا وہ شراب وطہور ہے۔''[3] اسے دارقطنی نے نقل کیا یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک قافلے میں نکلے جس میں سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی تھے، ایک حوض پر وارد ہوئے تو سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کے مالک سے پوچھا: کیا تمہارے حوض پر درندے بھی وارد ہوتے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: مت بتلانا! کیونکہ ہم درندوں پر اور وہ ہم پر وارد ہوتے ہیں، اسے امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں نقل کیا۔[4]

---

[1] صحیح مسلم: ۳۰۰. [2] ضعیف، مسند الشافعی: ٤٠؛ السنن الدارقطنی: ۱۷۳. [3] ضعیف، سنن الدارقطنی: ۳۱. [4] ضعیف، المؤطا امام مالك: ۱/ ۲۳، ۲٤.

④ بلی کا جوٹھا

یہ سیدہ کبشہ بنت کعب رضی اللہ عنہا کی روایت کے مدنظر پاک ہے جو سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے گھر والی تھیں، کہتی ہیں: سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ آئے تو میں نے انہیں وضو کا پانی پیش کیا، اس اثنا میں ایک بلی نے آکر برتن سے منہ لگا لیا تو انہوں نے اس کی طرف برتن کو جھکا دیا تا کہ وہ آسانی سے پی سکے، میری نظر میں تعجب دیکھ کر انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((إِنَّمَا لَيسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ)) ''یہ نجس نہیں، بلے اور بلیاں کثرت سے تمہارے ہاں آنے جانے والی مخلوق میں سے ہیں۔''① اسے خمسہ نے تخریج کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے، امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا۔

⑤ کتے اور خنزیر کا جوٹھا

یہ پلید ہے، لہٰذا اس سے اجتناب واجب ہے، کتے کا جوٹھا بخاری و مسلم کی اس حدیثِ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیش نظر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کتے نے تمہارے کسی کے برتن میں منہ مارا ہو تو وہ اسے سات مرتبہ دھوئے۔''② احمد اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''کتا اگر کسی برتن سے پی لے تو اسے پاک کرنے کے لیے سات مرتبہ دھونا پڑے گا، پہلی مرتبہ مٹی سے مانجھے۔''③ خنزیر کا جوٹھا اس کے خبث اور گندا ہونے کی وجہ سے ہے۔

نجاست

یہ ایسی قذارت (یعنی گندگی ہے) کہ مسلمان کے لیے اس سے اجتناب واجب ہے اور اگر لگ جائے تو اسے دھونا ضروری ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ (المدثر: ٤) ''اپنے لباس کو پاک رکھیے۔'' مزید فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ٢٢٢) ''بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' ایک حدیث میں ہے: ''صفائی نصف ایمان ہے۔''④ اس موضوع کے کئی مباحث ہیں جو درج ذیل ہیں:

نجاست کی انواع

① مردار

جو (جانور) طبعی موت مر گیا ہو بغیر شرعی ذبح کے اسی سے ملحق ہے گوشت کا وہ ٹکڑا یا پارچہ جو زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا جائے، کیونکہ سیدنا ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيْمَةِ وَهِيَ

---

① صحيح، سنن أبي داود: ٧٥؛ سنن ترمذي: ٩٢. ② صحيح البخاري: ١٧٢؛ صحيح مسلم: ٢٧٩.
③ صحيح مسلم: ٢٧٩؛ مسند أحمد: ٢/ ٤٢٧. ④ صحيح مسلم: ٢٢٣؛ سنن ترمذي: ٣٥١٧.

حَيَّةٌ فَهُوَ مَيْتَةٌ » ''اگر زندہ جانور سے کوئی گوشت کا پارچہ کاٹ لیا جائے تو وہ مردار متصور ہے۔''① اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، حسن قرار دیا اور لکھا کہ اہل علم کے ہاں اسی پر عمل ہے، اس سے مندرجہ ذیل چیزیں مستثنیٰ ہیں:

(الف) مردار مچھلی اور ٹڈی

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں مردار مچھلی اور ٹڈی جبکہ خون جگر اور تلی ہیں۔''② اسے امام احمد، امام شافعی، امام ابن ماجہ، امام بیہقی اور امام دارقطنی رحمہم اللہ نے تخریج کیا، یہ حدیث ضعیف ہے لیکن امام احمد رحمہ اللہ نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے، جیسا کہ امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم رحمہما اللہ نے لکھا (ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: اسے احمد اور دارقطنی نے مرفوعاً نقل کیا اور دارقطنی نے کہا: موقوف اصح ہے گویا مرفوع بھی صحیح ہے بیہقی نے بھی اس کا موقوف ہونا راجح قرار دیا، البتہ اس کے لیے رفع کا حکم ہے، امام البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اس قسم کی احادیث حکمِ رفع میں ہوتی ہیں، کیونکہ صحابی کا یہ کہنا کہ ہمارے لیے حلال کیا گیا یا حرام کیا گیا اس قول کی مثل ہے: ہمیں حکم دیا گیا، یا ہمیں منع کیا گیا اور سمندر کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان گزرا ہے: « هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ » ''اس کا پانی پاک اور مردار حلال ہے۔''

(ب) ایسا مردار جس کے لیے دمِ مسفوح (یعنی بہتا ہوا خون) نہ ہو

جیسے چیونٹی اور شہد کی مکھی وغیرہ تو یہ پاک ہیں، اگر کھانے پینے کی کسی چیز میں پڑ کر مر جائیں تو اس سے وہ نجس نہ ہوگی، بقول مؤلف اس مذکور کی طہارت کے بارے کسی اختلاف سے واقف نہیں ہوں مگر جو امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے اور ان کے مذہب کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ نجس ہے، ہاں اگر کسی مائع میں پڑ جائے تو قابلِ نظر اندازی ہے بشرطیکہ اسے متغیر نہ کیا ہو۔

(ج) مردار کی ہڈی وغیرہ

مردار کی ہڈی، سینگ، ناخن، بال، پر اور کھال (بقول محشی کھال رنگے جانے کے بعد پاک ہوگی کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ اگر کھال رنگ لی جائے تو وہ پاک ہو جائے گی) اور ہر جو اس کی جنس سے ہے وہ پاک ہے، کیونکہ ان سب کے بارے میں اصل یہ ہے کہ سب پاک ہیں نجاست کی کوئی دلیل نہیں، زہری رحمہ اللہ مردہ (جانوروں) ہاتھی وغیرہ کی ہڈیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے سلف کے کئی علماء کو دیکھا کہ اس سے بنی کنگھیاں اور تیل دانیاں استعمال کرتے اور اس میں کوئی حرج محسوس نہ کرتے تھے، اسے بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی کو ایک بکری بطورِ صدقہ دی گئی، وہ ایک روز مر گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو فرمایا: ''تم نے اس کی کھال کیوں نہ حاصل کر لی تاکہ اسے رنگ کر استعمال میں لاتی۔'' عرض کی: یہ تو مردار تھی! فرمایا: ''صرف اسے کھانا حرام ہے۔''③ اسے سب اہلِ صحاح

---

① صحیح، سنن أبی داود: ۲۸۵۸. ② صحیح، سنن ابن ماجه: ۳۳۱٤؛ مسند أحمد: ۲/ ۹۷.

③ صحیح البخاری: ۱٤۹۲؛ صحیح مسلم: ۳٦۳؛ سنن أبی داود: ٤۱۲۰؛ ابن ماجه: ۳٦۱۰.

نے نقل کیا، ابن ماجہ نے سند میں (عن میمونۃ) ذکر کیا، بخاری اور نسائی کے ہاں رنگنے کا ذکر موجود نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾(الأنعام:١٤٥)

''کہہ دیجیے! جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں میں ان میں کوئی چیز کھانے والے پر حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا بہتا ہوا لہو یا سُور کا گوشت کیونکہ یہ پلید ہیں، یا ایسا جانور جو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔''

اور کہا کہ صرف اس کا کھانا حرام ہے یعنی گوشت، اس کی کھال سے بنا برتن، اس کے دانت، ہڈی، بال اور اون سب چیزیں حلال ہیں، اسے امام ابن منذر اور امام ابن ابو حاتم رحمہ اللہ نے نقل کیا (بقول محشی اس کی سند میں ابوبکر سلمی بن عبداللہ ہذلی بصری ہے جو بقول دارقطنی ضعیف ہے) اسی طرح (حلال جانور کے) مردار کے اِنفحہ (اس کے پیٹ سے ایک چیز جسے کپڑے میں لت پت کرتے ہیں پھر وہ پنیر کی مانند گاڑھا ہو جاتا ہے) اور ان کا دودھ بھی پاک ہے کیونکہ صحابہ نے جب عراق فتح کیا تو مجوسیوں کی تیار کردہ پنیر کے بارے میں پوچھا تھا، جب سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ دورِ عمری میں مدائن کے گورنر تھے۔

② خون

چاہے یہ دمِ مسفوح ہو جو ذبح کردہ جانور سے بہتا ہے یا حیض کا خون ہو، البتہ تھوڑی مقدار میں لگ جانا قابلِ نظر اندازی ہے، چنانچہ ابن جریج رحمہ اللہ سے آیت: ﴿اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾(الأنعام: ١٤٥) کی تفسیر میں منقول ہے کہ مسفوح وہ خون جو بہتا ہے، البتہ جو ان کی رگوں میں ہو اس میں حرج نہیں، اسے امام ابن منذر رحمہ اللہ نے نقل کیا، امام ابومجلز رحمہ اللہ سے اس خون کی بابت پوچھا گیا جو ذبح کی جگہ میں لگا ہوا ہو یا ہانڈی کے اندر بالائی سطح پر ہو تو انہوں نے کہا: اس میں حرج نہیں کیونکہ ہمیں دمِ مسفوح سے منع کیا گیا ہے اور یہ تو گوشت کے ساتھ لگا تھا، لہٰذا یہ غیر مسفوح ہے، اسے عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہم گوشت تناول کرتے اور ہانڈی پر خون کے نشان نمایاں ہوتے تھے، بخاری رحمہ اللہ نے حسن کا قول ذکر کیا کہ مسلمان ہمیشہ بہتے زخموں کے ساتھ نمازیں پڑھتے رہے،① صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں نماز پڑھی کہ زخم سے خون بہہ رہا تھا، اسے بخاری نے کتاب الوضوء میں نقل کیا، حافظ فتح الباری میں لکھتے ہیں: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نماز کے دوران ایک یا دو قطرے لگ جانے یا بہہ جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔② جہاں تک پسو کا خون اور جو (پیپ، خون یا پانی) پھوڑے پھنسیوں سے نکلے تو یہ ان آثار کی رو سے قابلِ نظر اندازی ہیں، ابومجلز رحمہ اللہ سے پیپ کے بارے میں پوچھا گیا جو جسم یا کپڑے کو لگ جائے تو کہا کہ کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ نے صرف خون (کے نجس ہونے) کا ذکر کیا

---

① صحيح البخاري تعليقاً: كتاب الوضوء، باب: ٣٤، من لم ير الوضوء الا۔۔۔۔ ② ضعيف، مصنف ابن ابی شيبه: ١/ ١٣٨.

ہے، پیپ کا نہیں، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: جسم کا کوئی فاسد مادہ، پیپ وغیرہ لگ جائے تو کپڑا دھونا واجب ہے، بقول ان کے اس کی نجاست پر کوئی دلیل موجود نہیں، اولی یہ ہے کہ انسان بقدرِ امکان اس سے بچے۔

③ خنزیر کا گوشت

قرآن میں ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾(الأنعام:١٤٥)

''کہہ دیجیے! میں اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ بے شک یہ گندگی ہے۔''

یعنی یہ سب کچھ خبیث ہے، طبائع سلیمہ ان سے نفور ہیں، ''فَاِنَّهٗ'' کی ضمیر تینوں انواع کی طرف راجع ہے، علماء کے اظہر قول کے مطابق خنزیر کے بالوں کی بنی رسی استعمال کرنا جائز ہے۔

④، ⑤، ⑥ آدمی کی قے اور بول و براز

ان کی نجاست متفق علیہ امر ہے، البتہ قے اگر قلیل مقدار میں ہو تو مؤثر نہیں، اسی طرح بچے کا پیشاب جو ابھی طعام کھانے کی عمر کو نہیں پہنچا تو اس کی تطہیر کے لیے پانی چھڑک دینا ہی کافی ہے، کیونکہ سیدہ ام قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں جو ابھی کھانا تناول کرنے کی عمر کو نہ پہنچا تھا، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوا کر اپنے کپڑے پر چھڑک دیا دھویا نہیں۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے، جبکہ لڑکی کے پیشاب کرنے پر کپڑے کو دھویا جائے۔''[2] بقول امام قتادہ رحمہ اللہ یہ تب ہے اگر دونوں ابھی کھانا کھانے کی عمر تک نہیں پہنچے بصورتِ دیگر دونوں کا پیشاب دھویا جائے گا، اسے احمد اور اصحابِ سنن نے ماسوائے نسائی کے تخریج کیا، حافظ رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: اس کی سند صحیح ہے، چھڑکنا تب تک کافی ہے جب تک بچہ صرف ماں کا دودھ پیتا ہے، اگر اس غذا میں طعام بھی شامل ہے تو بلا اختلاف دھونا واجب ہوگا، شاید اس رخصت کا سبب لوگوں کی آسانی تھا کہ وہ عموماً بچوں کو اٹھاتے ہیں اور وہ کثرت سے پیشاب کرتے رہتے ہیں تو (باربار) دھونے کی مشقت سے انہیں بچایا۔

⑦ ودی

یہ سفید ثخین (جو رقیق نہ ہو) پانی جو پیشاب کے بعد خارج ہوتا ہے اور یہ بلا اختلاف نجس ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے

---

[1] صحیح البخاري: ٢٢٣؛ صحیح مسلم: ٢٨٧. [2] صحیح، سنن أبي داود: ٣٧٧؛ سنن ترمذي: ٦١٠؛ سنن ابن ماجه: ٥٢٥.

کہ ودی جو پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے تو اس صورت میں انسان اپنی شرمگاہ اور خصیتین کو دھوئے، اس پر نہانا واجب نہیں، اسے امام ابن منذر رحمہ اللہ نے نقل کیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ منی خارج ہوگئی تو نہانا ضروری ہوگا، جبکہ ودی اور مذی کے خروج کی صورت میں اسباغ الطہور ہے (یعنی شرمگاہ اور آس پاس کی جگہوں کو دھونا اور وضو کرنا) اسے اثرم اور بیہقی نے نقل کیا، بیہقی نے یہ الفاظ نقل کیے: ''اِغْسِلْ ذَكَرَكَ أَوْ مَذَاكِيْرَكَ وَتَوَضَّأْ وُضُوْئَكَ فِي الصَّلَاةِ'' یعنی زیرِ ناف دھو کر نماز والا وضو کرو۔[1]

⑧ مذی

یہ سفید چپچپاہٹ والا پانی جو جماع کے بارے میں سوچتے ہوئے یا چھیڑ چھاڑ اور بوس و کنار کرتے ہوئے نکل آتا ہے، کبھی اس کے خروج کا آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا، عورت سے بھی خارج ہوتا ہے، بلکہ آدمی کی نسبت اسے کثیر ہے، یہ بالاتفاق نجس ہے، اگر بدن کو لگے تو آلودہ جگہ دھونا واجب ہے اور اگر کپڑے کو لگے تو اس جگہ پانی چھڑک لینا ہی کافی ہوگا کیونکہ یہ ایسی نجاست ہے جس سے احتراز پُر از مشقت ہے کہ عموماً کنوارے نوجوانوں سے اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے تو لڑکے کے پیشاب کی نسبت اس بارے میں تخفیف اولیٰ ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں مذاء آدمی تھا (یعنی کثرت سے مذی بہہ پڑتی تھی) تو کسی سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھے کیونکہ خود مجھے آپ کی بیٹی کے اپنے گھر والی ہونے کی وجہ سے استحیاء محسوس ہوا تو آپ نے فرمایا: ''وضو کرو اور آلہ تناسل دھولو۔''[2] اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا، سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے مذی نے بہت مشقت میں ڈالا ہوا تھا اور اس وجہ سے بکثرت نہاتا رہتا تھا، ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اس سے استنجا اور وضو کرنا ہی کافی ہے۔'' عرض کی: اگر کپڑے کو لگ جائے تو...... آپ نے فرمایا: ''کف میں پانی لو اور جہاں محسوس کرو کہ لگی ہے وہاں چھڑک دو۔''[3] اسے ابو داود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن صحیح ہے، اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں جو اگر (عن) کا لفظ ذکر کریں تو ضعیف قرار دیے گئے ہیں، کیونکہ مدلس ہیں لیکن یہاں انہوں نے تصریحِ تحدیث کی ہے، اثرم نے اس کے یہ الفاظ ذکر کیے کہ میں بوجہ مذی مشقت میں تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بابت استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: «تَأْخُذُ حَفْنَةً مِنْ مَاءٍ فَتَرُشُّ عَلَيْهِ» ''پانی کا ایک چلو لو اور وہاں چھڑک دو۔''

⑨ منی

بعض علماء اس کے نجس ہونے کے قائل ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یہ پاک ہے، لیکن اگر گیلی ہو تو دھونا مستحب ہے اور اگر خشک ہو تو کھرچ ڈالنا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پر لگی منی جب خشک ہوتی تو اسے کھرچ ڈالتی تھی اور اگر تر ہوتی تو دھوتی،[4] اسے دارقطنی، ابوعوانہ اور بزار نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

① السنن الکبری للبیهقی: ١/ ١٩٩. ② صحیح البخاري: ٢٦٩؛ سنن نسائي: ١٥٢. ③ حسن، سنن أبي داود: ٢١٠؛ سنن ترمذي: ١١٥. ④ صحیح، سنن دارقطني: ٤٤٣؛ مسند ابی عوانه: ٥٢٧.

پوچھا گیا: اگر منی کپڑے کو لگ جائے تو...... آپ نے فرمایا: ''یہ ناک کے پانی اور تھوک کے بمنزلہ ہے، اسے کپڑے کی پٹی یا گھاس پھوس کے ساتھ صاف کر لینا کافی ہے۔''[1] اسے دارقطنی، بیہقی اور طحاوی رحمہم اللہ نے نقل کیا اور اس کے رفع وقف کا معاملہ مختلف فیہ ہے۔ (محشی کہتے ہیں: بیہقی کے بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا موقوف ہونا ہی صحیح ہے، البتہ اس کا نحو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً صحیحاً مروی ہے، کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھاس کے تنکے کے ساتھ اپنے کپڑے سے منی کھرچ لیتے تھے، البانی نے اِرواء الغلیل میں اسے صحیح قرار دیا)

⑩ غیر ماکول اللحم کا (یعنی جن جانوروں کا گوشت حلال نہیں) پیشاب اور لید

یہ دونوں نجس ہیں، کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کو گئے تو مجھے حکم دیا کہ تین پتھر لاؤں، مجھے دو تو مل گئے مگر تیسرا نہ ملا تو میں روثہ (یعنی لید) لے آیا، آپ نے پتھر لے لیے مگر روثہ ایک طرف رکھ دی اور فرمایا: ''یہ ناپاک ہے۔''[2] اسے بخاری، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے تخریج کیا، ان کی روایت میں یہ زیادت ہے: ﴿إِنَّهَا رِكْسٌ إِنَّهَا رَوْثَةُ حِمَارٍ﴾ ''یہ پلید ہے کیونکہ یہ گدھے کی لید ہے۔'' قلیل مقدار میں اگر ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس سے احتراز میں مشقت ہے، ولید بن مسلم کہتے ہیں: میں نے امام اوزاعی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ غیر ماکول اللحم جانوروں مثلاً: خچر اور گدھے کے پیشاب کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: لوگ جنگوں میں اس کے ساتھ مبتلا ہوتے تھے تو جسم یا کپڑے کو لگنے کی صورت میں دھوتے نہ تھے۔ ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب اور لید کے متعلق امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی ایک جماعت طہارت کی قائل ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: صحابہ میں سے کوئی بھی ان کے نجس ہونے کا قائل نہیں بلکہ اس کی نجاست کا قول محدَث (یعنی بعد کی پیداوار) ہے، صحابہ میں سے اس کے لیے سلف نہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ عکل اور عرینہ قبائل کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو انہیں اس کی آب و ہوا ناسازگار ہوئی (اور بیمار پڑ گئے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اونٹنیوں کی چراہ گاہ میں چلے جانے کا حکم دیا اور یہ کہ ان کا پیشاب اور دودھ پئیں،[3] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا، یہ حدیث ان کے طاہر ہونے پر دلیل ہے، دیگر ماکول اللحم حیوانات کو ان پر قیاس کیا جائے گا، بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ: جو زعم کرے کہ یہ انہی کے ساتھ خاص تھا تو اس کی رائے صائب نہیں کیونکہ خصائص کا ثبوت دلیل کے ساتھ ہی ہوتا ہے، کہتے ہیں: اہل علم کی نظروں کے سامنے بازاروں میں بکریوں کے گوبر کی خرید و فروخت اور اونٹوں کے پیشاب کا دواؤں میں بغیر کسی نکیر کے قدیم و جدید میں استعمال ان کی طہارت کی دلیل ہے، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بظاہر ہر ماکول اللحم جانور کے پیشاب اور گوبر طاہر ہیں، اصل کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے اور براءتِ اصلیہ کے پیش نظر جبکہ نجاست کا حکم لگانا اس حکم سے جس کی

---

① صحیح، سنن دارقطنی: ٤٤١؛ السنن الکبری للبیهقی: ٢/ ٤١٨. ② صحیح البخاری: ١٥٦؛ سنن ابن ماجه: ٣١٤؛ صحیح ابن خزیمه: ٧٠. ③ صحیح البخاری: ٣٣٣؛ صحیح مسلم: ١١.

اصل اور براءت مقتضی ہو، منتقل کرنے والا شرعی حکم ہے، لہٰذا نجاست کے قائلین کا دعویٰ مقبول نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ کوئی دلیل ہو جو اصل و براءت سے اسے منتقل کرنے کے لیے ٹھیک ہو، لیکن ایسی کسی دلیل کا وجود نہیں۔

⑪ الجَلَّالہ (گندگی کھانے والا جانور)

جلالہ پر سوار ہونے، اس کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے نہی وارد ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جلالہ کا دودھ پینے سے منع کیا،[1] اسے سوائے ابن ماجہ کے دیگر پانچ نے تخریج کیا، ترمذی نے اس پر حکمِ صحت لگایا، ابو داود کی روایت میں ہے کہ جلالہ پر سواری سے منع کیا،[2] عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت سے اور جلالہ پر سواری کرنے اور اس کا گوشت کھانے سے منع کیا۔[3] اسے احمد، نسائی اور ابو داود نے نقل کیا، جلالہ ایسا اونٹ، گائے، بکری، مرغ یا مرغی وغیرہ جو گندگی کھائے یہاں تک کہ وہ بدبودار ہو چکا ہو، ہاں اگر ایک مدت ایسے جانور کو صاف خوراک دی جائے اور گندگی سے دور رکھا جائے تو اس کا گوشت طیب ہو جائے گا اور بدبو ختم ہو جائے گی، تب یہ حلال ہے کیونکہ نہی کی علت اب دور ہوگئی۔

⑫ شراب

جمہور علماء کے نزدیک یہ نجس ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ﴾ (المائدۃ: ۹۰)

''اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے، یہ سب ناپاک کام اعمالِ شیطان میں سے ہیں۔''

ایک گروہ اس کے طاہر ہونے (نہ کہ حلال ہونے) کا قائل ہے اور انہوں نے آیت میں مذکور رجس کو معنوی رجس پر محمول کیا ہے، کیونکہ لفظ رجس خمر سے اور جس کا اس پر عطف ڈالا گیا، سے خبر ہے اور وہ معطوف قطعی طور پر حسی نجاست کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا، قرآن میں ہے: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ﴾ (الحج: ۳۰) ''بتوں کی پلیدی سے بچو۔'' تو اوثان معنوی طور پر رجس ہیں، یہ نہیں کہ انہیں ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نجس ہو جائے گا، آیت میں اس کی یہ تفسیر کہ یہ شیطان کے عمل سے ہے، عداوت اور بغض کا موجب بنتے اور اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتے ہیں، بھی اسی طرف دلالت کناں ہے، سبل السلام میں ہے: حق یہ ہے کہ اعیان (یعنی قدرتی اشیا) میں اصل ان کا طاہر ہونا ہے اور کسی چیز کا حرام ہونا اس کے نجس ہونے کو لازم نہیں، اب حشیش (یعنی بھنگ) حرام ہے، لیکن یہ طاہر ہے۔ ہاں ہر نجاست لازماً حرام ہے، اس کا عکس درست نہیں اس لیے کہ ہر حال میں نجس چیز کی ملامست سے ممانعت ہے تو کسی عین کی نجاست کا حکم اس کی تحریم کے حکم کے مترادف ہے بخلاف کسی چیز کی تحریم کے حکم کے (کہ اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ وہ چیز نجس بھی ہوئی) اب (مردوں کے لیے) ریشم اور سونا حرام ہے، حالانکہ

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ۳۷۸۶؛ سنن ترمذي: ۱۸۲۵. [2] صحيح، سنن أبي داود: ۳۷۱۹.

[3] حسن، سنن أبي داود: ۳۸۱۱؛ سنن نسائي: ٤٤٥٩.

ضرورتِ شرعیہ کے لحاظ سے اور بالاجماع وہ طاہر ہیں، یہ ضابطہ جان لینے کے بعد واضح ہوا کہ شراب کی حرمت جیسا کہ نصوص کی اس پر دلالت ہے، سے اس کا نجس ہونا لازم نہیں بلکہ اس کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت ہوگی، وگرنہ طہارت کے ضمن میں متفق علیہ قاعدہ کلیہ پر یہ باقی ہے (وہ یہ کہ ہر چیز اصلاً طاہر ہے) تو جو اس کے برخلاف کا مدعی ہو اس کے ذمہ دلیل ہے۔

⑬ کتا

یہ نجس (العین) ہے، اگر برتن میں منہ مار جائے تو اسے سات مرتبہ دھونا ضروری ہوگا، پہلی مرتبہ میں مٹی کے ساتھ مانجھا جائے، کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «طَهُوْرُ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ إِذَا وَلَغَ فِيْهِ الْكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ أُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ» ''اگر برتن میں کتا منہ مار دے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے، تب وہ پاک ہوگا اور اولاً مٹی سے مانجھا جائے۔''[1] اسے مسلم، احمد، ابوداود اور بیہقی نے نقل کیا، اگر کسی ایسے برتن میں منہ مارا جس میں جما ہوا طعام تھا تو جہاں اس کا منہ لگا اسے اور اس کے آس پاس کے طعام کو نکال دیا جائے، باقی اپنی سابقہ طہارت پر باقی ہے، جہاں تک کتے کے بال ہیں تو اظہر یہ ہے کہ وہ پاک ہیں ان کی نجاست کا ثبوت نہیں۔

بدن اور کپڑے کو پاک کرنا

بدن اور کپڑوں میں نجاست لگ جائے تو اگر مرئی نجاست ہے جیسے خون تو پانی کے ساتھ دھونا واجب ہے تاکہ وہ زائل ہو جائے، اگر دھونے کے بعد کوئی نشان و اثر باقی ہے جس کا زائل کرنا دشوار ہے تو یہ قابلِ نظر اندازی ہے، اگر غیر مرئی نجاست ہے، مثلاً پیشاب (یا اس کے چھینٹے) تو دھونا ہی کافی ہے چاہے ایک بار، سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک خاتون آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے کسی کے لباس کو حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: «تَحُتُّهُ ثُمَّ تَقْرِصُهُ بِالْمَاءِ ثُمَّ تَنْضَحُهُ ثم تُصَلِّيْ فِيْهِ» ''اسے کھرچے، پھر پانی سے صاف کرے، پھر اس میں نماز پڑھ سکتی ہے۔''[2] متفق علیہ۔

اگر عورت (یا مرد) کے کپڑے (چادر وغیرہ) کے نچلے حصے کو نجاست لگ جائے (اور وہ چلتے ہوئے زمین پر لگتا جاتا ہے) تو مٹی ہی اسے پاک کر دے گی، ایک روایت میں ہے کہ ایک خاتون نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: میری چادر لمبی ہے اور کئی دفعہ گندگی والی جگہ پر چلنا پڑتا ہے (تو نچلے حصے کو کچھ گندگی لگ جاتی ہے) تو نبی کریم ﷺ نے (مسئلہ دریافت ہونے پر) فرمایا: «يُطَهِّرُهُ مَا بَعْدَهُ» ''مابعد والی پاک زمین پر اس کا لگنا اسے پاک کر دے گا۔''[3] اسے احمد اور ابوداود نے تخریج کیا۔

---

① صحيح البخاري: ١٧٢؛ صحيح مسلم: ٢٧٩. ② صحيح البخاري: ٢٢٧؛ صحيح مسلم: ٢٩١.
③ صحيح، سنن أبي داود: ٣٨٣؛ سنن ابن ماجه: ٥٣١.

زمین کی تطہیر

اگر زمین پر نجاست لگ جائے تو اس پر پانی بہانا اسے پاک کر دے گا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا، لوگ اسے اٹھانے کے لیے دوڑے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا اور فرمایا: ''کرنے دو اور اس جگہ پانی کا ایک ڈول بہا دو، پس تمہیں نرمی کے لیے بھیجا گیا ہے سختی کے لیے نہیں۔''[1] اسے سوائے مسلم کے سب نے نقل کیا ہے، خشک ہو کے ویسے بھی پاک ہو جائے گا زمین بھی اور جو اس کے ساتھ جڑا ہوا ہو، مثلاً: درخت اور دیوار، بقول ابوقلابہ رحمہ اللہ زمین کا خشک ہونا اس کی پاکی کا سبب ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: ''زَكَاةُ الأَرْضِ يبْسُهَا'' یعنی زمین کی پاکی اس کا خشک ہونا ہے۔[2] (یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نہیں بلکہ ابوجعفر کا قول ہے) اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، یہ تب ہے جب لگی ہوئی نجاست مائع ہو، (مثلاً پیشاب) لیکن اگر وجود والی نجاست ہے تب طہارت کے لیے اس کا وہاں سے ہٹا دینا ضروری ہو گا۔

گھی وغیرہ کی تطہیر

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا: اگر گھی میں چوہیا گر جائے تو...... آپ نے فرمایا: ''جہاں گری ہے وہ اور اس کا آس پاس نکال کر پھینک دو، باقی کھا سکتے ہو۔''[3] اسے بخاری نے نقل کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس امر پر اتفاق نقل کیا کہ جمے ہوئے گھی وغیرہ میں اگر کوئی مردار پڑ جائے تو اسے اور اس کا اس پاس نکال کر پھینک دیا جائے، باقی اگر تیقن ہو کہ اس سے متاثر نہیں ہوا تو استعمال کر لیا جائے، مائع کے بارے میں اختلافِ آراء ہے، جمہور کی رائے میں نجاست پڑنے سے یہ سارا نجس ہو جائے گا، ایک فریق نے اختلاف کیا جس میں زہری اور اوزاعی ہیں، ان کا مذہب یہ ہے: ان کا حکم پانی کی مانند ہے کہ اگر نجاست کے سبب متغیر ہو تو نجس ورنہ پاک ہے اور یہی سیدنا ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب تھا۔

مردار کی کھال کی تطہیر

مردار کی کھال بیرون اور اندورن دونوں طرف سے رنگ لینے سے پاک ہو جائے گی، کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إذا دُبِغَ الإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ» ''اگر کھال رنگ لی جائے تو وہ پاک ہے۔''[4] یہ متفق علیہ ہے۔

آئینہ اور اس جیسی اشیا کی تطہیر

آئینہ، چھری، تلوار، ناخن، ہڈی، شیشہ، مدہون (یعنی کیمیکل/ تیل لگا) آئینہ اور ہر صقیل چیز جس کے مسام نہ ہوں، اس کو

---

[1] صحيح البخاری: ٢٢٠؛ سنن أبی داود: ٣٨٠. [2] المصنف لابن ابی شیبہ: ١/ ٥٧. [3] صحيح البخاری: ٢٣٥؛ سنن نسائی: ٧/ ١٧٨. [4] صحيح البخاری: ١٤٩٢؛ صحيح مسلم: ٣٦٣.

پونچھ کر پاک کیا جاسکتا ہے اس طور پر کہ نجاست کا اثر زائل ہو جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تلواروں سمیت نمازیں ادا کر لیتے تھے، حالانکہ انہیں خون لگا ہوتا تھا، پھر پونچھ کر صاف کر لیتے اور اسی کو ان کی طہارت میں کافی سمجھتے تھے۔

جوتے کی تطہیر

نجاست آلود جوتا یا موزہ زمین پر رگڑ کر پاک ہو سکتا ہے اگر اس طرح نجاست کا اثر زائل ہو جائے کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إذا وَطِئَ أحَدُكُمْ بِنَعْلِهِ الأَذَىٰ فإنَّ التُّرَابَ لَهُ طَهُوْرٌ)) ''اگر جوتے کے تلے میں نجاست لگ جائے تو مٹی سے رگڑ کر اسے پاک کیا جاسکتا ہے۔''[1] اسے ابوداود نے نقل کیا، ایک روایت میں یہی بات موزوں کے بارے میں کہی، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مسجد میں آؤ تو جوتے (اندر لے جانے کی صورت میں) الٹے کر کے دیکھ لو کہ کہیں گندگی تو نہیں لگی ہوئی، اگر لگی ہو تو زمین کے ساتھ صاف کرو، پھر اس میں نماز پڑھو (یعنی اگر کسی جگہ جوتوں سمیت نماز پڑھنی ہو تو)''[2] اسے احمد اور ابوداود نے تخریج کیا، اس لیے کہ جوتے عموماً بار بار گندگی سے آلودہ ہوتے رہتے ہیں تو مٹی کے ساتھ انہیں صاف کرنے اور پونچھنے کو کافی قرار دیا گیا، محلِ استنجا کی مانند بلکہ اس کا معاملہ محلِ استنجا کی نسبت اولیٰ ہے، کیونکہ وہاں تو (دن میں) صرف دو یا تین مرتبہ ضرورت پڑے گی۔

چند مفید معلومات عامہ

① ایسی رسی جس پر نجس کپڑا لٹکایا گیا ہو، پھر دھوپ یا ہوا نے اسے خشک کر دیا تو بعد ازاں اس پر پاک کپڑے لٹکانے میں حرج نہیں۔

② اگر کسی پر کچھ چھینٹے گرے اور اسے نہیں پتہ کہ یہ پانی کے تھے یا پیشاب کے (یا پانی کہیں گٹر کا تو نہیں تھا) تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ اس کے بارے میں تحقیق کرتا پھرے، ہاں اگر کسی سے پوچھ لیا تو مسئول علیہ کی ذمہ داری نہیں کہ صورت حال سے آگاہ کرے، چاہے اسے پتہ ہو کہ نجس قطرے تھے اور اس کے لیے متاثرہ جگہ کا دھونا واجب نہیں۔

③ اگر جسم یا لباس کے کسی حصے کو گیلا پائے اور نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے تو واجب نہیں کہ سونگھے اور حقیقت جاننے کی کوشش کرے، کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہیں گزر رہے تھے کہ پرنالے سے ان پر کچھ قطرے پڑے، پرنالے پر ایک آدمی موجود پا کر ان کے ہمراہی نے اس سے پوچھا یہ قطرے پاک پانی کے تھے یا نجس کے؟ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: مت بتلانا! اور چلتے رہے۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٣٨٥، ٣٨٦؛ المستدرك للحاكم: ١/ ١٦٦. [2] صحیح، سنن أبی داود: ٦٥٠؛ مسند أحمد: ٣/ ٢٠.

④ سڑکوں اور گلی بازاروں کی مٹی لگنے کی صورت میں دھونا واجب نہیں، کمیل بن زیاد رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ بارش کے کیچڑ میں چل کر آئے، پھر بغیر پاؤں دھوئے مسجد میں آکر جماعت کرا دی۔

⑤ اگر نماز سے فارغ ہو کر لباس یا بدن کے کسی حصے پر نجاست دیکھی، پہلے اس کی بابت علم نہ تھا یا علم تو تھا مگر بھول گیا یا بھولا نہیں مگر اس کا ازالہ کرنے سے عاجز تھا تو اس کی نماز ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، یہی کثیر صحابہ و تابعین کا فتویٰ ہے۔

⑥ جسے یہ علم ہو کہ لباس میں کسی جگہ نجاست لگی ہے، مگر وہ جگہ نہیں مل رہی تو پورا کپڑا دھونا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر طہارت کا تیقن ممکن نہیں، یہ "مَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ" یعنی جس کے بغیر کوئی واجب روبعمل نہ آسکے تو وہ بھی واجب ہوگا، کے باب سے ہے۔

⑦ اگر دو میں سے ایک کپڑا پاک اور ایک نجس ہے، مگر اس پر یہ معاملہ مشتبہ ہے تو تحری (یعنی خوب تلاش وطلب) کر کے کسی ایک میں نماز پڑھ لے، جیسے قبلہ کا رخ معلوم نہ ہونے کی بابت یہی حکم ہے، پاک کپڑوں کی تعداد کثیر ہو یا قلیل۔

قضائے حاجت

اس کے متعدد آداب ہیں، جن کا ملخص حسبِ ذیل ہے:

① اپنے ہمراہ کوئی ایسی چیز (رقعہ اور انگشتری وغیرہ) نہ لے جائے جس میں اللہ کا نام لکھا ہو، اِلّا یہ کہ (مجبور ہو اور) ضیاع کا ڈر ہو، کیونکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (محمد رسول اللہ) کے نقش والی انگشتری بنوائی تو بیت الخلا جاتے وقت اسے اتار دیتے تھے۔"[1] اسے اربعہ نے روایت کیا، حافظ نے اس حدیث کو معلول اور ابو داود نے منکر قرار دیا البتہ حدیث کا اول جز صحیح ہے۔

② (گھروں میں بیت الخلا نہ ہونے کی صورت میں) لوگوں کی نظروں سے دور جانا بالخصوص بڑے پیشاب کے وقت اس طور پر کہ آواز یا بو لوگوں تک نہ پہنچے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے (پڑاؤ سے) اتنی دور جاتے ہیں کہ نظر نہیں آتے تھے،[2] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا، ابو داود کے الفاظ ہیں کہ براز کا ارادہ ہوتا تو اتنی دور جاتے کہ کوئی نہ دیکھ سکتا،[3] ان کی ایک روایت میں ہے: "كَانَ إِذَا ذَهَبَ الْمَذْهَبَ أَبْعَدَ" یعنی جب آپ قضائے حاجت کے لیے جاتے تو دور جاتے۔[4]

③ بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت (اندر جانے سے قبل) بآوازِ بلند بسم اللہ اور دعائے ماثور پڑھے، اگر کھلی جگہ میں یہ کرے تو تب اس غرض کے لیے جا کر (بیٹھنے سے قبل) کپڑے سمیٹے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلا کا ارادہ کرتے تو کہتے:

---

[1] منكر، سنن أبي داود: ١٩؛ سنن ترمذي: ١٧٤٦. [2] صحيح، سنن ابن ماجه: ٣٣٥. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٢. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١.

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ»

''اے اللہ! میں خبیث جنوں اور جنیوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔''[1]

اسے جماعت نے تخریج کیا۔

④ اس دوران میں کسی قسم کی کلام نہ کرے، نہ اذکار میں سے کچھ، نہ عام بات، نہ سلام اور اذان کا جواب، مگر جو ضروری ہو، مثلاً: اندھے کو خطرہ درپیش ہے تو بول کر آگاہ کر دے، اگر اس دوران میں چھینک آئے تو دل میں زبان کو حرکت دیے بغیر الحمدللہ پڑھے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی کا گزر ہوا اور اس نے سلام کہا، مگر آپ نے جواب نہ دیا،[2] سوائے بخاری کے دیگر سب (مصنفینِ صحاح) نے اسے نقل کیا، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، اگر دو مل کر قضائے حاجت کو نکلیں اور اس دوران میں آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔''[3] اسے احمد، ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، حدیث کا ظاہر کلام کی تحریم پر دلیل ہے، البتہ اجماع نے اسے تحریم سے کراہت کی طرف پھیر دیا ہے (یعنی بالا جماع علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے)۔

⑤ قبلہ کی تعظیم کرے، لہٰذا نہ اس کی طرف پیٹھ کرے اور نہ چہرہ، کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب قضائے حاجت کے لیے بیٹھو تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرو اور نہ پشت۔''[4] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، یہ نہی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث کے مدِ نظر کراہت پر محمول ہے، جس میں ہے کہ میں ایک روز (اپنی بہن) ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی چھت پر چڑھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قضائے حاجت میں مشغول دیکھا اور آپ کا رخ شام اور پشت قبلہ کی جانب تھی،[5] اسے جماعت نے نقل کیا یا پھر دونوں کے مابین یہ تطبیق دی جائے گی کہ تحریم کھلے میں اور اباحت تیار کیے گئے بیت الخلا میں ہے، مروان اصغر سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ قبلہ رخ اپنی اونٹنی بٹھا کر پیشاب کر رہے ہیں، کہا: اے ابوعبدالرحمن! کیا اس سے منع نہیں کیا گیا؟ کہا: کیوں نہیں! لیکن یہ نہی کھلے میدان سے متعلق ہے، اگر تمہارے اور قبلہ کے مابین کوئی چیز حائل ہو تب حرج نہیں،[6] اسے ابوداود، ابن خزیمہ اور حاکم نے نقل کیا اور اس کی سند حسن ہے جیسا کہ فتح الباری میں کہا گیا۔

⑥ نرم، ہموار اور نشیب کی طرف جاتی جگہ تلاش کرے تاکہ نجاست لگنے سے محفوظ رہے، کیونکہ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کے ساتھ ایک نرم و ہموار جگہ پر آئے اور پیشاب کیا، پھر فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو مناسب جگہ تلاش کرے۔''[7] اسے احمد اور ابوداود نے تخریج کیا، اگرچہ اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٢، صحيح مسلم: ٣٧٥. [2] صحيح مسلم: ٣٧٠؛ سنن أبي داود: ١٦. [3] ضعيف، سنن أبي داود: ١٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٤٢. [4] صحيح مسلم: ٢٦٥. [5] صحيح البخاري: ١٤٨، صحيح مسلم: ٢٦٦.
[6] حسن، سنن أبي داود: ١١، صحيح ابن خزيمه: ٦٠. [7] ضعيف، سنن أبي داود: ٣؛ مسند أحمد: ٤/ ٤١٤.

مگر معنی کے لحاظ سے یہ صحیح ہے۔

⑦ سوراخ سے بچے تا کہ اس میں کوئی موذی چیز اگر ہے تو اس سے محفوظ ہو، قتادہ کی سیدنا عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ کوئی بل میں پیشاب کرے، قتادہ سے لوگوں نے کہا: اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا: کیونکہ یہ جنوں کے مساکن ہیں،[1] اسے احمد، نسائی، ابوداود، حاکم اور بیہقی نے نقل کیا، ابن خزیمہ اور ابن سکن نے اس پر صحت کا حکم لگایا۔

⑧ لوگوں کی سایہ دار جگہوں، گزرگاہوں اور مجالس کی جگہوں سے احتراز کرے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِتَّقُوا اللَّاعِنَیْنِ)) ''دو لعنت کا موجب بننے والی جگہوں سے بچو۔'' عرض کی گئی: ان سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جو لوگوں کے راستے یا ان کی سایہ کی جگہ میں قضائے حاجت کے لیے بیٹھتا ہے۔''[2] اسے احمد، مسلم اور ابوداود نے تخریج کیا۔

⑨ اپنے نہانے کی جگہ میں، اسی طرح ٹھہرے ہوئے یا جاری (صاف) پانی میں پیشاب نہ کرے سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے غسل خانے میں پیشاب نہ کرو اور پھر وہیں وضو کرو کیونکہ اس سے اکثر وسواس پیدا ہوتے ہیں۔''[3] (لیکن حدیث کا دوسرا حصہ ''کیونکہ اس سے اکثر وسواس پیدا ہوتے ہیں'' ضعیف ہے) اسے خمسہ نے نقل کیا، البتہ وضو کا ذکر صرف احمد و ابوداود کے ہاں ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا،[4] اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، انہی سے مروی ہے کہ آپ نے جاری پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا:[5] مؤلف مجمع الزوائد کے بقول اسے طبرانی نے نقل کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں، اگر غسل خانے میں فلش لگی ہو تب مکروہ نہیں۔

⑩ کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرے، کیونکہ یہ وقار اور محاسن عادات کے منافی ہے، پھر چھینٹے پڑنے کا بھی امکان ہے، ہاں اگر یہ خدشہ نہ ہو تب جائز ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے: جو تمہیں بیان کرے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، اس کی اس بات کو سچا مت مانو، کیونکہ آپ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے،[6] اسے سوائے ابوداود کے خمسہ نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ اس باب میں احسن و اصح روایت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات ان کے ذاتی علم پر مبنی ہے اور یہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی کے منافی نہیں کہ آپ ایک محلہ کے کوڑا پھینکنے کی جگہ پر آئے تو کھڑے کھڑے پیشاب کیا، میں دور جانے لگا تو فرمایا: ''قریب ہو جاؤ حتی کہ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا، بعد میں آپ نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا،[7] اسے جماعت نے روایت کیا ہے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بیٹھ کر پیشاب کرنا مجھے زیادہ پسند ہے، لیکن کھڑے ہو کر کرنا

---

① ضعیف، سنن أبی داود: ۲۹؛ سنن نسائی: ۳٤. ② صحیح مسلم: ۲٦۹؛ سنن أبی داود: ۲۵. ③ صحیح، سنن أبی داود: ۲۷؛ سنن ترمذی: ۲۱. ④ صحیح مسلم: ۲۸۱؛ سنن نسائی: ۳۵. ⑤ ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۷۷۰؛ مجمع الزوائد: ۱/ ۲۰٤. ⑥ صحیح، سنن ترمذی: ۱۲؛ سنن نسائی: ۲۹. ⑦ صحیح البخاری: ۲۲٤؛ صحیح مسلم: ۲۷۳.

بھی مباح ہے اور دونوں طرح نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔

⑪ شرم گاہ سے نجاست دور کرے، یہ واجب ہے پتھر (اور ڈھیلے) کے ساتھ یا اس کی مثل کسی چیز سے اور جس سے نجاست دور ہوسکتی ہے، ایسی اشیا میں سے جن کی کوئی حرمت نہ ہو (مثلاً: ایسے کاغذ نہیں جن میں پاکیزہ الفاظ لکھے ہوں) یا صرف پانی استعمال کرے یا پتھر وغیرہ اور پانی دونوں استعمال کرے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قضائے حاجت کو جاؤ تو تین پتھروں کے ساتھ صاف کرو کیونکہ یہ کافی ہوں گے۔''① (اگر ضرورت پڑے تو تین سے زائد بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں البتہ طاق عدد ہونا چاہیے) اسے احمد، نسائی، ابو داود اور دارقطنی نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلا کو جاتے تو میں اور میری عمر کا ایک لڑکا پانی کا لوٹا اور برچھی لے کر ہمراہ جاتے تو آپ پانی کے ساتھ استنجا کرتے،② یہ متفق علیہ ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر دو قبروں سے ہوا تو فرمایا: ''انہیں عذاب ہو رہا ہے اور انہیں کسی ایسی بات کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا جس سے بچنا کوئی بڑی بات تھی، ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا۔''③ اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''پیشاب (کے قطروں) سے بچا کرو کیونکہ قبر کا عمومی عذاب اس سے ہے۔''④

⑫ دائیں ہاتھ کے ساتھ استنجا نہ کیا جائے، یہ دائیں ہاتھ کو گندگی سے آلودہ کرنے سے تنزیہہ کی غرض سے ہے، عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ سیدنا سلمان (فارسی) رضی اللہ عنہ سے کسی نے (طنزیہ انداز میں) کہا: آپ کو آپ کے نبی نے ہر چیز کی تعلیم دی ہے، حتی کہ قضائے حاجت کرنے کا طریقہ بھی سکھلایا ہے! تو انہوں نے کہا: ہاں بالکل! ہمیں منع کیا کہ بول و براز کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین پتھروں سے کم کے ساتھ استنجا کریں، اسی طرح نجس چیز اور ہڈی کے ساتھ استنجا کرنے سے بھی منع کیا،⑤ اسے مسلم، ابو داود اور ترمذی نے تخریج کیا، سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ کھانے، پینے، کپڑے پہننے اور اخذ وعطا کے لیے جبکہ بایاں ہاتھ ان کے ماسوا امور کے لیے خاص کیا ہوا تھا،⑥ اسے احمد، ابو داود، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے نقل کیا۔

⑬ استنجا کے بعد زمین پر ہاتھ مل کر صاف کرے یا صابن وغیرہ کے ساتھ دھولے تا کہ اس کی بو ختم ہو جائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ قضائے حاجت کو گئے تو میں ایک برتن میں پانی لایا، آپ نے استنجا کر کے زمین پر ہاتھ رگڑ کر پونچھا،⑦ اسے ابو داود و نسائی، بیہقی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

⑭ پیشاب کر کے اپنی شرمگاہ اور شلوار (کی آسن) پر پانی چھڑکے تا کہ کسی قسم کا وسوسہ نہ رہے اور تریاہٹ محسوس کر کے کہے گا:

---

① حسن، سنن أبي داود: ٤٠؛ سنن نسائي: ٤٤. ② صحيح البخاري: ١٥٢؛ صحيح مسلم: ٢٧١.

③ صحيح البخاري: ٢١٦؛ صحيح مسلم: ٢٩٢. ④ صحيح، سنن الدارقطني: ٤٥٣. ⑤ صحيح مسلم: ٢٦٢؛ سنن أبي داود: ٧. ⑥ صحيح، سنن أبي داود: ٣٢؛ صحيح ابن حبان: ٥٢٢٧؛ المستدرك للحاكم: ٤/ ١٠٩.

⑦ صحيح، سنن أبي داود: ٤٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٨.

یہ پانی کے قطرے ہیں (نہ کہ پیشاب کے)، حکم بن سفیان یا سفیان بن حکم سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پیشاب کر کے پانی چھڑکا کرتے تھے۔[1] ایک روایت میں ہے کہ پیشاب کر کے اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی یہی کرتے تھے حتی کہ ان کا کپڑا گیلا ہو جاتا۔

⑮ بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں پہلے اندر رکھے اور نکلتے وقت دایاں پہلے نکالے، پھر کہے: «غُفْرَانَكَ» سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بیت الخلا سے نکلتے تو «غُفْرَانَكَ» کہتے[2]، اسے سوائے نسائی کے سب نے تخریج کیا ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت اس باب کی اصح ترین روایت ہے، جیسا کہ ابوحاتم نے کہا: کئی ضعیف طرق سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ باہر آ کر یہ دعا پڑھتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَعَافَانِيْ»[3] اور یہ بھی مروی ہے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ أَذَاقَنِيْ لَذَّتَهُ وَأَبْقٰى فِيَّ قُوَّتَهُ وَأَذْهَبَ عَنِّيْ أَذَاهُ» ''اللہ کی حمد کہ اولاً اس طعام کی لذت دی، پھر اس کا بعض حصہ جزوِ جسم بنایا اور فضلے کا اخراج کیا۔''[4]

سنن الفطرۃ (آدابِ فطرت)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے لیے کئی سنن پسند کیں اور ہمیں حکم دیا کہ اس ضمن میں ان کی اقتدا کریں اور ان سنن کو شعار کی قبیل سے کیا جو کثیر الوقوع ہیں تا کہ ان کے اتباع دیگر سے متمیز ہوں، ان کا بیان حسبِ ذیل ہے:

① ختنہ کرنا

یہ اس ٹکڑے کو قطع کر کے پھینک دینا ہے جس نے آلہ تناسل کے سرے کو ڈھانپا ہوتا ہے، تا کہ وہاں میل جمع نہ ہو، نہ پیشاب کا کوئی قطرہ ادھر رکا رہے اور لذتِ جماع کم نہ ہو، یہ مرد کی بنسبت ہے جہاں تک عورت کا تعلق ہے تو اس کی شرمگاہ کا اوپر والا کچھ حصہ قطع کیا جاتا ہے (بقول محشی عورتوں کے ختنہ کے حکم پر احادیث ضعیف ہیں، ان میں کوئی طریق بھی صحت کے ساتھ ثابت نہیں، بقول البانی رحمہ اللہ ان میں سے صرف ایک طریق صحیح ہے جس میں مذکور ہے کہ آپ نے ایک ختنہ کرنے والی سے کہا تھا: «وَاخْفِضِيْ وَلَا تَنْهَكِيْ فَإِنَّهُ أَنْضَرُ لِلْوَجْهِ وَأَحْظٰى لِلْفَرْجِ» ''خواتین کا ختنہ کرتے ہوئے زیادہ مت قطع کرنا بس معمولی سا کیونکہ یہ چہرے کی رونق بڑھاتا ہے اور شوہر کو زیادہ لطف ملنے کا باعث ہوتا ہے۔'' کہتے ہیں: اس کے متعدد طرق ہیں اور صحابہ کی ایک جماعت سے اس کے شواہد ہیں، جنہیں انہوں نے سلسلۃ الصحیحۃ میں تخریج کیا ہے) یہ سنت قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے اسی برس کی عمر میں کلہاڑے سے اپنا ختنہ کیا۔''[5] اسے بخاری نے روایت کیا، جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ختنہ واجب ہے، شوافع کے

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٦٦؛ سنن نسائی: ٥٠. [2] صحیح، سنن أبی داود: ٣٠؛ سنن ترمذی: ٧. [3] ضعیف، سنن ابن ماجہ: ٣٠١. [4] ضعیف، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ٢٥. [5] صحیح البخاری: ٣٣٥٦، ٦٢٩٨.

ہاں ساتویں دن اسے کرانا مستحب ہے، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ اس کے وقت کی تحدید یا اس کا وجوب ثابت کرنے میں کوئی روایت منقول نہیں (بقول محشی وجوب پر دلالت کرنے والی مرویات موجود ہیں، تفصیل کے لیے ہمارے شیخ مصطفی بن سلامہ کی کتاب: یا قلفاء ختنی اور علامہ البانی کی تمام المنۃ پڑھیے)۔

②، ③ زیرِ ناف بال صاف کرنا اور بغلوں کے بال اکھیڑنا

ان دونوں جگہوں میں استرا پھیرنا، قینچی سے کاٹنا، بال صفا اور نورہ (یعنی چونے کے پتھر) کا استعمال بھی درست اور جائز ہے۔

④، ⑤ ناخن کاٹنا اور مونچھیں چھوٹی کرانا یا ان کا اِحفاء (یعنی صفا چٹ کرنا)

ہر ایک کے بارے میں صحیح روایات وارد ہیں، چنانچہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رویت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی کو کثیر اور بھاری کرو اور مونچھوں کا احفاء کرو۔''[1] یہ متفق علیہ ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: «خَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: الاسْتِحْدَادُ وَالْخِتَانُ وقَصُّ الشَّارِبِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وتَقْلِيمُ الْأَظَافِرِ» ''پانچ امور فطرت ہیں: زیرِ ناف بالوں کی صفائی، ختنہ، مونچھیں ہلکی کرنا، بغل کے بال اکھیڑنا اور ناخن کاٹنا۔'' اسے جماعت نے نقل کیا، دونوں طریقوں (یعنی ہلکی کرنا اور صفا چٹ کر دینا) میں سے کوئی ایک ہی متعین نہیں بلکہ دونوں سنت ہیں، مقصود یہ ہے کہ مونچھ طویل نہ ہو، اس طور پر کہ کھانے پینے میں اس کے بال لگیں اور یہ کہ میل جمع ہو، سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ لَمْ يَأْخُذْ شَارِبَهُ فَلَيْسَ مِنَّا» ''جس نے اپنی مونچھیں نہ ترشوائیں وہ ہم سے نہیں۔''[2] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ صحیح ہے، ہفتہ میں ایک دفعہ یہ سب کام کرنا مستحب ہیں، بہر حال چالیس ایام تک ان کے جسم میں باقی رہنے کی رخصت ہے، اس سے زیادہ چھوڑے رکھنے میں کوئی عذر نہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھیں چھوٹی کرانے، ناخن کاٹنے، بغل کے بال اکھیڑنے اور زیرِ ناف بال صاف کرنے کے لیے ہمارے لیے چالیس دن کا وقت مقرر کیا کہ اس کے بعد ان کا ترک نہ کیا جائے،[3] اسے احمد و ابو داود وغیرہما نے نقل کیا۔

⑥ داڑھی کا اِعفاء اور اسے چھوڑے رکھنا

اس طرح کہ یہ بھاری اور کثیر ہو تا کہ یہ وقار کا ایک مظہر لگے، اتنی چھوٹی نہ کی جائے کہ منڈوانے کے قریب قریب لگے اور اس حد تک چھوڑی بھی نہ (لمبی کی) جائے کہ بھدی لگے (بقول محشی یہ ثابت نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ریش مبارک کی کتر بیونت کرائی ہو، نہ طول سے اور نہ عرض سے اور جس روایت میں وارد ہے کہ آپ اپنی داڑھی کی تراش خراش کر لیتے تھے وہ ضعیف ہے کسی طور پر ثابت نہیں، دیکھیے البانی کی ''الضعیفۃ'' بلکہ آپ کی صفت سے ہے کہ بھاری بھر کم داڑھی تھی، صحابہ کرام

---

① صحيح البخاری: ٥٨٩٢؛ صحيح مسلم: ٢٥٩. ② صحيح، سنن ترمذی: ٢٧٦١؛ سنن نسائی: ١٣.
③ صحيح مسلم: ٢٥٨؛ سنن أبی داود: ٤٢٠٠.

کو آپ کی قراءت کے بارے میں آپ کی ڈاڑھی مبارک کی حرکت سے پتہ چلتا تھا۔) (داڑھی کو کناروں سے ذرا ہموار کرنا مامور بہ اعفاء اور اس کے بھاری بھر کم ہونے کے منافی نہیں، میرے نانا حافظ عبداللہ محدث بڈھیمالوی رحمہ اللہ بھی اس کے قائل تھے۔ مترجم)

بلکہ توسط احسن ہے کہ ہر چیز میں اعتدال و توسط ہی بہتر ہے، پھر یہ رجولت (یعنی مردانگی) کی تمامیت اور فحولت (یعنی مردانہ شان) کے کمال سے ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مشرکوں کی مخالفت کرو اور داڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کا احفاء کرو۔''① متفق علیہ، بخاری نے یہ اضافہ نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما حج یا عمرہ کے موقع پر داڑھی کو اپنی مٹھی میں لیتے تو جو زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے تھے۔

⑦ بالوں کا اکرام (یعنی خیال رکھنا) کہ ان پر تیل لگایا اور کنگھی کی جائے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: «مَنْ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ» ''جس کے بال ہیں وہ ان کا اکرام کرے۔''② اسے ابو داود نے نقل کیا، عطاء بن یسار رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایک پراگندہ سر اور داڑھی والا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے اشارہ سے اصلاحِ حال کی توجہ دلائی، اس نے ایسا ہی کیا، پھر آیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا اب بہتر نہیں اس امر سے کہ بال بکھرے ہوں گویا شیطان لگو۔''③ اسے مالک نے تخریج کیا۔ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے بال نہایت گھنے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں عرض کی تو آپ نے تلقین فرمائی کہ ''ان کا خیال رکھو اور روزانہ کنگھی کرو۔''④ اسے نسائی نے نقل کیا، امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں اس کے یہ الفاظ ذکر کیے کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! میرے جمہ بال ہیں (یعنی کندھوں تک لمبے) کیا روزانہ کنگھی کروں؟ فرمایا: ''ہاں اور ان کا اکرام کرو۔''⑤ تو سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بعد ازاں دن میں دو مرتبہ تیل لگانے لگے، سر کے بال بالکل منڈوا لینا (یعنی ٹنڈ کرانا) مباح ہے، اسی طرح انہیں بڑھا لینا بھی بشرطیکہ (صفائی ستھرائی کا) خیال رکھا جائے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: «اِحْلِقُوْا كُلَّهُ أَوْ ذَرُوْا كُلَّهُ» ''یا تو پورا سر صاف کراؤ یا پورے کو چھوڑ دو۔''⑥ اسے احمد، مسلم، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، سر کے کچھ حصے کے بال منڈوا لینا اور کچھ حصہ میں موجود رکھنا تو یہ مکروہِ تنزیہی ہے (لیکن کانوں کے پاس اور سر کے اگلے حصہ کی نسبت پیچھے سے بال ذرا چھوٹے ہونا اس میں داخل نہیں کیونکہ وہ فطری طور سے ہی ایسے ہوتے ہیں) کیونکہ نافع کی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع سے منع کیا، نافع رحمہ اللہ سے کہا گیا: قزع کیا ہے؟ کہا کہ بچے کے سر کا کچھ حصے منڈوا لیا جائے اور کچھ حصہ کے بال چھوڑ دیں۔⑦ متفق علیہ (لیکن آگے سے کچھ بڑے اور پیچھے یا کناروں سے نسبتًہ چھوٹے ہونا جسے عام لوگ بودی کہتے ہیں، اس زمرہ میں نہیں آتا)۔

⑧ سفید بال نوچے نہ جائیں

داڑھی میں یا سر میں، مرد و عورت دونوں کے لیے ہے کیونکہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت میں ہے کہ

---

① صحيح البخاري: ٥٨٩٢؛ صحيح مسلم: ٢٥٩. ② حسن، صحيح، سنن أبي داود: ٤١٦٣. ③ ضعيف، المؤطا امام مالك: ٢/ ٩٤٩. ④ سنن نسائي: ٥٢٣٧. ⑤ ضعيف، المؤطا امام مالك: ٢/ ٩٤٩. ⑥ سنن أبي داود: ٤١٩٥؛ سنن نسائي: ٥٠٦٣. ⑦ صحيح البخاري: ٥٩٢٠؛ صحيح مسلم: ٢١٢٠.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَنْتِفِ الشَّيْبَ فَإِنَّهُ نُوْرُ الْمُسْلِمِ» ''سفید بال مت نوچو کیونکہ یہ مسلمان کا نور ہیں۔'' آگے فرمایا: ''جس مسلمان پر اسلام میں بڑھاپا طاری ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے لیے نیکی لکھ لیتا ہے، ایک درجہ رفعت عطا کرتا ہے اور ایک خطا معاف کر دیتا ہے۔''[1] (شاید مراد ہو کہ ہر سفید بال کے بدلے) اسے احمد، ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم اس امر کو برا گردانتے تھے کہ داڑھی یا سر سے سفید بال نوچا جائے،[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

⑨ سفید بالوں پر مہندی اور سرخ یا زرد، کسی اور رنگ کا خضاب لگانا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہودی اور عیسائی خضاب نہیں لگاتے تم ان کی مخالفت کرو۔''[3] اسے سب اہلِ صحاح نے نقل کیا، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَحْسَنَ مَا غَيَّرْتُمْ بِهِ هٰذَا الشَّيْبَ الْحِنَّاءُ وَالْكَتَمُ» ''سب سے احسن خضاب وہ ہے جس کے ساتھ تم اپنا بڑھاپا تبدیل کرو وہ مہندی اور کتم ہے۔''[4] کتم ایک بوٹی ہے جسے لگانے سے سرخی مائل سیاہ رنگ چڑھتا ہے، اسے خمسہ نے نقل کیا، خضاب کی کراہت میں بھی کچھ روایات وارد ہیں، بظاہر یہ معاملہ عمر، عرف اور رواج کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوجاتا ہے، بعض صحابہ سے مروی ہے کہ خضاب کا ترک افضل ہے جبکہ بعض صحابہ سے اس کا استعمال افضل ہونا منقول ہے، اسی طرح بعض صحابہ زرد، بعض مہندی، بعض کتم اور بعض زعفران کا خضاب لگاتے تھے، ان میں سے ایک جماعت نے سیاہ خضاب بھی استعمال کیا، ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں زہری سے نقل کیا: کہتے ہیں کہ ہم سیاہ خضاب تب تک استعمال کرتے جب تک چہرہ جوان ہوتا، لیکن جب بڑھاپے کے آثار طاری ہو جاتے اور دانت گرنے لگتے تو سیاہ خضاب لگانا ترک کر دیتے تھے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد محترم سیدنا ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے روز نبی کریم ﷺ کے پاس لایا گیا گویا ان کا سر ثغامہ ہو (یہ سفید رنگ کا ایک پودا ہے) تو آپ نے فرمایا: «اِذْهَبُوْا بِهِ إِلٰى بَعْضِ نِسَائِهِ فَلْيُغَيِّرْهُ بِشَيْئٍ وَجَنِّبُوْهُ السَّوَادَ» ''ان کی کسی رشتہ دار خاتون کے پاس لے جاؤ جو انہیں خضاب لگائے البتہ سیاہ خضاب سے بچنا۔''[5] اسے سوائے بخاری اور ترمذی کے سب نے نقل کیا تو یہ واقعہ عین ہے (یعنی ایک معین آدمی کا واقعہ جس کی کوئی خاص وجہ ہوسکتی ہے جو وہ یہ کہ وہ نہایت بوڑھے آدمی تھے، تب تقریباً اسی برس سے زائد ان کی عمر تھی تو اس عمر میں سیاہ خضاب مروت کے خلاف ہے) اور اس طرح کے واقعات میں سب اعیان کے لیے عموم نہیں اور پھر سیدنا ابوقحافہ رضی اللہ عنہ جس عمر میں تھے (اس میں تو سیاہ خضاب لگانا جچتا ہی نہیں) تو ان کے لیے یہی حکم مناسب تھا۔

---

① حسن صحیح، سنن أبی داود: ۴۲۰۲؛ سنن ترمذی: ۲۸۲۱. ② صحیح مسلم: ۲۳۴۱. ③ صحیح البخاری: ۲۸۹۹؛ صحیح مسلم: ۲۱۰۳. ④ سنن أبی داود: ۴۲۰۵؛ سنن أبی داود: ۴۲۰۴. ⑤ صحیح مسلم: ۲۱۰۲؛ سنن أبی داود: ۴۲۰۴.

⑩ خوشبو کا استعمال

جس سے نفس کو خوشی و مسرت ملے اور شرح صدر ہو اور بدن میں چستی، نشاط اور قوت آئے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا النِّسَاءُ وَالطِّيْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ»

''دنیا کی اشیا میں سے مجھے خواتین (بطور والدہ، بہن، بیٹی اور بیوی) اور خوشبو پسند ہے جبکہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''[1] اسے احمد اور نسائی نے تخریج کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے خوشبو دی جائے وہ رد نہ کرے کیونکہ اسے لگانے کا کوئی بوجھ نہیں جبکہ خوشبو آئے گی۔''[2] اسے مسلم، نسائی اور ابو داود نے نقل کیا، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کستوری کے بارے میں فرمایا: ''یہ سب سے عمدہ خوشبو ہے۔''[3] اسے سوائے بخاری اور ابن ماجہ کے سب اصحاب صحاح نے نقل کیا، نافع رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اگر بتی بغیر کسی دوسری خوشبو کے ساتھ خلط کیے مہکایا کرتے تھے اور ساتھ میں کچھ کافور ڈال دیتے اور کہتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ماحول کو مہکایا کرتے تھے،[4] اسے مسلم اور نسائی نے تخریج کیا۔

وضو کے مسائل

یہ ایک معروف طہارت ہے جس میں پانی استعمال ہوتا ہے، اس کا تعلق ہاتھوں، چہرے، سر اور پاؤں سے ہے، اس کے درج ذیل مباحث ہیں:

① وضو کی مشروعیت کے دلائل

وضو کی مشروعیت تین ادلہ کے ساتھ ثابت ہے۔

اول: قرآن سے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدة:٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کا قصد کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو، سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔''

---

① صحيح، سنن نسائی: ٣٩٤٩؛ مسند أحمد: ٣/ ١٢٨. ② صحيح مسلم: ٢٢٥٢؛ سنن أبی داود: ٤١٧٢؛ سنن نسائی: ٣/ ١٢٨. ③ صحيح مسلم: ٢٢٥٢؛ سنن ترمذی: ٩٩١. ④ صحيح مسلم: ٢٢٥٤؛ سنن نسائی: ٥١٥٠.

دوم: حدیث سے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ بے وضو کی نماز قبول نہیں کرتا۔''[1] اسے شیخین، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا۔

سوم: اجماع سے، اہل اسلام کا عہدِ نبوی سے لے کر دورِ حاضر تک وضو کی مشروعیت پر اجماع ہے تو یہ ایک معروف دینی امر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

۲ وضو کی فضیلت

وضو کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہیں جن میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے: سیدنا عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ وضو کرتے ہوئے جب کلی کرتا ہے تو اس کے منہ سے خطائیں نکل جاتی ہیں، جب ناک جھاڑے تو ناک کی خطائیں ختم ہوگئیں، اسی طرح چہرے سے حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی، پھر جب بازو دھوئے تو ان کی خطائیں حتیٰ کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی، پھر جب سر کا مسح کرے تو سر سے حتی کہ کانوں سے بھی، پھر جب پاؤں دھوتا ہے تو اس کی خطائیں نکل جاتی ہیں حتیٰ کہ ناخنوں تک سے، بعد ازاں مسجد کی طرف جانا اور نماز پڑھنا ایک امرِ زائد ہوا۔''[2] (یعنی گناہ تو اب باقی نہ رہے تھے، صغیرہ گناہ مراد ہیں، تو چلنا نماز کی ادائیگی، ثواب کی بڑھوتی اور فرض کی ادائیگی کے لیے ہوا) اسے مالک، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدمی میں کوئی ایسی نیک خصلت ہوتی ہے کہ اللہ اس کی وجہ سے اس کا سارا عمل نیک بنا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ آدمی کے نماز کی غرض سے وضو کرنے کو اس کے سب گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے اور نماز گویا ایک امرِ زائد بن جاتی ہے۔[3] اسے ابویعلیٰ، بزار اور اوسط میں طبرانی نے تخریج کیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمہیں ایسا عمل نہ بتلاؤں جس کی وجہ سے اللہ گناہ مٹا ڈالتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے؟'' لوگوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''مَکارِہ (ناسازگار حالات مثلاً ٹھنڈک وغیرہ) کے باوجود کامل وضو کرنا، کثیر قدم اٹھا کر مسجد کو جانا اور ایک کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا تو یہ ہے رباط (یعنی مورچہ زن ہونا)'' تین دفعہ یہی فرمایا۔[4] اسے مالک، مسلم، ترمذی اور نسائی نے نقل کیا۔

انہی سے روایت ہے کہ آپ ایک قبرستان میں آئے تو فرمایا: ''اے اس گھر کے مومنو! تمہیں سلام ہو، ہم بھی عنقریب تم سے آن ملنے والے ہیں، کاش! ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ سکتے۔'' صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ فرمایا: ''تم تو میرے صحابہ ہو! ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئے۔'' عرض کی: آپ انہیں کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''دیکھو اگر کسی کا پانچ کلیان گھوڑا (یعنی جس کے پانچ اعضا سفید ہوں) سرتاپا سیاہ رنگ کے گھوڑوں میں موجود ہوا کیا وہ اسے پہچان نہ پائے گا؟'' عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: ''میری امت وضو کی وجہ سے

---

[1] صحيح البخاري: ٦٩٥٤؛ صحيح مسلم: ٢٢٥. [2] صحيح، سنن نسائي: ١٠٣؛ سنن ابن ماجه: ٢٨٢.
[3] منكر، مسند ابي يعلى: ٣٢٩٧؛ مسند البزار: ٢٥٣. [4] صحيح مسلم: ٢٥١؛ سنن ترمذي: ٥١.

غراً محجّلین (یعنی روشن وآراستہ اعضا والی بن کر) آئے گی اور میں حوض پر ان کا منتظر ہوں گا اور خبر دار رہنا کہ میرے حوض سے کئی اس طرح ہٹا دیے جائیں گے جیسے کسی کا گم شدہ اونٹ (اپنے اونٹوں سے) دور کیا جاتا ہے، میں پکاروں گا کہ آؤ، لیکن کہا جائے گا: یہ وہ ہیں جنہوں نے دین بدل دیا تھا، تو میں کہوں گا: دوری ہو دوری ہو۔‘‘[1] اسے مسلم نے تخریج کیا۔

۴ وضو کے فرائض

اس کے کچھ فرائض وارکان ہیں جن سے اس کا وجود تشکیل پاتا ہے، ان میں سے کوئی فرض اگر رہ جائے تو شرعاً وضو نہیں ہوگا، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱ نیت

اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ کی رضا کی طلب اور اس کے حکم کی بجا آوری میں کسی فعل کے کرنے کا ارادہ کرنا، یہ خالص دل کا عمل ہے زبان کا اس میں کوئی دخل نہیں اور بول کر نیت کرنا غیر مشروع ہے، اس کی فرضیت کی دلیل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»

’’اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔‘‘[2] اسے جماعت نے تخریج کیا۔

۲ چہرے کو (کم از کم) ایک مرتبہ دھونا

یعنی اس پر پانی بہانا کیونکہ غسل کا معنی اِسالت ہے (یعنی بہانا) چہرے کی حد پیشانی کے اوپر والے کنارے سے لے کر طول میں ٹھوڑی اور چہرے کے نچلے کناروں تک اور عرض میں ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک ہے۔

۳ کہنیوں تک بازو دھونا

آپ سے وارد نہیں کہ کہنیوں کا دھونا ترک کیا ہو۔

۴ سر کا مسح

مسح کا معنی تر یا ہٹ پہنچانا ہے، یہ رو بعمل نہ ہوگا مگر مسح کرنے والے عضو (یعنی ہاتھ) کو ممسوح عضو پر پھیرنے کے ساتھ تو ہاتھ یا انگلی کا سرا کسی اور عضو پر صرف رکھ دینا مسح نہ کہلائے گا، پھر اس آیت: ﴿وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ﴾ (المائدة:٦) کا ظاہر پورے سر کا مسح واجب ہونے کو مقتضی نہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سر کے بعض حصے کا مسح کرنے سے حکم پورا ہوجائے گا، اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طریقے محفوظ ہیں:

---

[1] صحيح مسلم: ٢٤٩. [2] صحيح البخاري: ١؛ صحيح مسلم: ١٩٠٧.

(الف) پورے سر کا مسح

سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دونوں ہاتھوں کے ساتھ سر مبارک کا مسح کیا، انہیں سامنے سے پیچھے کی طرف لے کر گئے، پھر واپس سامنے لائے۔[1] اسے سب مصنفینِ صحاح نے نقل کیا۔

(ب) اکیلے عمامہ پر مسح

سیدنا عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے عمامہ اور موزوں پر مسح کیا،[2] اسے احمد، بخاری اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «اِمْسَحُوْا عَلَى الْخُفَّيْنِ وَالْخِمَارِ» ''موزوں اور خمار پر مسح کر سکتے ہو۔''[3] (خمار وہ کپڑا ہے جسے عمامہ کی مثل سر پر رکھا جائے) اسے احمد نے نقل کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مَنْ لَمْ يُطَهِّرْهُ الْمَسْحُ عَلَى الْعِمَامَةِ لَاطَهَّرَهُ اللّٰهُ'' جو عمامہ پر مسح کو طہارت نہ سمجھے اسے اللہ پاک نہ کرے۔[4] اس ضمن میں بخاری اور مسلم وغیرہما کے ہاں کئی احادیث وارد ہیں، کثیر اہل علم سے اسی پر عمل منقول ہے۔

(ج) سامنے کے حصے کے بالوں پر اور باقی کا مسح عمامہ پر کر لینا

چنانچہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو سر کے اگلے حصے پر مسح کیا اور عمامہ اور موزوں پر،[5] اسے مسلم نے تخریج کیا، نبی کریم ﷺ سے مسح کے یہ تین طریقے محفوظ ہیں، آپ سے وارد نہیں کہ صرف سامنے کے حصہ سر کے مسح پر اقتصار کیا ہو، جیسے ظاہرِ آیت کا اقتضا ہے۔ پھر سر کی حد سے نکلے بالوں مثلاً: صرف مینڈھیوں کا مسح کافی نہیں۔

⑤ ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا

یہ نبی کریم ﷺ کے فعل اور قول سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کچھ پیچھے رہ گئے، جب قیام گاہ میں پہنچے جبکہ عصر کا وقت کچھ لیٹ ہو چلا تھا اور ہم وضو کرنے لگے تو پاؤں پر مسح کرنے لگے تو یہ دیکھ کر آپ نے بآواز بلند فرمایا: «وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» دو یا تین مرتبہ کہا ''(خشک) ایڑیوں کے لیے بربادی ہو۔''[6] متفق علیہ، عبد الرحمن بن ابی لیلی رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحابہ کرام کا ایڑیوں سمیت پاؤں دھونے پر اجماع ہے، مذکورہ بالا فرائض مذکورہ آیتِ وضو میں منصوص علیہ (یعنی مذکور) ہیں۔ ﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدة: ٦) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لو۔''

---

① صحيح البخاري: ١٨٥؛ صحيح مسلم: ٢٣٥. ② صحيح البخاري: ٢٠٥؛ ابن ماجه: ٥٦٢. ③ ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ١٢، ١٣. ④ المحلى ابن حزم: ١/ ٣٠٥. ⑤ صحيح مسلم: ٢٤٧. ⑥ صحيح البخاري: ٦٠؛ صحيح مسلم: ٢٤١.

⑥ ترتیب سے اعضائے وضو کا دھونا

کیونکہ آیت میں ان کا ذکر بالترتیب ہوا ہے، پھر پاؤں کا ہاتھوں سے سر کے مسح کے ذکر کے ساتھ جو فرض ہے، فصل کیا اور دونوں کا دھونا فرض ہے اور عرب نظیر کا اس کی نظیر سے قطع نہیں کرتے، مگر کسی فائدہ کی غرض سے ہی جو یہاں ترتیب ہے اور آیت بیانِ واجب کے لیے ذکر کی گئی ہے، اسی طرح اس صحیح حدیث میں آپ کے فرمان: ((اِبْدَءُ وْا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ)) [1] (أَبْدَءُ وْا امر کے صیغے سے شاذ ہے، صحیح أَبْدَءُ یعنی خبر کے صیغے سے ہے) کے عموم کے مدنظر (یعنی آیت میں جس عضو کے ذکر سے اللہ نے ابتدا کی ہے، تم وضو میں اسی سے ابتدا کرو) اور عملاً ان اعضا کے دھونے کا یہی طریقہ معمول بہ ہے، نبی کریم ﷺ سے اسی ترتیب کے ساتھ ہی وضو کرنا منقول ہے اور وضو ایک عبادت ہے اور عبادات کا مدار اتباع پر ہے تو وضوئے نبوی کی منقول کیفیت کی مخالفت روا نہیں۔

④ وضو کی سنتیں

یعنی جو نبی کریم ﷺ کے قول یا فعل سے بغیر لزوم کے ثابت ہیں، ان کے تارک پر انکار نہیں، یہ مندرجہ ذیل ہیں:

① شروع میں بسم اللہ پڑھنا

اس ضمن میں کئی ضعیف احادیث ہیں لیکن مجموع سے تاثر ملتا ہے کہ اس کے لیے اصل ہے، پھر یہ فی نفسہ ایک حسن عمل ہے اور بسم اللہ پڑھنا فی الجملہ مشروع ہے۔

② مسواک کرنا

مسواک کا لفظ اس کام پر بھی اور اس میں استعمال ہونے والی لکڑی پر بھی بولا جاتا ہے، اسے دانتوں پر ملنا مسواک کرنا کہلاتا ہے جس سے وہ صاف ہوتے ہیں، بہترین مسواک اراک (یعنی پیلو کے درخت) کا ہے جو حجاز سے درآمد کیا جاتا ہے (مصر میں) اس کے خواص میں سے ہے کہ مسوڑھے مضبوط کرتا ہے اور دانتوں کے امراض میں رکاوٹ بنتا ہے، اسی طرح مقویِ ہضم اور پیشاب آور ہے، اگرچہ سنت پر عمل ہر اس طریقہ سے ہو جائے گا جس سے دانتوں کی زردی دور ہو اور منہ صاف ہو، مثلاً: برش کرنا مگر یہ مذکورہ فوائد حاصل نہ ہوں گے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں حکم دیتا کہ ہر وضو کے وقت مسواک کریں۔'' [2] اسے مالک، شافعی بیہقی اور حاکم نے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ)) ''مسواک منہ کی صفائی اور اللہ کی رضا کا سبب ہے۔'' [3] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا، مسواک کرنا تمام اوقات میں مستحب ہے،

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ۲۹۶۱؛ مسند أحمد: ۳/ ۳۹۴۔ [2] صحیح البخاری تعلیقاً: کتاب الصوم باب: ۲۷؛ المؤطا امام مالك: ۱/۶۶۔ [3] صحیح، سنن نسائی: ۵۔

لیکن درج ذیل پانچ اوقات میں استحباب زیادہ ہے: وضو کے وقت، نماز کے وقت، تلاوت کے وقت، نیند سے اٹھ کر اور جب منہ کا ذائقہ خراب ہو۔ روزہ دار دن کے اول حصہ میں مسواک کریں یا آخر میں، برابر ہے کیونکہ سیدنا عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے بے شمار دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ روزہ کی حالت میں مسواک کی۔[1] اسے احمد، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا (بخاری نے ویذکر کے لفظ کے ساتھ اسے نقل کیا ہے) مسواک کے بعد اسے دھولینا سنت ہے تا کہ صاف ہو جائے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کر کے مجھے دیتے تا کہ دھولوں تو میں دھونے سے قبل خود کرتی، پھر دھوتی اور آپ کو واپس کر دیتی،[2] اسے ابو داود اور بیہقی نے نقل کیا، جس کے دانت نہیں اس کے لیے مسنون ہے کہ انگلیوں سے صفائی کر لے کیونکہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے کہ عرض کی: یا رسول اللہ! جس کے دانت ختم ہو گئے ہوں کیا وہ بھی مسواک کرے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں!'' عرض کی: کیسے؟ آپ نے فرمایا: ''اپنی انگلی کے ساتھ۔''[3] اسے طبرانی نے نقل کیا۔

③ وضو کے شروع میں تین مرتبہ ہتھیلیاں دھونا

سیدنا اوس بن ابی اوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو تین مرتبہ ہتھیلیاں دھوئیں۔[4] اسے احمد اور نسائی نے تخریج کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیند سے اٹھ کر تین مرتبہ دھوئے بغیر پانی (کے برتن) میں ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ نہیں جانتے کہ نیند میں ہاتھ کہاں کہاں لگتا رہا۔''[5] اسے جماعت نے نقل کیا، البتہ بخاری نے تعداد ذکر نہیں کی۔

④ تین مرتبہ کلی کرنا

سیدنا لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إذا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمِضْ)) ''جب وضو کرو تو کلی کرو۔''[6] اسے ابو داود اور بیہقی نے نقل کیا۔

⑤ ناک میں پانی ڈال کر تین مرتبہ اسے جھاڑنا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب وضو کرو تو ناک میں پانی ڈال کر اسے جھاڑو۔''[7] اسے امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داود رحمہ اللہ نے نقل کیا۔ سنت یہ ہے کہ پانی ڈالنے کا عمل دائیں ہاتھ سے اور اسے جھاڑا بائیں ہاتھ سے جائے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وضو کا پانی منگوایا تو کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور بائیں ہاتھ کے ساتھ ناک جھاڑا، تین مرتبہ یہ کیا پھر کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا یہ طریقہ ہے،[8] اسے احمد اور نسائی نے تخریج کیا، منہ اور ناک میں پانی

---

① ضعیف، سنن أبی داود: ٢٣٦٤؛ سنن ترمذی: ٧٢٥. ② حسن، سنن أبی داود: ٥٢؛ السنن الکبری للبیهقی: ١/٣٩. ③ ضعیف، مجمع الزوائد: ١/ ١٠٠. ④ صحیح، سنن نسائی: ٨٣؛ مسند أحمد: ٤/ ٩، ١٠. ⑤ صحیح البخاری: ١٦٢؛ صحیح مسلم: ٢٧٨. ⑥ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٤. ⑦ صحیح البخاری: ١٦٢؛ صحیح مسلم: ٢٣٧. ⑧ صحیح، سنن نسائی: ١٩١؛ مسند أحمد: ١/ ١٣٩، ١٥٤.

کسی بھی صفت میں پہنچ جانے سے کلی اور استنشاق کا عمل ہو جائے گا، البتہ نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ ثابت یہ ہے کہ ایک ہی چلو سے کلی اور ناک میں پانی ڈالتے تھے، ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ بِثَلَاثِ غُرْفَاتٍ''[1] یعنی کلی اور ناک میں پانی تین چلو سے ڈالتے۔ متفق علیہ، غیر روزہ دار مبالغہ کے ساتھ یہ کرے، سیدنا لقیط رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! وضو کا طریقہ سکھلایے، تو آپ نے فرمایا: ''اچھی طرح وضو کرو، انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک کو اچھی طرح صاف کرو اِلّا یہ کہ روزے سے ہو۔''[2] اسے خمسہ نے نقل کیا، ترمذی نے حکمِ صحت لگایا۔

⑥ داڑھی کا خلال (یعنی بالوں کے اندر تر انگلیاں پھیرنا)

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ داڑھی مبارک میں خلال کرتے تھے،[3] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا اور ترمذی نے صحت کا حکم لگایا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو ایک کف میں پانی لے کر اسے ٹھوڑی مبارک پر ڈالتے اور یوں ڈاڑھی مبارک کا خلال کرتے، پھر فرماتے: ''مجھے میرے رب نے یہی حکم دیا ہے۔''[4] اسے ابوداود، بیہقی اور حاکم نے تخریج کیا ہے۔

⑦ انگلیوں کا خلال

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب وضو کرو تو ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرو۔''[5] اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ چھنگلی کے ساتھ پاؤں مبارک کی انگلیوں کا خلال کر رہے تھے۔[6] اسے سوائے احمد کے خمسہ نے نقل کیا، ایک روایت سے اشارہ ملتا ہے کہ اگر انگشتری یا کڑے وغیرہ پہن رکھے ہوں تو انہیں ہلایا جائے، البتہ یہ روایت صحت کے درجہ تک نہیں پہنچتی، لیکن اس پر عمل کرنا چاہیے، اسباغ (یعنی کامل وضو کرنے) کے عمومی امر میں یہ بھی داخل ہے۔

⑧ تین مرتبہ اعضا دھونا

اسی پر اکثر کا عمل ہے اس سے کم تعداد میں جو وارد ہوا وہ بیانِ جواز کے لیے ہے، عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے وضو کے بارے میں پوچھا تو آپ نے تین تین مرتبہ اعضائے وضو دھو کر اسے بالفعل تعلیم دی اور فرمایا: ''یہ ہے وضو تو جس نے اس سے زائد کیا اس نے برا کیا اور ظلم و تعدی سے کام لیا۔''[7] اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین تین مرتبہ اعضا دھونے کے

---

① صحيح البخاري: ١٨٦؛ صحيح مسلم: ٢٣٥. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٤٢؛ سنن ترمذي: ٧٨٨.
③ صحيح، سنن ترمذي: ٣١؛ سنن ابن ماجه: ٤٣٠. ④ صحيح، سنن أبي داود: ١٤٥؛ السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٥٤. ⑤ حسن، صحيح، سنن ترمذي: ٣٩؛ سنن ابن ماجه: ٤٤٧. ⑥ صحيح، سنن أبي داود: ١٤٨؛ سنن ترمذي: ٤٠؛ سنن ابن ماجه: ٤٤٦. ⑦ صحيح، سنن أبي داود: ١٣٥؛ سنن نسائي: ١٤٠.

ساتھ وضو کیا۔[1] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا، یہ روایت بھی صحیحاً ثابت ہے کہ آپ نے ایک ایک اور دو دو مرتبہ اعضا دھونے کے ساتھ وضو کیا، جہاں تک سر کا مسح ہے تو وہ ایک مرتبہ ہے، یہی اکثر روایات کا اقتضا ہے۔

⑨ تیامُن

یعنی پہلے دائیں ہاتھ، بازو اور پاؤں کو دھونا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو کرنے اور سب کام کرنے میں تیامن کو پسند کرتے تھے،[2] متفق علیہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب لباس پہنو اور وضو کرو تو داہنے اعضا سے ابتدا کرو۔''[3] اسے احمد، ابو داود، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

⑩ دَلک (یعنی پانی ڈالنے کے ساتھ یا اس کے بعد مَلنا)

سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو تہائی مد پانی لایا گیا، آپ نے وضو کیا تو بازوؤں کو مَلا،[4] اسے ابن خزیمہ نے تخریج کیا، انہی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو یوں کیا: یہ کہہ کر دَلک کرنے لگے۔[5] اسے طیالسی، احمد، ابن حبان اور ابو یعلیٰ نے نقل کیا۔

⑪ مُوالات (یعنی پے در پے اعضا دھونا)

اس طور پر کہ درمیان میں انقطاع اور وقفہ نہ ہو کسی اور کام یا مشغولیت کے ساتھ، اتنی مدت کہ عرف میں اسے وضو چھوڑ دینا باور کر دیا جائے، (گویا تھوڑا انقطاع قابلِ قبول ہے، شاید اس حد تک کہ وضو کے دھوئے گئے اعضا خشک نہ ہو جائیں) یہی سنتِ جاریہ اور اسی پر اہلِ اسلام کے سلف و خلف کا عمل ہے۔

⑫ کانوں کا مسح

سنت یہ ہے کہ دونوں انگشتِ شہادت کے ساتھ بیک وقت کانوں کے اندرونی حصے کا اور انگوٹھوں کے ساتھ بیرونی حصے کا اسی سر کے مسح کے پانی (یعنی تریاہٹ) کے ساتھ مسح کیا جائے کیونکہ کان سر کا حصہ ہیں، سیدنا مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ وضو سر کا مسح کیا اور ساتھ ہی کانوں کے اندرون و بیرون کا اور انگلیاں کانوں کے سوراخ میں داخل کیں،[6] اسے ابو داود اور طحاوی نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وضوئے نبوی کی صفت میں مروی ہے کہ آپ نے ایک ہی دفعہ کے پانی کے ساتھ سر اور کانوں کا مسح کیا،[7] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا، ایک روایت میں ہے کہ سر کا مسح کیا اور کانوں کے اندرون کا شہادت کی انگلیوں اور بیرون کا انگوٹھوں کے ساتھ۔[8]

---

① صحيح مسلم:٢٢٦؛ سنن أبی داود: ١١٠. ② صحيح البخاری: ٤٢٦؛ صحيح مسلم: ٢٦٨. ③ صحيح، سنن أبی داود: ٤١٤١؛ سنن ترمذی: ١٧٦٦. ④ صحيح، صحيح ابن خزيمه: ١١٨؛ المستدرك للحاكم: ١/ ١٦١. ⑤ صحيح، مسند أحمد: ١٦٤٤١؛ شعیب ارناؤط نے صحیح قرار دیا ہے۔ ⑥ ضعيف جدًا سنن أبی داود: ١٢٣؛ شرح معانی الآثار: ١/ ٣٢. ⑦ سنن أبی داود: ١٣٣؛ سنن ترمذی: ٣٦. ⑧ صحيح، سنن أبی داود: ١٣٥.

⑬ غرۃ وتحجیل کی اطالت (یعنی آگے تک یہ اعضا اور مکمل طور پر دھونا)

غرۃ کی اطالت یہ ہے کہ چہرہ دھونے کی حد سے زائد سر کا اگلا حصہ بھی دھو لے جبکہ تحجیل کی اطالت یوں ہوگی کہ کہنیوں اور ٹخنوں سے اوپر بھی (کچھ حصہ) دھوئے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''روزِ قیامت میری امت وضو کرتے رہنے کی وجہ سے پانچ کلیاں آئے گی۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بیان کر کے حاضرین سے کہا: جو تم میں سے غرۃ کی اطالت کر سکے تو کرے۔[1] اسے احمد اور شیخین نے تخریج کیا، ابوزرعہ رحمہ اللہ راوی ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی منگوایا تو وضو کرتے ہوئے جب بازو دھونے لگے تو کہنیوں سے آگے تک اور جب پاؤں دھوئے تو ٹخنوں سے آگے تک پانی لے گئے پنڈلی میں، میں نے کہا: یہ کیا؟ کہا: یہ اس آراستگی کی انتہائی حد ہے،[2] اسے احمد نے نقل کیا اور اس کی اسناد شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

⑭ پانی استعمال کرنے میں میانہ روی سے کام لینا چاہیے چاہے دریا کے کنارے پر ہو

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع (ایک پیمانہ جو قدیم ساڑھے تین سیر کے مساوی تھا) یا اس سے ایک مد زائد پانی کے ساتھ غسل اور ایک مد پانی کے ساتھ وضو کرتے تھے (صاع میں چار مد ہیں)[3] متفق علیہ، عبید اللہ بن ابو یزید رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: وضو کے لیے مجھے کتنا پانی کافی ہوگا؟ کہا: ایک مد، پھر کہا: اور غسل کے لیے؟ کہا: ایک صاع تو وہ بولا: مجھے یہ کافی نہ ہوگا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیری ماں نہ رہے! اتنا پانی اس ذات کو کافی ہوتا تھا جو تجھ سے بہتر ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،[4] اسے احمد، بزار اور کبیر میں طبرانی نے نقل کیا اور اس کی سند ثقہ راویوں پر مشتمل ہے، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے ہوا جو وضو کر رہے تھے، تو آپ نے فرمایا: ''اے سعد! یہ کیسا اسراف ہے؟ وہ بولے: کیا پانی میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ فرمایا: ''ہاں! اگر چہ دریا کے کنارے بیٹھے ہو۔''[5] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا اور اس کی سند میں ضعف ہے، پانی میں اسراف یہ ہے کہ بغیر کسی شرعی فائدہ کے اس کا استعمال کیا جائے، بایں طور کہ تین مرتبہ سے زائد اعضائے وضو کو دھویا جائے (یا جیسے ہماری مساجد میں نمازیوں کا اور من حیث المجموع پوری قوم کا معمول ہے) عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کا طریقہ پوچھا تو آپ نے تین تین مرتبہ اعضا دھو کر اسے وضو کر کے دکھلایا اور فرمایا: ''یہ ہے وضوء اور جس نے اس سے زائد کیا اس نے برا کیا اور ظلم و تعدی سے کام لیا۔''[6] اسے احمد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے صحیح اسانید کے ساتھ تخریج کیا، سیدنا عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''میری امت میں

---

[1] صحيح البخاري: ١٣٦؛ صحيح مسلم: ٣٥. [2] صحيح، مسند أحمد: ٢/ ٢٣٢. [3] صحيح البخاري: ٢٠١؛ صحيح مسلم: ٣٢٥. [4] صحيح، مسند أحمد: ١/ ٢٨٩؛ مسند البزار: ٢٥٥. [5] ضعيف، سنن ابن ماجه: ٤٢٥؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٢١. [6] صحيح، سنن أبي داود: ١٣٥؛ سنن نسائي: ١٤٠؛ ابن ماجه: ٤٤٢.

ایک قوم ہوگی جو وضو کرنے میں اور دعا کرنے میں حد سے تجاوز کرے گی۔''[1] (ماشاء اللہ یہ دونوں صفتیں بدرجہ اتم اہل پاکستان میں موجود ہیں، وضو میں حد سے تجاوز تو عام مشاہدہ کی بات ہے، کسی بھی مسجد میں جا کر اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ رہی دعا کی بات تو اکثر مساجد میں ہر نماز کے وقت امام صاحب کا دو دو مرتبہ دعا کروانا ملاحظہ فرمالیں) اسے احمد، ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہل علم نے اس امر کو مکروہ قرار دیا ہے کہ وضو میں فعلِ نبوی سے تجاوز کیا جائے۔

⑮ وضو کے دوران میں کوئی دعا مانگنا یا کوئی کلمات پڑھنا

نبی کریم ﷺ سے اس ضمن میں کوئی دعائیں وغیرہ ثابت نہیں ماسوائے ایک سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے، جس میں ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس وضو کا پانی لایا تو وضو کرتے ہوئے میں نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: ((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ)) ''اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما، میرے گھر کو کشادہ اور میرے رزق میں برکت فرما۔'' عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے یہ یہ کہا؟ فرمایا: ((وھَلْ تَرَكْنَ مِنْ شَيْئٍ)) ''ان تین دعاؤں میں سب کچھ آ گیا ہے۔''[2] اسے نسائی اور ابن سنی نے بسند صحیح نقل کیا، لیکن نسائی نے اس پر یہ عنوان باندھا ہے: ''باب مايَقُوْلُ بَعْدَ الفَرَاغِ مِنَ الْوُضُوْءِ'' یعنی وضو سے فارغ ہو کر جو دعا پڑھنی ہے۔ جبکہ ابن سنی نے اس پر وضو کے دوران کا عنوان قائم کیا، بقول نووی رحمہ اللہ دونوں باتیں محتمل ہیں۔

⑯ وضو کے بعد کیا پڑھنا ہے؟

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی ایسا نہیں جو اچھے طریقے سے وضو کرے، پھر کہے: ((أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔''[3] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے وضو کیا، پھر کہا: ((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ)) اسے ایک کاغذ میں لکھ کر مہر لگا دی جاتی ہے جو قیامت تک نہ توڑی جائے گی۔'' اسے طبرانی نے نقل کیا، اوسط میں اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں، نسائی نے بھی اسے تخریج کیا، ان کی روایت کے آخر میں ہے: ''مہر لگا کر عرش کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے اور قیامت تک اس مہر کو توڑا نہ جائے گا۔''[4] انہوں نے اس کا موقوف ہونا درست قرار دیا، جہاں تک یہ (معروف) دعا ہے: ((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))[5]

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٩٦؛ ابن ماجه: ٣٨٦٤. [2] ضعيف، عمل اليوم والليلة للنسائي: ٨٠؛ عمل اليوم والليلة لابن السني: ٢٨. [3] صحيح مسلم: ٢٣٤. [4] صحيح، المعجم الاوسط للطبراني: ١٤٧٨؛ عمل اليوم والليلة للنسائي: ٨١. [5] صحيح، سنن ترمذي: ٥٥.

تو یہ ترمذی نے نقل کی ہے اور کہا: اس کی اسناد میں اضطراب ہے اور اس بارے میں کوئی چیز واضح صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔

⑰ وضو کر کے دو نفل ادا کرنا (یعنی تحیۃ الوضو)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے بلال! مجھے اسلام میں اپنا سب سے امید بھرا عمل بتلاؤ کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے آگے تمہارے چلنے کی دھمک سنی ہے۔'' انہوں نے عرض کی: مجھے اپنا یہ عمل بہت امید والا لگتا ہے کہ جب بھی وضو کرتا ہوں تو اس وضو کے بعد جتنی اللہ توفیق دے نوافل ضرور پڑھتا ہوں۔[1] متفق علیہ۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اچھی طرح وضو کرے، پھر خشوع وخضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ دو رکعت پڑھے تو جنت اس کے لیے واجب ہو جائے گی۔''[2] اسے مسلم، ابو داود، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے تخریج کیا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حمران رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب کیا، میں لایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے پہلے برتن کو جھکا کر دایاں ہاتھ تین مرتبہ دھویا، پھر دایاں ہاتھ اس میں ڈال کر پانی لے کر تین تین مرتبہ اعضائے وضو دھوتے رہے، پھر کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے، آپ نے وضو کے بعد فرمایا: ''جس نے میری طرح وضو کیا، پھر پوری توجہ سے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کے سابقہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔''[3] اسے بخاری اور مسلم وغیرہما نے نقل کیا۔

(مؤلفِ کتاب لکھتے ہیں:) ہم پلکوں، چہرے کی سلوٹوں، انگشتری کو حرکت دینے اور گردن کے مسح کے بارے میں بات نہیں کر رہے، کیونکہ ان کی بابت مروی روایات صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتیں، اگرچہ اکمال نظافت کے لیے انہیں بھی بیان کر دیا جائے۔

⑤ وضو کے مکروہات

وضو کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مندرجہ بالا وضو کی سنن میں سے کچھ ترک نہ کرے، تاکہ اس کے کامل ثواب کا حقدار بن سکے، کیونکہ کسی مکروہ امر کا ارتکاب ثواب سے محرومی کا موجب بن سکتا ہے اور کراہت کا تحقق ترکِ سنت کے ساتھ ہوتا ہے۔

⑥ نواقضِ وضو

یعنی جن سے وضو ٹوٹ جائے گا وہ درج ذیل ہیں:

① ہر جو سبیلین یعنی اگلی اور پچھلی شرمگاہ سے خارج ہو

وہ درج ذیل اشیا ہیں:

---

① صحيح البخاري: ١١٤٩؛ صحيح مسلم: ٢٤٥٨. ② صحيح مسلم: ٢٣٤؛ سنن أبي داود: ٩٠٦.
③ صحيح البخاري: ١٥٩؛ صحيح مسلم: ٢٢٦.

(الف، ب) بول و براز (یعنی پیشاب اور پاخانہ) کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَآئِطِ ﴾ (المائدۃ:٦)
یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے تو مراد بول و براز ہے۔

(ج) دبر سے خارج ہونے والی ہوا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ أَحَدِكُمْ إِذَا أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ» ''جو حدث کرے اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ وضو کر لے۔'' حضر موت کے ایک شخص نے کہا: اے ابوہریرہ! حدث کیا ہے؟ کہا: ''فُسَاءٌ أو ضُرَاطٌ'' یعنی آواز یا بغیر آواز کے ہوا کا خارج ہونا۔[1] متفق علیہ، انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر معاملہ مشتبہ ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو مسجد سے نہ نکلے (یعنی یقین نہ ہونے کی صورت میں اس کا وضو قائم ہے) حتی کہ آواز سنے یا بو محسوس کرے۔''[2] اسے مسلم نے نقل کیا، سننا یا بو کا پانا اس ضمن میں شرط نہیں بلکہ مراد اس بات کا تیقن ہے کہ کوئی چیز خارج ہوئی ہے؟

(د، ہ، و) منی، مذی اور ودی

ان کے خروج کی صورت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے، نبی کریم ﷺ نے مذی کی بابت فرمایا تھا کہ ''اس میں وضو ہے۔''[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ منی موجبِ غسل ہے (لہٰذا وضو بھی اس میں شامل ہوا) مذی اور ودی کے بارے میں فرمایا تھا: «اِغْسِلْ ذَكَرَكَ أَوْ مَذَاكِيْرَكَ وَتَوَضَّأْ وُضُوْئَكَ لِلصَّلَاةِ» ''زیرِ ناف جگہ دھو کر نماز والا وضو کر لو۔''[4] اسے بیہقی نے سنن میں نقل کیا۔

② گہری نیند

اس طور پر کہ کوئی ادراک باقی نہ رہے اور اس طرح کہ اپنے سہارے پر قائم نہ رہ سکے (بلکہ زمین پر یا کسی چیز کی ٹیک لگانے پر مجبور ہو جائے) سیدنا صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سفر کے دوران میں ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اپنے موزے پورے تین دن نہ اتاریں اِلّا یہ کہ جنابت ہو جائے، بول و براز یا سو کر بعد ازاں اتارے بغیر ہی وضو کریں۔[5] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے تخریج کیا، ترمذی نے حکمِ صحت لگایا، اگر اس حالت میں سویا ہے کہ بغیر سہارے کے زمین پر جما بیٹھا رہا تب وضو نہ ٹوٹے گا، اسی پر یہ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ محمول ہے کہ صحابہ کرام کے عشاء کی جماعت کا انتظار کرتے ہوئے (نیند سے بوجھل ہو کر) سر جھک جاتے، پھر بغیر نیا وضو کیے نماز ادا کرتے تھے۔[6] اسے شافعی، مسلم، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، امام ترمذی رحمہ اللہ کے شعبہ کے طریق سے الفاظ ہیں: میں نے دیکھا کہ کئی اصحابِ نبی ﷺ کو جماعت

---

① صحيح البخاري: ١٣٥؛ صحيح مسلم: ٦٤٩. ② صحيح مسلم: ٣٦٢. ③ صحيح البخاري: ١٣٢؛ صحيح مسلم: ٣٠٣/١٨. ④ موقوف صحيح، السنن الكبرى للبيهقي: ٨٠٠. ⑤ حسن، سنن ترمذي: ٩٦؛ سنن نسائي: ١٢٧. ⑥ صحيح مسلم: ٣٧٦؛ سنن أبي داود: ٢٠٠.

کھڑی ہونے کے وقت جگایا جاتا تھا اور کئی ایک کے تو میں خراٹے بھی سنتا، پھر وہ اٹھ کر نماز پڑھتے اور نیا وضو نہ کرتے، امام ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارے نزدیک یہ تب ہے جب بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ جائے۔

③ عقل زائل ہونے سے

چاہے یہ جنون طاری ہونے، غشی یا نشہ، کوئی دوا لینے کا نتیجہ ہو اور چاہے قلیل اثر ہو یا کثیر اور چاہے زمین پر جم کر بیٹھا ہوا ہو یا نہیں، کیونکہ ان وجوہات کی بنا پر ذہول (یعنی غافل ہونا) نیند سے ابلغ واشد ہے، اسی پر علماء کی رائے متفق ہے۔

④ بغیر حائل کے شرمگاہ کو چھولینا

کیونکہ سیدہ بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے ذکر کو چھولے وہ (نیا) وضو کیے بغیر نماز نہ پڑھے۔''[1] اسے خمسہ، مالک، شافعی اور احمد وغیرہم نے تخریج کیا، ابوداود لکھتے ہیں: میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: کیا حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا صحیح نہیں؟ کہا: صحیح ہے، امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت اور نسائی کی سیدہ بسرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: «وَيَتَوَضَّأُ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ» ''ذکر چھونے کی صورت میں وضو ٹوٹ گیا۔'' اس میں اپنے اور غیر کے ذکر کو چھونا شامل ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے ذکر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور درمیان میں کپڑا بھی نہ تھا تو اس پر وضو واجب ہوا۔''[2] اسے احمد، ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح کہا، ابن سکن رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس مسئلہ کی سب سے اجود حدیث ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں حدیث کے یہ الفاظ ہیں: «إِذَا أَفْضَىٰ أَحَدُكُمْ بِيَدِهِ إِلَىٰ ذَكَرِهِ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ شَيْءٌ فَلْيَتَوَضَّأْ» ''جب کوئی بغیر آڑ کے اپنے ذکر چھوئے تو اس کا وضو ٹوٹ گیا۔'' عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ ''جس مرد یا عورت نے اپنی شرمگاہ چھوئی وہ وضو کرے۔''[3] اسے احمد نے نقل کیا، بقول حازمی اس کی سند صحیح ہے، احناف کی رائے ہے کہ ذکر کو چھونا ناقضِ وضو نہیں، ان کا استدلال سیدنا طلق رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے، کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ اگر کوئی اپنے ذکر کو چھولے تو کیا اس کا وضو ٹوٹ گیا؟ فرمایا: ''وہ تمہارے جسم کا حصہ ہے۔''[4] اسے خمسہ نے نقل کیا، امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس پر حکمِ صحت لگایا، بقول امام ابن مدینی رحمہ اللہ یہ سیدہ بسرہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے احسن ہے (ایک رائے ہے کہ اگر شہوت سے چھوا چاہے کپڑے کے اوپر سے یا براہ راست تو وضو ٹوٹ جائے گا وگرنہ نہیں)۔

⑦ وہ امور جن سے وضو نہیں ٹوٹتا

ذیل میں کچھ ایسی باتیں ذکر کی جاتی ہیں جن کی بابت عام خیال ہے کہ یہ وضو کے نواقض ہیں، مگر صحیح دلیل کے عدم ورود کی وجہ سے ایسا نہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

---

[1] صحيح، سنن أبى داود: ١٨١؛ سنن ترمذى: ٨٢. [2] صحيح، مسند أحمد: ٢/ ٣٣٣؛ ابن حبان: ١١١٨.
[3] صحيح، مسند أحمد: ٢/ ٢٢٣. [4] صحيح، سنن أبى داود: ١٨٢؛ سنن ترمذى: ٨٥.

① بغیر آڑ کے عورت کا لمس

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالتِ روزہ میں انہیں بوسہ دیا اور فرمایا: ''بوسہ دینے سے وضو یا روزہ نہیں ٹوٹتا۔''[1] اسے اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے اور بزار نے جید سند کے ساتھ نقل کیا، عبدالحق کہتے ہیں: میں اس کی کسی علت سے واقف نہیں جو اس کے ترک کا موجب ہو، انہی سے مروی ہے کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کو بستر پر نہ پایا، ادھر ادھر ہاتھ پھیرا تو آپ کے پاؤں کی اندرونی جانب لگا اور آپ سجدے کی حالت میں تھے اور یہ دعا پڑھ رہے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سخطِكَ وَأَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰی نَفْسِكَ»

''اے اللہ! میں تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضی سے اور تیری عافیت کے ساتھ تیری پکڑ سے اور تیرے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا، تو ایسے ہی ہے جیسے خود تو نے اپنی ثنا کی ہے۔''[2]

اسے مسلم نے نقل کیا اور ترمذی نے صحیح قرار دیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ آپ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کو بوسہ دیا، پھر بغیر نیا وضو کیے نماز کی طرف نکلے،[3] اسے احمد اور اربعہ نے ثقہ سند کے ساتھ نقل کیا، ان کی ایک روایت میں ہے کہ میں آپ کے سامنے سوئی ہوتی تھی اور میرے پاؤں آپ کی قبلہ گاہ میں ہوتے، آپ جب سجدہ کرنا چاہتے تو ہاتھ سے مجھے ہلا دیتے، ایک طریق میں ہے کہ آپ پاؤں کو ہلا دیتے تو میں پاؤں سمیٹ لیتی،[4] یہ متفق علیہ ہے۔

② معروف راستہ کے سوا کسی اور حصہ جسم سے خون کا نکلنا

چاہے یہ کسی زخم کا نتیجہ ہو یا سینگی لگوانے کا یا نکسیر پھوٹی ہو، کم ہو یا کثیر، حسن (بصری رحمہ اللہ) کہتے ہیں: مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں میں نمازیں ادا کرتے رہے ہیں،[5] اسے بخاری نے نقل کیا، یہ بھی کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پھنسی چھیلی، جس سے خون نکلا مگر نیا وضو نہ کیا، سیدنا ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے خون تھوکا مگر نماز میں جاری رہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے (زخمی ہونے کے بعد) اس حالت میں نماز ادا کی کہ زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، سیدنا عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے تیر لگا مگر نماز جاری رکھی، اسے ابوداود، ابن خزیمہ اور بخاری نے تعلیقاً نقل کیا۔

③ قے: چاہے منہ بھر کر آئے، اس کے ناقضِ وضو ہونے کے بارے میں کوئی قابلِ حجت حدیث موجود نہیں۔

④ اونٹ کا گوشت کھانا:

یہی خلفائے راشدین اور کثیر صحابہ وتابعین کی رائے تھی، البتہ اس کا گوشت تناول کرنے پر وضو کے حکم کے بارے میں

---

① سلسلة الاحاديث ضعيفة: ٩٩٩. ② صحيح مسلم: ٤٨٦؛ سنن ترمذی: ٣٥٦٦. ③ صحيح، سنن أبی داود: ١٧٨. ④ صحيح البخاری: ٣٨٢، صحيح مسلم: ٥١٢. ⑤ صحيح البخاری تعليقاً: كتاب الوضوء، باب: ٣٤، من لم ير الوضوء إلّا من المخرجين.

صحیح حدیث موجود ہے، چنانچہ سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: کیا ہم بکری کا گوشت کھانے پر وضو کریں؟ آپ نے فرمایا: ''چاہو تو کرلو اور چاہو تو نہ کرو۔'' اس نے کہا: اور اونٹ کا گوشت کھانے پر؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں اونٹ کا گوشت کھانے پر وضو کرو!'' اس نے پھر پوچھا: کیا میں بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں!۔'' کہا: اور اونٹوں کے باڑے میں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں!۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے روایت کیا، سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اونٹوں کا گوشت کھانے پر وضو کرنے کے بارے سوال ہوا تو فرمایا: ''ہاں وضو کرو۔'' جبکہ بکری کا گوشت کھانے پر وضو کرنے کے بارے سوال پر فرمایا: ''نہ کرو۔'' اونٹوں کے باڑے میں نماز کے بارے فرمایا: ''وہاں نہ پڑھو، کیونکہ وہ شیاطین سے ہیں۔'' بکریوں کے باڑے میں نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''وہاں پڑھ لو کیونکہ یہ برکت ہے۔''[2] اسے احمد، ابو داود اور ابن حبان نے نقل کیا، ابن خزیمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے علماء کے مابین اس امر میں اختلاف نہیں دیکھا کیونکہ اسناداً یہ حدیث صحیح ہے، بقول نووی رحمہ اللہ: دلیل کے لحاظ سے یہ مذہب اقوی ہے، اگرچہ جمہور اس کے برخلاف ہیں (یعنی ان کے ہاں اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا)۔

⑤ اگر آدمی کو شک ہو کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے یا نہیں؟

تو مجرد شک اس کے لیے ضار نہیں اور نہ وہ بے وضو شمار ہوگا، چاہے نماز کے اندر یہ شک لاحق ہو یا خارج از نماز، تا آنکہ تیقن سے یاد آئے کہ وضو ٹوٹ گیا تھا، عباد بن تمیم اپنے چچا سے راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی: اگر کسی کو نماز میں خیال آئے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے تو...... آپ نے فرمایا: ''نماز سے نہ پھرے، مگر جب (ہوا خارج ہونے کی) آواز سنے یا بو پائے۔''[3] اسے جماعت نے ماسوائے ترمذی کے تخریج کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کو تردد ہو کہ آیا اس سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو جب تک آواز نہ سنے یا بو نہ آئے تو وہ مسجد سے نہ نکلے۔''[4] اسے مسلم، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا، مراد خاص طور سے آواز کا سنائی دینا یا بو محسوس کرنا نہیں، بلکہ اس امر کا یقین ہونا ہے کہ بالفعل اس سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے۔ امام ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر اتنا یقین ہو کہ حلف اٹھا سکے کہ ہوا خارج ہوئی ہے تبھی وضو ٹوٹے گا، اگر شک و تردد کی حالت ہے تو بالاجماع وضو قائم ہے۔

⑥ نماز کے دوران قہقہہ مار کر ہنسنا

اس سے وضو نہ ٹوٹے گا کیونکہ اس بابت وارد روایت صحیح نہیں ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: ٣٦٠، مسند أحمد: ٥/ ٨٥، ٨٨. [2] صحيح، سنن أبي داود: ١٨٤؛ مسند أحمد: ٤/ ٢٨٨.
[3] صحيح البخاري: ١٧٧؛ صحيح مسلم: ٣٦١. [4] صحيح مسلم: ٣٦٢؛ سنن أبي داود: ١٧٧.

⑦ میت کو غسل دینا

یہ بھی ناقضِ وضو نہیں کیونکہ دلیلِ نقض ضعیف ہے۔

⑧ وضو کب واجب ہوگا؟

درج ذیل تین امور کے لیے وضو کرنا واجب ہے:

① نماز کے لیے

فرض ہو یا نفل اور چاہے نمازِ جنازہ ہو، قرآن میں ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ ... ﴾ الخ (المائدة: ٦) ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے قیام کا ارادہ کرو تو......'' (وضو کر لو) اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بغیر وضو کے نماز قبول نہیں کرتا۔''[1] اسے سوائے بخاری کے دیگر سب نے نقل کیا۔

② طواف کرنے کے لیے

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''طواف بھی نماز ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کلام کر لینا حلال کیا ہے تو جو کلام کرے وہ کلامِ خیر ہی کرے۔''[2] اسے ترمذی اور دارقطنی نے نقل کیا، حاکم، ابن سکن اور ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس پر حکم صحت لگایا۔

③ قرآن پاک چھونا ہو

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہلِ یمن کو خط میں لکھا: «لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ» ''قرآن کو حالتِ طہارت میں ہی چھوا جائے۔''[3] اسے نسائی، دارقطنی، بیہقی اور اثرم نے نقل کیا، ابن سیدنا عبدالبر رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے رقمطراز ہیں کہ یہ متواتر حدیث سے مشابہ ہے، کیونکہ لوگوں نے اسے تلقی بالقبول کیا ہے، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ»[4] اسے ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ذکر کیا اور کہا: اس کے راوی ثقہ ہیں تو حدیث دلیل ہے کہ قرآن کا چھونا اور پکڑنا صرف طاہر کے لیے ہی جائز ہے، لیکن طاہر کا لفظ مشترک ہے حدثِ اکبر (یعنی جنابت) سے طاہر اور حدثِ اصغر (یعنی بے وضو ہونے کی حالت) سے طاہر دونوں پر اس کا اطلاق ہے، اسی طرح اس مومن پر بھی اس کا اطلاق ہے جس کے بدن پر کوئی ظاہری نجاست نہ لگی ہوئی ہو (چاہے وہ جنبی ہی ہو) تو کسی عین پر اسے محمول کرنے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے تو یہ حدیث حدثِ اصغر والے شخص کے لیے قرآن پکڑنا یا

---

① صحيح مسلم: ٢٢٤؛ سنن أبي داود: ٥٩؛ سنن ترمذي: ١. ② صحيح، سنن ترمذي: ٩٦٠.
③ صحيح، سنن الدارقطني: ٤٣٣؛ السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٣٠٩. ④ صحيح، سنن الدارقطني: ٤٣١؛ مجمع الزوائد للهيثمي: ١/ ٢٧٦.

چھونا منع ہونے پر نص نہیں، جہاں تک آیت: ﴿لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (الواقعة:۷۹) ہے تو بظاہر ضمیر (یعنی یَمَسُّهٗ) کا مرجع ”کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ“ ہے جو لوحِ محفوظ ہے کیونکہ (قاعدہ کی رو سے ضمیر اقرب کی طرف راجع ہوتی ہے) کیونکہ وہی اقرب ہے اور ”مطہرون“ سے مراد ملائکہ ہیں، جیسے ان آیات میں: ﴿فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ کِرَامٍۭ بَرَرَةٍ﴾ (عبس: ۱۳۔ ۱۶) ”یہ قابل احترام صحیفوں میں ہے جو بلند و بالا اور پاکیزہ ہیں اور لکھنے والے فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، شعبی، ضحاک، زید بن علی، داود، ابن حزم اور حماد بن ابو سلیمان رحمہم اللہ کی رائے میں بے وضو شخص کے لیے قرآن پکڑنا یا چھونا جائز نہیں، لیکن اس امر پر اتفاق ہے کہ بغیر وضو کے زبانی تلاوت کر لینا جائز ہے۔

⑨ جن امور کے لیے وضو کرنا مستحب ہے

درج ذیل احوال میں وضو کرنا مستحب اور مندوب ہے:

① ذکر اذکار کرتے وقت

سیدنا مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا جبکہ آپ وضو کرنے میں مصروف تھے تو جواب نہ دیا، یہاں تک کہ وضو مکمل کیا، پھر جواب دیا اور فرمایا: ”مجھے جواب دینے میں کوئی امر مانع نہ تھا، مگر یہ میں نے برا جانا کہ اللہ کا ذکر کروں، مگر طہارت پر ہی۔“[1] قتادہ کہتے ہیں: حسن (بصری رحمہ اللہ) اس حدیث کے مدنظر باوضو حالت ہی میں تلاوت یا ذکر کرنا پسند کرتے تھے، اسے احمد، ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بئر جمل کی طرف سے آ رہے تھے کہ ایک شخص نے سلام کیا، آپ نے فوری جواب نہ دیا، بلکہ ایک دیوار کی طرف گئے اس سے تیمم کیا، پھر اس کے سلام کا جواب دیا۔[2] اسے احمد، بخاری، مسلم، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا۔

یہ ”علیٰ سبیل الافضلیت والندب“ ہے وگرنہ بے وضو، جنبی، کھڑے، بیٹھے ہوئے، چل رہے اور لیٹے ہوئے شخص کے لیے بلا کراہت ذکر اذکار کرنا جائز ہے، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سب احوال میں اللہ کا ذکر کر لیتے تھے،[3] اسے سوائے نسائی کے دیگر سب اہلِ صحاح نے نقل کیا، بخاری نے اسے معلقاً نقل کیا، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا سے نکلتے تو ہمیں قرآن پڑھاتے اور ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے، کوئی چیز بجز جنابت آپ کے لیے قرآن سے حاجز (یعنی رکاوٹ) نہ بنتی تھی،[4] اسے خمسہ نے تخریج کیا اور ترمذی و ابن سکن نے اس پر صحت کا حکم لگایا۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۱۷؛ سنن نسائی: ۳۸؛ سنن ابن ماجه: ۳۵۰. [2] صحیح البخاری: ۳۳۷؛ صحیح مسلم ۳۶۹. [3] صحیح، سنن أبی داود: ۲۲۹؛ سنن ترمذی: ۱۴۶؛ سنن نسائی: ۲۶۵. [4] صحیح مسلم: ۱۱۷؛ سنن أبی داود: ۱۸.

② جب سونے کا ارادہ ہو

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اپنے بستر کی طرف آؤ تو (پہلے) نماز والا وضو کرو، پھر داہنے پہلو کے بل لیٹو۔''[1] (آگے ایک دعا سکھلائی) الخ اسے احمد، بخاری اور ترمذی نے نقل کیا، جنبی کے لیے زیادہ تاکید ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کے مدنظر کہ عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی جنابت کی حالت میں سوسکتا ہے؟ فرمایا: ''ہاں! جب وہ وضو کر لے۔''[2] اسے بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر حالتِ جنابت میں سونا چاہتے تو استنجا کر کے نماز والا وضو کر لیتے۔[3] اسے جماعت نے نقل کیا۔

③ جنبی کے لیے وضو کرنے کا استحباب

جب کھانے، پینے یا دوبارہ جماع کا ارادہ کرے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر جنبی ہوتے تو کھانا تناول کرنا یا سونا چاہتے تو وضو کر لیتے،[4] اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا، سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دی کہ اگر جنبی کھانا پینا، یا سونا چاہے تو پہلے وضو کر لے،[5] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور حکمِ صحت لگایا، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی دوبارہ جماع کرنا چاہے تو پہلے وضو کر لے۔''[6] اسے سوائے بخاری کے سب نے نقل کیا، ابن خزیمہ، ابن حبان جبکہ حاکم کے ہاں اس میں یہ اضافہ بھی ہے: «فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ» ''اس سے دوبارہ جماع کرنے کے لیے (اگر ارادہ بنے تو) چستی پیدا ہوتی ہے۔''[7]

④ نہانے کے شروع میں

چاہے یہ واجب غسل ہو یا مستحب، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غسلِ جنابت کرتے تو پہلے ہاتھ دھوتے، پھر دائیں سے بائیں میں پانی لے کر شرمگاہ دھوتے، پھر نماز والا وضو کرتے،[8] اسے جماعت نے روایت کیا۔

⑤ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کی صورت میں

اس کا استحباب ابراہیم بن عبداللہ بن قارظ کی حدیث کے پیش نظر ہے، کہتے ہیں: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے میرا گزر ہوا جو وضو کر رہے تھے، کہنے لگے: جانتے ہو کیوں یہ وضو کر رہا ہوں؟ کیونکہ جامد دودھ (یعنی پنیر) کے ٹکڑے کھائے تھے، اور میں

---

[1] صحیح البخاری: ۲۴۷، سنن ترمذی: ۳۳۹۴. [2] صحیح البخاری ۲۸۹، صحیح مسلم: ۳۰۶.
[3] صحیح البخاری: ۲۸۸، صحیح مسلم: ۳۰۵. [4] صحیح مسلم: ۳۰۵، سنن ابن ماجه: ۵۹۱. [5] سنن أبی داود: ۲۲۵، سنن ترمذی: ۶۱۳. [6] صحیح مسلم: ۳۰۸، سنن أبی داود: ۲۲۰. [7] صحیح، ابن خزیمه: ۲۲۱، بن حبان: ۱۲۱۱. [8] صحیح البخاری: ۲۴۸، صحیح مسلم: ۳۱۶.

نے نبی کریم ﷺ کا فرمان سنا ہے: «تَوَضَّؤُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ» ''آگ پر پکی چیز کھانے سے وضو کرو۔''[1] اسے احمد، مسلم اور اربعہ نے تخریج کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «تَوَضَّؤُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ»[2] اسے احمد، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، وضو کا یہ حکم ندب پر محمول ہے، کیونکہ سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ بکری کے کندھے سے کاٹ کر گوشت کھا رہے تھے، اس اثنا میں نماز کی طرف بلاوا آیا تو چھری رکھی اور بغیر نیا وضو کیے نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے،[3] متفق علیہ، نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس سے چھری (کانٹے) کے ساتھ گوشت (اور کھانا) کھانے کا جواز بھی ملا۔

⑥ ہر نماز کے لیے تجدید وضو کرنے کا استحباب

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے وقت وضو کرتے تھے، فتح مکہ کے دن موزوں پر مسح کے ساتھ وضو کیا، پھر اس ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھائیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آج آپ نے ایسا فعل کیا ہے جو پہلے کبھی نہ کیا تھا، آپ نے فرمایا: ''عمداً ایسا کیا ہے (بیانِ جواز کے لیے) اے عمر!''[4] اسے احمد اور مسلم وغیرہما نے تخریج کیا، عمرو بن عامر انصاری راوی ہیں کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے، میں نے کہا: آپ لوگوں کا طرزِ عمل کیا تھا؟ کہا: ہم تو ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھ لیتے تھے، جب تک وضو نہ ٹوٹتا برابر نمازیں پڑھتے رہتے،[5] اسے احمد اور بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو انہیں ہر نماز کے لیے نیا وضو اور ہر وضو کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔''[6] اسے احمد نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے وضو ہونے کے باوجود وضو کیا اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دی گئیں۔''[7] اسے ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

وضو سے متعلق چند مفید معلومات

① وضو کرنے کے دوران میں مباح کلام کرنا مباح ہے، سنت میں اس کے منع ہونے کی کوئی دلیل وارد نہیں۔

② اعضاء دھونے کے دوران میں کسی قسم کی دعاء پڑھنا باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں (یعنی کوئی وضو کے درمیان مسنون دعا کے بطور کچھ نہ پڑھے، عمومی لحاظ سے کبھی کبھار استغفر اللہ یا کوئی اور کلمہ کہہ لینا منع نہیں) مطلوب انہی ادعیہ ماثورہ پر اقتصار ہے جن کا ذکر وضو کی سنن کے بیان میں گزرا۔

---

① صحیح مسلم:٣٥٢؛ سنن نسائی:١٧١. ② صحیح مسلم: ٣٥٣؛ سنن ابن ماجہ: ٤٨٦. ③ صحیح البخاری: ٦٧٥؛ صحیح مسلم: ٣٥٥. ④ صحیح مسلم: ٢٧٧؛ سنن أبی داود: ١٧٢. ⑤ صحیح البخاری: ٢١٤؛ مسند أحمد: ٣/ ١٣٣. ⑥ صحیح، مسند أحمد: ٢/ ٢٥٩؛ المجمع الزوائد: ١/ ٢٢١. ⑦ ضعیف، سنن أبی داود: ٦٢؛ سنن ترمذی: ٥٩.

③ اگر متوضی کو شک ہو کہ کتنی دفعہ عضو دھویا ہے تو وہ یقینی عدد پر بنا کرے (یعنی اسے شمار کرے) جو کم از کم اس کے ذہن میں ہو۔

④ اعضائے وضو میں کسی عضو پر اگر کوئی حائل ہے، مثلاً: موم (کیونکہ اس کی تہہ موٹی ہے) تو وضو نہ ہوگا، لیکن اگر صرف رنگ ہے، جیسے مہندی وغیرہ تو اس سے صحتِ وضو میں فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ یہ جلد کو پانی لگنے میں حائل نہیں (مترجم کے خیال میں دیواروں کے پینٹ کے دھبے اور نیل پالش کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے، نیل پالش کی موجودگی ایک امرِ مجبوری بھی ہے۔ کچھ علماء اس کے ناخنوں پر لگے ہونے کی صورت میں وضو نہ ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں، ذاتی رائے ہے کہ اس ضمن میں نرمی کی ضرورت ہے، اسے مہندی پر قیاس کیا جائے)۔

⑤ مستحاضہ خاتون اور جس مرد یا عورت کو سلس البول کا عارضہ ہو یا ہوائیں خارج ہوتی رہنے کا یا دیگر کوئی عارضہ ہو تو اگر یہ عذر ہمہ وقت درپیش رہتا ہے تو یہ حضرات وخواتین ہر نماز کے وقت وضو کریں، اگر قطرے مسلسل ٹپکتے رہتے ہیں اس قدر کہ یاد رکھنا ممکن نہیں تو نماز صحیح ہوگی (یعنی اگر نماز کے دوران میں بھی قطرے ٹپکیں تو نماز توڑنے کی ضرورت نہیں)

⑥ کسی کو وضو کرانا جائز ہے۔

⑦ وضو کر کے تولیہ وغیرہ کے ساتھ صاف کر لینا مباح ہے موسم گرما ہو یا سرما۔

موزوں پر مسح

① اس کی مشروعیت کی دلیل:

نبی کریم ﷺ سے محفوظ وثابت روایات میں موزوں پر مسح کرنا ثابت ہے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: سفر وحضر میں موزوں پر مسح کے جواز پر قابلِ ذکر اہل علم کا اجماع ہے، چاہے کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو حتی کہ ان خواتین کے لیے بھی جو مسلسل گھروں میں ہی رہتی ہیں اور معذور اور اپاہج شخص جو چل نہیں سکتا، صرف شیعہ اور خوارج اس کے منکر ہیں: لیکن ان کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں (کیونکہ اہل سنت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں رقم طراز ہیں، حفاظ کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ موزوں پر مسح کرنا تواتر سے ثابت ہے، بعض نے اس کے رواۃ کو شمار کیا تو وہ اسی (۸۰) صحابہ سے زائد نکلے اور ان میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں، مسح کے بارے میں حجت کے لحاظ سے سب سے قوی روایت جسے احمد، شیخین، ابو داود اور ترمذی نے ہمام نخعی سے نقل کیا، کہتے ہیں کہ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پیشاب کر کے وضو کیا تو موزوں پر مسح کیا، کہا گیا: آپ نے استنجا کیا تھا اور اب موزوں پر مسح کر رہے ہیں؟ کہا: ہاں! میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔[1] بقول ابراہیم رحمہ اللہ لوگوں کو یہ حدیث بہت اچھی لگتی تھی، کیونکہ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سورۃ المائدہ کے نزول کے بعد مسلمان ہوئے تھے، یعنی ان کا قبولِ اسلام سن دس ہجری میں تھا، آیتِ وضو کے نزول کے بعد جو وضو میں پاؤں دھونے کے وجوب کا افادہ دیتی ہے، تو ان کی یہ حدیث اس آیت کی توضیح وتبیین کرتی ہے کہ آیت میں پاؤں دھونے کے وجوب کا تعلق ان

---

[1] صحیح البخاری: ۳۸۷؛ صحیح مسلم: ۲۷۲.

حضرات سے ہے جنہوں نے موزے نہ پہنے ہوں، جہاں تک موزے پہنے ہوئے شخص کا تعلق ہے تو اس کی نسبت فرض مسح کرنا ہے (یعنی اگر وہ موزے نہیں اتارنا چاہتا) تو یہ حدیث آیت کے لیے مخصص ہے۔

② جرابوں پر مسح کی مشروعیت

جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے، یہ کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، ابوداود کہتے ہیں: سیدنا علی، ابن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہل بن سعد اور عمرو بن حریث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، سیدنا عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ اسی طرح سیدنا عمار، بلال، عبداللہ بن ابی اوفی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی، امام ابن قیم رحمہ اللہ کی تہذیب السنن میں ابن منذر کے حوالے سے منقول ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کی جرابوں پر مسح کے جواز کے بارے نص موجود ہے اور یہ ان کے عدل وانصاف کا غماز ہے، اس ضمن میں ان کا عمدہ یہ مذکورہ صحابہ کرام اور صریح قیاس ہے کیونکہ موزوں اور جرابوں کے مابین کوئی ایسا مؤثر فرق نہیں، لہٰذا انہی کے حکم کو جرابوں پر لاگو کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، اکثر اہل علم جرابوں پر مسح کے قائل ہیں۔

یہ رائے رکھنے والوں میں امام سفیان ثوری، ابن مبارک، عطاء، حسن اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ ہیں، ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ کہتے ہیں: اگر جرابیں اتنی موٹی اور دبیز ہوں کہ پاؤں کی جلد نظر نہ آتی ہو تب مسح کرنا جائز ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اولاً موٹی جرابوں پر بھی مسح کو جائز نہ سمجھتے تھے، لیکن اپنی وفات سے تین یا سات دن قبل جواز کے قائل ہو گئے اور آخری بیماری میں موٹی جرابوں پر مسح کیا اور عیادت کے لیے آنے والوں سے کہا: اب میں نے وہی کیا ہے جس سے منع کیا کرتا تھا، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور جرابوں اور نعلین مبارک پر مسح کیا۔[1] (بقول محشی آپ کی نعلین کی صفت یہ تھی کہ (اوپر سے بند نہ تھی بلکہ) دو تسمے تھے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے لیے اور ایک درمیانی اور اس کے ساتھ والی کے لیے اور یہ دونوں تسمے ان تسموں سے ملحق تھے، جو قدم مبارک کی سطح پر تھے) اسے احمد، طحاوی، ابن ماجہ اور ترمذی نے تخریج کیا اور کہا کہ یہ حسن صحیح ہے، ابوداود نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، اصل مقصود جرابوں پر مسح تھا بالتبع نعلین پر بھی کر لیا (بظاہر پاؤں مبارک باہر نکالے بغیر مسح کیا تو یوں جرابوں کے ساتھ ساتھ نعلین مبارکین کی بالائی لپٹوں پر بھی مسح ہو گیا) اگر معروف جرابوں کی بجائے پاؤں کسی اور چیز میں لپیٹے ہوئے ہیں مثلاً: لفافہ اور زخموں کی وجہ سے پٹیوں وغیرہ سے تو ان پر بھی مسح کرنا جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: بلکہ لفائف (یعنی کپڑے کے بنے ہوئے) پر مسح زیادہ موزوں اور جرابوں کی نسبت اولی ہے کیونکہ عرف میں سردی وغیرہ کے باعث یا زخم کی تکلیف کی وجہ سے ان کا استعمال بامر مجبوری ہی ہوتا ہے تو اگر موزوں اور جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے تو ان لفائف (اور پٹیوں) پر تو بطریق اولیٰ ہوا تو جو اس ضمن میں اجماع کا ادعا کرے تو اس کے ساتھ سوائے عدم علم کے کچھ نہیں، کوئی مشہور علماء میں سے کسی سے بھی اس کا منع ہونا نقل نہیں کر سکتا چہ جائے کہ اجماع کا دعویٰ، آگے کہا: جو الفاظِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تدبر کرے اور قیاس کو اس کا حق دے اسے علم ہوگا کہ اس باب میں وسیع

---

① حسن، سنن أبی داود: ١٥٩؛ سنن ترمذی: ٩٩؛ ابن ماجه: ٥٥٩.

رخصت ہے اور یہ شریعت کے محاسن میں سے ہے اور اس حنیفیہ سمحہ (یعنی سہل اور سیدھا، جس میں سابقہ ملتوں کی مثل مشقتیں نہیں) شریعت کا پرتو ہے جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ مبعوث کیے گئے۔

اگر موزے یا جراب میں سوراخ ہو تو بھی مسح کرنے میں مضائقہ نہیں جب تک وہ معمولاً اسے پہنے رکھ سکتا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں: مہاجرین وانصار کے موزے سوراخوں سے سالم نہ ہوتے تھے، اگر اس میں کوئی حظر ہوتا تو منقول ہوتا۔

③ موزوں وغیرہ پر مسح کی شروط

موزے یا جرابیں وضو کر کے پہنے گئے ہوں، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کو وضو کرا رہا تھا تو سر پر مسح کے بعد میں جھکا تا کہ موزے اتاروں تو آپ نے فرمایا: ''رہنے دو کیونکہ میں نے انہیں وضو کر کے پہنا تھا'' تو ان پر مسح کیا،① اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا، مسند حمیدی کی انہی سے روایت میں ہے کہ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم بھی موزوں پر مسح کر سکتے ہیں؟ فرمایا: ''ہاں! اگر وضو کر کے پہنے ہوں۔''② بعض فقہا نے جو شرط عائد کی کہ موزہ پورے محلِ فرض (یعنی جتنا حصہ دھونا فرض ہے) کو چھپائے ہوئے ہو اور باندھے بغیر خود اپنے زور سے پاؤں میں جما ہوا ہو اور اس میں چلنا (یعنی جوتا پہنے بغیر) ممکن ہو، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فتاویٰ میں اس کا ضعف واضح کیا ہے۔

④ محلِ مسح

مسح کا مشروع محل موزے (اور جرابوں وغیرہ) کا پاؤں کی بالائی سطح والا حصہ ہے، سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے موزوں کے ظاہری حصے پر مسح کیا۔③ اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر دین کا (کلی) انحصار رائے پر ہوتا تو موزے کا نچلا حصے بنسبت اوپر والے حصہ کے مسح کا زیادہ حقدار ہوتا، لیکن میں نے نبی کریم ﷺ کو اس کے صرف اوپر والے حصے پر مسح کرتے دیکھا ہے۔④ اسے ابوداود اور دارقطنی نے روایت کیا اور اس کی اسناد حسن یا صحیح ہے، مسح کے ضمن میں واجب وہی فعل ہے جس پر لغت میں مسح کا اطلاق ہے، بغیر تحدید کے اس بارے میں صحت کے ساتھ کچھ مروی نہیں۔

⑤ مسح کی مدت

مقیم کے لیے ایک رات و دن اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں، سیدنا صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اگر وضو کر کے موزے پہنے ہوں تو سفر میں تین اور حضر میں ایک دن مسح کیا کریں ہاں جنابت کی صورت میں انہیں اتارنا ہوگا۔⑤ اسے امام شافعی، امام احمد، امام ابن خزیمہ، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ نے تخریج کیا اور

---

① صحیح البخاری: ۲۰۶؛ صحیح مسلم: ۲۷۴. ② مسند الحمیدی: ۷۷۶. ③ حسن، سنن أبی داود: ۱۶۱؛ سنن ترمذی: ۹۸. ④ صحیح، سنن أبی داود: ۱۶۲؛ سنن الدارقطنی: ۷۵۹. ⑤ حسن، سنن ترمذی: ۹۵؛ صحیح ابن خزیمہ: ۱۹۳.

آخری دونوں نے اس پر حکمِ صحت لگایا، شریح بن ہانی کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے موزوں پر مسح کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھو! انہیں اس بارے مجھ سے زیادہ علم ہے، کیونکہ وہ اسفار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوتے تھے، کہتے ہیں: میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: مسافر کے لیے تین رات و دن اور مقیم کے لیے ایک رات اور دن ہے،[1] اسے احمد، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، بقول بیہقی رحمہ اللہ یہ اس باب کی صحیح ترین روایت ہے، مختار یہ ہے کہ اس مدت کی ابتدا مسح کے وقت سے ہوگی پہننے کے بعد جب حادث ہوکر وضو کیا ہو اور پھر جب مسح کرے (تو یہ اس کا آغاز ہوا)۔

⑥ صفتِ مسح

متوضی کے لیے وضو کر کے موزے یا جرابیں پہننے کے بعد آئندہ سے ان پر مسح کرنا صحیح ہے، جب بھی وضو کرے تو پاؤں دھونے کی بجائے اسے اب مقررہ مدت کے لیے مسح کی رخصت ہے، اِلّا یہ کہ اسے احتلام ہو جائے، تب ان کا اتارنا واجب ہوگا، جیسا سیدنا صفوان رضی اللہ عنہ کی سابق الذکر حدیث سے ثابت ہے۔

⑦ مسح (کی رخصت) کو باطل کرنے والے امور

① مدت پوری ہونا۔

② احتلام ہونا۔

③ موزے اتار لینا، اگر مدت پوری ہوگئی یا موزے وجرابیں اتار لیں، اگر وہ پہلے سے باوضو ہے تو اب صرف پاؤں دھولے۔

غسل کے مسائل

غسل کا معنی

تمام جسم پر پانی ڈالنا، یہ اس آیت کے مدِنظر مشروع ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾(المائدة:٤٣)

''اگر جنبی ہو جاؤ تو غسل کرو۔''

اور قولہ تعالیٰ:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾(البقرة:٢٢٢)

---

[1] صحيح مسلم: ٢٧٦؛ سنن نسائی: ١٢٨.

''لوگ آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجیے! وہ نجاست ہے، تم ایامِ حیض میں عورتوں سے دور رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے قربت نہ کرو، جب وہ پاک ہو جائیں تو جس طریقہ سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے ان کے پاس جاؤ، بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس مسئلہ کے درج ذیل پہلو ہیں:

غسل کے موجبات

پانچ امور اس کے موجب بنتے ہیں:

(اول) نیند یا بیداری کی حالت میں شہوت کے ساتھ منی کا نکلنا

یہی اکثر فقہاء کا قول ہے، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مدنظر، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ)) ''منی خارج ہو تو غسل کرو۔''[1] اسے مسلم نے تخریج کیا۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ حق بات سے استحیاء نہیں کرتا، عورت کو احتلام ہو تو کیا اس پر بھی غسل واجب ہے؟ فرمایا: ''ہاں! اگر پانی (یعنی منی لگی) دیکھے۔''[2] اسے شیخین وغیرہما نے نقل کیا۔

خروج منی کی متعدد صورتیں ہیں جن کا بیان کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں:

① اگر منی بغیر شہوت کے نکل آئے

مثلاً کسی مرض یا سردی کے سبب، تب غسل کرنا واجب نہ ہوگا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ((فإذا فَضَحْتَ الماء فَاغْتَسِلْ)) ''جب منی شہوت سے نکلے تو غسل کرو۔''[3] فضح منی کا زور (یعنی عمد وقصد) سے نکلنا ہے، اسے ابوداود نے نقل کیا، امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تلامذہ مسجد میں حلقہ بنائے بیٹھے تھے، ان میں طاوس، سعید بن جبیر اور عکرمہ تھے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور پوچھا: کیا کوئی مسئلہ بتلانے والا ہے؟ کہا: پوچھیے! کہنے لگا: میں جب بھی پیشاب کرتا ہوں تو آخر میں ''الماءُ الدَّافق'' یعنی ٹپک کر خاص پانی بہہ پڑتا ہے، ہم نے کہا: تمہاری مراد اس پانی سے جو مادۂ تولید ہے؟ کہا: ہاں! ہم نے کہا: اس پر تو غسل واجب ہے، یہ سن کر وہ آدمی انا للہ پڑھتا ہوا واپس ہوا، ادھر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جلدی سے سلام پھیرا، پھر عکرمہ سے کہا: اس آدمی کو واپس لاؤ اور ہمیں کہنے لگے: کیا تم لوگوں نے یہ مسئلہ کتاب اللہ سے بتلایا؟ ہم نے نفی کی، کہا: کیا سنتِ رسول اللہ سے؟ ہم نے کہا: نہیں! کہا: کیا صحابہ کے حوالے سے؟ ہم نے عرض کی: نہیں! پوچھا: پھر کس سے؟ عرض کی: اپنی رائے سے یہ بات کہی ہے، کہنے لگے: اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''شیطان پر ایک فقیہہ ہزار عابدوں سے بھاری ہے۔''[4] اتنی دیر میں وہ

---

① صحيح مسلم: ٣٤٣۔ ② صحيح البخاري: ١٣٠؛ صحيح مسلم: ٣١١۔ ③ صحيح، سنن أبي داود: ٢٠٦؛ مسند أحمد: ١/ ١٠٩۔ ④ ضعيف جدًا، سنن ترمذي: ٢٦٨١؛ سنن ابن ماجه: ٢٢٢۔

شخص آ گیا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: جب یہ کیفیت ہوتی ہے کیا تم شہوت پاتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! تو بولے: کیا جسم میں اس سے کچھ لگا پاتے ہو؟ کہا: نہیں! تو کہنے لگے: یہ دراصل اندرونی ٹھنڈک کا زور ہے تو اس سے صرف وضو کرنا کافی ہوگا۔

② احتلام ہوا لیکن منی لگی نہیں دیکھی

اس صورت میں اس کے ذمہ غسل نہیں، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اپنی معلومات کی حد تک اہل علم کا اس پر اجماع پاتا ہوں، سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے: ((نَعَمْ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ)) ''ہاں! اگر پانی لگا دیکھے۔'' تو یہ دال ہے کہ اگر منی لگی نہیں دیکھی تب غسل واجب نہیں، لیکن اگر بیدار ہونے پر منی خارج ہوگئی، تب غسل ضروری ہے۔

③ نیند سے اٹھا تو کپڑے میں گیلاہٹ پائی

مگر یاد نہیں کہ احتلام ہوا تھا تو اگر یقین ہو کہ یہ منی ہے (پیشاب نہیں) تو اس کے ذمہ غسل ہے، کیونکہ اس کا خروج احتلام کی وجہ سے ہوا ہے، مگر وہ بھول گیا ہے، اگر شک و تردد ہو اور اسے کچھ یاد نہیں کہ یہ منی ہے یا کچھ اور تو بھی احتیاطاً غسل کر لے، امام مجاہد اور امام قتادہ رحمہما اللہ کہتے ہیں (غسل ضروری نہیں) جب تک یقین نہ ہو کہ یہ منی ہے، کیونکہ بقائے طہارت یقینی امر ہے، جو شک کے ساتھ زائل نہ ہوگا۔

④ شہوت کے وقت محسوس کیا کہ منی حرکت پذیر ہوئی ہے تو اپنا ذکر پکڑ لیا، مگر وہ خارج نہ ہوئی تو اس صورت میں غسل واجب نہیں، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وجوبِ غسل کو پانی کی رؤیت کے ساتھ معلق کیا ہے، اس کے بغیر حکم ثابت نہ ہوگا، اگر بعد ازاں منی خارج ہوگئی تب نہانا واجب ہے۔

⑤ لباس پر منی لگی دیکھی

مگر یہ علم نہیں کہ یہ کب نکلی تھی اور اس حالت میں نماز پڑھ لی تو اپنی آخری نیند سے اٹھ کر جتنی نمازیں پڑھی ہیں سب کا اعادہ لازم ہے، اگر خیال کرے کہ یہ اس سے قبل کی ہے تب سابقہ نمازوں کا بھی اعادہ کرے گا۔

(دوم) دونوں کی شرمگاہوں کا باہمی ملاپ

یعنی حشفہ (ذکر کا اوپر والا کنارا) عورت کی شرمگاہ میں داخل کرے، اگرچہ انزال نہ ہو، کیونکہ قرآن نے کہا: ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (المائدۃ:٦) ''اگر تم جنبی ہو جاؤ تو طہارت اختیار کرو۔'' امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کلامِ عرب مقتضی ہے کہ جنابت کا حقیقت میں اطلاق جماع پر ہے، اگرچہ اس میں انزال نہ ہوا ہو، کہتے ہیں کہ جب یہ الفاظ کہے جائیں: ''فُلَانٌ أَجْنَبَ مِنْ فُلَانَةٍ'' یعنی فلاں فلانہ سے جنبی ہوا تو اس کا مفہوم ہوگا کہ اس نے اس سے جماع کیا چاہے انزال نہ بھی ہوا ہو، کہتے ہیں: کسی کا اختلاف نہیں کہ زنا جو موجبِ حد ہے وہ بھی جماع ہے، چاہے انزال نہ ہوا ہو اور حدیثِ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب شوہر بیوی کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھا، پھر جماع کیا تو تب غسل واجب ہے، چاہے انزال ہوا ہو یا نہیں۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا (بخاری نے ''نَزَلَ أَوْ لَمْ يَنْزِلْ'' کے جملہ کے بغیر اسے نقل کیا ہے) سعید بن مسیب رحمہ اللہ راوی ہیں کہ سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں لیکن حیا آتی ہے، وہ بولیں: بلا استحیا پوچھیے کیونکہ میں آپ کی ماں ہوں تو اس آدمی کی بابت پوچھا جو بیوی کے قریب آیا مگر انزال نہ ہوا، جواب میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ذکر کیا: «إِذَا أَصَابَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ» ''اگر شرمگاہ میں آلہ تناسل داخل ہوا تو غسل واجب ہوگیا۔''[2] اسے احمد اور مالک نے مختلف الفاظ کے ساتھ تخریج کیا ہے، وجوبِ غسل کے ضمن میں بالفعل آلہ تناسل داخل ہونا ضروری ہے، اگر صرف ساتھ لگا تب دونوں پر بالاجماع غسل واجب نہ ہوگا۔

(سوم) حیض اور نفاس ختم ہونے پر غسل کرنا ضروری ہے

کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾(البقرۃ:۲۲۲)

''ان کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''ان ایام میں نماز چھوڑے رکھو جو حیض کے ہیں، پھر غسل کرو اور نماز پڑھو!''[3] متفق علیہ، یہ اگرچہ حیض کے بارے میں وارد ہے، مگر نفاس بھی بالاجماع صحابہ حیض کی مثل ہے، اگر بچہ جنا مگر کوئی خون نہ آیا تو اس بارے میں دو آراء ہیں: ایک غسل کی اور دوسری عدم غسل کی، اس ضمن میں کوئی نص وارد نہیں۔

(چہارم) وفات

مسلمان (مرد و عورت) کی وفات کی صورت میں اسے بالاجماع غسل دینا ضروری ہے، اس تفصیل پر جو اپنی جگہ بیان کی جائے گی۔

(پنجم) جب کافر اسلام قبول کرے

اس پر غسل کرنا واجب ہے، کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ سیدنا ثمامہ حنفی رضی اللہ عنہ (اسلام لانے سے قبل) قیدی بنا کر لائے گئے، اس قصے کے آخر میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رہا کر دیا، وہ اسلام لے آئے اور آپ نے

---

[1] صحيح البخاری: ۲۹۱؛ صحيح مسلم: ۳٤۸. [2] صحيح مسلم: ۳٤۹؛ ابن خزيمه: ۲٤۹.

[3] صحيح البخاری: ۳۲۵؛ صحيح مسلم: ۳۳۳.

سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ میں انہیں بھیجا تا کہ وہاں جا کر غسل کریں، انہوں نے یہی کیا اور دو رکعتیں ادا کیں، پھر آپ نے فرمایا: ''تمہارا بھائی حسن الاسلام ہوا۔''[1] اسے احمد نے نقل کیا، اصل واقعہ شیخین نے بھی نقل کیا۔

جنبی کے لیے حرام امور

حالتِ جنابت میں درجِ ذیل امور حرام ہیں:

① نماز پڑھنا۔

② طواف کرنا۔ اس کی ادلہ وضو کے باب میں ذکر ہو چکیں ہیں

③ قرآن چھونا اور اٹھانا، ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہیں، داود (ظاہری) اور ابن حزم نے جنبی کے لیے قرآن چھونا اور اٹھانا جائز قرار دیا ہے، وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، ان کا استدلال صحیحین کی اس روایت سے ہے جس میں ہرقل کی طرف مکتوبِ نبوی ارسال کیے جانے کا ذکر ہے، جس میں بسم اللہ کے ساتھ ساتھ یہ آیت بھی لکھی ہوئی تھی:

﴿قُلْ يَآهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا . . .﴾
(آل عمران:٦٤)

''(اے نبی) کہہ دیجیے! اے اہل کتاب، آئیں ہم ایسی بات پر متفق ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم سب اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔''

ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ نصاریٰ کی طرف نامۂ نبوی لکھا گیا اور اس میں یہ آیت تھی اور یقین تھا کہ وہ اسے چھوئیں گے اور پکڑیں گے، جمہور نے جواب دیا کہ یہ ایک خط ہے تو ان اشیا کے چھونے اور پکڑنے میں حرج نہیں، جن میں قرآنی آیات ہوں، مثلاً: خطوط، کتبِ تفسیر و فقہ وغیرہ کیونکہ انہیں مصحف نہیں کہا جاتا اور ان کی نسبت یہ حرمت ثابت نہیں۔

تلاوت قرآن (زبانی)

جمہور کے نزدیک جنبی کے لیے قرآن کی کوئی چیز تلاوت کرنا حرام ہے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاوتِ قرآن سے جنابت کے سوا کوئی چیز روکنے والی نہ تھی۔[2] اسے اصحابِ سنن نے تخریج کیا اور ترمذی وغیرہ نے صحیح قرار دیا، حافظ رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: بعض نے اس کے بعض رواۃ کو ضعیف قرار دیا ہے، حق یہ ہے کہ یہ حسن کے درجہ میں ہے اور دلیل کے بطور ٹھیک ہے، انہی سے مروی ہے کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا، پھر کچھ قرآن پڑھا، پھر فرمایا: «هٰكَذَا لِمَنْ لَيْسَ بِجُنُبٍ فَأَمَّا الْجُنُبُ فَلَا وَ لَا آيَةً» ''جنبی ایک آیت بھی نہ پڑھے۔''[3]

---

① صحيح البخاري: ٤٣٧٢؛ صحيح مسلم: ١٧٦٤. ② ضعيف، سنن أبي داود: ٢٢٩؛ سنن ترمذي: ١٤٦.
③ ضعيف، سنن أبي داود: ٢٢٩؛ سنن ترمذي: ١٤٦.

اسے احمد اور ابویعلیٰ نے نقل کیا، بقول ہیثمی اس کے راوی ثقہ ہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر یہ صحیح ہے تو تحریم پر استدلال کے لیے ٹھیک ہے، البتہ پہلی حدیث میں تحریم پر دال کوئی چیز نہیں کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالتِ جنابت میں تلاوت کا ترک کیا تو اس قسم کے بیان سے تو کراہت پر بھی استدلال نہیں ہوسکتا چہ جائے کہ تحریم پر، بخاری، طبرانی، داود اور ابن حزم رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ جنبی کے لیے (زبانی) تلاوتِ قرآن جائز ہے، بخاری کے بقول ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا: کوئی حرج نہیں کہ حائضہ ایک آدھ آیت پڑھ لے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی جنبی کے لیے قرآن کی زبانی تلاوت میں حرج خیال نہ کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ اپنے سب احوال و کیفیات میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ حافظ رحمہ اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک جنبی اور حائضہ کو تلاوت سے منع کرنے کے بارے وارد روایات میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں اگرچہ دیگر علماء کے ہاں ان مجموعی روایات سے منع پر حجت قائم ہے، لیکن اکثر قابلِ تاویل ہیں۔

مسجد میں ٹھہرے رہنا

جنبی پر یہ حرام ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب (ہجرت فرما کر مدینہ) آئے تو دیکھا کہ (مسجد کے پڑوسی) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں کے دروازے مسجد کے اندر کھلتے ہیں تو آپ نے حکم دیا کہ ”دروازوں کا رخ مسجد سے پھیر دیا جائے۔“ صحابہ نے رخصت نازل ہونے کے انتظار میں اس حکم پر فوری عمل نہ کیا، آپ پھر آئے اور فرمایا: ”دروازوں کا رخ تبدیل کر دو کیونکہ میں مسجد (میں داخل ہونا) کسی حائضہ یا جنبی کے لیے حلال نہیں کرتا۔“[1] اسے ابو داود نے تخریج کیا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحنِ مسجد میں بآواز بلند کہا: ”بے شک مسجد حائضہ اور جنبی کے لیے حلال نہیں۔“[2] اسے ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا۔

یہ دونوں حدیثیں جنبی اور حائضہ کے مسجد میں ٹھہرنے کی عدم حلت پر دال ہیں، البتہ ان کا مسجد سے گزرنا جائز ہے، یہ رخصت قرآن نے بیان کی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ﴾ (النساء:٤٣)

”مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک تم جو کہو اسے سمجھنے نہ لگو تو نماز کے قریب نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی، البتہ مسجد سے گزر سکتے ہو حتیٰ کہ غسل کرلو۔“

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنابت کی حالت میں ہم مسجد سے گزر جاتے تھے، اسے ابن ابی شیبہ نے اور سعید بن منصور نے سنن میں نقل کیا، زید بن اسلم راوی ہیں کہ صحابہ کرام جنابت کی حالت میں مسجد میں چل لیا کرتے تھے، اسے امام ابن منذر رحمہ اللہ نے نقل کیا، یزید بن ابی حبیب سے مروی ہے کہ انصار کے کچھ گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے، وہ

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٢٣٢. [2] ضعيف، سنن ابن ماجه: ٦٤٥.

جب جنبی ہوتے تو پانی لانے کے لیے انہیں مسجد کے اندر سے گزرنا پڑتا تو اللہ تعالیٰ نے (اس کی رخصت دیتے ہوئے) یہ آیت نازل کی: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ الخ۔ اسے ابن جریر نے نقل کیا، امام شوکانی رحمہ اللہ اس کے عقب میں لکھتے ہیں: اس سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہوتا ہے جس کے بعد شک کی کوئی گنجائش نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ذرا مسجد سے مجھے چٹائی پکڑانا۔'' میں نے کہا: میں حائضہ ہوں، آپ نے فرمایا: ''تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔''[1] اسے سوائے بخاری کے جماعت نے نقل کیا، سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی کسی زوجہ محترمہ کے ہاں تشریف لاتے جو حائضہ ہوتی تو ان کی گود میں سر رکھے قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہتے، پھر ہماری کوئی حائضہ اٹھتی تو مسجد میں اپنی چادر رکھ دیتی۔[2] اسے احمد اور نسائی نے نقل کیا، اس کے متعدد شواہد بھی موجود ہیں۔

مستحب غسل

یعنی ان کا کرنے والا مدح وثواب کا مستحق ہے اور جو نہ کرے اس پر کوئی لوم وعقاب نہیں، یہ چھ عدد ہیں، درج ذیل ان کا بیان کیا جاتا ہے۔

① غسلِ جمعہ

جمعہ کا دن نماز وعبادت کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہے، تو شارع علیہ السلام نے اس کے لیے غسل کی تاکید کی تاکہ لوگ (صفائی ستھرائی کے لحاظ سے) احسن حالت میں جمع ہوں، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جمع کا غسل ہر بالغ پر واجب ہے اور یہ کہ حسبِ توفیق خوشبو بھی لگائے۔''[3] یہاں وجوب سے مراد اس کے استحباب کی تاکید ہے، اس کی دلیل بخاری کی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت جس میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خطبہ کے لیے کھڑے تھے کہ مہاجرینِ اولین میں سے ایک شخص مسجد میں داخل ہوئے اور یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مخاطب کر کے کہا: یہ آنے کا کون سا وقت ہے؟ انہوں نے معذرت کی کہ اپنے کاروبار میں لگا ہوا تھا تو وقت کا پتہ ہی نہ چلا، اچانک اذان سنی تو جلدی سے صرف وضو کر کے آ گیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: صرف وضو؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ غسل کا حکم دیا کرتے تھے۔[4] امام شافعی رحمہ اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے غسل کی خاطر نمازِ جمعہ کو ترک نہ کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں واپس جا کر غسل کرنے کا حکم نہیں دیا تو اس سے دلالت ملی کہ دونوں کے نزدیک غسل کا یہ امرِ نبوی استحبابی تھا، استحباب پر مسلم کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی دلیل ہے: نبی کریم ﷺ سے نقل کیا کہ ''جس نے اچھی طرح وضو کیا، پھر جمعہ کے لیے حاضر ہو کر توجہ وسکون سے خطبہ سنا تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور مزید

---

① صحیح مسلم: ٢٩٨؛ سنن أبي داود: ٢٦١؛ سنن ترمذی: ١٣٤۔ ② حسن، سنن نسائی : ٢٧٢؛ مسند أحمد: ٦/ ٣٣١۔ ③ صحیح البخاری: ٨٨٠؛ صحیح مسلم: ٨٥٦۔ ④ صحیح البخاری: ٨٧٨۔

اور مزید تین ایام کے بھی۔''[1] امام قرطبی رحمہ اللہ (شارحِ مسلم) اس حدیث سے غسل جمعہ کے استحباب پر استدلال کی تقریر میں لکھتے ہیں: صرف وضو و ما معہ کا ذکر جس پر ثوابِ مذکور کو مرتب کیا، بغیر غسل کیے جمعہ کی صحت کو مقتضی ہے تو دلیل یہ ہے کہ اس کے لیے صرف وضو ہی کافی ہے، ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص میں رقمطراز ہیں کہ یہ غسل جمعہ کی عدم فرضیت اور اس کے مستحب کے قول کی قوی ترین دلیل ہے اس امر پر بنا کرتے ہوئے کہ غسل کا ترک کسی ضرر کے حصول کا موجب نہیں، ہاں اگر اس مذکورہ ثواب کو پسینہ وغیرہ کی بد بو کے ساتھ لوگوں کی ایذا رسانی کے ترک پر مرتب کرتے تب اس کا وجوب ثابت اور غسل کا ترک حرام تھا۔

علماء کی ایک جماعت غسل جمعہ کے وجوب کی قائل ہے، چاہے اس کے ترک سے ایذا کا وقوع نہ ہوتا ہو، ان کا استدلال سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس فرمانِ نبوی سے ہے: «حَقٌّ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ يَغْتَسِلَ فِيْ كُلِّ سَبْعَةِ أَيَّامٍ يَوْماً يَغْسِلُ فَيْهِ رَأْسَهُ وَجَسَدَهُ» ''ہر مسلمان پر حق ہے کہ ہر سات دن میں ایک بار نہائے اور اس میں اپنے سر اور جسم کو دھوئے۔''[2] اسے شیخین نے نقل کیا انہوں نے اس باب میں وارد روایات کو ان کے ظاہر پر محمول کیا اور ان کے معارض کو رد کیا ہے۔

غسلِ جمعہ کا وقت طلوع فجر تا نمازِ جمعہ ہے، اگرچہ مستحب یہ ہے کہ عین جمعہ کے لیے جاتے وقت غسل کیا جائے، اگر غسل کے بعد وضو ٹوٹا تو اب صرف وضو کافی ہے، اثرم کہتے ہیں: امام احمد رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ اگر کسی نے غسل کیا تھا پھر وضو ٹوٹ گیا تو کیا اسے وضو کافی ہے؟ کہا: ہاں! اس ضمن میں میں نے ابن ابزیٰ کی حدیث سے اعلیٰ روایت نہیں سنی، ان کا اشارہ ابن ابی شیبہ کی صحیح سند کے ساتھ عبدالرحمن بن ابزیٰ سے روایت کی طرف ہے، جنہوں نے اپنے والدِ محترم صحابی رسول کی بابت نقل کیا کہ وہ جمعہ کے دن غسل کرتے، پھر وضو ٹوٹنے پر صرف وضو کرتے اور دوبارہ غسل نہ کرتے، نماز ہوتے ہی غسلِ جمعہ کا وقت نکل جائے گا تو جس نے بعد از نماز غسل کیا تو یہ غسلِ جمعہ نہ کہلائے گا اور نہ اس کا فاعل اس حکمِ نبوی کا عامل باور ہو گا، کیونکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی جمعہ کو آئے تو غسل کرے۔''[3] اسے جماعت نے تخریج کیا، مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں: «إِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْتِيَ الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ» ''جمعہ کو جاؤ تو غسل کرو۔''[4] ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا۔

۲ عیدین کا غسل

علماء کے نزدیک عیدین کے لیے غسل کرنا مستحب ہے، اس بابت کوئی صحیح حدیث مروی نہیں، مصنف ''البدر المنیر'' لکھتے ہیں: غسلِ عیدین کی احادیث ضعیف ہیں، البتہ اس میں کئی جید آثارِ صحابہ موجود ہیں (بقول البانی رحمہ اللہ: اس ضمن کی احسن روایت جو بیہقی نے امام شافعی عن زاذان سے نقل کی کہ ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے غسل کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا:

---

[1] صحيح مسلم: ٨٥٧. [2] صحيح البخاري: ٨٩٧؛ صحيح مسلم: ٨٤٩. [3] صحيح البخاري: ٨٩٤؛ صحيح مسلم: ٨٤٤. [4] صحيح مسلم: ٨٤٤.

چاہو تو روزانہ غسل کرلو، اس نے کہا: میں بطور خاص جن ایام کے لیے غسل کیا جائے ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، کہا: جمعہ، یوم عرفہ اور عیدین کے لیے غسل کرو، اس کی سند صحیح ہے۔[1]

③ میت کو نہلانے والے کے لیے غسل

یہ کثیر اہل علم کے نزدیک مستحب ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے میت کو غسل دیا وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔''[2] اسے احمد اور اصحاب سنن وغیرہم نے نقل کیا، ائمہ نے اس حدیث میں طعن کیا ہے۔ علی بن مدینی، احمد، ابن منذر اور رافعی رحمہم اللہ وغیرہم کہتے ہیں: علمائے حدیث نے اس باب میں کسی روایت کو صحیح قرار نہیں دیا، لیکن ابن حجر رحمہ اللہ اس مذکورہ روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: ترمذی نے اسے حسن اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے، یہ اپنے کثرت طرق کے پیش نظر کم از کم حسن کے درجہ میں ضرور ہے تو نووی رحمہ اللہ کا ترمذی کے اسے حسن کہنے کا انکار قابلِ اعتراض ہے۔ ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس حدیث کے کئی طرق ان روایات سے اقویٰ ہیں جنہیں فقہاء نے قابلِ حجت سمجھا ہے، حدیث میں مذکور یہ امر ندب پر محمول ہے کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم میت کو غسل دیتے تو بعض ہمارے غسل کر لیتے اور بعض نہ کرتے تھے،[3] اسے خطیب نے بسند صحیح نقل کیا۔ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے جب اپنے شوہر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی میت کو غسل دیا تو وہاں موجود مہاجرین کو ندا دی اور کہا: آج شدید سردی ہے اور میرا روزہ ہے، کیا مجھ پر نہانا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! اسے امام مالک رحمہ اللہ نے نقل کیا۔[4]

④ احرام باندھتے وقت غسل

حج یا عمرہ کا احرام باندھتے وقت غسل کرنا جمہور کے نزدیک مندوب ہے، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے احرام باندھتے وقت غسل کیا۔[5] اسے دارقطنی، بیہقی اور ترمذی نے نقل کیا ترمذی نے اسے حسن اور عقیلی نے ضعیف قرار دیا۔

⑤ مکہ میں داخل ہوتے وقت غسل

یہ بھی مستحب ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے منقول ہے کہ جب مکہ آتے تو رات وادی ذی طویٰ میں گزارتے، پھر صبح اٹھ کر دن کے اجالے میں مکہ داخل ہوتے اور بتلاتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی کیا کرتے تھے،[6] اسے بخاری و مسلم نے تخریج کیا، یہ مسلم کے الفاظ ہیں، بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ دخولِ مکہ کے وقت تمام علماء کے نزدیک غسل کرنا مستحب ہے، لیکن اگر ترک کیا

---

① إرواء الغليل ١/ ١٧٦. ② صحيح، سنن أبي داود: ٣١٦١؛ سنن ترمذي: ٩٩٣؛ سنن ابن ماجه: ١٤٦٣.
③ صحيح، سنن الدارقطني: ١٨٠٢؛ تاريخ بغداد: ٥/ ٤٢٤. ④ صحيح، المؤطا امام مالك: ١/ ٢٢٣.
⑤ صحيح، سنن ترمذي: ٨٣٠؛ سنن الدارقطني: ٢٤١٠. ⑥ صحيح البخاري: ١٥١٣؛ صحيح مسلم: ١٢٥٩.

تو کوئی فدیہ نہیں، اکثر کے نزدیک صرف وضو کرنا بھی کافی ہے۔

⑥ وقوفِ عرفہ کا غسل

یہ بھی مندوب ہے، امام مالک رحمہ اللہ کی نافع سے روایت میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما احرام پہننے سے قبل دخولِ مکہ کے وقت اور وقوفِ عرفہ کے لیے شام کو غسل کیا کرتے تھے۔

غسل کے ارکان

شرعی غسل درج ذیل دو امور کے ساتھ مکمل ہوگا:

① نیت

کیونکہ اسی سے عبادت کا عادت اور معمول سے تفرقہ ہے اور (جیسا کہ پہلے گزرا) نیت ایک خالص قلبی عمل ہے، بہت سے لوگ جو آج کل ہر عبادت کے لیے بول کر نیت کرتے اور خاص الفاظ کہتے ہیں تو یہ غیر مشروع اور محدث یعنی بدعت ہے، اس کا ترک اور اس سے اعراض کرنا چاہیے، حقیقتِ نیت پر وضو کے باب میں بحث گزر چکی۔

② تمام اعضا کو دھونا

کیونکہ قرآن نے کہا: ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (المائدۃ:٦)

”اگر تم جنبی ہو تو غسل کر لو۔“

(یعنی فاطہروا کا معنی ہے ”اِغْتَسِلُوْا“ غسل کرو) اور کہا:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾

”(اے نبی!) آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے! وہ ایک طرح کی گندگی ہے، سو حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔“ (البقرۃ:٢٢٢)

(یعنی یطھرن سے مراد أی یغتسلن غسل کرنا ہے) اس امر کی دلیل کہ تطہیر سے مراد غسل ہے، جو صریحاً درج ذیل آیت میں وارد ہوا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ (النساء:٤٣)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو

اور نہ اس حال میں کہ جنبی ہو، مگر راستہ عبور کرنے والے، یہاں تک کہ غسل کرلو۔‘‘

حقیقتِ غسل تمام اعضائے جسمانی کا دھونا ہے۔

غسل کی سنن

غسل کرنے والے کو چاہیے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے اثنائے غسل فعل کی اقتدا اور مراعات کرے تو

① تین دفعہ ہاتھ دھونے کے ساتھ آغاز کرے۔

② پھر شرمگاہ دھوئے۔

③ پھر پورا وضو کرے، چاہے تو پاؤں دھونا غسل کے آخر تک مؤخر کرلے (یہ اگر پرانی طرز کا غسلخانہ ہو جس میں پاؤں پھر سے آلودہ ہو جاتے تھے۔)

④ پھر سر پر تین مرتبہ پانی ڈالے اور بالوں کا خلال بھی کرے تاکہ جڑوں تک پانی پہنچ جائے۔

⑤ پھر (باقی) سب جسم پر پانی بہائے اور اس کا آغاز داہنی جانب سے کرے، بغلوں کے اندر بھی پانی پہنچائے، کانوں، ناف اور اسی طرح پاؤں کی انگلیوں کے درمیان بھی اور جتنے بدن کا مَلنا ممکن ہو مَلے، اس سب کی اصل جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہوا کہ نبی کریم ﷺ جب غسلِ جنابت کرتے تو اولاً ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ کے ساتھ بائیں کف میں پانی لے کر شرمگاہ دھوتے، پھر نماز والا وضو کرتے، پھر تین چلو پانی سر مبارک پر ڈالتے، پھر انگلیوں کے ساتھ بالوں کی جڑیں ہلاتے (انہیں گیلا کرتے) جب دیکھتے کہ جلد تک پانی پہنچا دیا ہے تو پھر باقی جسم پر ڈالتے،[1] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، انہی سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب غسلِ جنابت کرنا چاہتے تو تیل طلب فرماتے تو کف میں لے کر سر کی داہنی جانب سے شروع کرتے، پھر بائیں حصے کو، پھر کف میں لے کر پورے سر پر لگاتے۔[2] سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے غسل کے لیے پانی رکھا تو آپ نے ہاتھوں میں ڈالا اور انہیں دو یا تین مرتبہ دھویا، پھر دائیں کے ساتھ بائیں ہاتھ میں پانی بھرا تو اس کے ساتھ استنجا کیا، پھر ہاتھ کو زمین پر ملا، پھر کلی کی، ناک صاف کیا، پھر چہرہ اور بازو دھوئے، پھر تین مرتبہ سر دھویا، پھر (باقی) جسم پر پانی ڈالا، پھر اس جگہ سے الگ ہو کر پاؤں دھوئے، کہتی ہیں: جب نہانے سے فارغ ہوئے تو میں (پونچھنے کے لیے) کپڑا لائی، لیکن آپ نے اسے نہ پکڑا بلکہ ہاتھ کے ساتھ جسم جھاڑنے لگے،[3] اسے جماعت نے تخریج کیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: ۲۴۸؛ صحیح مسلم: ۳۱۶. [2] صحیح البخاری: ۲۵۸؛ صحیح مسلم: ۳۱۸.
[3] صحیح البخاری: ۲۵۷؛ صحیح مسلم: ۳۱۷.

عورت کے غسل کا طریقہ

عورت بھی اسی مذکورہ طریقہ سے غسل کرے گی، البتہ اس کے لیے ضروری نہیں کہ اپنے جُوڑے کھولے اگر کھولے بغیر پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ سکتا ہے، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں بالوں کا جُوڑا بناتی ہوں، کیا غسلِ جنابت کرتے ہوئے اسے کھولوں؟ فرمایا: ''یہی کافی ہے کہ سر پر (تین مرتبہ) ڈالو، پھر باقی سارے جسم پر تو یہ تمہارا طہور ہے۔''[1] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے۔ عبید بن عمیر سے مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما عورتوں کو بوقتِ غسل جوڑا کھولنے کا حکم دیتے ہیں تو کہنے لگیں: کیوں نہ بال منڈوانے کا حکم ہی دے دیا؟ میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے (یعنی اکٹھے) غسل کرتے تو میں اس سے زیادہ نہ کرتی تھی کہ سر پر تین دفعہ پانی ڈال لیتی،[2] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، حیض یا نفاس سے غسلِ طہارت کرتے ہوئے مستحب ہے کہ عورت روئی وغیرہ کا ایک ٹکڑا لے اور اس پر کوئی خوشبو ملے پھر خون نکلنے کے محل پر اسے لگائے تاکہ بدبو ختم ہو، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے غسلِ حیض کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''تمہاری ایسی خاتون پانی اور بیری کے پتے لے اور اچھی طرح سے وضو کرے، پھر سر پر پانی ڈالے اور اسے اچھی طرح ملے حتی کہ جڑوں تک پہنچ جائے، پھر پانی بہائے، پھر خوشبو لگا روئی وغیرہ کا ٹکڑا لے اور اس کے ساتھ طہارت حاصل کرے، سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کہنے لگی: کس طرح؟ فرمایا: «سُبْحَانَ اللّٰهِ! تَطَهَّرِيْ بِهَا»، (تعجب کیا کہ وہ بات کو سمجھ نہیں رہی) تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں سمجھایا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں کہ انصار کی عورتیں اچھی خواتین تھیں کہ حیا انہیں دین کی سمجھ حاصل کرنے اور دینی مسائل پوچھنے سے نہیں روکتی تھی، اسے ترمذی کے سوا دیگر سب (اصحاب صحاح) نے نقل کیا۔

غسل سے متعلق چند مزید مسائل

① حیض و جنابت، جمعہ اور عید اور جنابت و جمعہ کے لیے ایک ہی غسل کافی ہوگا اگر سب کی نیت کر لی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوىٰ» ''ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔''[3]

② اگر غسلِ جنابت کیا اور وضو کیا ہوا نہیں تھا تو اب غسل ہی وضو کی قائم مقامی کرے گا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہ کیا کرتے تھے (اسے ابو داود، نسائی اور ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا اور اس کی سند صحیح ہے) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص سے کہا: ''جس نے ان سے کہا تھا کہ میں غسل کے بعد وضو بھی کرتا ہوں کہ ''لَقَدْ تَعَمَّقْتَ'' یعنی تم تو خوب تعمق کا مظاہرہ کرتے ہو۔ (اسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں نقل کیا)

---

[1] صحیح مسلم: ٣٣٠؛ سنن ترمذی: ١٠٥. [2] صحیح مسلم: ٣٣١. [3] صحیح البخاری: ١؛ صحیح مسلم: ١٩٠٧.

ابو بکر بن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علماء اس امر میں باہم مختلف نہیں کہ وضو غسل کے تحت داخل ہے اور یہ کہ طہارتِ جنابت کی نیت طہارتِ حدث پر بھی لاگو ہوتی ہے اور اسے بھی زائل کر ڈالتی ہے، کیونکہ جنابت کے موانع حدث (یعنی بے وضو ہونے) کے موانع سے اکثر ہیں تو اول اکثر کی نیت میں داخل ہے اور اکبر (حدث) کی نیت اس (یعنی حدث اصغر یعنی بے وضو کی حالت) سے کفایت کرنے والی ہے۔

③ جنبی اور حائض کے لیے بال صاف کرنا، ناخن تراشنا اور بازار جانا وغیرہ امور بلا کراہت جائز ہیں، عطاء کے بقول جنبی سینگی لگا سکتا، ناخن کاٹ سکتا اور سر منڈوا سکتا ہے، چاہے وضو بھی نہ کرے۔[1] اسے بخاری نے نقل کیا۔

④ حمام جانے میں حرج نہیں، اگر شرمگاہ پر نظر پڑنے سے محفوظ ہے امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر حمام (یعنی عوامی غسل خانے) میں سب لوگوں نے تہہ بند وغیرہ پہنے ہوئے ہیں تو چلے جاؤ وگرنہ نہیں، ایک حدیثِ نبوی میں ہے: ''مرد مرد کی اور عورت عورت کی شرمگاہ کی طرف نہ دیکھے۔''[2] حمام میں ذکر واذکار کرنے میں بھی حرج نہیں کہ اللہ کا ذکر ہر حال میں حسن ہے، جب تک کوئی مانع وارد نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں اللہ کا ذکر کر لیتے تھے۔

⑤ تولیہ وغیرہ کے ساتھ جسم صاف کر لینے میں حرج نہیں غسل اور وضو دونوں میں چاہے موسمِ گرما ہو یا سرما۔

⑥ عورت کے بچے ہوئے پانی کے ساتھ مرد اور اس کے غسل سے بچے ہوئے پانی کے ساتھ عورت نہا سکتی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ میاں بیوی اکٹھے ایک ہی برتن سے غسل کریں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض ازواج مطہرات نے ایک ہی ٹب میں غسل کیا، بعد ازاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی سے وضو یا غسل کرنا چاہا تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں جنبی تھی (اور اس برتن سے غسل کیا ہے) فرمایا: ''پانی جنبی نہیں ہوتا۔''[3] اسے احمد، ابو داود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا اور یہ حسن صحیح ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اکٹھے ایک ہی برتن سے غسل کر لیتی تھیں۔

⑦ لوگوں کے سامنے ننگے نہانا جائز نہیں، کیونکہ کسی کے سامنے برہنہ ہونا حرام ہے، ہاں اگر ستر ڈھانپا ہوا ہو (یعنی ناف تا گھٹنے تک یا کم از کم شرمگاہ کا حصہ) تب حرج نہیں، اگر نظروں سے دور کہیں خلوت میں ہو تب مانع نہیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام دور جا کر ننگے نہا لیا کرتے تھے،[4] جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ''ایک مرتبہ ایوب علیہ السلام (خلوت میں) ننگے نہا رہے تھے (یہ ان کا غسلِ صحت تھا) کہ ان پر سونے کی ٹڈیوں کی بارش ہونا شروع ہوئی وہ انہیں اپنے کپڑے میں جمع کرنے لگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پکارا: اے ایوب! جسے آپ دیکھ رہے ہیں، کیا ہم نے آپ کو اس سے بے نیاز نہیں کر دیا؟ کہا: کیوں نہیں، آپ کی عزت کی قسم! مگر آپ کی برکت سے تو بے پروا نہیں ہوا۔''[5] اسے احمد، بخاری اور نسائی نے تخریج کیا۔

---

① صحیح البخاری تعلیقاً: کتاب الغسل باب: ٢٤، الجنب یخرج ویمشی...... ② صحیح مسلم: ٣٣٨؛ سنن أبی داود: ٤٠١٨. ③ صحیح، سنن أبی داود: ٦٨؛ سنن ترمذی: ٦٥؛ سنن نسائی: ٣٢٦. ④ صحیح البخاری: ٢٧٨. ⑤ صحیح البخاری: ٢٧٩؛ مسند أحمد: ٢/ ٣١٤.

تیمم

① تیمم کی تعریف

لغت میں تیمم قصد کرنے کے معنی میں ہے، شرعی اصطلاح میں مٹی کا قصد کرنا اور اسے ہاتھوں پر لگا کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرنا نماز وتلاوت کی ادائیگی کی نیت سے۔

② تیمم کی مشروعیت کی دلیل

اس کی مشروعیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾ (النساء : ٤٣)

''اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں یا تم میں سے کوئی بیت الخلا سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمم) کر لو۔''

جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام زمین میرے اور میری امت کے لیے مسجد اور طہور بنا دی گئی ہے، تو جہاں بھی تم ہو اور نماز کا وقت ہو جائے وہیں (اگر پانی نہ ملے تو) تیمم کر کے نماز ادا کر لو۔''[1] اسے احمد نے نقل کیا اور جو اجماع ہے تو اس لیے کہ اہل اسلام کا خاص احوال میں وضو اور غسل کے بدل کے بطور تیمم کی مشروعیت پر اجماع ہے۔

③ امت محمدیہ کا تیمم کے ساتھ اختصاص

یہ ان منجملہ امور کے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ خاص کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو قبل ازیں کسی کو نہ دی گئیں:

① ایک ماہ کی دوری سے میرا رعب دشمنوں پر طاری ہے۔

② زمین میرے لیے مسجد وطہور بنائی گئی، لہٰذا جہاں بھی نماز کا وقت ہو وہیں ادا کر لی جائے (یعنی اگر آس پاس مسجد موجود نہیں)۔

③ میرے لیے مالِ غنیمت حلال کیا گیا جو پہلے کسی کے لیے نہ تھا۔

---

[1] صحيح، مسند أحمد: ٥/ ٢٤٨.

④ مجھے شفاعت عطا کی گئی۔

⑤ ہر سابقہ نبی صرف اپنی قوم کے لیے مبعوث تھا، جب کہ میری نبوت تمام اہلِ عالم کے لیے عام ہے۔''[1] اسے شیخین نے نقل کیا۔

④ تیمم کی مشروعیت کا پس منظر

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ صحرا میں تھے کہ میرا ہار گم ہو گیا، جس کی تلاش کے لیے پڑاؤ ڈالا گیا اور لوگوں کے پاس پانی موجود نہ تھا، انہوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے میرا شکوہ کیا کہ کس طرح ہمیں روکے ہوئے ہیں، وہ ہمارے خیمہ میں آئے اور نبی کریم ﷺ اس وقت میرے زانو پر سر مبارک رکھے محوِ استراحت تھے اور مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے. اس حالت میں صبح ہوئی کہ پانی موجود نہیں تھا (اور ہار ابھی ملا نہ تھا) تو اللہ نے آیتِ تیمم نازل کی: ﴿ فَتَيَمَّمُوا ﴾(المائدة:٦) اس پر سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے آل ابوبکر! یہ آپ حضرات کی پہلی برکت نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: جب (ہار کی تلاش سے مایوس ہو کر سفر شروع کرنے کے لیے) میرا اونٹ اٹھایا گیا تو ہار اس کے نیچے پڑا تھا،[2] اسے سوائے ترمذی کے دیگر سب نے تخریج کیا۔

⑤ تیمم مباح کرنے والے اسباب

حدثِ اصغر ہو یا حدثِ اکبر، حضر ہو یا سفر، جب درج ذیل میں سے کوئی سبب موجود ہو تو تیمم کرنا جائز و مباح ہو گا:

① جب پانی موجود نہ ہو یا نا کافی ہو، سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے، جماعت کھڑی ہوئی، فراغت کے بعد آپ نے دیکھا کہ ایک شخص الگ تھلگ بیٹھا ہے جو جماعت میں شامل نہ ہوا تھا، اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا: میں جنبی ہوں اور (نہانے کے لیے) پانی موجود نہیں، آپ نے فرمایا: «عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيْكَ» ''اس صورت میں تمہیں مٹی کافی ہے۔''[3] متفق علیہ، سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر دس سال بھی پانی نہ ملے تو طہارت کے لیے مٹی ہی کافی ہے،[4] اسے اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن صحیح ہے، لیکن تیمم کرنے سے قبل ضروری ہے کہ آس پاس پانی کی تلاش وطلب کرے، اگر اس کے عدم کا یقین ہے یا وہ دور ہے تب اس پر تلاش کرنا واجب نہیں۔

② اسے کوئی زخم لگا ہوا ہے یا کوئی مرض لاحق ہے اور پانی کے استعمال سے زخم بگڑنے یا مرض کے زیادہ ہونے کا خدشہ ہے چاہے اس کا یہ ذاتی خیال وتجربہ ہو یا اطبا نے بتلایا ہو تو تیمم کرنا مباح ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک سفر کے دوران میں ایک شخص کا سر پتھر لگنے سے زخمی ہو گیا، پھر اسے احتلام بھی ہو گیا، اس نے ہمراہیوں سے پوچھا: کیا میرے لیے (نہانے کی

---

[1] صحيح البخاري: ٣٣٥؛ صحيح مسلم: ٥٢١. [2] صحيح البخاري: ٣٣٤؛ صحيح مسلم: ٣٦٧؛ سنن نسائي: ٣٠٩. [3] صحيح البخاري: ٣٤٤؛ صحيح مسلم: ٦٨٢. [4] سنن أبي داود: ٣٣٢؛ سنن ترمذي: ١٢٤.

بجائے) تیمم کرنے کی رخصت ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارا نہیں خیال کہ رخصت ہو، کیونکہ تم پانی کے استعمال کرنے پر قادر ہو، چنانچہ اس نے غسل کیا مگر (زخم بگڑنے سے) موت واقع ہوگئی، واپس آئے تو نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ سے آگاہ کیا تو (آپ سخت ناراض ہوئے اور) فرمایا: ''انہوں نے (غلط مسئلہ بتلا کر) اسے قتل کر دیا، اللہ انہیں غارت کرے، اگر مسئلے کا علم نہ تھا تو کسی اور سے پوچھ لیا ہوتا! کیونکہ جہل کا علاج سوال ہے اور تیمم کر لینا کافی تھا یا پھر زخم پر پٹی باندھ لیتا اور بقیہ جسم دھو کر اس پر مسح کرتا۔''[1] اسے ابوداود، ابن ماجہ اور دارقطنی نے نقل کیا، ابن سکن نے صحت کا حکم لگایا۔

③ جب پانی نہایت ٹھنڈا ہو اور اسے ظنِ غالب ہو کہ پانی کے استعمال سے ضرر لاحق ہو سکتا ہے اور اس کے پاس پانی گرم کرنے کی سہولت بھی نہ ہو اور کسی سے کرانے کی اجرت بھی نہیں نیز کوئی گرم حمام بھی موجود نہیں یا موجود ہے مگر اس کی استطاعت نہیں تو تیمم کر سکتا ہے، سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں غزوہ ذات السلاسل میں امیرِ لشکر بنا کر بھیجا، کہتے ہیں: ایک نہایت ٹھنڈی رات میں مجھے احتلام ہوگیا تو میں ڈرا کہ اگر غسل کیا تو جان کو خطرہ ہوگا، لہٰذا تیمم کر کے ہمراہیوں کو (صبح کی) نماز پڑھادی (کیونکہ امیرِ لشکر ہی امامت کرایا کرتے تھے) واپس ہوئے تو نبی کریم ﷺ کو یہ قصہ بتلایا گیا آپ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا: ''اے عمرو! تم نے حالتِ جنابت میں امامت کرا دی؟'' میں نے عرض کی: میرے مدِ نظر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تھا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ (النساء:۲۹)

''اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو! بے شک اللہ تم پہ مہربان ہے۔''

لہٰذا تیمم کر کے امامت کرا دی، اس پر نبی کریم ﷺ ہنس پڑے اور کچھ نہ کہا۔[2] اسے احمد، ابو داود، حاکم، دارقطنی اور ابن حبان نے نقل کیا، بخاری نے بھی صحیح میں معلقاً درج کیا ہے، نبی کریم ﷺ کا سکوت اس امر کی تقریر ہے (حدیث تقریری) کیونکہ آپ ناجائز فعل پر سکوت نہ کرتے تھے۔

④ پانی تو قریب ہے مگر اسے اپنی جان یا عزت یا مال کے ضیاع کا خدشہ ہے یا ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا، یا اس کے اور پانی کے درمیان دشمن حائل ہے چاہے یہ دشمن آدمی کی صورت میں ہو یا کوئی اور (مثلاً درندے اور سانپ وغیرہ) یا وہ قیدی ہے یا پانی نکالنے سے عاجز ہے، کیونکہ ان احوال میں اس کی نسبت پانی کا وجود اور عدم وجود ایک برابر ہے، اسی طرح کوئی ڈرا کہ اگر غسل کیا تو لوگ شکوک وشبہات کا شکار ہوں گے اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچے گا تو بھی تیمم جائز ہے۔ (بقول محشی مثلاً کسی دوست کے گھر میں رات گزاری اور رات کو احتلام ہو گیا تو اگر صبح غسل کیا تو شکوک ہو سکتے ہیں)

⑤ پانی ہے مگر فوری طور پر یا بعد ازاں خود پینے یا کسی اور کے لیے اس کی ضرورت ہے، چاہے یہ کوئی اور کلبِ غیر عقور ہی ہو (یعنی گلی محلوں میں رہنے والے کتے جو عموماً کاٹتے نہیں) یا آٹا وغیرہ گوندھنے کے لیے اس کی ضرورت ہے یا کھانا پکانے کے

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ٣٣٦؛ سنن ابن ماجه: ٥٧٢. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٣٣٤؛ سنن الدارقطني: ٦٧٠.

لیے، یا ایسی نجاست کے ازالہ کے لیے جوضروری ہے تو تیمم کرسکتا ہے، امام احمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں: متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ پانی کوضروری کاموں کے لیے محفوظ کیا اور خود تیمم کرلیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مسافر کی بابت جوجنبی ہو جائے اور اس کے پاس قلیل پانی ہے اور ڈر ہے کہ اگر اس سے نہالیا تو پیاس بجھانے کو نہ ہوگا، کہا کہ وہ تیمم کر لے اور اس کے ساتھ نہائے نہیں،[1] اسے دارقطنی نے نقل کیا، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: جسے پیشاب کی حاجت ہو اور پانی موجود نہیں تو افضل یہ ہے کہ تیمم کر کے نماز ادا کر لے اور اس صورتحال میں اگر کسی کا وضو برقرار ہے تو کوشش کر کے اگلی نماز تک لے جائے اگرچہ پیشاب روکنا پڑے۔

⑥ پانی کے استعمال پر قادر ہے لیکن ڈر ہے کہ اگر وضو کرنے یا نہانے لگ گیا تو نماز کا وقت نکل جائے گا، لہٰذا تیمم کر کے پڑھ لے اور اس کے ذمہ اعادہ بھی نہیں۔

⑥ کیسی مٹی کے ساتھ تیمم کرے؟

پاک مٹی کے ساتھ تیمم کرنا ہوگا اور ہر اس کے ساتھ جو زمین کی جنس سے ہے، جیسے: ریت، پتھر اور گچ و چونا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (المائدة:٦) ''پس پاک مٹی سے تیمم کرلو۔'' اہلِ لغت متفق ہیں کہ صعید سطحِ زمین ہے چاہے وہ (معروف) مٹی ہو یا اس کا غیر (مثلاً ریت، شور، پتھریلی زمین)۔

⑦ تیمم کا طریقہ

پہلے نیت کرے (اور یہ فرض ہے) نیت پر وضو کے باب میں بات گزر گئی، پھر بسم اللہ پڑھے اور مٹی پر دونوں ہاتھ مارے اور ان کے ساتھ چہرے اور کلائی تک دونوں ہاتھوں کا مسح کرے، اس ضمن میں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سے زیادہ صحیح اور صریح روایت موجود نہیں، کہتے ہیں: میں جنبی ہوا اور نہانے کے لیے پانی نہ مل سکا تو میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوا اور پھر نماز پڑھ لی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ((إِنَّمَا يَكْفِيْكَ هٰكَذَا)) ''اس طرح کرنا ہی کافی تھا۔'' اور آپ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں، پھر ان میں پھونک ماری، پھر ان کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا،[2] متفق علیہ، ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''تجھے کافی تھا کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر مارتا، پھر ان میں پھونک مارتا، پھر ان کے ساتھ چہرے اور کلائی تک ہاتھوں کا مسح کر لیتا۔''[3] اسے دارقطنی نے تخریج کیا، اس حدیث میں دونوں ہتھیلیوں کی ایک ہی ضرب پر اکتفا کا بیان ہے اور یہ کہ مٹی کے ساتھ تیمم کرنے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ ہاتھوں کو جھاڑے اور ان میں پھونک مارے یہ نہیں کہ چہرہ بالکل ہی خاک آلود کر لے۔

---

[1] سنن الدارقطني: ٧٦٤؛ السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٢٣٤. [2] صحيح البخاري: ٣٣٨؛ صحيح مسلم: ٣٦٨.
[3] سنن الدارقطني: ٦٩١؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٢١٠.

⑧ تیمم کے ساتھ مباح امور

پانی کے عدم کی صورت میں تیمم وضو اور غسل کا بدل ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہر وہ امر مباح ہے جو ان دو کے ساتھ ہے، مثلاً: قرآن چھونا اور نماز کی ادائیگی وغیرہ، اس کی صحت کے لیے وقت کا دخول شرط نہیں، ایک تیمم کے ساتھ جتنے چاہے فرائض و نوافل ادا کر سکتا ہے (جب تک محدث نہیں ہوتا) تو اس کا حکم کلیۃً وضو کے حکم کی مثل ہے، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مٹی مسلمان کا طہور (یعنی وضو کا مادہ ہے) اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے، ہاں اگر پانی ہو تب وہی استعمال کرے کیونکہ وہ خیر ہے۔''[1] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور حکمِ صحت لگایا۔

⑨ تیمم کے نواقض

جو چیز وضو کی ناقض ہے وہ تیمم کی بھی ہے، کیونکہ یہ اس کا بدل ہے، اسی طرح پانی مل جانا بھی اس کا ناقض ہے، اگر اس کے فقدان کی وجہ سے تیمم کیا تھا اسی طرح جس نے بوجہ عجز کیا لیکن پھر وہ استعمال پر قادر ہوا لیکن اگر نماز ادا کر لی، پھر پانی ملا یا قادر ہوا تب اس پر اعادہ واجب نہیں، اگرچہ وقت ابھی باقی ہو، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ دو صاحب سفر میں نکلے، نماز کا وقت ہو گیا اور ان کے ساتھ پانی نہ تھا تو تیمم کر کے نماز پڑھ لی، پھر ابھی وقت تھا کہ پانی مل گیا تو ان میں سے ایک نے نماز کا اعادہ کر لیا اور دوسرے نے نہیں کیا، جب نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ کو اس سے آگاہ کیا گیا، آپ نے اس شخص سے جس نے اعادہ نہ کیا تھا، فرمایا: «أَصَبْتَ السُّنَّةَ وأَجْزَأَتْكَ صَلاَتُكَ» ''تم سنت کو پہنچے اور تمہاری نماز ہو گئی۔'' اور دوسرے سے کہا: «لَكَ الأَجْرُ مَرَّتَيْنِ» ''تمہیں دہرا اجر ملا۔''[2] اسے ابوداود اور نسائی نے تخریج کیا، اگر ابھی نماز شروع ہی کی تھی کہ پانی مل گیا یا اس کے استعمال پر قادر بنا تو اس صورت میں اس کا تیمم ٹوٹ گیا، اسے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی سابق الذکر حدیث کی رو سے پانی کے ساتھ وضو کرنا ہوگا، اگر جنبی یا حائضہ نے تیمم مباح کرنے والے اسباب میں سے کسی کے مدِنظر تیمم کیا اور نماز پڑھ لی، تو اس کے ذمہ اعادہ نہیں، البتہ پانی ملنے یا قادر ہونے پر غسل کرے گا، سیدنا عمران رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی، جب فارغ ہوئے تو ایک شخص پر نظر پڑی جو جماعت میں شریک نہ ہوا تھا، آپ نے فرمایا: ''اے فلاں! تمہارے لیے کیا مانع تھا کہ جماعت میں شریک ہوئے؟'' اس نے کہا: مجھے جنابت پہنچی اور پانی موجود نہیں، فرمایا: ''مٹی تمہیں کافی تھی۔'' روایت میں ہے کہ بعد ازاں پانی ملنے پر اس صحابی کو پانی کا برتن عطا ہوا اور ہدایت دی کہ اسے اپنے اوپر بہالو۔''[3] اسے بخاری نے تخریج کیا۔

---

① صحيح، مسند أحمد: ٢١٣٧١؛ سنن أبی داود: ٣٣٢. ② صحيح، سنن أبی داود: ٣٣٨؛ سنن نسائی: ٤٣١.
③ صحيح البخاري: ٣٣٤؛ صحيح مسلم: ٨٢.

جبیرہ (ٹوٹی ہڈی باندھنے کی لکڑی یا پٹی) وغیرہ پر مسح

جبیرہ اور اس جیسی پٹیوں پر جن کے ساتھ متأثرہ عضو باندھا جاتا ہے مسح کرنا جائز ہے، اس ضمن کی وارد احادیث کے پیشِ نظر اگرچہ یہ ضعیف ہیں، مگر ان کے متعدد طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں اور مشروعیت پر استدلال کے لیے ٹھیک ہیں، مثلاً سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک صحابی کا سر زخمی ہوگیا، پھر نہانے کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی، جب نبی علیہ السلام کو خبر دی گئی تو آپ سخت ناراض ہوئے اور آپ نے فرمایا: ''تیمم کر لینا کافی تھا، یا پھر زخم پر مٹی باندھ لیتا اور بقیہ جسم دھو کر اس پر مسح کر لیتا۔''[1] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ انہوں نے پٹی پر مسح کیا۔ اثنائے وضو اور غسلِ واجب کرتے ہوئے پٹی پر مسح کا حکم ہے، بجائے اس عضوِ مریض کے دھونے کے جسے کوئی زخم لگا یا ہڈی ٹوٹ گئی اور اس نے وضو یا غسل کا ارادہ کیا تو اس پر اپنے اعضا کا دھونا واجب ہے، چاہے پانی گرم کر کے اگر عضوِ مریض پر پانی ڈالنے سے ضرر کا اندیشہ ہے کہ کوئی مرض لاحق ہوسکتا ہے یا تکلیف میں اضافہ یا شفا میں تاخیر ہوسکتی ہے تو بجائے دھونے کے مسح کر لے اور اگر مسح کرنے سے بھی ضرر کا خدشہ ہے تو واجب ہے کہ زخم پر پٹی باندھ لے یا ٹوٹی ہڈی پر کوئی چیز کس کر باندھ لے اس طور پر کہ صرف متأثرہ عضو پر ہی رہے، ہاں اگر باندھنے میں صحیح عضو کا کچھ حصہ بھی چھپ گیا تو حرج نہیں، لہٰذا اب اس پٹی پر مسح کرسکتا ہے، اس کے لیے یہ بھی شرط نہیں کہ باندھنے سے قبل یہ عضو دھویا ہوا اور نہ اس میں کسی مدت کی قید ہے، بلکہ جب تک عذر قائم ہے وہ وضو اور غسل میں اس پر مسح کرسکتا ہے، متأثرہ جگہ پہ بندھی چیز اگر اتار دی یا آرام آنے پر تو مسح کی رخصت ختم ہوجائے گی۔

فاقد الطهورين (یعنی جسے نہ پانی ملا اور نہ تیمم کے لیے مٹی تو اس) کی نماز

اگر پانی کے ساتھ ساتھ مٹی بھی نہیں پاتا تو ایسے ہی نماز پڑھ لے اور اس کے ذمہ اعادہ بھی نہیں کیونکہ مسلم کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہار کی گمشدگی والے واقعہ کی روایت میں ہے کہ نماز کا وقت ہونے پر ان صحابہ کرام نے جنہیں ہار کی تلاش میں بھیجا تھا بغیر وضو کے (اور ابھی تیمم کی رخصت نازل نہ ہوئی تھی) نماز ادا کر لی تھی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اس امر کا شکوہ کیا، اس پر آیتِ تیمم نازل ہوئی جس پر خوش ہو کر سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے) کہا تھا: اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کو کبھی کوئی معاملہ درپیش ہوا، تو اللہ نے آپ کے لیے اس سے خلاصی کی سبیل نکالی اور مسلمانوں کو خیر و برکت ملی تو ان صحابہ نے پانی کی عدم موجودگی میں ویسے ہی نماز پڑھ لی اور اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا اور آپ نے انکار نہ فرمایا اور نہ انہیں اعادہ کا حکم دیا، بقول امام نووی رحمہ اللہ دلیل کے لحاظ سے یہی سب سے قوی ہے۔

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ٣٣٦؛ سنن ابن ماجه: ٥٧٢.

حیض

① حیض کی تعریف

حیض کا لغوی معنی سیلان ہے (یعنی بہنا) یہاں اس سے مراد عورت کی اگلی شرمگاہ سے خون کا خروج، حالتِ صحت میں بغیر ولادت کے سبب کے اور بغیر افتضاض (یعنی شادی اور جماع) کے۔

② حیض کا وقت

کثیر علماء کی رائے میں اس کی ابتدا لڑکی کے نو برس کی عمر کو پہنچنے سے قبل نہیں ہوتی (بقول محشی یعنی قمری نو سال اور قمری برس ۳۵۴ دنوں کا ہوتا ہے) اگر اس عمر سے قبل وہ خون دیکھے تو وہ حیض کا خون شمار نہ ہوگا، بلکہ وہ کسی علت اور خرابی کا خون ہے، حیض مدت العمر جاری رہ سکتا ہے، اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ کسی خاص عمر میں اس کا انقطاع ہو جاتا ہے، اگر سال خوردہ بڑھیا بھی اپنی شرمگاہ سے خون کا خروج دیکھے تو وہ حیض شمار ہوگا۔

③ حیض کا رنگ

اس ضمن میں شرط ہے کہ درج ذیل میں سے خون کسی رنگ کا ہو:

(الف) سیاہ، کیونکہ سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ انہیں استحاضہ کا مرض لاحق تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''حیض کا جو خون ہوگا وہ برنگِ سیاہ ہوگا، عورتیں جسے خوب پہچانتی ہیں تو اگر یہ ہو تو نماز سے رکی رہو اور اگر رنگ بدل جائے تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو، کیونکہ یہ خون ایک رگ کا ہے (یعنی بوجہ مرض کے ہے)''[①] اسے ابو داود، نسائی، ابن حبان اور دارقطنی نے نقل کیا بقول ان کے اس کے سب راوی ثقہ ہیں، اسے حاکم نے بھی تخریج کیا اور کہا: اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔

(ب) سرخ، کیونکہ خون کا اصلی رنگ یہی ہے۔

(ج) زرد، یہ لوہے کو لگے زنگ کی مانند نظر آتا ہے جس پر زردی کا غلبہ ہوتا ہے۔

(د) گدلا، یہ جو سیاہ و سفید کے درمیان کا رنگ ہو، جیسے میلا پانی ہوتا ہے، علقمہ بن ابو علقمہ اپنی والدہ مرجانہ جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ لونڈی تھیں، سے راوی ہیں کہ عورتیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اپنا ایک ڈبہ بھیجتیں جس میں روئی کا ٹکڑا ہوتا اور اس پر حیض کے خون کا زرد اثر لگا ہوتا اور پوچھتیں (کہ اب اس رنگ کا خون آرہا ہے تو) کیا نماز پڑھنا شروع کر دیں؟ وہ کہتیں: جلدی نہ کروحتی کہ قصہ بیضا دیکھ لو (یعنی بالکل سفید ہو روئی کا ٹکڑا جس میں کسی زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو)،[②] اسے مالک اور محمد بن حسن نے نقل کیا، بخاری نے بھی اسے معلقاً ذکر کیا، زرد اور گدلے رنگ کا پانی اگر (معروف) ایامِ حیض میں نکلا

---

① حسن، سنن أبي داود: ٢٨٦؛ سنن نسائي: ٢٠١؛ سنن دارقطني: ٧٨٠. ② حسن، المؤطا امام مالك: ١/ ٥٩؛ صحيح البخاري: قبل الرقم: ٣٢٠.

ہے، تب تو وہ حیض شمار ہوگا دیگر ایام میں اگر خارج ہوا ہے تب نہیں، کیونکہ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ہم طہر کے بعد خارج ہونے والے زرد اور گدلے رنگ کے مادے کو کچھ شمار نہ کرتی تھیں،[1] اسے ابو داود اور بخاری نے نقل کیا، بخاری رحمہ اللہ نے ''بَعْدَ الطُّهْرِ'' کا لفظ ذکر نہیں کیا۔

④ حیض کی مدت

حیض کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس ضمن میں کوئی قابلِ حجت روایت وارد نہیں تو اس سلسلہ میں ہر خاتون اپنے معمول و عادت کو ملحوظ رکھے گی، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جریانِ خون میں مبتلا خاتون کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''(ہر ماہ میں) اپنے معمول کے حیض کے روز و شب کا حساب رکھے تو ان میں نماز ادا نہ کرے۔''[2] (بقول محشی حیض کی کم از کم مدت میں بعض کا قول ہے کہ یہ ایک رات و دن ہے، بعض نے تین رات و دن کہا اسی طرح اس کی زیادہ سے زیادہ مدت میں ایک قول دس دن اور ایک پندرہ دن کا ہے) اسے ترمذی کے سوا باقی پانچ نے تخریج کیا، اگر اس کے لیے کوئی خاص عادت اور معمول نہیں تو سابق الذکر حدیثِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مدنظر متعلقہ قرائن ملحوظ رکھے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مذکور تھا کہ حیض کا خون سیاہی مائل ہوتا ہے تو اس سے دلالت ملی کہ عام طور پر عورتیں حیض کے خون کو پہچانتی ہیں۔

⑤ دو ماہواریوں کے مابین کے طہر کی مدت

علماء متفق ہیں کہ دو حیضوں کے درمیان متخلل طہر کی مدت کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں اس کی کم از کم مدت کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے پندرہ دن کہا، ایک فریق تیرہ دن کا قائل ہے، حق یہ ہے کہ طہر کی کم از کم مدت کے بارے بھی کوئی قابلِ احتجاج دلیل نہیں۔

نفاس

① نفاس کی تعریف

وہ خون جو عورت کی اگلی شرمگاہ سے ولادت کے سبب خارج ہوتا ہے، چاہے حمل گر گیا ہو۔

② نفاس کی مدت

نفاس کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں یہ ایک لحظہ بھی ہوسکتا ہے تو جب حمل وضع ہو اور ولادت کے فوری بعد خون کا خروج

---

[1] صحيح البخاري: ٣٢٦؛ سنن أبي داود: ٣٠٧. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٢٧٤؛ سنن نسائي: ٢٠٨.

منقطع ہو جائے یا بالکل ہی نہ آئے تو اس کا نفاس ختم ہوا اب وہ طاہر خاتون کے حکم میں ہے اور اس پر نماز و روزہ وغیرہما تمام فرائض کی بجا آوری ضروری ہے، جہاں تک اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ہے تو یہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی رو سے چالیس دن ہے، کہتی ہیں: نفاس والی خواتین عہدِ نبوی میں فرائض کی ادائیگی سے چالیس دن تک رکی رہتی تھیں،[1] اسے نسائی علاوہ باقی پانچ نے نقل کیا، ترمذی حدیثِ ہٰذا نقل کر کے لکھتے ہیں، صحابہ وتابعین کے اہل علم اور مابعد کا اجماع ہے کہ نفاس والی عورت چالیس دن تک نماز چھوڑے رکھے گی، اِلَّا یہ کہ اس سے قبل ہی طہر دیکھ لے، تب وہ غسل کر کے نماز و روزہ شروع کر دے، اگر چالیس دن کے بعد بھی خون دیکھے تو اکثر کے نزدیک (یہ نفاس نہیں لہٰذا) نماز ترک نہ کرے۔

حیض ونفاس والی خاتون پر کیا امور حرام ہیں؟

وہ سب امور ان پر حرام ہیں جو جنبی کے لیے حرام ہیں اور یہ سب حدثِ اکبر کے ساتھ محدث کہلائیں گے، حائضہ اور نفسا پر مزید یہ امور بھی حرام ہیں:

① روزہ رکھنا

اگر رکھا تو وہ شمار نہ ہوگا اور اس کے ذمہ قضا ہوگی، رمضان میں بوجہ حیض ونفاس چھوڑے روزوں کی وہ قضا دے گی، البتہ نمازوں کی نہیں دے گی کیونکہ اس میں مشقت ہے، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر یا اضحیٰ میں عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے معشرِ نساء! کثرت سے صدقہ دیا کرو کیونکہ میں نے اہلِ نار کی اکثریت عورتوں کی دیکھی ہے۔'' انہوں نے کہا: اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: ''خراب زبان کا مظاہرہ بکثرت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری بھی، پھر تمہاری عقل و دین میں کمی ہے'' انہوں نے اس کی تفصیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا: ''کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے آدھی نہیں؟'' ہم نے کہا: جی ہاں! فرمایا: ''یہی اس کی عقل کی کمی ہے اور عورت حیض کے دوران میں نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے تو یہ اس کے دین کی کمی ہے۔''[2] اسے بخاری ومسلم نے نقل کیا، سیدہ معاذہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ حائضہ روزوں کی قضا دیتی ہے، نمازوں کی نہیں؟ کہا: عہدِ نبوی میں ہمیں یہی حکم ملا تھا کہ روزوں کی قضا دیں نمازوں کی نہیں،[3] اسے جماعت نے نقل کیا۔

② جماع کرنا

اس کے حرام ہونے پر کتاب وسنت کی نص اور اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ حائضہ اور نفسا سے جماع حلال نہیں جب تک وہ طہارت نہ پالے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہودیوں کی خواتین کو حیض آتا تو نہ ان سے جماع کرتے اور نہ اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتے، صحابہ نے اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

---

① صحیح، سنن أبی داود: ۳۱۱، ۳۱۲؛ سنن ترمذی: ۱۳۹؛ سنن ابن ماجہ: ۶٤۸، ٦٤۹. ② صحیح البخاری: ۳۰٤؛ صحیح مسلم: ۷۹. ③ صحیح البخاری: ۳۲۱؛ صحیح مسلم: ۳۳۵.

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾(البقرة: ٢٢٢) ''(اے نبی!) تم یہ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دیجیے! وہ ایک طرح کی گندگی ہے، سو حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔''

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ماسوائے جماع کے ہر چیز کر سکتے ہو۔''[1] سوائے بخاری کے سب نے اسے نقل کیا، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر کوئی مسلمان حائضہ سے جماع کی حلت کا اعتقاد رکھے گا تو وہ کافر و مرتد ہو جائے گا، اگر حلت کا اعتقاد رکھے بغیر بھولے سے یا بوجہ حکم سے لاعلمی یا یہ کہ حائضہ ہونے کا پتہ نہ تھا تو جماع کر لیا، تب اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کفارہ اور اگر عملاً حیض اور حرمت کا علم ہونے کے باوجود اپنے اختیار سے جماع کیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا، واجب ہے کہ توبہ کرے، اس صورت میں کفارہ واجب ہونے کی بابت دو اقوال ہیں، اصح یہ کہ کوئی کفارہ نہیں (بقول محشی یہ کلام محلِ نظر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایک دینار یا نصف دینار کا صدقہ کرے۔'' اسے ابو داود اور نسائی وغیرہ نے نقل کیا اور یہ بقول البانی صحیح روایت ہے) پھر لکھتے ہیں: نوعِ ثانی یہ ہے کہ شرمگاہ کا حصہ چھوڑ کر جماع کے سوا مباشرت کرے، یہ بالا جماع حلال ہے، نوعِ ثالث یہ کہ عورت کی ناف اور گھٹنہ کے مابین کے حصہ سے مباشرت (یعنی میل ملاپ) کرے، البتہ اگلی اور پچھلی شرمگاہ سے احتراز کرے، اکثر علماء اس نوعِ ثالث کی حرمت کے قائل ہیں، خود نووی رحمہ اللہ نے اس کی حلت مع الکراہت کی رائے اختیار کی ہے، کیونکہ من حیث الدلیل یہی اقویٰ ہے، یہ مشار الیہ دلیل جواز واج مطہرات سے مروی ہوا کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی کسی حائضہ زوجہ سے قربت چاہتے تو اس کی شرمگاہ پر کپڑا ڈال دیتے (اور ہمراہ لیٹ کر بوس و کنار وغیرہ کر لیتے)۔[2] اسے ابو داود نے نقل کیا، بقول امام ابن حجر رحمہ اللہ: اس کی سند قوی ہے، مسروق بن اجدع رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا: آدمی اپنی حائضہ بیوی سے کس حد تک قریب ہو سکتا ہے؟ کہا: ہر چیز کے ماسوائے شرمگاہ کے۔[3] اسے بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا۔

استحاضہ

① استحاضہ کی تعریف

یہ غیر ماہواری کے ایام میں خون کا مسلسل خروج اور جریان ہے (یعنی شرمگاہ سے)۔

② مستحاضہ خاتون کے احوال

---

[1] صحيح مسلم: ٣٠٢؛ سنن أبي داود: ٢٥٨؛ سنن ترمذي: ٢٩٧٧. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٢٧٢.
[3] سنن الدارقطني: ١٠٧٩.

اس کے لیے تین احوال ہیں:

① استحاضہ سے قبل اسے اپنے حیض کے ایام معلوم تھے تو استحاضہ کا عارضہ لاحق ہونے کی صورت میں اس کے یہ ایام حیض کے شمار ہوں گے اور باقی استحاضہ کے کیونکہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے (جیسا کہ اس کا ذکر پیچھے گزرا) کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: ''ایسی عورت اپنے معمول کے ایام حیض کا حساب رکھے۔ ان میں نماز و روزہ چھوڑے رکھے، پھر غسل کر کے شرمگاہ پر پٹی باندھے اور نماز ادا کیا کرے۔'' اسے امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور سوائے ترمذی کے باقی پانچ نے تخریج کیا، بقول نووی رحمہ اللہ اس کی اسناد صحیحین کی شرط پر ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حکم اس عورت کی نسبت ہے جسے اپنی ماہواری کے ایام معلوم ہیں اور استحاضہ کے عارضہ میں مبتلا ہونے سے قبل انہی میں اسے حیض آتا تھا تو اس کے لیے یہ مذکورہ حکم ہے کہ یہ ایام گزر جانے پر وہ معمول کا یکبارگی غسلِ طہارت کرے کیونکہ اب وہ طواہر خواتین کے حکم میں ہے۔

② مسلسل اسے خون آتا رہے اور اس کے لیے حیض کے معروف ایام نہیں یا تو اس وجہ سے کہ اپنی عادت و معمول کو بھول گئی یا وہ دمِ حیض کی دمِ استحاضہ سے تمیز نہیں کر سکتی تو اس حالت میں اس کا حیض اکثر خواتین کی عادت و معمول کے مطابق چھ یا سات دن ہو گا، کیونکہ سیدہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ مجھے شدت و کثرت سے استحاضہ کا خون آتا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھنے آئی تو آپ کو اپنی بہن ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر پایا، میں نے عرض کی کہ مجھے شدید استحاضہ ہے، کیا میں نماز و روزہ چھوڑے رکھوں؟ آپ نے فرمایا: ''مخرج پر روئی کا ٹکڑا باندھ لیا کرو اس سے (وقتی طور پر یعنی نماز پڑھنے کے وقت) خون رک جایا کرے گا۔'' انہوں نے کہا: وہ اس سے زیادہ ہے، فرمایا: ''کس کر لگام کی مانند باندھو۔'' عرض کی: اس سے بھی نہ رکے گا، فرمایا: ''پھر بڑا کپڑا لو۔'' عرض کی: وہ تو کثرت اور شدت سے بہتا رہتا ہے، فرمایا: ''میں دو باتیں بتلاتا ہوں، ان میں سے جو بھی کرو گی وہ کافی ہو گا، دونوں کی استطاعت رکھو تو یہ تم پر ہے۔'' فرمایا: ''تمہارا حیض اللہ کے علم میں چھ یا سات دن ہے، پھر غسل (طہارت) کر لو، پھر مہینہ کے بقیہ تیئس یا چوبیس دن نمازیں پڑھتی رہو اور روزے بھی رکھو (یعنی اگر رمضان ہو تو) یا پھر ایسا کیا کرو کہ ظہر کو موخر کر کے اور عصر کو اول وقت میں (یعنی جمع صوری) کر کے پڑھا کرو اور اس سے قبل غسل کر لیا کرو، اور اسی طرح مغرب کو موخر کرو اور اسے عشا کے ساتھ پڑھو، تب بھی غسل کر لیا کرو اور ایک غسل فجر کے وقت کیا کرو، اگر قدرت رکھو تو یہی کرتی رہو۔'' (جب تک منجانب اللہ شفا نہیں مل جاتی) پھر فرمایا: ''دونوں میں یہ آخری مجھے زیادہ پسند ہے۔''[1] اسے احمد، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح حدیث ہے، کہتے ہیں کہ میں نے اس کی بابت بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا انہوں نے تو کہا: یہ حسن ہے، بقول احمد یہ حسن صحیح ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: دراصل سیدہ حمنہ رضی اللہ عنہا کو استحاضہ کی مرض ان کے بالغ ہوتے ہی لگ گئی تھی، ابھی ان کے لیے حیض کی شروعات نہ ہوئی تھی اور نہ وہ اس کے خون کو پہچانتی تھیں اور انہیں مسلسل خون کا جریان

---

① صحیح، سنن أبی داود: ۲۸۷؛ سنن ترمذی: ۱۲۸.

رہا تھا، تبھی نبی کریم ﷺ نے ان کے معاملہ کا فیصلہ عام عرف کے لحاظ سے کیا اور عورتوں کے احوال میں امرِ غالب یہ ہے کہ ہر ماہ ایک بار انہیں حیض آتا ہے اور اس کی مدت معلوم ہے، کہتے ہیں: حیض، حمل، بلوغت اور ان سے مشابہ امور میں یہی حدیث خواتین کے امور کو ایک دوسرے پر قیاس کرنے میں اصل ہے۔

④ حیض کی اس کے لیے ابھی شروعات نہ ہوئی تھیں، لیکن وہ حیض کے خون کی دیگر خون سے تمیز کرنے کی استطاعت رکھتی ہے، اس صورت میں وہ اس تمیز کے اپنے تجربہ پر عمل کرے گی، کیونکہ سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کی روایت میں گزرا کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں کہا تھا: ''اگر حیض کا خون ہو تو وہ معروف سیاہ رنگ کا ہوگا تو اس دوران میں نماز و روزہ سے رکی رہو اور اگر کسی اور رنگ کا ہو تب وضو کر کے نماز پڑھو کیونکہ یہ دراصل رگ ہے۔''[1]

④ استحاضہ کے احکام

استحاضہ میں مبتلا خاتون کے لیے درج ذیل احکام ہیں:

① نماز پڑھنے کے لیے اس پر غسل واجب نہیں اور نہ کسی اور وقت بھی ماسوائے ایک غسلِ طہارت کے جو وہ حیض کے معروف ایام گزرنے پر کرے گی، یہی سلف وخلف کے جمہور کا مؤقف ہے۔

② ہر نماز کے لیے علیحدہ وضو کرنا اس پر واجب ہے، کیونکہ بخاری کی روایت میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مذکور ہوا: «ثُمَّ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صَلَاةٍ» ''ہر نماز کے لیے وضو کرو۔''[2] امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، واجب تبھی ہوگا جب سابقہ وضو ٹوٹے گا۔

③ وضو سے قبل لازماً استنجا کرے اور خون کے مخرج پر کوئی پٹی یا روئی کا ٹکڑا باندھ لے، تاکہ نماز کے دوران میں نجاست رکی رہے اور خون کے سیلان کی شدت میں کمی ہو، اگر اس سے مکمل طور پر خون کا جریان بند نہ ہو تو اسے کس کے شرمگاہ پر باندھ لے، یہ واجب نہیں صرف اولیٰ ہے۔

④ جمہور کے نزدیک نماز کا وقت ہونے پر ہی وضو کرے اور وضو کے بعد فوراً نماز ادا کرلے۔

⑤ جماہیر علماء کے نزدیک خون کے اس جریان کی حالت میں اس کا شوہر اس سے جماع کر سکتا ہے، کیونکہ تحریم جماع کی کوئی دلیل وارد نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر وہ اس حالت میں نماز ادا کر سکتی ہے جو اعظم (عمل) ہے تو جماع میں کیا حرج ہے؟ اسے بخاری نے نقل کیا (بخاری نے معلقاً اور ابن ابی شیبہ نے اسے موصولاً نقل کیا) عکرمہ عن حمنہ بنت جحش سے مروی ہے کہ وہ مستحاضہ تھیں اور اس حالت میں ان کا شوہر ان سے جماع کرتا تھا،[3] اسے ابوداود اور بیہقی نے تخریج کیا۔ بقول امام نووی رحمہ اللہ اس کی سند حسن ہے اور مستحاضہ خاتون طاہرات کے حکم میں ہے، لہٰذا ہر وہ عبادت کر سکتی ہے جو دیگر طاہرہ خاتون کرے، مثلاً: نماز، روزہ، اعتکاف، تلاوت، قرآن پکڑنا وغیرہ، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: ٣٣٤؛ المعجم الصغير للطبراني: ٢٣٠. [2] صحيح البخاري: ٢٢٨.
[3] سنن أبي داود: ٣١٠؛ سنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٣٢٩.

نماز کے مسائل

نماز ایک ایسی عبادت ہے جو کئی مخصوص اقوال وافعال پر مشتمل ہے، یہ تکبیر کے ساتھ شروع اور تسلیم کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

اسلام میں اس کی قدرت ومنزلت

اسلام میں اس کا وہ مقام ہے کہ کوئی اور عبادت اس کے برابر نہیں، یہ دین کا ستون ہے، اس کے بغیر دین قائم نہیں، نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے:

«رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ وَذِرْوَةُ سِنَامِهِ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ»

''اس ملت کا رأس۔یعنی اصل الاصول۔اسلام ہے اور اس کا ستون نماز اور اس کا عروج اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔''[1]

عبادات میں سب سے قبل اسی کو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا اور یہ شب معراج میں براہ راست نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے کیا (اسی سے اس کی فضیلت عیاں ہے) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: شب معراج کو پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، پھر کم کرتے کرتے پانچ رہ گئیں، پھر ندا آئی: اے محمد! میرے ہاں قول تبدیل نہیں ہوتا، یہ بظاہر پانچ ہیں مگر پچاس کی قائم مقامی کرتی ہیں۔[2] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، روزِ محشر پہلا سوال اسی کے بارے میں ہوگا، سیدنا عبداللہ بن قرط رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزِ قیامت بندے کا پہلا محاسبہ نماز کی بابت ہوگا، اگر یہ درست ہوئی (یعنی اسے اولین محاسبہ میں کامیابی ملی) تو بقیہ نیکی کے اعمال بھی درست ہوں گے اگر یہی نا مقبول نکلی تو اس کا سارا عمل فاسد قرار پائے گا۔''[3] اسے طبرانی نے نقل کیا، نبی کریم ﷺ نے دنیا چھوڑتے ہوئے آخری وصیت اسی کے بارے میں کی تھی، آخری سانس لیتے ہوئے بار بار کہے جاتے تھے: «اَلصَّلَاةَ، اَلصَّلَاةَ، وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ» ''نماز نماز اور تمہارے ماتحت (یعنی اپنے غلاموں اور نوکروں کی بابت کوتاہی نہ کرنا)[4] یہ دین کا آخری مظہر ہے جو آخر کار مفقود ہو جائے گا، جب اس کا ضیاع ہوگا تو سارا دین ہی ضائع ہو جائے گا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی عریٰ (کڑیاں) ایک ایک کر کے کم ہوتی جائیں گی، ایک کم ہوگی تو لوگ اگلی کو مضبوطی سے تھام لیں گے (حتی کہ سب ختم ہو جائیں گی) تو سب سے اولین نقص عدل و انصاف کے باب میں پیش آئے گا اور سب سے آخر میں نماز (اٹھ جائے گی)''[5] اسے ابن حبان نے سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] صحیح، سنن ترمذی:٢٦١٦. [2] صحیح، سنن ترمذی: ٢١٣؛ مسندأحمد: ١٦١. [3] صحیح، مجمع الزوائد: ١/ ٢٩٢؛ ترغیب الترهیب: ٥٣٩. [4] صحیح، سنن أبی داود: ٥١٥٦؛ سنن ابن ماجه: ٢٦٩٨.

[5] صحیح، مسند أحمد: ٥/ ٢٥١؛ ابن حبان: ٥/ ٦٧.

نقل کیا، قرآن کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نماز کا ذکر کرتا ہے تو کبھی اسے ذِکر کے ساتھ مقرون کرتا ہے، جیسے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ﴾(العنکبوت:٤٥)

''بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے مانع ہے۔''

اور﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾(الأعلیٰ:١٤۔١٥)

''کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاکیزہ کیا، اللہ کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔''

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾(طه:١٤)

''میری یاد کے لیے نماز پڑھو۔''

اور کبھی زکاۃ کے ساتھ، جیسے:

﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾(البقرة:١١٠)

''نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرو۔''

اور کبھی صبر کے ساتھ، جیسے:

﴿ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ﴾(البقرة:٤٥)

''نماز اور صبر کے ساتھ اللہ کی مدد کی طلب کرو۔''

اور کبھی قربانی کے ساتھ، جیسے:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ ﴾(الکوثر: ٢)

''اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی دو۔''

مزید فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾(الأنعام: ١٦٢۔١٦٣)

''کہہ دیجیے! میری نماز، میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرمانبردار ہوں۔''

اور کبھی نیکی کے اعمالِ کے ذکر کا افتتاح بھی نماز کے ساتھ کرتا ہے اور اختتام بھی، جیسے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾(المؤمنون: ١)

''یقیناً اہل ایمان کامیاب ہو گئے۔''

تا آنکہ کہا:

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾(المؤمنون:۱۰، ۱۱)

''ایسی صفات کے حامل لوگ جنت الفردوس کے وارث بنیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اسلام کی نماز کے ساتھ توجہ واہتمام اس حد تک ہے کہ ہر حالت میں سفر ہو یا حضر، امن ہو یا خوف اس کی محافظت کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾(البقرۃ:۲۳۸، ۲۳۹)

''نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً درمیان کی نماز کی اور اللہ کے آگے خشوع وخضوع سے کھڑے رہا کرو، اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیادے یا سوار (جیسے بھی ہو نماز ادا کرو) پھر جب امن ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو جس طریقہ کی اللہ نے تعلیم دی ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔''

سفر، حالتِ جنگ اور امن میں اس کی ادائیگی کی کیفیت بیان کی، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾(النساء: ۱۰۱، ۱۰۳)

''جب تم سفر کو جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نمازِ قصر پڑھو بشرطیکہ تم کو خوف ہو کہ کافر تمہیں ایذا دیں گے، بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں، (اے پیغمبر!) جب آپ ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہوں اور انہیں نماز پڑھانے لگیں تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت آپ کے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی رہے، جب وہ سجدہ کر چکیں تو پرے ہو جائیں، پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی (ان کی) جگہ آئے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز ادا کرے، کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تو تم پر اچانک حملہ کر دیں، اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو مگر ہوشیار ضرور رہنا، اللہ نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے، پھر جب تم نماز تمام کر چکو تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) اللہ کو یاد کرو، جب خوف

جاتا رہے تو (اس طرح سے) نماز پڑھو (جس طرح امن کی حالت میں پڑھتے ہو) بے شک نماز کا مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔''

نماز کی محافظت میں کوتاہی کرنے اور اس کا ضیاع کرنے والوں کے لیے شدید نکیر وتہدید وارد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم:۵۹)

''پھر ایسے ان کے جانشین بنے جنہوں نماز ضائع کی اور خواہشات کے غلام ہوئے، یہ عنقریب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔''

اور فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (الماعون:٤۔٥)

''نماز سے غافلوں کے لیے ہلاکت ہے۔''

اس لیے کہ نماز ان کبریٰ امور میں سے ہے جو ہدایتِ خاصہ کے محتاج ہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے بطورِ خاص دعا کی تھی کہ وہ انہیں اور ان کی ذریت کو نماز قائم کرنے والا بنائے، چنانچہ کہا:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ○ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ (إبراهيم:٤٠، ٤١)

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی، اے میرے رب! میری دعا قبول فرما، اے میرے رب! حساب کے دن میری، میرے والدین کی اور سب اہلِ ایمان کی مغفرت کرنا۔''

ترکِ نماز کا حکم

نماز کی فرضیت کا انکار کرتے ہوئے اسے ترک کرنا بالاجماع کفر اور ملتِ اسلام سے خروج ہے، لیکن جس کا اس پر ایمان اور اس کی فرضیت پر اعتقاد ہے اور بوجہ سستی یا مشغولیت تارکِ نماز ہے تو کئی احادیث اس کے بھی کافر ہونے کی تصریح کرتی ہیں اور یہ کہ ایسا شخص واجب القتل ہے، احادیث درج ذیل ہیں:

① سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ» ''آدمی اور کفر کے درمیان (فرق) نماز چھوڑنے کا ہے۔''[1] اسے احمد، مسلم، ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

② سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»

---

[1] صحیح مسلم: ٨٢؛ سنن أبی داود: ٤٦٧٨؛ سنن ترمذی: ٢٦٢٠.

''ہمارے اوران (کافروں) کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہے، جس نے اسے ترک کر دیا، اس نے کفر کیا۔''
اسے احمد اور اصحابِ سنن نے نقل کیا۔[1]

③ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''جس نے اس کی محافظت کی تو یہ اس کے لیے برہان اور روزِ قیامت نجات کا سبب بنے گی اور بصورتِ دیگر وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کا ساتھی بنے گا۔''[2] اسے احمد، طبرانی اور ابن حبان نے تخریج کیا اور اس کی سند جید ہے اس کی محافظت نہ کرنے والے کا قیامت کے دن آئمہ کفر کے ساتھ انجام ہونا اس کے کفر کو مقتضی ہے۔ بقول امام ابن قیم رحمہ اللہ: نماز کے تارک کا باعث یا مال ہوتا ہے یا اقتدار و ریاست اور یا پھر تجارت، تو اول کا انجام قارون کے ساتھ، دوسرے کا فرعون اور ہامان کے ساتھ اور جسے اس کی تجارت نے اس کی محافظت سے غافل رکھا، اس کا انجام ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

④ عبداللہ بن شقیق عقیلی کہتے ہیں: صحابہ کرام نماز کے علاوہ کسی اور عمل کے ترک کو کفر نہ سمجھتے تھے۔[3] اسے ترمذی اور حاکم نے نقل کیا، بقول حاکم یہ شیخین کی شرط پہ صحیح ہے۔

⑤ محمد بن نصر مروزی کہتے ہیں کہ اسحاق رحمہ اللہ کو سنا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ عمداً بغیر کسی شرعی عذر کے نماز ترک کرنے والا کہ اس کا وقت ختم ہوجائے وہ کافر ہے اور یہی عہدِ نبوی سے لے کر آج تک کے اہلِ علم کی رائے ہے۔

⑥ امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: سیدنا عمر، عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر کئی صحابہ سے منقول ہے کہ جس نے جان بوجھ کر کسی ایک فرض نماز کا ترک کیا، حتی کہ اس کا وقت نکل گیا تو وہ کافر و مرتد ہے اور ہم کسی اور صحابی کو اس رائے کا مخالف نہیں جانتے،[4] اسے منذری رحمہ اللہ نے الترغیب والترہیب میں ذکر کیا، پھر لکھا: صحابہ اور مابعد ادوار کے اہلِ علم کی ایک جماعت عمداً نماز کے ترک کرنے والے حتی کہ اس کا وقت نکل جائے کو کافر قرار دیتی ہے، ان میں سیدنا عمر، ابن مسعود، ابن عباس، معاذ بن جبل، جابر بن عبداللہ، ابو درداء رضی اللہ عنہم اور کئی دیگر صحابہ ہیں، غیر صحابہ میں سے یہ رائے رکھنے والوں میں امام احمد، ابن راہویہ، ابن مبارک، ابراہیم نخعی، حکم بن عتیبہ، ایوب سختیانی، ابو داود طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور زہیر بن حرب رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔

تارکِ نماز کے واجب القتل ہونے کے بارے میں صریح احادیث درج ذیل ہیں:

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ناقل ہیں کہ اسلام کی کڑیاں اور قواعد تین اشیا ہیں: انہی پر اسلام کی بنیادیں استوار ہیں، جس نے ان میں سے کسی ایک کا ترک کیا وہ اس کا کافر ہوا اب اس کا خون حلال ہے، اول: کلمۂ شہادت، دوم: فرض نماز

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۲۶۲۱؛ سنن نسائی: ٤٦٤؛ سنن ابن ماجہ: ۱۰۷۹۔ [2] صحیح، مسند أحمد: ۲/ ۱٦۹؛ ابن حبان: ۱٤٦۷۔ [3] صحیح، سنن ترمذی: ۲٦۲۲؛ المستدرك للحاكم: ۱/ ۷۔ [4] ترغیب الترھیب: ۸۱۸۔

اورسوم: رمضان کے روزے۔''[1] اسے ابویعلیٰ نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا، ایک روایت میں ہے: ''جس نے ان میں سے کسی ایک کا ترک کیا، وہ کافر باللہ ہوا، اب اس کی کوئی فرض ونفل عبادت مقبول نہیں اور اس کا مال و جان حلال ہے۔''[2]

② سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم ملا ہے کہ لوگوں سے قتال کروں حتی کہ وہ کلمہ پڑھ لیں، نماز قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں، اگر یہ کرلیں تو ان کا مال و جان محفوظ ہے،''[3] اسے بخاری و مسلم نے تخریج کیا۔

③ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے کئی امرا ایسے آئیں گے جو کچھ منکر امور بجا لائیں گے تو جس نے برا سمجھا وہ بری الذمہ بنا۔'' لوگوں نے عرض کی: کیا ہم ایسے لوگوں سے قتال نہ کریں؟ فرمایا: ((لَا مَا صَلَّوْا))[4] ''نہیں! جب تک نماز قائم رکھیں۔'' اسے مسلم نے نقل کیا تو یوں ان سے قتال کا مانع نماز کو بنایا۔

④ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کی کچھ مقدار بھیجی، آپ نے اسے چار افراد کے درمیان تقسیم کر دیا، اس پر ایک شخص بولا: یا رسول اللہ! اللہ سے ڈریں، فرمایا: ''تجھ پر ہلاکت ہو! کیا سب اہل زمین سے بڑھ کر میں اللہ سے ڈرنے والا نہیں؟'' وہ شخص پھرا تو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر ڈالنے کی اجازت طلب کی، مگر آپ نے فرمایا: ''نہیں! شاید وہ نمازی ہو۔'' تو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنی زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو دل میں نہیں ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے لوگوں کے دلوں میں نقب لگانے اور ان کے پیٹ چاک کرنے کا حکم نہیں دیا۔''[5] اس حدیث میں بھی اس کے قتل سے نماز کو مانع ٹھہرایا، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر وہ نمازی نہ ہوتا تو واجب القتل تھا۔

بعض علما کی رائے

اس ضمن میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ تارکِ نماز کافر نہیں بلکہ فاسق ہے، اسے توبہ کا کہا جائے، اگر نہ کرے تو امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ وغیرہما کے نزدیک حداً قتل کیا جائے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قتل نہیں بلکہ قید کر دیا جائے اور کوئی تعزیری سزا دی جائے اور جب تک نماز پڑھنے نہ لگے، اسے چھوڑا نہ جائے، انہوں نے سابق الذکر تکفیر کی احادیث کو اس شخص پر محمول کیا جو نماز کی فرضیت کا منکر ہے اور اس کے ترک کو حلال سمجھتا ہے، ان کے معارضہ میں کتاب وسنت سے کئی نصوص پیش کیں، مثلاً قرآن کی یہ آیت:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾

''اللہ تعالیٰ شرک کے سوا جو گناہ چاہے معاف کر دے۔'' (النساء:١١٦)

جیسے احمد و مسلم کی حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کو ایک دعا ایسی عطا کی گئی ہے جو قبول

---

[1] ضعیف، مسند ابی یعلی: ٢٣٤٩۔ [2] ترغیب الترھیب: ١/ ٤٤٦۔ [3] صحیح البخاری: ٢٥؛ صحیح مسلم: ٢٢۔ [4] صحیح مسلم: ١٨٥٤/ ٦٣۔ [5] صحیح البخاری: ٤٣٥١؛ صحیح مسلم: ١٠٦٤۔

ہوگی اور میں نے اپنی یہ دعا روزِ قیامت کے لیے مؤخر کر رکھی ہے اور یہ اپنی امت کی قیامت کے دن شفاعت ہوگی، جس کا فیض ان شاء اللہ ہر اس بندے کو پہنچے گا جو اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتا تھا۔''[1] بخاری رحمہ اللہ کے ہاں انہی سے یہ الفاظ مروی ہیں: ((أَسْعَدُ النَّاسِ بِشِفَاعَتِيْ مَنْ قَالَ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَالِصاً مِنْ قَلْبِهِ)) ''روزِ قیامت میری شفاعت سے سب سے بڑھ کر وہ شخص مستفید ہوگا جس نے خلوصِ دل سے کلمہ پڑھا۔''[2]

تارکِ نماز کے بارے میں ایک مناظرہ کی روداد

امام سبکی رحمہ اللہ نے طبقات الشافعیہ میں ذکر کیا ہے کہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے تارکِ نماز کے بارے باہم مناظرہ کیا، امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: اے احمد! کیا آپ کے نزدیک تارکِ نماز کافر ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! کہا: اگر کافر ہے تو وہ اب مسلمان کیسے ہو؟ احمد نے کہا: وہ کلمہ پڑھے، امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: کلمہ تو ہمیشہ وہ پڑھتا ہے کبھی اس کا ترک نہیں کیا، کہنے لگے: پھر اس کا مسلمان ہونا یہ ہوگا کہ نماز پڑھے (کیونکہ اسی کے ترک کے باعث ان کے نزدیک وہ کافر ہوا ہے) امام شافعی رحمہ اللہ کہنے لگے: کافر کی تو نماز ہی صحیح نہیں اور نہ اس کے ساتھ اس پر اسلام کا حکم لگایا جائے گا، اس پر امام احمد رحمہ اللہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ کی تحقیق

لکھتے ہیں: حق یہ ہے کہ تارکِ نماز کافر ہے، اسے قتل کیا جائے کیونکہ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ شارع نے تارکِ نماز کو کافر کہا ہے اور آدمی اور اس پر کفر کے اطلاق کے جواز کے مابین نماز کو حائل قرار دیا ہے، لہٰذا اس کا ترک کرنا کفر کے اطلاق کے جواز کو مقتضی ہے، جو ادلہ مخالفین نے اس کے معارضہ میں پیش کی ہیں ان میں سے کوئی چیز ہمیں لازم نہیں آتی، کیونکہ ہم کہیں گے: مانع نہیں کہ کفر کی بعض انواع مغفرت اور استحقاقِ شفاعت سے غیر مانع ہوں، جیسے بعض ان ذنوب کی وجہ اہلِ قبلہ کا کفر جنہیں شارع نے کفر کا نام دیا ہے، لہٰذا ان تاویلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں جو ان حضرات نے بتکلف ذکر کی ہیں۔

نماز کن پر واجب ہے؟

ہر مسلمان، عاقل اور بالغ (مرد و عورت) پر واجب ہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین (قسم کے افراد) مرفوع القلم ہیں (یعنی وہ مکلف نہیں، ان کا حساب و کتاب نہ ہوگا) ① سویا ہوا حتی کہ بیدار ہو، ② بچہ حتی کہ بالغ ہو ③ مجنون حتی کہ اس کی عقل لوٹ آئے۔''[3] اسے احمد، اصحابِ سنن اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، ترمذی نے حسن کہا۔

---

① صحيح مسلم: ١٩٩؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٧٥. ② صحيح البخاري: ٩٩. ③ صحيح،سنن أبى داود: ٤٣٩٨؛ سنن ترمذي: ١٤٢٣؛ سنن ابن ماجه: ٢٠٤١.

نابالغ کی نماز

اگرچہ نابالغ پر نماز فرض نہیں، مگر اس کے سرپرست کو چاہیے کہ جب اس کی عمر سات برس ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دے اور اگر دس برس کا ہو گیا اور ابھی نماز کے قریب نہیں جاتا تو اسے مارے تاکہ ابھی سے نماز کی عادت پختہ اور اس کی مشق ہو اور بالغ ہونے کے بعد چھوٹے نہیں، عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب سات برس کے ہو جائیں اور جب دس برس کے ہوں تو اس پر انہیں مارو اور ان کے بستر الگ کر دو،''[1] اسے احمد، ابوداود اور حاکم نے تخریج اور کہا: یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

فرض نمازوں کی تعداد

ایک رات و دن میں ان کی تعداد پانچ ہے، ابن محیریز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بنی کنانہ کے ایک صاحب نے جنہیں مخدجی کہا جاتا تھا، شام میں ابومحمد نامی ایک شخص سے سنا کہ وتر پڑھنا واجب ہے، کہتے ہیں کہ میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور انہیں اس قول سے آگاہ کیا تو کہنے لگے: وہ غلط کہتے ہیں کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ نے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں جو ان کی ادائیگی کرے اور بغیر بے پروائی کرتے ہوئے ان میں سے کچھ ضائع نہ کرے تو اس کے لیے اللہ کے ہاں عہد ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے اور جو ایسا نہ کرے تو اس کے لیے اللہ کے ہاں ایسا کوئی عہد نہیں، چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے معاف کر دے۔''[2] اسے احمد، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا اور ان کے الفاظ ہیں کہ جس نے انہیں ہلکا جانتے ہوئے کوئی کمی کی۔ سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک بکھرے بالوں والا دیہاتی حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ فرمایا: ''پانچ نمازیں ہیں، اِلّا یہ کہ تم نوافل بھی پڑھو۔'' عرض کی: زکاۃ میں کیا فرض کیا؟ الغرض سب شرائع اسلام کی اسے آگاہی دی تو کہنے لگا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت بخشی ہے! میں کوئی نفلی عبادت نہیں کروں گا، مگر فرائض میں بھی کوئی کمی نہ کروں گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر صحیح کہہ رہا ہے تو کامیاب ہوا'' یا یوں فرمایا: ''جنتی ہے اگر سچ کہہ رہا ہے۔''[3] متفق علیہ۔

اوقاتِ نماز

ہر نماز کے لیے ایک محدود وقت ہے، ضروری ہے کہ اسی کے اندر نماز ادا کی جائے، قرآن میں ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ (النساء:١٠٣)

''مومنوں پر وقت مقررہ میں نماز ادا کرنا فرض ہے۔''

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٤٩٥؛ سنن ترمذی: ٤٠٧. [2] صحیح، سنن أبی داود: ١٤٢٠؛ سنن نسائی: ٤٦٠؛ سنن ابن ماجہ: ١٤٠١. [3] صحیح البخاری: ١٨٩١؛ صحیح مسلم: ١١.

قرآن نے ان اوقات کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔

چنانچہ کہا:﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ﴾(ھود:١١٤)

''صبح وشام اور رات کی کئی ساعات میں نماز ادا کرو، یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں، یہ (اللہ کو) یاد کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔''

سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہوا:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾(بنی اسرائیل: ٧٨)

''(اے نبی!) سورج ڈھلنے سے لے کر رات کا اندھیرا چھانے تک نماز قائم کیجیے اور فجر کے وقت بھی قرآن (نماز میں) پڑھیے، یقیناً فجر کے وقت قرآن پڑھنے میں (فرشتوں کی) حاضری ہوتی ہے۔''

سورۂ طٰہٰ میں کہا:

﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی ﴾

''سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کیا کرو اور رات کی ساعات (اولین) میں بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور دن کے اطراف (یعنی دوپہر کے قریب ظہر کے وقت بھی) تاکہ تمہیں ہماری رضا حاصل ہو۔''(طٰہٰ: ١٣٠)

طلوعِ آفتاب سے قبل تسبیح سے مراد نماز فجر اور غروب سے قبل تسبیح سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ صحیحین میں سیدنا جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ہم حلقہ بگوش رسول اللہ ﷺ تھے کہ ماہِ کامل کی جانب نگاہ مبارک اٹھائی اور فرمایا: ''تم اپنے رب کا اس طرح دیدار کرو گے، جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، کوئی مشکل پیش نہ ہوگی تو اگر ممکن ہو تو طلوع آفتاب سے قبل کی نماز اور غروب آفتاب سے قبل کی نماز کا خاص خیال رکھو۔'' پھر سورۂ طہٰ کی یہی مندرجہ بالا آیت پڑھی،[1] تو قرآن نے ان مذکورہ اوقات کی طرف اشارہ دیا ہے، احادیث میں ان کی مکمل تفصیل وتحدید موجود ہے، ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ظہر کا وقت تب شروع ہوتا ہے، جب سورج کو زوال آجائے (یعنی نصف آسمان سے آگے جانبِ مغرب ڈھلک جائے) اور (اس کا آخری وقت) جب ہر آدمی کا سایہ اس کی مثل ہو، جب تک عصر کا اول وقت نہیں ہوتا اور عصر کا وقت سورج کے زرد ہونے تک رہتا ہے (یعنی غروب سے کوئی آدھ پون گھنٹہ قبل تک) اور فجر کی نماز کا وقت طلوعِ فجر تا طلوعِ آفتاب ہے، جب سورج طلوع ہو جائے تو نماز سے رک جاؤ، کیونکہ وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے،[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

---

[1] صحیح البخاری: ٥٥٤؛ صحیح مسلم: ٦٣٣. [2] صحیح مسلم: ٦١٢.

② سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جبرائیل علیہ السلام (ظہر کے وقت) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اٹھیے نماز پڑھیے! تو ظہر تب پڑھی جب سورج ڈھل گیا، پھر عصر کے وقت آئے اور کہا: اٹھیے اور عصر کی نماز ادا کیجیے! اور یہ تب جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو چکا تھا، پھر جب سورج غروب ہو گیا تو نماز مغرب کا کہنے آئے، پھر جب شفق غائب ہوئی تو عشا کا کہنے آئے، پھر فجر کا تب کہنے آئے جب فجر طلوع ہو چکی تھی، پھر اگلے روز ظہر کا تب کہنے آئے جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو چکا تھا، پھر عصر کے وقت تب آئے جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل ہو گیا تھا البتہ مغرب کے وہی کل والے وقت آئے، لیکن نماز عشاء کا کہنے تب آئے جب نصف رات یا ثلث رات گزر چکی تھی اور فجر کا کہنے اس وقت آئے جب فجر کی خاصی روشنی پھیل چکی تھی، پھر کہا: ((مَا بَيْنَ هٰذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ وَقْتٌ)) ''یہ نمازوں کے ابتدائی اور انتہائی اوقات ہیں۔''[1] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے تخریج کیا، بخاری نے اس حدیث کے بارے میں کہا کہ یہ اوقاتِ نماز کی بابت اصح ترین روایت ہے۔

ظہر کا وقت

دونوں سابق الذکر حدیثوں سے واضح ہوا کہ نماز ظہر کا وقت سورج کے آسمان کے وسط سے (مغرب کی طرف) ڈھلک جانے سے شروع ہوتا ہے اور ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہونے تک رہتا ہے فئ زوال کا استثناء کر کے، البتہ سخت گرمی میں ظہر کو اس کے اول وقت سے مؤخر کرنا مستحب ہے تاکہ خشوع مفقود نہ ہو، لیکن دیگر ایام میں اول وقت ادا کرنا اولیٰ ہے، اس کی دلیل سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سردی ہوتی تو نماز کی ادائیگی میں جلدی کرتے (یعنی اول وقت میں پڑھتے) اور اگر سخت گرمی ہوتی تو ابراد کرتے (یعنی کچھ تاخیر کرتے تاکہ مسجد کو جانے کے لیے سایہ مل جائے)،[2] اسے بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ موذن نے ظہر کی اذان کہنا چاہی تو آپ نے فرمایا: ''ابھی ٹھنڈا ہونے دو۔'' مؤذن نے کچھ دیر بعد پھر ارادہ کیا تو آپ نے پھر کہا: ''ابھی ٹھنڈا ہونے دو۔'' دو یا تین مرتبہ یہی ہوا حتی کہ ہم نے ٹیلوں کے سائے دیکھے، پھر آپ نے فرمایا: ''گرمی کی شدت جہنم کے جوش مارنے سے ہے لہٰذا جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو۔''[3] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

کس وقت تک ابراد کرنا چاہیے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: علماء کے ہاں ابراد کی غایت و انتہا کے بارے میں اختلافِ اقوال یہ ہے، ایک قول ہے کہ جب ہر چیز کا سایہ ایک گز ہو جائے زوال کے سایہ کے علاوہ، بعض نے انسانی قامت کا چوتھا حصہ کہا، بعض نے ثلث اور بعض نے نصف قامت کہا، کئی اور اقوال بھی ہیں، جاری علی القواعد یہ ہے کہ یہ معاملہ اختلافِ احوال پر منحصر ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ ظہر کے آخری وقت سے پہلے پہلے ادا کر لی جائے۔

---

① صحیح، سنن نسائی: ٥٢٥، سنن ترمذی: ١٤٩. ② صحیح البخاری: ٩٠٦. ③ صحیح البخاری: ٦٢٩؛ صحیح مسلم: ٦٠٦.

عصر کا وقت

وقتِ عصر کی ابتدا ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے پر فئ زوال کا استثناء کر کے ہوتی ہے اور اس کا آخری وقت غروبِ آفتاب تک ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جس نے غروب سے قبل ایک رکعت پالی گویا اس نے عصر کو پالیا (یعنی قضا کرنے سے بچ گیا)''[1] اسے جماعت نے نقل کیا، بیہقی کے ہاں یہ الفاظ ہیں کہ ''جسے غروب سے قبل ایک رکعت مل گئی جبکہ باقی تین رکعتیں بعد از غروب ادا کیں تو اس سے عصر فوت نہ ہوئی۔''[2] (یہ اضطراری حالت بیان کی ہے)

وقتِ اختیار اور وقتِ کراہت

عصر کی نماز کا وقتِ فضیلت و اختیار سورج کی رنگت زرد ہونے تک ہے، اسی پر سیدنا جابر اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم کی احادیث محمول کی جائیں گی، اس کے بعد تک نماز کی تاخیر اگرچہ جائز تو ہے لیکن مکروہ ہے، الّا یہ کہ کوئی عذر ہو، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''یہ منافق کی نماز ہے (یعنی سورج زرد ہونے کے بعد) جو بیٹھا سورج تکتا رہتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے۔''[3] یعنی اللہ کا ذکر اس میں قلیل کرتا ہے، اسے ماسوائے بخاری اور ابن ماجہ کے جماعت نے نقل کیا، امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ہمارے اصحاب (یعنی شافعیہ) کا کہنا ہے کہ عصر کے لیے پانچ اوقات ہیں:

① وقتِ فضیلت ② وقتِ اختیار ③ جواز بلا کراہت ④ جواز مع کراہت ⑤ وقتِ عذر

وقتِ فضیلت عصر کا اول وقت ہے، جبکہ وقتِ اختیار جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل ہو جائے، وقتِ جواز سورج کے زرد ہونے تک، جواز مع کراہت سورج زرد ہونے سے غروب تک اور وقتِ عذر وقتِ ظہر ہے اس شخص کے حق میں جو سفر یا بارش کی وجہ سے عصر کی نماز ظہر کے ساتھ جمع کر کے پڑھتا ہے تو ان سب مذکورہ اوقات میں عصر پڑھنا ادا شمار ہوگی (یعنی وقت کے اندر) لیکن اگر سورج غروب ہو گیا (اور ابھی عصر ادا نہیں کی) تو وہ قضا ہو گئی۔

ابر آلود دن عصر کی تعجیل کی تاکید

سیدنا بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے تو آپ نے فرمایا: ''ابر والے دن نماز میں تعجیل کرو کیونکہ جس کی نماز عصر فوت ہوئی اس کا عمل ضائع ہوا۔''[4] نماز عصر کی وعید دوسری احادیث سے ثابت ہے، اسے احمد اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، (یہ اس زمانہ کے احوال کے تناظر میں کہ جس میں کلاک اور گھڑیاں نہ تھیں اور لوگ سورج کی رفتار و سایہ دیکھ کر نمازوں کے اوقات کا اندازہ لگاتے تھے، دورِ حاضر میں چونکہ فوت ہونے کا خدشہ نہیں، لہٰذا ابر آلود ایام میں بھی ہر

---

① صحيح البخاري: ٥٧٩؛ صحيح مسلم: ٦٠٨. ② حسن، السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٣٦٨.

③ صحيح مسلم: ٦٢٢؛ سنن أبي داود: ٤١٣. ④ ضعيف، سنن ابن ماجه: ٦٩٤؛ مسند أحمد: ٥/ ٣٦١.

مسجد کے وقتِ مقررہ پر عصر ادا کی جائے) امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ترک (نماز) کی دو اقسام ہیں: ترکِ کلی کہ جو کبھی پڑھتا ہی نہیں تو اس شخص کا عمل محبوط (یعنی ضائع) ہے، دوم: ترکِ معین کہ کسی خاص دن عصر ضائع کر لی تو ایسے شخص کے لیے ایک دن کا عمل ضائع و محبوط ہوا۔

نمازِ عصر صلاۃِ وسطیٰ ہے

جس کا ذکر اس آیت میں ہوا:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (البقرۃ:۲۳۸)

صحیح احادیث میں تصریح ہے کہ نمازِ عصر ہی نمازِ وسطیٰ ہے، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے دن فرمایا: ''اللہ ان کفار کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھرے جنہوں نے ہمیں صلاۃِ وسطیٰ سے مشغول رکھا (یعنی ادائیگی کا موقع نہ دیا) حتی کہ سورج غروب ہو گیا۔''[1] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، مسلم، احمد، اور ابو داود کے ہاں یہ الفاظ ہیں: «شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطىٰ صَلَاةِ الْعَصْرِ» سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز عصر کا موقع نہ دیا حتی کہ سورج سرخ اور زرد ہو گیا تو آپ نے فرمایا: ''انہوں نے ہمیں صلاۃِ وسطیٰ نمازِ عصر سے مشغول رکھا ہے، اللہ ان کے پیٹ اور قبور آگ سے بھر دے۔''[2] اسے مسلم، احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

نماز مغرب کا وقت

جب سورج غروب ہو جائے اور چھپ جائے تو مغرب کا وقت شروع ہو جاتا ہے جو سرخ شفق تک رہتا ہے، سیدنا عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نمازِ مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے لے کر شفق کی موجودگی تک ہے۔''[3] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوقاتِ نماز کے بارے سوال کیا تو ایک حدیث ذکر کی جس میں نمازِ مغرب کی بابت یہ مذکور ہوا کہ ''جب سورج غروب ہو جائے تو نماز مغرب پڑھ لو۔'' اگلے روز اسے فرمایا: ''مغرب کو موخر کرو حتی کہ شفق غائب ہو جائے۔'' پھر فرمایا: ''اس کا وقت ان دو وقتوں کے مابین ہے۔''[4]
نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ہمارے اصحاب کے محققین مغرب کی تاخیر کے جواز کے قائل ہیں، جب تک کہ شفق غائب نہ ہو جائے اور اس دوران میں کسی بھی وقت اسے ادا کیا جا سکتا ہے اور اول وقت سے مؤخر کرنے پر وہ آثم نہ ہوگا، کہتے ہیں: یہی صحیح یا صائب ہے، جبریل علیہ السلام کی امامت کے بارے حدیث میں جو گزرا کہ دونوں دن ایک ہی وقت میں نماز مغرب پڑھائی اور وہ غروبِ آفتاب کے فوری بعد تو یہ تعجیلِ مغرب کے استحباب (بلکہ افضلیت) پر دلیل ہے کئی احادیث میں اس کی

---

[1] صحیح البخاری: ۲۹۳۱؛ صحیح مسلم: ٦٢٧. [2] صحیح مسلم: ٦٢٨؛ سنن ابن ماجہ: ٦٨٦. [3] صحیح مسلم: ٦١٢. [4] صحیح مسلم: ٦١٤.

تصریح ہے، چنانچہ سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت ہمیشہ فطرت پر کار بند رہے گی، جب تک وہ نمازِ مغرب ستارے نکلنے سے پہلے ادا کرتے رہیں گے۔''[1] اسے احمد اور طبرانی نے نقل کیا، مسند احمد میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مغرب کو ستارے نکلنے سے پہلے پہلے اس وقت ادا کرلیا کرو جب روزہ دار افطار کرتا ہے۔''[2] مسلم میں سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نمازِ مغرب نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ادا کرتے، پھر واپس آکر ہمارا کوئی ساتھی تیر چلاتا تو تیر گرنے کی جگہ دیکھ سکتے تھے، مسلم نے سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ سورج غروب ہوتے ہی مغرب ادا کرلیا کرتے تھے۔[3]

عشا کا وقت

سرخ شفق غائب ہونے سے عشا کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور نصف شب تک اس کا دورانیہ ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: لوگ (عہد نبوی میں) نمازِ عشا شفق غائب ہونے سے لے کر رات کے اول ثلث کے اختتام تک ادا کرتے تھے (یعنی اس دوران میں کسی بھی وقت)،[4] اسے بخاری نے روایت کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری امت پر گراں نہ ہوتا تو انہیں ثلث یا نصف شب تک عشا موخر کر کے ادا کرنے کا حکم دیتا۔''[5] اسے احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی نے صحت کا حکم لگایا، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک رات نمازِ عشا کے لیے ہم نبی کریم ﷺ کے منتظر تھے حتی کہ تقریبا آدھی رات ہوگئی، تب آپ تشریف لائے اور نماز پڑھائی تو آپ نے فرمایا: ''ابھی بیٹھو'' پھر کہا: ''لوگ اپنے بستروں میں جا چکے اور تم یہ ساری مدت نماز میں رہے ہو، جب سے اس کے منتظر تھے، اگر ضعیف کے ضعف، بیمار کی بیماری اور مشغول کی مصروفیت کا خیال نہ ہوتا تو میں اس نماز کو (ہمیشہ) آدھی رات کو ادا کرنے کا حکم دیتا۔''[6] اسے احمد، ابوداود، ابن ماجہ، نسائی اور ابن خزیمہ نے تخریج کیا جبکہ اس کی سند صحیح ہے، یہ وقتِ اختیار ہے، وقتِ جواز و اضطرار فجر تک پھیلا ہوا ہے، کیونکہ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونے میں حرج نہیں، حرج کی بات تو یہ ہے کہ نماز نہ پڑھے حتی کہ اگلی نماز کا وقت داخل ہو جائے۔''[7] اسے مسلم نے نقل کیا، یہ دلیل ہے کہ ہر نماز کا وقت اگلی نماز کا وقت ہونے تک ہوتا ہے، ماسوائے نمازِ فجر کے کیونکہ اس کا وقت ظہر تک نہیں، علماء کا اجماع ہے کہ اس کا وقت طلوعِ آفتاب ہونے تک ہے (کیونکہ اس بارے میں نصِ نبوی موجود ہے)۔

نمازِ عشا کی اس کے اول وقت سے تاخیر کا استحباب

افضل یہ ہے کہ نمازِ عشا کو اس کے وقتِ مختار کے آخر تک مؤخر کیا جائے جو نصف شب ہے، اس حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے

---

[1] حسن، مسند أحمد: ۳/ ٤٤٩، شعیب ارناؤط نے حسن قرار دیا ہے۔ [2] صحیح، مسند احمد: ٥/ ٤٢١، شعیب ارناؤط نے صحیح قرار دیا ہے۔ [3] صحیح البخاری: ٥٦١، صحیح مسلم: ٦٣٦. [4] صحیح البخاری: ٨٦٤. [5] صحیح، سنن ترمذی: ٦١٧، ابن ماجہ: ٦٩١. [6] صحیح، سنن أبی داود: ٤٢٢، سنن نسائی: ٥٣٧، سنن ابن ماجہ: ٦٩٣. [7] صحیح مسلم: ٦٨١.

پیشِ نظر جس میں ہے کہ ایک رات نبی کریم ﷺ نے نمازِ عشا کے لیے جانے میں تاخیر کی حتی کہ رات کا ایک حصہ گزر گیا اور اہلِ مسجد (بیٹھے بیٹھے) سوگئے، پھر آپ نکلے اور جماعت کرائی، پھر فرمایا: ''یہی اس کا وقت ہے اگر اپنی امت پر اسے گراں نہ سمجھتا۔''[1] اسے مسلم اور نسائی نے نقل کیا، اس معنی میں سیدنا ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما کی روایات گزریں اور یہ سب تاخیر کے استحباب وافضلیت پر دال ہیں اور واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ اس وقت عشا ادا کرنے کا ترک نمازیوں کے لیے مشقت ہونے کے پیشِ نظر کیا، نبی کریم ﷺ حالات کو ملحوظ رکھتے تھے، جب دیکھتے کہ نمازی جمع ہو گئے تو عشا میں تعجیل کرتے اور جب دیکھتے کہ ابھی زیادہ لوگ جمع نہیں ہوئے تو اسے مؤخر کر لیتے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز زوال کے فوری بعد پڑھتے، عصر کو اس وقت جب کہ سورج ابھی صاف اور چمکدار ہوتا، مغرب جب سورج غروب ہوتا اور عشا کبھی جلدی (یعنی اول وقت میں) ادا کرتے اور کبھی تاخیر کرتے، جب دیکھتے کہ لوگ جمع ہو چکے ہیں تو جلدی ادا کر لیتے اور اگر دیکھتے کہ لوگ ابھی جمع نہیں ہوئے تو تاخیر کرتے اور صبح کی نماز ہمیشہ منہ اندھیرے ادا فرماتے (یعنی طلوعِ فجر ہوتے ہی)،[2] اسے بخاری ومسلم نے نقل کیا۔

عشا سے قبل سو جانا یا اس کے بعد باتوں میں لگے رہنا

یہ دونوں امور مکروہ ہیں، سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نمازِ عشا کو مؤخر کرنا پسند کرتے تھے اور اس سے قبل سونے اور بعد میں باتوں میں لگے رہنے کو مکروہ گردانتے تھے۔[3] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عشا کے بعد گپیں ہانکنے کو نا پسند فرمایا، اسے ابن ماجہ نے تخریج کیا، عشا سے قبل سونے کی کراہت میں علت یہ ہے کہ کبھی اس وجہ سے مستحب وقت میں نماز عشا کی با جماعت ادائیگی فوت ہو سکتی ہے، اسی طرح بعد میں گپیں ہانکتے رہنے سے نیند متاثر ہوگی اور کثیر فوائد ضائع ہونے کا امکان ہے، لیکن اگر اس حالت میں سوتا ہے کہ کوئی نماز کے وقت جگانے والا موجود ہے یا عشا کے بعد (بجائے گپیں ہانکنے کے) خیر کی باتیں کرتا ہے، تب کراہت نہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امور کے بارے عشا کے بعد باہم مشاورت کرتے اور میں بھی ان کے ہمراہ ہوتا (یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بجائے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، شائد کاتب کا سہو ہے) اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ میں نے اپنی خالہ ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات گزاری اور اس رات نبی کریم ﷺ بھی وہیں تھے تو عشا کے بعد کچھ دیر آپ دونوں نے باہم گفتگو کی، پھر سو گئے، اسے مسلم نے نقل کیا۔

---

[1] صحیح مسلم: ٦٣٨؛ سنن نسائی: ٥٣٥. [2] صحیح البخاری: ٥٦٥؛ صحیح مسلم: ٦٣٦.
[3] سنن ابن ماجہ: ٧٠٣.

صبح کی نماز کا وقت

جیسا کہ ذکر کیا نمازِ صبح کا وقت فجرِ صادق طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے جو طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے۔

صبح کی تعجیل کا استحباب

اس طور پر کہ اول وقت میں ادا کر لی جائے، سیدنا ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ اندھیرے نمازِ فجر پڑھائی اور اگلے روز خاصی روشنی ہونے پر، لیکن پھر ہمیشہ وفات تک آپ منہ اندھیرے ہی نماز پڑھاتے رہے کبھی اسفار نہ کیا (یعنی روشنی پھیلنے پر نماز شروع نہیں کی)[1] اسے ابوداود اور بیہقی نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: مسلمان خواتین فجر کی جماعت میں حاضر ہوتیں اور اندھیرے کی وجہ سے کوئی تمیز نہ کرسکتا تھا (کہ مرد ہے یا عورت)،[2] اسے جماعت نے تخریج کیا، سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَصْبِحُوْا بِالصُّبْحِ فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأُجُوْرِكُمْ» ''نمازِ صبح روشن کر کے پڑھو کیونکہ یہ اجر میں اضافہ کا موجب ہے۔'' ایک طریق میں «أَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلْأَجْرِ» ہے،[3] اسے خمسہ نے نقل کیا، ترمذی اور ابن حبان نے صحت کا حکم لگایا، اس سے مراد نماز سے فارغ اس وقت ہونا جب اسفار ہو چکا ہو نہ کہ شروع اسفار میں، مراد یہ کہ فجر میں طویل قراءت کرو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب نماز ختم ہو تو روشنی پھیل چکی ہوگی، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ساٹھ تا سو آیات کی قراءت کرتے تھے یا مراد یہ ہے کہ اچھی طرح فجر طلوع ہو جانے کا تیقن کرلو، یہ نہ ہو کہ ظنِ غالب (کہ فجر طلوع ہو چکی ہے اور وہ ابھی طالع نہ ہوئی ہو) پر نماز پڑھ لو۔

وقت کے اندر (کم از کم) ایک رکعت کا پالینا

وقت کے خروج سے قبل جس نے ایک پوری رکعت (سجدہ تک) پا لی اس نے نماز کو (وقت کے اندر) پا لیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ» ''جسے وقت کے اندر کسی نماز کی ایک رکعت بھی مل گئی تو اسکی یہ نماز قضا نہ ہوئی۔''[4] اسے جماعت نے نقل کیا، یہ تمام نمازوں کے بارے میں ضابطہ ہے، بخاری کی روایت میں ہے: «إِذَا أَدْرَكَ أَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ، وَإِذَا أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ» ''جسے سورج کے غروب ہونے سے قبل عصر کی ایک رکعت مل گئی تو وہ اب پوری کرلے۔'' یہی بات صبح کی نماز کے بارے میں بھی کہی۔[5] سجدہ سے یہاں مراد رکعت ہے، احادیث کا ظاہر یہ ہے کہ جسے وقت کے اندر عصر و صبح کی ایک رکعت

---

[1] صحيح، سنن ابن داود: ٣٩٤؛ السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٣٦٤. [2] صحيح البخاري: ٥٧٨؛ صحيح مسلم: ٦٤٥. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٤٢٤؛ سنن ترمذي: ٥١٤. [4] صحيح البخاري: ٥٨٠؛ صحيح مسلم: ٦٠٧.
[5] صحيح البخاري: ٥٥٦.

مل گئی، اس کے حق میں یہ نماز مکروہ وقت میں ادا نہ ہوئی، وگرنہ تو عین طلوع اور عین غروب کا وقت اوقاتِ کراہت میں سے ہے اور یہ کہ نماز اداءً واقع ہوئی نہ کہ قضاءً مگر یہ کوئی خاص اور مجبوری کی حالت میں ہے، عمداً اس وقت تک تاخیر کرنا جائز نہیں۔

نماز سے سوتا رہ جانا یا بھول جانا

جو کسی نماز سے سوتا رہ گیا یا بھول گیا تو اس کے لیے اس کا وقت اب وہی ہے جب بیدار ہو اور جب یاد آجائے، سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نماز سے سویا رہ جانے والے کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''سویا رہ جانے والا بے قصور ہے! قصوروار وہ ہے جو جاگ رہا ہے، مگر نماز نہیں پڑھی'' اور فرمایا: ''کوئی بھول جائے کہ نماز نہیں پڑھی تھی تو جب یاد آئے اسی وقت پڑھ لے۔''[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جسے نماز کے بارے میں بھول لگ گئی وہ جب یاد آئے تب ادا کر لے اس کے سوا کوئی کفارہ اس پر عائد نہیں۔''[2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک سفر میں ہم چلے جا رہے تھے، پھر رات کے آخری حصہ میں پڑاؤ ڈالا اور اس وقت بیدار ہوئے جب سورج خاصہ اوپر آچکا تھا تو سب بیدار ہوئے اور نہایت گھبراہٹ میں وضو کی طرف لپکے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پرسکون ہو جانے کا حکم دیا، پھر قافلہ چل پڑا اور کچھ دور آگے جا کر سورج اور بلند ہوا تو آپ رکے، وضو کیا، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا، پھر دو سنتیں ادا کیں اور فجر کی جماعت کرائی، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا کل اس کے وقت میں اس کا اعادہ نہ کر لیں؟ تو فرمایا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تمہیں سود سے منع کرے اور خود تم سے وصول کرے؟''[3] اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا۔

اوقاتِ کراہت (وہ اوقات جن میں نماز پڑھنا منع ہے)

اس ضمن میں صبح کی نماز کی بعد نماز (یعنی نوافل) پڑھنے سے ممانعت وارد ہے، جب تک کہ سورج طلوع نہ ہو اور ایک نیزہ تک بلند نہ ہو جائے کیونکہ عین طلوع کے وقت بھی نماز پڑھنا منع ہے، اسی طرح عین دوپہر کو جب سورج وسط آسمان میں ہو، جب تک آگے کو ڈھلک نہ جائے (اصطلاح میں اس ڈھلنے کو زوالِ آفتاب کہا گیا، اس کی مدت تقریباً پندرہ منٹ ہوتی ہے) تیسرا وقتِ کراہت بعد از نمازِ عصر ہے جب تک سورج غروب نہ ہو جائے، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عصر کے بعد کوئی نماز نہیں جب تک سورج غروب نہ ہو جائے اور نہ فجر کے بعد حتی کہ سورج طلوع ہو جائے۔''[4] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سیدنا عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! مجھے نماز کے بارے میں تعلیم دیجیے، فرمایا: ''صبح کی نماز پڑھو، پھر (نوافل وغیرہ سے) رک جاؤ حتی کہ سورج طلوع ہو اور بلند ہو جائے، کیونکہ وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور اس وقت (بعض) کفار اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، پھر نمازیں پڑھتے رہو (یعنی نوافل) نمازیں مشہود و محضور ہیں (یعنی ان میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں) اور جب سایہ سمٹ کر بقدر ایک نیزہ کے

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۱۷۷؛ سنن نسائی: ٦١٤. [2] صحيح البخاري: ٥٩٧؛ صحيح مسلم: ٦٨٤.
[3] صحيح، ابن خزيمة: ٩٩٤؛ مسند أحمد: ٤/ ٤٤٩. [4] صحيح البخاري: ٥٨٦؛ صحيح مسلم: ٨٢٧.

رہ جائے تو رک جاؤ، کیونکہ اس وقت جہنم دہکائی جاتی ہے تو جب فئ (یعنی سایہ) آجائے تو پھر شروع ہو جاؤ، اب عصر تک اجازت ہے، عصر کی نماز ادا کرلو تو مغرب تک رکے رہو اور عین غروب کے وقت بھی کیونکہ سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور تب (بعض) کفار اس کے لیے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے تخریج کیا، سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: تین اوقات ایسے ہیں جن میں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگی نوافل سے منع فرمایا تھا اور یہ کہ ان میں مردے دفن کریں (بقول محشی یہ تب ہے جب عمداً ان اوقات میں میت کی تدفین کا قصد کیا جائے لیکن اگر بلاعمد ان میں سے کوئی وقت ہو گیا تب مکروہ نہیں) وہ جو یہ ہیں: جب سورج طلوع ہو رہا ہو حتی کہ بلند ہو جائے اور جب عین دوپہر ہو اور جب مائل بغروب ہو۔[2] سوائے بخاری کے اسے سب نے نقل کیا۔

فجر و عصر کے بعد ادائیگی نوافل کے بارے فقہا کی آراء

جمہور علماء کے نزدیک نماز فجر اور نماز عصر کے بعد فوت شدہ نمازوں کی قضا دینا اس ممانعت میں شامل نہیں، کیونکہ آپ کا فرمان ہے: ((مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا)) ''جسے نماز پڑھنا یاد نہ رہا تو جب یاد آئے تب ادا کر لے۔''[3] متفق علیہ جہاں تک نفل نماز کا تعلق ہے تو صحابہ میں سے سیدنا علی، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابوہریرہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم نے اسے مکروہ سمجھا ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے پر صحابہ کی موجودگی میں بلا نکیر لوگوں کو مارا کرتے تھے، سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی یہی کرتے تھے، تابعین میں سے اس کی کراہت کے قائل حسن بصری، سعید بن مسیب اور ائمہ مذاہب میں سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں ایسی نفل نماز ادا کرنا جائز ہے جو کسی سبب سے مربوط ہو، مثلاً: تحیۃ المسجد (یعنی مسجد میں داخل ہونے کی دو رکعت جو مستحب ہیں) اور تحیۃ الوضو (وضو کرنے کی مناسبت سے دو رکعت، یہ بھی مستحب ہیں) ان کا استدلال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہر کے بعد کی دو سنتوں کی بعد از نماز عصر ادائیگی کرنے سے ہے، حنابلہ کی رائے میں ان دو وقتوں میں غیر فرض نماز ادا کرنا حرام ہے، چاہے وہ کسی سبب سے ہی مربوط ہو ما سوائے طواف کی دو رکعتوں کے، ان کے پیش نظر سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بنی عبد مناف! کسی کو بیت اللہ کے طواف سے اور نماز پڑھنے سے مت روکو، چاہے وہ رات اور دن کے کسی بھی وقت یہ کرے۔''[4] اسے اصحاب سنن نے نقل کیا اور ابن خزیمہ اور ترمذی نے اس پر صحت کا حکم لگایا۔

طلوع، غروب اور عین استوا (جب سورج عین دوپہر وسط آسمان میں ہو) کے وقت نماز کی قضا دینے کے بارے آراء

حنفیہ مطلقاً ان اوقات میں نماز کی عدم صحت کے قائل ہیں چاہے فرض نماز ہو یا واجب یا نفل اور چاہے قضا ہو یا ادا البتہ انہوں نے اس دن کی عصر اور نمازِ جنازہ کا استثناء کیا ہے، اگر ان میں سے کسی وقت میں جنازہ حاضر ہو تو بلا کراہت پڑھ لیا

---

[1] صحيح مسلم: ٨٣٢، مسند أحمد: ٤/ ١١١. [2] صحيح مسلم: ٨٣٢؛ سنن ترمذي: ١٠٣٠. [3] صحيح البخاري: ٥٩٧، صحيح مسلم: ٦٨٤. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١٨٩٤؛ سنن ترمذي: ٨٦٨؛ سنن ابن ماجه: ١٢٥٤.

جائے، اسی طرح سجدۂ تلاوت بھی اگر ان اوقات میں اس کی آیات پڑھی جائیں، ابو یوسف نے جمعہ کے دن عین استوا کے وقت نوافل کی ادائیگی کا بھی اس سے استثناء کیا، شافعیہ ان اوقات میں کسی سبب کے ساتھ غیر مربوط نوافل کی ادائیگی کو مکروہ قرار دیتے ہیں، جہاں تک مطلقاً فرض نماز اور ایسی نماز جس کا کوئی سبب ہے اور جمعہ کے دن عین استوا کے وقت ادائیگی نوافل، کعبہ میں ادائیگی نوافل تو یہ سب ان کے ہاں بغیر کسی کراہت کے مباح ہیں، مالکیہ عین طلوع اور غروب کے وقت میں نوافل کی حرمت کے قائل ہیں چاہے ایسے نوافل ہوں جن کا کوئی سبب ہو، اسی طرح نذر کی نماز، سجدہ تلاوت اور نمازِ جنازہ ادا کرنا بھی ان کے ہاں مکروہ ہے، اِلّا یہ کہ لاش کے خراب ہونے کا خدشہ ہو تب جائز ہے، انہوں نے عینی فرائض کو اداءً وقضاءً ادا کرنا مباح کہا ہے، علامہ باجی رحمہ اللہ شرح موطا میں لکھتے ہیں: المبسوط میں ابن ذہب سے منقول ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے نصف نہار نماز ادا کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا کہ میں نے (مدینہ میں) لوگوں کو جمعہ کے دن نصف نہار کے وقت نوافل ادا کرتے پایا ہے اور بعض احادیث میں اس سے نہی وارد ہے لیکن میں نہ منع کرتا ہوں، کیونکہ لوگوں کو پڑھتے پایا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہوں، کیونکہ اس سے نہی وارد ہے۔

حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ان تین مذکورہ اوقات میں مطلقاً ہی نوافل منعقد نہیں ہوتے، چاہے ان کے لیے سبب ہو یا نہ ہو اور چاہے مکہ میں ہو یا اس کے غیر میں اور چاہے جمعہ کا روز ہو یا اس کا غیر ماسوائے جمعہ کے دن تحیۃ المسجد کے تو اسے انہوں نے جائز قرار دیا، اس پر استوائے آفتاب کی کراہت لاگو نہیں ہوتی اور خطبہ کے دوران میں بھی، ان کے نزدیک ان اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنا بھی حرام ہے، اِلّا یہ کہ نعش کے متغیر ہونے کا اندیشہ ہو، تب بلا کراہت جائز ہے، البتہ فوت شدہ نمازوں کی قضا دینا، نذر مانی ہوئی نماز پڑھنا اور طواف کی دو رکعتوں کی ادائیگی ان اوقات میں مباح قرار دی ہے۔

طلوعِ فجر کے بعد اور نمازِ فجر سے قبل نوافل کی ادائیگی

یسار مولیٰ ابن عمار رحمہ اللہ راوی ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے دیکھا کہ فجر طلوع ہونے کے بعد نوافل پڑھ رہا ہوں، تو کہنے لگے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے اور ہم اس ساعت میں (یعنی فجر طلوع ہونے کے بعد جماعت ہونے سے پیشتر) نفل ادا کرنے میں لگے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا: ''حاضر غائب کو بھی مطلع کرے کہ فجر طلوع ہونے کے بعد ماسوائے فجر کی دو سنتوں کے کوئی اور نفل نماز جائز نہیں۔''[1] اسے احمد اور ابو داود نے تخریج کیا، اگرچہ یہ ضعیف ہے لیکن اس کے متعدد طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، لہٰذا طلوعِ فجر کے بعد سنتوں کے سوا دیگر نوافل پڑھنے کی کراہت پر اس کے ساتھ حجت اخذ کرنا مستقیم اور درست ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے یہ افادہ دیا، امام حسن، امام شافعی اور امام ابن حزم رحمہم اللہ مطلقاً بلا کراہت جوازِ تنفل کی طرف مائل ہیں، مالک نے اس کا جواز اس شخص کے لیے خاص کیا جس سے اس شب کی تہجد فوت ہوگئی ہو، انہوں نے (بلغہ) کے صیغہ سے ذکر کیا ہے (یعنی انہیں یہ بات پہنچی) کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قاسم بن محمد اور عبداللہ بن عامر

---

[1] صحيح، سنن أبى داود: ١٢٧٨؛ مسند أحمد: ٢/ ١٠٤.

بن ربیعہ نے فجر کے بعد وتر ادا کیے اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: مجھے پروا نہیں کہ فجر کی نماز کی اقامت ہونے لگے اور میں ادائیگی وتر میں مشغول رہوں، یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کسی مسجد میں امامت کراتے تھے، ایک دن صبح پہنچے تو موذن نے اقامت کہنا شروع کی، سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسے خاموش کرا دیا اور کہا: پہلے میں وتر پڑھ لوں، پھر صبح کی جماعت کرائی، سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سو گئے، پھر اٹھے اور خادم سے کہا: دیکھو مسجد کی کیا صورتحال ہے؟ یہ تب کی بات ہے جب ان کی بینائی جا چکی تھی، خادم گیا، پھر آ کر بتلایا کہ لوگ نمازِ صبح ادا کر کے واپس جا چکے ہیں تو اٹھے پہلے وتر پڑھا، پھر فجر کی نماز ادا کی۔

اقامت کے دوران میں نوافل جاری رکھنا

جب اقامت ہونے لگے تو نوافل میں مشغول رہنا مکروہ ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اقامت ہو تو سوائے فرض نماز کے کوئی نماز نہیں۔'' ایک روایت میں ((إِلَّا الَّتِيْ أُقِيْمَتْ)) کے الفاظ ہیں یعنی ''ماسوائے اس نماز کے جس کے لیے یہ اقامت کہی گئی۔''[1] اسے احمد، مسلم اور اصحابِ سنن نے نقل کیا۔ سیدنا عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ صبح پڑھا رہے تھے تو اس نے (احناف کی طرح) مسجد کے ایک کونے میں سنتیں پڑھیں، پھر جماعت میں داخل ہوا، سلام پھیر کر آپ نے فرمایا: ''اے فلاں! تم نے کون سی نماز شمار کی ہے، وہ جو تنہا پڑھی یا جو ہمارے ساتھ پڑھی ہے؟'' اسے مسلم، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انکار میں اور یہ کہ اسے اعادہ کا حکم نہ دیا یہ صحتِ نماز پر دلیل ہے، اگرچہ یہ مکروہ ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں سنتیں پڑھ رہا تھا کہ مؤذن نے اقامت کہنی شروع کر دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھینچا (یعنی نماز تڑوائی) اور کہا: ''کیا تم صبح کی نماز چار رکعتیں پڑھو گے؟''[2] اسے بیہقی، طبرانی، طیالسی، ابویعلیٰ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے، سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اقامت ہو رہی ہے اور ایک شخص فجر کی سنتیں پڑھ رہا ہے تو آپ نے اس کا کندھا ہلایا اور فرمایا: ''اقامت سے پہلے کیوں نہ ادا کیں؟''[3] اسے طبرانی نے نقل کیا، بقول عراقی اس کی سند جید ہے۔

اذان

① اذان (کی اہمیت)

اذان کا مقصد مخصوص الفاظ بول کر نماز کا وقت داخل ہو جانے کی اطلاع دینا ہے، اس سے جماعت کی طرف دعوت کا

---

① مسند أحمد: ٢/ ٤٥٥؛ صحيح مسلم: ٧١٠؛ سنن أبي داود: ١٢٦٦. ② حسن، مسند ابی یعلی: ٢٥٧٥؛ مسند البزار: ٥١٨. ③ المعجم الصغير للطبراني: ١٤٠.

حصول ہوتا ہے اور یہ شعائرِ اسلام کا اظہار ہے، یہ واجب یا مندوب ہے، قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ لکھتے ہیں: اذان اپنے قلتِ الفاظ کے باوجود عقیدہ کے مسائل پر مشتمل ہے، کیونکہ اس کا آغاز اکبریت سے ہوا جو اللہ کے وجود و کمال کو متضمن ہے، ثانیاً توحید کا اعلان و اثبات اور شرک کی نفی ہے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے، اس کے بعد مخصوص عبادت کی طرف پکار و دعوت ہے، شہادت (یعنی توحید کی گواہی دینے) کے عقب میں رسالت کا اقرار ہے، کیونکہ ہمیں توحید کی معرفت رسول کی جہت سے ہی ملی، پھر فلاح کی طرف دعوت ہے اور یہ دائمی بقا ہے اور اس میں معاد کی طرف اشارہ ہے، پھر توکیداً بعض کلمات کا اعادہ کیا۔

② اذان کی فضیلت

اذان اور مؤذنین کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہیں، ذیل میں بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر لوگ جان لیں کہ اذان دینے اور پہلی صف (میں نماز پڑھنے) کی کیا فضیلت و درجہ ہے تو اس کی خاطر اگر قرعہ اندازی کرنا پڑے تو کریں اور اگر جان لیں کہ تہجیر (یعنی دوپہر کے وقت ظہر کی جماعت کو جانے) میں کیا (فضیلت) ہے تو ایک دوسرے سے سبقت کا مظاہرہ کریں اور اگر جان لیں کہ عشا و صبح میں کیا (فضیلت) ہے تو اگر گھٹنوں کے بل بھی آنا پڑے تو آئیں۔''[1] اسے بخاری وغیرہ نے تخریج کیا۔

② سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن مؤذنوں کی گردنیں سب سے طویل ہوں گی (یعنی روزِ محشر لوگوں میں نمایاں نظر آتے ہوں گے)۔''[2] اسے احمد، مسلم اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

③ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اگلی صف (والوں) پر صلاۃ بھیجتے ہیں اور موذن کی مغفرت کے لیے تمام مخلوق اور ہر چیز۔ رطب و یابس۔ دست بدعا ہوتی ہے، جہاں تک اس کی آواز پہنچتی ہے اور اس کی ہمنوائی کرتی ہے اس کے لیے ان سب جیسا اجر ہے جنہوں نے اس کی اذان کے جواب میں اس کے ہمراہ نماز پڑھی۔''[3] بقول منذری رحمہ اللہ اسے احمد اور نسائی نے جید سند کے ساتھ نقل کیا۔

④ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ''کوئی تین افراد ایسے نہیں جو (کسی نماز کے وقت) اذان و جماعت کا اہتمام نہ کریں، مگر شیطان ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔''[4]

⑤ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''امام ضامن ہے اور مؤذن امین'' پھر دعا کی: ''اے اللہ! آئمہ کی رہنمائی اور مؤذنوں کی مغفرت فرما۔''[5]

⑥ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ اس ریوڑ کے چرواہے سے خوش

---

[1] صحیح البخاري: ٦١٥، صحیح مسلم: ٤٣٧. [2] صحیح مسلم: ٣٨٧، سنن ابن ماجه: ٧٢٥. [3] صحیح، سنن نسائي: ٦٤٥، مسند أحمد: ٤/ ٩٥. [4] حسن، مسند أحمد: ٦/ ٤٤٦. [5] صحیح، سنن ترمذي: ٢٠٧، مسند أحمد: ٢/ ٣٧٨، ٥١٤.

ہوتا ہے جو پہاڑ کے دامن میں ہے اور نماز کا وقت ہونے پر اذان کہتا ہے، پھر نماز ادا کرتا ہے اللہ کہتا ہے: میرے اس بندے کو دیکھو! جو اذان دے رہا ہے اور میرے خوف سے نماز قائم کرتا ہے، میں نے اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔''[1]
اسے احمد، ابوداود، اور نسائی نے نقل کیا۔

③ اذان کی مشروعیت کا سبب

اس کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال میں ہوئی، اس کا سبب درج ذیل احادیث میں ذکر ہوا:

① نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ شروع میں مسلمان اندازے سے نماز کے لیے جمع ہونا شروع ہو جاتے، کوئی اس کے لیے منادی نہ کی جاتی تھی، ایک روز اس بارے میں باہم مشورے کیا تو بعض نے کہا: نصاریٰ کی مانند ناقوس بجا لیا کریں، بعض نے کہا: یہودیوں کی طرح کا قرن لے لیں، (یعنی سینگ تاکہ اس میں زور سے پھونک مار کر آواز پیدا کی جائے)، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہ کسی آدمی کو نماز کی منادی کرنے بھیج دیا کریں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے بلال! اٹھو نماز کی منادی کرو۔''[2] اسے احمد اور بخاری نے نقل کیا۔

② سیدنا عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لیے جمع کرنے کی غرض سے ناقوس بجانے کا حکم دیا اور آپ کو یہ پسند نہ تھا، کیونکہ اس میں نصاریٰ کی موافقت تھی تو مجھے خواب آیا کہ ایک آدمی نے ہاتھ میں ناقوس اٹھایا ہوا ہے، میں نے کہا: اے بندۂ خدا! کیا تم ناقوس بیچو گے؟ اس نے کہا: تم اس کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا: ہم اسے بجا کر نماز کے لیے لوگوں کو جمع کیا کریں گے، وہ بولا: کیا تمہیں اس سے بہتر طریقہ نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! کہا: تم کہو: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' الخ، پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ اقامت کے لیے یہ یہ الفاظ کہنا، کہتے ہیں: صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اپنا خواب سنایا تو آپ نے فرمایا: ''یہ ان شاء اللہ رؤیائے حق ہے، تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور جو کلمات خواب میں سنے ہیں اسے بتلاتے رہو تاکہ وہ بآوازِ بلند انہیں کہے (یعنی اذان دے) کیونکہ اس کی آواز تم سے ارفع و احسن ہے۔'' کہتے ہیں: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اذان سنی جبکہ وہ اپنے گھر میں تھے تو چادر کھینچتے ہوئے نکلے اور کہتے جاتے تھے: قسم ہے اس ذات کی جس نے (یا رسول اللہ) آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا! میں نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے لیے حمد ہے۔''[3] اسے احمد، ابوداود، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے۔

④ اذان کی کیفیت

اذان تین کیفیات سے وارد ہوئی ہے جو درج ذیل ہیں:

① پہلی تکبیر کی تربیع (یعنی چار مرتبہ کہنا) اور اذان کے باقی کلمات دو مرتبہ کہنا بلا ترجیع کے ماسوائے (آخر کے) کلمۂ توحید

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٢٠٣؛ سنن نسائی: ٦٦٥. [2] صحیح البخاری: ٦٠٤؛ صحیح مسلم: ٣٧٧.
[3] صحیح، سنن أبی داود: ٤٩٩؛ سنن ترمذی: ١٨٩؛ سنن ابن ماجه: ٧٠٦.

کے، یوں اس کے کلمات کی تعداد پندرہ بنتی ہے، یہ کیفیت سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہوئی۔

④ تکبیر کی تربیع اور شہادت کے دونوں جملوں کی ترجیع (یعنی دوہرا کہنا)، اس کی صورت یہ ہوگی کہ مؤذن ذرا پست آواز میں کہے: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" پھر ان دونوں کلموں کو باآواز بلند دہرائے (تو یوں اذان کے انیس کلمے بنیں گے) چنانچہ سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اذان کے انیس کلمے سکھلائے،[1] اسے خمسہ نے نقل کیا بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔

③ تکبیر کو دو دفعہ اور شہادتین کی ترجیع ہو تو اس صورت میں کلمات کی تعداد سترہ ہوگی، مسلم میں سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ اذان سکھلائی: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ......" الخ (گویا شروع کا اللہ اکبر بجائے چار کے دو مرتبہ اور باقی کیفیت نمبر دو کے مطابق ہے)۔

⑤ تثویب

مؤذن کے لیے تثویب مشروع ہے، وہ یہ کہ صبح کی اذان میں حیعلتین کے بعد یہ کہے: "اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ" سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان کی تعلیم کا خواہاں ہوا تو اس کی بھی آپ نے تعلیم دی اور فرمایا: "صبح کی اذان میں (آخری) اللہ اکبر سے قبل اسے کہا کرو۔"[2] اسے احمد و ابوداود نے نقل کیا، یہ جملہ سوائے اذان صبح کے کہنا مشروع نہیں۔

⑥ اقامت کی کیفیت

اقامت کے لیے بھی درج ذیل تین کیفیات ہیں:

① تکبیر اول کی تربیع اور بقیہ کلمات کو دو دو مرتبہ کہنا ما سوائے آخری کلمہ کے، سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اقامت کے سترہ کلمے سکھلائے: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ" چار مرتبہ، "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دو مرتبہ "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" دو مرتبہ "حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ" دو اور "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" دو مرتبہ، پھر "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ"[3] اسے خمسہ نے نقل کیا اور ترمذی نے حکم صحت لگایا۔

② اول اور آخر کی تکبیر کو دو دو مرتبہ کہنا، اسی طرح "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کو بھی اور باقی کو ایک ایک دفعہ، تب اس کے کلمات کی تعداد گیارہ بنے گی، سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سابق الذکر حدیث میں ہے: «ثُمَّ تَقُوْلُ، إذا أقَمْتَ: اللّٰهُ أكْبَر»

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٥٠٢؛ سنن ترمذي: ١٩٢. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٥٠٠؛ مسند أحمد: ٣/ ٤٠٨.

[3] سنن أبي داود: ٥٠٢؛ سنن ترمذي: ١٩٢

دو مرتبہ، "أَشهَدُأَن لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" ایک مرتبہ، پھر "اَشهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُولُ اللَّهِ"ایک مرتبہ، آگے "حَیَّ علَی الصَّلاۃِ" ایک اور "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" بھی ایک مرتبہ، پھر دو مرتبہ "اَللّٰهُ أَكْبَرُ" اور آخر میں ایک مرتبہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ"۔

③ یہ بھی نمبر دو کی کیفیت کی طرح ہے البتہ "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" ایک مرتبہ کہنا ہے تو اس طرح اس کے کلمات کی تعداد دس بنتی ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے اس کیفیت کا اخذ کیا ہے، کیونکہ یہی (ان کے دور میں) اہلِ مدینہ کا عمل تھا، مگر ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ سے "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" ایک مرتبہ کہنا قطعاً صحت کے ساتھ ثابت نہیں، بقول ابن عبدالبر رحمہ اللہ ہر کیفیت میں یہ دو مرتبہ کہنا ہے۔

⑤ اذان کے دوران کا مسنون ذکر

اذان سننے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ درج ذیل ذکر کا التزام کرے:

① اذان کے کلمات موذن کے ساتھ ساتھ دہراتا رہے، البتہ حیعلتین کے وقت "لَاحَوْلَ ولَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" کہے، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب اذان سنو تو وہی کہو جو موذن کہہ رہا ہے۔''[1] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم نے فرمایا: ''جب مؤذن «اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ» کہے تو تم بھی یہ کہو، پھر جب «أَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کہے تو تم بھی یہی کہو، پھر جب وہ «أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰه» کہے تو تم بھی کہو، پھر جب کہے: «حیَّ علَی الصَّلَاةِ» تو کہو: «لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ» پھر «حَیَّ علی الْفَلَاحِ» کہے تو کہو: «لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ» پھر «اَللّٰهُ اَكْبَرْ اَللّٰهُ اَكْبَرْ» کہے تو تم بھی کہو، پھر وہ کہے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» تو تم بھی کہو تو جس نے دل سے اس کی اذان کا یہ جواب دیا (یعنی توجہ سے) تو وہ جنت میں داخل ہوا۔''[2] اسے مسلم اور ابو داود نے تخریج کیا۔

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ یہ مستحب ہے، تاکہ یہ اس کی اس پر رضا و موافقت ظاہر کرے، "حیعلتین" چونکہ نماز کی طرف دعوت ہے اور یہ صرف مؤذن ہی کو لائق ہے (یعنی اس کا کام ہے) تو متابع کے لیے یہاں ایک دیگر ذکر مشروع کیا جو "لاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" ہے، کیونکہ یہ اللہ کی طرف اپنے امور کی سپردگی ہے، صحیحین میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''«لاحَوْلَ......» جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔''[3] بقول نووی رحمہ اللہ ہمارے اصحاب کا کہنا ہے کہ ہر طرح کے سامع کے لیے اذان کا جواب دینا مستحب ہے، چاہے وضو ہو یا نہیں اور چاہے جنبی ہو یا حائضہ، اس سے نماز میں مشغول شخص، یا جو بیت الخلا میں ہے یا جو جماع کر رہا ہے، مستثنیٰ ہے، وہ فارغ

---

① صحیح البخاري: ٦١١ صحیح مسلم: ٨٤٦؛ سنن أبي داود: ٥٢٢. ② صحیح مسلم: ٣٨٥؛ سنن أبي داود: ٥٢٧. ③ صحیح البخاري: ٤٢٠٢؛ صحیح مسلم: ٢٧٠٤.

ہو کر اذان کا جواب دے، اگر کوئی تلاوت، ذکر اور درس وغیرہ امور میں تھا کہ اذان شروع ہوگئی تو سلسلہ منقطع کر کے پہلے اذان کا جواب دے، پھر چاہے تو دوبارہ اس میں لگ جائے، امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا مؤقف ہے کہ یہ شخص جواب نہ دے، ہاں جب فارغ ہو جائے تو اذان کے کلمات کہہ دے، المغنی میں ہے: جو مسجد میں آیا تو دیکھا کہ مؤذن اذان دے رہا ہے تو مستحب ہے کہ (کھڑے کھڑے) اذان کا جواب دے یا جواب نہ بھی دے تو مؤذن کی فراغت کا انتظار کرے، پھر اپنی نماز شروع کرے تاکہ دونوں فضیلتیں حاصل ہوں، اگر فوراً نماز شروع کر دی تو بھی کوئی حرج نہیں، احمد نے بھی اسی پر منصوص کیا (عموماً دیکھا گیا کہ بعض حضرات چاہے تقریر کے کسی بھی مرحلہ پر مسجد میں پہنچیں تو وہ اولاً دو رکعتیں پڑھتے ہیں، حالانکہ خطبہ سننا فرض جبکہ یہ مستحب ہیں، راقم کی رائے میں اولیٰ یہ ہے کہ اگر جمعہ شروع ہو چکا ہو تو سنتیں ادا نہ کی جائیں، جہاں تک ایک روایت سے استدلال جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اثنائے خطبہ ایک آنے والے شخص کو حکم دیا کہ دو رکعتیں ادا کر کے بیٹھے تو ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس روایت کا ایک طریق نقل کیا ہے جس میں ہے کہ اس دوران میں نبی کریم ﷺ خاموش رہے تھے، گویا نبی کریم ﷺ کا اصل مقصد اسے اور دیگر کے لیے امام کے جمعہ شروع کرنے سے قبل مسجد پہنچنے کی اہمیت اجاگر کرنا تھا)

۲ اذان کے بعد مسنون و ماثور الفاظ کے ساتھ نبی اقدس ﷺ پر درود بھیجے، پھر اللہ سے آپ کے لیے وسیلہ کی دعا کرے (یعنی دعائے ماثور پڑھے) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب مؤذن کو سنو تو اسی جیسے کلمات کہو، پھر مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جس نے مجھ پر ایک بار درود پڑھا، اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا، پھر اللہ سے میرے لیے وسیلہ مانگو جو جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ کے صرف ایک بندے کو ملے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہوں گا تو جس نے میرے لیے وسیلہ کی طلب کی اس کے لیے میری شفاعت حلال ہوئی۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اذان سن کر کہا:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدَ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَّحْمُوْدَ نِ الَّذِيْ وَعَدْتَهُ»

''اے اللہ! اس کامل دعوت اور قائم ہونے والی نماز کے رب! تو محمد (ﷺ) کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور وہ مقامِ محمود دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ تو اس کے لیے روزِ قیامت میری شفاعت حلال ہوئی۔''[2]

اسے بخاری نے تخریج کیا۔

۸ اذان کے بعد دعا

اذان اور اقامت کے درمیان وہ وقت ہے جس میں دعاؤں کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے، لہٰذا اس میں دعاؤں کا اِکثار

---

[1] صحيح مسلم: ٣٨٤. [2] صحيح البخاري: ٦١٤.

مستحب ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذان اور اقامت کے مابین دعا رد نہیں کی جاتی۔''[1] اسے ابوداود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے، ان کے ہاں یہ زیادت ہے کہ عرض کی گئی: یارسول اللہ! ہم کیا کہیں؟ فرمایا: ''اللہ سے دنیا و آخرت کی عفو و عافیت کا سوال کرو۔''[2] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! مؤذن تو ہم سے فضیلت لے گئے تو آپ نے فرمایا: ''جیسے وہ کہتے ہیں ویسے ہی کہو، پھر آخر میں دعا کرو قبول ہوگی۔''[3] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو وقت ایسے ہیں کہ ان میں دعائیں رد نہیں کی جاتیں: اذان کے وقت اور جنگ میں جب لوگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔''[4] اسے ابوداود نے بسند صحیح نقل کیا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذانِ مغرب کے وقت پڑھنے کے لیے مجھے یہ دعا سکھلائی: «اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذَا إِقْبَالُ لَيْلِكَ وَإِدْبَارُ نَهَارِكَ وَأَصْوَاتُ دُعَاتِكَ فَاغْفِرْ لِيْ» ''اے اللہ! یہ تیری رات کا آنا اور تیرے دن کا جانا اور تیرے مؤذنوں کی آوازیں ہیں پس میری مغفرت فرما۔''[5] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

⑨ اقامت کے دوران مسنون ذکر

اقامت سننے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ بھی ساتھ ساتھ اقامت کے الفاظ کہے، البتہ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کے وقت ''أَقَامَهَا اللّٰهُ وَأَدَامَهَا'' کہے، بعض صحابہ نے بیان کیا کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اقامت کہنا شروع ہوئے تو جب ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے «أَقَامَهَا اللّٰهُ وَأَدَامَهَا» کہا۔[6]

⑩ مؤذن کی شروط

مؤذن کے لیے مستحب ہے کہ درج ذیل صفات سے متصف ہو:

① اذان دینے کی ذمہ داری فقط رضائے الٰہی کے حصول کی نیت سے انجام دے اور اس پر تنخواہ نہ لے، سیدنا عثمان بن ابوعاص رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے میری قوم کا امام بنا دیجیے! فرمایا: ''ٹھیک ہے تو کمزوروں کا خیال رکھنا اور اسے مؤذن مقرر کرنا جو اس پر تنخواہ یا اجرت نہ لے۔''[7] اسے ابوداود، نسائی ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا، ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں کہ مجھ سے آخری عہد یہ لیا کہ ایسا مؤذن مقرر کروں جو اجرت نہ لے۔[8] بقول ترمذی یہ حسن ہے اور اکثر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، انہوں نے تنخواہ دار مؤذن مقرر کرنے کی کراہت ظاہر کی اور مستحب قرار دیا کہ فی سبیل اللہ اذان دی جائے۔

---

① صحیح، سنن أبی داود: ٥٢١؛ سنن ترمذی: ٢١٢. ② ضعیف، سنن ترمذی: ٢١٢. ③ صحیح، سنن أبی داود: ٥٢٤؛ مسند أحمد: ٢/ ١٧٢. ④ صحیح، سنن أبی داود: ٢٥٤٠. ⑤ ضعیف، سنن أبی داود: ٥٣٠.
⑥ ضعیف، سنن أبی داود: ٥٢٨. ⑦ صحیح، سنن أبی داود: ٥٣١؛ سنن ابن ماجه: ٧١٤. ⑧ صحیح، سنن ترمذی: ٢٠٩.

② یہ کہ اصغر اور اکبر حدث سے پاک ہو (یعنی باوضو اذان دے) کیونکہ سیدنا مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سلام کا جواب دینے میں کوئی امر مانع نہیں، مگر میں نے چاہا کہ اللہ کا ذکر نہ کروں مگر طہارت کے ساتھ۔''[1] اسے احمد، ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا اور ابن خزیمہ نے حکمِ صحت لگایا، اگر بغیر وضو اذان دے دی تو یہ شوافع، امام احمد رحمہ اللہ اور حنفیہ کے ہاں کراہت کے باوجود جائز ہے، دیگر کے ہاں یہ مکروہ نہیں۔

③ کھڑے ہو کر اور قبلہ رو ہو کر اذان دے، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس امر پر اجماع ہے کہ کھڑے ہو کر اذان دینا سنت ہے کیونکہ اس طرح آواز زیادہ بلند ہوگی اور قبلہ رخ ہو کر اذان دینا بھی سنت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذنین قبلہ رو ہو کر ہی اذان کہتے تھے، اگر یہ نہ کیا تو کراہت کے باوجود اذان ہو جائے گی۔

④ ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' کہتے ہوئے اپنے سر، گردن اور سینے کو دائیں جانب موڑے اور ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہتے ہوئے بائیں جانب، بقول امام نووی رحمہ اللہ یہ اصح کیفیت ہے، سیدنا ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں مؤذن کے ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' اور ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہتے ہوئے منہ کو دائیں اور بائیں طرف کرنے کو دیکھتا رہا، اسے احمد اور شیخین نے تخریج کیا، جہاں تک مؤذن کا گھومنا ہے تو بقول امام بیہقی رحمہ اللہ یہ صحیح طرق سے وارد نہیں، المغنی میں امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ نہ گھومے اِلّا یہ کہ مینار پر چڑھ کر اذان دے، تب ہر دو جہت کے لوگوں تک آواز پہنچانے کی غرض سے ایسا کرنا جائز ہے۔

⑤ یہ کہ اذان دیتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے اپنی انگلی اپنے کان میں کی اور اذان کہی، اسے ابو داود اور ابن حبان نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ: اہل علم نے مستحب سمجھا ہے کہ مؤذن اذان میں اپنی انگلیاں کانوں میں دے۔

⑥ آواز بلند رکھے اگرچہ صحرا میں اکیلا اذان دے رہا ہو، عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ابو صعصعہ سے مروی ہے کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ریوڑ اور جنگل پسند ہے تو جب ادھر ہو تو اذان دیتے ہوئے آواز کو بلند رکھو، جہاں تک آواز جائے گی تو ہر سننے والا جن و انس روزِ قیامت تمہارا گواہ بنے گا، بقول ابو سعید رضی اللہ عنہ: یہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا،[2] اسے احمد، بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

⑦ اذان میں ترسُّل کرے (یعنی ٹھہر ٹھہر کر دے) اور ہر دو کلموں کے بعد ہلکا سا توقف کرے، جبکہ اقامت میں حدر کرے (یعنی ذرا جلدی جلدی) کئی طرق سے اس کا استحباب مروی ہے۔

⑧ اثنائے اقامت کسی سے بات نہ کرے، رہا اثنائے اذان تو اہل علم کی ایک جماعت نے اسے بھی مکروہ قرار دیا، جبکہ حسن بصری، امام عطاء اور امام قتادہ رحمہم اللہ نے اس کی رخصت دی ہے، ابو داود کہتے ہیں: میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: کیا اذان دینے کے دوران مؤذن بات کر سکتا ہے؟ کہا: ہاں! پوچھا اور اقامت کے دوران؟ کہا: نہیں! اس لیے کہ اس میں جلدی کرنا مستحب ہے۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۱۷؛ سنن نسائی: ۳۸؛ سنن ابن ماجہ: ۳۵۰۔ [2] صحیح البخاری: ۶۰۹؛ سنن نسائی: ٦٤٣؛ سنن ابن ماجہ: ۷۲۳.

⑪ اول وقت میں یا وقت سے قبل ہی اذان کہہ دینا

اذان اول وقت دینی چاہیے، نہ اس سے قبل اور نہ تاخیر سے ما سوائے اذانِ فجر کے کیونکہ اسے اول وقت سے مقدم کرنا مشروع ہے اگر (کسی علاقہ میں سحری کی اذان ہوتی ہو اور اس) اول اذان سے اس کی پہچان ہوتی ہو تا کہ اشتباہ نہ ہو جائے، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلال (رضی اللہ عنہ) سحری کی اذان کہتے ہیں، لہٰذا تم کھا پی سکتے ہو، حتی کہ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) اذان دیں۔“[1] متفق علیہ، فجر کی اذان وقت سے پہلے دینے میں حکمت احمد وغیرہ کی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت میں بیان ہوئی، کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہیں بلال کی اذان سحری سے نہ روکے کیونکہ وہ اس لیے دیتے ہیں، تا کہ تہجد میں مشغول شخص اب نماز ختم کرے اور سویا ہوا بیدار ہو جائے۔“[2] سیدنا بلال رضی اللہ عنہ انہی معروف الفاظِ اذان کے ساتھ اذان دیتے تھے۔ طحاوی اور نسائی نے روایت کیا کہ ان کی اور سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذانوں کے مابین اتنا ہی وقفہ ہوتا تھا کہ یہ چڑھتے (یعنی کسی مکان کی چھت پر جہاں اذان دی جاتی تھی) اور وہ اترتے،[3] (لیکن اس سے وقت سے قبل اذانِ فجر دینا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ بخاری کی روایت میں ہے کہ سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تب اذان دیتے جب لوگ ان سے کہتے: صبح ہوگئی صبح ہوگئی، رہی اذانِ بلالی تو وہ نمازِ فجر کے لیے نہیں بلکہ سحری کی ہوتی تھی)۔

⑫ اذان اور اقامت کے درمیان کا وقفہ

دونوں کے درمیان اتنا وقت ہونا چاہیے کہ لوگ نماز کے لیے تیار ہوں اور وضو وغیرہ کر کے مسجد میں آ جائیں (اور سنتیں بھی ادا کر لیں) کیونکہ اذان کی مشروعیت اسی غرض کے لیے ہوئی وگرنہ اس کا کیا فائدہ؟ اس معنی میں وارد احادیث ضعیف ہیں، بخاری رحمہ اللہ نے ایک باب اس عنوان سے باندھا ہے: ”باب كَمْ بين الأذان والإقامة؟“ یعنی اذان اور اقامت کے درمیان کتنا وقفہ ہو؟ لیکن درمیانی وقت کی مقدار و اندازہ ذکر نہیں کیا، بقول ابن بطال اس کی کوئی خاص حد نہیں ما سوائے اس کے کہ وقت داخل ہونے کا تیقن ہو اور نمازی مسجد میں جمع ہو جائیں، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ مؤذنِ رسول اذان کہتا، پھر وقفہ کرتا اور فوراً اقامت نہ کہتا، حتی کہ جب وہ دیکھتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے ہیں تو آپ کو دیکھ کر اقامت کہنی شروع کرتا،[4] اسے احمد، نسائی، ابوداؤد اور ترمذی نے تخریج کیا۔

⑬ جس نے اذان کہی ہے وہی اقامت کہے

علماء کا اتفاق ہے کہ کوئی اور بھی اقامت کہہ سکتا ہے، لیکن اولیٰ یہی ہے کہ مؤذن ہی کہے، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ اکثر اہل علم کے ہاں اسی پر عمل ہے۔

---

① صحيح البخاري: ٦١٧؛ صحيح مسلم: ١٠٩٢. ② صحيح البخاري: ٦٢١؛ صحيح مسلم: ١٠٩٣.
③ صحيح البخاري: ١٩١٨، ١٩١٩. ④ صحيح مسلم: ٦٠٦؛ سنن أبي داود: ٥٣٧؛ سنن ترمذي: ٢٠٢.

⑭ لوگ جماعت کے لیے کب کھڑے ہوں؟

امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں لکھتے ہیں: میں نے اس ضمن میں کوئی تحدید نہیں سنی، میرا خیال ہے کہ یہ لوگوں کی طاقت پر منحصر ہے کہ ان میں بھاری تن و توش والے اور ہلکے پھلکے بھی ہوتے ہیں (تو ہر کوئی اپنے حساب سے کھڑا ہو، یہ بحث دراصل اس زمانہ کے معمول کے لحاظ سے تھی کہ عموماً اقامت کے آخری جملہ کے ساتھ ہی آج کل کی طرح امام اللہ اکبر نہ کہتے تھے، بلکہ اقامت کے بعد صفیں درست کرائی جاتی تھیں) امام ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی بابت نقل کیا کہ وہ تب صف میں کھڑے ہوتے تھے جب اقامت کہنے والا "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" کہتا۔

⑮ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا

بغیر عذر کے اور بغیر واپسی کے عزم کے اذان کے بعد مسجد سے نکلنے کی نہی وارد ہے، چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم مسجد میں ہو اور نماز کی ندا دی جائے تو نماز پڑھے بغیر نہ نکلو۔"[1] اسے احمد نے نقل کیا اور اس کی سند صحیح ہے، ابوشعثاء اپنے والد اور وہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ اذان کے بعد ایک شخص مسجد سے نکل گیا تو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس شخص نے سیدنا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔[2] اسے مسلم اور اصحاب سنن نے نقل کیا، سیدنا معاذ جہنی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: "یہ نہایت جفا اور کفر و نفاق کی بات ہے کہ اذان دی جائے اور کوئی اس کا جواب نہ دے (یعنی نماز کے لیے مسجد میں نہ جائے)۔"[3] یہ روایت ضعیف ہے، اسے احمد اور طبرانی نے نقل کیا، ترمذی کہتے ہیں: متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ انہوں نے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہوئے) کہا: جس نے ندا سنی اور اس کا جواب نہ دیا تو اس کی کوئی نماز نہیں۔"[4] (ابن ماجہ کی روایت میں اس کے بعد ہے: إِلَّا مِنْ عُذْرٍ) بعض اہلِ علم نے اسے تغلیظ و تشدید پر محمول قرار دیا، ترکِ جماعت کی کسی کو رخصت نہیں الّا یہ کہ کوئی عذر ہو۔

⑯ فوت شدہ نماز ادا کرنے کے لیے اذان و اقامت

جو کسی نماز سے سو یا رہ گیا یا بھول گیا تو اس کے لیے مشروع ہے کہ اذان بھی اور اقامت بھی کہہ سکتا ہے جب وہ نماز کی قضا کا ارادہ کرے، ابوداود کے ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ایک طویل سفر میں نماز فجر سے سوئے رہ جانے کے قصے کے بارے روایت میں ہے کہ پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا، پھر اقامت کہلوا کر جماعت کرائی۔[5] اگر فوت شدہ نمازیں متعدد ہیں تو پہلی کی ادائیگی کے وقت اذان و اقامت دونوں مستحب ہے، باقی ہر نماز کے لیے صرف اقامت کہی جائے (یہ تب ہے اگر باجماعت نماز قضا ہو رہی ہو) اثرم کہتے ہیں: میں نے سنا کہ ابوعبداللہ سے اس شخص کی بابت سوال ہوا کہ جو قضا ادا کرنے جا رہا

---

① ضعیف، مسند أحمد: ۲/ ۵۳۷. ② صحیح مسلم: ٦۵۵؛ سنن أبی داود: ۵۳٦؛ سنن ترمذی: ۲۰٤.
③ ضعیف، مسند أحمد: ۳/ ٤۳۹؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۰/ ۱۸۳؛ رقم: ۳۹٤. ④ صحیح، سنن ابن ماجه: ۷۹۳. ⑤ صحیح، سنن أبی داود: ٤۳٦.

ہے تو وہ اذان میں کیا کرے؟ تو ہشیم کی حدیث ذکر کی جو ابوزبیر عن نافع بن جبیر عن ابوعبیدہ عن عبداللہ عن ابیہ سے ناقل ہیں کہ غزوۂ خندق کے دن مشرکوں نے نبی کریم ﷺ کی چار نمازیں فوت کرادیں، حتی کہ رات کا ایک حصہ گزر گیا، پھر آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا اور اقامت کہلوا کر ظہر کی قضا دی، پھر انہیں عصر، پھر مغرب اور پھر عشا کے لیے باری باری اقامت کہنے کا حکم دیا اور ان کی قضا دی۔

⑰ عورتوں کی اذان واقامت

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: عورتوں (کی جماعت) کے لیے نہ اذان ہے اور نہ اقامت،[1] اسے بیہقی نے بسندِ صحیح نقل کیا یہی سیدنا انس رضی اللہ عنہ، حسن بصری، ابن سیرین، نخعی، ثوری، مالک، ابو ثور رحمہم اللہ اور احناف کی رائے ہے، امام شافعی اور امام اسحاق رحمہما اللہ کہتے ہیں: اگر خواتین نے اذان دی اور اقامت کہی تو کوئی حرج نہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر ایسا کرلیا تو حرج کی کوئی بات نہیں، نہ کیا تو جائز ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بابت منقول ہے کہ وہ اذان واقامت کہہ کر عورتوں کی اقامت کراتیں اور ان کے (یعنی پہلی صف کے) وسط میں کھڑی ہوتیں،[2] اسے بیہقی نے نقل کیا۔

⑱ اگر جماعت ہوجانے کے بعد کوئی مسجد میں آئے

مؤلف المغنی کہتے ہیں: جو جماعت ہوجانے کے بعد نماز پڑھنے آیا تو چاہے تو اذان دے اور اقامت بھی کہے (اس غرض سے کہ ایسے اور لوگ اگر ہوں تو آجائیں مگر دورِ حاضر میں فسادِ خلق کے خوف سے اس پر عمل مشکل ہے) احمد کی اس بارے میں نص ان کے مدنظر ہے، اثرم اور سعید بن منصور کی سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے بارے روایت ہے کہ وہ مسجد میں آئے اور جماعت ہوچکی تھی تو ایک آدمی کو اذان دینے اور پھر اقامت کہنے کا کہا، پھر حاضرین کو جماعت کرائی۔[3] نماز بغیر اذان واقامت کے بھی پڑھ سکتا ہے، عروہ کا قول ہے اگر ایسی مسجد آؤ جہاں جماعت ہوچکی ہے تو ان کی دی ہوئی اذان واقامت ہی بعد میں آنے والوں کے لیے کافی ہے، یہی حسن، شعبی اور نخعی رحمہم اللہ کا قول تھا، البتہ حسن نے کہا: مجھے زیادہ پسند یہ ہے کہ وہ اقامت کہہ لے، اگر اذان کہے تو آواز آہستہ رکھے، اسے ظاہر نہ کرے، تاکہ لوگ (جو نماز ادا کرچکے ہیں) بغیر وقت اذان سے چوکنا نہ ہوں۔

⑲ اقامت اور جماعت کے درمیان وقفہ

اقامت کے بعد امام کو کوئی بات وغیرہ کرلینی جائز ہے، اس صورت میں اقامت کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں، اگرچہ یہ وقفہ طویل ہوجائے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اقامت کہی جاچکی تھی اور نبی کریم ﷺ مسجد کے ایک کونے میں کسی شخص سے محوِ مناجات ہوئے اتنی دیر لگائی کہ لوگ (بیٹھے بیٹھے) سو گئے،[4] اسے بخاری نے نقل کیا، ایک اور روایت میں ہے کہ

---

② ضعيف، السنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٤٠٨. ③ ضعيف، سنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٤٠٨. ③ صحيح، تمام المنة: ١٥٥. ④ صحيح البخاري: ٦٤٢؛ صحيح مسلم: ٣٧٦.

نبی کریم ﷺ کو اقامت کے بعد یاد آیا کہ آپ کو غسل کی ضرورت ہے تو آپ گھر واپس گئے اور غسل کر کے تشریف لائے اور بغیر نئی اقامت کے جماعت کرائی۔

⑳ راتب (جس کے ذمہ اذان دینا لگایا گیا ہے) مؤذن کے غیر کا اذان دینا

یہ جائز نہیں البتہ مؤذن کی اجازت سے یا اس صورت میں کہ وہ لیٹ ہوجائے، تب وقت فوت ہونے سے بچنے کی خاطر کوئی اور اذان دے سکتا ہے۔

㉑ اذان میں اضافہ شدہ کلمات جو اس کا حصہ نہ تھے

اذان ایک عبادت ہے اور عبادات میں مدار اتباعِ نبوی پر ہوتا ہے، کسی کے لیے جائز نہیں کہ اپنی طرف سے دین میں کمی یا بیشی کرے، صحیح حدیث میں ہے: ''جس نے ہمارے اس دین میں اِحداث کیا (یعنی دین اور شرع کا حصہ باور کر کے کسی نئے کام کو جاری کیا) وہ باطل (یعنی بدعت) ہے۔'' یہاں کچھ غیر مشروع اشیا کا ذکر کیا جاتا ہے جس کے کثیر حضرات مرتکب ہوئے، حتی کہ بعض اب انہیں دین میں سے خیال کرتے ہیں، مگر ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں، وہ یہ ہیں:

① اذان یا اقامت میں ''أَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کہنا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس ضمن میں رائے یہ ہے کہ ماثور (یعنی کتاب وسنت میں منقول) کلمات میں اضافہ کرنا جائز نہیں البتہ غیرِ ماثور میں یہ ہوسکتا ہے۔

② الشیخ اسماعیل عجلونی کشف الخفاء میں لکھتے ہیں: مؤذن کے ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدً ارَسُوْلُ اللّٰہ'' کہنا سن کر انگوٹھے چومنا اور اس کا استدلال دیلمی کی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے منقول کرنا کہ اذان میں یہ سن کر انگوٹھے چومے، (کتاب میں شہادت کی انگلی اور بائیں ہاتھ کی یہی انگلی لکھا ہے لیکن ہمارے ہاں چونکہ انگوٹھے چومے جاتے ہیں تو یہی لکھ دیا ہے، یہ حدیث صحیح نہیں ضعیف ہے) اسی طرح جو ابن عباس بن ابو بکر رداد یمانی متصوف نے اپنی کتاب ''موجبات الرحمة و عزائم المغفرة'' میں ایسی سند کے ساتھ جو منقطع ہے اور اس میں مجہول راوی ہیں، سیدنا خضر علیہ السلام سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: جس نے مؤذن کا ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' سن کر کہا: ''مَرْحَباً بِحَبِيْبِي وَقُرَّةِ عَيْنِيْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ'' پھر انگوٹھے ''یہاں انگوٹھے ہی مذکور ہے'' چوم کر انہیں آنکھوں پر لگایا، وہ کبھی اندھا نہ ہوگا اور نہ کبھی آشوبِ چشم میں مبتلا ہو گا، کئی اور آثار بھی نقل کیے، چنانچہ تو اس ضمن میں کوئی مرفوع روایت ثابت نہیں ہے۔

③ اذان میں اس طرح سے طرزیں نکالنا کہ کسی حرف، حرکت یا مد کا اضافہ ہو، مکروہ ہے اگر اس طرح کرنے سے معنی بدلے یا کسی محذور کا ایہام ہو تو تب یہ حرام ہے، یحیی بکاء کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا: میں تم سے اللہ کی خاطر بغض رکھتا ہوں، پھر اپنے اصحاب سے کہا: یہ اذان میں (بے جا) طرزیں نکالتا ہے اور اذان دینے پر اجرت لیتا ہے۔

④ فجر سے قبل تسبیح، حنابلہ کی مشہور کتاب ''الاقناع'' اور اس کی شرح میں لکھا ہے کہ فجر سے قبل تسبیح کے کلمات پڑھنا یا نعتیں، نظمیں اور (لاؤڈ سپیکر میں) دعائیں کرنا یا کوئی دیگر الفاظ تو یہ مسنون نہیں اور کوئی بھی عالم اس کے استحباب کا قائل نہیں، بلکہ یہ بدعات میں سے ہے (اور لوگوں کو تنگ کرنے کی قبیل سے) کیونکہ اس کا ثبوت نہ عہدِ نبوی سے ملتا ہے اور نہ آپ کے صحابہ کے عہود میں اور نہ اس کے لیے کوئی اصل ہے جس کی روشنی میں اس کا اثبات کیا جائے تو جائز نہیں کہ اس کا حکم دیا جائے اور ایسا نہ کرنے والوں پر تنقید کی جائے، اس پر تنخواہ وغیرہ دینا روا نہیں، کیونکہ یہ بدعت کی اعانت کے مترادف ہے، عبدالرحمن بن جوزی کی کتاب ''تلبیسِ ابلیس'' میں لکھا ہے کہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو رات کا بیشتر حصہ مینار (آج کل کی اصطلاح میں لاؤڈ سپیکر) پر وعظ و ذکر، تلاوتِ قرآن (اور نعتیں) باآواز بلند پڑھتے رہتے ہیں اور لوگوں کی نیند خراب اور عبادت کرنے والوں کی عبادت میں خلل ڈالتے ہیں تو یہ سب امورِ منکر (یعنی بدعت) ہیں، ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: جو صبح سے قبل تسبیح و ذکر کرنے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے کا اسی طرح جمعہ سے قبل رواج پڑ گیا ہے تو یہ اذان کا حصہ نہیں، نہ لغۃً اور نہ شرعاً۔

⑤ اذان کے بعد (اور ہمارے ہاں اذان سے قبل) بالجہر درود و سلام پڑھنے کا التزام کرنا غیر مشروع ہے، بلکہ اسے بدعت قرار دینا چاہیے، ابن حجر رحمہ اللہ ''الفتاوی الکبریٰ'' میں لکھتے ہیں: ہمارے مشائخ سے اذان کے بعد اس رواج کے بارے استفتاء ہوا تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ اس کی اصل (یعنی مطلقاً درود پڑھنا اور ذکر و تسبیح کے کلمات کہنا) تو سنت ہے، مگر یہ کیفیت رائج بدعت ہے (کہ اسے تقریباً اذان کا حصہ بنا لیا ہے)، مصر کے مفتی اعظم الشیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ سے اذان کے بعد درود و سلام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جہاں تک اذان کا تعلق ہے تو ''الحلیۃ'' میں مذکور ہے کہ یہ غیر فرض نمازوں کے لیے نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اس کے پندرہ کلمات ہیں اور اس کا آخری کلمہ ''لا إله إلا اللّٰه'' ہے تو اس کے بعد یا اس سے قبل جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب بدعت ہے در اصل اس کا ابتداع برائے تلحین (یعنی طرز بنانے، مخالف مسلک والوں کی ضد میں اور انہیں تاؤ دلانے کے لیے) ہے کوئی اور غرض نہیں، کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہیں اور کسی کا یہ کہنا بالکل معتبر نہیں کہ ہے تو یہ بدعت مگر حسنہ ہے، کیونکہ عبادات میں ایجاد کی گئیں سب بدعات بظاہر حسنہ (اور اچھے الفاظ پر مشتمل) ہی ہیں، مگر یہ حسنہ نہیں بلکہ سیئہ ہیں اور جو دعویٰ کرے کہ اس کا تلحین سے کوئی تعلق نہیں تو وہ کاذب ہے۔

شروطِ نماز

یعنی وہ شروط جن کا نماز شروع کرنے سے قبل ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور نمازی پر واجب ہے کہ ان کا التزام کرے اس طور پر کہ اگر ان میں سے کسی کا ترک کیا تو اس کی نماز باطل ہوگی۔

یہ درج ذیل ہیں:

① وقت داخل ہو جانے کا علم

اس ضمن میں ظنِ غالب ہونا کافی ہے (یہ پرانے زمانہ کے حالات میں، البتہ آج کل گھڑیوں کی موجودگی میں اشتباہ ہونا ناممکن ہے) تو جس کا ظن غالب ہوا کہ وقت ہو گیا ہے تو اس کے لیے اقامتِ نماز مباح ہوئی، چاہے یہ کسی ثقہ آدمی کے اسے خبر دینے سے ہو یا امین موذن کی اذان سے یا یہ اس کا ذاتی اجتہاد ہو یا کسی بھی دیگر سبب سے جس کے ساتھ حصولِ علم ہو۔

② اصغر اور اکبر حدث سے طہارت

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ﴾ (المائدۃ: ٦)

''اے اہلِ ایمان! جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو، اپنے سر کا مسح کر لو اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھولو۔ اگر تم جنبی ہو تو غسل کر لو۔''

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ بغیر طہور کے نماز قبول نہیں کرتا۔''[1] سوائے بخاری کے اسے جماعت نے نقل کیا۔

③ جسم، لباس اور جگہ کا ظاہری نجاست سے پاک وصاف ہونا

یہ حسبِ قدرت ہے، اگر اس کے ازالہ سے عاجز ہو تو اس سمیت ہی نماز پڑھ لے اس پر اعادہ نہیں، جہاں تک جسم کی طہارت ہے تو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پیشاب (کے چھینٹوں) سے بچا کرو کیونکہ عام عذابِ قبر اسی وجہ سے ہوگا۔''[2] اسے دارقطنی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں ایک مذّاء آدمی تھا (یعنی مذی کے قطرے کثرت سے خارج ہوتے رہتے تھے) تو میں نے سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھیں تو آپ نے فرمایا: ''استنجا کر کے وضو کر لیا جائے (یعنی مذی کے خروج سے وضو ٹوٹ جائے گا)۔''[3] اسے بخاری وغیرہ نے تخریج کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے ایک استحاضہ والی خاتون سے کہا: ''اپنا خون دھولو اور (وضو کر کے) نماز پڑھ لو۔''[4] جو لباس کی طہارت ہے تو قرآن میں ہے: ﴿ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (المدثر: ٤) ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے۔'' سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ! کیا میں اس لباس میں نماز پڑھ سکتا ہوں جسے پہنے ہوئے اپنی اہلیہ سے قربت کی؟ فرمایا: ''ہاں! الّا یہ کہ اس میں کوئی چیز لگی دیکھو تو پہلے اسے دھولو۔''[5]

---

[1] صحیح مسلم: ٢٢٤. [2] صحیح، سنن الدارقطنی: ٤٥٩. [3] صحیح البخاری: ٢٦٩. [4] صحیح، سنن ابن ماجه: ٦٢١؛ مسند أحمد: ٥/ ٩٧. [5] صحیح، سنن ابن ماجه: ٥٤٢.

اسے احمد اور ابن ماجہ نے ثقہ سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے (اپنی بہن ام المومنین) سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جماع والے لباس میں نماز ادا فرما لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اگر اس میں کوئی چیز نہ لگی ہوتی تو، [1] اسے احمد اور ماسوائے ترمذی کے اصحاب سنن نے تخریج کیا، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کی اور جوتے اتار دیے تو لوگوں نے بھی اتار دیے، سلام کے بعد فرمایا: ''تم نے کیوں اتارے؟'' عرض کی: کیونکہ آپ نے اتار دیے تھے تو ہم نے بھی اتار دیے۔ فرمایا: ''مجھے تو جبریل علیہ السلام نے آکر بتلایا (گویا نماز کے دوران اتارے تھے) کہ ان میں گندگی لگی ہوئی ہے۔'' کہتے ہیں: پھر آپ نے ہدایت جاری کی کہ ''جب مسجد میں آؤ تو جوتوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ لو کہ گندگی تو نہیں لگی، اگر لگی ہو تو زمین کے ساتھ رگڑ کر صاف کر لیا کرو، پھر (چاہو تو) ان سمیت نماز پڑھ لو۔'' [2] (یہ اس زمانہ کے تناظر میں جب مسجد میں چٹائیوں یا دریوں کا وجود نہ ہوتا تھا) اسے احمد، ابوداود، حاکم، ابن حبان اور ابن خزیمہ نے نقل کیا، ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے حکمِ صحت لگایا تو حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دورانِ نماز علم ہوا کہ لباس یا بدن وغیرہ میں نجاست لگی ہے، پہلے علم نہ تھا یا بھول گیا تھا تو اسی حالت میں اس کا ازالہ کر لے اگر ممکن ہے تو اس سے نماز پڑھتے پڑھتے علیحدہ ہو جائے اور نماز جاری رکھے اور اس کے ذمہ اعادہ نہیں اور جو ادا کر چکا اسی پر بنا کرے (یعنی اس سے آگے کی پڑھے مگر اس دوران میں کسی سے کلام نہ کرے اگر کر لی تو سابقہ نماز ختم ہوگئی) جگہ کی طہارت حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رو سے جس میں ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا، لوگ اس کی طرف لپکے مگر آپ نے منع کیا اور فرمایا: ''کرنے دو اور پیشاب والی جگہ پر پانی کا ڈول بہادو، تمہیں آسانیاں کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، تنگ کرنے کے لیے نہیں۔'' (آج کل کے مسلمانوں کا وطیرہ اور روش اس کے برعکس ہے) اسے سوائے مسلم کے سب نے تخریج کیا، امام شوکانی رحمہ اللہ کپڑے کی طہارت کے قائلین کی ادلہ کا مناقشہ کر کے لکھتے ہیں: ان سے کپڑوں کی تطہیر کا وجوب ثابت ہوتا ہے تو جس نے نجاست لگی والے کپڑے کے ساتھ نماز پڑھ لی وہ ایک واجب کا تارک ہوا، لیکن یہ کہنا کہ اس کی نماز نہ ہوئی کیونکہ کسی شرطِ صحت کے فقدان کی صورت میں یہی کہا جانا چاہیے، لیکن یہاں یہ نہیں، ''الروضۃ الندیۃ'' میں ہے: جمہور کی رائے میں بدن، کپڑا (لباس اور جائے نماز) اور جگہ تینوں کی تطہیر واجب ہے اور ایک گروہ کی رائے ہے کہ یہ صحتِ نماز کے لیے شرط ہے۔ دوسروں کے خیال میں یہ سنت ہے، حق یہ کہ یہ واجب ہے تو جس نے نجاست کے ساتھ آلودہ حالت میں جان بوجھ کر نماز پڑھ لی اس نے ایک واجب امر کا اخلال کیا لیکن اس کی نماز ہوگئی۔

④ سترِ عورۃ (یعنی جسم کا وہ حصہ ڈھانپنا جو شرعاً فرض ہے)

کیونکہ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ﴾ (الأعراف:٣١)

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ٥٤٠؛ سنن أبی داود: ٣٦٦؛ سنن نسائی: ٢٩٣. [2] صحیح، سنن أبی داود: ٦٥٠.

''اے بنی آدم! ہر مسجد میں حاضری کے وقت زینت اختیار کرو۔''

زینت سے (یہاں) مراد ہے کہ شرمگاہ کا ستر کرے اور مسجد سے مراد نماز ہے، یعنی ہر نماز میں اپنی عورۃ کا ستر کرو، سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں صرف قمیص (یعنی عربوں کی قدیم ہیئت کی جو تقریباً گھٹنوں تک یا اس سے نیچے تک ہوتی تھی) میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ فرمایا: ''ہاں! اور «زَرِّرْهُ وَلَوْ بِشَوْكَةٍ» یعنی اسے آپس میں جوڑ و خواہ بٹن نہ ملے تو کانٹے کے ساتھ۔''[1] اسے بخاری نے تاریخ وغیرہ میں نقل کیا۔

آدمی کی عورۃ کی حد

آدمی کی عورۃ کی حد جس کا (ہمہ وقت اور بطورِ خاص نماز میں) ستر کرنا واجب ہے، اگلی اور پچھلی شرمگاہ ہے، البتہ اس کے زانو، ناف اور گھٹنوں کے بارے میں اختلافِ آراء ہے، جس کا مدار اس کے بارے میں وارد باہم متعارض آثار ہیں تو بعض قائل ہیں کہ یہ عورۃ نہیں، جبکہ بعض دیگر ان کے عورۃ ہونے کے قائل ہیں، انہیں عورۃ نہ سمجھنے والوں کا استدلال درج ذیل احادیث سے ہے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زانو مبارک سے کپڑا ہٹائے تشریف فرما تھے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنے کی اجازت طلب کی تو انہیں اندر بلالیا اور اسی حالت میں رہے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے تو بھی یہی حالت رکھی، بعد ازاں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے آنے کی اذن طلب کی تو زانو پر کپڑا ڈال لیا، جب یہ سب چلے گئے تو میں نے کہا: ابوبکر و عمر آئے تو آپ اسی حالت میں رہے، مگر جب عثمان آئے تو آپ نے زانو ڈھانپ لیا؟ فرمایا: ''اے عائشہ! کیا میں اس سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟''[2] اسے احمد نے موصولاً اور بخاری نے معلقاً نقل کیا۔

② سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ خیبر کے معرکہ میں (گھوڑے پر سوار) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور زانو مبارک سے ازار اونچا کیا ہوا تھا، حتی کہ میں نے آپ کے زانو کی سفیدی دیکھی،[3] اسے احمد و بخاری نے نقل کیا، امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس سے اس رائے کی صحت ثابت ہوئی کہ زانو عورۃ میں داخل نہیں کیونکہ اگر وہ عورۃ کا حصہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو معصوم و مطہر ہیں، حالتِ نبوت و رسالت میں اسے ننگا نہ کرتے اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی نظر نہ پڑنے دیتے، اللہ نے تو نبوت سے قبل بچپن ہی میں آپ کو کشفِ عورۃ سے محفوظ رکھا تھا، چنانچہ صحیحین میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (بچپن میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکہ کے ہمراہ تعمیر کعبہ کے لیے پتھر جمع کر رہے تھے۔ تو اپنے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے کہنے پر اپنا تہہ بند اتار کر کندھے پر رکھ لیا، تاکہ پتھروں کی رگڑ سے محفوظ رہے، جونہی یہ کیا تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے تو پھر کبھی ایسا نہ کیا۔[4]

③ مسلم نے ابو عالیہ براء سے روایت نقل کی کہ عبد اللہ بن صامت رحمہ اللہ نے میرے زانو پر ہاتھ مارا، پھر کہا: میں نے

---

① حسن، سنن أبي داود: ٦٣٢؛ سنن نسائي: ٧٦٤. ② صحيح مسلم: ٢٤٠١؛ مسند أحمد: ٦/ ٦٢.

③ صحيح البخاري: ٣٧١. ④ صحيح البخاري: ٣٦٤؛ صحيح مسلم: ٣٤٠.

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے میرے زانو پر ہاتھ مارا، پھر بتلایا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مسئلہ پوچھا تو آپ نے بھی یہی کیا تھا اور پھر تلقین کی کہ ''نماز کو وقت پر ادا کیا کرو۔''[1] الخ، بقول امام ابن حزم رحمہ اللہ: اگر زانو عورۃ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے زانو کو اصلاً ہی اپنے دست مقدس کے ساتھ مس نہ کرتے، اسی طرح اگر سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہ عورۃ ہوتا تو ابن صامت کے زانو پر ہاتھ نہ مارتے، اسی طرح وہ بھی، جیسے کسی کے لیے حلال نہیں کہ کسی کی قبل یا دبر کو ہاتھ لگائے، چاہے کپڑے کے اوپر ہی سے اور نہ کسی غیر محرم خاتون کے بدن پر (کیونکہ عورت کا سارا بدن عورۃ ہے)۔

④ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے جبیر بن حارث تک اپنی سند کے ساتھ نقل کیا، انہوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زانو کو دیکھا اور تب اس کے اوپر کپڑا نہ تھا، اسی طرح سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سیدنا قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے (صحیح یہ ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کے پاس جیسا کہ بخاری میں ہے، یہ جنگ یمامہ کا واقعہ ہے) اور اس وقت وہ اپنے زانو ننگے کیے بیٹھے ہوئے تھے (اور جسم پر کافور مل رہے تھے تاکہ اگر معرکہ میں شہید ہو جائیں تو دیر ہو جانے پر لاش سے بو نہ آئے اور پھر وہ اسی معرکہ میں شہید ہو گئے تھے)۔

انہیں عورۃ قرار دینے والوں کی حجت

ان حضرات کی بنائے استدلال یہ دو احادیث ہیں:

① محمد بن جحش راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا معمر رضی اللہ عنہ سے گزر ہوا اور ران کے زانو ننگے تھے تو فرمایا: ''اے معمر! زانو ڈھانپ لو، کیونکہ یہ عورۃ ہیں۔''[2] اسے احمد، حاکم اور بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا، صحیح بخاری میں اس کا ذکر بصورتِ تعلیق ہے (یعنی سند کے ذکر کے بغیر)۔

② سیدنا جَرہَد رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور میں چادر لپیٹے ہوئے تھا جبکہ میرے زانو ننگے تھے تو فرمایا: ''اپنے زانو ڈھانپ لو کیونکہ یہ عورۃ ہیں۔''[3] اسے مالک، احمد، ابوداود اور ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا بخاری نے اپنی صحیح میں معلقاً اسے نقل کیا، تو یہ ہر دو فریقین کے مستدل یہ روایات و آثار ہیں، مسلمان ان دونوں آراء میں سے جو چاہے اختیار کر لیں اگرچہ دین میں احوط یہ ہے کہ اثنائے نماز ناف تا گھٹنہ اچھی طرح ہر ممکن حد تک ڈھانپا ہوا ہو، بقول بخاری حدیثِ انس رضی اللہ عنہ اسند (یعنی سند کے لحاظ سے اقویٰ) اور حدیثِ جرہد رضی اللہ عنہ احوط ہے۔

عورت کی عورۃ کی حد

عورت کا سارا بدن سر تا پاؤں عورۃ ہے، اس کا ستر اس پر واجب ہے (یعنی ہر وقت گھر میں یا کسی اور جگہ، اسی طرح محرموں کے سامنے) ماسوائے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے (یعنی ان کا ہمہ وقت ڈھانپے رکھنا واجب نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں

---

① صحیح مسلم: ٦٤٨۔ ② صحیح، مسند أحمد: ٥/ ٢٩٠؛ المستدرك للحاكم: ٤/ ١٨٠؛ صحیح البخاری تعليقاً: ١/ ٤٧٨۔ ③ صحیح، سنن أبی داود: ٤٠١٤؛ سنن ترمذی: ٢٧٩٨۔

کہ اجنبیوں سے چہرہ کا پردہ واجب نہیں، جیسا کہ بعض علماء کو غلط فہمی ہوگئی، انہی میں سے علامہ البانی رحمہ اللہ بھی ہیں، جنہوں نے اس بارے ایک کتاب تالیف کی، البتہ چہرے کے پردے کے وجوب کے اثبات میں مولانا مودودی کی کتاب ''پردہ'' ایک عمدہ کاوش ہے) قرآن میں ارشاد ہوا: ﴿ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾(النور: ۳۱) یعنی مواضعِ زینت میں سے (گھر کے اندر) عورت ماسوائے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے کوئی چیز ظاہر نہ کرے، جیسا کہ صحت کے ساتھ سیدنا ابن عباس، ابن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ بالغ خاتون کی نماز بغیر خمار (سر پہ اوڑھی چادر) کے قبول نہیں کرتا۔''① اسے سوائے نسائی کے باقی پانچ نے تخریج کیا: ابن خزیمہ اور حاکم نے صحت کا حکم لگایا، ترمذی کے بقول یہ حسن ہے، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کیا عورت قمیص اور خمار میں جبکہ تہہ بند نہ باندھا ہوا ہو، نماز پڑھ لے؟ فرمایا: ''اگر قمیص اتنی لمبی ہے کہ قدموں کا اوپر والا حصہ بھی ڈھانپ رہی ہے، تب پڑھ لے۔''② اسے ابوداود نے نقل کیا، آئمہ حدیث نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا (مگر اس جیسی موقوفات مرفوعات کے حکم میں ہوتی ہیں) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال ہوا کہ عورت کتنے کپڑوں میں نماز ادا کرے؟ انہوں نے کہا: علی رضی اللہ عنہ سے پوچھو، پھر مجھے آ کر ان کا جواب بتلاؤ! وہ گئے اور ان سے پوچھا: تو انہوں نے کہا: خمار اور لمبی قمیص میں تو واپس آ کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے جواب سے آگاہ کیا تو کہنے لگیں: ٹھیک کہا۔③

کس طرح کا لباس واجب اور کس طرح کا مستحب ہے؟

واجب لباس وہ ہے جو عورۃ کا ساتر ہو، اگر یہ ساتر اتنا تنگ ہے کہ عورہ کے حصہ جسم کو نمایاں کرتا ہے یا کپڑا اتنا باریک ہو کہ اس کے نیچے سے جلد کا رنگ چھلکتا ہو اور پتہ چل رہا ہو کہ وہ سفید، سرخ یا برنگِ دیگر ہے تو اس میں نماز نہ ہوگی، ایک کپڑے (مثلاً: لمبی قمیص یا چادر جس سے کم از کم عورہ کا حصہ ڈھانپا ہوا ہے) میں نماز ادا کرنا جائز ہے، جیسا کہ سابق الذکر سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزرا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کپڑے میں ادائیگی نماز کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا: ''کیا تم سب کو دو دو کپڑے نصیب ہیں؟''④ اسے مسلم اور مالک وغیرہما نے نقل کیا۔

مستحب یہی ہے کہ دو یا دو سے زائد کپڑوں میں نماز پڑھے (اگر میسر ہوں) اور یہ کہ ممکن حد تک تجمل وتزین کرے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ''جب تمہارا کوئی نماز پڑھے تو دو کپڑے پہنے کیونکہ اللہ کا زیادہ حق ہے کہ اس کے لیے تزین کیا جائے، اگر دو کپڑے میسر نہیں (یعنی ایک چادر ہے) تو اسے بطورِ تہہ بند کے باندھے اور یہودیوں کی طرح (نماز میں) بکل مت مارو (وہ اس طرح کرتے تھے کہ بمع بازو سارا جسم چادر کے اندر کر لیتے)⑤ اسے طبرانی اور بیہقی

① صحیح، سنن أبی داود: ٦٤١؛ سنن ترمذی: ٣٧٧؛ سنن ابن ماجه: ٦٥٥. ② صحیح، سنن أبی داود: ٦٤٠.
③ منقطع، مصنف عبدالرزاق: ٣/ ١٢٨، ح: ٥٠٢٩. ④ صحیح البخاری: ٣٥٨؛ صحیح مسلم: ٥١٦.
⑤ صحیح، السنن الکبری للبیهقی: ٢/ ٢٣٥، ٢٣٦.

نے نقل کیا، عبدالرزاق ناقل ہیں کہ سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا باہم اختلاف ومناظرہ ہوا، سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں، جبکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ دراصل اس زمانہ میں تھا جب کپڑوں کی قلت تھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر کہا: بات وہی ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہی، لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے بھی غلط نہیں، اب جبکہ اللہ نے کشائش کی ہے تو تم بھی توسع کرو، ہر کوئی اپنے پورے کپڑوں میں نماز پڑھے، آدمی تہہ بند اور بالائی دھڑ کی چادر میں ملبوس ہو کر، اسی طرح تہہ بند اور قمیص میں، شلوار اور جبہ پہن کر، جبہ اور تبان زیبِ تن کر کے، بقول راوی میرا خیال ہے کہ تبان اور چادر بھی کہا (تبان چمڑے وغیرہ کی بنی ایسی شلوار جس کا ایک پہنچا ہو، یہ پہلوانوں کا لباس تھا، یعنی اس زمانے میں، اسے دورِ حاضر کا لنگوٹ باور نہ کیا جائے)، اسے بخاری رحمہ اللہ نے بغیر سیدنا اُبی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قصہ ذکر کیے نقل کیا ہے، سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ کوئی ایک کپڑا جسم کے گرد لپیٹ کر نماز پڑھے، جسے مخالف سمت سے دونوں کندھوں پر نہ ڈالا ہو (کیونکہ ایسا نہ کیا تو ستر ظاہر ہوگا) اور اس بات سے بھی کہ صرف شلوار پہنی ہوئی ہو چادر نہ ہو،[1] اسے ابو داود اور بیہقی نے نقل کیا، سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ جب نماز کے لیے جاتے تو اپنا سب سے اچھا لباس پہنتے، ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو کہا: اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تو میں اپنے رب کے سامنے تجمل اختیار کرتا ہوں اور اس کا فرمان ہے: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ''ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو۔'' (الاعراف: ۳۱)

ننگے سر نماز پڑھنا

ابن عساکر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کئی دفعہ اپنی ٹوپی سر مبارک سے اتار کر اسے سترہ بنا لیتے تھے۔[2] حنفیہ کے نزدیک ننگے سر نماز پڑھنے میں حرج نہیں، بلکہ اگر خشوع کی غرض سے سر کو ننگا رکھے تو ان کے ہاں یہ مستحب ہے، بہر حال سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کی افضلیت کے بارے میں کوئی دلیل وارد نہیں۔

⑤ قبلہ رو ہونا

علماء متفق ہیں کہ نمازی پر قبلہ رو ہونا واجب ہے، کیونکہ قرآن نے کہا:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

''(اے نبی!) اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجیے اور تم جہاں بھی ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو۔'' (البقرة:١٤٤)

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں، پھر ہم کعبہ کی طرف پھیر دیے گئے،[3] اسے مسلم نے تخریج کیا۔

---

① حسن، سنن أبی داود: ٦٣٦؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ٢٣٦. ② ضعيف، سلسلة الاحاديث الضعيفة: ٥٣٨. ③ صحيح مسلم: ٥٢٥.

ایسے آدمی کے بارے حکم جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو اور جو اسے دیکھ نہ رہا ہو

جو کعبہ کو دیکھ رہا ہے اس کے لیے واجب یہ ہے کہ عین اپنے سامنے اسے رکھے، دیگر حضرات اس کی جہت کی طرف رخ کرلیں، کیونکہ یہی ان کی استطاعت میں ہے اور اللہ طاقت سے بڑھ کر کسی کو مکلف نہیں بناتا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ» ''ایک سے دوسرے افق کے درمیان ساری جہت قبلہ ہے۔'' یعنی تھوڑا سا دائیں بائیں انحراف غلط نہیں۔[1] اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے، بخاری نے بھی اسی پر صاد کیا، یہ اہلِ مدینہ اور جو علاقے اسی سمت میں ہیں، کی نسبت سے ہے جیسے اہل شام، جزیرہ اور عراق وغیرہ، جہاں تک اہلِ مصر ہیں تو ان کا قبلہ مشرق اور جنوب کے درمیان ہے، اہلِ یمن جب نماز پڑھیں تو مشرق ان کی دائیں اور مغرب بائیں جانب ہوگا اور اہلِ ہند و پاکستان کا رخ مغرب کی طرف ہوگا۔

قبلہ کی معرفت کیسے ہو؟

ہر علاقہ کے لیے کچھ ایسے رہنما اصول ہیں جو انہی کے ساتھ مختص ہیں، جن سے انہیں قبلہ کی پہچان ہو جاتی ہے، مثلاً: مسجدوں کے محراب، اسی طرح قبلہ نما وغیرہ۔

جسے قبلہ کا پتہ نہ چلے

مثلاً کوئی صحرا میں ہے اور بادل چھائے ہوئے ہیں یا تاریکی ہے تو اسے چاہیے کہ کسی سے پوچھے، اگر کوئی موجود نہ ہو تو اجتہاد کرے اور جس طرف اس کا اجتہاد رہنمائی کرے اسی جانب منہ کر کے نماز ادا کرلے، اس کی نماز صحیح ہوگی، چاہے بعد میں پتہ چلے کہ غلط سمت رخ کر کے پڑھی ہے، اس کی نماز صحیح ہوگی، اس کے ذمہ اعادہ نہیں، اگر اثنائے نماز پتہ چلے کہ غلط سمت رخ کیا ہوا ہے تو وہیں سے اپنی نماز قطع کیے بغیر قبلہ کی طرف ہو جائے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ اہل قباء نمازِ فجر میں مشغول تھے کہ کسی شخص کا گزر ہوا، اس نے بآواز بلند کہا: آج رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا، جس کے ذریعے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے تو انہوں نے حالتِ نماز میں ہی بیت المقدس سے اپنا رخ کعبہ کی طرف کرلیا،[2] اسے شیخین نے نقل کیا، اگر ایک نماز اجتہاد کر کے پڑھ لی ہے تو اگلی نماز کے وقت دوبارہ سوچے، اگر اس کا خیال تبدیل ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور پہلی نماز کا اعادہ نہ کرے۔

درج ذیل احوال میں قبلہ رخ ہونے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے

① سواری پر نفل نماز ادا کرتے ہوئے

سوار کے لیے جائز ہے کہ حالت سواری میں نفل نماز ادا کرلے اور رکوع و سجود اشارے سے کرے (اگر آسانی سے ممکن نہیں)

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ٣٤٢، ٣٤٣؛ سنن ابن ماجه: ١٠١١. [2] صحيح البخاري: ٤٠٣؛ صحيح مسلم: ٥٢٦.

اس صورت میں اس کا سجود رکوع کی نسبت کچھ جھکا ہوا ہونا چاہیے، اب اس کا قبلہ وہی ہے جس طرف اس کی سواری کا رخ ہے، سیدنا عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ سواری پر نماز ادا کر رہے ہیں اور جس طرف کو وہ جا رہی تھی، اسی طرف آپ کا رخِ انور تھا۔[1] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، بخاری رحمہ اللہ نے یہ اضافہ بھی کیا کہ سر مبارک کے ساتھ اشارہ کرتے تھے۔[2] (یعنی رکوع و سجود میں) جبکہ فرض نماز سواری کی حالت میں ادا نہ کرتے تھے۔[3] احمد، مسلم اور ترمذی کے ہاں روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے سواری پر نماز پڑھتے رہے، جس طرف بھی سواری کا رخ ہوتا، اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾(البقرۃ:۱۱۵) ''جہاں بھی تم ہو وہیں اللہ کا وجود ہے۔'' ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سلف اپنی سواریوں پر جس طرف بھی ان کا رخ ہوتا نماز پڑھ لیتے تھے، بقول امام ابن حزم رحمہ اللہ یہ صحابہ و تابعین کی سفر و حضر میں اور اپنے ٹھکانوں میں عمومی روش کا بیان ہے۔

۲ مکرَہ (یعنی کسی جبر کا شکار) مریض اور خوفزدہ کی نماز

ان کے لیے غیر قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کرنا جائز ہے، اگر قبلہ رخ ہونے سے وہ عاجز ہوں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی ہدایت تھی کہ ''جب تمہیں کوئی حکم دوں تو حسبِ استطاعت اس کی بجا آوری کیا کرو۔''[4] آیت: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرۃ:۲۳۹) ''پھر اگر تم ڈرو تو پیدل پڑھ لو یا سوار۔'' کی تفسیر کے بارے میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''مُسْتَقْبِلِي الْقِبْلَةِ وَغَيْرَ مُسْتَقْبِلِيْهَا''[5] یعنی قبلہ رخ ہو یا نہ ہو، اسے بخاری نے نقل کیا۔

نماز کی کیفیت وصفت

نماز کی کیفیت وصفت کے بیان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث وارد ہیں، ہم یہاں دو کے ذکر پر اکتفا کریں گے، اول آپ کے فعل اور ثانی آپ کے قول سے:

① عبد اللہ بن غنم راوی ہیں کہ سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو جمع کیا اور اعلان کیا کہ اپنی خواتین اور اپنے بچوں کو بھی لے آؤ، تاکہ سب کو میں نمازِ نبوی سکھلا دوں جو ہم نے مدینہ میں آپ کو پڑھتے دیکھا ہے تو سب مرد و زن اور چھوٹے بڑے جمع ہوئے تو اولاً ان کے سامنے وضو کیا اور اس کی تعلیم دی، پھر دوپہر کا سایۂ زوال جب ختم ہوا تو اٹھ کر اذان دی، سب سے پہلے مردوں، پھر بچوں اور ان کے پیچھے عورتوں نے صف بنائی، سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، ہاتھ بلند کیے اور اللہ اکبر کہا، پھر سورۂ فاتحہ کی قراءت کی، اس کے بعد کوئی اور سورت پڑھی، پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں گئے تو تین مرتبہ «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ» کہا، پھر «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» کہہ کر اٹھے اور سیدھے کھڑے ہوئے، پھر تکبیر کہی اور سجدے میں گئے، پھر اللہ اکبر کہہ کر اٹھے، پھر تکبیر کہی اور دوسرا سجدہ کیا، پھر اللہ اکبر کہا اور (دوسری رکعت کے لیے) کھڑے ہوئے تو یوں پہلی

---

① صحيح البخاري: ١١٠٤؛ صحيح مسلم: ٧٠١. ② صحيح البخاري: ١١٠٥. ③ صحيح مسلم: ٧٠٠؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٠. ④ صحيح البخاري: ٧٢٨٨؛ صحيح مسلم: ١٣٣٧. ⑤ صحيح البخاري: ٤٥٣٥.

رکعت میں انہوں نے چھ تکبیریں کہیں، نماز مکمل کر کے قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ان تکبیرات کی تعداد یاد کر لو اور ذہن نشین کر لو کہ کس طرح میں نے سجود و رکوع کیا ہے تو یہ نبی کریم ﷺ کی نماز ہے جو آپ نے مدینہ میں ہمیں دن کی اس ساعت میں پڑھائی تھی، پھر چہرہ انور لوگوں کی طرف کر کے فرمایا تھا: ''اے لوگو! سنو اور سمجھو، اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء مگر ان کی مجالس اور اللہ سے ان کے قرب پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔'' یہ سن کر ایک اعرابی جو مجلس کے کنارے پہ تھا، آگے بڑھا اور ہاتھ کے اشارہ سے نبی کریم ﷺ کو متوجہ کر کے یوں عرض گزار ہوا کہ یا نبی اللہ! کچھ لوگ جو نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء مگر انبیاء و شہداء بھی ان پر رشک کریں گے، آپ ہمارے لیے ان کا وصف بیان کیجیے، اس کی بات سے نبی کریم ﷺ کے چہرہ سے خوشی پھوٹ گئی اور اس کی بات کے جواب میں فرمایا:

«هُمْ نَاسٌ مِنْ أَفْيَاءِ النَّاسِ وَنَوَازِعِ الْقَبَائِلِ لَمْ تَصِلْ بَيْنَهُمْ أَرْحَامٌ مُتَقَارِبَةٌ تَحَابَّوْا فِي اللَّهِ وَتَصَافَّوْا يَضَعُ اللَّهُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ فَيُجْلِسُهُمْ عَلَيْهَا فَيَجْعَلُ وُجُوْهَهُمْ نُوراً وَثِيَابَهُمْ نُوراً يَفْزَعُ النَاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَايَفْزَعُوْنَ وَهُمْ أَوْلِيَاءُ اللَّهِ الَّذِيْنَ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ»

''وہ مختلف قبائل اور قوموں کے لوگ ہیں جن کے درمیان کوئی قریبی رشتہ نہیں، مگر اللہ کی وجہ سے سب باہم شیر و شکر ہوئے، روزِ قیامت اللہ انہیں نور کی کرسیوں پر بٹھلائے گا تو ان کے چہرے اور لباس نور کے ہوں گے، یہ محشر میں عام لوگوں جیسی گھبراہٹ میں مبتلا نہ ہوں گے، یہ اللہ کے اولیاء ہیں نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ غم۔''[1]

اسے احمد اور ابو یعلیٰ نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا اور حاکم نے اسے صحیح الاسناد قرار دیا۔

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی، پھر حاضرِ خدمت ہو کر سلام عرض کیا، آپ نے جواب دے کر فرمایا: ''لوٹ کر دوبارہ نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔'' تین مرتبہ یہی ہوا، پھر اس نے عرض کی: قسم ہے اس ذات کی جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا! میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا، آپ مجھے سکھلایئے، فرمایا: «إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ......» الخ ''جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو تکبیر کہو، پھر جو قرآن میسر ہے وہ پڑھو، پھر رکوع کرو اور اس میں اطمینان کا مظاہرہ کرو، پھر سر اٹھاؤ حتی کہ پورے طور پر اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو اور اس میں (تیزی کا مظاہرہ نہ کرو بلکہ) اطمینان سے رہو، پھر سر اٹھاؤ اور عجلت کیے بغیر اطمینان سے بیٹھو، پھر (دوسرا) سجدہ نہایت اطمینان سے کرو اور یہی روش اپنی تمام نماز میں اختیار کرو۔''[2] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے تخریج کیا، اس روایت کو ''حدیث المسیء فی صلاتہ'' کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے تو یہ ہے صفتِ نماز جس کے بارے میں آپ کے فعل و قول سے دو روایتیں پیش کی گئیں۔

---

[1] ضعيف، مسند أحمد: ٥/ ٣٤٣؛ مجمع الزوائد: ٢/ ١٣٠. [2] صحيح البخاري: ٧٥٧؛ صحيح مسلم: ٣٩٧.

نماز کے فرائض

نماز کے متعدد فرائض وارکان ہیں جن سے اس کا وجود ترتیب پاتا ہے، ان میں سے کوئی فرض اگر متحقق نہ ہو تو شرعاً نماز نہ ہوگی، ذیل میں ان کا بیان کیا جاتا ہے:

① نیت

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾(البينة:٥)

''انہیں یہی حکم دیا گیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں۔''

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » ''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' اسے بخاری نے نقل کیا، وضو کے باب میں نیت کی حقیقت کے بارے بحث گزر چکی ہے۔

زبان سے نیت کی حقیقت

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب ''إغاثة اللهفان'' میں لکھتے ہیں: نیت کسی چیز کے کرنے کا قصد وعزم ہے اور اس کا محل دل ہے، زبان کا اس سے اصلاً ہی تعلق نہیں، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سے اور صحابہ سے نیت کے کوئی الفاظ منقول نہیں، ہمارے ادوار میں یہ جو وضو اور نماز کی نیت کے الفاظ ایجاد کر لیے گئے ہیں انہیں شیطان نے اہلِ وسواس کے لیے معرکہ گاہ بنا دیا ہے اور ان پر انہیں روک رکھا ہے اور ان کی طلب و تصحیح کے عذاب میں لوگوں کو ڈال رکھا ہے۔تم کئی حضرات کو دیکھتے ہو کہ انہیں یاد کر رہے ہیں اور یہ عبارت بولنے میں مشقت اٹھا رہے ہیں (اور ادھر نماز ہو رہی ہے) نماز سے اس کارروائی کا کوئی تعلق نہیں۔

② تکبیر تحریمہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: ''نماز کی کنجی وضو، اس کی تحریم تکبیر (یعنی اب حلال کام بھی حرام ہوئے) اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے (یعنی پھر سے نماز سے قبل کی صورتحال ہوئی)''[1] اسے شافعی، احمد، ابو داود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور لکھا کہ یہ اس باب میں اصح واحسن روایت ہے، حاکم اور ابن سکن نے بھی اس پر صحت کا حکم لگایا، اس لیے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے قول اور فعل سے ثابت ہے، جیسا کہ سابق الذکر دونوں روایتوں میں تھا،تکبیر کے لیے ''اَللّٰہُ أَکْبَرْ'' ہی متعین ہے، سیدنا ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مدنظر کہ جب نبی کریم ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہو کر رفع الیدین کرتے، پھر کہتے: « اَللّٰہُ أَکْبَرْ »[2] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حکمِ صحت لگایا،

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٦١؛ سنن ترمذي: ٣؛ سنن ابن ماجه: ٢٧٥. [2] صحيح، سنن ابن ماجه: ٨٠٣؛ ابن حبان: ١٨٧٠.

اس کا مثل بزار نے صحیح سند کے ساتھ مسلم کی شرط پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، کہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے ،طبرانی کے ہاں مسیء صلاتہ والی حدیث میں ہے کہ پھر کہے: ((اَللّٰہُ أَکْبَرْ)) ۔

③ فرائض میں قیام

یہ کتاب وسنت اور اجماع کی رو سے واجب ہے اس کے لیے جو اس پر قادر ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ۚ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۳۸)

''سب نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو۔''

(قوموا یعنی قیام کا لفظ استعمال کیا) سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ مجھے بواسیر کا عارضہ تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر، اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھو تو پہلو کے بل ہو کر۔''[1] اسے بخاری نے نقل کیا، اس پر علماء متفق ہیں جیسے اس امر پر بھی کہ دورانِ نماز نمازی کے دونوں پاؤں جڑے ہوئے نہ ہوں۔

نوافل میں قیام

قیام کی قدرت کے باوجود نوافل کی ادائیگی بیٹھ کر بھی جائز ہے، البتہ ثواب میں کمی ہوگی، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مجھے حدیث بیان کی گئی کہ آپ نے فرمایا ہے: ((صَلَاۃُ الرَّجُلِ قَاعِداً نِصْفُ الصَّلَاۃِ)) ''(بلا عذر) بیٹھ کر نماز پڑھنے سے کھڑے کی نسبت نصف اجر ملتا ہے۔''[2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

فرائض میں قیام سے عاجز ہونا

ایسا شخص اپنے حسبِ قدرت نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اسے پورا ثواب ملے گا کوئی کمی نہ ہوگی، سیدنا ابوموسی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ اگر مریض یا مسافر ہو تو اللہ اس دوران میں کیا ہوا اس کا وہی عمل لکھتا ہے جو صحیح اور مقیم حالت میں وہ کرتا ہے۔''[3] اسے بخاری نے نقل کیا۔

④ فرض و نفل کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت

ہر رکعت میں قراءتِ فاتحہ کی فرضیت کے بارے میں صحیح احادیث موجود ہیں، لہٰذا ان کی موجودگی میں اس بابت کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔

ان میں سے درج ذیل ذکر کی جاتی ہیں:

---

[1] صحیح البخاری: ۱۱۱۷. [2] صحیح البخاری: ۱۱۵؛ صحیح مسلم: ۷۳۵. [3] صحیح البخاری: ۲۹۹۶.

① سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے فاتحہ نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔''① اسے جماعت نے نقل کیا۔

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم نے فرمایا: ''جس نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں فاتحہ کی قراءت نہ کی تو وہ نماز خداج ہے، تام نہیں۔''② بقول محشی خطابی رحمہ اللہ نے خداج کا معنی یہ کیا: ''نَقْصُ بُطْلَانٍ وَفَسَادٍ'' یعنی ایسا نقص جو نماز کے فساد اور بطلان کا موجب بنے۔ اسے احمد اور شیخین نے تخریج کیا۔

③ انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایسی نماز کفایت نہیں کرے گی جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔''③ اسے ابن خزیمہ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا، ابن حبان اور ابوحاتم نے بھی اس کی تخریج کی۔

④ دارقطنی میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے: «لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» ''فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی۔''④

⑤ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہمیں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ جو قرآن سے میسر ہو، کی قراءت کا حکم دیا گیا۔⑤ اسے ابوداود نے نقل کیا، بقول حافظ اور ابن سید الناس اس کی اسناد صحیح ہیں۔

⑥ حدیث المسیء صلاتہ کے بعض طرق میں ہے: «ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ» آگے ہدایت کی تھی کہ ہر رکعت میں یہ کرنا۔

⑦ پھر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرض ونفل کی ہر رکعت میں فاتحہ پڑھا کرتے تھے، آپ سے اس کے برخلاف ثابت نہیں اور عبادت میں مدار اتباع پر ہے اور آپ کا فرمان ہے: «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» ''ایسے نماز پڑھا کرو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔''⑥ اسے بخاری نے نقل کیا۔

بسم اللہ پڑھنا

علماء کا اتفاق ہے کہ ''بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم'' سورۃ النمل کی ایک آیت ہے، لیکن اس امر میں ان کا باہم اختلاف ہے کہ آیا بسم اللہ ہر سورت کی پہلی آیت ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں تین مشہور مذاہب ہیں:

① یہ فاتحہ اور ہر سورت کی اولین آیت ہے، اس پر فاتحہ میں اس کی قراءت بھی واجب ہے اور سری و جہری نمازوں میں یہ بھی سورۂ فاتحہ کے حکم میں ہے، اس مذہب کی اقویٰ دلیل نعیم مجمر کی روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے ''بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم'' پڑھی، پھر فاتحہ کی قراءت کی، اس کے آخر میں ہے کہ کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری نماز نمازِ نبوی سے مشابہت میں تم سب سے بڑھ کر ہے۔⑦ اسے نسائی، ابن خزیمہ

---

① صحيح البخاري: ٧٥٦؛ صحيح مسلم: ٣٩٤؛ سنن أبي داود: ٨٢٢. ② صحيح مسلم: ٣٩٥؛ سنن أبي داود: ٨٢١. ③ صحيح، ابن خزيمة: ٤٩٠؛ سنن ترمذي: ٢٤٧. ④ صحيح، سنن الدارقطني: ١٢١٢. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ٨١٨. ⑥ صحيح البخاري: ٧٢٤٦. ⑦ ضعيف، سنن نسائي: ٩٠٤.

اور ابن حبان نے نقل کیا، حافظ رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: بسم اللہ بالجہر پڑھنے کے بارے میں یہ صحیح ترین حدیث ہے۔

② یہ ایک مستقل (اور سورت سے الگ) آیت ہے جو برائے تبرک اور سورتوں کے مابین فصل کی علامت کے بطور نازل ہوئی اور فاتحہ میں اس کی قراءت جائز بلکہ مستحب ہے، لیکن بالجہر پڑھنا مسنون نہیں، کیونکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نمازیں ادا کی ہیں، یہ سب بسم اللہ بالجہر نہ پڑھتے تھے۔[1] (مترجم کہتا ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سابقہ روایت میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور نہیں کہ بالجہر بسم اللہ پڑھی، راوی نے امرِ واقع بتلایا کہ بسم اللہ پڑھی، ممکن ہے کہ ایک آدھ لفظ بالجہر پڑھ دیا ہو، جبکہ اس کے مقابلہ میں یہ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ عدم جہر میں بالکل صریح اور واضح ہے) اسے نسائی، ابن حبان اور طحاوی نے صحیحین کی شرط پر سند کے ساتھ نقل کیا۔

③ یہ فاتحہ اور دیگر سورتوں کا حصہ نہیں اور اس کی قراءت مکروہ ہے، چاہے سری نماز ہو یا جہری، فرائض میں نہ کہ نوافل میں، یہ مذہب قوی نہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اول اور ثانی مذاہب کے مابین یہ تطبیق دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بالجہر بسم اللہ پڑھ لیتے اور اکثر اوقات بالسر پڑھتے تھے، بلا شبہ ہمیشہ سفر وحضر کی نمازِ پنجگانہ میں اسے بالجہر نہیں پڑھا، خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ پر یہ امر مخفی ہونا ممکن نہیں۔

جسے فاتحہ اچھی طرح یاد نہیں

امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اصل وضابطہ یہ ہے کہ نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قراءتِ فاتحہ کا یہ وجوب اس شخص کے لیے ہے جسے یہ اچھی طرح یاد ہے، اگر کسی کو (فی الحال، مثلاً کم سن بچہ) یہ اچھی طرح یاد نہ ہو اور دیگر کوئی سورت یا آیت یاد ہے تو فاتحہ کی سات آیات کے بقدر پڑھ لے (عام مشاہدہ ہے کہ بچوں کو ''سورۂ اخلاص'' کے بعد سب سے قبل فاتحہ ہی یاد ہوتی ہے) کیونکہ فاتحہ کے بعد اولین ذکر دیگر کسی سورت میں سے قراءت کرنا ہے اور اگر کسی وجہ سے اسے قرآن کی کوئی چیز یاد نہیں تو تسبیح، تحمید اور تہلیل کے وہ کلمات پڑھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ومنقول ہیں، آپ سے مروی ہے کہ ''کلام اللہ کے بعد افضل ترین ذکر سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إلہ إلا اللہ اور اللہ اکبر ہے۔'' اس کی تائید خطابی رحمہ اللہ کی ذکر کردہ سیدنا رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز کی تعلیم دی اور فرمایا: ''اگر تمہیں کچھ قرآن یاد ہے تو اسے پڑھو، وگرنہ حمد کرو، تکبیر پڑھو، تہلیل کرو اور پھر رکوع کرو۔''[2] اسے ابوداود، نسائی اور ترمذی اور بیہقی نے نقل کیا، ترمذی نے حسن قرار دیا۔

⑤ رکوع

اس کی فرضیت پر اجماع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ (الحج: ۷۷) ''اے

---

① صحیح، سنن نسائی: ۹۰۷۔ ② صحیح، سنن أبی داود: ۸۶۱؛ سنن ترمذی: ۳۰۲.

ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو۔" رکوع کی حقیقت مجرد احناء (یعنی اتنا جھکنا کہ دونوں ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں) سے رکوع متحقق ہو جاتا ہے اور ضروری ہے کہ اس حالت کو اختیار کر کے مکمل اطمینان کا مظاہرہ ہو، کیونکہ مسیئ صلاۃ والی روایت میں تھا: ﴿ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعاً﴾ سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب سے بدتر چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرتا ہے!" صحابہ نے عرض کی کہ نماز کی چوری کیسے ہوتی ہے؟ فرمایا: "رکوع و سجود میں جلدی کرے۔" ایک روایت میں ہے، "جو رکوع و سجود میں کمر اچھی طرح نہیں ٹکاتا۔"[1] اسے احمد، طبرانی، ابن خزیمہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ یہ صحیح الاسناد ہے، سیدنا ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس آدمی کی نماز نہیں ہوتی جو رکوع و سجود میں اپنی کمر اچھی طرح نہیں ٹکاتا۔"[2] اسے احمد، طبرانی، ابن خزیمہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے اور صحابہ و تابعین اور محدثین کا اسی پر عمل ہے، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع و سجود میں جلدی کر رہا تھا تو اسے کہا: تمہاری نماز ہی نہیں اور اگر اسی حالت میں مر گئے تو اس فطرت پر نہیں مرو گے جس پر اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قائم کیا۔[3] اسے بخاری نے روایت کیا۔

⑥ رکوع سے سر اٹھا کر اعتدال (یعنی قومہ) میں طمانیت سے کھڑے ہونا

سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے نمازِ نبوی کی صفت والی اپنی روایت میں کہا کہ آپ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سیدھے کھڑے رہتے، حتی کہ جسم کی ہر ہڈی اپنی جگہ پر لوٹ آتی۔[4] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس وقت تک سجدے میں نہ جاتے جب تک سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے۔[5] (یہ نہیں کہ بعض احناف کی طرح رکوع سے ہی جھٹکا کھا کر سجدے میں چلے جائیں) اسے مسلم نے نقل کیا، آپ کا فرمان ہے: ﴿ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِماً﴾ "رکوع سے جب اٹھو تو تسلی اور اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔" (جلد بازی نہ کرو کہ فوراً سجدے میں چلے جاؤ)۔[6] متفق علیہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ ایسے شخص کی نماز کو دیکھتا تک نہیں جو رکوع اور سجود کے درمیان (یعنی قومہ میں) اپنی کمر کو سیدھی نہیں رکھتا۔"[7] اسے احمد نے تخریج کیا، بقول منذری اس کی سند جید ہے۔

⑦ سجدہ

قرآن کی مندرجہ بالا آیت اس کے وجوب پر دلالت کرتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیئ صلاۃ کو نماز کی تعلیم کے ضمن میں یہ بھی کہا تھا:

---

① صحیح ابن خزیمة: ٦٦٣؛ صحیح ابن حبان: ١٨٨٨. ② صحیح، سنن أبي داود: ٨٥٥؛ سنن ترمذی: ٢٦٥.
③ صحیح البخاری: ٧٩١. ④ صحیح البخاری: قبل الرقم: ٨٠٠. ⑤ صحیح مسلم: ٤٩٨. ⑥ صحیح البخاری: ٧٥٧؛ صحیح مسلم: ٣٩٧. ⑦ صحیح لغیره، مسند أحمد: ٢/ ٥٢٥.

«ثُمَّ اسْجُدْ حَتّیٰ تَطْمَئِنَّ سَاجِداً، ثم ارفع حَتّیٰ تَطْمَئِنَّ جَالِساً ثُمَّ اسْجُدْ حَتّیٰ تَطْمَئِنَّ سَاجِداً»

''پھر خوب اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدوں کے درمیان بھی اطمینان سے کچھ دیر بیٹھو، پھر اطمینان سے (دوسرا) سجدہ کرو۔''

تو پہلا سجدہ، اس سے اٹھ کر بیٹھنا اور دوسرا سجدہ، فرض ونفل گویا ہر نماز کی ہر رکعت میں ان تینوں میں بھی طمانیت کا اظہار اور تیزی نہ دکھلانا فرض ہے۔

طمانیت کی حد

اتنی دیر کہ اعضا میں استقرار آجائے (یعنی پچھلے رکن سے منتقل ہوتے ہوئے جو اعضائے جسمانی میں تحریک پیدا ہوئی تھی وہ تھم جائے اور جسم اگلے رکن میں جا کر پر سکون ہو جائے) اور کچھ دیر اسی حالت میں رہے، علماء نے اس کی کم از کم حد اتنی بیان کی کہ ایک دفعہ تسبیح (یعنی جو اس رکن کے لیے مشروع ہے) پڑھی جا سکے۔

جن اعضا پر سجدہ کرنا ہے

یہ چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں ہیں۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جب نمازی سجدہ کرتا ہے تو اس کے سات اعضا کو بھی سجدہ کرنا چاہیے۔'' پھر مذکورہ بالا اعضا ذکر کیے،[1] اسے سوائے بخاری کے دیگر اہلِ ستہ نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ''سات اعضا پر سجدہ کیا جائے اور اپنے بال اور لباس کے کسی حصے کو مت سمیٹے۔'' تو ان سات اعضا میں پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں ذکر کیے،[2] متفق علیہ، ایک روایت میں یہ فرمانِ نبوی مذکور ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات ہڈیوں پر سجدہ کروں: پیشانی پر (ناک کی طرف اشارہ کیا) اور دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنوں اور پاؤں کی انگلیوں پر۔''[3] سیدنا ابوحمید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر لگاتے،[4] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ صحیح ہے، لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے، بعض اہلِ علم کے نزدیک اگر صرف پیشانی زمین پر لگی تو یہ بھی جائز ہے، دیگر نے کہا: یہ جائز نہیں۔

⑧ آخری تشہد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی وسیرت سے ثابت ومعروف یہ ہے کہ آپ نماز کے آخر میں بیٹھتے اور اس میں تشہد کے معروف الفاظ پڑھتے تھے، آپ نے مسیئ صلاتہ سے کہا تھا، جب آخری سجدہ سے اٹھو اور بقدرِ تشہد بیٹھ چکو تو سمجھو تمہاری نماز مکمل ہوگئی،

---

① صحیح مسلم: ٤٩١؛ سنن أبی داود: ٨٩١؛ سنن ترمذی: ٢٧٢. ② صحیح البخاری: ٨١٢؛ صحیح مسلم: ٤٩٠. ③ صحیح مسلم: ٤٩٠؛ سنن نسائی: ١٠٩٥. ④ سنن أبی داود: ٧٣٤؛ سنن ترمذی: ٢٧٠.

بقول ابن قدامہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم تشہد فرض ہونے سے قبل یہ الفاظ کہا کرتے تھے: ''اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰہِ قِبَلَ عِبَادِہٖ، اَلسَّلَامُ عَلٰی جِبْرِیْل، اَلسَّلَامُ عَلٰی مِیْکَائِیْل' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰہِ نہ کہو بلکہ کہو: اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ''[1] یہ دال ہے کہ پہلے یہ فرض نہ تھا بعد ازاں فرض کر دیا گیا۔

الفاظِ تشہد کے بارے میں وارد اصح روایت

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز (کے آخر) میں بیٹھے اور کہا ''اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰہِ قِبَلَ عِبَادِہٖ، وَالسَّلَامُ عَلٰی فُلَانٍ وَفُلَانٍ'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰہِ)) نہ کہو کیونکہ اللہ تو خود سلام ہے، جب تمہارا کوئی بیٹھے تو یہ کہے: ((اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ أَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ)) ''تمام انواع کی عبادات اور پاکیزہ کلمات اللہ ہی کے لیے ہیں، اے نبی! آپ پر سلامتی، اللہ کی طرف سے رحمت اور برکات ہوں نیز ہم پر بھی اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی۔'' تو تمہارا سلام ارض وسما کے ہر عبدِ صالح تک پہنچ جائے گا، پھر کہو: ((أَشْھَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ)) پھر جو چاہو دعائیں کرو۔''[2] (علماء نے قرار دیا کہ بزبان عربی یہ دعائیں کرنی چاہئیں، اگر کسی کو حسبِ منشا عربی میں دعائیں کرنا نہیں آتا تو ماثورہ ادعیہ پڑھ لے) اسے جماعت نے تخریج کیا، امام مسلم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لوگوں نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول اس تشہد (کے کلمات) پر اجماع کر لیا ہے کیونکہ ان کے تلامذہ نے بغیر باہمی اختلاف کیے یہی الفاظ روایت کیے ہیں، ترمذی، خطابی، ابن عبد البر اور ابن منذر رحمہم اللہ لکھتے ہیں: سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت تشہد کے بارے میں وارد اصح ترین روایت ہے۔

اس کے بعد سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس طرح تشہد کی تعلیم دیتے جس طرح قرآن کی دیتے تھے، آپ یہ کلمات فرماتے: ((اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ أَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ أَشْھَدُ أَنْ لَاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ))[3] اسے شافعی، مسلم، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، امام شافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تشہد کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں اور یہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، کیونکہ یہ سب سے اکمل ہے۔ بقول حافظ رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ذکر کردہ تشہد کو اختیار کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جب میں نے اسے جامع مانع دیکھا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیحاً سنا (یعنی میری اس روایت کی ان تک سند صحیح ہے) اور میرے نزدیک یہ کلمات دیگر منقول سب کلمات سے اجمع و اشمل ہیں تو میں نے اسے اختیار کیا، لیکن میں دیگر

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ١١٦٧. [2] صحیح البخاری: ٨٣١؛ صحیح مسلم: ٤٠٢؛ سنن أبی داود: ٩٦٨.

[3] صحیح مسلم: ٤٠٣؛ سنن أبی داود: ٩٧٤؛ سنن ترمذی: ٢٩٠.

صحیح وارد تشہد اختیار کرنے والے پر ناراض نہیں، مالک رحمہ اللہ کا اختیار ایک دیگر تشہد ہے جسے انہوں نے موطا میں عبدالرحمن بن عبدالقاری سے روایت کیا، کہتے ہیں: میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ منبر پر کھڑے ہوئے لوگوں کو یہ کلمات تشہد سکھلا رہے تھے: ((اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ اَلزَّاكِيَاتُ لِلّٰهِ اَلطَّيِّبَاتُ وَالصَّلَوَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ)) [1] امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تشہد کے بارے میں یہ سب روایات صحیح ہیں اور محدثین کے بالاتفاق ان میں صحیح ترین روایت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے: پھر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی، بقول شافعی رحمہ اللہ ان میں سے جو بھی کلمات تشہد پڑھ لو جائز ہوگا، کہتے ہیں: علماء کے ہاں بالاجماع ان مذکورہ میں سے کسی ایک کو پڑھنا جائز ہے۔

⑨ سلام

سلام کی فرضیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل دونوں کے ذریعے ثابت ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز کی کنجی وضو، اس کی تحریم تکبیر اور اس کی تحلیل تسلیم ہے۔'' اسے احمد، شافعی، ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ اس باب کی اصح حدیث ہے، عامر بن سعید عن ابیہ سے روایت ہے: میں دیکھتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دائیں طرف سلام پھیرتے اور پھر بائیں طرف، چہرہ مبارک اتنا موڑتے کہ رخسار کی سفیدی نظر آتی۔ [2] اسے احمد، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز ادا کی تو آپ دائیں جانب سلام پھیرتے ہوئے کہتے: ((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ)) اور بائیں طرف بھی یہی کہتے، [3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بلوغ المرام میں لکھتے ہیں: اسے ابوداود نے بسند صحیح نقل کیا۔

ایک طرف سلام کا وجوب اور دوسرے کا استحباب

جمہور علماء کی رائے ہے کہ پہلا (یعنی دائیں طرف) سلام فرض اور دوسرا مستحب ہے، امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علماء کا اجماع ہے کہ ایک سلام پر اکتفا کر لینا جائز ہے، ابن قدامہ رحمہ اللہ المغنی میں لکھتے ہیں: احمد کی نص دونوں سلام کے واجب ہونے کے بارے میں صریح نہیں، صرف یہ کہا کہ دونوں سلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا صحیح ہے تو جائز ہے کہ ان کی مشروعیت کی رائے رکھی جائے نہ کہ وجوب کی جیسا کہ کئی اہل علم کا مؤقف ہے، ان سے منقول ایک نص کے یہ الفاظ اس پر دال ہیں: ((وَأَحَبُّ إِلَيَّ التَّسْلِيْمَتَانِ)) ''دونوں طرف سلام پھیرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔'' اس لیے کہ سیدنا سلمہ بن اکوع، سہل بن سعد اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سلام پھیرا کرتے تھے اور مہاجرین بھی ایک سلام پھیرتے تھے۔ [4] (بقول محشی ان تینوں روایات کی اسانید میں ضعیف اور منکر الحدیث راوی ہیں) ہم نے قبل ازیں جو ذکر کیا کہ ایک مرتبہ کا سلام

---

① المؤطا امام مالك:١/ ٩٠. ② صحيح مسلم:٥٨٢؛ سنن نسائی:١٣١٦؛سنن ابن ماجه:٩١٥. ③ صحيح، سنن أبی داود: ٩٩٧. ④ صحيح، سنن ابن ماجه: ٩١٩؛ سنن ترمذی: ٢٩٦.

واجب اور دوسرا مستحب ہے، وہ ان کے درمیان تطبیق کر دیتا ہے، اس اجماع کی صحت پر دلیل وہ جو امام ابن منذر رحمہ اللہ نے ذکر کی، لہٰذا اس سے عدول نہیں کرنا چاہیے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: شافعی اور سلف وخلف کے جمہور کا مسلک یہ ہے کہ دونوں سلام مسنون ہیں، مالک اور ایک گروہ نے کہا کہ مسنون فقط ایک سلام ہے، ان کے مدنظر ضعیف روایات ہیں جو ان صحیح احادیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتیں، اگر ان میں سے کوئی ثابت ہوتو اسی امر پر محمول کی جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیانِ جواز کے لیے یہ کہا، قابلِ ذکر علماء کا اجماع ہے کہ واجب ایک سلام ہے، اگر کوئی ایک سلام پر اکتفا کرنا چاہے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ (بجائے دائیں طرف پھیرنے کے) اپنے سامنے کہے اور اگر دونوں طرف سلام پھیرنا چاہے تو اول اپنی دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف منہ کر کے کہے اور اس دوران میں اتنا التفات کرے کہ اس کا رخسار (اس طرف کے لوگوں کو) نظر آئے، یہی صحیح ہے، آگے لکھتے ہیں: اگر دونوں سلام دائیں طرف یا دونوں بائیں طرف پھیر لیے یا پہلا بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف تو بھی اس کی نماز صحیح ہے، کیونکہ اس کی جانب سے سلام تو وقوع پذیر ہو گئے، لیکن ان کی کیفیت کی (مسنون) فضیلت سے وہ محروم ہوا۔

نماز کی سنن

نماز کی متعدد سنن ہیں، نمازی کے لیے ان پر محافظت مستحب ہے تاکہ ان کا ثواب حاصل ہو، وہ درج ذیل ہیں:

① رفع الیدین

نماز کے چار مقامات پر رفع الیدین کرنا مستحب ہے۔

پہلا رفع الیدین

تکبیر تحریمہ کے وقت، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہل علم کا اس امر میں اختلاف نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو رفع الیدین کرتے تھے، ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نماز کے شروع میں رفع الیدین کا ہونا پچاس صحابہ سے مروی ہے اور ان میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں، بیہقی نے حاکم سے نقل کیا کہ ہمیں رفع الیدین کے علاوہ کسی اور سنت کا علم نہیں جس کی روایت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفائے اربعہ، پھر عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ متفق ہوئے ہوں، باوجود اس امر کے کہ صحابہ مختلف شہروں میں متفرق ہو گئے تھے، امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بات یہی ہے جو ہمارے استاذ ابوعبداللہ (یعنی حاکم) نے کہی۔

رفع الیدین کی صفت

رفع الیدین کی صفت کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں، اکثر کے ہاں مختار یہ ہے کہ کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھائے جائیں، اس طور پر کہ انگلیاں کانوں کے اوپر والے کناروں کے برابر ہوں اور انگوٹھے ان کی لو کے، بقول امام نووی:

امام شافعی رحمہ اللہ نے ان روایات کے مابین یہی تطبیق دی ہے اور لوگوں نے اسے پسند کیا، رفع الیدین کرتے ہوئے مستحب ہے کہ انگلیاں پھیلی ہوئی ہوں، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو: ''رَفَعَ يَدَيْهِ مَدًّا'' یعنی ''ہاتھوں کو پھیلا کر رفع یدین کرتے۔''[1] اسے سوائے ابن ماجہ کے سب نے تخریج کیا۔

رفع الیدین کا وقت

تکبیر تحریمہ کے دوران ہی رفع الیدین کرنا چاہیے یا پھر اس سے پہلے، نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز میں داخل ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور ساتھ ہی رفع الیدین کرتے اور بیان کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی کیا کرتے تھے۔[2] اسے بخاری، نسائی اور ابو داود نے نقل کیا، انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کہتے ہوئے رفع الیدین کرتے حتی کہ ہاتھ آپ کے کندھوں کے برابر ہو جاتے یا اس کے قریب قریب، اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا، جہاں تک تکبیر کہنے سے قبل ہاتھ اٹھانا ہے تو یہ بھی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے: کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو رفع الیدین کرتے حتی کہ ہاتھ کندھوں کے برابر ہو جاتے، پھر تکبیر کہتے،[3] اسے بخاری و مسلم نے تخریج کیا، سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''كَبَّرَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ'' یعنی تکبیر کہی، پھر رفع الیدین کیا۔''[4] اسے مسلم نے نقل کیا، اس سے رفع الیدین سے قبل تکبیر کہنے کا افادہ ملا، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ مجھے کوئی تکبیر کی رفع الیدین پر تقدیم کا قائل نہیں ملا۔

دوسرا اور تیسرا رفع الیدین

رکوع جاتے ہوئے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع الیدین کرنا مستحب ہے، بائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع الیدین کرتے تھے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے ہوئے رفع الیدین کرتے، پھر جب رکوع کرنا چاہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور کہتے: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهْ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ» اسے بخاری، مسلم اور بیہقی نے نقل کیا، بخاری کے ہاں یہ اضافہ بھی ہے کہ سجدہ کو جاتے ہوئے اور اس سے اٹھتے ہوئے ایسا نہ کرتے تھے،[5] مسلم میں ہے کہ سجدوں سے اٹھتے ہوئے رفع یدین نہ کرتے تھے،[6] ان کی ایک روایت میں ہے کہ سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہ کرتے تھے،[7] بیہقی نے یہ اضافہ بھی نقل کیا: ''فَمَا زَالَتْ تِلْكَ صَلَاتُهُ حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى'' یعنی وفات تک یہی آپ کی نماز کی صفت رہی۔ ابن مدینی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میرے نزدیک یہ حدیث خلقِ خدا پر حجت ہے، ہر جو اسے سنے اس پر واجب ہے کہ رفع الیدین کرے، کیونکہ اس

---

[1] صحيح، سنن ترمذي: ٢٤٠؛ سنن أبي داود: ٧٥٣. [2] صحيح البخاري: ٧٣٩؛ سنن أبي داود: ٧٤١.
[3] صحيح البخاري: ٧٣٦؛ صحيح مسلم: ٣٩٠. [4] صحيح مسلم: ٣٩١. [5] صحيح البخاري: ٧٣٨.
[6] صحيح مسلم: ٣٩٠/ ٢٢. [7] صحيح مسلم: ٣٩٠/ ٢١.

کی اسناد میں کوئی علت نہیں، بخاری نے رفع الیدین پر ایک رسالہ تالیف کیا اور اس میں حسن اور حمید بن ہلال کا قول نقل کیا کہ صحابہ کرام رفع الیدین کرتے تھے، حسن نے تو کسی ایک کا بھی استثناء نہیں کیا۔

حنفیہ کا مؤقف ہے کہ رفع الیدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہی مشروع ہے، ان کا استدلال سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے کہ ایک دفعہ کہا: میں تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھاتا ہوں، پھر نماز شروع کی تو ''فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا مَرَّةً''، یعنی یکبارگی رفع الیدین کیا (ایک مفہوم یہ کہ بار بار شیعوں کی طرح نہیں بلکہ ایک دفعہ ہاتھ بلند کیے، احناف کے ہاں اس سے مراد یہ ہے کہ صرف نماز شروع کرتے وقت رفع الیدین کیا، رکوع کو جاتے اور اس سے سر اٹھاتے وقت نہیں)۔'' تو یہ غیر قوی مذہب ہے، کیونکہ اس روایت کی سند میں کثیر آئمہ حدیث نے طعن کیا ہے، ابن حبان لکھتے ہیں: یہ رکوع جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے نفیِ رفع الیدین کے بارے میں اہل کوفہ کی سب سے احسن روایت ہے اور فی الحقیقت یہ ان کی کمزور ترین دلیل ہے جس پر ان کے مؤقف کا مدار ہے، کیونکہ اس کی اسناد میں متعدد علل ہیں، بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کر لیں، جیسا کہ ترمذی نے کہا تو اس سے ان صحیح احادیث کا معارضہ نہیں کیا جا سکتا جو مشہور کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں، صاحب التنقیح نے تجویز کیا کہ ممکن ہے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھول لگ گئی ہو جیسے کئی اور امور میں بھی لگی، امام زیلعی رحمہ اللہ نصب الرایہ میں مصنف التنقیح کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھول جانا کوئی مستغرب امر نہیں، ''سورۂ فلق اور سورۂ ناس'' کے بارے میں بھی انہیں بھول لگی، جب کہا کہ یہ قرآن کا حصہ نہیں جبکہ ان کے سوا بلا استثناء سب صحابہ کرام متفق ہیں کہ یہ قرآن کا حصہ ہیں، اسی طرح دورانِ رکوع ہاتھ گھٹنوں کے درمیان رکھنے کا حکم منسوخ ہونے کے بارے میں بھی بھول انہیں لگ گئی تھی، جبکہ اس میں بھی کوئی اور ان کا ہمنوا نہیں، اسی طرح اس امر میں بھی کہ دو رکعتیں ادا کر کے تیسری کے لیے مقتدی کیسے اٹھیں اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر نمازِ فجر وقت پر ادا کی تھی اور عرفہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقوف کی کیا کیفیت تھی اور سجدہ کی حالت میں کہنی اور بازو زمین پر کس کیفیت میں رکھنے چاہییں اور ﴿ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ﴾ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیا تھی، ان سب امور میں انہیں بھول لگی تو کیا عجب ہے کہ رفع الیدین کے معاملہ میں بھی انہیں بھول لگ گئی ہو!۔

چوتھا رفع الیدین

یہ ان نمازوں میں ہے جن میں دو سے زائد رکعات ہیں تو دوسری سے تیسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت بھی رفع الیدین کیا جائے گا، چنانچہ نافع سے مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب دو رکعتوں سے کھڑے ہوتے تو رفع الیدین کرتے اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا،[1] اسے بخاری، ابو داود اور نسائی نے تخریج کیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی صفت کے بارے میں حدیث ہے کہ جب آپ دو رکعتوں سے (تیسری کے لیے) اٹھتے تو ہاتھ کندھوں کے برابر کر کے رفع الیدین کرتے اور تکبیر کہتے، اسے ابو داود، احمد اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی صحیح ہے۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٧٤٤؛ سنن ترمذی: ٣٠٤.

اس سنت میں عورت و مرد کی تمیز نہیں

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سنت میں مرد و عورتیں سب شریک ہیں کہیں کوئی ایسی روایت وارد نہیں جو ان کی تفریق کا اشارہ دیتی ہو، دونوں کے لیے رفع الیدین کی کیفیت بھی ایک جیسی ہے۔

② دائیں بازو کو بائیں پر رکھنا

یہ مندوب ہے، اس بارے میں اٹھارہ صحابہ و تابعین کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس روایات منقول ہیں، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ راوی ہیں: لوگوں کو حکم تھا کہ نماز میں (یعنی قیام کی حالت میں) اپنا دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر باندھیں، بقول ابو حازم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسے منسوب کیا۔[1] اسے بخاری، احمد، اورموطا میں مالک نے نقل کیا ہے بقول حافظ رحمہ اللہ: یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ اس امر پر محمول ہے کہ یہ حکم دینے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، انہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم معشرِ انبیاء کو حکم دیا گیا کہ روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں اور یہ کہ اثنائے نماز دایاں بازو بائیں کے اوپر رکھیں۔''[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک نماز میں مشغول شخص سے ہوا، جس نے اپنا بایاں ہاتھ دائیں کے اوپر باندھ رکھا تھا تو آپ نے اس کا ہاتھ چھڑوا کر دایاں بائیں پر کر دیا،[3] اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا: اس کا برخلاف منقول نہیں اور یہ جمہور صحابہ و تابعین کا قول ہے، مالک نے یہ موطا میں ذکر کیا اور کہا: امام مالک رحمہ اللہ کا وفات تک عمل یہی تھا کہ وہ ہاتھ باندھتے تھے۔

ہاتھ کس جگہ باندھے جائیں؟

کمال بن ہمام (مشہور حنفی امام) لکھتے ہیں: سینے کے نیچے اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، بہر حال احناف کے ہاں معمول یہ ہے کہ ہاتھ ناف کے نیچے باندھے جائیں، شوافع سینے کے نیچے کہتے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے دونوں طرح منقول ہے، تحقیق ان دونوں کے مابین مساوات ہے (یعنی دونوں اقوال ہم پلہ ہیں) امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحابہ و تابعین اور مابعد کے اہلِ علم کی رائے ہے کہ آدمی نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر باندھے، ان کے بعض کی رائے تھی کہ ناف کے نیچے باندھے، جبکہ بعض نے کہا: ناف کے اوپر اور یہ سب ان کے ہاں معمول بہ تھا، لیکن کچھ ایسی روایات ہیں جن سے افادہ ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سینے پر ہاتھ باندھا کرتے تھے، چنانچہ سیدنا ہلب طائی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا: ''يَضَعُ الْيُمْنىٰ عَلَى الْيُسْرىٰ عَلىٰ صَدْرِهِ فَوْقَ الْمِفْصَلِ'' یعنی دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے جوڑ پر باندھا سینے پر۔''[4] اسے احمد نے نقل کیا اور ترمذی نے حسن قرار دیا، سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت

---

① صحيح البخاري: ٧٤٠؛ مسند أحمد: ٥/ ٣٣٦. ② صحيح، سنن دارقطني: ١٠٨٤. ③ صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٣٨١؛ سنن دارقطني: ١٠٩٣. ④ حسن، مسند أحمد: ٥/ ٢٢٦؛ سنن ترمذي: ٢٥٢.

ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی تو آپ نے سینے پر دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر باندھا، اسے ابن خزیمہ نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا، اسے ابوداود اور نسائی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ”ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنىٰ عَلىٰ ظَهْرِ كَفِّهِ الْيُسْرىٰ وَالرُّسْغِ وَالسَّاعِدِ“[1] یعنی ”پھر اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی پشت پر باندھا اور کلائی اور بازو تک گیا۔

③ دعائے استفتاح

نمازی کے لیے مندوب ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قراءت سے قبل نبی کریم ﷺ سے ماثور دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھے، جو آپ اس دوران پڑھا کرتے تھے، ان میں سے بعض ذکر کی جاتی ہیں:

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ تکبیر کہہ کر قراءت سے قبل کچھ دیر خاموش رہتے تھے، میں نے ایک دفعہ عرض کی: یارسول اللہ! آپ اس دوران میں کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا: یہ دعا پڑھتا ہوں:

«اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَایَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَایَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَایَ بِالثَّلْجِ وَالْمَاءِ وَالْبَرَدِ»

”اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری کر جیسے مشرق اور مغرب کے درمیان ہے، اے اللہ! مجھے میرے گناہوں سے اس طرح صاف فرما جیسے سفید کپڑا میل سے کیا جاتا ہے، اے اللہ! تو میرے گناہوں کو برف، پانی اور اولوں سے دھو ڈال۔“[2]

اسے بخاری و مسلم نے اور سوائے ترمذی کے سب اصحاب سنن نے تخریج کیا۔

② سیدنا علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر یہ دعا پڑھتے:

«وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعاً إِنَّهٗ لَايَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَايَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَايَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ، وَأَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ»

---

[1] صحیح، ابن خزیمة: ٤٧٩؛ سنن نسائی: ٨٨٨. [2] صحیح البخاری: ٧٤٤؛ صحیح مسلم: ٥٩٨؛ سنن أبی داود: ٧٨١.

''میں اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی کی طرف یکسو ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا رب ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے، تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں، تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے، پس میرے سب گناہ بخش دے، کیونکہ تیرے سوا گناہوں کو اور کوئی معاف نہیں کر سکتا، مجھے عمدہ اخلاق کی راہ بتا، اچھے اخلاق کی توفیق تجھ ہی سے مل سکتی ہے اور بری عادات کو مجھ سے دور کر دے، ان بُری عادتوں کا پھیرنے والا تیرے سوا اور کوئی نہیں، میں حاضر ہوں اور تیری بھلائیوں کا امیدوار ہوں۔ ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور کسی برائی کی نسبت تیری طرف نہیں ہے۔ میں تیرا ہوں اور میرا ٹھکانہ تیری ہی طرف ہے، تو بڑی برکت والا اور بڑی شان والا ہے، میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف توبہ (رجوع) کرتا ہوں۔''[1]

اسے احمد، مسلم، ترمذی اور ابوداود وغیرہم نے نقل کیا۔

③ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے مروی ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے بعد یہ پڑھتے تھے: ''سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ إِلٰهَ غَيْرُكَ''[2] اسے مسلم نے منقطع سند سے نقل کیا، جبکہ دارقطنی نے اسے موصولاً اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر موقوفاً نقل کیا، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں یہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے صحت کے ساتھ ثابت ہے اور وہ خلیفۂ رسول کی حیثیت سے اسے لوگوں کو سکھلاتے اور علی الاعلان اس کی تعلیم دیتے تھے، لہٰذا یہ مرفوع کے حکم میں ہے، اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی اسی دعا کو اختیار کرتا ہوں اور اگر کوئی ان مروی ادعیہ میں سے بعض کے ساتھ نماز کا آغاز کر لے تو یہ حسن ہے۔

④ عاصم بن حمید رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامِ شب کا آغاز کس چیز کے ساتھ کرتے تھے؟ کہا: تم نے ایسا سوال کیا ہے جو کسی نے مجھ سے قبل ازیں نہیں کیا، آپ جب کھڑے ہوتے تو (تکبیر تحریمہ) کے بعد دس مرتبہ تکبیر، دس مرتبہ حمد، دس مرتبہ تسبیح اور دس مرتبہ تہلیل (یعنی لا الہ الا اللہ) کہتے اور دس مرتبہ استغفار کرتے اور پھر یہ کلمات پڑھتے: ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ)) اور روزِ قیامت تنگ مقام سے پناہ مانگتے۔[3] اسے ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

⑤ سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو نماز کا آغاز کس دعا سے کرتے تھے؟ کہنے لگیں کہ آپ یہ کلمات کہتے:

---

① صحيح مسلم: ٧٧١، سنن أبي داود: ٧٦٠. ② صحيح مسلم: ٣٩٩، سنن الدارقطني: ١١٢٩. ③ صحيح، سنن أبي داود: ٧٦٦، سنن ابن ماجه: ١٣٥٦.

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَالسَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ»

''اے اللہ! جبرائیل ومیکائیل اور اسرافیل کے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے پوشیدہ اور کھلی چیزوں کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں، مجھے اس حق کی طرف ہدایت دے جس میں اختلاف کیا گیا ہے، تو جسے چاہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔''[1]

اسے مسلم، ابوداود، ترمذی، اور ابن ماجہ نے نقل کیا (مصنف نے اس ضمن میں دو مزید دعائیں بھی ذکر کی ہیں)۔

④ تعوذ:

ثنا اور دعائے استفتاح کے بعد قراءت سے قبل تعوذ پڑھنا بھی مندوب ہے، کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل: ۹۸)

''پس جب تو قرآن پڑھے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کر۔''

نافع بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت سے قبل یہ بھی پڑھتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت سے قبل «أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» پڑھتے تھے۔

تعوذ کو آہستہ پڑھے

سنت یہ ہے کہ اس کو آہستہ آواز سے پڑھا جائے، المغنی میں ہے کہ تعوذ آہستہ آواز سے پڑھے، کہتے ہیں: میں اس بارے میں برخلاف رائے سے واقف نہیں لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نمازی کو جہری نمازوں میں اختیار ہے کہ آہستہ تعوذ پڑھے یا جہراً پڑھے، ایک ضعیف طریق میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بالجہر پڑھنا منقول ہے۔

تعوذ کی مشروعیت صرف پہلی رکعت میں ہے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسری رکعت کے لیے اٹھتے تو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے آغاز کرتے اور اس میں (پہلی رکعت کے شروع کی طرح) سکوت نہ فرماتے،[2] اسے مسلم نے تخریج کیا، امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: فقہاء کے ہاں اختلافِ آراء ہے کہ یہاں تعوذ پڑھنا ہے یا نہیں، اس امر پر ان کا اتفاق ہے کہ یہ محلِ استفتاح نہیں اس بابت دو اقوال منقول ہیں، اور یہ دونوں احمد سے بھی منقول ہیں، ان کے بعض اصحاب نے ان کا مبنیٰ یہ امر قرار دیا ہے کہ آیا

---

[1] صحيح مسلم: ٧٧٠. [2] صحيح مسلم: ٥٩٩.

قراءتِ نماز (یعنی پوری نماز کی قراءت) ایک قراءت ہے؟ (اگر ایک ہے) تو ایک بار کا تعوذ کافی ہے یا پھر ہر رکعت کی قراءت ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے (تب ہر رکعت کے شروع میں تعوذ پڑھنا ہوگا) دونوں اقوال کے مابین اس بارے میں نزاع نہیں کہ استفتاح مجموعی نماز کے لیے ہے، بہر حال یکبارگی تعوذ پر اکتفا صحیح حدیث کے مدِ نظر اظہر ہے، پھر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی (سابق الذکر) حدیث ذکر کی، پھر لکھا کہ ایک استفتاح اس لیے کافی ہے کیونکہ دونوں قراءتوں کے مابین سکوت حائل نہیں بلکہ صرف ذکر حائل ہوا ہے تو یہ دراصل ایک قراءت کی مانند ہے، ایسی جس کے درمیان اللہ کی حمد یا تسبیح یا تہلیل یا درود متخلل ہو جائے یا اس کا نحو۔ بقول امام شوکانی رحمہ اللہ احوط روش اسی پر اقتصار کرنا ہے جو احادیث میں وارد ہوا اور وہ صرف پہلی رکعت میں قراءت سے قبل تعوذ پڑھنا ہے۔

⑤ آمین کہنا

ہر نمازی کے لیے مسنون ہے کہ وہ قراءتِ فاتحہ کے بعد آمین کہے، چاہے امام، مقتدی یا منفرد ہو، جہری نمازوں میں بالجہر اور سری نمازوں میں بالسر کہے، نعیم مجمر راوی ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھی، پھر فاتحہ کی قراءت کی جب ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ تک پہنچے تو آمین کہی اور لوگوں نے بھی آمین کہی، سلام کے بعد کہا: اللہ کی قسم! میری نماز تم سب سے بڑھ کر نمازِ نبوی سے مشابہ ہے،[1] اسے بخاری نے تعلیقاً نقل کیا، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور ابن سراج نے بھی اس کی تخریج کی، بخاری میں ابن شہاب کا قول منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آمین کہتے تھے، بقول عطاء آمین ایک دعا ہے، سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے مقتدی اتنی آواز سے آمین کہتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔[2] نافع کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما آمین کہنا نہ چھوڑتے تھے بلکہ اس کی ترغیب دلاتے تھے، اس بارے میں نے ان سے حدیث بھی سنی،[3] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے، حتی کہ پہلی صف کے قریبی لوگ آپ کی آواز سنتے،[4] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، ان کے الفاظ ہیں حتی کہ آپ کی آمین کو پہلی صف والے سنتے اور (سب کی آمین سے) مسجد گونج اٹھتی،[5] اسے حاکم نے بھی نقل کیا اور اس کی اسناد حسن ہیں (دارقطنی نے کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، بیہقی نے اسے حسن صحیح کہا) سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھا تو آمین کہا اور یہ کہتے ہوئے آواز کو پھیلایا،[6] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا۔ ابوداود کے الفاظ ہیں: ''رَفَعَ بِهَا صَوْتَهُ'' یعنی آمین کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کیا ترمذی نے اسے حسن قرار دیا، ترمذی لکھتے ہیں: صحابہ وتابعین اور مابعد کے کئی اہل علم کا یہی کہنا ہے ان کا خیال ہے کہ آمین اونچی آواز سے کہی

---

① صحیح البخاری: ۸۰۳؛ مسند أحمد: ۲/ ۲۷۰. ② صحیح البخاری، قبل الرقم: ۷۸۰. ③ صحیح البخاری، قبل الرقم: ۷۸۰. ④ ضعیف، سنن أبی داود: ۹۳۴؛ سنن ابن ماجہ: ۸۵۳. ⑤ المستدرک للحاکم: ۱/ ۲۳۲.
⑥ صحیح، سنن أبی داود: ۹۳۲؛ سنن ترمذی: ۲۴۸.

جائے پست سے نہیں، بقول حافظ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ عطاء کہتے ہیں: میں نے اس مسجد (یعنی مسجدِ نبوی) میں دو سو صحابہ کو پایا ہے۔ کہ امام جب ﴿ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ کہتا تو اتنی آواز سے آمین کہتے کہ مسجد گونج اٹھتی۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی تم سے کسی اور چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا حسد وہ امام کے پیچھے آمین کہنے پر کرتے (اور تنگ پڑتے) ہیں۔''[2] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

آمین امام کے ساتھ کہنے کا استحباب

مقتدیوں کے لیے مستحب ہے کہ امام کے ساتھ مل کر آمین کہیں اور اس سے سبقت نہ کریں اور نہ اس سے پیچھے رہیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امام ﴿ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ کہے تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوا، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' اسے بخاری نے تخریج کیا، انہی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب امام ﴿ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ کہے تو آمین کہو، کیونکہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں اور امام بھی آمین کہے تو جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ ہوئی اس کے سابقہ گناہ دھل جاتے ہیں،[3] اسے (شیخین) احمد، ابو داود، نسائی (اور ابن خزیمہ) نے نقل کیا، ان کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تب تم بھی آمین کہو، پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل گئی تو اس کے گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔''[4] اسے جماعت نے نقل کیا، آمین کا تلفظ کئی طرح سے ہے ان میں اس کے الف کا قصر کرنا (بغیر مد کے) اور مد مع میم کی تخفیف کے۔ یہ فاتحہ کا حصہ نہیں (بنا بریں تلاوت کے وقت آمین نہیں کہنی چاہیے، اس کا معنی ہے: اے اللہ! قبول فرما۔)

٦ فاتحہ کے بعد کی قراءت

نمازی کے لیے مسنون ہے کہ وہ صبح کی نماز، جمعہ کی نماز، ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی پہلی دو رکعتوں میں اور نوافل اور سنتوں کی ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد کوئی مزید سورت یا آیات کی قراءت کرے، سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت بھی پڑھتے تھے، جبکہ تیسری اور چوتھی رکعت میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے اور کئی دفعہ ہمیں ایک آدھ آیت سنوا بھی دیتے اور پہلی رکعت کو بنسبت دوسری کے زیادہ طویل کرتے، یہی آپ کی روش نمازِ صبح میں تھی،[5] اسے بخاری، مسلم اور ابو داود نے تخریج کیا، انہوں نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا، ہمارا خیال تھا کہ ایسا آپ اس لیے کرتے تھے تاکہ لوگ (زیادہ سے زیادہ اور جو ابھی راستوں میں ہیں) پہلی رکعت میں مل سکیں، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اہلِ کوفہ نے (اپنے امیر) سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی، منجملہ باتوں کے یہ بھی کہا کہ وہ نماز عمدگی سے نہیں پڑھاتے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلوایا اور یہ بات ان کے سامنے رکھی، وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم!

---

[1] ضعيف، سنن ابن ماجه: ٨٥٣. [2] سنن ابن ماجه: ٨٥٦؛ الأدب المفرد للبخاري: ٩٨٨. [3] صحيح البخاري: ٧٨٢. [4] صحيح البخاري: ٧٨٠؛ صحيح مسلم: ٤١٠. [5] صحيح البخاري: ٧٥٩؛ صحيح مسلم: ٤٥١.

میں تو انہیں نبی کریم ﷺ جیسی نماز پڑھاتا تھا، کوئی کمی نہیں کی، میں نمازِ عشا کی پہلی دو رکعتوں میں لمبی اور آخری دو میں ہلکی قراءت کرتا تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: اے ابو اسحاق! آپ سے یہی حسنِ ظن تھا، [1] اسے بخاری نے نقل کیا (مصنف نے پوری حدیث نقل کی جوان کے معاملہ میں تفتیشی گروہ کو فہ بھیجے جانے سے متعلق ہے، یہ حصہ غیر متعلق ہونے کی وجہ سے ترک کیا)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہر رکعت میں قراءت ہے جو نبی کریم ﷺ ہمیں سنوا دیتے تھے، ہم بھی تمہیں سنواتے ہیں اور جو ہم پر مخفی رکھا ہم بھی وہ مخفی رکھتے ہیں اگر فاتحہ سے زائد نہ بھی پڑھو تو نماز ہو جائے گی، اگر مزید پڑھو تو یہ بہت بہتر ہے، [2] اسے بخاری نے نقل کیا۔

فاتحہ کے بعد قراءت کی کیفیت

فاتحہ کے بعد والی قراءت کسی بھی طور وطریقہ سے جائز ہے، حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم خراسان کے جہاد کے لیے گئے اور ہمارے ہمراہ تین سو صحابہ تھے تو ان میں سے کوئی ہمارا امام بنتا تو کسی سورت کی کئی آیات پڑھ کر (یعنی فاتحہ کے بعد) رکوع کرتا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ نماز پڑھائی تو فاتحہ پڑھی، پھر سورۃ البقرہ کی ایک ایک آیت کو ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پڑھا، [3] اسے دارقطنی نے قوی سند کے ساتھ نقل کیا، بخاری نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے: "بَابُ الْجَمْعِ بَيْنَ السُّوْرَتَيْنِ فی الركعة والْقِرَاءَةِ بِالْخَوَاتِيْمِ وبِسُوْرَةٍ قَبْلَ سُوْرَةٍ وَبِأَوَّلِ سُوْرَةٍ" یعنی ایک رکعت میں دو سورتیں پڑھنا، سورتوں کی اختتامی یا ابتدائی آیات پڑھنا اور (موجودہ قرآنی ترتیب کے برخلاف) سورت سے قبل کوئی اور سورت پڑھ لینا۔ سیدنا عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صبح کی نماز میں سورۃ المؤمنون پڑھنی شروع کی، جب سیدنا موسیٰ وہارون یا عیسیٰ علیہم السلام کے ذکر تک پہنچے تو آپ کو کھانسی لگی جس پر رکوع کر دیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے (نمازِ فجر کی) پہلی رکعت میں سورۃ البقرۃ کی ایک سو بیس آیات پڑھیں اور دوسری میں مثانی (یعنی جن کی نمازوں میں بار بار قراءت کی جاتی ہے، مثلاً: آخری پاروں کی سورتوں) میں سے ایک سورت، احنف نے پہلی رکعت میں سورۂ کہف اور دوسری میں سورۂ یوسف یا یونس کی قراءت کی اور ذکر کیا کہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازِ صبح ادا کی تو انہوں نے بھی یہی دونوں سورتیں پڑھی تھیں، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پہلی رکعت میں سورۂ انفال کی چالیس آیات پڑھیں اور دوسری میں مفصل (یعنی آخری پاروں کی سورتوں) میں سے ایک سورت (اسے بخاری نے کتاب الاذان میں نقل کیا) قتادہ اس شخص کے بارے میں جو دونوں رکعتوں میں ایک سورت پڑھے (یعنی آدھی آدھی کر کے) یا ایک سورت کا دونوں رکعتوں میں تکرار کرے، کہتے ہیں بہر حال اللہ کی کتاب ہی پڑھی، عبیداللہ بن ثابت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ ایک انصاری شخص مسجد قبا کا امام تھا اور اس کی عادت تھی کہ ہر رکعت میں (فاتحہ کے بعد قراءت کا) آغاز ہمیشہ "سورۂ اخلاص" سے کرتا، پھر کوئی اور سورت پڑھتا، ہر رکعت میں یہی کرتا،

---

[1] صحيح البخاری: ٧٥٥. [2] صحيح البخاری: ٧٧٢؛ صحيح مسلم: ٣٩٦/ ٤٣. [3] ضعيف جدًا، سنن دارقطنی: ١٢٦٤.

مقتدیوں نے اس بارے میں ان سے بات کی اور کہا: آپ ہمیشہ اسی کے ساتھ آغاز کرتے ہیں، پھر سمجھتے ہو کہ یہ کافی نہیں تو کوئی اور سورت بھی پڑھتے ہو، یا تو اسی پر اکتفا کیا کرو یا اسے چھوڑ کر کوئی اور پڑھو، اس نے جواب دیا: میں تو اسے چھوڑنے والا نہیں، چاہو تو اپنا امام تبدیل کرلو، لیکن اسے وہ اپنے میں سے افضل شخص سمجھتے تھے اور اس کے سوا کوئی اور امام رکھنا پسند نہ کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کو اس سے آگاہ کیا گیا تو آپ نے ان سے پوچھا: ''اپنے ساتھیوں کے مشورہ پر عمل کرنے سے کیا امر مانع ہے اور ہمیشہ سورۃ اخلاص پڑھنے کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے کہا: میں اس سے محبت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا: ''تمہاری اس سے یہ محبت تمہیں جنت کا حقدار بنا دے گی۔''[1] جہینہ قبیلے کے ایک شخص سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو سنا (ایک مرتبہ) نمازِ صبح کی دونوں رکعتوں میں سورۂ زلزال پڑھی، کہتے ہیں: میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آیا آپ بھول گئے تھے کہ پہلی رکعت میں بھی یہی پڑھی ہے یا عمداً ایسا کیا،[2] اسے ابو داود نے نقل کیا اور اس کی اسناد میں طعن کیا گیا ہے۔

سورت فاتحہ کی بعد والی قراءت کا سنت طریقہ

ذیل میں ابن قیم ؒ کی نبی کریم ﷺ کی بعد از فاتحہ قراءت کے بارے بحث کا ملخص پیش کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت شروع کرتے، حضر میں لمبی قراءت فرماتے اور سفر وغیرہ یا کسی عارضہ کی وجہ سے اختصار بھی کر لیتے، عام روش آپ کی یہ تھی کہ توسط اختیار کرتے تھے۔

فجر کی نماز میں قراءت

فجر میں آپ ساٹھ تا سو آیات کے لگ بھگ قراءت فرماتے تھے، اس ضمن میں متعدد روایات وارد ہیں، جن سے یہ ظاہر ہے، سورۂ ق کی قراءت کی، اسی طرح سورۂ روم اور سورۂ تکویر بھی، ایک دفعہ (جیسا کہ اوپر گزرا) دونوں رکعتوں میں سورۂ زلزال پڑھی، ایک دفعہ معوذتین کے ساتھ نماز پڑھائی، تب آپ حالتِ سفر میں تھے، ایک دفعہ سورۃ المؤمنون کی قراءت شروع کی حتی کہ سیدنا موسیٰ و ہارون یا سیدنا عیسیٰ علیہم السلام کے ذکر والی آیات تک پہنچے تو کھانسی لگی، جس پر رکوع کر لیا، جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں سورۂ سجدہ اور دوسری میں سورۂ دھر مکمل سورتیں پڑھا کرتے تھے، لیکن اس سے جاہلوں نے جو خیال کر لیا کہ جمعہ کی نمازِ فجر کو ان دو سورتوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے تو یہ بہت بڑی جہالت ہے، اسی وجہ سے اس ظن کے ازالہ کی غرض سے بعض آئمہ نے جمعہ کی فجر میں یہ سورتیں پڑھنا مکروہ کہہ دیا، آپ اس لیے ان سورتوں کی اس دن قراءت کرتے تھے کہ ان میں مبداو معاد، تخلیقِ آدم، جنت و دوزخ کے دخول وغیرہ کا ذکر ہے اور یہ سب افعال بروزِ جمعہ صادر ہوئے تو آپ کی غرض امت کو ان حوادث کی تذکیر تھی، جیسا کہ آپ عیدین اور جمعہ جیسی مناسبات میں سورۂ ق، سورۂ قمر، سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ کی قراءت فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٧٧٤. [2] حسن، سنن أبي داود: ١٨١٦.

ظہر کی نماز میں قراءت

نبی کریم ﷺ کئی دفعہ نمازِ ظہر میں بھی طویل قراءت کرتے تھے، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نمازِ ظہر کھڑی کرتے اور کوئی جانے والا اپنے کسی کام سے قبا (جو مسجدِ نبوی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے) جاتا اور کام پورا کر کے واپس آجاتا اور وضو کر کے پہلی رکعت میں مل جاتا تھا،[1] اسے مسلم نے نقل کیا، آپ کئی دفعہ اس میں سورۂ الم سجدۃ، کئی دفعہ سورۃٔ الاعلیٰ کئی دفعہ سورۂ اللیل کئی دفعہ سورۃ البروج اور کئی مرتبہ سورۃ الطارق کے بقدر قراءت کرتے (ان مثالوں سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم ﷺ عموماً ظہر کی نماز زیادہ لمبی نہ کرتے تھے)۔

عصر کی نماز میں قراءت

عصر میں قراءت کی مقدار ظہر کی قراءت سے نصف کے بقدر ہوتی تھی اگر ظہر کو طویل کیا ہوتا، اگر مختصر کیا ہوتا تو اس کے بقدر ہوتی تھی۔

مغرب کی نماز میں قراءت

نمازِ مغرب میں نبی کریم ﷺ کی قراءت باہم متفاوت رہی ہے، کئی دفعہ اتنی طویل قراءت کرتے کہ دونوں رکعتوں میں سورۂ اعراف پڑھتے (یہ سوا پارے پر مشتمل ہے) کئی مرتبہ نماز مغرب میں سورۃ الطور اور کئی دفعہ سورۃ المرسلات پڑھی ہے، ابن عبدالبر رقم طراز ہیں: مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف پڑھی، اسی طرح سورۂ صافات بھی اور سورۂ دخان بھی اور کئی دفعہ سورۂ اعلیٰ کی قراءت کرتے، اسی طرح سورۃ التین اور معوذتین پڑھنا بھی مروی ہے، عموماً قصار مفصل (یہ قرآن کی آخری پندرہ بیس سورتیں ہیں) کی سورتیں پڑھتے تھے، لکھتے ہیں کہ یہ سب صحیح روایات میں ثابت و مذکور ہے۔

جہاں تک ہمیشہ قصار مفصل پڑھنے پر اقتصار ہے تو یہ فعل مروان بن حکم کا تھا (جب وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں امیرِ مدینہ تھے) اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا تھا، ایک دفعہ ان سے کہا: آپ تو ہمیشہ قصار مفصل ہی پڑھتے ہیں، جب کہ میں نے دیکھا تھا کہ نبی کریم ﷺ مغرب میں "طُوْلَى الطُّوْلَيَيْنِ" یعنی قرآن کی سب سے طویل دو سورتوں میں سے اطول سورت پڑھتے تھے، میں نے کہا: "طُوْلَى الطُّوْلَيَيْنِ" سے کون سی سورت مراد ہے؟ کہا: سورۂ اعراف،[2] یہ حدیث صحیح ہے، اسے اہل سنن نے تخریج کیا، نسائی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے نمازِ مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورۂ اعراف مکمل کی،[3] ہمیشہ ایک آیت یا ہمیشہ قصار سورتیں اس میں پڑھنا سنت کے خلاف ہے۔

عشاء کی نماز میں قراءت

اس میں آپ نے سورۃ التین بھی پڑھی ہے، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ عشا میں سورۃ الشمس،

---

[1] صحيح مسلم: ٤٥٤. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٨١٢. [3] صحيح، سنن نسائي: ٩٩٠.

سورۃ الاعلیٰ، سورۃ اللیل اور ان جیسی سورتیں پڑھا کرو، انہیں اعشا میں سورۃ البقرۃ پڑھنے کا انکار کیا تھا، جیسا کہ ایک روایت میں ہے: آپ کے ہمراہ نماز ادا کر کے اپنے محلہ بنی عمرو بن عوف میں جا کر امامت کرائی، جبکہ خود نبی کریم ﷺ کے ساتھ ادا کر چکے تھے اور رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا تو سورۃ البقرہ کی قراءت شروع کر دی، جس پر ایک شخص نے نماز توڑ کر اپنی الگ ادا کر لی نبی کریم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو فرمایا: ''اے معاذ! کیا تم فتان ہو؟۔''[1] (یعنی فتنہ میں ڈالنے والے) تو نقاد نے یہی (آخری) کلمہ ملحوظ رکھا اور اس کا پسِ منظر فراموش کر دیا (شاید کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا انہیں سورۂ بقرہ جیسی طویل سورتیں پڑھنے سے منع کرنا اس خاص پسِ منظر سے تعلق رکھتا ہے کہ رات کا خاصہ حصہ گزر چکا تھا اور اس وقت مناسب یہ تھا کہ ہلکی قراءت کرتے، یہ نہیں کہ نمازِ عشا میں مطلقاً ہی سورۃ البقرہ یا اس جیسی سورت کی قراءت ممنوع ہے)

نماز جمعہ میں قراءت

جمعہ کی نماز میں نبی کریم ﷺ سورۃ الجمعہ، المنافقون، الغاشیہ یا پھر پہلی میں الاعلیٰ اور دوسری میں الغاشیہ پڑھا کرتے تھے، البتہ سورۃ الجمعہ کی فقط آخری آیات پڑھنا مثلاً: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ ... ﴾ الخ تو یہ آپ نے کبھی نہ کیا اور یہ آپ کی اس سنت کے برخلاف ہے جس پر آپ نے محافظت کی۔

عیدین میں قراءت

عیدین کی نماز میں آپ کبھی سورۂ ق اور سورۂ قمر کی مکمل قراءت کرتے اور کبھی الاعلیٰ اور الغاشیہ کی، یہی آپ کی سنت ہے جس پر آپ وفات تک ہمیشہ جاری رہے، اس میں سے کچھ منسوخ نہ ہوا، لہٰذا آپ کے خلفائے راشدین نے بھی اسی کا اخذ کیا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ نمازِ فجر میں سورۃ البقرہ پڑھنی شروع کی اور اس کی مکمل قراءت سے جب فارغ ہوئے تو سورج نکلنے کے قریب تھا، لوگوں نے کہا: اے خلیفہِ رسول! سورج طلوع ہونے ہی والا تھا، کہا: اگر (نماز کے دوران) طلوع ہوتا تو ہمیں غافل نہ پاتا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ نمازِ فجر میں سورۂ یوسف، نحل، ہود، بنی اسرائیل اور ان جیسی (طویل) سورتوں کی قراءت کرتے تھے، اگر فجر کی قراءت کو طویل کرنا منسوخ ہو گیا ہوتا تو یہ امر آپ کے خلفائے راشدین پر مخفی نہ ہوتا اور محدثین اس پر مطلع ہوتے، جہاں تک وہ حدیث ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نمازِ فجر میں سورۂ ق پڑھا کرتے تھے اور بعد ازاں آپ کی نمازیں ہلکی ہو گئیں تو اس میں ان کے قول ''أي بعد الفجر'' سے مراد یہ ہے کہ فجر کی قراءت تو آپ طویل ہی کرتے رہے، لیکن اس کے بعد کی نمازوں میں ہلکی کر دی۔[2] اسی پر سیدہ ام فضل رضی اللہ عنہا کا قول دلالت کرتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے بیٹے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نمازِ مغرب میں والمرسلات پڑھتے سنا تو کہا: تم نے مجھے نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں ادا کردہ آخری نمازِ مغرب کی یاد دلا دی کہ اس میں آپ نے یہی سورت پڑھی تھی اور یہی آپ کا آخری معاملہ تھا۔

---

[1] صحيح البخاری: ٦١٠٦؛ صحيح مسلم: ٤٦٥. [2] صحيح مسلم: ٤٥٨.

آپ کی عمومی ہدایت ہے کہ «أَيُّكُمْ أَمَّ بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ» ''جو امام بنے وہ زیادہ طوالت نہ کرے۔''[1]
سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''كان أخفَّ الناسِ صلاةً في تَمام'' یعنی ارکانِ نماز اگرچہ پورے طور سے کرتے مگر زیادہ طویل نہ پڑھاتے تھے۔ تو یہاں تخفیف امرِ نسبی ہے جو فعلِ نبوی کی طرف راجع ہے، جس پر آپ نے ہمیشگی کی ہے نہ کہ جو مقتدیوں کی خواہش ہو، یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ انہیں تو کسی چیز کا حکم دیں اور خود وہ نہ کریں اور آپ جانتے تھے کہ آپ کے مقتدیوں میں بڑی عمر کے لوگ، ضعیف اور ذی الحاجت بھی شامل ہیں تو جو آپ کا ہمیشگی کا فعل رہا وہ تخفیف ہے، جس کا آپ نے حکم دیا کیونکہ آپ کی نماز اس سے بھی کئی گنا اطول ہونا ممکن تھا تو یہ اس سے اطول کی نسبت سے خفیف تھی، اس قسم کے تنازع آراء اور اختلافِ اقوال کے وقت آپ کی ہدی وسنت ہی حقدار ہے کہ ثالث بنے، اس کے لیے دلیل وہ ہے جو نسائی وغیرہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تخفیف کا حکم دیتے اور ہماری امامت کراتے ہوئے سورۃ الصافات پڑھتے تو (ظاہر ہوا کہ) والصافات کے ساتھ نماز کرانا ہی تخفیف ہے، جس کا آپ حکم دیتے تھے۔

کسی نماز میں ہمیشہ کسی معین سورت کی قراءت

سوائے جمعہ وعیدین کے آپ نے نمازوں میں پڑھنے کے لیے سورتوں کی تعیین وتخصیص نہ کی ہوئی تھی، ابوداود نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے نقل کیا کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: مفصل میں سے کوئی چھوٹی یا بڑی سورت نہیں، مگر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نمازوں میں انہیں سنا ہے،[2] آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کامل سورت پڑھتے تھے، کئی دفعہ دو رکعتوں میں اس کی قراءت مکمل کرتے اور کئی دفعہ کسی سورت سے قراءت کا آغاز فرماتے (اور اسے مکمل نہ کرتے) سورتوں کے درمیان سے یا ان کے اواخر کی قراءت آپ سے منقول نہیں، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں ان نظائر (یعنی ایک جیسی) سورتوں کو پہچانتا ہوں جو دو دو کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں پڑھا کرتے تھے، پھر یہ سورتیں ذکر کیں: اَلرَّحْمٰن اور وَالنَّجْمِ ایک رکعت میں اور اِقْتَرَبَت اور اَلْحَاقَّةُ اور نٓ ایک رکعت میں تو یہ آپ کے فعل کی حکایت ہے جس کا محل معین نہیں کیا کہ کیا یہ فرض نمازوں میں پڑھتے تھے یا نفل میں! لہٰذا یہ احتمالی بات ہے، جہاں تک دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت کی قراءت کا تکرار کر لینا تو بہت کم مرتبہ آپ نے یہ کیا ہے، ابوداود کی جہینہ قبیلے کے ایک شخص سے روایت گزری ہے: میں نے سنا کہ آپ نے نمازِ صبح کی دونوں رکعتوں میں سورۂ زلزال پڑھی، کہتے ہیں: کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آپ بھول گئے تھے یا عمداً ایسا کیا۔[3]

صبح کی پہلی رکعت کی طوالت

آپ فجر اور دیگر نمازوں کی پہلی رکعت کو نسبۃً طویل کیا کرتے تھے، اتنا کہ (آنے والے نمازیوں کے) قدموں کی آواز

---

[1] صحیح البخاري: ٧٠٣؛ صحیح مسلم: ٤٦٧. [2] ضعیف، سنن أبي داود: ٨٠٤. [3] حسن، سنن أبي داود: ٨١٦.

آنا بند ہو جاتی[1] (اسی غرض سے طویل کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ نمازی پہلی رکعت کو پاسکیں) صبح کی نماز کو بنسبت دیگر نمازوں کے اس لیے زیادہ طویل کرتے کہ فجر کے وقت قرآن مشہود ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اور فرشتے اس کے شاہد ہوتے ہیں، بعض نے کہا: دن اور رات (کی ذمہ داریوں) والے فرشتے، یہ دونوں اقوال اس امر پر مبنی ہیں کہ نزولِ الٰہی (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص توجہ) نمازِ صبح تک جاری رہتا ہے یا طلوعِ فجر تک، دونوں کے بارے روایات وارد ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ جب اس کی رکعات کی تعداد کم ہوئی تو اس کا بدل طولِ قراءت کی شکل میں ہوا، پھر چونکہ ابھی لوگ امورِ دنیا میں مشغول نہ ہوئے ہوتے تھے اور یہ ایسا وقت ہوتا جس میں انسان تازہ دم اور اس کی توجہ پوری ہوتی ہے، لہٰذا قرآن کی طرف اس کا متوجہ ہونا اور اس کے الفاظ و معانی میں تدبر و تفکر دیگر اوقات کی نسبت زیادہ ہوگا کیونکہ یہی عمل کی اساس اور اس کا نقطۂ آغاز ہے تو اسے زیادہ اہتمام و توجہ سے نوازا گیا، یہی اسرار ہیں جن کی طرف وہی شخص رہنمائی پاتا ہے جو شریعت کے اسرار، حکمتوں اور مقاصد پر گہری نظر رکھتا ہے۔

آپ کی قراءت کا انداز

آپ کی قراءت مداً ہوتی تھی (یعنی کلمات کو کھینچ کر اور پھیلا کر، جلدی سے نہیں) ہر آیت پر وقف فرماتے اور آخری لفظ پر آواز کو پھیلاتے، یہاں ابن قیم کی بحث کا ملخص ختم ہوا۔

اثنائے قراءت کیا مستحب ہے؟

قراءت میں مستحب ہے کہ آواز کی تحسین و تزئین کرے، حدیثِ نبوی ہے: «زَيِّنُوْا أَصْوَاتَكُمْ بِالْقُرْآنِ» ''قرآن اچھی آوازوں اور طرزوں سے پڑھو۔''[2] نیز فرمایا: «لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ» ''وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن سجا کر نہ پڑھے۔''[3] اور فرمایا: «إِنَّ أَحْسَنَ النَّاسِ صَوْتاً بِالْقُرْآنِ الَّذِيْ إِذَا سَمِعْتُمُوْهُ حَسِبْتُمُوْهُ يَخْشَى اللّٰهَ» ''اچھا قاری وہ ہے کہ جب اسے سنو تو لگے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والا شخص ہے۔''[4] اور فرمایا: «مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْئٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ»[5] ''اللہ تعالیٰ نبی کے حسنِ صوت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے پر نہایت توجہ فرماتا ہے۔''[6] امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نماز و غیرِ نماز میں تلاوتِ قرآن کرنے والے کے لیے مسنون ہے کہ جب آیتِ رحمت سے گزرے تو اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرے اور جب آیتِ عذاب سے گزرے تو آگ، عذاب، شر یا مکروہ سے اس کی پناہ کا طالب ہو کر کہے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ'' یا اس طرح کا کوئی جملہ اور جب کسی ایسی آیت سے اس کا گزر ہو، جس میں اللہ کی شان و عظمت کا بیان ہے تو اللہ کی تنزیہہ کرے

---

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٨٠٢. [2] صحيح، سنن أبي داود: ١٤٦٨؛ سنن نسائي: ١٠١٤؛ سنن ابن ماجه: ١٣٤٢. [3] صحيح البخاري: ٧٥٢٧، سنن أبي داود: ١٤٦٩. [4] حسن، سنن ابن ماجه: ١٣٣٩. [5] صحيح البخاري: ٧٥٤٤؛ صحيح مسلم: ٧٩٢. [6] صحيح، سنن أبي داود: ١٤٧٣.

(یعنی پاکی بیان کرے) اور کہے: "سُبْحَانَهُ تَعَالیٰ" یا "تَبَارَكَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ" یا "جَلَّتْ عَظْمَةُ رَبِّنَا" یا اس طرح کا کوئی جملہ، سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی، آپ نے سورۃ البقرہ سے قراءت کا آغاز کیا، میں نے سوچا ایک سو آیات پڑھ کر رکوع کریں گے، مگر آپ جاری رہے، پھر سوچا شاید اسے مکمل کر کے رکوع کریں گے، مگر آپ پڑھتے رہے اور آلِ عمران شروع کر دی اور اس کی مکمل قراءت کر کے سورۃ النساء شروع کی اور اس کی بھی مکمل قراءت کی، اس دوران میں آپ نے ترسُّل کیا (یعنی آہستہ آہستہ پڑھا) کسی آیتِ تسبیح سے گزرے تو اللہ کی تسبیح کی، کسی دعا پر گزر ہوا تو دعا کی، کسی تعوذ پر پہنچے تو تعوذ کیا،[1] اسے مسلم نے نقل کیا (بقول نووی:) ہمارے اصحاب کہتے ہیں: اثنائے قراءت تسبیح، دعا اور استعاذہ چاہے نماز ہو یا غیر نماز امام، مقتدی اور منفرد سب کے لیے مستحب ہے ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ سننے والے اور پڑھنے والے کے لیے مستحب ہے کہ کہے: "بَلیٰ وَأَنَا عَلیٰ ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ" (کیوں نہیں اور میں اس کے گواہوں میں سے ہوں) اور جب پڑھے: ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِ الْمَوْتٰى﴾ تو کہے: "بَلیٰ أَشْهَدُ" (کیوں نہیں، میں گواہی دیتا ہوں) اور جب پڑھے: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ تو کہے: "آمَنْتُ بِاللّٰهِ" اور جب پڑھے: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ تو کہے: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلیٰ" یہ نماز اور غیرِ نماز دونوں حالتوں میں کہہ سکتا ہے۔

جہری اور سری قراءت کے مواضع

سنت یہ ہے کہ نمازِ صبح، جمعہ، مغرب اور عشا، عیدین، کسوف اور استسقاء میں جہری قراءت کرے، جبکہ ظہر، عصر، مغرب کی تیسری اور عشا کی آخری دو رکعتوں میں سری قراءت کرے، جہاں تک بقیہ نوافل ہیں تو دن کے نوافل میں جہراً قراءت نہیں کرنی چاہیے، جبکہ رات کے نوافل میں اسے اختیار ہے کہ چاہے سری کرے اور چاہے تو جہری اور افضل توسط ہے (یعنی نہ زیادہ اونچی اور نہ بالکل پست) نبی کریم ﷺ کا ایک رات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے گزر ہوا جو نماز میں تھے اور پست آواز سے قراءت کر رہے تھے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے گزر ہوا وہ بھی نماز میں تھے اور بآوازِ بلند قراءت کر رہے تھے، جب بعد ازاں دونوں آپ کے پاس جمع ہوئے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: "میرا آپ سے گزر ہوا اور آپ نماز میں بہت پست آواز کے ساتھ قراءت کر رہے تھے۔" وہ بولے: میں اسی ذات کو سنا رہا تھا جس سے محوِ مناجات تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: "آپ بہت بلند آواز کے ساتھ قراءت کر رہے تھے۔" وہ بولے: اس لیے کہ اونگھنے والے کو جگاؤں اور شیطان کو بھگاؤں، آپ نے فرمایا: "اے ابوبکر! آپ اپنی آواز کو تھوڑا سا بلند کریں اور اے عمر! آپ ذرا پست کریں۔"[2] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا، اگر بھول کر مواضعِ جہر میں سری اور مواضعِ سر میں جہری قراءت کر لی تو اس پر کچھ حرج نہیں، اگر اثنائے قراءت یاد آ جائے تو وہیں سے آگے حسبِ سنت شروع کر دے۔

---

[1] صحیح مسلم: ۷۷۲؛ مسند أحمد: ۵/ ۳۸۴. [2] صحیح، سنن أبی داود: ۱۳۲۹؛ سنن ترمذی: ٤٤٧.

امام کے پیچھے قراءت

ضابطہ واصل یہ ہے کہ فرض ونفل نماز ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے ساتھ ہی صحیح ہے، جیسا کہ فرائض نماز کے باب میں اس کی بحث گزری، البتہ جہری نمازوں میں مقتدی سے قراءت ساقط ہے اور اس پر اس آیت کے مدِ نظر: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(الأعراف:٢٠٤) ''جب قرآن پڑھا جائے تو اسے خاموشی سے سنو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' استماع و انصات واجب ہے اور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے مدِ نظر: «إِذَا كَبَّرَ الْإِمَامُ فَكَبِّرُوْا وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا» ''جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی کہو اور جب وہ قراءت کرے تو خاموشی اختیار کرو۔''[1] اسے مسلم نے تخریج کیا، اسی پر یہ حدیث محمول ہے: «مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ» ''امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔''[2] یعنی امام کی قراءت جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے بھی ہے (اس میں جہری نمازوں کا تو ذکر ہی نہیں) جہاں تک سری نمازیں ہیں ان میں مقتدی پر بھی قراءت واجب ہے (مندرجہ بالا حدیث میں تو یہ تفریق موجود نہیں تو پھر اسے کیوں جہری کے ساتھ خاص کیا، اصل بات ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، لہٰذا اسے معرضِ استدلال میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا) اسی طرح جہری نمازوں میں بھی، البتہ اس طور پر ہو (یعنی اس جگہ کھڑا ہو) کہ امام کی قراءت کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی ہے۔

ابو بکر بن العربی لکھتے ہیں: ہمارے ہاں قابلِ ترجیح سری نمازوں میں وجوبِ قراءت کا موقف ہے آثار وروایات کے عموم کی وجہ سے، جہاں تک جہری نمازیں ہیں تو درجِ ذیل تین وجوہ کی بنا پر ان میں (مقتدی کے لیے) قراءت کی کوئی سبیل نہیں۔

① یہی اہلِ مدینہ کا عمل تھا۔

② یہ قرآن کا حکم ہے، جیسا کہ کہا: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ...﴾ الخ. سنت نے دو احادیث کے ساتھ اسے متقوی کیا ہے، ایک سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مذکور ہے: «قَدْ عَلِمْتُ أَنَّ بَعْضَكُمْ خَالَجَنِيْهَا» ''میں بھی کہوں کہ تم میں سے کوئی میرے پڑھنے میں رکاوٹ بنا ہے۔''[3] اسے مسلم نے نقل کیا، (یہ بات تب کہی تھی جب سنا کہ مقتدیوں میں سے کوئی ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ پڑھ رہا تھا، راقم کہتا ہے: اس سے ظاہر ہوا کہ آپ کی اس نہی کا تعلق فاتحہ کی قراءت سے نہیں، دراصل وہ مقتدی آگے کی قراءت آپ کے ساتھ ساتھ کر رہا تھا جس سے روک دیا) پھر مسلم کا اس پر اس عنوان سے باب: ''باب نَهْيِ المأمُوْمِ عن الْجَهْرِ بالقراءةِ خَلْفَ إمَامِهِ'' یعنی مقتدی کے لیے منع ہے کہ امام کے پیچھے بآوازِ بلند قراءت کرے۔'' دلیل ہے کہ اگر فاتحہ کی قراءت بھی مراد لی جائے تو یہ وہ ہے جو بالجہر ہو۔ (ہمارا موقف تو یہ ہے کہ مقتدی آہستہ آواز سے فاتحہ پڑھیں گے) اور دوم آپ کا فرمان: «وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا» ''جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو۔''

---

[1] صحيح مسلم: ٤٠٤؛ سنن ابن ماجه: ٨٤٦. [2] حسن، سنن ابن ماجه: ٨٥٠. [3] صحيح مسلم: ٣٩٨؛ مسند احمد: ٤٢٦.

③ ترجیح

امام کے ساتھ قراءت نہیں سکتے، پھر مقتدی کب پڑھے؟ اگر کہا جائے کہ امام کے سکتات (یعنی ہر آیت کے بعد وقف کرنے کے دوران) میں تو ہم کہیں گے کہ سکتہ کرنا امام پر لازم نہیں تو کیونکر ایک فرض کو اس چیز پر مرکب کیا جائے جو فرض نہیں بالخصوص جب ہمارے پاس جہر میں قراءت کا ایک انداز وطریق موجود ہے اور وہ ہے دل کی قراءت یعنی امام کی قراءت میں تدبر وتفکر کرنا اور یہی قرآن وحدیث کا نظام، حفظِ عبادت، سنت کی مراعات اور ترجیحی عمل ہے اور یہی امام زہری اور امام ابن مبارک رحمہ اللہ کا اختیار ہے، امام مالک، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی اور اس کی تائید کی ہے۔

⑦ ایک سے دوسرے رکن میں منتقل ہوتے وقت کی تکبیرات

نمازی ہر رفع وخفض (یعنی جھکنے اور اٹھنے) اور قیام وقعود میں اللہ اکبر کہے گا ماسوائے رکوع سے اٹھتے ہوئے کہ وہاں "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ہر خفض ورفع اور قعود میں تکبیر کہتے ہیں۔[1] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا اور اس پر حکمِ صحت لگایا اور کہا: اسی پر صحابہ کرام کا عمل ہے، ان میں خلفائے راشدین وغیرہم بھی ہیں۔ اسی طرح تابعین کا اور یہی عام فقہاء وعلماء کا معمول بہ ہے، ابو بکر بن عبدالرحمن بن حارث سے مروی ہے: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کا آغاز کرتے تو تکبیر کہتے، پھر رکوع جاتے ہوئے یہی کہتے اور وہاں سے اٹھتے ہوئے «سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ» کہتے، پھر قومہ میں «رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ» پڑھتے، پھر تکبیر کہہ کر سجدہ کو جاتے، اسی طرح سجدہ سے سر اٹھاتے ہوئے، پھر جب دو رکعتوں کے تشہد سے اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے اور یہی ہر رکعت میں آپ کا فعل ہوتا تھا حتی کہ نماز سے فارغ ہو جاتے، کہتے ہیں کہ یہی آپ کی نماز رہی حتی کہ آپ اللہ سے جا ملے،[2] اسے احمد، بخاری، مسلم اور ابوداود نے تخریج کیا، عکرمہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: بطحا میں ایک بوڑھے کے پیچھے میں نماز پڑھ کر آرہا ہوں جس نے (ظہر کی نماز میں) بائیس دفعہ اللہ اکبر کہا ہے (اور تعجب ہے) کہ سجدہ کو جاتے اور وہاں سے اٹھتے ہوئے بھی اللہ اکبر کہا، (اس تعجب کی وجہ صحیح بخاری میں مذکور ہے وہ یہ کہ بنی امیہ کے خلفاء نماز میں نیچے جاتے ہوئے اللہ اکبر کا اخفا کرنے لگ گئے تھے) یہ سن کر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہی سیدنا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تھی،[3] اسے بخاری اور احمد نے نقل کیا، تکبیر کہنا تب مستحب ہے جب حرکت کرنا شروع کرے۔

⑧ رکوع کی ہیئت

رکوع میں واجب تو مجرد انحناء ہے (یعنی جھکنا) اس طرح کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ گئے ہوں، لیکن اس میں سنت سر کو پیٹھ کے

---

① صحیح، سنن ترمذی: ۲۵۳؛ سنن نسائی: ۱۱۴۱. ② صحیح البخاری: ۷۸۹؛ صحیح مسلم: ۳۹۲.
③ صحیح البخاری: ۷۸۸؛ مسنداحمد: ۲۱۸.

برابر کرنا اور ہاتھوں سے گھٹنوں کو تھام لینا ہے، انہیں پہلوؤں سے دور رکھنے کے ساتھ، انگلیاں ایک دوسری کے ساتھ نہ لگی ہوں اور کمر پھیلی ہوئی ہو، سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رکوع کیا تو ہاتھ پہلوؤں سے دور کر کے اور انہیں گھٹنوں پر جمایا اور انگلیاں گھٹنوں سے آگے کر کے ایک دوسری سے دور کیں (یعنی کھلی رکھیں) اور کہا: اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔[1] اسے احمد، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا سیدنا ابو حمید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع کرتے تو معتدل ہیئت اختیار کرتے، نہ سر کو بالکل سیدھا (یعنی اٹھا ہوا) رکھتے اور نہ زیادہ جھکا لیتے اور ہاتھ گھٹنوں پر اس انداز سے رکھتے گویا انہیں پکڑا ہوا ہو،[2] اسے نسائی نے نقل کیا، مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں نہ سر مبارک کو اٹھائے رکھتے اور نہ اسے نیچے کی طرف جھکا لیتے لیکن ان کے درمیانی کیفیت ہوتی، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رکوع کی ہیئت اس طرح کی ہوتی تھی کہ اگر آپ کی کمر مبارک پر پانی بھرا برتن رکھ دیا جائے تو پانی نہ گرے،[3] اسے احمد نے اور ابو داود نے اپنی مراسیل میں نقل کیا، مصعب بن سعد سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد محترم کے ساتھ ان کے پہلو میں نماز پڑھی تو رکوع میں دونوں ہاتھ باہم ساتھ ملا کر اپنے زانوؤں کے درمیان رکھ لیے (اسے تطبیق کہتے ہیں اور شروع میں مسلمانوں کو یہی کرنے کا حکم تھا) تو اس سے منع کیا اور کہا: ہم پہلے کیا کرتے تھے، پھر حکم ملا کہ ہاتھ گھٹنوں پر رکھیں،[4] اسے جماعت نے تخریج کیا۔

⑨ رکوع میں کیا پڑھنا چاہیے؟

رکوع میں اس جملہ کے ساتھ ذکر کرنا مستحب ہے: «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم» سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیت: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ (الواقعة:٧٤) نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''اسے اپنے رکوع میں پڑھا کرو۔''[5] اسے احمد اور ابو داود وغیرہ نے جید سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ رکوع میں «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم» کہتے تھے،[6] اسے مسلم اور اصحابِ سنن نے نقل کیا، یہ الفاظ: «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم وَبِحَمْدِهٖ»[7] کئی طرق سے مروی ہیں جو بقول امام شوکانی رحمہ اللہ سب ضعیف ہیں، لیکن یہ طرق (جو اگرچہ ضعیف ہیں مگر متعدد ہونے کی وجہ سے) ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، صحیح ہے کہ نمازی اسی جملہ کے کہنے پر اقتصار کرے یا چاہے تو درج ذیل میں سے کوئی اس کے ساتھ ملا لے:

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع کرتے تو یہ دعا پڑھتے: «اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ أَنْتَ رَبِّيْ خَشَعَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وعَصَبِيْ وَمَا اسْتَقَلَّتْ بِهٖ

---

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٨٦٣، سنن نسائي: ١٠٣٦. [2] صحيح، سنن ترمذي: ٣٠٤، سنن نسائي: ١٠٣٨.
[3] مراسيل ابي داود: ٤٣، مسند أحمد: ١/ ١٢٣. [4] صحيح البخاري: ٧٩٠، صحيح مسلم: ٥٣٥. [5] ضعيف، سنن أبي داود: ٨٦٤، سنن ابن ماجه: ٨٨٧. [6] صحيح مسلم: ٧٧٢، سنن أبي داود: ٨٧١، سنن ترمذي: ٢٦٢.
[7] ضعيف، سنن أبي داود: ٨٧٠.

قَدَمِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ » ''اے اللہ! میں نے تیرے لیے رکوع کیا، تجھی پہ میرا ایمان ہے، میں تیرا فرمانبردار ہوں، تو میرا رب ہے، میرے سب اعضاء اللہ رب العالمین کے لیے مطیع ہیں۔''[1] اسے احمد، مسلم اور ابوداود وغیرہم نے نقل کیا۔

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں یہ کلمات کہتے:

« سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ »[2]

③ سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام شب میں کھڑا ہوا تو آپ نے سورۃ البقرہ تلاوت کی، رکوع کی بابت کہتے ہیں کہ اس میں یہ دعا پڑھی: « سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظْمَةِ »[3] اسے ابوداود، ترمذی اور نسائی نے نقل کیا۔

④ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجود میں اکثر یہ کلمات پڑھتے: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ » اور یہ قرآنی آیت کے مصداق پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، اسے احمد،[4] بخاری اور مسلم وغیرہم نے نقل کیا۔

⑩ قومہ کے اذکار

نمازی کے لیے مستحب ہے، چاہے امام ہو یا ماموم یا اکیلا پڑھنے والا، کہ رکوع سے اٹھتے وقت ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے اور جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو کہے: ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' یا ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ » کہتے، پھر کھڑے ہونے کی حالت میں کہتے: « رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ »،[5] اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا، بخاری کی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ ''جب امام « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ » کہے تو تم کہو: « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ » بعض علماء کی رائے ہے کہ مقتدی « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ » نہ کہے، بلکہ اسے امام سے سن کر « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ » کہے، ان کے مدنظر یہی روایت ہے، اسی طرح احمد وغیرہ کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت جس میں ہے کہ امام جب « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ » کہے تو کہو: « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ » تو جس کا یہ کہنا فرشتوں کے موافق ہوا اس کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''[6] لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی تلقین: « صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ »[7] مقتضی ہے کہ مقتدی ''سمع اللّٰه لمن حمده'' بھی کہے اور آگے کی دعا بھی، ان قائلین کا مذکورہ استدلال کہ مقتدی دونوں کے مابین جمع نہ کرے گا، بلکہ فقط ''ربنا لك الحمد'' کہے گا، اس کا جواب نووی نے یہ ذکر کیا کہ ہمارے اصحاب (یعنی شوافع) کا کہنا

---

① صحيح مسلم: ٧٧١؛ سنن أبي داود، ٧٦٠. ② صحيح مسلم: ٤٨٧. ③ صحيح، سنن أبي داود: ٨٧٣؛ سنن نسائي: ١٠٤٨. ④ صحيح البخاري: ٨١٧؛ صحيح مسلم: ٤٨٤. ⑤ صحيح البخاري: ٧٨٩؛ صحيح مسلم: ٣٩٢. ⑥ صحيح البخاري: ٧٩٦. ⑦ صحيح البخاري: ٦٣١.

ہے: اس کا معنی ہے کہ یہ بھی کہو: "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کیونکہ دوسرا قول "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه" ہے تو ان کے علم میں تھا ہی کہ نبی کریم ﷺ اسے بالجہر کہتے تھے جبکہ اگلے جملہ کو بالسرّ اسی جہر کی وجہ سے اسے خاص بالذکر کیا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے بالجہر کہے جملہ کو سنتے تھے اور "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کو نہیں کیونکہ آپ اسے سراً کہتے تھے اور وہ آپ کی عمومی تلقین «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّيْ» سے بھی واقف تھے اور مطلقاً آپ کی اتباع و اقتدا کے عمومی ضابطہ سے بھی اور "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه" کہنے میں وہ آپ کی موافقت کرتے ہی تھے، لہٰذا اس کا حکم دینے کی ضرورت نہ تھی، البتہ "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کو نہ جانتے تھے تو اس کا حکم دے گئے، یہ حالتِ اعتدال (یعنی قومہ) میں کم از کم عبارت ہے جو کہی جائے، اس کے بارے مزید عبارات بھی روایات میں وارد ہیں، جن کا حسبِ ذیل ذکر کیا جاتا ہے:

① سیدنا رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم ایک دن نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں نماز میں تھے، جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا اور کہا: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه» تو مقتدیوں میں سے کسی نے کہا: "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيه" سلام کے بعد آپ نے پوچھا: ''یہ کون بولا تھا؟'' اس نے کہا: میں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: ''میں نے تیس سے زائد فرشتے دیکھے جو ایک دوسرے سے مسابقت کر کے اسے پہلے لکھنے کو چلے آ رہے تھے۔''[1] اسے احمد، بخاری، مالک اور ابوداود نے نقل کیا۔

② سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهْ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ» ''میں اللہ کی اتنی حمد کرتا ہوں کہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کا خلا بھر جائے اور جو اللہ بعد ازیں پیدا کرنا چاہے۔''[2] اسے احمد، مسلم، ابوداود، اور ترمذی نے نقل کیا۔

③ سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ قومہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ، اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ، اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَنَقِّنِيْ مِنْهَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْوَسَخِ»

اسے احمد، مسلم اور ابوداود اور ابن ماجہ نے تخریج کیا۔

④ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ "سمع اللّٰه لمن حمده" کے بعد یہ کلمات پڑھتے:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ أَهْلَ

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٧٧٠؛ سنن نسائی: ١٠٦٢. [2] صحيح مسلم: ٧٧١؛ سنن أبی داود: ٧٦٠؛ سنن ترمذی: ٢٦٦.

الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»

اس میں مزید یہ ہے کہ ''اے اللہ! تو ثنا وتعریف کا اہل ہے، ہم سب تیرے بندے ہیں، تیری عطا کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو تو نہ دے اسے کوئی دے نہیں سکتا اور (نیک عمل اگر نہ ہوں تو) تیرے ہاں کسی کا مال اس کے لیے نافع نہیں۔''[1]

اسے مسلم، احمد اور ابوداود نے نقل کیا۔

⑤ بصحت یہ ثابت ہے کہ آپ نے "سمع اللّٰہ لمن حمدہ" کے بعد یہ دعا بھی پڑھی: «لِرَبِّيَ الْحَمْدُ لِرَبِّيَ الْحَمْدُ»[2] اور آپ کا قومہ آپ کے رکوع کے بقدر ہوتا تھا۔

⑪ سجدہ کی طرف جھکنے اور اس سے اٹھنے کی کیفیت

جمہور کے نزدیک (زمین پر) ہاتھوں سے قبل گھٹنے رکھنا مستحب ہے، اسے ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، احمد، اسحاق رحمہم اللہ اور احناف سے نقل کیا، کہتے ہیں: میں بھی یہی رائے رکھتا ہوں، ابوطیب نے اسے اکثر فقہاء کی رائے قرار دیا، بقول ابن قیم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں سے قبل گھٹنے رکھتے تھے، اولاً گھٹنے، پھر ہاتھ، پھر پیشانی اور ناک، یہی صحیح ہے، جسے شریک نے عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کو جاتے ہوئے ہاتھوں سے قبل گھٹنے رکھے اور جب کھڑے ہوئے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھ اٹھائے،[3] آپ کے فعل سے اس کا برخلاف مروی نہیں۔

امام مالک، اوزاعی، اور ابن حزم رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ گھٹنوں سے قبل ہاتھ رکھنا مستحب ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے لوگوں کو پایا ہے کہ وہ گھٹنوں سے قبل ہاتھ رکھتے ہیں، بقول ابن ابوداود اصحاب الحدیث کا بھی یہی میلان ہے، جہاں تک سجدہ سے دوسری رکعت کے لیے اٹھنے کی کیفیت ہے تو اس میں بھی اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اولاً ہاتھ اٹھائے، پھر گھٹنے، دیگر کے نزدیک ابتدا گھٹنے اٹھانے سے کرے۔

⑫ سجدہ کی ہیئت

ساجد کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھے:

① اپنی ناک، پیشانی اور ہاتھ زمین پر اچھی طرح جمائے اور بازو اپنے پہلوؤں سے دور رکھے، سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو اپنی پیشانی اپنی ہتھیلیوں کے درمیان رکھتے اور بغلوں سے بازو دور رکھتے،[4]

---

[1] صحيح مسلم: ٤٧٧؛ سنن أبي داود: ٨٤٧. [2] صحيح،سنن أبي داود: ٨٧٤؛ سنن نسائي: ١٠٦٨.
[3] ضعيف، سنن أبي داود: ٨٣٨، سنن ترمذي: ٢٦٨. [4] ضعيف، سنن أبي داود: ٧٣٦.

اسے ابو داود نے نقل کیا، سیدنا ابو حمید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ سجدہ میں پیشانی اور ناک اچھی طرح زمین پر چپکاتے اور بازوؤں کو پہلوؤں سے دور رکھتے اور ہتھیلیاں کندھوں کے برابر رکھتے تھے،[1] اسے ابن خزیمہ اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن صحیح قرار دیا۔

② ہتھیلیوں کو کانوں یا کندھوں کے برابر رکھنا دونوں طرح وارد ہے، بعض علماء نے دونوں کے مابین یہ تطبیق دی ہے کہ ہتھیلیاں کندھوں اور انگلیاں کانوں کے برابر ہوں۔

③ انگلیاں لمبی کر کے ساتھ جوڑ کر رکھے، حاکم اور ابن حبان کے ہاں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں انگلیاں کشادہ کر کے اور حالتِ سجدہ میں انہیں ساتھ جوڑ کر رکھتے تھے۔[2]

④ انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب ہو، بخاری رحمہ اللہ کی سیدنا ابو حمید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو بازوؤں کو زمین پر نہ بچھاتے اور نہ انہیں سمیٹ اور سکیڑ کر رکھتے اور پاؤں کی انگلیاں (یعنی ان کے اگلے پورے) جانبِ قبلہ ہوتے تھے۔[3]

⑬ سجدہ کا دورانیہ اور اس کے اذکار

سجدوں میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلىٰ" کہنا مستحب ہے، سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب آیت: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس تسبیح کو اپنے سجود میں کر لو۔"[4] اسے احمد، ابو داود، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا اور اس کی سند جید ہے، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجود میں «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلى» کہتے تھے،[5] اسے احمد، مسلم اور اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن صحیح ہے، مناسب یہ ہے کہ رکوع اور سجود میں تین مرتبہ سے کم تسبیح نہ پڑھی جائے، امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کے نزدیک یہی معمول ہے، وہ مستحب سمجھتے ہیں کہ رکوع وسجود میں تین مرتبہ سے کم نہ پڑھے اور کم از کم مدتِ رکوع وسجود جو کفایت کرتی ہے وہ جمہور کے نزدیک ایک تسبیح کے بقدر ہے (افسوس آجکل کے عام مسلمان بالخصوص احناف اس کم از کم مقدار کے عامل اور اسی پہ راضی ہیں، ان کا تین مرتبہ تیز تیز یہ تسبیح پڑھنا عمدگی سے ایک مرتبہ پڑھنے کے برابر ہے) پہلے گزرا کہ حالتِ رکوع اور حالتِ سجدہ (بلکہ تمام ارکانِ نماز) میں طمانیت اور سکون فرض ہے، اس کا اندازہ ایک تسبیح کے بقدر کیا گیا ہے، لیکن جہاں تک کمالِ تسبیح ہے تو بعض علماء نے اس کا دورانیہ دس تسبیحات کے بقدر قرار دیا ہے، سعید بن جبیر عن انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے پیش نظر جب کہا کہ میں نے اس نوجوان سے بڑھ کر کسی کی نماز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے مشابہ نہیں دیکھا، ان کا اشارہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی طرف تھا (یہ ان کے

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٧٣٤؛ سنن ترمذی: ٢٧٠. [2] صحیح، ابن خزیمة: ٦٤٢؛ ابن حبان: ١٩٢٠.
[3] صحیح البخاری تعلیقاً: کتاب الأذان، باب: ١٣١؛ یستقبل أطراف رجلیه القبلة. [4] ضعیف، سنن أبی داود: ٨٦٩؛ سنن ابن ماجه: ٨٨٧. [5] صحیح مسلم: ٧٧٢.

خلیفہ بلکہ امیرِ مدینہ بننے سے قبل کی بات ہے، ان کی پرورش مدینہ میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاں ہوئی تھی، کیونکہ ان کی والدہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بھائی عاصم کی نواسی تھیں) کہتے ہیں: ہم نے ان کے رکوع اور سجود کے دورانیہ کا اندازہ لگایا تو وہ دس مرتبہ تسبیحِ مذکور پڑھنے کے بقدر تھا۔[1] اسے احمد، ابو داود اور نسائی نے جید اسناد سے نقل کیا، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس میں ان قائلین کی حجت ہے جو کہتے ہیں کہ کمالِ تسبیح دس مرتبہ تسبیح پڑھنا ہے، اصح یہ ہے کہ تنہا نماز پڑھنے والے کے لیے کوئی حد نہیں، جتنی مرتبہ چاہے پڑھ لے، صحیح احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رکوع و سجود (یعنی نوافل میں اور بعض دفعہ فرائض میں بھی) کے تطویل کی ناطق ہیں، امام کے لیے بھی یہ تطویل روا ہے، اگر اس کے مقتدی اس پر رضامند ہوں، امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام کے لیے مناسب ہے کہ ہلکا رکھے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے، چاہے مقتدیوں کی برداشت و رضامندی سے واقف ہو، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ شاید کسی مقتدی کو کوئی کام درپیش ہو (اور شاید کسی کی طبیعت ناساز ہو)۔

امام ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام کے لیے مستحب ہے کہ پانچ مرتبہ تسبیح پڑھے، تاکہ اس کے پیچھے والے بآسانی تین مرتبہ پڑھ سکیں اور مستحب ہے کہ نمازی صرف اسی مذکورہ تسبیح تک محدود نہ رہے، بلکہ جو چاہے دعائیں پڑھتا رہے (یعنی دیگر ماثور تسبیحات جن کا ذکر گزرا اور اپنی ذاتی دعائیں بھی بشرطیکہ بزبانِ عربی ہوں)۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ حالتِ سجدہ میں اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا اس میں کثرت سے دعائیں کیا کرو۔''[2] اور فرمایا: ''مجھے منع کیا گیا ہے کہ رکوع اور سجود کی حالت میں قرآن کی کوئی چیز پڑھوں جہاں تک رکوع ہے تو اس میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو، جبکہ سجود میں بڑھ بڑھ کر دعائیں کیا کرو کیونکہ ان کی بابت ظنِ غالب ہے کہ قبول ہوں گی۔''[3] اسے احمد اور مسلم نے تخریج کیا۔

اس بابت کثیر احادیث مروی ہیں، بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یہ کلمات پڑھا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ فَصَوَّرَهٗ فَأَحْسَنَ صُوَرَهٗ فَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ))[4] اسے احمد و مسلم نے نقل کیا۔

② سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: پھر آپ نماز (یعنی صبح کی سنتوں) کے لیے نکلے اور نماز میں ۔یا سجدہ میں۔ یہ دعا پڑھی: ((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَسَارِيْ نُوْراً وَأَمَامِيْ نُوْرًا وَخَلْفِيْ نُوْرًا وَفَوْقِيْ نُوْرًا وَتَحْتِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْنِيْ نُوْرًا))[5] بقول امام شعبہ رحمہ اللہ: یا کہا: ((وَاجْعَلْ لِيْ نُوْراً))،[6] اسے مسلم اور احمد وغیرہما

---

① ضعیف، سنن أبی داود: ۸۸۸؛ سنن نسائی: ۱۱۳۴. ② صحیح مسلم: ۴۸۲؛ سنن أبی داود: ۸۷۵.
③ صحیح مسلم: ۴۷۹؛ مسند أحمد: ۱/ ۱۵۵. ④ صحیح مسلم: ۷۷۱. ⑤ صحیح مسلم: ۷۷۱؛ مسند أحمد: ۱/ ۱۰۲. ⑥ صحیح مسلم: ۷۶۳؛ مسند أحمد: ۱/ ۳۴۳، ۳۵۲.

نے تخریج کیا، بقول امام نووی رحمہ اللہ علماء کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے تمام اعضاء، اپنے جسم، اپنے تصرفات، افعال، حالت، اپنی سب کیفیات میں اور اپنی شش جہات میں نور کا سوال کیا تا کہ کوئی چیز رہ نہ جائے (یعنی اے اللہ! مجھے مجسم نورِ ہدایت بنا دے اور میرے ہر طرف ہدایت کی روشنی ہو، بطورِ تفنن عرض ہے کہ اگر کوئی بریلوی بھائی کہے: دیکھو حضور نے اپنی ہر چیز کو نور کا بنا دینے کی دعا کی ہے تو کیا اللہ نے یہ دعا منظور نہ کی ہوگی؟، لہٰذا ہمارا مؤقف کہ حضور مجسمِ نور ہیں، درست ہے تو عرض یہ ہے کہ بالفرض اگر ظاہری معنی مان بھی لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قبل ازیں حضور نور نہ تھے، اس دعا کے بعد بنائے گئے اور یہ دعا آپ نے مدینہ میں مانگنا شروع کی تو یہ آپ کے مؤقف کے برخلاف ہے کہ اللہ نے آپ کا نور بہت پہلے تخلیق کر دیا تھا جبکہ ابھی سیدنا آدم علیہ السلام کی مٹی گوندھی جا رہی تھی، دوم یہ کہ یہ دعا تو ہمیں بھی کرنے کی فعلِ نبوی سے ہدایت ملی ہے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ امت کے صحابہ، اولیاء، صالحین اور مستجاب الدعوات بزرگ بھی مجسمِ نور بن چکے ہیں؟ لہٰذا امام نووی رحمہ اللہ نے علماء کے حوالے سے اس کا جو مفہوم بیان کیا وہی مطلوب و مقصود ہے)۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ایک رات میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا، جب ادھر ادھر ہاتھ پھیرا تو آپ کو ہاتھ لگا اور آپ سجدے کی حالت میں تھے اور یہ دعا کر رہے تھے: «رَبِّ أَعْطِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا» ''اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ دے اور اس کا تزکیہ فرما تو ہی اس کا ولی و مولیٰ ہے۔''[1] اسے احمد نے تخریج کیا۔

④ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدوں میں یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهُ دِقَّهُ وَجُلَّهُ وَأَوَّلَهُ وَآخِرَهُ وَعَلَانِيَتَهُ وَسِرَّهُ» ''اے اللہ! میرے ظاہری، پوشیدہ اور چھوٹے بڑے سب گناہ معاف فرما۔''[2] اسے مسلم، ابوداود اور حاکم نے نقل کیا۔

⑤ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ایک رات آپ نہ ملے، ڈھونڈا تو مسجد میں تھے اور دورانِ سجدہ یہ کہہ رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ» ''اے اللہ! میں تیری خوشنودی کے ذریعے تیری ناراضی سے تیری عافیت کے ذریعے تیری سزا سے اور تیری رحمت کے ذریعے تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں۔ میں تیری تعریف کو شمار نہیں کر سکتا، تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے اپنی تعریف خود کی ہے۔''[3] اسے مسلم اور اصحابِ سنن نے نقل کیا۔

⑥ انہی سے ایک اور روایت میں ہے کہ ایک رات یہی معاملہ ہوا تو تب آپ رکوع یا سجدے کی حالت میں تھے اور یہ کلمات کہہ رہے تھے: «سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ» ''پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں کس خیال میں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کام میں مصروف ہیں۔''[4] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے نقل کیا۔

---

[1] ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٢٠٩. [2] صحيح مسلم: ٤٨٣؛ سنن أبي داود: ٨٧٨. [3] صحيح مسلم: ٤٨٦؛ سنن ترمذي: ٣٤٩٣. [4] صحيح مسلم: ٤٨٥؛ سنن نسائي: ١١٣١.

⑦ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ سجدے میں یہ بھی پڑھا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَإِسْرَافِيْ فِيْ أَمْرِيْ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، اَللّٰهُمَّ أَغْفِرْلِيْ جِدِّيْ وَهَزْلِيْ وَخَطَئِيْ وَعَمْدِيْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ أَنْتَ إِلٰهِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»

''اے اللہ! میری خطائیں، میری جہالت اور تمام امور میں جو مجھ سے زیادتی ہوئی جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے سبھی معاف فرمادے، اے اللہ! میں نے دانستہ کیا یا جو بھول چوک سے ہوا اور جو کچھ عمداً کیا یہ سب کچھ مجھ میں ہے تو اس کو معاف کردے، اے اللہ! میں نے جو آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا، میں نے جو علانیہ کیا اور جو چھپ کر کیا تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔''[1]

⑭ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی صفت

اس بارے میں سنت یہ ہے کہ بایاں پاؤں موڑ کر پھیلا دے اور اس پر بیٹھے، جبکہ دایاں پاؤں کھڑا ہو اور اس کی انگلیوں کا رخ جانب قبلہ ہو، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بایاں پاؤں پھیلاتے اور دایاں کھڑا رکھتے۔[2] اسے بخاری و مسلم نے بیان کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: نماز کی سنت میں سے ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھے اور اس کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے،[3] اسے نسائی نے نقل کیا، نافع رحمہ اللہ ناقل ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز پڑھتے تو ہر چیز کا رخ قبلہ کی طرف کرتے، حتی کہ جوتوں کا بھی (یعنی اگر جوتوں سمیت نماز ادا کرتے) اسے اثرم نے نقل کیا، سیدنا ابو حمید رضی اللہ عنہ کی نمازِ نبوی کی صفت والی مشہور حدیث میں بیٹھنے کی صفت کے بیان میں ہے کہ پھر آپ نے بایاں پاؤں موڑا اور اس پر بیٹھے، پھر اتنی دیر توقف کیا اور اطمینان سے بیٹھے رہے کہ ہر ہڈی اپنی جگہ واپس ہوئی، پھر (اگلے) سجدے کے لیے جھکے،[4] اسے احمد، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا اور صحت کا حکم لگایا، اقعاء کا استحباب بھی وارد ہے، وہ یہ کہ دونوں پاؤں بچھا کر ان کے عقب (یعنی ایڑیوں) پر بیٹھے، ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اہل الحدیث کا قول ہے۔ چنانچہ ابو زبیر رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ طاوس سے سنا: ہم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اقعاء علی القدمین (یعنی ایڑیوں کے بل بیٹھنے) کے بارے میں پوچھا: تو انہوں نے کہا: یہ سنت ہے، ہم نے کہا: ہم تو اسے ایک فضول حرکت خیال کرتے ہیں، کہا: یہ تمہارے نبی کی سنت ہے۔[5] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے منقول ہے کہ جب پہلے سجدے سے اٹھتے تو اپنی انگلیوں کے کناروں پر (یعنی پاؤں کھڑے کر کے ایڑیوں کے بل) بیٹھتے اور کہتے: یہ بھی سنت سے ہے، طاوس رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میں نے عبادلہ، یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ اقعاء کرتے ہیں، اسے بیہقی

---

① صحيح مسلم: ٢٧١٩. ② صحيح مسلم: ٤٩٨؛ سنن أبي داود: ٧٨٣. ③ صحيح، سنن نسائي: ١١٥٨.
④ صحيح، سنن أبي داود: ٧٣٠؛ سنن ترمذي: ٣٠٤. ⑤ صحيح مسلم: ٥٣٦؛ مسند أحمد: ١/ ٣١٣.

نے روایت کیا، بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی سند صحیح ہے، جہاں تک وہ اقعاء جس سے مراد یہ ہے کہ دونوں سرین زمین پر ٹکا لی جائیں اور زانو کھڑے کیے جائیں تو یہ بالاتفاق مکروہ ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ مجھے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں سے منع فرمایا: مرغ کی طرح ٹھونگے مارنے سے (یعنی جلدی جلدی نماز پڑھنے سے)، کتے کے اقعاء کی مانند اقعاء سے اور لومڑی کی طرح تانک جھانک سے،[1] اسے احمد، بیہقی، طبرانی اور ابویعلیٰ نے نقل کیا جبکہ اس کی سند حسن ہے، دو سجدوں کے مابین بیٹھے ہوئے کے لیے مستحب ہے کہ اپنا دایاں ہاتھ دائیں زانو اور بایاں ہاتھ بائیں زانو پر رکھے، اس طرح کہ انگلیاں کچھ کھلی ہوئیں اور جانبِ قبلہ ہوں اور پھیلی ہوئی گھٹنوں تک پہنچ رہی ہوں۔

دو سجدوں کے درمیان کی دعا

اس میں درج ذیل دعاؤں میں سے ایک کا پڑھنا مستحب ہے اور اگر چاہے تو تکرار کر لے (یا دونوں پڑھ لے) نسائی اور ابن ماجہ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان بیٹھے ہوئے یہ دعا پڑھتے تھے: «رَبِّ اغْفِرْلِيْ، رَبِّ اغْفِرْلِيْ»[2] ابوداود نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جلسہ کی یہ دعائے نبوی نقل کی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ»[3] (مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فیض الباری شرح بخاری میں لکھتے ہیں: میں حنفیوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس دعا پر توجہ دیں اور اسے نظرانداز نہ کریں، بظاہر احناف نے اپنے شیخ کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا)۔

⑮ جلسۂ استراحت

یہ ایک مختصر سا بیٹھنا ہے جو نمازی پہلی رکعت کے دوسرے سجدہ سے فارغ ہو کر دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہونے سے قبل بیٹھے، اسی طرح تیسری رکعت میں بھی چوتھی کے لیے کھڑا ہونے سے قبل، علماء نے اختلافِ روایات کے مدِ نظر اس حکم کے بارے باہم اختلاف کیا ہے، ذیل میں اس ضمن کی امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کلام کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، کہتے ہیں: اس جلسہ کے بارے میں فقہاء نے باہم اختلاف کیا کہ کیا یہ نماز کی سنن میں سے ہے؟ تو ہر ایک کے لیے اس کا کرنا مستحب ہے، یا سنن سے نہیں صرف حسبِ ضرورت اس پر عمل ہو تو دو اقوال ملتے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دونوں طرح منقول ہے، خلال کہتے ہیں: آخر میں امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرف رجوع کر لیا تھا، جس میں جلسۂ استراحت کا اثبات مذکور ہے اور کہا: مجھے یوسف بن موسیٰ نے بتلایا کہ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے (دوسری اور تیسری رکعت کے لیے) اٹھنے کی کیفیت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں کہا: ”عَلٰى صُدُوْرِ الْقَدَمَيْنِ“ یعنی پاؤں کی انگلیوں کے بل ہو کر اٹھے، جو سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کیفیت مذکور ہے، ابن عجلان کی حدیث سے بھی دلالت ملتی ہے کہ وہ پاؤں کی انگلیوں کے بل (یعنی بغیر بیٹھے)

---

① حسن، مسند ابی یعلی: ٢٦١٩؛ مسند أحمد: ٢/ ٣١١. ② صحيح، سنن نسائی: ١١٤٤؛ سنن ابن ماجه: ٨٩٧. ③ حسن، سنن أبی داود: ٨٥٠؛ سنن ترمذی: ٢٨٤، ٢٨٥.

اٹھتے تھے، اسے متعدد صحابہ کرام نے روایت کیا ہے، تمام نمازِ نبوی کا وصف نقل کرنے والوں نے جلسہ استراحت کا ذکر نہیں کیا، صرف سیدنا ابوحمید ساعدی اور مالک بن حویرث رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں یہ مذکور ہے، اگر ہمیشہ آپ کا طریقہ یہی ہوتا تو ہر نمازِ نبوی کا واصف اسے ذکر کرتا، مجرد آپ کا اسے کرنا اس کے نماز کی سنن میں سے ہونے پر دلیل نہیں اِلّا یہ کہ معلوم ہو جائے کہ آپ نے سنت قرار دے کر کیا ہے، تب اس پر آپ کی اقتدا کی جائے گی، لیکن اگر محسوس ہو کہ کوئی کام آپ نے ضرورت کے تحت کیا ہے تو یہ نماز کی سنن سے ہونے پر دلالت کرنے والا نہ ہوگا۔

⑯ تشہد میں بیٹھنے کی ہیئت و کیفیت

تشہد میں درج ذیل سنن کا خیال رکھنا لازمی ہے:

(الف) اپنے ہاتھ مندرجہ بالا احادیث میں مذکور طریقہ کے مطابق رکھے

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھ لیتے اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے (عربوں کے ہاں اس زمانہ میں رائج) ترپن (53) کے عدد کا انداز بناتے۔[1] (بقول محشی اس کی تفصیل یہ کہ انگلیاں سمیٹ کر یعنی مٹھی بنا کر انگوٹھے کی نوک انگشتِ شہادت کے نچلے پورے پر رکھتے اور شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے (یعنی اشارہ والی جگہ پہنچ کر اسے حرکت دیتے اور قبل ازیں اسے سیدھا کھڑا رکھتے، مسلسل حرکت دینا ایک غلط فہمی ہے جو بعض کو ایک روایت کے الفاظ سے ہوئی ہے) ایک روایت میں ہے کہ آپ اپنی تمام انگلیاں سمیٹ لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے، اسے مسلم نے نقل کیا۔

② سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بائیں ہتھیلی بائیں زانو اور گھٹنے پر رکھی اور اپنی دائیں کہنی کی حد کو اپنے دائیں زانو پر رکھا، پھر گول مٹھی بنائی، ایک روایت میں ہے کہ درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ دائرہ بنایا اور انگشتِ شہادت کے ساتھ اشارہ کیا، پھر اپنی انگلی اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ آپ اسے ہلا رہے ہیں اور اس کے ساتھ دعا کرتے ہیں،[2] اسے احمد نے نقل کیا، بیہقی کہتے ہیں: محتمل ہے کہ یہاں ہلانے سے مراد اشارہ ہو نہ کہ ہمہ وقت ہلاتے رہنا تا کہ یہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی اس روایت کے موافق ہو جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تو انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اسے ہلاتے نہیں تھے، اسے ابوداود نے بسندِ صحیح نقل کیا،[3] نووی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

③ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں زانو اور بایاں بائیں زانو پر رکھ لیتے اور انگشتِ شہادت کے ساتھ اشارہ کرتے اور آپ کی نظر آپ کے اشارے سے متجاوز نہ ہوتی،[4] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے نقل کیا تو اس حدیث میں مٹھی بنا لینے کا ذکر نہیں تو یہ تینوں کیفیات صحیح روایات سے ثابت ہیں، ان میں سے کوئی

---

① صحیح مسلم: ٥٨٠. ② صحیح، سنن نسائی: ٨٨٩؛ مسند أحمد: ١٨٨٧٠. ③ شاذ، سنن أبی داود: ٩٨٩.
④ صحیح مسلم: ٥٧٩؛ سنن نسائی: ١٢٧٥؛ مسند أحمد: ٤/ ٣.

بھی ایک اختیار کی جا سکتی ہے۔

(ب) اپنی داہنی انگشتِ شہادت کے ساتھ اشارہ کرتے، اسے تھوڑا سا جھکاتے ہوئے، سیدنا نمیر خزاعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تشہد میں بیٹھے دیکھا اور آپ نے اپنا دایاں بازو دائیں زانو پر رکھا تھا اور انگشتِ شہادت اٹھائے ہوئے تھے جبکہ تھوڑا سا اسے جھکائے ہوئے دعائیں پڑھ رہے تھے،[1] اسے احمد، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے جید سند کے ساتھ تخریج کیا، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے گزر ہوا جو دو انگلیوں (کے اشارے) کے ساتھ دعائیں کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ''ایک انگلی کے ساتھ (اشارہ کرو) اے سعد!''[2] اسے احمد، ابوداود، نسائی اور حاکم نے تخریج کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا: اگر کوئی دعا کرتے ہوئے انگلی کے ساتھ اشارہ کرے تو انہوں نے کہا: یہ اخلاص کی نشانی ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہ تضرُّع ہے، بقول مجاہد رحمہ اللہ شیطان کی ہزیمت کا ہتھیار ہے، شافعیہ کی رائے میں ایک بار ہی انگلی کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور یہ ''إِلَّا اللّٰهُ'' پر پہنچ کر، جبکہ حنفیہ کے نزدیک یہ اشارہ ''لا'' کہتے وقت ہوگا اور إِلَّا اللّٰهُ کہتے ہوئے انگلی نیچے کر لے، مالکیہ کے ہاں سلام تک انگلی کو دائیں بائیں حرکت دیتا رہے، اس ضمن میں حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ جب بھی لفظ ''اللّٰہ'' آئے انگلی کے ساتھ اشارہ کرے کیونکہ یہ اشارۂ توحید ہے، اسے (مسلسل) ہلاتا نہ رہے۔

(ج) پہلے تشہد میں دو زانو ہو کر اور دوسرے میں تورُّک کر کے بیٹھے، تورُّک یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور اس کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب ہو اور بائیں پاؤں کو موڑے رکھے اور سرین زمین پر رکھے (یعنی بجائے بائیں پاؤں کے)، سیدنا ابو حمید رضی اللہ عنہ کی نمازِ نبوی کی صفت والی حدیث میں تورّک کا دوسرے تشہد میں بیان موجود ہے، اسے بخاری نے نقل کیا۔

⑰ پہلا تشہد

جمہور علماء کی رائے میں پہلا تشہد سنت ہے، سیدنا عبد اللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مدِنظر جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر میں پہلا تشہد (بھولے سے) ترک کر کے کھڑے ہو گئے، پھر نماز پوری کر کے سلام سے قبل بیٹھے بیٹھے دو سجدے (سہو کے) کیے، اللہ اکبر کہہ کر ہر سجدے میں گئے اور لوگوں نے بھی آپ کے ہمراہ سجدے کیے تو یہ اس تشہد کے بدلے میں تھے جو آپ بھول گئے تھے،[3] اسے جماعت نے نقل کیا، سبل السلام (شرح بلوغ المرام) میں ہے کہ حدیثِ ہٰذا اس امر پر دلیل ہے کہ اگر پہلا تشہد بھولے سے ترک کر دیا تو سجدہ سہو اس کی تلافی کر دے گا اور آپ کا فرمان: «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» ''نماز اس طرح پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو۔'' پہلے تشہد کے وجوب پر دلیل ہے اور اس کے ترک پر

---

① ضعيف، سنن أبي داود: ٩٩١؛ سنن نسائي: ١٢٧٣؛ سنن ابن ماجه: ٩١١. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٤٩٩؛ سنن نسائي: ١٢٧٢. ③ صحيح البخاري: ١٢٢٥؛ صحيح مسلم: ٥٧٠؛ سنن أبي داود: ١٠٣٤.

اس کا (بذریعہ سجدہ سہو) تدارک دلیل ہے کہ یہ اگرچہ واجب ہے، مگر سجدہ سہو سے اس کی کمی پوری ہو جائے گی (یعنی اب تشہد بیٹھنے کی ضرورت نہیں) اس کے ساتھ اول تشہد کے عدم وجوب پر استدلال تام نہیں ہوگا، تا آنکہ اس بات کی دلیل ملے کہ ہر واجب فعل سے سجدہ سہو مجزئ نہ ہوگا اگر بھولے سے اس کا ترک کر دیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کی کلام نقل کرتے ہیں: اس امر کی دلیل ہے کہ سجدہ سہو واجب کا قائم مقام نہیں بنتا، یہ ہے کہ اگر کوئی تکبیر تحریمہ کہنا بھول جائے تو اس کی تلافی بذریعہ سجدہ سہو نہ ہو سکے گی تو اسی طرح تشہد ہے اور اس لیے کہ یہ ذکر ہے، جسے کسی صورت بالجہر نہیں پڑھنا، لہٰذا یہ واجب نہیں، جیسے دعائے استفتاح (یعنی ثنا) ہے، ان کے غیر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لوگوں کی اپنی سجدہ سہو کرنے کی اتباع پر تقریر (یعنی اسے ناپسند نہ کرنے) سے استدلال کیا یہ جان لینے کے بعد کہ انہوں نے تو اس کا ترک تعمداً کیا تھا، یہ کہنا محلِ نظر ہے، اس کے وجوب کے قائلین میں امام لیث بن سعد، امام اسحاق رحمہ اللہ اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ ہیں اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے، حنفیہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، طبری نے اس کے وجوب پر اس بات سے احتجاج کیا کہ نماز اولاً دو رکعتیں فرض کی گئی تھی اور اس میں تشہد واجب تھا، تو جب اضافہ ہوا تو یہ اضافہ اس وجوب کا مزیل نہیں ہو سکتا۔

تشہد کو ہلکا رکھنے کا استحباب

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی دو رکعتوں کے بعد (تشہد) بیٹھتے تو گویا گرم کوئلے پر بیٹھے ہوں (یعنی پہلے تشہد میں زیادہ دیر نہ بیٹھتے تھے)،[1] اسے احمد اور اصحاب سنن نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن ہے، البتہ عبیدہ کا اپنے والد (یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ) سے سماع ثابت نہیں، لکھتے ہیں: اہلِ علم کے ہاں یہی معمول ہے، انہیں پسند ہے کہ پہلے تشہد کو طویل نہ کیا جائے اور (ماثور کلماتِ) تشہد سے زائد اس میں کچھ نہ پڑھا جائے، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: منقول نہیں کہ آپ نے پہلے تشہد میں درود شریف پڑھا ہو اور نہ عذابِ قبر، عذابِ نار اور محیا و ممات اور مسیح دجال کے فتنوں سے استعاذہ کیا ہو، جن حضرات نے ان دعاؤں کو مستحب قرار دیا، ان کی یہ فہم عمومات اور اطلاقات سے ہے، صحیح روایات میں ان کا محل و مقام آخری تشہد مذکور ہے۔

⑱ درود شریف

نمازی کے لیے مستحب ہے کہ آخری تشہد میں درج ذیل میں سے کسی ایک عبارت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر درود پڑھے:

① سیدنا ابو مسعود بدری راوی ہیں کہ سیدنا بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے (قرآن میں) ہمیں آپ پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے تو کن الفاظ میں یہ پڑھیں؟ آپ (وحی کے انتظار میں) کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا: ''کہو:

---

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٩٩٥؛ سنن ترمذي: ٣٦٦؛ سنن نسائي: ١١٧٥.

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ» اور سلام بھیجنا تو تمہیں معلوم ہے۔''[1] اسے مسلم اور احمد نے نقل کیا (محشی لکھتے ہیں: آل کی تعریف میں اختلافِ اقوال ہے، بعض نے کہا: بنی ہاشم اور بنی مطلب کہ جن پر زکاۃ حرام ہے، بعض نے کہا: نبی کریم ﷺ کی صلبی ذریت اور ازواج مطہرات ہیں، بعض نے کہا: ساری امت اور اَتباع مراد ہیں، بعض نے آپ کی امت کے متقی مراد لیے، بقول امام ابن قیم رحمہ اللہ اول قول صحیح ہے، درجہ میں اس کے بعد دوسرا قول ہے، تیسرے اور چوتھے کو انہوں نے ضعیف قرار دیا، لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا کہ یہی قول سب سے بہتر ہے اور یہی زہری وغیرہ اور کئی محققین کا اختیار ہے کہ ساری امت ہی آل ہے)۔

② سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کے الفاظ کا تو علم ہے، درود کس طرح بھیجیں؟ فرمایا: ''کہو: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْد، اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ» ''[2] اسے جماعت نے نقل کیا، درود شریف پڑھنا واجب نہیں، بلکہ مندوب ہے۔ کیونکہ ترمذی نے صحیح قرار دیا۔ احمد اور ابو داود نے سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی: نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص نماز میں دعا کر رہا ہے اور آپ پر درود نہیں پڑھا (یعنی وہ صحابی تشہد کے کلمات کے فوری بعد دعائیں کرنا شروع ہوا درود پڑھے بغیر) تو آپ نے فرمایا: ''اس نے عجلت کی۔'' پھر اسے یا کسی اور سے کہا: ''جب تمہارا کوئی نماز (یہاں نماز سے مراد تشہد ہے) پڑھے تو اللہ کی تحمید و ثنا کے ساتھ ابتدا کرے، پھر نبی (ﷺ) پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے دعائیں کرے۔'' مصنف المنتقی لکھتے ہیں: اس میں ان حضرات کی حجت ہے جو درود کو فرض نہیں سمجھتے، کیونکہ آپ نے اس کے تارک کو نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا، اس کی تائید و تقویت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ملتی ہے، جس میں ذکرِ تشہد کے بعد فرمایا: «ثُمَّ يَتَخَيَّرُ مِنَ الْمَسْأَلَةِ مَا شَاءَ» ''پھر جو چاہے دعا مانگے۔''[3] امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: میری رائے میں کوئی دلیلِ وجوب ثابت نہیں۔

⑲ سلام سے قبل کی دعائیں

تشہد کے آخر میں سلام سے قبل دنیا و آخرت کی بھلائی کی ہر طرح کی دعا کرنا مستحب ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں تشہد کی تعلیم دی، پھر آخر میں فرمایا: «ثم تَخْتَرْ مِنَ الْمَسْأَلَةِ ما تَشَاءُ» اسے مسلم نے نقل کیا، دعا کرنا مطلقاً مستحب ہے، چاہے وہ ماثور ہو یا غیر ماثور، البتہ ماثورہ دعائیں پڑھنا افضل ہے، ذیل میں اس ضمن کی چند دعائیں ذکر کی جاتی ہیں:

---

① صحيح مسلم: ٤٠٥؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٧٤. ② صحيح البخاري: ٣٣٧٠؛ صحيح مسلم: ٤٠٦.
③ صحيح مسلم: ٤٠٢.

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور کہے:'' ((اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَهِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ)) ''اے اللہ! میں تجھ سے عذابِ جہنم، قبر کے عذاب اور حیات وممات اور دجال کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں۔''[1] اسے مسلم نے تخریج کیا۔

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ)) ''اے اللہ! میں تجھ سے قبر کے عذاب سے، دجال کے فتنے سے، زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے گناہ اور چٹی پڑ جانے سے پناہ مانگتا ہوں۔''[2] متفق علیہ۔

③ سیدنا علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تشہد اور تسلیم کے درمیان یہ دعا کیا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ)) [3] اسے مسلم نے نقل کیا۔

④ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: مجھے کوئی ایسی دعا سکھلائیں جسے میں نماز میں پڑھا کروں، آپ نے فرمایا: ''کہو: ((اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْماً كَثِيْراً وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ)) ''اے اللہ! میں نے اپنی جان پہ بہت ظلم کیے ہیں اور تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں، تو میری مغفرت فرما اور مجھ پہ رحم کر کیونکہ تو غفور رحیم ہے۔''[4] متفق علیہ۔

⑤ حنظلہ بن علی سے مروی ہے کہ سیدنا محجن بن اَدْرع رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ مسجد تشریف میں لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی تشہد میں یہ کہہ رہا ہے: ''اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ يَا اَللّٰهُ الْوَاحِدُ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُواً أَحَدٌ، أَنْ تَغْفِرَ لِيْ ذُنُوْبِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ'' اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اے اللہ! ایک، اکیلا، بے نیاز، جس نے نہ اولاد جنی نہ وہ خود جنا گیا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں، تو میرے گناہ بخش دے، بے شک تو معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اسے مغفرت مل گئی۔'' تین دفعہ فرمایا،[5] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا (اور نسائی نے بھی)۔

⑥ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْأَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدُ وَأَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَأَسْأَلُكَ قَلْباً سَلِيْماً

---

[1] صحيح مسلم: ٥٨٨. [2] صحيح البخاري: ٨٢٣؛ صحيح مسلم: ٥٨٩. [3] صحيح مسلم: ٧٧١.
[4] صحيح البخاري: ٨٣٤؛ صحيح مسلم: ٢٧٠٥. [5] صحيح، سنن أبي داود: ٩٨٥؛ مسند احمد: ٤/ ٣٣٨.

وَلِسَاناً صَادِقاً وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ» ''میں تجھ سے استقامت، نیکیوں کا عزم اور بھلائی مانگتا ہوں اور یہ کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں اور عمدگی سے عبادت کروں اور ہر خیر جو تیرے علم میں ہے اس کا سوالی ہوں اور ہر شر جو تیرے علم میں ہے اس سے پناہ چاہتا ہوں اور استغفار کرتا ہوں۔''[1] اسے نسائی نے نقل کیا۔

⑦ امام ابومجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمیں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے نماز پڑھائی اور اسے ہلکا رکھا، لوگوں کو یہ ناگوار لگا (آج کل لوگوں کو اس کا عکس ناگوار لگتا ہے) وہ بولے: کیا رکوع وسجود کا اتمام نہیں کیا؟ کہا: کیوں نہیں! پھر بولے: میں نے اس میں وہ دعا بھی مانگی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانگا کرتے تھے، وہ یہ ہے: «اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ أَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْراً لِيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِيْ أَسْأَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَكَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنىٰ وَلَذَّةَ النَّظَرِ إِلىٰ وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ إِلىٰ لِقَائِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَمِنْ فِتْنَةٍ، مُضِلَّةٍ، اَللّٰهُمَّ زَيِّنَا بِزِيْنَةِ الْإِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مَهْدِيِّيْنَ» ''اے اللہ! تیرے عالم الغیب ہونے اور خلق پر تیری قدرت کے صدقے دعا کرتا ہوں کہ جب تک میرے لیے زندہ رہنا بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور جب مرنا میرے لیے بہتر ہو تو مجھے موت دے، میں ہر حال میں تیری خشیت کا سوالی ہوں اور یہ کہ غضب اور ناراضی کی حالت میں کلمۂ حق منہ سے نکلے اور غنیٰ وفقر دونوں حالتوں میں میانہ روی سے کام لوں اور اپنے دیدار کی لذت عطا فرمانا اور اپنی ملاقات کا مجھے شوق پیدا کر اور ہر تنگی وضرر اور گمراہ کن فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ! تو ہمیں زینتِ ایمان سے مزین کر اور ہمیں ہادی ومہدی بنا''[2] اسے احمد اور نسائی نے جید سند سے نقل کیا۔

⑧ ابوصالح رحمہ اللہ کسی صحابی سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پوچھا: ''نماز میں کیا کہتے ہو؟'' کہا: تشہد کے بعد میں یہ دعا کرتا ہوں: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ'' اور کہا: ''أَمَا إِنِّيْ لَا أُحْسِنُ دَنْدَنَتَكَ وَلَا دَنْدَنَةَ مُعَاذٍ'' یعنی میرے پاس آپ جیسے اور معاذ جیسے حسنِ الفاظ نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا: ''ہمارے حسنِ الفاظ کا لبِ لباب بھی جنت کی طلب اور دوزخ سے پناہ مانگنا ہے۔''[3] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا۔

⑨ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ دعا بھی سکھلائی: «اَللّٰهُمَّ أَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ، وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْ أَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ

---

[1] ضعيف، سنن نسائی: ١٣٠٤. [2] صحيح، سنن نسائی: ١٣٠٥؛ مسند أحمد: ٤/ ٢٦٤. [3] صحيح، سنن أبی داود: ٧٩٢؛ سنن ابن ماجه: ٩١٠.

عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا وَقَابِلِيْهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا ﴾ ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو جوڑ دے، ہمیں سلامتی کے راستے دکھلا، ہمیں تاریکیوں سے نور کی طرف نجات دے، ہر نوع کے ظاہری و باطنی فواحش سے بچا، ہمارے اعضائے جسمانی اور اہل وعیال میں برکت ڈال اور ہماری توبہ قبول کر، بے شک تو بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمیں اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے نواز دے اور ہمیں ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے والا بنا دے۔''[1] اسے احمد اور ابوداود نے تخریج کیا۔

⑩ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا اور ایک شخص نماز میں مصروف تھا، جب وہ تشہد میں بیٹھا تو یہ دعا کی: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُك بِأَنَّ لَكَ الْحَمْدَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا: ''جانتے ہو یہ کس کے ساتھ دعا کر رہا ہے؟'' عرض کی: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا: ''اللہ کے اسمِ اعظم کے ساتھ، وہ اسم کہ جب اس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اور جب اس کے ساتھ اس سے کچھ مانگا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔''[2] اسے نسائی نے نقل کیا۔

⑪ عمیر بن سعید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں نماز کا تشہد سکھلاتے، پھر کہتے: اس سے فارغ ہو کر یہ کلمات کہا کرو: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُك مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ وَأَعُوْذُ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ عِبَادُكَ الصَّالِحُوْنَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ عِبَادُكَ الصَّالِحُوْنَ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ'''' اے اللہ! میں تجھ سے ہر بھلائی کا سوالی ہوں، جسے میں جانتا ہوں اور جسے نہیں جانتا اور ہر شر سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے علم میں ہے اور جو نہیں، اے اللہ! ہر اس بھلائی کا میں طالب ہوں جو تیرے نیک بندوں نے تجھ سے مانگی اور ہر اس شر سے پناہ مانگتا ہوں جس سے تیرے نیک بندوں نے پناہ مانگی، ہمیں دنیا وآخرت کی حسنہ عطا فرما۔'' پھر فرمایا: اس دعا میں ہر نبی اور ہر صالح داخل ہوا۔[3] اسے ابن ابوشیبہ اور سعید بن منصور نے نقل کیا۔

⑳ سلام کے بعد کے اذکار اور دعائیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلام کے بعد کے اذکار اور دعائیں وارد ہیں، مسنون ہے کہ انہیں پڑھا جائے یہ مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ ﴿أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ﴾ پڑھتے اور پھر کہتے: ﴿اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾[4] اسے جماعت نے ماسوائے

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٩٦٩؛ صحيح ابن حبان: ٩٩٦۔ [2] صحيح، سنن أبي داود: ١٤٩٥؛ سنن نسائي: ١٢٩٩؛ مسند أحمد: ٣/ ١٢٠۔ [3] ضعيف، مصنف ابن ابی شيبة: ١/ ٢٩٦، ٢٩٧۔ [4] صحيح مسلم: ٥٩١؛ سنن ترمذي: ٣٠٠؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٧٥۔

بخاری کے نقل کیا، مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا کہ ولید کہتے ہیں: میں نے اوزاعی رحمہ اللہ سے کہا: استغفار کیسا ہو؟ کہا کہ یہ کہے:
«أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ»

② سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک دن نبی کریم ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: ''اے معاذ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' انہوں نے عرض کی: میرے والدین آپ پر قربان ہوں، مجھے بھی آپ سے محبت ہے، آپ نے فرمایا: ''اے معاذ! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرنا نہ چھوڑنا: «اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ» اے اللہ! اپنے ذکر، شکر اور حسنِ عبادت پر میری مدد فرما۔''[1] اسے احمد، ابوداود، نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ یہ صحیحین کی شرط پر ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم خوب توجہ اور محنت سے دعا کرنا چاہتے ہو؟ تب یہ کہا کرو:'' «اَللّٰهُمَّ أَعِنَّا عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[2] اسے احمد نے جید سند کے ساتھ نقل کیا۔

③ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سلام پھیر کر یہ کلمات پڑھا کرتے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ أَهْلَ النِّعْمَةِ وَالْفَضْلِ وَالثَّنَاءِ الْحَسَنِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ»[3] اسے احمد، مسلم ابوداود اور نسائی نے تخریج کیا۔

④ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر فرض نماز سے سلام کے بعد یہ کلمات پڑھا کرتے تھے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[4] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

⑤ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ہر نماز کے بعد معوذتین (یعنی آخری دو سورتیں) پڑھا کروں،[5] ابوداود کی روایت میں ''المعوذات'' کا لفظ (یعنی جمع کا) ہے، اسے احمد، بخاری اور مسلم نے تخریج کیا۔

⑥ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو دخولِ جنت اور اس کے درمیان صرف موت ہی حائل ہے۔''[6] اسے نسائی اور طبری نے نقل کیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی وہ اب اگلی نماز تک اللہ کی نگہبانی و ذمہ داری پر ہے۔''[7] اسے طبرانی نے حسن سند سے نقل کیا۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٥٢٢؛ سنن نسائی: ١٣٠٢. [2] مسند أحمد: ٢/ ٢٩٩؛ مجمع الزوائد: ١٠/ ١٧١.
[3] صحیح مسلم: ٥٩٤؛ سنن أبی داود: ١٥٠٦. [4] صحیح البخاری: ٨٤٤؛ صحیح مسلم: ٥٩٤. [5] صحیح، سنن أبی داود: ١٥٢٣؛ سنن ترمذی: ٢٩٠٣. [6] صحیح، عمل الیوم واللیلة للنسائی: ١٠٠؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ٧٥٣٢. [7] ضعیف، المعجم الکبیر للطبرانی: ٢٧٣٣.

⑦ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ہر نماز کے بعد ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۳ دفعہ اللہ اکبر پڑھا، یہ کل ننانوے بنے، پھر ان الفاظ کے ساتھ سو کا عدد مکمل کیا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» ''اس کی تمام خطائیں معاف کر دی جائیں گی، چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے مثل ہوں۔''[1] اسے احمد، بخاری، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا۔

⑧ سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ''جس نے ہر نماز کے بعد ۳۳ دفعہ تسبیح، ۳۳ دفعہ تحمید اور ۳۴ دفعہ تکبیر کہی وہ کبھی ناکام نہ ہوگا۔''[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

⑨ سمی عن ابو صالح عن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فقرائے مہاجرین دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مالدار بلند درجات اور نعمتیں پا گئے، آپ نے فرمایا: ''وہ کیسے؟'' عرض کی: وہ ہماری طرح صوم و صلاۃ کے پابند ہیں، مگر وہ صدقہ دیتے اور غلام و لونڈی آزاد کرتے ہیں جو ہم بوجہ فقر نہیں کر سکتے تو آپ نے فرمایا: ''کیا میں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ (جس کے کرنے سے) انہیں بھی پا لو گے اور بعد والوں سے بھی آگے نکل جاؤ گے اور تم سے کوئی افضل نہ ہو سکے گا، مگر وہ جس نے تمہاری طرح یہ کیا؟'' عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: ''ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ مرتبہ اللہ کی تسبیح، تحمید اور تکبیر کیا کرو۔'' کہتے ہیں: کچھ مدت کے بعد وہ پھر آئے اور عرض کی کہ ہمارے مالدار بھائیوں کو بھی اس عمل کا پتہ لگ چکا ہے، اس پر آپ نے فرمایا: ''پھر یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے وہ عطا کرے۔'' سمی کہتے ہیں: میں نے اپنے ایک رشتہ دار کو یہ حدیث سنائی تو وہ بولا: تمہیں اس میں وہم لگا ہے، انہوں نے تکبیر کا (۳۳ نہیں بلکہ) ۳۴ مرتبہ کہا تھا، کہتے ہیں: میں ابو صالح کی طرف واپس ہوا اور یہ بات گوشگزار کی، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: اللہ اکبر، اور سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ان سب کا مجموعہ تینتیس بنے گا۔[3] متفق علیہ

⑩ یہ بھی بصحت ثابت ہے کہ پچیس پچیس مرتبہ ان تینوں کا ورد کرے اور پچیس مرتبہ ہی درج ذیل کا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ»[4]

⑪ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو آسان سی خصلتیں ہیں، جس نے ان پر محافظت کی (یعنی دائمی عمل کیا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' عرض کی: وہ کیا ہیں؟ فرمایا: ''ہر فرض نماز کے بعد دس دس مرتبہ اللہ کی حمد، تکبیر اور تسبیح بیان کرو، اسی طرح جب (سونے کے لیے رات کو) اپنے بستر پر جاؤ تو سو دفعہ تسبیح، تکبیر اور تحمید کرو تو یہ کل ڈھائی سو (ایک دن میں) بنیں گی، مگر میزان میں یہ ڈھائی ہزار شمار ہوں گی۔'' پھر آپ نے پوچھا: ''کیا کوئی ہر روز ڈھائی ہزار گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: ایسے تو کم ہی ہوں گے، فرمایا: ''کئی دفعہ نماز کے وقت شیطان آڑے آ جاتا اور کئی کام

---

① صحيح البخاري: ٨٤٣؛ صحيح مسلم: ٥٩٧. ② صحيح مسلم: ٥٩٦. ③ صحيح البخاري: ٨٤٣؛ صحيح مسلم: ٥٩٥. ④ صحيح، سنن ترمذي: ٣٤١٣؛ سنن نسائي: ١٣٤٩.

کاج یاد کراتا ہے تو وہ اسے نہیں کر پاتا، اسی طرح سوتے وقت بھی کئی دفعہ شیطان آ کر جلدی سے سلا دیتا ہے اور وہ اسے نہیں کرتا۔'' راوی کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ یہ ورد ہاتھ کی انگلیوں پر گنا کرتے تھے۔① اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔

⑫ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پاس خادم لینے کا مطالبہ لے کر آئے جو ان کے کاموں میں ہاتھ بٹائے اور یوں ان کا بوجھ ہلکا ہو، نبی کریم ﷺ نے انکار کر دیا، پھر فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس مطالبہ سے بہتر ایک عمل نہ بتلاؤں؟'' عرض کی: کیوں نہیں! فرمایا: ''یہ کچھ کلمات ہیں جو جبریل علیہ السلام نے مجھے سکھلائے ہیں: تم دونوں ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ تسبیح، تحمید اور تکبیر کا ورد کیا کرو اور جب اپنے بستر پر جاؤ، تب تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کا ورد کرو۔'' پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! جب سے میں نے یہ کلمات رسول اللہ ﷺ سے سیکھے میں نے انہیں نہیں چھوڑا۔②

⑬ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مغرب اور صبح کی نمازوں کے بعد جانے سے قبل «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ» دس مرتبہ کہا اس کے لیے ہر ایک کے عوض دس حسنات لکھی جاتی ہیں، دس برائیاں محو کی جاتی ہیں اور دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور یہ ورد ہر مکروہ اور شیطان رجیم سے اس کے لیے بچاؤ کا سبب بنتا ہے، شرک کے علاوہ کوئی گناہ اسے ہلاک نہیں کر سکتا اور یہ ورد کرنے والا عمل کے لحاظ سے سب سے افضل ہوگا اِلّا یہ کہ کوئی اس سے بھی بڑھ کر اور افضل عمل کرے۔''③ احمد اور ترمذی نے اس کا نحو سوائے ''بِيَدِهِ الْخَيْرُ'' کے نقل کیا۔

⑭ مسلم بن حارث اپنے والد سے راوی ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم صبح کی نماز پڑھو تو کسی سے کلام کرنے سے پیشتر سات مرتبہ «اَللّٰهُمَّ أَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ» کا ورد کرو، اگر اس دن تمہاری وفات ہوگئی تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے دوزخ سے نجات کا پروانہ لکھ دیں گے اور یہی عمل شروع میں اس اضافہ کے ساتھ: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، أَللّٰهُمَّ أَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ» مغرب کی نماز کے بعد کرو، اگر اسی رات وفات ہوگئی تو اللہ آگ سے نجات کا پروانہ لکھ دیں گے۔''④ اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا۔

⑮ ابو حاتم راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز سے پھرنے کے بعد یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِيْ وَأَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ جَعَلْتَ فِيْهَا مَعَاشِيْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ نَقْمَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا

① صحيح، سنن أبي داود: ٥٠٦٥؛ سنن ترمذي: ٣٤١٠. ② صحيح، مسند أحمد: ٨٣٨؛ شعیب ارناؤط نے صحیح قرار دیا ہے۔ ③ حسن سنن ترمذي: ٣٤٧٤؛ مسند أحمد: ٤/ ٢٢٧. ④ ضعيف، سنن أبي داود: ٥٠٧٩؛ مسند أحمد: ٤/ ٢٣٤.

مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ» ''اے اللہ! میرے لیے میرا دین سنوار دے، جسے تو نے میرے بچاؤ کا سبب بنا دیا اور میری دنیا کو سنوار دے، جس میں تو نے میری معیشت اور زندگی مقرر کی، اے اللہ! میں تیری رضا مندی کے ذریعے تیرے غصے اور تیرے عفو کے ذریعے تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں، جو تو دے اسے روکنے والا کوئی نہیں جو تو روک لے اس کو کوئی دینے والا نہیں اور دولت مند کی مالداری اسے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔''①

⑯ بخاری اور ترمذی نے روایت نقل کی کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں کو اس طرح یہ درج ذیل کلمات سکھلاتے جیسے معلم لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھلاتا ہے اور کہتے: نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد ان کا ورد کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ أَنْ أُرَدَّ إِلىٰ أَرْذَلِ الْعُمْرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ» ''اے اللہ! میں تیرے ساتھ بخل اور بزدلی سے پناہ مانگتا ہوں اور اس امر سے کہ نہایت ناتوانی کی عمر کو پہنچوں اور دنیا کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے۔''②

⑰ ابوداود اور حاکم نے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد یہ ورد کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَدَنِيْ، اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ سَمْعِيْ، اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَصَرِيْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ» ''اے اللہ! میرے بدن، سماعت اور بصارت کو سلامت رکھنا، اے اللہ! میں تیرے ساتھ کفر، فقر اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتا ہوں تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔''③

⑱ احمد، ابوداود اور نسائی نے ایسی سند کے ساتھ جس میں داؤد طفاوی ضعیف راوی ہے۔ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ أَنَا شَهِيْدٌ أَنَّكَ الرَّبُّ وَحْدَكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ أَنَا شَهِيْدٌ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ أَنَا شَهِيْدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ اِجْعَلْنِيْ مُخْلِصاً لَكَ وَأَهْلِيْ فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ مِنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اِسْمَعْ وَاسْتَجِبْ اَللّٰهُ الْأَكْبَرُ الْأَكْبَرُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ اَللّٰهُ الْأَكْبَرُ الْأَكْبَرُ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اَللّٰهُ الْأَكْبَرُ الْأَكْبَرُ» ''اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہ ہوں کہ تیرا کوئی شریک نہیں، تو اکیلا رب ہے اور گواہ ہوں کہ محمد (ﷺ) تیرے بندے اور رسول ہیں، اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہ ہوں کہ سب بندے بھائی بھائی ہیں تو مجھے اور میرے اہل کو اخلاص کی دولت عطا فرما، دنیا و آخرت کی ہر ساعت میں، اے ذو الجلال والاکرام! ہماری پکار سن اور قبول کر، اللہ سب سے بڑا ہے اور ارض و سما کا نور ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، مجھے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''④

---

① ضعيف، سنن نسائی: ١٣٤٦. ② صحيح البخاری: ٦٣٦٥؛ سنن ترمذی: ٣٥٦٧. ③ صحيح، سنن أبی داود: ٥٠٩٠. ④ ضعيف، سنن أبی داود: ١٥٠٨؛ مسند أحمد: ٤/ ٣٦٩.

⑲ احمد، ابن ابی شیبہ اور ابن ماجہ نے ایک مجہول راوی والی سند کے ساتھ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نمازِ صبح سے سلام پھیرنے کے بعد کہا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ عِلْماً نَافِعاً، وَرِزْقاً وَاسِعاً، وَعَمَلاً مُتَقَبَّلاً)) ''اے اللہ! میں تجھ سے علمِ نافع، رزقِ واسع اور قبول عمل کا سوالی ہوں۔''[1]

تطوع (یعنی غیر واجب نماز، مثلاً: سنتیں اور نوافل)

① تطوع کی مشروعیت

تطوع کی مشروعیت اس لیے ہوئی تا کہ فرائض میں واقع ہونے والی کوتاہیوں کے ازالہ کا باعث اور ان کا عوض ہوں، پھر اللہ کے لیے نماز کے قیام میں وہ فضیلت ہے جو دیگر عبادات میں نہیں، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزِ قیامت اعمالِ بنی آدم میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا، حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے لیکن فرشتوں سے فرمائے گا: میرے بندے کی نمازوں کو دیکھو کیا انہیں پورے طور پر ادا کرتا رہا یا کوئی نقص اور کوتاہی کی؟ اگر تو نمازیں پوری نکلیں تو ان پر مکمل کی مہر لگ جائے گی اور اگر نقص و کمی ہوئی تو اللہ کہے گا: دیکھو اس کے نامہ اعمال میں کیا تطوع ہیں؟ اگر ہوئے تو ان کے ساتھ اس کمی کو دور کیا جائے گا، پھر اسی نہج پہ دیگر اعمال کا حساب ہوگا (یعنی فرض اعمال کی کوتاہی اور کمی کو نفلی اسی کی نظیر اعمال سے دور کیا جائے گا اگر ہوئے تو)[2] '' اسے ابوداود نے تخریج کیا، سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بندے کو نماز پڑھتے ہوئے اللہ کا نہایت تقرب حاصل رہتا ہے اور جب تک وہ نماز میں ہو، رحمت اس پہ سایہ فگن رہتی ہے،[3] اسے احمد و ترمذی نے نقل کیا، امام سیوطی رحمہ اللہ کے بقول یہ صحیح ہے، مالک رحمہ اللہ موطا میں ناقل ہیں: مجھے یہ حدیث پہنچی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''استقامت کا مظاہرہ کرو اور جان لو کہ نماز تمہارا سب سے بہتر عمل ہے اور وضو پر محافظت نہیں کرتا سوائے مومن کے۔''[4] مسلم نے سیدنا ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا: مانگ لو جو مانگنا ہے۔'' عرض کی: میں جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں، فرمایا: ''کچھ اور؟'' میں نے کہا: بس یہی! فرمایا: ''تب کثرتِ سجود کے ساتھ میری معاونت کرو۔''[5]

② غیر فرض نمازیں گھر میں ادا کرنے کا استحباب

احمد اور مسلم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھر کے لیے بھی نمازوں میں سے کچھ حصہ مقرر کرو، اللہ تعالیٰ اس پر خیر عطا فرمائے گا۔''[6] احمد کے ہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح، سنن ابن ماجه: ٩٢٥؛ مسند أحمد: ٢٦٦٠٢. [2] صحيح، سنن أبى داود: ٨٦٤؛ سنن ابن ماجه: ١٤٢٥. [3] ضعيف، سنن ترمذى: ٢٩١١؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٦٨. [4] صحيح، مسند أحمد: ٢٢٤١٤.
[5] صحيح مسلم: ٤٨٩. [6] صحيح مسلم: ٧٧٨؛ سنن ابن ماجه: ١٣٧٦.

''آدمی کا نفل عبادت گھر میں ادا کرنا نور ہے تو جو چاہے اپنے گھر کو منور بنالے۔''[1] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گھروں میں بھی کچھ نمازیں پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔''[2] اسے احمد اور ابو داود نے تخریج کیا۔ ابوداود نے بسندِ صحیح سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کا گھر میں نماز ادا کرنا، میری اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں بھی نماز ادا کرنے سے افضل ہے، ماسوائے فرض نمازوں کے۔''[3] ان احادیث سے نفل اور سنتیں گھروں میں ادا کرنے کا استحباب عیاں ہوا اور یہ کہ گھروں میں ان کی ادائیگی مساجد میں ادائیگی سے افضل ہے، بقول امام نووی رحمہ اللہ: نوافل کی گھر میں ادائیگی پر ترغیب دلائی، کیونکہ وہاں کسی طرح کی ریا کاری کا خدشہ اور شائبہ نہ ہوگا اور اس میں اعمال ضائع کرنے والے امور سے زیادہ بچت ہے، پھر اس وجہ سے گھروں میں برکت ہوگی اور رحمت کے فرشتوں کا نزول ہوگا اور شیطان بھاگے گا۔

③ تطوع نمازوں میں بجائے رکعتیں زیادہ پڑھنے کے لمبا لمبا قیام کرنا افضل ہے

جماعت نے ماسوائے ابوداود کے سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ اتنا لمبا قیام کرتے تھے، حتی کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، اس بابت پوچھا گیا تو فرمایا: ''کیا میں اللہ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟''[4] ابوداود نے سیدنا عبداللہ بن حُبْشی خثعمی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: ''لمبا قیام (یعنی نماز کا)'' عرض کی گئی: صدقہ کس قسم کا افضل ہے؟ فرمایا: ''جو غریب شخص اپنی محنت کی کمائی سے دے۔'' پھر پوچھا: ہجرت کون سی افضل ہے؟ فرمایا: ''جس نے اللہ کی محرمات کا ہجراں کیا۔'' کہا گیا: جہاد کون سا افضل ہے؟ فرمایا: ''جس نے اپنے مال و جان کے ساتھ مشرکین سے جہاد کیا۔'' کہا گیا: شہادت کون سی اشرف ہے؟ فرمایا: ''جس کا خون بہایا گیا اور اس کا گھوڑا کاٹا گیا۔''[5] اسے ابوداود اور احمد نے نقل کیا۔

④ بیٹھ کر تطوع نماز پڑھنے کا جواز

قیام پر قدرت رکھنے کے باوجود بیٹھ کر تطوع ادا کرنا جائز ہے اور یہ بھی کہ بعض ارکان کی ادائیگی بیٹھے ہوئے اور بعض کی کھڑے ہوئے کرے، اگر ایک رکعت میں ایسا کیا بایں طور کہ بعض حصہ (یا قیام کا بعض حصہ) کھڑے ہو کر اور بعض حصہ بیٹھ کر ادا کیا، یہ سب جائز ہے اور بیٹھے بھی جس طرح چاہے، مگر افضل تربُّع ہے (یعنی دوزانو بیٹھنا) مسلم نے علقمہ سے نقل کیا کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: نبی کریم ﷺ اگر بیٹھ کر نماز پڑھتے تو دو رکعتوں میں آپ کا فعل کیا تھا؟ کہا: آپ قراءت کرتے رہتے (یعنی بیٹھ کر) حتی کہ جب رکوع کا ارادہ فرماتے تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے،[6] احمد اور

---

① ضعيف، مسند أحمد: ١/١٤. ② صحيح البخاري: ٤٣٢، صحيح مسلم: ٧٧٧. ③ صحيح، سنن أبي داود: ١٠٤٤. ④ صحيح البخاري: ١١٣٠، صحيح مسلم: ٢٨٢٠. ⑤ صحيح، سنن ابي داود: ١٤٤٩، مسند أحمد: ٣/ ٤١٢، ٤١٢. ⑥ صحيح مسلم: ٧٣١.

اصحابِ سنن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا: کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی قیامِ شب میں بیٹھ کر قراءت کرتے نہ دیکھا تھا، مگر جب عمر رسیدہ ہو گئے تو اکثر بیٹھ کر قراءت کرنے لگے، جب چالیس یا تیس آیات کی قراءت باقی ہوتی تو کھڑے ہو جاتے اور ان کی قراءت کر کے رکوع میں چلے جاتے۔[1]

⑤ تطوع کی اقسام

تطوع کی دو اقسام ہیں: مطلق تطوع اور مقید تطوع، مطلق وہ ہے جس میں نماز والی نیت پر اقتصار کیا جاتا ہے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر تطوع نماز شروع کی مگر تعداد کی نیت نہ کی تھی تو اسے چاہیے کہ ایک رکعت کے بعد سلام پھیر دے اور یہ بھی اسے اختیار ہے کہ دو، تین یا اس سے زائد حتی کہ سو یا ہزار رکعات پڑھے، اگر نامعلوم تعداد میں رکعتیں پڑھتا رہا (یعنی بغیر حساب کے) پھر ارادہ ہوا کہ اب سلام پھیر دے تو یہ بلا اختلاف صحیح ہے، ہمارے اصحاب کے ہاں یہ بالاتفاق ہے، ''الاملاء'' میں اس بارے امام شافعی رحمہ اللہ کی نص ہے، بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے کثیر تعداد میں رکعتیں ادا کیں، پھر جب سلام پھیرا تو احنف بن قیس رحمہ اللہ ان سے کہنے لگے: کیا آپ کو یاد ہے کہ طاق عدد پر سلام پھیرا ہے یا جفت پر؟ انہوں نے کہا: اگر میں نہیں جانتا تو میرا اللہ تو جانتا ہی ہے، میں نے اپنے خلیل سیدنا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ یہ کہتے ہوئے رونے لگے۔ وہ فرماتے تھے: ''جس نے اللہ کے لیے ایک سجدہ کیا، اللہ اس کے ساتھ اسے ایک درجہ رفعت عطا کرے گا اور ایک گناہ اس سے محو کر ڈالے گا۔''[2] اسے دارمی نے اپنی مسند میں بسندِ صحیح نقل کیا، البتہ مسند میں ایک راوی کے عدول ہونے کے بارے اختلافِ اقوال ہے اور جو مقید تطوع ہے، اس کی مزید ذیلی اقسام میں سے ایک وہ جو فرائض کی تبع میں مشروع کی گئیں، انہیں سنتِ راتبہ کہا جاتا ہے اور ان میں نماز پنجگانہ کی سنتیں شامل ہیں، ذیل میں ان کا تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے:

فجر کی سنتیں

① فجر کی سنتوں کی فضیلت

فجر کی سنتوں کی محافظت کی فضیلت میں متعدد احادیث وارد ہیں، ذیل میں ان کا ذکر کیا جا رہا ہے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز فجر سے قبل دو رکعت کی ادائیگی کے بارے میں روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''یہ مجھے تمام دنیا سے بڑھ کر محبوب ہیں۔''[3] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فجر کی سنتیں نہ چھوڑو، خواہ گھوڑے تم پر چڑھ دوڑیں۔''[4] اسے

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٩٥٣؛ سنن ابن ماجه: ١٢٢٧. [2] صحیح، مسند أحمد: ٥/ ١٦٤؛ سنن الدارمی: ١٥٠٢؛ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [3] صحیح مسلم: ٧٢٥؛ مسند أحمد: ٧/٥٠، ٥١. [4] ضعیف، سنن أبی داود: ١٢٥٨؛ مسند أحمد: ٢/ ٤٠٥.

احمد، ابو داود، بیہقی اور طحاوی نے تخریج کیا، مطلب یہ کہ کتنا ہی شدید عذر ہو، اگرچہ سامنے دشمن ہو تب بھی ان کا ترک نہ کرو۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نوافل میں سے کسی کی ادائیگی کا فجر کی سنتوں سے بڑھ کر خیال نہ رکھتے تھے، اسے شیخین، احمد اور ابو داود نے نقل کیا۔

④ انہی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فجر کی دو سنتیں دنیا وما فیہا سے بہتر ہیں۔''[1] اسے احمد، مسلم، ترمذی اور نسائی نے نقل کیا۔

⑤ احمد و مسلم کے ہاں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خیر کی کسی چیز کی طرف فجر کی سنتوں سے بڑھ کر جلدی کرنے والا نہیں دیکھا۔[2]

② انہیں ہلکا رکھا جائے

نبی کریم ﷺ کی سیرت وہدی سے معروف یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کی قراءت کو ہلکا رکھتے تھے، چنانچہ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے ہاں فجر کی سنتیں پڑھتے اور انہیں ہلکا رکھتے، نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی انہیں ہلکا رکھا کرتے تھے۔[3] اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر سے قبل دو سنتیں ادا کرتے اور انہیں اتنا ہلکا رکھتے کہ مجھ شک ہوتا کہ آپ نے ان میں فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں۔[4] اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا، انہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ان میں اتنی دیر ہی قیام کرتے جتنی مدت میں سورۂ فاتحہ پڑھی جا سکے،[5] اسے احمد، نسائی، بیہقی، مالک اور طحاوی نے تخریج کیا۔

③ فجر کی سنتوں میں کیا پڑھا جائے؟

اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے درج ذیل وارد ہے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی سنتوں میں ﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے اور انہیں آہستگی سے پڑھتے۔[6] اسے احمد اور طحاوی نے نقل کیا، آپ انہیں فاتحہ کے بعد پڑھتے تھے، جیسا کہ گزرا فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

② انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''یہ دونوں خوب اچھی سورتیں ہیں۔'' اور آپ فجر کی سنتوں میں ان کی قراءت کرتے یعنی سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص کی۔''[7] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

---

① صحيح مسلم:٧٢٥؛سنن ترمذي: ٤١٦. ② صحيح مسلم: ٧٢٤؛ مسند أحمد: ٢٥٣٢٧. ③ صحيح البخاري: ١١٧٣؛ صحيح مسلم: ٧٢٣. ④ صحيح البخاري: ١١٧١؛ صحيح مسلم: ٧٢٣؛ مسند أحمد: ٦/ ١٨٦.
⑤ ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٢١٧؛ شرح معاني الآثار: ١/ ٢٩٧. ⑥ ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ١٧٤؛ شرح معاني الآثار: ١/ ٢٩٧. ⑦ صحيح، سنن ابن ماجه: ١١٥٠؛ مسند أحمد: ٦/ ٢٣٩.

③ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص فجر کی سنتیں پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور پہلی رکعت میں اس نے سورۂ کافرون پڑھی، جب پوری سورت پڑھ لی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوئی'' دوسری میں اس نے سورۂ اخلاص پڑھی تو آپ نے فرمایا: ''یہ اپنے رب پر ایمان لانے والا ہے۔'' طلحہ کہتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ ان دو رکعتوں میں انہی کی قراءت کروں۔[1] اسے ابن حبان اور طحاوی نے نقل کیا۔

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں میں

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾(البقرة:١٣٦)

اور سورۂ آل عمران کی آیت:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾(آل عمران:٦٤)

کی قراءت کرتے تھے۔[2] اسے مسلم نے نقل کیا تو مراد یہ کہ فاتحہ کے بعد ایک رکعت میں سورۂ البقرۃ کی اور دوسری میں سورۂ آل عمران کی مذکورہ ایک آیت پڑھتے تھے۔

⑤ انہی سے مروی ہے کہ پہلی میں یہی مذکورہ اور دوسری میں

﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾(آل عمران: ٥٢)

پڑھی،[3] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

⑥ صرف فاتحہ پر اقتصار کر لینا بھی درست ہے، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت گزری کہ آپ کا قیام فاتحہ کی قراءت کے بقدر ہوتا تھا (یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صرف فاتحہ پڑھی، راقم)۔

④ ان سنتوں کے بعد دعا کرنا

امام نووی رحمہ اللہ ''اذکار'' میں لکھتے ہیں: ابن سنی کی کتاب ''عمل الیوم واللیلۃ'' میں ابوالملیح عامر بن اسامہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فجر کی سنتیں پڑھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب ہی فجر کی سنتیں ادا کر رہے تھے، پھر فارغ ہو کر یہ دعا پڑھی: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَمُحَمَّدٍ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) أَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ» تین مرتبہ یہ کلمات کہے،[4] اسی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جمعہ کی صبح نماز فجر سے قبل

---

[1] صحیح، ابن حبان: ٢٤٦٠؛ شرح معانی الآثار: ١/٢٩٨. [2] صحیح مسلم: ٧٢٧. [3] صحیح مسلم: ٧٢٧؛ سنن أبی داود: ١٢٥٩. [4] ضعیف جدًا، عمل الیوم واللیلة لابن السنی: ١٠٣.

تین مرتبہ یہ کہا: «أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ» اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے گا، چاہے سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔''[1]

⑤ سنتیں پڑھ کر کچھ دیر لیٹنا

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتیں ادا کر کے اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے تھے،[2] (آپ دراصل قبل ازیں قیامِ شب میں مصروف ہوتے تھے، پھر اذان کے بعد فجر کی سنتیں پڑھ کر ذرا تازہ دم ہونے کو لیٹ جاتے تا آنکہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اقامت کی اطلاع دینے آتے، اسے استحباب کا درجہ دینا یا فجر کی سنتوں کا خاصہ سمجھنا جو بعض لوگوں نے سمجھا ہوا ہے۔ سخت محلِ نظر ہوگا، راقم) اسے جماعت نے نقل کیا، یہ بھی انہی سے مروی ہے کہ فجر کی سنتیں پڑھ کر اگر میں لیٹی ہوتی تو آپ بھی تھوڑی دیر لیٹ جاتے اور اگر میں جاگ رہی ہوتی تو مجھ سے باتیں کرتے۔[3] (اس سے بھی میرے مؤقف کی تائید ملی) اس لیٹ جانے کے حکم بارے میں نہایت اختلاف کیا گیا ہے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں مستحب ہے جس نے سنتیں گھر میں ادا کی ہوں نہ کہ وہ جس نے مسجد میں آکر پڑھیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: بعض سلف گھر میں اس کے استحباب کے قائل ہیں، نہ کہ مسجد میں، یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور بعض مشائخ نے اس کی اس امر کے ساتھ تقویت کی کہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے مسجد میں ایسا کیا ہو، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ مسجد میں یہ کرنے والوں کو کنکری مارا کرتے تھے، اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، امام احمد رحمہ اللہ سے اس بارے میں سوال ہوا تو کہا: میں یہ نہیں کرتا، اگر کوئی کرے تو اچھی بات ہے۔

⑥ فجر کی سنتوں کی قضا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھیں، حتی کہ سورج نکل آیا تو وہ (اب) انہیں ادا کر لے (یعنی قضا دے)۔''[4] اسے بیہقی نے نقل کیا، بقول امام نووی رحمہ اللہ اس کی سند جید ہے (بقول حاکم اس کی سند شیخین کی شرط پر ہے) سیدنا قیس بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ نمازِ صبح کے لیے نکلے تو پایا کہ جماعت شروع ہے، انہوں نے سنتیں ادا نہ کی تھیں تو جماعت میں شامل ہو گئے، پھر جب جماعت ختم ہوئی تو (اسی وقت) اٹھ کر سنتیں ادا کر لیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ کیا اور پوچھا: ''یہ کون سی نماز ہے؟'' عرض کی کہ (پہلے) سنتیں نہ پڑھ سکا تھا تو آپ خاموش رہے، کچھ نہ کہا، (گویا یہ تقریری حدیث ہوئی)،[5] اسے احمد، ابن حبان اور ماسوائے نسائی کے اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول حافظ عراقی اس کی سند حسن ہے، احمد اور شیخین نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ایک سفر کے دوران میں سب نمازِ صبح سے سوتے

---

① ضعيف جدًا، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٨٣. ② صحيح البخاري: ١١٦٠؛ صحيح مسلم: ٧٣٦.
③ صحيح البخاري: ١١٦١؛ صحيح مسلم: ٧٤٣. ④ صحيح، السنن الكبرى للبيهقي: ٢/٤٨٤؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٧٤. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ١٢٦٧؛ سنن ترمذي: ٤٢٢؛ سنن ابن ماجه: ١١٥٤.

رہ گئے، سورج کی گرمی سے جب بیدار ہوئے تو تھوڑی دیر رکے حتی کہ سورج ذرا بلند ہوا، پھر آپ نے مؤذن سے اذان کہلوائی تو اولاً سنتیں ادا کیں، پھر فجر کی جماعت کرائی،[1] احادیث کے ظاہر سے معلوم پڑتا ہے کہ ان سنتوں کی قضا سورج طلوع ہونے سے قبل بھی دے لینا جائز ہے، جیسا کہ بعد میں بھی، چاہے یہ کسی عذر کے سبب فوت ہوئی ہوں یا بغیر عذر کے اور چاہے اکیلی یہی فوت ہوئی ہوں یا نمازِ فجر بھی۔

ظہر کی سنتیں

ان کی بابت وارد ہے کہ یہ چار، چھ یا آٹھ ہیں، ذیل میں ان کا مفصل بیان کیا جاتا ہے:

چار کی تعداد ہونے کے بارے میں روایات

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے (نماز پنجگانہ کی سنتوں کے ضمن میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعات یاد کی ہیں: دو رکعتیں قبل از ظہر اور دو اس کے بعد، دو رکعتیں مغرب کی نماز کے بعد اور دو عشا کے بعد گھر واپس آ کر اور دو ہی نمازِ فجر سے قبل۔[2] اسے بخاری نے نقل کیا۔

② مغیرہ بن سلمان سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا: وہ کہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل دو رکعتیں اور اس کے بعد بھی دو رکعتیں نہ چھوڑتے تھے، اسی طرح دو رکعتیں نمازِ مغرب اور دو نمازِ عشا کے بعد اور دو نمازِ فجر سے قبل،[3] اسے احمد نے جید سند سے نقل کیا۔

چھ عدد ہونے کے بارے میں روایات

① عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز (یعنی فرض کے علاوہ) کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: آپ ظہر سے قبل چار اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اسے احمد اور مسلم وغیرہما نے نقل کیا۔

② سیدہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایک دن و رات میں (فرائض کے علاوہ) بارہ رکعتیں پڑھیں، اس کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ چار قبل از ظہر، دو اس کے بعد، دو مغرب اور دو عشا کے بعد اور دو نمازِ فجر سے قبل۔''[4] اسے ترمذی نے نقل کیا اور لکھا کہ یہ حسن صحیح ہے، مسلم نے اسے مختصراً نقل کیا۔

آٹھ عدد ہونے کے بارے میں روایات

① سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے چار قبل از ظہر اور چار اس کے بعد پڑھیں،

---

① صحيح البخارى: ٣٤٤، صحيح مسلم: ٦٨٢. ② صحيح البخارى: ١١٨٠. ③ صحيح، مسند أحمد: ٥١٢١، شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ ④ صحيح مسلم: ٧٢٨، سنن ترمذى: ٤٢٥.

اللہ آگ پر اس کا گوشت حرام کر دے گا۔“[1] اسے احمد اور اصحاب سنن نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ صحیح ہے۔

قبل از ظہر چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت

① سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے منقول ہے کہ وہ نمازِ ظہر سے قبل چار رکعات پڑھا کرتے تھے، کسی نے کہا: آپ ان پر ہمیشگی کرتے ہیں؟ کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی کرتے دیکھا ہے، میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ”یہ ایسی ساعت ہے کہ اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے کہ اس ساعت میں میرا کوئی نیک عمل اوپر لے جایا جائے۔“[2] اسے احمد نے جید سند کے ساتھ نقل کیا۔

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار اور فجر سے قبل کی دو رکعتیں کسی بھی حال میں چھوڑا نہ کرتے تھے۔[3] اسے احمد اور بخاری نے نقل کیا، انہی سے مروی ہے کہ آپ ظہر سے قبل چار رکعات پڑھا کرتے تھے ان میں طویل قیام کرتے اور عمدگی سے رکوع وسجود کرتے۔[4] تو ان کا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سابق الذکر حدیث کے ساتھ تعارض نہیں، جس میں تھا کہ آپ ظہر سے قبل دو رکعتیں ادا کرتے تھے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں رقم طراز ہیں: اولی یہ ہے کہ انہیں دو حالتوں پر محمول کیا جائے تو کبھی آپ دو ادا فرماتے اور کبھی چار، بعض نے یہ تطبیق دی کہ دو گھر میں اور دو مسجد میں ادا کرتے تھے تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ملاحظہ میں مسجد والی دو روایتیں آئیں تو ان کا بیان کیا، یہ بھی محتمل ہے کہ گھر میں چار اور مسجد میں دو ادا کرتے ہوں، احمد اور ابو داود کے ہاں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں ہے کہ آپ گھر میں ظہر سے قبل چار رکعات پڑھا کرتے تھے، ابو جعفر طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اکثر احوال میں آپ نے چار پڑھی ہیں، جب کہ بعض اوقات دو پر اقتصار کیا، اگر کوئی چار پڑھے تو افضل یہ ہے کہ ہر دو کے بعد سلام پھیرے، کیونکہ آپ کا فرمان ہے: «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنٰى مَثْنٰى» ”رات اور دن کی نماز دو دو رکعتیں ہے۔“[5] اسے ابو داود نے بسندِ صحیح نقل کیا، لیکن چار اکٹھی پڑھنا بھی جائز ہے۔

ظہر کی سنتوں کی قضا

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی وجہ سے ظہر سے قبل چار رکعتیں ادا نہ کر پاتے تو ظہر کے بعد پڑھ لیتے،[6] اسے ترمذی نے نقل کی اور کہا یہ (حسن) غریب ہے، ابن ماجہ نے ان سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر قبل از ظہر کی چار سنتیں رہ جاتیں تو بعد از ظہر کی دو سنتوں کے بعد ان کی قضا دیتے۔[7] یہ ہے نماز سے قبل کی سنتوں کی قضا کے بارے، جہاں تک بعد والی سنتوں کی قضا ہے تو اس بارے میں احمد نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت نقل کی: کہتی ہیں کہ

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٢٦٩؛ سنن ترمذي: ٤٢٧؛ ابن ماجه: ١١٦٠. ② صحيح، مسند أحمد: ٢١٨؛ شعيب ارناؤط حفظہ اللہ نے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ ③ صحيح البخاري: ١١٨٢؛ مسند أحمد: ٦/ ٦٣. ④ ضعيف، سنن ابن ماجه: ١١٥٦؛ مسند أحمد: ٦/ ٤٣. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ١٢٩٥؛ سنن ترمذي: ٤٢٤، ٥٩٧. ⑥ حسن، سنن ترمذي: ٤٢٦. ⑦ ضعيف، سنن ابن ماجه: ١١٥٨.

نبی کریم ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی، پھر میرے گھر تشریف لے آئے جبکہ یہ میرا (باری کا) دن تھا تو دو ہلکی رکعتیں ادا کیں، ہم نے پوچھا: یہ کون سی رکعتیں ہیں، کیا کوئی نیا حکم ملا ہے؟ فرمایا: ''یہ ظہر کے بعد والی دو سنتیں ہیں، لیکن آج مال تقسیم کرنے میں مشغول ہونے کے باعث ادا نہ کرسکا تھا حتی کہ عصر کا وقت ہو گیا تو مجھے اچھا نہ لگا کہ یہ چھوٹ جائیں۔''[1] اسے بخاری، مسلم اور ابوداود نے نقل کیا۔

مغرب کی سنتیں

نمازِ مغرب کے بعد دو رکعتیں ادا کرنا مسنون ہے، کیونکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں گزرا کہ یہ اس نماز میں سے ہے جسے نبی کریم ﷺ کسی صورت نہ چھوڑتے تھے، اس کی قراءت کے بارے مستحب یہ ہے کہ فاتحہ کے بعد سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی جائے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں شمار نہیں کرسکتا کہ نبی کریم ﷺ کو بارہا مغرب کی اور فجر کی سنتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھتے سنا ہے،[2] اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن ہے، یہ بھی مستحب ہے کہ انہیں گھر میں ادا کیا جائے، سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ بنی عبدالاشہل سے ملنے تشریف لائے تو انہیں مغرب کی نماز پڑھائی، سلام کے بعد فرمایا: ''اس کی سنتیں گھروں میں ادا کرو۔''[3] اسے احمد، ابوداود، ترمذی اور نسائی نے تخریج کیا، پہلے ایک روایت میں گزرا کہ آپ بھی انہیں گھر میں ہی ادا کیا کرتے تھے۔

عشاء کی سنتیں

اس بابت گزرا کہ عشاء کی فرضوں کے بعد میں دو سنتیں ہیں۔

غیر مؤکدہ سنتیں

سابق الذکر سنتیں اور رواتب کی ادائیگی مؤکد امر ہے، ان کے علاوہ بھی کئی سنتیں ہیں جو راتبہ ہیں اور ان کی ادائیگی مندوب ہے، لیکن اس پر تاکید نہیں کی گئی، وہ حسبِ ذیل ہیں:

① عصر سے قبل دو یا چار رکعتیں

اس کے بارے متعدد روایات ہیں، مگر سب کی اسانید میں مقال ہے، لیکن کثرتِ طرق کے باوصف ان کا بعض بعض کے لیے مؤید ہے، ان میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو عصر

---

① صحیح البخاری: ۱۲۳۳؛ صحیح مسلم: ۸۳٤. ② صحیح، سنن ترمذی: ٤۳۱؛ سنن ابن ماجہ: ۱۱٦٦.
③ حسن، سنن أبی داود: ۱۳۰۰.

سے قبل چار رکعتیں پڑھے۔''[1] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے حسن قرار دیا اور تخریج کیا، ابن حبان اور ابن خزیمہ نے حکمِ صحت لگایا، اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ عصر سے قبل چار رکعات ادا کیا کرتے تھے اور ہر دو رکعت کے بعد مقرب فرشتوں، انبیاء اور ان کی اتباع کرنے والے مسلمانوں اور مومنوں پر سلام بھیجنے کے ذریعے سے فاصلہ کرتے تھے۔[2] اسے احمد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ان کے یہ حسن ہے، دو سنتوں پر اقتصار کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ عمومی فرمان ہے: ''ہر دو اذانوں (یعنی اذان اور اقامت) کے مابین نماز ہے۔''[3] اسے مسلم نے نقل کیا۔

② مغرب کی نماز سے قبل دو رکعتیں

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نمازِ مغرب سے قبل نماز پڑھو، مغرب کی نماز سے قبل نماز پڑھو'' اور تیسری دفعہ میں اضافہ کیا: ''اس کے لیے ہے جو چاہے۔'' اس امر کو مکروہ سمجھتے ہوئے کہ لوگ انہیں سنت (یعنی مؤکدہ) سمجھ لیں۔[4] ابن حبان کی سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں ادا کیں۔[5] مسلم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم غروبِ آفتاب سے قبل دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ ہمیں دیکھتے مگر نہ روکتے اور نہ ایسا کرنے کا حکم دیتے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: مجموع ادلہ سے انہیں ہلکی رکھنے کا استحباب ملتا ہے، جیسے فجر کی سنتوں کے بارے وارد ہے۔

③ نمازِ عشا سے قبل دو رکعتیں

جماعت نے سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر دو اذانوں (یعنی اذان اور اقامت) کے مابین نماز ہے۔'' تین مرتبہ یہ کہا اور تیسری مرتبہ میں یہ اضافہ کیا: ''اس کے لیے جو چاہے۔''[6] ابن حبان کی سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت گزری کہ ''ہر فرض نماز سے قبل (کم از کم) دو رکعتیں ہیں۔''[7]

فرض نماز کے بعد نفل (اور سنتیں) پڑھنے سے قبل مناسب وقفہ کرنے کا استحباب

اتنا کہ جتنی دیر نماز ادا کرنے میں لگی ہے، ایک صحابی راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نمازِ عصر ادا کی، پھر ایک شخص کھڑا ہوا اور نماز پڑھنے لگا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس پر نظر پڑی تو کہا: بیٹھ جاؤ! کیونکہ اہلِ کتاب اسی لیے ہلاک ہوئے کہ ان کی نمازوں کے لیے فصل و وقفہ نہ تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ابن خطاب نے اچھا کیا۔''[8] اسے احمد نے صحیح سند کے نقل کیا ہے۔

---

① حسن، سنن أبی داود: ۱۲۷۱؛ سنن ترمذی: ٤۳۰. ② حسن، سنن ترمذی: ٤۲۹؛ سنن نسائی: ۸۷۳؛ ابن ماجہ: ۱۱٦۱. ③ صحیح مسلم: ۸۳۸؛ سنن أبی داود: ۱۲۸۳. ④ صحیح البخاری: ۱۱۸۳؛ سنن أبی داود: ۱۲۸۱. ⑤ ضعیف، صحیح ابن حبان: ۱۵۸۸. ⑥ صحیح البخاری: ٦۲۷؛ صحیح مسلم: ۸۳۸. ⑦ صحیح، صحیح ابن حبان: ۲٤۵۵؛ سنن دارقطنی: ۱۰۳٤. ⑧ صحیح، مسند أحمد: ٥/ ۳٦۸.

وتر

① وتر کی فضیلت اور حکم

وتر سنتِ مؤکدہ ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب وتحریص دلائی ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وتر اس طرح لازم نہیں جیسے تمہاری فرض نمازیں ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے وتر پڑھا، پھر فرمایا: ''اے اہلِ قرآن! وتر پڑھا کرو کیونکہ بے شک اللہ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔''[1] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے نقل کیا، ترمذی نے اسے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو وتر کو واجب قرار دیا تو یہ ضعیف مذہب ہے، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی موافقت کی ہو، احمد، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا کہ انصار کے ایک ابومحمد کی کنیت والے شخص نے کہا: وتر واجب ہے تو بنی کنانہ کا ایک شخص مخرجی یہ بات سن کر سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور انہیں بتلایا کہ ابومحمد یہ کہتے ہیں، وہ بولے کہ غلط کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ نے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جو انہیں ادا کرے ان میں سے کچھ بھی ضائع نہ کرے ہلکا سمجھتے ہوئے تو اس کے لیے اللہ کے ہاں عہد ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور جو انہیں ادا نہیں کرتا اس کے لیے ایسا کوئی عہد نہیں، وہ اب اللہ کی مشیت پر ہے چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو بخش دے۔''[2] بخاری اور مسلم نے سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ پانچ نمازیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ایک رات و دن میں فرض کی ہیں۔'' ایک اعرابی نے کہا: کیا کوئی اور نمازیں بھی فرض ہیں؟ فرمایا: ''نہیں! اِلّا یہ کہ تم تطوع (نوافل) ادا کرو۔''[3]

② وتر کا وقت

علماء کا اجماع ہے کہ وتر کا وقت نمازِ عشا کے بعد شروع ہوتا ہے اور یہ فجر تک رہتا ہے، ابوتمیم جیشانی سے منقول ہے کہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ میں کہا: ابوبصرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے تمہاری نمازوں میں ایک نماز کا اضافہ کیا اور وتر ہے تو اسے نمازِ عشا تا نمازِ فجر کے مابین (کسی بھی وقت) ادا کرو۔'' ابوتمیم کہتے ہیں: سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسجد میں موجود سیدنا ابوبصرہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: کیا تم نے یہ بات جو عمرو رضی اللہ عنہ نے کہی کیا نبی کریم ﷺ سے سنی ہے؟ انہوں نے کہا: بالکل! میں نے اسے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے،[4] اسے احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کے ابتدائی حصے میں بھی وتر

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٤١٦؛ سنن ابن ماجه: ١١٦٩. [2] صحیح، سنن أبی داود: ١٤٢٠؛ سنن نسائی: ابن ماجه: ١٤٠١. [3] صحیح البخاری: ٤٦؛ صحیح مسلم: ١١. [4] صحیح، مسند أحمد: ٦/ ٧.

ادا کر لیتے تھے اور اس کے وسط اور آخر میں بھی،① اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا، عبداللہ بن ابوقیس سے منقول ہے کہ میں نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: کئی دفعہ آپ نے رات کے اول حصے میں بھی ادا کیا اور کئی دفعہ اس کے آخر میں بھی، میں نے پوچھا: آپ اس میں کیا پڑھتے تھے، کیا بالسر پڑھتے تھے یا بالجہر؟ کہا: دونوں طرح آپ نے کیا ہے، کئی دفعہ بالسر اور کئی دفعہ بالجہر، اسی طرح کئی دفعہ آپ نہائے، پھر سوئے اور کئی دفعہ صرف وضو کیا اور سو گئے، یعنی حالتِ جنابت ہونے کی صورت میں،② اسے ابوداود، احمد، مسلم اور ترمذی نے تخریج کیا۔

③ اس شخص کے لیے اس کی تعجیل مستحب ہے جو رات کو (تہجد کے لیے) نہیں اٹھتا یا اسے ڈر ہے کہ سوتا رہ جائے گا اور اس شخص کے حق میں تاخیر مستحب ہے جو رات کے آخر میں تہجد کے لیے اٹھتا ہے

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جسے خیال ہو کہ رات کے آخر میں نہ اٹھ سکے گا تو وہ شروع میں ہی (یعنی نمازِ عشا کے ساتھ) وتر ادا کر لے اور جسے یقین ہے کہ اٹھے گا وہ آخر میں ادا کرے کیونکہ آخرِ شب کی نماز محضورہ ہے (یعنی فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں) اور یہ افضل ہے۔'' اسے احمد و مسلم نے نقل کیا، ترمذی اور ابن ماجہ کی انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''آپ وتر کب پڑھتے ہو؟'' کہا: عشا کے بعد شروع میں ہی، پھر پوچھا: ''تم اے عمر؟'' کہا: آخرِ شب میں، فرمایا: ''اے ابوبکر! آپ نے احتیاط پسندی کی اور اے عمر! آپ نے عزیمت کی روش اختیار کی۔''③ اسے احمد، ابوداود اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: مسلم کی شرط پر یہ صحیح ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وتر کے ضمن میں آخری وقت سحر کا وقت ہے کیونکہ یہی افضل ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں گزرا، جسے تمام اصحابِ صحاح ستہ نے تخریج کیا ہے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض اصحاب کو نصیحت فرمائی کہ سونے سے قبل احتیاطاً وتر ادا کر لیا کریں، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں نماز عشا پڑھتے، پھر ایک رکعت وتر اسی وقت ادا کر لیتے اس سے زائد نہ پڑھتے، کسی نے ان سے کہا: اے ابو اسحاق! آپ ہمیشہ ایک رکعت وتر ہی پڑھتے ہیں۔ کہا: ہاں! کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو نہ سوئے حتی کہ وتر پڑھ لے وہ محتاط آدمی ہے۔''④ اسے احمد نے ثقہ روایت والی سند سے نقل کیا۔

④ وتر کی رکعات کی تعداد

امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ وتر تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ، تین اور ایک رکعت بھی مروی ہے۔⑤

---

① ضعیف، مسند أحمد: ٥/ ٢١٥؛ شعیب ارناؤط رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ② صحیح مسلم: ٣٠٧؛ سنن أبی داود: ١٤٣٧. ③ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٣٤؛ مسند أحمد: ٣/ ٣٠٩. ④ صحیح، مسند أحمد: ١/ ١٧٠.
⑤ سنن ترمذی: ٤٥٧.

اسحاق بن ابراہیم (ابن راہویہ) کہتے ہیں: یہ روایت کہ نبی کریم ﷺ تیرہ رکعات کے ساتھ وتر پڑھتے تھے، کا مفہوم یہ ہے کہ آپ تہجد کی نماز تیرہ رکعتیں پڑھتے مع وتر کے یعنی ان منجملہ کے وتر بھی ہوتا تھا تو نمازِ شب کی وتر کی طرف نسبت کر دی گئی (تین وتر ادا کرنے کی صورت میں) جائز ہے کہ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرے، پھر ایک رکعت تشہد وسلام کے ساتھ پڑھے، جیسا کہ تینوں کو اکٹھے دو تشہد اور ایک سلام کے ساتھ ادا کرنا بھی جائز ہے، یہ بھی کہ مسلسل رکعات پڑھتا رہے (یعنی تہجد کی)، پھر (جب ختم کرنا ہو تو) تشہد بیٹھ جائے اور سلام پھیرے بغیر (یعنی شہادت تک پڑھ کے) اٹھ جائے اور ایک رکعت بطورِ وتر پڑھے اور اکٹھا سلام پھیرے، جیسا کہ یہ بھی درست ہوگا کہ تمام رکعات مع وتر کو ایک تشہد اور آخر میں سلام کے ساتھ ادا کرے، یہ سب طریقے جائز اور نبی کریم ﷺ سے وارد ہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صحیح، صریح اور محکم سنت پانچ متصل اور سات رکعات بطورِ وتر پڑھنے کے بارے میں وارد ہے، جیسا کہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سات اور پانچ رکعات وتر پڑھتے اور درمیان میں سلام یا کلام کے ساتھ فصل نہ کرتے تھے۔[1] اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے جید سند کے ساتھ نقل کیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو تیرہ رکعات قیام فرماتے، ان میں سے پانچ رکعات کے ساتھ وتر ادا کرتے اور ان کی ادائیگی کے دوران صرف آخر میں بیٹھتے تھے۔[2] متفق علیہ۔

انہی سے ایک روایت میں ہے کہ آپ رات کو نو رکعات ادا فرماتے، تشہد نہ بیٹھتے اور سلام پھیرتے، پھر سلام کے بعد بیٹھے بیٹھے دو رکعتیں پڑھتے تو یہ کل گیارہ رکعات بنیں، جب آپ عمر رسیدہ ہوئے اور جسم بھاری ہوا تو سات رکعات کے ساتھ وتر پڑھتے اور سلام پھیرتے، پھر سلام کے بعد دو رکعتیں آخر میں ادا کرتے، ایک روایت میں ہے کہ جب جسم بھاری ہوا تو آپ ﷺ سات رکعات کے ساتھ وتر ادا فرماتے اور تشہد نہ بیٹھتے، مگر چھٹی یا ساتویں میں اور سلام صرف ساتویں رکعت میں ہی پھیرتے، ایک روایت کے الفاظ ہیں: سات رکعات پڑھیں اور صرف آخر میں تشہد بیٹھے،[3] اسے جماعت نے نقل کیا، یہ سب احادیث صحیح وصریح ہیں، ان کے معارض کوئی حدیث نہیں، ماسوائے آپ کے اس فرمان کے: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنیٰ مَثْنیٰ» ''رات کی نماز دو دو رکعات ہے۔''[4] یہ صحیح حدیث ہے، لیکن دراصل یہ بات آپ نے نمازِ شب کے بارے سوال کرنے والے کے جواب میں کہی تھی کہ یہ دو دو کر کے ادا کرنی ہے (یعنی ایک ایک کر کے نہیں، گویا کم از کم کی تعداد بتلائی) وتر کی بابت تو اس نے پوچھا ہی نہ تھا اور ان روایات میں جو سات، پانچ، نو اور ایک کا ذکر ہوا تو وہ وتر ہیں اور وتر (حقیقۃً) ایک رکعت کو ہی کہیں گے جو ماقبل سے علیحدہ ہو، اسی طرح متصل پڑھی جانے والی پانچ، سات اور نو کو جیسے مغرب تین متصل پڑھی جانے والی نماز کا اسم ہے، تو اگر پانچ اور سات دو سلاموں کے ساتھ منفصل ہوئیں، جیسے گیارہ رکعات تو وتر اس رکعت کا اسم ہوگا جو اکیلی جدا کر کے ادا کی گئی، جیسے آپ کا فرمان ہے کہ ''نمازِ شب دو دو رکعات ہے۔'' جسے صبح ہو جانے کا خدشہ ہو وہ ایک رکعت

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ١٧١٤؛ سنن ابن ماجہ: ١١٩٢. [2] صحیح البخاری: ١١٤٠؛ صحیح مسلم: ٧٣٤.
[3] صحیح البخاری: ١١١٨؛ صحیح مسلم: ٧٤٦؛ سنن أبی داود: ١٣٤٣. [4] صحیح البخاری: ٩٩٠؛ صحیح مسلم: ٧٤٩.

ادا کر لے، یہ اس کی نماز کو وتر کر دے گی تو یوں آپ کا قول اور فعل باہم متفق ہوا اور بعض نے بعض کی تصدیق کی۔

⑤ وتر کی قراءت

وتر میں فاتحہ کے بعد قرآن میں سے کچھ بھی پڑھا جا سکتا ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ مہجور (یعنی متروک) نہیں تو جہاں سے چاہو وتر میں پڑھو، لیکن تین سورتوں کی قراءت مستحب ہے (کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر انہیں وتر میں پڑھا ہے) تو اگر تین وتر پڑھے تو پہلی میں فاتحہ کے بعد ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ دوسری میں ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور تیسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھے اور معوذتین، کیونکہ احمد، ابو داود اور ترمذی نے حسن قرار دیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی میں سورۃ الاعلیٰ، دوسری میں سورۃ الکافرون اور تیسری میں سورۃ الاخلاص اور معوذتین پڑھتے تھے۔[1]

⑥ دعائے قنوت

پورا سال وتر میں قنوت پڑھنا مشروع ہے، احمد اور اہلِ سنن وغیرہم نے سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک دعا سکھلائی جسے میں وتر میں پڑھا کروں، وہ یہ ہے: «اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ، وَإِنَّهٗ لَايَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ، وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ»[2] بقول ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قنوت کے ضمن میں اس سے احسن چیز منقول نہیں، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس کی اسناد صحیح ہیں، ابن حزم اس کی صحت کے بارے میں متردد تھے، لکھتے ہیں: اگرچہ یہ روایت ان روایات میں سے نہیں جو قابلِ احتجاج ہوں، لیکن ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے سوا (وتر میں پڑھنے کو) کچھ اور نہیں پاتے اور ذاتی رائے کی نسبت ہمیں یہ حدیث زیادہ پسند ہے اگرچہ ضعیف ہی ہو، جیسا کہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا: یہی سیدنا ابن مسعود، ابو موسیٰ، ابن عباس، براء، انس رضی اللہ عنہم، حسن بصری، عمر بن عبد العزیز، سفیان ثوری، ابن مبارک رحمہم اللہ اور حنفیہ کا مسلک ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے۔ بقول نووی رحمہ اللہ دلیل کے لحاظ سے یہ نقطہ نظر قوی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ قائل ہیں کہ صرف رمضان کے دوسرے نصف میں ہی وتر میں قنوت پڑھی جائے کیونکہ ابو داود نے نقل کیا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا (یعنی رمضان کی تراویح میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر) وہ انہیں بیس رکعات پڑھائے اور قنوت نہ کیا کرتے تھے، مگر رمضان کے دوسرے نصف میں، محمد بن نصر کہتے ہیں: میں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے پوچھا: وتر میں دعائے قنوت پڑھنی کب شروع کی جائے؟ کہنے لگے: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر کہیں بھیجا ہوا تھا تو ان کی بابت تشویشناک اطلاعات آئیں تو رمضان کے دوسرے نصف سے وتر میں قنوت کرنے لگے، ان کے لیے دعا کرتے تھے۔

---

① صحیح، سنن أبي داود: ١٤٢٤؛ سنن ترمذي: ٤٦٣؛ سنن ابن ماجه: ١١٧٣. ② صحیح، سنن أبي داود: ١٤٢٥؛ سنن ترمذي: ٤٦٤؛ سنن نسائي: ١٧٤٤.

⑦ محلِ قنوت

دعائے قنوت قراءت کے بعد قبل از رکوع پڑھنا بھی جائز ہے، اسی طرح رکوع کے بعد بھی (یعنی قومہ میں) حمید سے منقول ہے کہ میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: کبھی ہم رکوع سے قبل اور کبھی بعد از رکوع بھی پڑھ لیتے تھے،[1] اسے ابن ماجہ اور محمد بن نصر نے نقل کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: اس کی سند قوی ہے، اگر رکوع سے قبل پڑھے تو قراءت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر رفع الیدین کرے اور یہی دعائے قنوت پڑھ کر بھی (اللہ اکبر کہے یعنی سجدہ کو جاتے ہوئے) بعض فقہاء اس کے قائل نہیں، جہاں تک قنوت پڑھ کر ہاتھ چہرہ پر پھیرنا تو بقول بیہقی اولیٰ یہ ہے کہ ایسا نہ کرے اور اسی پر اکتفا کرے جو سلف نے کیا، یعنی ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے نہ کہ آخر میں ہاتھوں کو چہرے پر بھی پھیرے۔

⑧ وتر کے بعد کی دعا

مستحب ہے کہ وتر کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ «سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ» کہے اور تیسری مرتبہ میں آواز ذرا اونچی رکھے، پھر کہے: «رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ»[2] ابوداود اور نسائی نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾، ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے اور جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ کہتے: «سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ» تیسری مرتبہ میں آواز بلند کرتے اور اسے پھیلاتے،[3] یہ نسائی کے نقل کردہ الفاظ ہیں، دارقطنی نے یہ اضافہ کیا: اور کہتے: «رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ» پھر وہ دعا پڑھتے جو احمد اور اصحاب سنن نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وتر کے آخر میں یہ دعا پڑھتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِمَا فَاتَكَ مِنْ عَقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ»[4]

⑨ ایک رات میں دو وتر نہیں

جس نے (عشا کے بعد یا کسی بھی وقت) وتر ادا کر لیے تھے، پھر اس کا ارادہ ہوا کہ (مزید) نمازِ تہجد پڑھے تو یہ جائز ہے، مگر دوبارہ وتر نہیں پڑھے گا، کیونکہ ابوداود و نسائی جبکہ ترمذی نے حسن کہا اور سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: «لَا وِتْرَانِ فِيْ لَيْلَةٍ» ”ایک رات میں دو وتر نہیں۔“[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (وتر کا) سلام پھیرتے، پھر بیٹھے بیٹھے دو رکعات ادا کرتے تھے،[6] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی وغیرہم نے تخریج کیا۔

---

[1] صحيح، سنن ابن ماجه: ١١٨٣. [2] صحيح، سنن أبى داود: ١٤٢٣؛ سنن نسائى: ١٧٢٩. [3] صحيح، سنن نسائى: ١٧٥٣. [4] صحيح، سنن ابى داود: ١٤٢٧؛ سنن نسائى: ١٧٤٦. [5] صحيح، سنن أبى داود: ١٤٣٩؛ سنن ترمذى: ٤٧٠. [6] صحيح، سنن ترمذى: ٤٧١؛ سنن ابن ماجه: ١١٩٥.

⑩ وتر کی قضا

جمہور علماء وتر کی مشروعیت کے قائل ہیں، کیونکہ بیہقی اور حاکم نے اسے شیخین کی شرط پر صحیح قرار دیا اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ اگر صبح ہوگئی اور کوئی وتر نہ پڑھ سکا تو اب ادا کرلے،[1] ابو داود نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو وتر سے سو تا رہ گیا یا بھول گیا وہ جب یاد آئے تو ادا کرلے۔''[2] بقول عراقی: اس کی سند صحیح ہے۔ احمد اور طبرانی کے ہاں حسن سند سے مروی ہے کہ کئی دفعہ نبی کریم ﷺ صبح ہونے پر وتر ادا فرماتے تھے۔[3] وتر کی قضا کس وقت دے؟ اس بارے میں اختلافِ آرا ہے، حنفیہ کے ہاں اوقاتِ مکروہہ کے سوا کسی بھی وقت، جبکہ شوافع نے رات و دن کے کسی وقت کا استثنا نہیں کیا، امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک فجر کے بعد قضا دے، نمازِ صبح ہونے سے قبل۔

نمازِ پنجگانہ میں دعائے قنوت

نوازل (یعنی آفات و مصائب) کے وقت نمازِ پنجگانہ (یا کسی بھی نماز) میں بالجہر قنوت مشروع ہے، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسلسل ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشا اور صبح کی نمازوں میں قنوت کی، جب آخری رکعت کے رکوع سے اٹھتے تو بنی سلیم کے ایک قبیلہ، رعل، ذکوان، اور عُصیہ کے خلاف بد دعا فرماتے اور صحابہ کرام آمین کہتے۔[4] ذکوان اور عصیہ بھی بنی سلیم کے قبائل تھے، انہوں نے اسلام ظاہر کیا اور نبی کریم ﷺ سے گزارش کی کہ ان کی طرف مبلغ بھیجیں، آپ نے ستر (۷۰) صحابہ کرام کی جماعت بھیجی تو انہوں نے اپنے علاقہ میں انہیں شہید کر دیا تو یہ آپ کی بد دعا کا سبب بنا،[5] احمد کے ہاں یہ مذکور ہے، اسے ابو داود نے بھی نقل کیا، عکرمہ کہتے ہیں: یہ قنوتِ نازلہ کا آغاز ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف دعا کرنا چاہتے تو رکوع کے بعد «رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ» کہہ کر قنوت کرتے، ایک دفعہ کئی دن یہ دعا کرتے رہے: «اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيْدَ......» الخ اور یہ بالجہر کرتے، ایک دفعہ عرب قبائل میں سے دو کے نام لے کر یہ بد دعا کی: «اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وفلانا» حتی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ (آل عمران:١٢٨)

''(اے نبی!) تمہارے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے یا انہیں عذاب دے کیونکہ بلاشبہ وہ ظالم ہیں۔''[6] اسے احمد اور بخاری نے تخریج کیا۔

---

① ضعيف، السنن الكبرى للبيهقي: ٢/٤٧٨؛المستدرك للحاكم: ١/ ٣٠٣، ٤٠٣. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٤٣١؛ سنن ترمذي: ٤٦٥، ٤٦٦؛ سنن ابن ماجه: ١١٨٨. ③ صحيح، مسند أحمد: ٦/ ٢٤٢، ٢٤٣. ④ حسن، سنن أبي داود: ١٤٤٣. ⑤ مسند أحمد: ٦/ ٢٤٢، ٢٤٣. ⑥ صحيح البخاري: ٤٥٦٠؛ صحيح مسلم: ٦٧٥؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٥٥.

نمازِ صبح میں قنوت

نمازِ صبح میں قنوت غیر مشروع ہے، مگر نوازل میں تو اس صورت میں صبح و دیگر نماز پنجگانہ میں قنوت کی جاسکتی ہے، جیسا کہ پیچھے گزرا، احمد، نسائی اور ابن ماجہ جبکہ ترمذی نے صحیح قرار دیا اور ابو مالک اشجعی سے نقل کیا کہ میرے والد عہدِ نبوی میں سولہ برس کے تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں نمازیں ادا کیں اور سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے بھی، میں نے ان سے پوچھا: کیا یہ سب قنوت کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: اے بیٹے! نہیں، یہ محدَث امر ہے۔[1] ابن حبان، خطیب اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نمازِ صبح میں قنوت تبھی کرتے جب کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف دعا کرنا مقصود ہوتا۔[2] (بقول محشی یہ ابن حبان کے الفاظ ہیں، دیگر نے نمازِ صبح کا ذکر کیے بغیر اسے نقل کیا) سیدنا زبیر اور خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بارے منقول ہے کہ یہ سب نمازِ فجر میں (ہمیشہ) قنوت نہ کیا کرتے تھے اور یہی حنفیہ، حنابلہ، ابن مبارک، ثوری اور ابن راہویہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے کہ نمازِ صبح میں قنوت دوسری رکعت کے رکوع کے بعد سنت ہے، ان کے مدنظر ماسوائے ترمذی کے جماعت کی نقل کردہ ابن سیرین رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا: کیا نبی کریم ﷺ نے نمازِ صبح میں قنوت کی؟ کہا: ہاں! پوچھا: رکوع سے قبل یا بعد؟ کہا: رکوع کے بعد،[3] اسی طرح احمد، بزار، دارقطنی، بیہقی اور حاکم نے صحیح قرار دیا۔ انہی سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ وفات تک نمازِ صبح میں قنوت کرتے رہے،[4] یہ استدلال محلِ نظر ہے، کیونکہ یہ بات معقول نہیں کہ نبی کریم ﷺ ساری عمر قنوتِ نازلہ پڑھتے رہے ہوں اور آپ کے بعد خلفاء اسے ترک کر دیں، بلکہ خود سیدنا انس رضی اللہ عنہ نمازِ صبح میں قنوت نہ کرتے تھے، جیسا کہ یہ ان سے ثابت ہے، اگر اس حدیث کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس قنوتِ مذکور کو اس امر پر محمول کریں گے کہ آپ رکوع کے بعد طویل قیام کرتے رہے، دعا و ثنا کے لیے تو یہ بھی قنوت کے معانی میں سے ایک معنی ہے اور یہاں یہی (تاویل کرنا) انسب ہے، بہر حال جو بھی معاملہ ہو یہ اس مباح اختلاف میں سے ہے، جس میں فعل و ترک ایک برابر ہیں اور بہترین ہدی سیدنا محمد ﷺ کی ہدی و سیرت ہے۔

تہجد کی نماز

① تہجد کی فضیلت

① اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (الاسراء: ٧٩)

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ٤٠٢؛ سنن نسائی: ١٠٧٩. [2] صحیح ابن خزیمة: ٦٢٠. [3] صحیح البخاری: ١٠٠١؛ صحیح مسلم: ٦٧٧. [4] ضعیف، مسند أحمد: ٣/ ١٦٢؛ سنن الدارقطنی: ١٦٧٨.

''رات کے کچھ حصے میں اس کے ساتھ بیدار رہو، اس حال میں کہ آپ لیے یہ زائد ہے، قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرے۔''

یہ امر اگرچہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے، مگر عامۃ المسلمین بھی اس میں داخل ہیں، اس رو سے کہ انہیں آپ کی اقتدا کرنے کا حکم ہے۔

② قرآن نے بیان کیا کہ قیامِ شب کی محافظت کرنے والے محسنین ہیں اور اللہ کی خیر و برکت کے حقدار، نیز فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ○ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ○ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾(الذاریات:۱۵-۱۸)

''بیشک پرہیزگار بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے، اپنے رب کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہونگے، کیونکہ وہ دنیا میں نیکیاں کرتے تھے، رات کے تھوڑے سے حصّے میں سوتے تھے اور اوقات سحر میں استغفار کیا کرتے تھے۔''

③ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف و توصیف کی اور انہیں اپنے نیک بندوں میں شمار کیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴾(الفرقان:۶۳-۶۴)

''رحمن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر عجز سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو یہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے آگے سجدوں اور قیام میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

④ ان کی آیات کے ساتھ صاحبِ ایمان ہونے کی گواہی دی اور کہا:

﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؗ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾(الم السجدہ: ۱۵-۱۷)

''ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لانے والے ہیں کہ جب انہیں ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے اور اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے، ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انہیں دیا، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک مقدر کی گئی ہے، یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔''

⑤ ان کے اور ان کے غیر کے مابین تسویہ کی نفی کی جو ان اوصاف کے ساتھ متصف نہیں، فرمایا:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾(الزمر:۹)

”(بھلا کافر ومشرک اچھا ہے یا) وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے اور آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے؟ (اے نبی کہہ دیجیے!) کیا عالم اور جاہل باہم برابر ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو عقلمند ہیں۔“

یہ وہ ہے جو کتاب اللہ میں قیامِ شب کے خوگر حضرات کی صفت میں ذکر ہوا، ذیل میں اس ضمن کی بعض احادیث بیان کی جاتی ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری ہوئی تو لوگ آپ کے پاس جمع ہوئے، میں بھی آیا جب آپ کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ یہ چہرہ (نعوذ باللہ) کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں: آپ کی پہلی بات جو میری سماعت میں پڑی وہ یہ تھی کہ ”اے لوگو! سلام عام کرو، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو اور راتوں کو اٹھ کر نمازیں پڑھو، جبکہ لوگ سوئے ہوتے ہیں (یہ کرو گے) تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔“[①] اسے حاکم، ابن ماجہ اور ترمذی نے تخریج کیا اور کہا کہ یہ حسن صحیح ہے۔

② سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامِ شب کیا کرو کیونکہ یہ تم سے پہلے کے صالحین کا طریقہ ہے اور تمہارے رب کے قرب کا وسیلہ ہے، اس سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں اور آمدہ سے بچت ہوتی ہے اور جسم طرح طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔“[②]

③ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: سیدنا جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور کہا: اے محمد! جتنی بھی عمر ملے آخر تو مرنا ہے اور جو عمل بھی کرو، اس کی جزا ملے گی، جس سے چاہو محبت کرو، آخر جدا ہونا ہے اور جان لو کہ مومن کا شرف رات کا قیام ہے اور اس کی عزت اس بات میں ہے کہ لوگوں سے مستغنی ہو جائے۔[③]

④ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین طرح کے افراد ایسے ہیں اللہ جن سے محبت کرتا ہے اور ان سے خوش ہوتا ہے، ایک وہ جو اس وقت بھی لڑتا رہے جب اس کی جمعیت پیچھے ہٹ جائے تو وہ جامِ شہادت نوش کر لے گا اور یا اسے اللہ کی نصرت و تائید ہوگی، اللہ کہتا ہے: میرے اس بندے کو دیکھو! کیسے میرے لیے اپنے آپ کو روک رکھا ہے، دوم وہ شخص جس کی اہلیہ ایک حسین خاتون ہے، بستر بھی عمدہ اور نرم ہے، لیکن اس سب کے باوجود رات کو اٹھ کر نماز پڑھتا ہے، اللہ کہتا ہے: اس نے اپنی شہوت چھوڑی اور مجھے یاد کیا، اگر چاہتا تو سویا رہتا، تیسرا وہ شخص جو سفر میں ہے اور اہلِ قافلہ سفر کی تکان کے سبب سوئے رہے، لیکن یہ سحر کے وقت اٹھ کر تہجد میں لگ گیا، تنگی میں اور آسانی میں بھی۔“[④]

---

① صحيح، سنن ترمذى: ٢٤٨٥؛ سنن ابن ماجه: ١٣٣٤؛ مسند أحمد: ٥/٤٥١. ② حسن، المعجم الكبير للطبراني: ٦١٥٤، بقول البانی سوائے آخری جملہ کے حدیث صحیح ہے۔ ③ حسن، المعجم الاوسط للطبراني: ٤٢٩٠؛ مجمع الزوائد: ٢/ ٢٥٢. ④ حسن، مجمع الزوائد: ٢/ ٢٥٥.

۲ تہجد کے آداب

تہجد کا ارادہ کرنے والے کے لیے مندرجہ ذیل امور مسنون ہیں:

① سوتے وقت تہجد کے لیے اٹھنے کی نیت کرے، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے بستر پر آئے اور اس کی نیت ہے کہ رات کو تہجد کے لیے اٹھے گا، پھر نیند کا غلبہ رہا اور وہ فجر تک سویا رہا تو اس کی نیت کے مطابق اس کا عمل لکھ دیا جائے گا اور اس کی نیند اس کے رب کا اس کے لیے صدقہ ہے۔''[1] اسے نسائی اور ابن ماجہ نے بسند صحیح نقل کیا۔

② بیدار ہو کر آنکھوں سے نیند پونچھے اور مسواک کرے اور آسمان پر نظر ڈالے، پھر وہ دعا پڑھے جو منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر پڑھی تھی، وہ یہ ہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ أَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِيْ وَأَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ، اَللّٰهُمَّ زِدْنِيْ عِلْماً وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنِيْ وَهَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ»

پھر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھے ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ سے آخر سورت تک، پھر کہے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ الْحَقُّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ، وَالسَّاعَةُ حَقٌّ، اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْكَ أَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَإِلَيْكَ حَاكَمْتُ، فَاغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ أَنْتَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»

''اے اللہ! ہر تعریف تیرے لیے ہے تو ارض وسما اور ان کے ساکنین کا نور ہے، تیری ہی تعریف ہے، تو ہی برحق ہے، تو ساری کائنات اور اس کی تمام چیزوں کا نگران ہے، تو ہی تعریف کے لائق ہے، تیرا وعدہ سچا ہے، تیری ملاقات برحق ہے، جنت اور دوزخ بھی برحق ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سب نبی برحق ہیں، قیامت برحق ہے۔ اے اللہ! میں تیرا فرمانبردار ہوں، میرا تجھی پہ ایمان اور تجھی پہ توکل ہے اور میرا سب کچھ تو ہے، تو میرے اگلے پچھلے اور ظاہر ومخفی گناہ معاف فرما، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔''[2]

③ شروع میں دو ہلکی رکعتیں پڑھے، پھر بعد میں جتنی چاہے طویل کرے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لیے اٹھتے تو اپنے قیام کا افتتاح دو ہلکی رکعتوں سے کرتے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی رات کو تہجد کے لیے اٹھے تو آغاز میں دو ہلکی رکعتیں پڑھے۔''[3] ان دونوں کو مسلم نے تخریج کیا۔

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ۱۷۸۶؛ سنن ابن ماجہ: ۱۳۴٤. [2] صحیح البخاری: ۱۱۲۰؛ صحیح مسلم: ۷٦۹.
[3] صحیح مسلم: ۷٦۸.

④ اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ اس پر رحم کرے جو رات کو نماز کے لیے اٹھا اور اپنی اہلیہ کو بھی اٹھایا اور اگر وہ نہ اٹھی تو اس کے چہرے پر پانی چھینکا اور اللہ اس خاتون پر رحم کرے جو رات کو اٹھی، نماز پڑھی اور اپنے شوہر کو بھی بیدار کیا، اگر اس نے پس و پیش کیا تو اس کے چہرے پر پانی چھینکا۔''[1] اسے ابو داود، نسائی، احمد، ابن ماجہ، حاکم اور ابن خزیمہ نے نقل کیا، اس کی سند صحیح ہے، انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی نے اپنی اہلیہ کو رات میں بیدار کیا، پھر تہجد ادا کی یا اکٹھے دو رکعتیں ہی پڑھ لیں، ان کا نام ذاکرین اور ذاکرات میں لکھ دیا جاتا ہے۔''[2] اسے ابو داود (اور ابن ماجہ) نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا: ''سبحان اللہ! آج کی شب کیا کیا فتنے اور کیا کیا خزانے اتارے گئے ہیں، کون ان حجرات والیوں (یعنی امہات المومنین) کو بیدار کرائے؟ ہائے! کتنی ہی دنیا میں لباس پہنی ہوئی عورتیں آخرت میں ننگی ہوں گی۔''[3] اسے بخاری نے نقل کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات انہیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جگایا اور پوچھا: ''کیا تم دونوں تہجد نہیں پڑھتے؟'' سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: (بخاری میں ہے کہ یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہی تھی) ہمارے نفوس اللہ کے ہاتھ میں ہیں، چاہے تو وہ جگا دے، اس پر آپ واپس ہوئے اور جاتے ہوئے اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے: ﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الكهف: ٥٤) ''انسان تو بہت ہی جھگڑالو ہے۔'' متفق علیہ۔

⑤ اگر اونگھ کا غلبہ ہو تو تہجد پڑھنا موقوف کرے، حتی کہ یہ کیفیت ختم ہو، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی تہجد کے لیے اٹھے اور محسوس کرے کہ قرآن پڑھنا دشوار ہو رہا ہے اور منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تو لیٹ جائے۔''[4] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں آئے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے، فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' کہا گیا: یہ ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے لیے ہے، وہ جب تہجد پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو اس کا سہارا لے لیتی ہیں، فرمایا: ''اسے کھول دو، اس وقت تک تہجد پڑھو، جب تک نشاط ہو، اگر تھکان یا سستی ہونے لگے تو سو جاؤ۔''[5] متفق علیہ۔

⑥ طاقت سے بڑھ کر مشقت برداشت نہ کرے، بلکہ اتنا قیام کرے جس پر ہمیشگی کر سکے اور صرف مجبوری میں ہی چھوڑے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیکی وہی کرو جس کی طاقت ہو، اللہ کی قسم! اللہ تنگ نہیں پڑتا حتی کہ تم تنگ پڑ جاؤ۔'' اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، انہی کے ہاں ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا: کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: ''جس پر ہمیشگی ہو، چاہے وہ قلیل ہی ہو۔''[6] مسلم نے ان سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا (ہر) عمل ہمیشگی والا تھا، جب کوئی عمل شروع کر لیتے تو پھر ہمیشگی کرتے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٣٠٨، ١٣٣٦. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٣٠٩؛ سنن ابن ماجه: ١٣٣٥.
③ صحيح البخاري: ١١٥. ④ صحيح مسلم: ٧٨٧. ⑤ صحيح البخاري: ١١٥٠؛ صحيح مسلم: ٧٨٤.
⑥ صحيح البخاري: ٦٤٦٤؛ صحيح مسلم: ٧٨٢.

نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ”اے عبداللہ! فلاں کی طرح نہ ہوجانا جو تہجد پڑھا کرتا تھا، پھر چھوڑ دی۔“[1] متفق علیہ۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص کا ذکر ہوا جو صبح تک سویا رہا، فرمایا: ”یہ ایسا شخص ہے کہ شیطان نے اس کے کانوں میں پیشاب کیا۔“[2] بخاری و مسلم نے سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی بابت فرمایا: ”عبداللہ اچھا آدمی ہے، اگر تہجد پڑھا کرے۔“ سالم کہتے ہیں: اس کے بعد سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے۔[3]

③ تہجد کا وقت

یہ رات کے اول، وسط اور آخر کسی بھی حصہ میں پڑھی جا سکتی ہے، بس یہ ہے کہ نمازِ عشا سے قبل نہ ہو، سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے قیامِ شب کے بارے کہتے ہیں: ہم رات کے کسی بھی حصے میں آپ کو تہجد میں مشغول دیکھنا چاہتے ہیں تو دیکھ لیتے، اسی طرح رات کے ہر حصے میں آپ کو سوتا ہوا بھی دیکھا ہے، آپ کئی دفعہ روزے رکھتے رہتے حتی کہ ہم کہتے کہ پورا ماہ روزے رکھیں گے، پھر کسی ماہ اتنے دن ناغہ کرتے کہ ہم کہتے: اس ماہ بالکل نہیں رکھیں گے،[4] اسے احمد، بخاری اور نسائی نے تخریج کیا، حافظ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی تہجد کا کوئی معین وقت نہ تھا، بلکہ جس وقت بھی اٹھنا آپ کو میسر ہوتا تو اٹھ جاتے تھے۔

④ تہجد کے افضل اوقات: البتہ تہجد کا افضل وقت رات کا تیسرا پہر ہے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ہمارا رب ہر رات جب رات کا آخری پہر باقی رہ جائے تو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے: کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے تو اس کی دعا قبول کروں؟ ہے کوئی جو مجھ سے مانگے تو اسے عطا کروں؟ ہے کوئی جو استغفار کرے تو اسے مغفرت سے نواز دوں۔“[5] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا: ”بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتا ہے، اگر ہو سکے کہ اس وقت ذاکرین میں تم بھی شامل ہو جاؤ تو ضرور (کوشش) کرو۔“[6] اسے حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ یہ مسلم کی شرط پر ہے، ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا اور نسائی اور ابن خزیمہ نے بھی اس کی تخریج کی، ابومسلم نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کون سا قیامِ شب افضل ہے؟ کہنے لگے: میں نے اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا تو آپ کا جواب تھا: ”رات کے پچھلے نصف میں اور کم ہی اس کے عامل ہیں۔“[7] اسے احمد نے جید سند سے نقل کیا، سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے

---

[1] صحیح البخاری: ١١٥٢؛ صحیح مسلم: ١١٥٩. [2] صحیح البخاری: ٣٢٧٠. [3] صحیح البخاری: ١١٢٢؛ صحیح مسلم: ٢٤٧٩. [4] صحیح البخاری: ١١٤١؛ سنن نسائی: ١٦٢٦. [5] صحیح البخاری: ١١٤٥؛ صحیح مسلم: ٧٨٥؛ سنن أبی داود: ٤٧٣٣. [6] سنن ترمذی: ٣٥٧٩؛ سنن نسائی: ٥٧١؛ صحیح ابن خزیمة: ١١٤٧.
[7] صحیح، مسند أحمد: ٢١٥٥٥.

مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کو روزے رکھنے کا محبوب ترین طریقہ سیدنا داود علیہ السلام کا طریقہ ہے، اسی طرح نماز بھی انہی کی، وہ آدھی رات تک سوتے، پھر ایک تہائی حصہ نماز پڑھتے، پھر باقی حصہ سو جاتے تھے اور روزوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن ناغہ کرتے۔''[1] اسے ماسوائے ترمذی کے جماعت نے نقل کیا۔

⑤ تہجد کی رکعات کی تعداد

قیامِ شب کی کوئی معین و مخصوص تعداد نہیں اور نہ اس کی کوئی حد متعین ہے (نہ کم از کم اور نہ زیادہ سے زیادہ) یہ نمازِ عشا کے بعد وتر کی ایک رکعت پڑھنے سے بھی متحقق ہو جائے گی، چنانچہ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ''رات کو نوافل پڑھا کرو، کم ہوں یا زیادہ اور آخر میں وتر ادا کیا کرو۔''[2] اسے طبرانی نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں نماز پڑھنا، دس ہزار نمازوں کے مساوی ہے اور کعبہ کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور ارضِ رباط (یعنی مجاہدین کی لشکر و کمین گاہ) میں نماز دو لاکھ نمازوں کے مساوی ہے اور ان سب سے بڑھ کر وہ دو رکعتیں جو بندہ رات کو اٹھ کر پڑھے۔''[3] اسے ابو الشیخ نے اور ابن حبان نے اپنی کتاب (الثواب) میں نقل کیا، امام منذری رحمہ اللہ نے ''الترغیب والترہیب'' میں اس کے حکم کے بارے سکوت اختیار کیا ہے، سیدنا ایاس بن معاویہ مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قیامِ شب سے چارہ نہیں، اگرچہ اتنی ہی دیر ہو جس میں بکری کا دودھ دھو لیا جائے اور عشا کے بعد جو بھی نماز ہوگی (یعنی سنتیں، وتر اور نوافل) وہ قیامِ شب میں سے ہے۔''[4] اسے طبرانی نے نقل کیا اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں، مگر محمد بن اسحاق (یہ بھی اکثر کے نزدیک ثقہ ہیں)۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ قیامِ شب کا ذکر چھڑا تو بعض نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: ''رات کا نصف، اس کا ثلث (یعنی ایک تہائی)، اس کا ربع (چوتھا حصہ) یا اتنی مدت جس میں اونٹنی یا بکری کا دودھ دوہنے کے لیے تھنوں پر ہاتھ رکھا جائے۔''[5] انہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں قیامِ شب کا حکم دیا اور اس کی ترغیب دلائی، حتی کہ فرمایا: ''تہجد ضرور پڑھو، اگرچہ ایک ہی رکعت پڑھو۔''[6] بقول محشی اس کی سند میں حسین بن عبد اللہ ہے جو ضعیف ہے) اسے طبرانی نے نقل کیا۔ افضل یہ ہے کہ گیارہ یا تیرہ رکعات پر ہمیشگی کی جائے اور اسے اختیار ہے کہ پڑھتا رہے یا قطع کر دے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم ﷺ رمضان ہو یا اس کا غیر، گیارہ سے زائد نہ پڑھتے تھے، چار رکعات پڑھتے ان کے طول و حسن کے بارے مت پوچھو، پھر تین پڑھتے، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ وتر سے قبل سو نہ گئے تھے (یعنی پھر اٹھ کر وضو کیے بغیر پڑھا) فرمایا: ''اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں، لیکن دل نہیں سوتا۔''[7] (یعنی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ وضو ٹوٹا ہے یا نہیں)، اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ میں

---

① صحیح البخاری: ١١٣١؛ صحیح مسلم: ١١٥٩. ② ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ٣٨٠٤؛ مسند البزار: ٧٠٣. ③ ضعیف، الترغیب الترھیب: ٩١٤. ④ ضعیف، المعجم الکبیر للطبرانی: ٧٨٧؛ مجمع الزوائد: ٢/ ٢٥٢. ⑤ ضعیف، مسند ابی یعلیٰ: ٢٦٧٧؛ مجمع الزوائد: ٢/ ٢٥٢. ⑥ ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ٦٨١٧؛ مجمع الزائد: ٢/ ٢٥٢. ⑦ صحیح البخاری: ١١٤٧؛ صحیح مسلم: ٧٣٨.

نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز دس رکعات تھی، پھر ایک رکعت بطورِ وتر پڑھتے تھے۔[1]

⑥ تہجد کی قضا

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کسی تکلیف وغیرہ کے باعث قیامِ شب فوت ہو جاتا تو دن کے وقت آپ (اس کی قضا کے بطور) بارہ رکعتیں ادا فرماتے۔[2] اسے سوائے بخاری کے باقی سب اہلِ صحاح نے تخریج کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے حزب (یعنی جتنا قرآن پڑھنا اپنے قیام میں مقرر کر رکھا ہے) سے سو تارہ گیا، یا اس کے بعض حصہ سے تو اگر فجر اور ظہر کے مابین اسے پڑھ لیا تو اعمال نامہ میں لکھا جائے گا گویا اس نے رات کو ہی پڑھا ہے۔''[3]

قیام رمضان (تراویح)

① قیام رمضان کی مشروعیت

قیامِ رمضان یا (دوسرے لفظوں میں) نمازِ تراویح مردوں اور عورتوں کے لیے مسنون ہے، جسے بعد از نمازِ عشا وتر سے قبل دو دو رکعتیں کر کے ادا کیا جائے گا، تاخیر سے ادا کرنا بھی جائز ہے، مگر افضل یہی ہے، اس کا وقت آخر شب تک رہتا ہے، جماعت کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامِ رمضان کی ترغیب دلایا کرتے تھے، لیکن اس پر زور نہ دیتے تھے، آپ یہ الفاظ استعمال کرتے: ''جس نے رمضان کا ایمان اور امیدِ ثواب کے ساتھ قیام کیا اس کے سب گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''[4] سوائے ترمذی کے باقی سب نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قیام رمضان کیا تو آپ کی اقتدا میں کثیر لوگ جمع ہو گئے، اگلی رات اس سے بھی زیادہ، پھر تیسری رات لوگ جمع ہوئے مگر آپ باہر نہ نکلے، صبح ہوئی تو فرمایا: ''رات میں تمہاری موجودگی سے باخبر تھا، لیکن فقط یہ خیال کر کے باہر نہیں آیا کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔''[5]

② قیام رمضان کی رکعات کی تعداد

جماعت نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زائد قیامِ شب نہ کرتے تھے،[6] ابن خزیمہ اور ابن حبان نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آٹھ تراویح پڑھائیں اور پھر وتر، پھر اگلی رات آپ کا انتظار کیا گیا، مگر آپ نہیں نکلے،[7] ابویعلیٰ اور طبرانی کی حسن سند کے ساتھ انہی سے ایک اور روایت

---

① صحیح مسلم: ۷۳۸. ② صحیح مسلم: ۱۱٤۰. ③ صحیح مسلم:۷٤۷؛سنن ترمذی:۵۸۱. ④ صحیح البخاری: ۲۰۰۹؛ صحیح مسلم: ۷۵۹. ⑤ صحیح البخاری: ۱۱۰۹؛ صحیح مسلم: ۷٦۱. ⑥ صحیح البخاری: ۱۱٤۷؛ صحیح مسلم: ۷۳۸. ⑦ صحیح ابن خزیمة: ۱۰۷۰؛ صحیح ابن حبان: ۲٤۰۹.

میں ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رمضان میں حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! رات میں نے ایک کام کیا ہے، فرمایا: ''وہ کیا؟'' کہا: محلہ کی خواتین نے مجھ سے کہا کہ ہمیں قیامِ رمضان کی جماعت کراؤ تو میں نے انہیں آٹھ رکعات پڑھائیں اور وتر، اس پر آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ کہا،[1] تو یہ سنتِ رضا کی حیثیت میں ہے (یعنی تقریری حدیث) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی وارد اور مسنون ہے، آپ سے اس کے سوا کچھ اور مروی نہیں، البتہ صحت کے ساتھ وارد ہے کہ لوگ سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے عہود میں بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے (یہاں محشی علامہ البانی رحمہ اللہ کی کتاب ''تمام المنۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے بیس رکعات والی بات ثابت نہیں) اور یہی حنفیہ اور حنابلہ کے جمہور فقہاء اور داود (ظاہری) کی رائے ہے، ترمذی لکھتے ہیں: اکثر اہلِ علم، سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما وغیرہما سے مروی اسی بیس رکعت تراویح کے عمل پر ہیں اور یہی امام ثوری، ابن مبارک اور شافعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور میں نے اہلِ مکہ کو پایا کہ بیس تراویح پڑھتے ہیں، بعض علماء کی رائے ہے کہ مسنون (یعنی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے) تو گیارہ رکعات مع وتر کے ہیں اور باقی مستحب ہیں، کمال بن ہمام حنفی لکھتے ہیں: دلیل مقتضی ہے کہ ان بیس میں سے مسنون تعداد وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے، جسے آپ نے اس خوف سے ترک کر دیا (یعنی ان کی جماعت کرانا) کہ کہیں فرض نہ ہو جائیں اور باقی مستحب ہیں اور ثابت یہ ہے کہ یہ مع وتر کے گیارہ رکعتیں تھیں، جیسا کہ صحیحین میں ہے، لہٰذا ہمارے مشائخ (یعنی احناف) کے اصول پر ان میں سے آٹھ رکعتیں مسنون اور باقی بارہ مستحب ہیں۔ (بقول محشی مالک رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تراویح کی تعداد ۳۶ ہے اور وتر اس کے علاوہ ہے، بقول زرقانی ابن حبان نے ذکر کیا کہ تراویح اولاً گیارہ رکعات تھیں اور قراءت طویل ہوتی تھی تو لوگوں پر یہ ثقیل ہوئیں تو قراءت کی تخفیف کر کے متوسط قراءت کے ساتھ رکعات کی تعداد بڑھا کر بیس کر دی گئی علاوہ شفع یعنی وتر کے ہمراہ پڑھی جانے والی دو رکعتیں اور ایک وتر کے جبکہ ہلکی قراءت کے ساتھ شفع و وتر کے سوا چھتیس رکعات کر دیں اور اسی پر معاملہ مستقر ہوا)۔

③ تراویح کی جماعت

جائز ہے کہ قیامِ رمضان با جماعت ادا کیا جائے، البتہ انفرادی طور پر ادا کرنا بھی جائز ہے، لیکن جمہور کے نزدیک مسجد میں با جماعت قیام کا اہتمام افضل ہے، پہلے گزرا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو (دو راتیں) اس کی جماعت کرائی، پھر اس ڈر سے کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اسے جاری نہ رکھا، بعد ازاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں تراویح کے لیے باقاعدہ امام مقرر کر دیے، عبدالرحمن بن عبدالقاری کہتے ہیں: میں رمضان کی ایک شب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نکلا تو دیکھا کہ لوگ الگ الگ قیامِ رمضان ادا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی اکیلا پڑھ رہا ہے اور کوئی چند بندوں کی جماعت کرا رہا ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ ان سب کو ایک قاری پر جمع کر دوں تو اچھا ہوگا، اس کا عزم کر کے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کر دیا، پھر ایک رات لوگوں کو ان کی امامت میں تراویح ادا کرتے دیکھ کر کہا: یہ اچھی بدعت ہے (نیا کام ایک امام پر جمع

---

[1] ضعیف، مسند ابی یعلیٰ: ۱۸۰۱؛ مجمع الزوائد للهیثمی: ۲/ ۷٤.

کرنا) اور زیادہ بہتر تھا کہ آخرِ شب اسے ادا کرتے۔[1] اسے بخاری، ابن خزیمہ اور بیہقی وغیرہم نے نقل کیا۔

④ قیام رمضان کی قراءت

قیامِ رمضان کی قراءت کے بارے میں کوئی خاص چیز مسنون نہیں، سلف سے وارد ہے کہ وہ عام طور پر اس میں دوسو آیات والی سورتیں پڑھتے تھے اور اتنا لمبا قیام کرتے کہ عصا کا سہارا لینا پڑتا اور سحر طلوع ہونے سے کچھ قبل ہی فارغ ہوتے اور اتنا کم وقت باقی ہوتا کہ خادموں کو کھانا پیش کرنے میں جلدی کرنا پڑتی کہ کہیں فجر طلوع نہ ہو جائے (ایک ہم ہیں کہ قاری اگر ایک گھنٹہ سے زیادہ لگائے تو بڑبڑاتے ہیں، قاری کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایک آدھ گھنٹہ میں کام تمام کر دے) پوری سورۃ البقرہ آٹھ رکعات میں پڑھتے، اگر اسے بارہ رکعات میں پڑھا جاتا تو اسے رعایت اور تخفیف خیال کیا جاتا، بقول ابن قدامہ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: قاری کو چاہیے کہ لوگوں کو زیادہ مشقت میں نہ ڈالے بالخصوص گرمیوں کی راتوں میں، قاضی لکھتے ہیں: مستحب یہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں (تراویح میں) قرآن ختم کیا جائے، بہرحال لوگ اگر اس سے زائد برداشت کر سکتے ہوں تو زیادہ بھی کرنے میں حرج نہیں، جیسا کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں قیام کر رہے تھے تو ڈرے کہ کہیں ہم سے سحری رہ نہ جائے۔ عموماً قاری حضرات دوسو (یا زائد) آیات والی سورتیں پڑھتے تھے۔[2]

چاشت کی نماز

① نمازِ چاشت کی فضیلت

نمازِ چاشت کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہیں، ان میں سے چند ایک کا درج ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

① سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے ہر جوڑ پر روزانہ ایک صدقہ عائد ہے تو ہر تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر ایک ایک صدقہ ہے، اسی طرح نیکی کی بات کرنا، صدقہ ہے اور برائی سے روکنا بھی اور ان سب سے چاشت کے وقت دو رکعتیں پڑھ لینا کافی ہوگا۔''[3] اسے احمد، مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا۔

② احمد اور ابوداؤد کے ہاں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر انسان میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اس پر لازم ہے کہ (روزانہ) ہر جوڑ کے بدلے صدقہ دے۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کی کس میں طاقت ہے؟ فرمایا: ''مسجد سے تھوک کا ازالہ کر دینا یا راستہ سے ایذا دینے والی چیز کو ہٹا دینا صدقہ ہے، اگر یہ نہیں تو چاشت کے وقت دو رکعت پڑھ لینا، اس سب سے کفایت کرے گا۔''[4] (گویا سب جوڑوں کا صدقہ ادا ہو گیا) امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ دونوں

---

[1] صحیح البخاري: ۲۰۱۰؛ السنن الکبری للبیهقي: ۲/ ۴۹۳. [2] صحیح، سنن أبي داود: ۱۳۷۵؛ سنن ترمذي: ۸۰۶؛ سنن نسائي: ۱۳۶۳. [3] صحیح مسلم: ۷۲۰؛ سنن أبي داود: ۱۲۸۶؛ مسند أحمد: ۵/ ۱۶۷.
[4] صحیح، سنن أبي داود: ۵۲۴۲؛ مسند أحمد: ۴/ ۳۵۴.

حدیثیں نمازِ چاشت کی عظیم فضیلت اور ان کی تاکدِ مشروعیت پر دلالت کناں ہیں اور یہ دو رکعتیں تین سو ساٹھ جوڑوں کی طرف سے صدقہ ادا کرنے کے مترادف ہیں اور جس کی یہ خاصیت ہو تو وہ حقدار ہے کہ اس پر ہمیشگی کی جائے، اس سے اذکار از قسمِ تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کے اِکثار کی مشروعیت بھی ثابت ہوئی، اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اور دیگر انواعِ طاعات کی تاکہ روزانہ (کم از کم) تین سو ساٹھ صدقات ادا ہو سکیں۔

③ سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اے ابن آدم! دن کے شروع میں اگر تو چار رکعات پڑھنے سے عاجز نہ ہوا، تو میں اس کے آخر میں تیرے لیے کافی ہوں گا۔''[1] اسے حاکم اور طبرانی نے نقل کیا اور اس کے راوی ثقہ ہیں، اسے احمد، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے نعیم غطفانی سے جید سند کے ساتھ نقل کیا۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں: «إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ ابْنَ آدَمَ ارْكَعْ لِيْ أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ أَكْفِكَ فِيْ آخِرِهٖ» ''بے شک اللہ کا ابن آدم سے خطاب ہے کہ تم میرے لیے دن کے شروع میں چار رکعتیں پڑھو میں دن کے آخر میں میں تیرے لیے کافی ہوں گا۔''[2]

④ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، جنہیں غنیمت حاصل ہوئی اور وہ بسرعت لوٹ آئے، لوگوں کو غنائم سمیت ان کے جلد واپس آنے پہ خوشگوار حیرت ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں اس سے بھی جلد حاصل ہو جانے والی اور اس سے بڑھ کر غنیمت کی بابت نہ بتلاؤں، جس میں بحفاظت واپسی کا زیادہ امکان ہے؟ وہ یہ کہ وضو کر کے مسجد جاؤ اور نمازِ چاشت ادا کرو، اس میں زیادہ دور بھی نہ جانا پڑا، واپسی بھی بحفاظت ہوئی اور غنیمت ان کی غنیمت سے زیادہ ہوگی۔''[3] اسے احمد، طبرانی اور ابو یعلی نے نقل کیا۔

⑤ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے میرے خلیل نے تین نصیحتیں کی تھیں: ہر ماہ تین روزے رکھوں، چاشت کے وقت (کم از کم) دو رکعت پڑھوں اور سونے سے قبل وتر ادا کر لیا کروں۔[4] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

⑥ سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے ایک سفر میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ چاشت آٹھ رکعات پڑھیں، فارغ ہوئے تو فرمایا: ''میں نے ایک رغبت و رہبت والی نماز ادا کی ہے اور میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا، دو اس نے عطا کر دیں اور ایک نہیں، میں نے دعا کی کہ میری امت قحط سالی میں مبتلا نہ ہو (اس طرح کہ سبھی ہلاک ہو جائیں) یہ قبول ہوئی، میں نے دعا کی کہ دشمن (کلی طور پر پوری امتِ اسلامیہ پر) غالب نہ آئے، یہ بھی قبول کی گئی، اور (تیسری) دعا کی کہ ان کے مابین اختلاف اور جنگ جدال پیدا نہ ہو لیکن وہ رد کر دی گئی۔''[5] اسے احمد، نسائی، حاکم اور ابن خزیمہ نے تخریج کیا اور دونوں (حاکم اور ابن خزیمہ) نے اس پر حکمِ صحت لگایا۔

---

① صحيح، سنن أبي داود: ۱۲۸۹؛ مسند أحمد: ٥/ ۲۸۷. ② صحيح، سنن ترمذي: ٤٧٥. ③ صحيح، مسند أحمد: ۲/ ۱۷٥؛ مسند أبي يعلى: ٦٥٥٩. ④ صحيح البخاري: ۱۱۷۸؛ صحيح مسلم: ۷۲۱. ⑤ صحيح، سنن ترمذي: ۲۱۷٥؛ صحيح ابن خزيمة: ۱۲۲۸.

② نماز چاشت کا حکم

یہ مستحب عبادت ہے، تو جو ادا کرے اسے ثواب ملے گا اور جو نہ پڑھے اس پر کوئی گناہ نہیں، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ضحیٰ (چاشت) پڑھتے، حتی کہ ہم کہتے: اب کبھی ترک نہ کریں گے، پھر اتنا عرصہ چھوڑے رکھتے کہ ہم کہتے: اب نہ پڑھیں گے،[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن ہے۔

③ نماز چاشت کا وقت

اس کا وقت سورج کے ایک نیزہ برابر بلند ہو جانے سے شروع ہوتا ہے اور زوال تک رہتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ سورج کے زیادہ بلند ہونے کا انتظار کیا جائے، جب گرمی ذرا شدید ہو جائے، سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ قبا کے ہاں تشریف لائے، جو ضحیٰ پڑھ رہے تھے، فرمایا:

«صَلَاةُ الْأَوَّابِيْنَ إِذَا رَمَضَتِ الْفِصَالُ مِنَ الضُّحىٰ»

''صلاۃ الاوابین تب ہے، جب اونٹنی کا بچہ بوجہ گرمی کی شدت کے جلنے یعنی تنگ پڑنے لگے۔''[2] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔

④ نماز چاشت کی رکعات کی تعداد

یہ کم از کم دو رکعتیں ہیں، جیسا کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزرا اور فعلِ نبوی سے اس کی زیادہ سے زیادہ تعداد آٹھ ثابت ہے، جب کہ آپ کے قول سے زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ثابت ہیں، بعض حضرات جن میں ابو جعفر طبری اور حلیمی بھی ہیں، قائل ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، شافعیہ کے رویانی اور عراقی کا بھی اسی پر جزم ہے، عراقی شرحِ ترمذی میں لکھتے ہیں: میں نے صحابہ و تابعین میں سے کسی سے منقول نہیں پایا کہ وہ اسے بارہ رکعات میں محدود کرتے ہوں، امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ حسن بصری رحمہ اللہ سے سوال ہوا: کیا صحابہ کرام اسے پڑھتے تھے؟ کہا: ہاں، بعض دو اور بعض چار پڑھتے تھے اور بعض تو اسے نصف نہار کے وقت (زوال سے ذرا پہلے) ادا کرتے تھے، امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے اسود بن یزید سے پوچھا: میں چاشت میں کتنی رکعتیں پڑھوں؟ کہا: جتنی چاہو، سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتح مکہ کے دن) آٹھ رکعات نمازِ چاشت پڑھی اور ہر دو کے بعد سلام پھیرا۔[3] اسے ابو داؤد نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ چاشت چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور اس سے زائد بھی جو اللہ چاہے،[4] اسے احمد، مسلم اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

---

① ضعيف، سنن ترمذي: ٤٧٧؛ مسند أحمد: ٣/ ٢١، ٣٦. ② صحيح مسلم: ٧٤٨؛ مسند أحمد: ٤/ ٣٦٦.
③ ضعيف، سنن أبي داود: ١٢٩٠؛ سنن ابن ماجه: ١٣٢٣. ④ صحيح مسلم: ٧١٩؛ سنن ابن ماجه: ١٣٨١.

نمازِ استخارہ

جس شخص کا مباح امور میں سے کسی امر کا ارادہ ہو اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کون سا امر اس کے لیے زیادہ بہتر رہے گا، اس کے لیے جائز ہے کہ دو نفل پڑھے، اگرچہ سنتوں میں سے یا تحیۃ المسجد (یا تحیۃ الوضو) میں سے کسی دو کی نسبت یہ نیت کر لے، چاہے دن ہو یا رات، اس میں فاتحہ کے بعد جو چاہے قرآن پڑھے، پھر اللہ کی حمد کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے، پھر وہ دعا کرے، جسے بخاری نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ ہمیں تمام امور میں دعائے استخارہ اس طرح سکھلایا کرتے تھے، جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھلاتے، فرماتے: ''جب کسی کام کا ارادہ ہو تو فرض کے علاوہ دو رکعت پڑھو، پھر کہو:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُك بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُك بِقُدْرَتِكَ وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ (الأمر کی جگہ اپنے اس معاملے کا نام لے) خَيْرٌ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ۔ اَوْقَالَ: وَعَاجِلِ أَمْرِيْ وَآجِلِهٖ۔ فَاقْدِرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أن هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِيْ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ۔ اَوْقَال: فِيْ عَاجِلِ أَمْرِيْ وَآجِلِهٖ۔ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ فَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ أَرْضِنِيْ بِهٖ»

''اے اللہ! میں تیرے علم کے مدِ نظر تجھ سے خیر کا اور تیری قدرت کے بروئے کار آنے کا طالب ہوں اور تجھ سے تیرے فضل کا سوالی ہوں، کیونکہ تو قادر ہے اور میرا کچھ اختیار نہیں اور تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا اور تو علام الغیوب ہے، اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق یہ معاملہ معاش و معاد کے لحاظ سے میرے لیے بہتر ہے، تو اسے میرے لیے ممکن بنا دے اور اگر برا ہے، تو اسے مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور جس معاملے میں خیر ہے، اسے میری دسترس میں کر دے۔''[1]

ان رکعتوں میں کوئی خاص سورت یا آیت پڑھنے کے بارے میں صحت کے ساتھ کچھ ثابت نہیں، اسی طرح اس کے استحبابِ تکرار میں بھی، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: استخارہ کے بعد وہ اقدام کرلے، جس کی نسبت شرحِ صدر ہو (جی میں آئے کہ یہ کرلوں) لیکن استخارہ سے قبل کا میلان روبعمل نہ لائے (لیکن استخارہ کے بعد اگر دل اسی طرف مائل ہو تو گویا استخارہ کے طفیل اسی میں خیر ہوگی، میرا ملحوظہ یہ ہے کہ استخارہ کے بعد اگر کچھ دیر توقف کیا جائے اور جلد بازی نہ کی جائے تو معاملہ واضح ہو جائے گا) بلکہ استخارہ کرنے والے کے لیے مناسب ہے کہ اصلاً ہی اپنا میلان پسِ پشت رکھے، وگرنہ استخارہ کا کیا فائدہ؟ اس طرح

[1] صحیح البخاري: ١١٦٢.

تو وہ استخارہ میں اور علم و قدرت سے اپنے تبرّی اور اللہ کے لیے ان کے اثبات کے معاملے میں صادق النیت تبھی شمار ہو گا، جب اپنا میلان اور ذاتی رائے (جو پہلے سے اس کے دل میں ہے) ترک کر کے استخارہ کے نتیجے پر کلی اعتماد کرے۔

نمازِ تسبیح

عکرمہ رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے عباس! اے چچا! کیا آپ کو ایسی چیز عنایت نہ کروں، خاص آپ کو، اگر وہ کریں تو وہ دس قسم کے گناہوں کا کفارہ بنے اور اللہ اگلے پچھلے گناہ معاف کرے اور قدیم وجدید جو غلطی سے کیے ہوں یا عمداً، چھوٹے ہوں یا بڑے، خلوت میں کیے یا جلوت میں؟ چار رکعات پڑھو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ساتھ میں کچھ اور پڑھو پھر قراءت کے بعد کھڑے کھڑے پندرہ مرتبہ کہو: «سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ» اس کے بعد رکوع جاؤ اور رکوع میں دس مرتبہ یہی پڑھو، پھر قومہ میں دس مرتبہ اسی طرح دونوں سجدوں میں اور ان کے درمیان میں دس دس مرتبہ، تو یہ ایک رکعت میں ۷۵ عدد بنے، تو چاروں رکعات میں یہی تعداد پڑھی جائے، اگر ہو سکے، تو ہر روز یہ نماز پڑھو، وگرنہ ہفتہ میں ایک دفعہ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو سال میں ایک دفعہ، وگرنہ پھر عمر بھر میں ایک دفعہ۔''[1] اسے ابوداود، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور طبرانی نے تخریج کیا، ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ حدیث کثیر طرق اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے، سب سے امثل طریق عکرمہ کا یہی طریق ہے، ایک جماعت نے اسے صحیح قرار دیا، ان میں ابوبکر آجری، ہمارے شیخ ابومحمد عبدالرحیم مصری اور ہمارے شیخ الحافظ ابوالحسن مقدسی بھی شامل ہیں! بقول ابن مبارک نمازِ تسبیح کی ترغیب دلائی گئی ہے، تو اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔

نمازِ حاجت

احمد نے بسندِ صحیح سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اچھی طرح وضو کیا، پھر عمدگی سے دو رکعتیں پڑھیں، اللہ اس کی جو دعا و درخواست ہو گی جلد یا بدیر پوری کرے گا۔''[2]

نمازِ توبہ

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا: ''کسی سے اگر گناہ سرزد ہو جائے، تو وہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اللہ سے استغفار کرے، تو وہ اسے معاف کر دے گا پھر یہ آیت پڑی:

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٢٩٧؛ سنن ابن ماجه: ١٣٨٦؛ صحيح ابن خزيمة: ١٢١٦. [2] ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٤٤٣.

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾(آل عمران: ١٣٥۔١٣٦)

''اور وہ لوگ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھتے ہیں، تو اللہ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے، ایسے ہی لوگوں کا صلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش اور باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ بستے رہیں گے۔''[1]

اسے ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی نے کہا: یہ حسن حدیث ہے، طبرانی نے کبیر میں حسن سند کے ساتھ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اچھی طرح وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر دو یا چار رکعتیں ادا کیں، فرض یا غیر فرض، جس میں رکوع و سجود اطمینان سے کیے ہوں، پھر اللہ سے گناہوں کی معافی مانگی تو وہ اسے مغفرت سے نوازے گا۔''[2]

نمازِ کسوف

علماء متفق ہیں کہ نمازِ کسوف مردوں و عورتوں دونوں کے لیے سنتِ مؤکدہ ہے اور افضل یہ ہے کہ جماعت کا اہتمام کرلیا جائے، اگرچہ ایسا کرنا اس کے لیے شرط نہیں، اس کے لیے (اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ) کہہ کر ندا دی جائے اور لوگ جمع کیے جائیں، جمہور کے نزدیک یہ دو رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو رکوع ہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سورج گرہن لگا، آپ مسجد تشریف لائے اور جماعت کرائی اور اس میں طویل قراءت کی پھر رکوع گئے اور طویل رکوع کیا، پھر ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہہ کر سر اٹھایا اور سجدہ کیے بغیر دوبارہ قراءت کرنے لگے، جو پہلی کی نسبت ذرا کم تھی، پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں گئے اور لمبا رکوع کیا، مگر پہلے سے کم پھر سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہہ کر اٹھے اور اس بار قومہ کر کے سجدہ گیا، دوسری رکعت بھی اول کی مثل (دو قیاموں اور دو رکوعوں کے ساتھ) پڑھائی تو اس طرح چار رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ دو رکعتیں مکمل کیں، پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ''بے شک چاند و سورج اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جو کسی کی موت یا حیات کے باعث گرہن زدہ نہیں ہوتے، جب یہ کیفیت ہو تو نماز کی طرف جلدی کرو۔''[3]

اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سورج گرہن لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور طویل قیام کیا، جیسے سورۂ بقرہ پڑھی جائے، پھر طویل رکوع کیا، پھر اٹھے اور طویل قیام کیا، جو پہلے سے کم تھا،

---

[1] حسن، سنن ترمذی: ٤٠٦؛ سنن ابن ماجه: ١٣٩٥. [2] حسن، مجمع الزوائد: ٢/ ٢٨١، ٢٨٢.
[3] صحيح البخاری: ١٠٤٦؛ صحيح مسلم: ٩٠١.

پھر لمبا رکوع کیا، جو اول سے کم تھا پھر سجدہ کیا، پھر (دوسری رکعت میں) طویل قیام، رکوع پھر قیام اور پھر رکوع کیا پھر سجدے کیے پھر سلام پھیرا اور گرہن اتنی دیر میں ختم ہو چکا تھا تو فرمایا: ''بے شک چاند و سورج اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جو کسی کی موت و حیات کے باعث گرہن زدہ نہیں ہوتے، جب یہ کیفیت دیکھو تو اللہ کو یاد کرو۔''[1] بقول حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ یہ دونوں حدیثیں اس باب کی صحیح ترین روایات ہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نمازِ کسوف کے ضمن میں صحیح، صریح و محکم سنت ہر رکعت میں دو رکوع ہیں، سیدہ عائشہ، ابن عباس، جابر، ابی بن کعب، ابن عمرو اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہم کی روایات کے مدِنظر، ان سب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہر رکعت میں تکرارِ رکوع روایت کیا ہے اور یہ تکرارِ رکوع کا عدم ذکر کرنے والوں کی نسبت اکثر، اجلّ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخص ہیں، یہی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا میلان یہ ہے کہ نمازِ کسوف کی نمازِ عید و جمعہ کی طرح دو رکعات ہیں، ان کا استدلال سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے، جو کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گرہن کے موقع پر تمہاری اسی نماز کی طرز پر نماز پڑھائی، اسی طرح آپ رکوع و سجود کرتے رہے، دو رکعتیں پڑھائیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے، تا آنکہ گرہن ختم ہوا۔[2] سیدنا قبیصہ ہلالی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب گرہن لگے، تو پچھلی گزری فرض نماز کی طرز پر نمازِ کسوف پڑھا کرو۔''[3] اسے احمد اور نسائی نے نقل کیا دونوں رکعتوں میں فاتحہ کی قراءت واجب ہے، بعد میں جہاں سے چاہے پڑھے، بالجہر یا بالسرّ دونوں طرح جائز ہے۔ البتہ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بالجہر اصح ہے اور اس کا وقت گرہن شروع ہونے سے لے کر ختم ہونے تک ہے۔

چاند گرہن کی نماز بھی سورج گرہن کی مثل ہے، حسن بصری رحمہ اللہ راوی ہیں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما امیر بصرہ تھے کہ چاند گرہن لگا، تو ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں اور ہر رکعت میں دو رکوع کیے پھر سواری پر بیٹھ کر کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح نمازِ کسوف پڑھتے دیکھا ہے۔[4] اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے مسند میں نقل کیا، علاوہ ازیں تکبیر، دعا کرنا اور صدقہ و استغفار بھی مستحب ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکور ہے، کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چاند و سورج اللہ کی نشانیاں ہیں، انہیں کسی کی موت و حیات کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا، جب یہ دیکھو تو اللہ سے دعا کرو، تکبیریں کہو، صدقہ و خیرات کرو اور استغفار کرو۔''

سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، کہتے ہیں: سورج گرہن لگا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور فرمایا: ''جب یہ دیکھو تو اللہ کے ذکر، دعا اور استغفار کی طرف جلدی کرو۔''[5]

---

[1] صحیح البخاری: ١٠٥٢؛ صحیح مسلم: ٩٠٧. [2] منکر، سنن نسائی: ١٤٨٤؛ سنن أبی داود: ١١٩٣؛ سنن ابن ماجه: ١٢٦٢؛ بقول محشی ضعیف ہے۔ [3] ضعیف، سنن نسائی: ١٤٨٥؛ مسند أحمد: ٥/ ٦٠، ٦١ وفی النسائی عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ. [4] مسند الشافعی: ٤٧٦. [5] صحیح، مستخرج ابی عوانه: ٢٤٣٢؛ سنن الکبری للبیهقی: ٦٣٦٣.

نمازِ استسقا

استسقا سے مراد قحط سالی اور بارشوں کے انقطاع کے وقت درجِ ذیل میں سے کسی طریقے پر اللہ سے بارشوں کی طلب اور قحط سالی اٹھالینے کی دعا کرنا:

① امام سوائے اوقاتِ کراہت کے کسی بھی وقت دو رکعتیں پڑھائے اور اول رکعت میں فاتحہ کے بعد ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ کی بالجہر قراءت کرے اور دوسری میں فاتحہ کے بعد ﴿هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ پڑھے اور نماز سے قبل یا بعد میں خطبہ دے اور آخر میں اپنی چادر کی تحویل کرے، مقتدی بھی یہ کریں وہ اس طرح کہ اپنا دایاں کنارا بائیں طرف اور بایاں کنارا دائیں طرف کرلیں اور قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھائے، نہایت گڑگڑا کر دعا کریں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت متواضع حالت میں خشوع کی کیفیت میں اور پراگندہ بال لیے نکلے اور کام کاج والے کپڑے پہنے نہایت تضرُّع کے ساتھ عید کی طرح دو رکعتیں پڑھائیں، البتہ خطبہ نہیں دیا،[1] اسے خمسہ نے نقل کیا ترمذی، ابوعوانہ اور ابن حبان نے صحت کا حکم لگایا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارشوں کے قحوط (انقطاع) کی شکایت کی، تو آپ نے حکم دیا کہ عید گاہ منبر لگایا جائے، پھر ایک دن مقرر کر کے سورج طلوع ہونے کے ذرا بعد نکلے، اور منبر پر بیٹھے، تکبیر کہی اور اللہ کی حمد بیان کی، پھر فرمایا: ''تم نے قحط سالی کی شکایت کی ہے اور اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اس سے دعا کرو اور وعدہ کیا ہے کہ وہ قبول کرے گا۔'' پھر کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَفْعِلُ مَا يُرِيْدُ اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ أَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبلَاغاً إِلىٰ حِيْنٍ» ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے نہایت رحم کرنے والا بڑا مہربان، مالک ہے قیامت کے دن کا، نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اے اللہ! تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو غنی اور ہم فقرا ہیں، ہم پر بارش برسا اور جو تم ہم پر نازل کرے اسے ہمارے لیے مفید ثابت کر۔'' پھر ہاتھ اٹھائے، مسلسل دعا کرتے رہے حتی کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دی، پھر لوگوں کی طرف پشت کی اور چادر ادل بدل کی، اس دوران میں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے، پھر لوگوں کی طرف رخ کیا اور منبر سے اتر آئے اور دو رکعتیں پڑھائیں، اسی دوران میں بادل گھر آئے اور گڑگڑانے لگے اور بجلی چمکنے لگی اور بارش شروع ہوگئی، ابھی مسجد واپس نہ پہنچے تھے کہ راستے بہہ پڑے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کی گھروں کی طرف جانے کی سرعت ملاحظہ کی تو کھلکھلا کر ہنس پڑے اور فرمایا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔''[2] اسے حاکم نے نقل کیا اور کہا: صحیح ہے، ابوداود نے بھی نقل کیا اور لکھا: یہ حدیث غریب ہے (غریب ضعیف نہیں ہوتی بلکہ مراد یہ کہ اس کی سند اتنی معروف نہیں، اجنبی سی ہے، اسی لیے

---

① حسن، سنن أبي داود: ١١٦٥؛ سنن ترمذي: ٥٥٨؛ سنن نسائي: ١٥٠٧. ② حسن، سنن أبي داود: ١١٧٣؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٣٢٨.

ساتھ ہی کہا) مگر اس کی سند جید ہے۔ عباد بن تمیم اپنے چچا عبداللہ بن زید مازنی سے راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ استسقا کی نیت سے لوگوں کے ہمراہ نکلے، دو رکعتیں پڑھائیں اور ان میں بالجہر قراءت کی۔[1] اسے جماعت نے تخریج کیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک روز بارش کی دعا کرنے نکلے اور ہمیں اذان واقامت کے بغیر دو رکعتیں پڑھائیں، پھر خطبہ دیا اور اللہ سے دعا کی اور ہاتھ اٹھائے ہوئے قبلہ رخ ہوئے، پھر چادر ادل بدل کی تو اس کا دایاں کنارا بائیں کندھے اور بایاں دائیں کندھے پر کیا۔[2] اسے احمد، ابن ماجہ اور بیہقی نے نقل کیا۔

② امام خطبہ جمعہ میں اس کی اجتماعی دعا کرادے اور نمازی آمین، آمین کہیں، چنانچہ بخاری اور مسلم نے شریک عن انس سے نقل کیا کہ ایک شخص جمعے کے دن مسجد میں داخل ہوا اور نبی کریم ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے تو پکار کر کہا: یا رسول اللہ! اموال ہلاک ہونے لگے اور راستے منقطع ہوئے، اللہ سے بارش کی دعا فرمائیں، تو آپ نے ہاتھ اٹھائے اور تین مرتبہ کہا: ((اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا)) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: تب آسمان بالکل صاف تھا، کہیں بادل کا ایک ٹکڑا نہ تھا، تو سلع پہاڑ کے پیچھے سے دیکھتے ہی دیکھتے ڈھال کی مثل ایک بدلی نمودار ہوئی اور آسمان کے درمیان میں پہنچ کر چاروں طرف پھیل گئی اور بارش ہونے لگی، اللہ کی قسم! ہم نے پورے سات دن تک سورج کا چہرہ نہیں دیکھا، پھر اگلے جمعے اسی دروازے سے ایک شخص داخل ہوا اور نبی کریم ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے، کہنے لگا: یا رسول اللہ! اموال ہلاک ہونے لگے اور راستے بند ہو گئے، آپ اللہ سے بارش تھم جانے کی دعا فرمائیں، تو آپ نے ہاتھ اٹھائے اور کہا: اے اللہ! ہم پر نہیں بلکہ ہمارے اردگرد بلند جگہوں، ٹیلوں، وادیوں کے اندر اور جنگلوں میں۔'' کہتے ہیں: بارش رک گئی اور ہم جب نکلے تو سورج چمک رہا تھا۔[3]

③ جمعہ کے علاوہ کسی بھی دن مجرد دعا کرے، چاہے نماز کے اندر یا بعد میں، چنانچہ ابن ماجہ اور ابوعوانہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں ایسی قوم سے آیا ہوں کہ ان کے پاس چارہ ختم ہو چکا اور جانور لاغر ہو چکے ہیں، تو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ کی حمد وثنا کی پھر یہ دعا کی: ((اَللّٰهُمَّ غَيْثاً مُغِيْثاً مَرِيْئاً مَرِيْعاً طَبَقاً غَدِقاً عَاجِلاً غَيْرَ رَائِثٍ)) ''اے اللہ! ہم پر (خشک سالی سے) نجات دینے والی، مفید، ہریالی کا باعث بننے والی، کھلی، کثیر اور موسلا دھار بارش برسا جلد از جلد۔'' پھر اتر آئے اور ہر طرف سے آنے والوں نے بارشیں ہونے کی بابت بتلایا۔[4] اسے ابن ماجہ، اور ابوعوانہ نے ثقہ رجال والی سند کے ساتھ نقل کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں اس روایت پر سکوت کیا ہے، شرحبیل بن سمط رحمہ اللہ راوی ہیں کہ انہوں نے سیدنا کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: اے کعب! ہمیں رسول اللہ ﷺ کی کوئی بات سناؤ، تو وہ بولے ایک آدمی حاضر خدمت ہوا اور کہا: آپ مضر کے لیے بارش کی دعا کریں (یہ ابوسفیان تھے اور ابھی اسلام قبول نہ کیا تھا) فرمایا: ''مضر کے لیے؟ (جو کافر تھے) تم تو بڑے جری ہو۔''

---

① صحیح، سنن أبي داود: ١١٦١. ② ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٢٦٨؛ مسند أحمد: ٤/ ٤١. ③ صحیح البخاري: ١٠١٤؛ صحیح مسلم: ٨٩٧. ④ ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٢٧٠؛ مسند أبي عوانه: ٢٥١٦.

(جو مجھے کافروں کے لیے دعا کرنے کو کہہ رہے ہو) اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اللہ سے نصرت مانگی، تو اس نے عطا کی، اللہ سے دعا کی تو اس نے قبول کی، اس پر آپ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کرتے ہوئے کہا: «اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثاً مُغِیْثاً......» وہی اوپر والی آخر میں ہے: «نَافِعاً غَیْرَ ضَارٍّ» تو بارشیں شروع ہوئیں، زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ لوگ بارشوں کی کثرت کی شکائتیں کرنے لگے اور کہا: گھر ڈھے گئے ہیں تو آپ نے دعا کی اور کہا: «اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا» ''اے اللہ! ہمارے اردگرد، نہ کہ ہم پر۔'' تو بادل دائیں بائیں بکھرنا شروع ہو گئے۔[1] اسے احمد، ابن ماجہ، بیہقی، ابن ابی شیبہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے اور اس کی اسناد صحیحین کی شرط پر ہے، امام شعبی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بغرضِ استسقا نکلے تو صرف استغفار پر اکتفا کیا، لوگوں نے کہا: آپ نے بارش تو مانگی ہی نہیں؟ کہنے لگے: میں نے اس کے اسباب کو اختیار کیا ہے (یعنی اللہ ہماری لغزشیں معاف کر دے گا، تو مہربان ہو کر بارش برسائے گا) پھر یہ آیت پڑھی: ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ (نوح: ۱۰۔۱۱) اور یہ آیت: ﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ﴾ (ہود: ۳) اسے سعید (بن منصور) نے اپنی سنن میں اور عبدالرزاق، بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے نقل کیا۔[2]

اس ضمن کی بعض ماثور ادعیہ حسب ذیل ہیں:

① امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سالم بن عبداللہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ بارش کی طلب کرتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ دعا کرتے تھے: «اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثاً مُغِیْثًا مَرِیْعًا غَدِقاً مُجَلِّلًا عَامًّا طَبَقًا سَحًّا دَائِمًا اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا الْغَیْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِیْنَ اَللّٰھُمَّ إِنَّ بِالْعِبَادِ وَالْبِلَادِ وَالْبَهَائِمِ وَالْخَلْقِ مِنَ اللَّأْوَاءِ وَالْجَهْدِ وَالضَّنْكِ مَا لَا نَشْكُوْهُ إِلَّا إِلَیْكَ اَللّٰھُمَّ أَنْبِتْ لَنَا الزَّرْعَ وَأَدِرَّ لَنَا الضَّرْعَ وَاسْقِنَا مِنْ بَرَكَاتِ السَّمَاءِ وَأَنْبِتْ لَنَا مِنْ بَرَكَاتِ الْأَرْضِ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ عَنَّا الْجَهْدَ وَالْجُوْعَ وَالْعُرْيِ وَاكْشِفْ عَنَّا مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا يَكْشِفُهُ غَیْرُكَ اَللّٰھُمَّ إِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ إِنْكَ كُنْتَ غَفَّارًا فَأَرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَیْنَا مِدْرَارًا» ملخص یہ کہ اے اللہ! تو ہم پر رحمت کی اور نفع دینے والی موسلا دھار بارش برسا اور ہماری قحط سالی دور کر، اسے تیرے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا اور ہمارے لیے زمین کی برکتیں ظاہر کر اور ہمارے کھیتوں کو سرسبز کر، اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔[3] امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ امام یہ دعا کرے۔

(ب) سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: «اَللّٰھُمَّ جَلِّلْنَا سَحَاباً كَثِیْفاً قَصِیْفاً دَلُوْقاً ضَحُوْكاً تُمْطِرُنَا مِنْهُ رَذَاذاً قِطْقِطاً سجلاً یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» ''اے اللہ! ہمیں گھنے بادلوں سے نواز اور ان کے ذریعے ہمیں لگاتار، موسلا دھار، بھاری، بوچھاڑ والی کڑک والی بارش عطا فرما اور ہلکی بھی اور تقاطرِ امطار بھی، اے جلال واکرام والے۔''[4]

---

① صحیح، سنن ابن ماجہ: ۱۲۶۹. ② ضعیف، السنن الکبری للبیهقی: ٦٤٢٣. ③ منقطع، کتاب الأم للشافعی: ١/ ٢٨٧. ④ ضعیف، مستخرج ابی عوانه: ٢٥١٤؛ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے واہ قرار دیا ہے۔

(ج) عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ بارش کی طلب میں یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهَائِمَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَأَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ» اے اللہ! اپنے بندوں کو اور چوپاؤں کو سیراب کر، اپنی رحمت نشر کر اور مردہ شہر کو زندگی بخش۔''[1] اسے ابوداود نے نقل کیا، دعائے استسقا کے وقت مستحب ہے کہ ہاتھ الٹی جانب سے اٹھائے جائیں، چنانچہ مسلم کی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بارش کی دعا کی، تو ہاتھوں کی الٹی جانب آسمان کی طرف کی۔[2] بارش دیکھ کر یہ کہنا مستحب ہے: «اَللّٰهُمَّ صَيِّباً نَافِعاً» ''اے اللہ! نافع بارش دے۔''[3] اور جسم ننگا کرے (یعنی کچھ حصہ مثلاً پیٹ) تاکہ بارش اسے لگے، اگر کثرت سے ہورہی بارشیں نقصان دہ ثابت ہورہی ہوں، تو یہ دعا کرے: «اَللّٰهُمَّ سُقْيَا رَحْمَةٍ وَلَاسُقْيَا عَذَابٍ وَلَا بَلَاءٍ وَلَاهَدْمٍ وَلَاغَرَقٍ اَللّٰهُمَّ عَلَى الظِّرَابِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا»[4] یہ سب دعائیں نبی کریم ﷺ سے مختلف مواقع پر ثابت ہیں۔

سجدۂ تلاوت

جس نے سجدے والی آیت پڑھی یا سنی، اس کے لیے مستحب ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر ایک سجدہ کرے اور اللہ اکبر کہہ کر ہی اس سے اٹھے، اسے سجدۂ تلاوت کہا جاتا ہے، اس میں تشہد اور سلام نہیں، نافع عن ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن پڑھتے ہوئے جب سجدہ والی آیت سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی کرتے۔[5] اسے ابوداود، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا، بقول حاکم کے صحیحین کی شرط پہ ہے، ابوداؤد نے عبدالرزاق کے حوالے سے نقل کیا کہ امام ثوری رحمہ اللہ یہ حدیث سن کر بہت خوش ہوتے تھے، ابوداود کہتے ہیں: اس کی وجہ سے یہ تھی کہ وہ اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں جاتے اور حدیث میں یہی کہہ کر اٹھنے کا ذکر ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تو سجدے والی آیت پڑھے تو اللہ اکبر کہہ اور سجدہ کر اور جب تو سر اٹھانے لگے تو بھی اللہ اکبر کہہ۔

① سجدۂ تلاوت کی فضیلت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب ابن آدم سجدے والی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے، تو شیطان الگ ہو کر روتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! اسے سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کرلیا، اب اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو میں نے انکار کردیا تھا، تو میرے لیے دوزخ ہے۔''[6] اسے احمد، مسلم اور ابن ماجہ نے تخریج کیا۔

---

① حسن، سنن أبي داود: ١١٧٦. ② صحيح مسلم: ٨٩٦. ③ صحيح البخاري: ١٠٣٢. ④ ضعيف، مسند الشافعي: ٥١٨. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ١٤١٣؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ٣٢٥. ⑥ صحيح مسلم: ٨١؛ سنن ابن ماجه: ١٠٥٢.

② سجدۂ تلاوت کا حکم

جمہور علماء کی رائے میں سجدہ تلاوت پڑھنے اور سننے والے دونوں کے لیے سنت ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کے ہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے منبر پر جمعہ کے دن (خطبہ جمعہ) میں سورۂ نحل پڑھی، جب سجدے والی آیت آئی، تو اترے اور سجدہ کیا، تو لوگوں نے بھی کیا، اگلے جمعہ پھر اسی کی تلاوت کی اور اس دفعہ سجدہ نہ کیا، بلکہ کہا: اے لوگو! ہمیں سجدۂ تلاوت کا حکم نہیں دیا گیا، تو جو کرے وہ بھی درست اور جو نہ کرے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔[1] ایک روایت کے الفاظ ہیں: بے شک اللہ نے ہم پر یہ سجدہ کرنا فرض نہیں کیا، بلکہ اسے ہماری مشیت پر چھوڑا ہے۔[2] سوائے ابن ماجہ کے جماعت نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ نجم سنائی، تو آپ نے سجدہ نہ کیا۔[3] اسے دارقطنی نے نقل کیا، کہتے ہیں: حاضرین میں سے کسی نے بھی سجدہ نہ کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس امر کو ترجیح دی ہے کہ اس موقع پر سجدہ نہ کرنا بیانِ جواز کے لیے تھا، امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی اسی پر جزم ہے، اس کی تائید میں بزار اور دارقطنی کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور ہم نے بھی آپ کے ہمراہ سجدہ کیا،[4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: اس کے راوی ثقہ ہیں، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مکہ میں) سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، تو تمام حاضرین نے سجدہ کیا، ماسوائے ایک قریشی بوڑھے کے جس نے مٹھی میں کنکریاں یا مٹی لے کر اپنی پیشانی پر لگائی اور کہا: مجھے تو یہی کافی ہے، کہتے ہیں: اسے بعد ازاں (بدر میں) مقتول دیکھا،[5] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

③ سجدۂ تلاوت کی تعداد

یہ کل پندرہ عدد ہیں، سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قرآن میں پندرہ سجدے پڑھائے، ان میں سے تین طوال مفصل (قرآن کے شروع کی طویل سورتوں) میں اور سورۂ حج میں ہیں،[6] اسے ابوداود، ابن ماجہ، حاکم اور دارقطنی نے نقل کیا، منذری اور نووی نے اسے حسن قرار دیا، یہ درج آیات میں ہیں:

① سورۂ اعراف کی آخری آیت:

﴿إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ﴾

② سورۂ رعد کی آیت نمبر ۱۵:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُم بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾

---

① صحیح البخاری: ۱۰۷۷. ② صحیح البخاری: ۱۰۷۷. ③ صحیح البخاری: ۱۰۷۳. ④ صحیح، سنن الدارقطنی: ۱۵۰۸؛ مسند البزار: ۷۵۳. ⑤ صحیح البخاری: ۱۰۷۰؛ صحیح مسلم: ۵۷۶. ⑥ ضعیف، سنن أبی داود: ۱۴۰۱؛ سنن ابن ماجہ: ۱۰۵۷.

③ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۴۹:

﴿ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾

④ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۰۷:

﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴾

⑤ سورۂ مریم کی آیت نمبر ۵۸:

﴿ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ﴾

⑥ سورۂ حج کی آیت نمبر ۱۸:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾

⑦ اور آیت نمبر ۷۷:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾

⑧ سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۶۰:

﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾

⑨ سورۂ نمل کی آیت نمبر ۲۵:

﴿ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴾

⑩ سورۂ سجدۃ کی آیت نمبر ۱۵:

﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾

⑪ سورۂ ص کی آیت نمبر ۲۴:

﴿ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴾

⑫ سورۂ حم فصلت کی آیت نمبر ۳۷:

﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾

⑬ سورۂ نجم کی آخری آیت:

﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ﴾

⑭ سورۂ انشقاق کی آیت نمبر ۲۱:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴾

⑮ اور سورۂ علق کی آخری آیت:

﴿ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ﴾

④ سجدۂ تلاوت کی ادائیگی کی شروط

جمہور فقہا کے ہاں سجدہ تلاوت کرنے کی وہی شروط ہیں، جو نماز کی ہیں، مثلاً باوضو ہونا، قبلہ رخ ہونا اور سترِ عورہ، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ سجدۂ تلاوت کی روایات میں اس امر پر دال کوئی چیز نہیں کہ ساجد باوضو ہو، نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جملہ حاضرین نے کئی مواقع پر سجدہ کیا ہے اور کہیں منقول نہیں کہ آپ نے وضو سے ہونے کا حکم دیا ہو اور بعید ہے کہ سبھی حاضرین باوضو ہوں، پھر (سورۂ نجم کی مکہ میں) تلاوت کے موقع پر مشرکین نے بھی سجدہ کیا تھا، جبکہ وہ نجس ہیں، ان کے وضو کا تو اعتبار ہی نہیں، بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے مذکور ہے کہ بغیر وضوء سجدہ تلاوت کر لیتے تھے۔[1] یہی ابن ابی شیبہ نے ان سے نقل کیا، ابن حجر رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ بیہقی سے نقل کیا کہ آدمی تبھی سجدہ کرے، جب وہ طاہر ہو تو ان کے مابین وہ تطبیق دی جائے، جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا کہ بعض نے اسے طہارتِ کبریٰ یا حالتِ اختیار پر محمول کیا ہے اور اول کو مجبوری پر اسی طرح کپڑے اور جگہ کے طاہر ہونے کی شرط کے بارے بھی ان روایات میں دلالت نہیں، جہاں تک سترِ عورہ اور قبلہ رخ ہونا اگر ممکن ہو تو کہا گیا: یہ بالاتفاق معتبر ہے! فتح الباری میں ہے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بلا وضو جوازِ سجدہ کی رائے پر کسی نے موافقت نہیں کی ماسوائے شعبی کے، اسے ابن ابی شیبہ نے ان سے صحیح سند سے نقل کیا، انہوں نے ابوعبدالرحمن سلمی سے نقل کیا کہ وہ بغیر وضو کے سجدہ تلاوت کر لیتے تھے اور رخ بھی جانبِ قبلہ نہ ہوتا، کئی دفعہ چل رہے ہوتے تو اس دوران میں قراءت کرتے ہوئے آیتِ سجدہ آتی، تو اشارہ سے سجدہ کرتے اور اہل بیت میں سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی موافقت کرنے والوں میں سے ابوطالب اور منصور باللہ ہیں۔

⑤ سجدۂ تلاوت کی تسبیح

سجدۂ تلاوت میں جو تسبیح چاہے پڑھ سکتا ہے، نبی کریم ﷺ سجودِ تلاوت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے علاوہ کچھ صحیح ثابت نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سجدہ تلاوت میں یہ تسبیح پڑھتے تھے: «سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ» ”میرے چہرے نے اس ذات کے لیے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کے کان اور آنکھ کو اپنی قدرت وقوت سے کھولا جو

---

[1] صحیح البخاری، قبل الرقم: ۱۰۷۱.

بابرکت احسن الخالقین ہے۔''[1] اسے ماسوائے ابن ماجہ کے خمسہ نے تخریج کیا، حاکم نے بھی اسے نقل کیا اور ترمذی اور ابن سکن نے اس پر حکمِ صحت لگایا اور آخر میں ((ثَلَاثاً)) کا اضافہ کیا، علاوہ ازیں سجدۂ تلاوت میں ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الأَعْلىٰ)) بھی پڑھ سکتا ہے۔

⑥ دورانِ نماز سجدۂ تلاوت

امام کے لیے اور منفرد کے لیے بھی نماز میں سجدہ والی آیت پڑھنا جائز ہے، چاہے جہری نماز ہو یا سری اور سجدہ کرنا بھی، بخاری اور مسلم نے ابورافع سے نقل کیا، کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نمازِ عشا ادا کی تو سورۂ انشقاق کی قراءت کی اور سجدہ تلاوت کیا، میں نے بعد میں پوچھا: یہ کون سا سجدہ تھا؟ کہا: میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کی، تو آپ نے بھی یہی سورت پڑھی اور سجدہ بھی کیا، تو میں بھی کرتا رہوں گا، حتی کہ آپ سے جا ملوں۔[2] حاکم نے صحیحین کی شرط پر قرار دیا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کی پہلی رکعت میں سجدہ تلاوت کیا، صحابہ کا خیال ہے کہ آپ نے سورۂ الم السجدۃ پڑھی تھی۔[3] امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارے نزدیک امام کے لیے سجدہ والی آیت پڑھنا مکروہ نہیں، اسی طرح منفرد کے لیے بھی، چاہے جہری نماز ہو یا سری اور سجدہ کرنا بھی، امام مالک رحمہ اللہ نے مطلقاً مکروہ کہا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سری میں مکروہ ہے، جہری میں نہیں، مؤلف البحر لکھتے ہیں: ہمارے ہاں آیتِ سجدہ پڑھنے کی صورت میں سجدہ تلاوت سلام پھیرنے کے بعد کرے، تاکہ مقتدیوں کو پریشانی نہ ہو۔

⑦ آیتِ سجدہ کو مکرراً پڑھنا یا سننا

اگر قاری نے بار بار سجدہ والی آیت پڑھی یا کسی نے ایک ہی جگہ بار بار سنی تو ایک بار سجدہ کرنا ہی کافی ہوگا، اگر پہلی دفعہ پڑھنے یا سننے کے بعد سجدہ کرلیا تھا، تو بعض کے نزدیک پھر پڑھنے کی صورت میں نیا سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں، جب کہ بعض قائل ہیں کہ چونکہ سبب متجدد ہوا ہے، لہٰذا دوبارہ سجدہ کرے (بقول محشی یہ امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قول ہے)۔

⑧ سجدۂ تلاوت کی قضا

آیتِ سجدہ کی قراءت یا سماع کے فوری بعد سجدہ کرلینا مستحب ہے، اگر مؤخر کیا تو وہ ساقط نہ ہوگا، لیکن اگر کافی مدت گزر گئی، تب وہ ساقط ہوا، جس کی کوئی قضا نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: ٧٧١؛ سنن أبی داود: ١٤١٤؛ سنن ترمذی: ٥٨٠. [2] صحیح البخاری: ٧٦٨؛ صحیح مسلم: ٥٧٨. [3] ضعیف، المستدرك للحاکم: ١/ ٢٢١.

سجدۂ شکر

جمہور علماء اس کے استحباب کے قائل ہیں، ہر اس کے لیے جسے کوئی نعمت عطا ہو یا اس سے کوئی مصیبت ٹل جائے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی خوشکن امر کی اطلاع ملتی، تو اللہ کے شکرانہ کے طور پر سجدے میں گر جاتے۔[1] اسے ابو داؤد، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، بیہقی نے بخاری کی شروطِ سند سے نقل کیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بذریعہ خط نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمدان قبیلہ کے مسلمان ہو جانے کی اطلاع دی، تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ((اَلسَّلَامُ عَلٰی هَمْدَان اَلسَّلَامُ عَلٰی هَمْدَان))[2] سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، میں آپ کے پیچھے گیا، آپ ایک باغ میں داخل ہوئے اور سجدہ کیا اور طویل سجدہ کیا، اتنا طویل کہ مجھے ڈر ہوا کہ اللہ نے آپ کو فوت نہ کر لیا ہو، میں آگے بڑھا تو آپ نے سر اٹھایا اور کہا: ''عبدالرحمن کیا بات ہے؟'' میں نے اپنا اندیشہ بتلایا، تو فرمایا: ''جبریل علیہ السلام آئے تھے اور کہا: کیا میں آپ کو خوشخبری سناؤں، پھر یہ وحی پہنچائی کہ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا ہے، جس نے آپ درود بھیجا، میں اس پر بھیجوں گا اور جس نے سلام بھیجا میں اس پر بھیجوں گا، اس پر میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔[3] اسے احمد نے اور حاکم نے صحیحین کی شرط پر قرار دے کر صحیح لکھا، سجدۂ شکر کے بارے اس سے اصح حدیث سے میں واقف نہیں ہوں، بخاری نے روایت نقل کی کہ سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو جب قبولِ توبہ کی خوشخبری ملی، تو سجدۂ شکر ادا کیا تھا،[4] احمد نے ذکر کیا کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خوارج کے مقتولوں میں ذوالثدیہ ملا تو سجدۂ شکر ادا کیا تھا۔[5] سعید بن منصور نے نقل کیا کہ جب مسیلمہ کے قتل کی خبر آئی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سجدہ میں گر پڑے تھے، بعض کے نزدیک سجدۂ شکر کرنے کے لیے وہی شروط ہیں، جو نماز کی ہیں، لیکن بعض کے ہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ نماز تو نہیں، فتح العلام میں اس ثانی کو اقرب کہا، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ اس ضمن کی احادیث میں شروطِ نماز ملحوظ رکھنے پر کوئی دلیل نہیں ہے، اسی طرح اللہ اکبر کہہ کر سجدۂ شکر میں جانے پر بھی کوئی دلیل نہیں۔

سجدۂ سہو

ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کئی دفعہ نماز میں بھول کا شکار ہوئے ہیں، آپ کا فرمان تھا: ''میں تمہاری طرح بشر ہوں، لہٰذا میں بھی کبھی بھول جاتا ہوں، تو جب ایسا ہو مجھے یاد دلا دیا کرو۔''[6] اس ضمن میں متعدد احکام مشروع ہیں جن کا ملخص حسبِ ذیل ہے:

---

[1] حسن، سنن أبی داود: ٢٧٧٤؛ سنن ترمذی: ١٥٧٨؛ سنن ابن ماجه: ١٣٩٤. [2] السنن الكبرى للبيهقی: ٢/ ٣٦٩. [3] صحيح مسلم: ٢٧٦٩؛ مسند أحمد: ١/ ١٩١. [4] صحيح البخاری: ٤٤١٨؛ صحيح مسلم: ٢٧٩٦.
[5] حسن، مسند أحمد: ١/ ١٠٧، ١٠٨. [6] صحيح البخاری: ٤٠١؛ صحيح مسلم: ٥٧٢.

① سجدہ سہو کی کیفیت

یہ دو سجدے ہیں، نمازی سلام سے قبل یا بعد انہیں ادا کرے گا، دونوں طرح نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے، بخاری میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کو نماز کی رکعات کی تعداد میں شک لاحق ہو تو ظنِ غالب پر بنا کرے، پھر سلام سے قبل دو (اضافی) سجدے کرلے۔''[1] افضل یہ ہے کہ اس سلسلے میں منقول کی متابعت کی جائے، تو جس ضمن میں قبل از سلام سجدہ سہو کرنے کا ذکر ہے، وہاں سلام سے قبل کرے اور جہاں بعد از سلام ذکر ہے وہاں یہی کرے، دیگر میں جیسے چاہے کرے، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس مقام پر احسن یہ کہا جانا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اقوال و افعال کے مقتضا پر عمل پیرا ہو تو جو اسبابِ سجود قبل از سلام کے ساتھ مقید ہیں، وہاں سلام سے قبل کرے اور جو بعد از سلام کے ساتھ مقید ہیں، ان میں سلام کے بعد کرے اور جہاں کوئی تقیید وارد نہیں ہوئی، تو اسے اختیار ہے کہ سلام سے پہلے کرے یا بعد میں، بغیر کمی یا بیشی کا فرق ملحوظ کیے کیونکہ مسلم میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِذَا زَادَ الرَّجُلُ أَوْ نَقَصَ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ» ''جب نماز میں کوئی کمی یا بیشی کرے تو دو سجدے ادا کرے۔''[2]

② وہ احوال جن میں سجدۂ سہو مشروع ہے، یہ درج ذیل ہیں

① اگر نماز پوری ہونے سے قبل سلام پھیر دیا

ابن سیرین عن ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دن کی کسی نماز میں دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا، پھر ایک تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، لگتا تھا آپ غصہ میں ہیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنسا کر رخسار مبارک بائیں کف پر ٹکا لیا، جلد باز لوگ مسجد کے دروازے سے نکل گئے، حاضرین چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ نماز میں کمی کر دی گئی ہے، مقتدیوں میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، مگر آپ کی ہیبت نے انہیں آپ سے بات کرنے سے روکا، ذوالیدین کے لقب والے ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ فرمایا: ''نہ تو بھولا ہوں اور نہ کمی کی گئی ہے۔'' پھر لوگوں سے پوچھا: ''کیا یہی ہوا ہے، جو ذوالیدین کہتا ہے؟'' لوگوں نے کہا: جی ہاں، تو پہلے دو رکعتیں پڑھائیں جو چھوٹ گئی تھیں، پھر سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر ایک سجدہ کیا، پھر اللہ اکبر کہا: اور دوسرا سجدہ کیا پھر سر اٹھایا۔[3] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، عطاء سے منقول ہے کہ ابن زبیر نے مغرب کی نماز پڑھائی تو دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا، پھر حجرِ اسود کو بوسہ دینے لپکے لوگوں نے سبحان اللہ کہا، پوچھا کیا ہوا؟ بتلایا گیا تو ایک رکعت پڑھا کر دو سجدے سہو کے ادا کیے، اس بات کا ذکر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کیا گیا: تو بولے سنتِ نبوی پر عمل کیا،[4] اسے احمد، بزار اور طبرانی نے نقل کیا۔

---

① صحیح مسلم: ٥٧١. ② صحیح مسلم: ٥٧٢. ③ صحیح البخاری: ٤٨٢؛ صحیح مسلم: ٥٧٣.
④ حسن، مسند أحمد: ٥/ ٣٥١.

② اگر نماز میں اضافہ کر دیا

جماعت نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے پانچ رکعتیں پڑھا دیں، عرض کی گئی: کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ فرمایا: ''کیا ہوا؟'' عرض کی: آپ نے پانچ رکعتیں پڑھائی ہیں، تو آپ نے سہو کے دو سجدے کیے،[1] اس سے دلالت ملی کہ اگر بھول کر ایک رکعت اضافی پڑھ لی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز نہیں ہوئی (تو دوبارہ پڑھے یا چھٹی رکعت بھی پڑھ لے تاکہ یہ دو ہو جائیں، جیسا کہ عمومی خیال ہے، بس دو سجدے سہو کے ادا کرے اور بس)۔

③ پہلا تشہد یا نماز کی سنتوں میں سے کوئی سنت چھوٹ جانے کی صورت میں

جماعت نے سیدنا ابن بحسینہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ دو رکعت کے بعد بغیر تشہد بیٹھے اٹھ گئے، لوگوں نے سبحان اللہ بھی کہا، مگر آپ جاری رہے پھر سلام سے قبل دو سجدے ادا کیے،[2] حدیث میں ہے کہ اگر پوری طرح کھڑا ہونے سے پیشتر پہلا تشہد یاد آ گیا، تو لوٹ آئے اور اگر پوری طرح کھڑا ہو چکا تھا، تو اب نہ لوٹے، اس کی تائید احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ کی سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہے، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی پہلا تشہد بھول گیا اور ابھی پوری طرح کھڑا نہیں ہوا، تو لوٹ آئے (اور اس صورت میں سجدۂ سہو عائد نہیں) لیکن اگر کھڑا ہو چکا تھا، تو اب واپس نہ آئے (بلکہ جاری رہے) اور سہو کے دو سجدے کرے۔''[3]

④ جب نماز میں شک لاحق ہو جائے

سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کو نماز میں شک ہو جائے کہ ایک رکعت پڑھی ہیں یا دو، تو اسے ایک شمار کرے اور اگر شک ہو کہ دو پڑھی ہیں یا تین تو دو شمار کرے، اسی طرح اگر تین یا چار میں تردد ہو تو تین باور کرے، پھر التحیات کے آخر میں سلام سے پہلے دو سجدے کر لے،[4] اسے احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی نے صحت کا حکم لگایا، ایک روایت کے الفاظ ہیں: ((مَنْ صَلّٰی صَلَاةً يَشُكُّ فِي النُّقْصَانِ فَلْيُصَلِّ حَتّٰى يَشُكَّ فِي الزِّيَادَةِ)) ''جسے شک ہوا کہ اس نے کمی کر دی ہے، تو پوری کر لے حتی کہ یہ شک ہو کہ اضافہ کیا ہے۔''[5]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کو نماز کے دوران میں شک ہو جائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو شک دور کرے اور ظنِ غالب پر بنا کرے، پھر سلام سے قبل دو سجدے سہو کے کرے، اگر (فی الحقیقت) پانچ پڑھی تھیں تو یہ دو سجدے انہیں جفت بنا دیں گے اور اگر اس نے چار رکعتیں پوری پڑھی تو وہ دو سجدے شیطان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ہوں گے۔''[6] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، ان دونوں حدیثوں میں جمہور کے لیے دلیل ہے، جو قائل ہیں کہ شک کی صورت میں اس کم از کم عدد پر بنا کرے، جس طرف جھکاؤ نسبۃً زیادہ ہو، پھر سہو کے سجدے کرے۔

---

① صحيح البخاري: ١٢٢٦؛ صحيح مسلم: ٥٧٢. ② صحيح البخاري: ١٢٢٤؛ صحيح مسلم: ٥٧٠؛ سنن أبي داود: ١٠٣٤. ③ صحيح، سنن أبي داود: ١٠٣٦؛ سنن ابن ماجه: ١٢٠٨. ④ صحيح، سنن ترمذي: ٣٩٨؛ سنن ابن ماجه: ١٢٠٩. ⑤ حسن، مسند أحمد: ١٨٨٩. ⑥ صحيح مسلم: ٥٧١؛ سنن نسائي: ١٢٣٨.

نمازِ باجماعت

جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی سنتِ مؤکدہ ہے، اس کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہیں، چند کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''باجماعت نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ افضل ہے۔''[1] متفق علیہ۔

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماعت کے ساتھ نماز گھر یا بازار میں نماز ادا کرنے سے پچیس گنا زیادہ ثواب کی حامل ہے، کیونکہ جب عمدگی سے وضو کر کے صرف نماز کی نیت سے نکلا، تو ہر قدم کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند ہوا اور اس سے ایک غلطی مٹائی گئی، پھر جب تک نماز گاہ میں موجود رہے فرشتے اس کے لیے دعا گو رہتے ہیں، جب تک وضو نہ ٹوٹے، کہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحمت بھیج، اے اللہ! اس پر رحم کر اور جب تک وہ نماز کا منتظر ہے گویا (ثواب کے اعتبار سے) نماز میں ہے۔''[2] متفق علیہ اور یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔

③ انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اندھا شخص آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے کوئی مسجد لے جانے والا نہیں ہے، وہ گھر میں ادائیگی نماز کی رخصت ملنے کا خواہاں تھا، آپ نے اولاً یہ رخصت دے دی، جب وہ واپس مڑا تو بلا کر پوچھا: ''کیا اذان کی آواز سنتے ہو؟'' عرض کی: جی ہاں، فرمایا: ''تب مسجد ہی آکر نماز پڑھو۔''[3] اسے مسلم نے نقل کیا۔

④ انہی سے مروی ہے کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا: ''میں نے ارادہ بنالیا تھا کہ ایندھن اکٹھا کرنے کا حکم دوں، پھر کسی کو امامت کا کہہ کر خود ان لوگوں کی طرف جاؤں، جو جماعت میں حاضر نہیں ہوئے اور ان کے گھر جلا دوں لیکن پھر عورتوں اور بچوں کا خیال آ گیا۔''[4] متفق علیہ۔

⑤ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا: جسے یہ بات اچھی لگے کہ کل مسلمان ہونے کی حالت میں اللہ سے جا ملے، وہ ان نمازوں کی پابندی کرے، جب ان کے لیے اذان دی جائے! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدایت کی سنن مشروع کی ہیں اور یہ انہی سننِ ہدایت میں سے ہے، اگر تم نے گھروں میں (فرض) نمازیں پڑھنا شروع کر دیں، تو تم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک کی اور جس نے نبی کی سنت ترک کی وہ گمراہ ہوا، ہم عہدِ نبوی میں دیکھتے تھے کہ معلوم النفاق آدمی ہی جماعت سے پیچھے رہتا تھا، کئی بوڑھے صحابہ سہارا دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے لائے جاتے تھے۔[5] اسے مسلم نے تخریج کیا، ان کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت والی سنتوں کی تعلیم دی ہے اور ان میں باجماعت نماز کی ادائیگی بھی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٦٤٥؛ صحيح مسلم: ٦٥٠. [2] صحيح البخاري: ٦٤٧. [3] صحيح مسلم: ٦٥٣.

[4] صحيح البخاري: ٦٤٤؛ صحيح مسلم: ٦٥١. [5] صحيح مسلم : ٦٥٤.

⑥ سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا: ''وادی میں یا کہیں بھی تین افراد ہوں اور وہ جماعت کا اہتمام نہ کریں، تو شیطان کا ان پر غلبہ ہوگا، تم جماعت کو لازم پکڑو، کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو کھاتا اور شکار کرتا ہے، جو ریوڑ سے دور نکل گئی ہو۔''① اسے ابوداود نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا۔

① عورتوں کا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے مساجد میں آنا اور ان کے لیے گھروں میں نماز پڑھنے کی فضیلت

خواتین کے لیے بھی مساجد آکر جماعت کے ساتھ ادائیگی نماز جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہر ایسے مظہر سے اجتناب کریں، جو شہوت بڑھانے والا اور فتنہ کا موجب بن سکتا ہو، مثلاً اچھا لباس، زیب و زینت اور خوشبو لگانا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی بندیوں کو مساجد آنے سے نہ روکو، مگر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔'' سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عورتوں کو مسجد آنے سے مت روکو، لیکن عورتوں کو چاہیے کہ بن سنور کر اور خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔''② ان دونوں روایتوں کو احمد اور ابوداود نے نقل کیا، انہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جو عورت خوشبو لگا چکی ہے، وہ ہمارے ساتھ عشا پڑھنے مسجد مت آئے۔''③ اسے مسلم، ابوداود اور نسائی نے حسن سند سے نقل کیا۔ عورتوں کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ گھروں میں نماز پڑھیں، کیونکہ احمد اور طبرانی کی سیدہ ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا سے روایت میں ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: مجھے آپ کے ہمراہ جماعت میں نماز پڑھنا اچھا لگتا ہے، آپ نے فرمایا: ''یہ ٹھیک ہے مگر تمہارا اپنے حجرہ میں نماز پڑھنا محلہ کی مسجد سے اور محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔④

② دور کی مسجد اور جہاں بڑی جماعت بنتی ہو، میں نماز پڑھنے کا اجر و ثواب

دور کی مسجد اور جہاں بڑی جماعت ہو، میں نماز باجماعت پڑھنا زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے، مسلم نے سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں زیادہ اجر کا حقدار وہ شخص ہے، جو زیادہ دور سے نماز پڑھنے آتا ہے۔''⑤ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں: مسجد نبوی کے آس پاس کچھ پلاٹ خالی تھے، تو بنی سلمہ نے چاہا کہ وہ یہاں منتقل ہو جائیں، نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو فرمایا: ''اے بنی سلمہ! تمہارے قدموں کی کثرت پر اجر ہے۔''⑥ شیخین وغیرہما نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''دو کا باہم جماعت کرالینا اکیلے پڑھنے سے افضل ہے اور جماعت جتنی بڑی ہو، اللہ کو زیادہ پسند ہے۔''⑦ اسے احمد، ابوداود، ابن ماجہ اور ابن حبان نے نقل کیا، ابن سکن، عقیلی اور حاکم نے اس پر صحت کا حکم لگایا۔

---

① حسن، سنن أبی داود: ٥٤٧، سنن نسائی: ٨٤٦. ② صحیح، سنن أبی داود: ٥٦٥. ③ صحیح مسلم: ٤٤٤، سنن أبی داود: ٤١٧٥. ④ صحیح، مسند أحمد: ٦/ ٣٧١، صحیح ابن خزیمة: ٦٨٩. ⑤ صحیح مسلم: ٦٦٢.
⑥ صحیح مسلم: ٦٦٥. ⑦ حسن، سنن أبی داود: ٥٥٤، سنن نسائی: ٨٤٢، سنن ابن ماجه: ٧٩٠.

③ مسجد کی طرف سکون و وقار کے ساتھ جانے کا استحباب

مسجد کی طرف سکون اور وقار کے ساتھ جانا مندوب ہے، تیز تیز چلنا اور دوڑنا مکروہ ہے، کیونکہ جماعت کے لیے جو گھر سے نکل پڑا وہ اب نماز میں مشغول کے حکم میں ہے! چنانچہ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز میں مشغول تھے کہ کچھ لوگوں کے ہلچل کی آواز سنی، فارغ ہو کر دریافت کیا: ''کیا ہوا تھا؟'' انہوں نے کہا: جماعت کھڑی ہو چکی تھی، تو ہم نے جلدی کی، فرمایا: ''ایسا نہ کیا کرو۔ سکون کے ساتھ آؤ، جو مل جائے وہ ادا کرو اور جو رہ جائے، اسے (سلام کے بعد) پورا کرلو۔''[1] متفق علیہ۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اقامت سنو تو سکون و وقار کے ساتھ آؤ۔''[2] اسے ترمذی کے سوا سب نے نقل کیا۔

④ امام کے لیے زیادہ لمبی نماز نہ پڑھانے کا استحباب

امام کے لیے مستحب ہے کہ نماز ہلکی رکھے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو لوگوں کو نماز پڑھائے اسے چاہیے کہ نماز کو ہلکا رکھے، کیونکہ اس کے پیچھے بوڑھے بھی ہیں اور بیمار اور کمزور بھی، ہاں اپنے لیے جب پڑھے (سنتیں و نوافل وغیرہ) تو جتنی چاہے لمبی کرے۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، جماعت نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا: ''کئی دفعہ میں جب جماعت شروع کرتا ہوں، تو میرا ارادہ ہوتا ہے کہ طویل رکھوں گا لیکن کسی بچہ کے رونے کی آواز آنے لگتی ہے، تو مختصر کر دیتا ہوں، کیونکہ جانتا ہوں اس کا رونا اس کی والدہ پر دشوار ہو رہا ہے۔''[4] شیخین نے انہی سے روایت نقل کی، کہتے ہیں: میں نے کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہلکی لیکن پوری نماز پڑھاتا ہو، ابن عبدالبر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہر امام کے لیے تخفیف کرنے کا یہ معاملہ بالاجماع ہے علماء کے نزدیک اس کے لیے یہ مندوب ہے مگر تخفیف سے مراد یہ ہے کہ اقل الکمال ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کمی کرے یا کچھ تسبیحات چھوڑ ہی دے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوے کی طرح ٹھونگے مارنے سے منع فرمایا ہے۔[5] ایک آدمی کو دیکھا کہ رکوع وسجود پورے طور سے ادا نہیں کر رہا تو اسے حکم دیا کہ دوبارہ نماز پڑھے اور فرمایا: ''تم نے پڑھی ہی نہیں۔''[6] اور کہا: ''اللہ ایسے شخص کی طرف دیکھتا ہی نہیں جو رکوع وسجدہ میں کمر نہیں ٹکاتا۔''[7] لکھتے ہیں: اس بابت میں اہلِ علم کے ہاں کوئی اختلافِ آراء نہیں دیکھا، سبھی متفق ہیں کہ امام بشرطے اِتمام نماز کو ہلکا رکھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ تم اللہ کو اس کے بندوں کے لیے مبغوض نہ بناؤ کہ اتنی لمبی نماز پڑھاؤ کہ مقتدیوں پر دشوار ہو جائے، اسے ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں بحوالہ بیہقی نقل کیا اور کہا: اس کی سند صحیح ہے۔

---

① صحيح البخاری: ٦٣٥؛ صحيح مسلم: ٦٠٣. ② صحيح البخاری: ٩٠٨؛ صحيح مسلم: ٦٠٢؛ سنن أبی داود: ٥٧٢. ③ صحيح البخاری: ٧٠٣؛ صحيح مسلم: ٤٦٧. ④ صحيح البخاری: ٧٠٩؛ صحيح مسلم: ٤٧٠.
⑤ حسن، سنن أبی داود: ٨٦٢؛ سنن ابن ماجه: ١٤٢٩. ⑥ صحيح البخاری: ٧٩٣؛ صحيح مسلم: ٣٩٧.
⑦ صحيح، مسند أحمد: ٧٤٣.

⑤ پہلی رکعت کو لمبا کرے

تا کہ راستوں میں آرہے اور وضو کر رہے لوگ پہلی رکعت میں مل جائیں، اسی طرح اگر حالتِ رکوع میں ہے، تو تھوڑا طویل کر دے، اسی طرح آخری تشہد کو بھی تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جماعت میں مل پائیں، خواہ اس کے آخری حصہ میں ہی، سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت کو لمبا کیا کرتے تھے، ہمارا خیال ہے، آپ اس غرض سے یہ کرتے تھے کہ تا کہ لوگ پہلی رکعت کو پالیں، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ کئی دفعہ نماز کھڑی ہوتی اور کوئی جانے والا البقیع جا کر ضرورت پوری کر کے پھر وضو کر کے آتا اور ابھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی ہی رکعت میں ہوتے۔[1] اسے احمد، مسلم، ابن ماجہ اور نسائی نے نقل کیا۔ (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخفیف سے مراد وہ نہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں کہ چشم زدن میں نماز مکمل کرادی جائے بلکہ جیسا کہ متعدد شراح نے لکھا کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نوافل بہت طویل کر کے پڑھتے تھے تو یہ تخفیف اور اس کا حکم نوافل کی اس طوالت کی نسبت سے ہے)۔

⑥ امام کی متابعت کا وجوب اور اس سے سبقت لے جانے کی حرمت

امام کی متابعت واجب اور اس سے آگے بڑھنا حرام ہے۔ (بقول محشی علماء متفق ہیں کہ تکبیرِ تحریمہ یا سلام میں امام سے پہل کرنے والے کی نماز باطل ہوجائے گی، دیگر میں پہل کرنے کے بارے اختلاف ہے، احمد کے ہاں کسی جگہ بھی پہل کرنے سے نماز باطل ہوجائے گی، جہاں تک مساوات (امام کے بالکل ساتھ ساتھ ہر رکن ادا کرنا) تو یہ مکروہ ہے) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''امام اس لیے بنا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب وہ تکبیر کہے تب تم کہو، جب وہ رکوع میں چلا جائے، تب تم جاؤ، جب وہ سمع اللہ کہہ دے تب تم ((اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ)) کہو اور جب وہ سجدے میں پہنچ جائے، تب تم جاؤ، اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''[2] اسے شیخین نے تخریج کیا، احمد اور ابوداود کی روایتوں میں بھی یہی ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''امام سے قبل سر اٹھانے والا ڈرتا نہیں کہ کہیں اللہ اس کا سر گدھے کے سر سے بدل نہ دے یا اس کا چہرہ گدھے کے چہرہ کی طرح نہ کر دے۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں، رکوع، سجود اور قیام وقعود میں مجھ سے پہل مت کیا کرو اور نہ سلام پھیرنے میں۔''[4] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز پڑھتے، تو جب آپ سمع اللہ کہتے، تو جب تک آپ سجدہ میں جا کر اپنی پیشانی زمین پر رکھ نہ دیتے کوئی سجدہ کے لیے اپنی کمر نہ جھکاتا،[5] اسے جماعت نے نقل کیا۔

---

① صحيح مسلم: ٤٥٤؛ سنن نسائي: ٩٧٢؛ سنن ابن ماجه: ٨٢٥. ② صحيح البخاري: ٧٣٤؛ صحيح مسلم: ٤١١. ③ صحيح البخاري: ٦٩١؛ صحيح مسلم: ٤٢٧. ④ صحيح مسلم: ٤٢٦؛ مسند أحمد: ٢/ ١٠٢، ١٥٤.
⑤ صحيح البخاري: ٨١١.

⑦ دو افراد کی جماعت

امام کے سوا اگر ایک فرد بھی ہے چاہے، وہ نابالغ بچہ ہی ہو یا عورت ہو، تو جماعت کا انعقاد ہو جائے گا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے ایک رات اپنی خالہ ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزاری، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کے لیے اٹھے، تو میں بھی اٹھا اور آپ کی بائیں جانب جا کھڑا ہوا، آپ نے میرا سر پکڑ کر اپنی دائیں جانب کر لیا،[1] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو رات کو اٹھا اور اپنی اہلیہ کو جگایا پھر دونوں نے جماعت کروا کر دو نفل ادا کیے، تو اللہ تعالیٰ ان کا نام کثرت سے ذکر کرنے والوں اور والیوں میں لکھ دیتا ہے۔''[2] اسے ابو داود نے نقل کیا، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جماعت ہو چکی تھی کہ ایک شخص داخل ہوا، آپ نے فرمایا: ''کون ہے جو اس پر صدقہ کرے اور ساتھ مل کر نماز پڑھے، تا کہ جماعت ہو جائے؟'' تو حاضرین میں سے ایک شخص اٹھے اور دونوں نے مل کر جماعت کرائی،[3] اسے احمد، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، ابن ابی شیبہ نے نقل کیا کہ وہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے، جو اس شخص کی ساتھ مل گئے تھے، ترمذی نے اس حدیث سے ایسی مسجد میں دوسری جماعت کرا لینے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جس میں جماعت ہو چکی ہو، کہتے ہیں: یہی امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے! دوسرے اہلِ علم کہتے ہیں کہ اب اکیلے اکیلے پڑھ لیں، یہی سفیان، امام مالک، امام ابن مبارک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔

⑧ امام کے (امامت چھوڑ کر) مقتدی بننے کی طرف منتقل ہونے کا جواز

اگر کوئی شخص امامِ راتب (باقاعدہ امام) کی غیر موجودگی میں جماعت کرا رہا تھا کہ اسی دوران میں وہ آ گیا، تو اس عارضی امام کے لیے جائز ہے کہ دورانِ نماز ہی مقتدی کی حیثیت میں ہو جائے، شیخین کی سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے مدِ نظر جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی عمرو بن عوف کے محلہ ان کی صلح کرانے گئے ہوئے تھے، تو نماز کا وقت ہو گیا، مؤذن نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ جماعت کرا دیں، وہ آگے بڑھے اور اقامت کے بعد نماز شروع کر دی، اسی اثنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آگے آ کر (پہلی) صف میں کھڑے ہو گئے، لوگوں نے تالی بجائی تا کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آگاہ کریں، وہ نماز میں مطلقاً التفات نہ کیا کرتے تھے، لیکن مسلسل ایسا ہوا تو گوشۂ چشم سے جھانکا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نظر آئے، چنانچہ وہ پیچھے ہٹنا شروع ہوئے، آپ نے اشارہ کیا کہ وہیں ٹھہرو، اس پر انہوں نے ہاتھ اٹھائے اور اس اعزاز پر اللہ کی حمد کی پھر پیچھے آ گئے اور صف میں مل گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر مصلائے امامت سنبھال لیا، سلام کے بعد ان سے کہا: ''اے ابو بکر! میرے اشارے کے باوجود کیوں نہ وہیں رہے؟'' وہ بولے ابن ابو قحافہ کے لیے لائق نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امام بنیں، پھر آپ نے دیگر صحابہ سے فرمایا: ''تم ایسے مواقع پر بجائے تالی بجانے کے سبحان اللہ کہا کرو، یہ کہنے کی صورت میں ضرور

---

① صحيح البخاري: ٧٢٨؛ صحيح مسلم: ٧٦٣. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٤٥١؛ سنن ابن ماجه: ١٣٣٥.
③ صحيح، سنن أبي داود: ٥٧٤؛ مسند أحمد: ٣/ ٤٥.

امام متوجہ ہوگا، البتہ عورتیں (الٹے ہاتھ سے) تالی بجائیں۔''[1]

⑨ تکبیر تحریمہ کے بعد جماعت میں ملنا

بعد میں آنے والا کھڑے ہونے کی حالت میں اللہ اکبر کہہ کر اس رکن میں جائے جس میں اس وقت امام ہو، رکعت تبھی شمار کرے اور اگر رکوع پالیا ہو چاہے، رکوع کا کچھ حصہ ہی پائے (یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے) بشرطیکہ امام کے سر اٹھانے سے قبل اس کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ چکے ہوں، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی اگر بعد میں آئے تو اگر ہم سجدے میں ہوں، تو وہ سجدے میں ہم سے آن ملے اور اسے کچھ شمار نہ کرو، جس نے رکعت پالی اس نے نماز پالی۔''[2] (مدرکِ رکوع مدرکِ رکعت کے قائلین کے ہاں اس کا ترجمہ ہے: جس نے رکوع کو پالیا اس کی وہ رکعت شمار ہوئی) اسے ابوداود، ابن خزیمہ اور مستدرک میں حاکم نے تخریج کیا اور کہا: صحیح ہے، مسبوق (بعد میں آنے والا) وہی کرے، جو اس وقت امام کر رہا ہے، اگر مثلاً وہ تشہد میں ہے، تو وہ بھی اس کے ساتھ تشہد میں بیٹھے اور دعائیں پڑھے اور (رہ گئی رکعت/رکعتیں پڑھنے کے لیے امام کے) سلام پھیرنے سے قبل کھڑا نہ ہو اور جب کھڑا ہونے لگے تو اللہ اکبر کہے۔

⑩ جماعت سے پیچھے رہ جانے کے شرعی عذر

درجِ ذیل حالات میں جماعت چھوڑ دینے کی رخصت ہے:

①، ② سردی یا بارش، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ سفر ٹھنڈی اور بارش والی رات مؤذن کو حکم دیتے کہ وہ یہ اعلان کر دے: «أَلَا صَلُّوْا فِيْ رِحَالِكُمْ» ''اپنے اپنے مقام پہ ہی نماز پڑھ لو۔''[3] اسے شیخین نے نقل کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں: ایک سفر میں بارش ہونے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو چاہے اپنے خیمہ میں ہی نماز پڑھ لے۔''[4] اسے احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بارش والے دن مؤذن کو حکم دیا کہ (أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ) کے بعد بجائے (حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ) کہنے کے ''صَلُّوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ'' کہو ''گھروں میں نماز پڑھ لو۔'' راوی کہتے ہیں: لوگوں کو یہ امر عجیب لگا، تو کہا: تم کیوں متعجب ہو؟ یہ حکم اس ذات نے بھی دیا تھا، جو مجھ سے بہتر ہیں، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے، مجھے مناسب نہ لگا کہ تمہیں کیچڑ میں نکال کر مشقت میں ڈالوں۔[5] اسے شیخین نے نقل کیا، مسلم میں ہے کہ جمعے کے دن بارش ہو رہی تھی، تو مؤذن کو یہ کہنے کا حکم دیا، سردی پر شدید گرمی، اندھیرے اور ظالم (مثلاً خودکش حملہ آور اور بم دھماکے) کے خوف کو قیاس کیا جا سکتا ہے، بقول امام ابن بطال رحمہ اللہ علماء کا اجماع ہے کہ شدید بارش، اندھیرے، آندھی اور اس قسم کے حالات میں گھروں میں نماز پڑھ لینا مباح ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٦٨٤؛ صحيح مسلم: ٤٢١. [2] حسن، سنن أبي داود: ٨٩٣؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٧٣، ٢٧٤. [3] صحيح البخاري: ٦٦٦؛ صحيح مسلم: ٦٩٧. [4] صحيح مسلم: ٦٩٨؛ سنن أبي داود: ١٠٦٥.
[5] صحيح البخاري: ٩٠١؛ صحيح مسلم: ٦٩٩.

③ کھانا اگر پیش کیا جاچکا ہو، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی کھانا تناول کرنے میں مشغول ہو تو جلدی نہ کرے، بلکہ اپنی ضرورت پوری کر لے، اگرچہ جماعت کھڑی ہو چکی ہو۔''[1] اسے بخاری نے تخریج کیا۔

④ اخبثین (بقول محشی اخبثین سے مراد چھوٹے اور بڑے پیشاب کی حاجت) درپیش ہونے کی صورت میں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: ''کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ جب اخبثین اسے درپیش ہوں۔''[2] سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آدمی کی فقہ (سمجھداری) سے ہے کہ اولاً اپنی حاجت پوری کرے، پھر یکسو ہو کر اور مکمل توجہ سے نماز کی طرف متوجہ ہو۔[3] اسے بخاری نے نقل کیا۔

⑪ امام کون بنے؟

اس کا سب سے بڑھ کر حقدار کتاب اللہ کا اَقْرَأْ ہے (یعنی قراءت میں سب سے بڑھ کر، مطلب یہ کہ دین کی بنیادی چیزوں کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں یہ مزید امتیاز ہے اور دیگر لوگوں سے بڑھ کر ہے) اگر اس میں ایک جیسے ہوں، تو سنت کا زیادہ عالم، اگر اس میں بھی برابر ہوں، تو ہجرت میں جو اَقدم تھا، اگر اس میں یکساں ہو تو عمر میں جو بڑا ہو، چنانچہ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تین افراد ہوں، تو ان میں سے ایک امام بنے اور زیادہ حقدار وہ جو اَقرأ ہے۔''[4] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے نقل کیا، اَقْرَأْ سے مراد جسے قرآن زیادہ یاد ہو، کیونکہ سیدنا عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں: «لِيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْآناً» ''امامت وہ کرائے جسے قرآن زیادہ یاد ہو۔''[5] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کا امام وہ بنے، جو اللہ کتاب کا اَقرأ ہے، اگر اس میں برابر ہوں، تو سنت کا اعلم، اگر اس میں برابر ہوں، تو ہجرت میں اَقدم، اگر اس میں بھی برابر ہوں، تو عمر میں جو بڑا ہے، کسی کی مِلک میں جا کر کوئی (بغیر کہے) امام نہ بنے اور نہ کسی کی خاص نشست پر بغیر اجازت کے بیٹھے۔''

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''کسی کے گھر میں کوئی مہمان بن کر جائے تو (خود ہی، جیسے بعض علماء کو دیکھا ہے کہ خود ہی مصلائے امامت سنبھال لیتے ہیں، گویا کہہ رہے ہیں ہم سے زیادہ حقدار کون ہے، بظاہر اس صورت میں امام بننے کے لیے اَقرأ و اعلم کی شروط کا اعتبار نہیں ہوگا، امامت صرف صاحبِ خانہ کا حق ہے اگر وہ اس کا اہل ہے) امام نہ بنے اور نہ کسی کے دائرۂ اختیار والی جگہ میں۔''[6] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، سعید بن منصور نے بھی اس کی تخریج کی، لیکن ان کے ہاں «إِلَّا بِإِذْنِهِ» کا اضافہ موجود ہے، ''مگر اس کی اجازت سے'' اس کا معنی یہ ہوا کہ سلطان (اس مقام کا صاحبِ اختیار، مثلاً دفتر کا باس اور سکول و کالج کا پرنسپل وغیرہ) صاحبِ خانہ اور صاحبِ مجلس (جس کے ہاں مجلس جمی ہے) دیگر سے امامت کے زیادہ حقدار

---

① صحيح البخاري: ٦٧٤. ② صحيح مسلم: ٥٦٠؛ سنن أبي داود: ٨٩. ③ صحيح البخاري تعليقا: كتاب الاذان، باب اذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة. ④ صحيح مسلم: ٦٧٢؛ سنن نسائي: ٧٨١. ⑤ صحيح البخاري: ٤٣٠٢؛ سنن أبي داود: ٥٨٥، ٥٨٧. ⑥ صحيح مسلم: ٦٧٣؛ سنن نسائي: ٧٨٢.

ہیں، ہاں اگر وہ خود کسی اور کو امامت کا کہہ دیں، تو یہ اور بات ہے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مومن کے لیے حلال نہیں کہ اجازت کے بغیر کسی کی امامت کرائے اور نہ کوئی امام مقتدیوں کو چھوڑ کر صرف اپنے لیے دعا کرے، اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے خیانت کی۔''[1] اسے ابو داؤد نے نقل کیا۔

⑫ کن کن کی امامت (شرعاً) صحیح ہے

سمجھ دار (نابالغ) بچہ کی، اندھے کی اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر پڑھانے والے کی، اسی طرح اس کا عکس، فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کا امام بننا، اسی طرح بالعکس، باوضوء کی تیمم والے کی اور اس کا عکس، مسافر کی مقیم اور مقیم کی مسافر کو اسی طرح مفضول کا فاضل کے لیے امام بننا، یہ سب درست اور جائز ہے، سیدنا عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے امام بنے اور ابھی وہ چھ یا سات برس کے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ (جو نابینا تھے) کو مسجدِ نبوی میں اپنا امامت میں جانشین بنایا، مرض الموت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے کئی نمازیں ادا کیں، ایک دفعہ آپ نے (جب گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئے) اپنے گھر میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، جب کہ لوگ کھڑے تھے، تو انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ دیا اور سلام کے بعد فرمایا: ''امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب وہ رکوع میں جائے تب تم جاؤ اور جب سر اٹھائے تو تم اٹھاؤ اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔''[2] متفق علیہ۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز عشا پڑھتے، پھر اپنے محلہ جا کر لوگوں کو وہی نماز پڑھاتے تھے، تو یہ ان کے لیے نفل کی حیثیت میں ہوتی۔[3] سیدنا محجن بن ادرع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں مسجد نبوی آیا جماعت کھڑی ہوئی، تو میں شریک نہ ہوا، آپ نے بعد میں مجھ سے اس کی وجہ پوچھی، تو عرض کی کہ میں آنے سے قبل اپنے خیمے میں (شاید یہ کسی وفد کے ساتھ آئے تھے) پڑھ چکا تھا، فرمایا: ''پھر بھی پڑھ لیتے اور یہ نفل بن جاتی۔''[4] (اسے حاکم نے نقل کیا اور کہا: شیخین کی شرط پر ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہے، تو فرمایا: ''کوئی ہے جو اس پر صدقہ کرے، تو اس کے ہمراہ نماز پڑھ لے؟'' (یعنی جماعت بنوا دے، تو جیسا کہ گزرا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کام کیا) سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تیمم کر کے امامت کرائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا، تو اس کی تقریر کی۔[5] (یعنی حدیث تقریری کسی کام کا سن کر یا ہوتا دیکھ کر منع نہ فرمائیں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو نماز قصر پڑھاتے رہے اور پہلے فرما دیتے اے اہلِ مکہ! تم پوری کر لینا، کیونکہ ہم تو مسافر ہیں۔''[6] مسافر اگر مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے، تو پوری نماز ہی پڑھے گا، اگر چہ آخر میں ہی ملا ہو (یعنی یہ نہیں کہ اتفاقاً اگر دو یا ایک رکعت ملی تھی تو اب دو پر اکتفا کر لے) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کیا حکمت ہے کہ مسافر اگر تنہا پڑھے تو دو پڑھے گا، لیکن اگر مقیم امام کی

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ٩١؛ سنن ترمذی: ٣٥٧. [2] صحیح البخاری: ٣٧٨؛ صحیح مسلم: ٤١١.
[3] صحیح مسلم: ٤٦٥. [4] صحیح، مسند أحمد: ٤/ ٣٣٨؛ سنن نسائی: ٨٥٦. [5] صحیح، سنن أبی داود: ٣٣٤. [6] ضعیف، سنن أبی داود: ١٢٢٩؛ مسند أحمد: ٤/ ٤٣٠.

اقتدا میں پڑھے، تو چار پڑھے گا؟ تو جواب میں کہا: یہی ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے،[1] ایک روایت میں ہے کہ یہ بات ان سے موسیٰ بن سلمہ نے کہی تھی، تو کہا: یہی ابو القاسم کی سنت ہے۔[2] اسے احمد نے تخریج کیا۔

⑬ کن کی امامت (شرعاً) صحیح نہیں؟

معذور کی امامت صحیح شخص کے لیے (بقول محشی مراد خاص معذور مثلاً جسے سلس البول یا ہوا خارج ہونے کی بیماری ہو) اور نہ اس معذور کی جس کا عذر مقتدی کے عذر سے مختلف ہے (بقول محشی مثلاً سلس البول کے عذر والے کی امامت اس شخص کے لیے جسے انقلاباتِ ریح (مسلسل ہوا خارج ہوتی رہنے) کا عذر لاحق ہو) یہ جمہور علماء کے نزدیک، مالکیہ کے ہاں معذور کی صحیح کے لیے امامت صحیح تو ہے مگر مکروہ ہے۔

⑭ عورت کا عورتوں کی امامت کرانے کا استحباب

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کئی دفعہ (نوافل میں) عورتوں کی امامت کراتیں اور (آگے کھڑے ہونے کی بجائے) صف میں کھڑی ہوتی تھیں،[3] سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی یہی کرتی تھیں،[4] نبی کریم ﷺ نے سیدہ ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک (مرد) مؤذن مقرر کر رکھا تھا جو اپنے محلہ کی (خواتین کو) فرض نمازوں میں امامت کراتی تھیں۔[5] اسے ابوداؤد نے نقل کیا۔

⑮ مرد امام کے پیچھے صرف عورتوں کا مقتدی ہونا

ابو یعلی اور اوسط میں طبرانی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے کہا: آج رات میں نے ایک (نیا) عمل کیا ہے، فرمایا: ''وہ کیا؟'' عرض کی: محلہ کی خواتین نے کہا کہ آپ قاری ہیں ہم نہیں ہیں، تو ہمیں نماز (یہ رمضان کا واقعہ ہے اور مراد تراویح ہیں) پڑھا دو، تو میں نے انہیں آٹھ رکعتیں پڑھائیں اور وتر بھی، نبی کریم ﷺ یہ سن کر چپ رہے، راوی کہتے ہیں، ہم نے آپ کے اس سکوت کو رضا سمجھا (حدیثِ تقریری)۔

⑯ فاسق اور بدعتی کی امامت کی کراہت

بخاری نے ذکر کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ حجاج کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔[6] مسلم نے نقل کیا کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے مروان کے پیچھے نمازِ عید ادا کی (مروان جب امیرِ مدینہ تھا، تو مسجد نبوی میں فرض نمازوں کی امامت کراتا تھا اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ اقامت کہنا تھا، جو انہوں نے اس شرط پر قبول کی کہ میری آمین فوت نہ کرایا کرے) اسے بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ بن ابو معیط کی اقتدا میں نماز ادا کی اور وہ شرابی تھا، ایک دفعہ اس نے صبح کی نماز چار

---

[1] صحیح مسلم: ٦٨٨؛ سنن نسائی: ١٤٤٢. [2] صحیح، مسند أحمد: ١/ ٢١٦، ٢٢٦. [3] صحیح، سنن الکبری للبیهقی: ٥٣٥٦. [4] حسن، المصنف ابن ابی شیبة: ٢/ ٨٨. [5] حسن، سنن أبی داود: ٥٩١، ٥٩٢. [6] صحیح، المصنف لابن ابی شیبة: ٢/ ١٥٢؛ صحیح بخاری کا ذکر مؤلف کا وہم ہے۔

رکعتیں پڑھا دی تھی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پر شراب خوری کی شرعی حد بھی لاگو کی تھی، صحابہ اور تابعین مختار بن ابو عبید ثقفی کے پیچھے نمازیں پڑھ لیتے تھے اور وہ الحاد کے ساتھ متہم اور ضلال کا داعی تھا، اس ضمن میں علماء کے ہاں یہ ضابطہ ہے کہ جس کی اپنے آپ کے لیے نماز جائز ہے، اس کا کسی اور کے لیے امام بن جانا بھی صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے فاسق اور بدعتی امام کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے، ابوداؤد، ابن حبان اور منذری نے سیدنا سائب بن خلاد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے امامت کراتے ہوئے قبلہ میں تھوک دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ رہے تھے، تو فرمایا: ''آج کے بعد یہ تمہارا امام نہ بنے۔'' اس نے بعد ازاں چاہا کہ امام بنے لیکن لوگوں نے منع کر دیا اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے باخبر کیا، اس نے اس کا ذکر آپ سے کیا تو فرمایا: ''ہاں (میں نے کہا تھا، کیونکہ) تم نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دی تھی۔''[1] (اسے ابوداؤد نے نقل کیا)۔

⑰ کسی عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑ کر اپنی الگ انفرادی نماز پڑھ لینا

جماعت میں جو شامل ہوا، تو اس کے لیے جائز ہے کہ مفارقت کی نیت کر کے الگ ہو کر اپنی نماز پڑھ لے، اس صورت میں کہ امام نے طوالت کی ہوئی ہے (اور اسے کوئی کام درپیش ہے یا تھکا ہوا تھا یا کوئی اور عذر، اگر کوئی عذر نہیں تو صبر کر کے ساتھ رہے) اسی سے ملحق ہے کسی بیماری کا حدوث (کوئی درد وغیرہ شروع ہو گئی) یا مال کے ضیاع وتلف کا خوف یا بس یا ریل نکل جانے کا ڈر یا اگر نیند غالب آ رہی ہو اور اس جیسے اَعذار جماعت نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نمازِ عشا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ پڑھ کر اپنے محلے جاتے اور انہیں عشا کی امامت کراتے تھے، ایک دفعہ انہوں نے سورۂ بقرۃ کی قراءت شروع کر دی، تو ایک آدمی نے الگ ہو کر اپنی پڑھ لی، انہیں پتہ چلا تو ان سے کہا: اے فلاں کیا منافق ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: میں منافق نہیں ہوا، لیکن اپنا عذر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کروں گا، تو آپ کے پاس آ کر امر واقع کا ذکر کیا، تو آپ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے معاذ! کیا تم فتان ہو (اتنی لمبی سورت پڑھنے کی بجائے) فلاں فلاں سورت پڑھا کرو۔'' (جن سورتوں کا آپ نے نام لیا ان کا ذکر بھی اس روایت کے مختلف طرق میں ہے مثلاً: سورۂ اعلیٰ، سورۂ غاشیہ، سورۂ شمس، سورۂ لیل وغیرہ)

⑱ جماعت مل جانے کی صورت میں دوبارہ نماز پڑھ لینا

سیدنا یزید بن اسود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم منیٰ میں فجر کی جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کر چکے تھے، ادھر دو آدمی اپنی اپنی سواریوں کے پاس کھڑے رہے، آپ نے انہیں لانے کا حکم دیا، وہ آئے تو (خوف کی وجہ سے) ان کے کندھے کانپ رہے تھے، فرمایا: ''جماعت میں کیوں نہیں شامل ہوئے کیا مسلمان نہیں ہو؟'' عرض کی: کیونکہ ہم نے اپنی قیامگاہ میں ہی نماز ادا کر لی تھی، فرمایا: ''اگر کبھی اپنی جگہ نماز پڑھ لی ہو پھر مسجد آؤ اور ابھی جماعت ہونی ہو، تو ان کے ساتھ بھی پڑھ لو تو یہ تمہارے

[1] حسن، سنن أبی داود: ٤٨١؛ صحیح ابن حبان: ١٦٣٦.

لیے نفل ہو جائے گی۔''[1] اسے احمد اور ابوداؤد نے نقل کیا، نسائی اور ترمذی نے بھی، بقول ان کے یہ حسن صحیح ہے، ابن سکن نے بھی حکمِ صحت لگایا، اس میں تطوع کی نیت کر کے نماز کے اعادہ کی مشروعیت پر دلیل ہے، ان حضرات کے لیے جو جماعت کے ساتھ یا اکیلے نماز پڑھ چکے ہوں، پھر ایک اور جماعت پالیں، مروی ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ظہر، عصر اور مغرب کا اعادہ کیا، حالانکہ جماعت کے ساتھ ادا کر چکے تھے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مربد (یہ بصرہ میں ایک جگہ تھی، جہاں اجناس اور کھجوریں خشک کی جاتی تھیں) میں نماز ادا کی، پھر مسجد آئے تو وہاں ابھی جماعت ہونا تھی، جس کے امام سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تھے، تو ان کے ہمراہ بھی شامل ہو گئے۔

جہاں تک یہ فرمانِ نبوی جو صحت کے ساتھ مروی ہے: «لَا تُصَلُّوْا صَلَاةً فِيْ يَوْمٍ مَرَّتَيْنِ» ''ایک دن میں ایک نماز دو دفعہ نہ پڑھو۔''[2] (اسے ابوداؤد، احمد، ابن خزیمہ اور دارقطنی نے نقل کیا، بقول نووی اس کی سند صحیح ہے) تو اس کی بابت ابن عبدالبر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: احمد اور اسحاق نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ کوئی فرض نماز پڑھ لے، پھر فارغ ہونے کے بعد دوبارہ فرض ہی کی نیت سے پڑھے، لیکن جو نفل کی نیت سے جماعت میں شامل ہوا، مذکورہ بالا احادیث پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ اس کا مصداق نہ بنے گا کیونکہ اس کی پہلی نماز فرض اور دوسری نفل بنی تو یہ اعادہ شمار نہ ہو گا۔

⑲ سلام پھیر کر امام کا دائیں یا بائیں جانب سے پھر کر رخ مقتدیوں کی طرف کرنے کا استحباب

پھر وہاں سے جب اٹھنا چاہے، تو اٹھے (یہ نہیں کہ سلام کے بعد اسی حالت میں اٹھ کر چلا جائے) اس ضمن میں قبیصہ بن ہلب کی اپنے والد سے روایت ہے کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام کے بعد کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب سے پھر کر ہماری طرف رخِ انور کرتے تھے،[3] اسے ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن ہے اور اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے کہ امام جس طرف سے چاہے پیچھے مڑے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کرنا صحت کے ساتھ ثابت ہے! سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام کے بعد (اسی حالت و ہیئت میں) اتنی دیر ہی بیٹھتے تھے، جتنی دیر میں: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» پڑھ لیں،[4] اسے احمد، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، احمد اور بخاری کے ہاں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیر لینے پر خواتین فوراً چلی جاتیں اور آپ اٹھنے سے پہلے کچھ دیر اسی جگہ بیٹھے رہتے، ہمارا خیال ہے، یہ اس وجہ سے کہ تا کہ عورتیں مردوں کی واپسی سے پہلے پہلے چلی جائیں۔[5]

⑳ امام یا مقتدی کا بلندی پر ہونا

امام کا مقتدی سے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر امامت کرانا مکروہ ہے، سیدنا ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحيح، سنن أبى داود: ٥٧٥؛ صحيح ابن خزيمة: ١٦٤١. ② حسن، سنن أبى داود: ٥٧٩؛ صحيح ابن خزيمة: ١٦٤١. ③ حسن، سنن أبى داود: ١٠٤١؛ سنن ترمذى: ٣٠١؛ سنن ابن ماجه: ٩٢٩. ④ صحيح مسلم: ٥٩٢؛ سنن ترمذى: ٩٨٩. ⑤ صحيح البخارى: ٨٣٧؛ مسند أحمد: ٦/ ٢٩٦.

نے منع فرمایا کہ امام کسی چیز پر کھڑا ہوکر امامت کرائے، جبکہ مقتدی اس سے نیچے ہوں،① اسے دارقطنی نے نقل کیا اور ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص میں اس پر ساکت رہے ہیں، ہمام بن حارث سے مروی ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مدائن میں ایک تھڑے پر کھڑے ہوکر امامت کرائی، تو سیدنا ابومسعود رضی اللہ عنہ نے ان کی قمیص پکڑ کر کھینچا، فراغت کے بعد کہا: کیا جانتے نہیں اس سے منع کیا جاتا تھا، کہا: مجھے اس وقت یہ یاد آیا جب تم نے قمیص پکڑ کر کھینچا تھا،② اسے ابوداود، شافعی اور بیہقی نے نقل کیا اور حاکم، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس پر صحت کا حکم لگایا، ہاں اگر کوئی خاص سبب ہو تب کراہت نہ ہوگی، چنانچہ سیدنا سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جس روز منبر بن کر آیا اور اسے مسجد میں رکھا گیا، تو اس پر کھڑے ہوکر آپ نے نماز پڑھانی شروع کی، رکوع اسی پر کیا اس کے بعد چہرہ اقدس موڑے بغیر الٹے قدموں سے اترے اور زمین پر سجدہ کیا، اگلی رکعت پھر منبر پر کرائی، فراغت کے بعد لوگوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا: ''اے لوگو! میں نے یہ اس لیے کیا تا کہ تم اچھی طرح ارکانِ نماز کو سیکھ لو۔''③ اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا، جہاں تک مقتدی (یا بعض) کا امام سے بلندی پر ہونا تو یہ جائز ہے سعید بن منصور، شافعی اور بیہقی کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ ایک روایت کے مدِنظر جسے بخاری نے بھی معلقاً نقل کیا، اس میں ہے کہ انہوں نے مسجد کی چھت پر جماعت کے ہمراہ نماز پڑھی، جبکہ امام نیچے تھا،④ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جمعہ بصرہ کی مسجد کی داہنی جانب بلندی پر واقع دارِ ابونافع میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، جس کا ایک دروازہ مسجد کی جانب کھلتا تھا، تو وہیں سے خطبہ سنتے اور جماعت میں شریک ہوتے، صحابہ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا، اسے سعید بن منصور نے اپنی سنن میں نقل کیا، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ اگر مقتدی اتنی زیادہ بلندی پر ہے کہ اسے امام کے افعال کا کچھ پتہ نہیں چل رہا، تو یہ بالاجماع ممنوع ہے، چاہے مسجد میں یہ ہو یا کسی اور ایسی جگہ جس کی مقدار تین سو گز ہے، اگر اس سے کم مقدار ہے، تب اصل جواز ہے، تا آنکہ کوئی دلیلِ منع ثابت ہو، اس اصل کی تقویت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فعل سے ہوتی ہے، جس کا کسی نے انکار نہ کیا تھا (میرے خیال میں اس مسئلہ میں اصل یہ ہے کہ اگر امام کی آواز آرہی ہے، تو چاہے جتنی بلندی ہو حرج نہیں، جیسے آج کل لاؤڈ سپیکر پر بعض بڑی مساجد مثلاً حرمین میں نمازیں کرائی جاتی ہیں)۔

(۲۱) مقتدی اور امام کے درمیان کسی رکاوٹ کا ہونا

اس صورت میں اگر دیکھ کر یا سن کر امام کے انتقالات کا علم ہو رہا ہے، تب جائز ہے! بخاری نے حسن بصری کا قول نقل کیا کہ تم دریا کے دوسرے کنارے کھڑے امام کی اقتدا بھی کر سکتے ہو، امام ابومجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر درمیان میں سڑک یا دیوار ہو تو اگر اس نے تکبیر تحریمہ کی آواز سن لی ہے، تو اقتدا کرنا جائز ہے اور پہلے ذکر ہوا کہ صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ تب حجرہ مبارکہ کے اندر تھے، کی اقتدا میں نماز پڑھی تھی۔

---

① حسن، سنن دارقطني: ١٨٦٤. ② صحيح، سنن أبي داود: ٥٩٧؛ صحيح ابن خزيمة: ١٥٢٣.
③ صحيح البخاري: ٩١٧؛ صحيح مسلم: ٥٤٤. ④ صحيح البخاري: ١/ ٤٨٦.

⑳ اس امام کی اقتدا کا حکم جس نے امامت کراتے ہوئے نماز کی کسی شرط یا رکن میں کوتاہی کی

جس امام نے نماز کی کسی شرط یا رکن کا ترک کیا۔ تو اگر مقتدی نے اس کا ترک نہیں کیا اور اسے امام کے ترک کرنے کا علم ہی نہیں ہو سکا، تو اقتدا صحیح ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر امام امامت کو کما حقہ انجام دیں، تو فبہا اور اگر کوتاہی و غلطی کریں، تو اس کا گناہ انہی کے ذمہ ہوگا، تم اس سے بری الذمہ ہو۔''[1] اسے بخاری اور احمد نے نقل کیا، سیدنا سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''امام ضامن ہوتا ہے، اگر عمدگی کا مظاہرہ کرے تو ٹھیک اور اگر برے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے (مثلاً جلدی جلدی نماز کرائے یا مثلاً طہارت وغیرہ کا خیال نہ رکھے) تو اس کا دوش اسی پر ہے (مقتدیوں کی نماز ہوگئی) وہ بری الذمہ ہیں۔''[2] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لاعلمی میں حالتِ جنابت میں امامت کرادی، یاد آنے پر انہوں نے تو دوبارہ نماز پڑھی، مگر دیگر کو اس کا حکم نہیں دیا (بظاہر سلام پھیرنے کے بعد یاد آیا تھا، اگر دورانِ نماز میں یاد آجاتا تو یقیناً خود پیچھے ہو کر کسی اور کو آگے کر دیتے)۔

㉑ دورانِ نماز کسی اور کو اپنا جانشین بنا دینا

اگر امام کو دورانِ نماز میں کوئی عذر پیش آجائے مثلاً یاد آیا کہ وہ بے وضو تھا، یا اب اس کا وضو ٹوٹ گیا، تو جائز ہے کہ (مقتدیوں میں سے) کسی کو اپنا جانشین بنا دے جو نماز مکمل کرادے، عمرو بن میمون سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہونے کے قصہ پر مشتمل روایت میں کہتے ہیں کہ تکبیرِ تحریمہ کہتے ہی ان کی آواز سنی کہ مجھے کتے نے مار دیا اور سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر اپنی جگہ کر دیا، جنہوں نے نہایت اختصار سے نماز کرائی،[3] اسے بخاری نے نقل کیا، ابو رزین راوی ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے کہ نکسیر پھوٹ پڑی، تو ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور خود چلے گئے،[4] اسے سعید بن منصور نے نقل کیا، امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر امام (کو حاجت ہو تو) کسی کو جانشین کر دے کیونکہ سیدنا عمر اور علی رضی اللہ عنہما نے ایسا کیا ہے اور اگر امام کے کسی وجہ سے ہٹ جانے پر مقتدی اپنی اپنی نماز مکمل کر لیں تو اس کی نظیر بھی ملتی ہے، جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر نماز پڑھاتے ہوئے خارجی نے حملہ کیا تو وہ گر پڑے اور لوگوں نے انفرادی طور پر اپنی نماز مکمل کی تھی۔

㉒ جس نے لوگوں کے نہ چاہنے کے باوجود امامت کرائی

احادیث میں اس کی ممانعت و تحذیر موجود ہے، اس میں اعتبار دینی کراہت کا ہوگا جس کا کوئی شرعی سبب ہو، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ تین طرح کے افراد ہیں، جن کی نمازیں ان کے سروں سے ایک بالشت بھی اوپر نہیں اٹھائی جاتیں (بارگاہِ صمدیت میں قبولیت کے لیے): ایک وہ شخص جو ایسے لوگوں کا امام بنا، جو اسے ناپسند کرتے ہیں، دوم وہ

---

[1] صحيح البخاري: ٦٩٤؛ مسند أحمد: ٢/ ٣٥٥، ٣٣٧. [2] صحيح، سنن ابن ماجه: ٩٨١.
[3] صحيح البخاري: ٣٧٠٠. [4] نيل الاوطار: ٢/ ٤١٥.

عورت جس نے اس حال میں رات گزاری کہ اس کا شوہر اس پر ناراض ہے اور سوم دو ایسے مسلمان بھائی جن کی آپس میں بول چال بند ہے۔‘‘[1] اسے ابن ماجہ نے تخریج کیا، بقول حافظ عراقی اس کی سند حسن ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تین طرح کے افراد ہیں جن کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا: ایک جس نے ایسے لوگوں کی امامت کرائی، جو اسے ناپسند کرتے ہیں اور دوم جو (عمداً) وقت ختم ہونے کے بعد نماز پڑھنے آیا اور سوم جس نے اپنے آزاد کردہ غلام سے اپنی خدمت لی۔‘‘[2] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ بعض علماء نے اس امر کو مکروہ قرار دیا ہے کہ کوئی ایسے لوگوں کا امام بنے، جو اسے ناپسند کرتے ہیں، لیکن اگر امام غیر ظالم (بے قصور ہے) ہے تو اسے (بے جا طور پر) ناپسند کرنے والے گناہ گار ہوں گے۔

صف کے مسائل

① اگر ایک ہی مقتدی ہے تو وہ کہاں کھڑا ہو؟

تو مستحب ہے کہ وہ امام کے (ساتھ اس کے) داہنی جانب کھڑا ہو، اگر دو یا زائد ہیں، تو امام کے پیچھے کھڑے ہوں، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نوافل پڑھ رہے تھے، تو میں آیا اور آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا، تو آپ نے مجھے گھما کر اپنی داہنی طرف کر لیا، پھر سیدنا جابر بن صخر رضی اللہ عنہ آ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب کھڑے ہو گئے، تو آپ نے ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا، حتی کہ ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے،[3] اسے مسلم اور ابوداود نے نقل کیا، اگر مقتدیوں میں ایک خاتون بھی حاضر ہو گئی، تو وہ مردوں کے پیچھے اکیلی صف بنائے گی، ان کے ہمراہ کھڑی نہ ہو گی لیکن اگر (بوجہ لاعلمی) ساتھ بھی کھڑی ہو گئی، تو جمہور کے نزدیک اس کی نماز ہو جائے گی، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے، تو نماز پڑھائی، میں اور ایک یتیم لڑکا آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور میری والدہ سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا (اکیلی) ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی۔[4] اسے بخاری و مسلم نے تخریج کیا۔

② امام کا مصلیٰ صف کے وسط کے سامنے ہونے کا استحباب اور چاہیے کہ اس کے قریب دانا بینا لوگ کھڑے ہوں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’امام کو درمیان میں کیا کرو اور ساتھ جڑ کر کھڑے ہوا کرو۔‘‘[5] اسے ابوداود نے نقل کیا، وہ اور منذری اس حدیث پر ساکت رہے (اس بارے صحت یا ضعف کا کوئی حکم ذکر نہیں کیا، ایسی روایت صحیح سمجھی جاتی ہے) سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ’’میرے قریب دانا بینا کھڑے ہوا کریں، پھر درجہ

---

① ضعیف، سنن ابن ماجہ: ۹۷۱؛ البتہ روایت کے ابتدائی حصے کو صحیح قرار دیا ہے۔ ② ضعیف، سنن أبی داود: ۵۹۳؛ سنن ابن ماجہ: ۹۷۰. ③ صحیح مسلم: ۳۰۱۰؛ سنن أبی داود: ٦٣٤. ④ صحیح البخاری: ۳۸۰؛ صحیح مسلم: ٦٥٨.
⑤ ضعیف، سنن أبی داود: ٦٩١.

بدرجہ ان سے ملتے جلتے اورتم ہیشات الاسواق (بازاروں کے سے شور وشرابہ اور بدنظمی سے) سے بچو۔"[1] اسے احمد، مسلم، ابوداود، اور ترمذی نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا کہ ان کے قریب مہاجرین و انصار کھڑے ہوا کریں، تا کہ آپ سے اخذ و تعلم کریں۔[2] اسے احمد اور ابوداود (اور ابن ماجہ) نے نقل کیا، اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ کبار صحابہ آپ سے نماز کی صفت و ہیئت کا تعلّم کریں اور اگر آپ سے کوئی بھول ہو جائے، تو آگاہی دیں اور اگر ضرورت پڑے، تو آپ ان میں سے کسی کو اپنا جانشین کریں۔

③ بچوں اور عورتوں کی صفیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی صفوں کو لڑکوں اور ان کی صفوں کو خواتین کی صفوں سے آگے رکھتے تھے۔ (بقول محشی اگر ایک ہی بچہ ہے تو وہ آگے مردوں کے ساتھ کھڑا ہوگا) اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا، ما سوائے بخاری کے جماعت نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مردوں کی بہترین صفیں ان کی اگلی اور سب سے کمتر پچھلی ہیں، جبکہ خواتین کی بہترین صفیں ان کے پیچھے والی اور سب سے کمتر اگلی ہیں۔"[3] اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کی پچھلی صفیں عورتوں کی اگلی صفوں کے قریب ہوں گی (جس سے خشوع وخضوع میں فرق آسکتا ہے)۔

④ اکیلے کا صف کے پیچھے کھڑے ہونا

جس نے صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہوئے اللہ اکبر کہا: پھر آگے ہو کر صف میں جا شامل ہوا اور رکوع کو امام کے ساتھ پالیا، اس کی نماز صحیح ہوئی، سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ وہ ایک دفعہ آئے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کی حالت میں تھے تو صف تک پہنچنے سے قبل ہی رکوع میں ہو گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر ہوا تو فرمایا: "اللہ تمہاری (نیکی کی) حرص میں اضافہ کرے مگر دوبارہ ایسا نہ کرنا۔"[4] اسے احمد، بخاری، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا، جس نے پوری نماز اکیلے صف کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھی، جمہور کے نزدیک اس کی نماز ہو گئی، البتہ کراہت کے ساتھ، امام احمد، اسحاق، حماد، ابن ابولیلی، وکیع، حسن بن صالح، نخعی اور ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس نے پوری ایک رکعت صف کے پیچھے اکیلے کھڑے پڑھی، اس کی نماز نہ ہوئی۔ سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اکیلا صف کے پیچھے کھڑا نماز پڑھ رہا ہے، تو اسے نماز کے اعادہ کا حکم دیا۔[5] نسائی کے سوا اسے بقیہ پانچ نے تخریج کیا، امام احمد کی روایت میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صف کے پیچھے اکیلے کی نماز بارے پوچھا گیا، تو کہا: "وہ دوبارہ نماز ادا کرے۔"[6] امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا، احمد کی سند جید ہے، علی بن شیبان

---

[1] صحيح مسلم: ٤٣٢؛ سنن أبي داود: ٦٧٤؛ سنن ابن ماجه: ٩٧٦. [2] صحيح، سنن ابن ماجه: ٩٧٧؛ مسند أحمد: ٣/ ١٩٩؛ صحيح ابن حبان: ٧٢٥٨. [3] صحيح مسلم: ٤٤٠؛ سنن أبي داود: ٦٧٨. [4] صحيح البخاري: ٧٨٣؛ سنن أبي داود: ٦٨٣، ٦٨٤؛ سنن نسائي: ٨٧٠. [5] صحيح، سنن أبي داود: ٦٨٢. [6] سنن أبي داود: ٦٨٢؛ سنن ترمذي: ٣٢٠؛ سنن ابن ماجه: ١٠٠٤.

راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے دیکھا، تو اس کے فارغ ہونے تک ادھر ہی ٹھہرے رہے، پھر فرمایا: ''دوبارہ نماز پڑھو، کیونکہ اکیلے کی صف کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔''[1] اسے احمد، ابن ماجہ اور بیہقی نے نقل کیا، بقول احمد یہ حسن ہے، ابن سید الناس کہتے ہیں: اس کے راوی معروف اور ثقہ ہیں۔

جمہور نے سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تمسک کیا، کہتے ہیں، انہوں نے بعض نماز (ایک رکوع) صف کے پیچھے اکیلے ادا کی تھی اور نبی کریم ﷺ نے انہیں اعادہ کا حکم نہ دیا، تو دیگر روایات میں اعادہ کے امر کو ندب پر محمول کرنا ہوگا تا کہ اولی طریق کی محافظت میں مبالغہ ہو۔ کمال بن ہمام لکھتے ہیں: ہمارے (احناف کے) ائمہ نے سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ندب پر اور سیدنا علی بن شیبان رضی اللہ عنہ کی حدیث کو نفیِ کمال پر محمول کیا ہے، تا کہ یہ دونوں حدیثِ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے موافق ہوں، جس کا ظاہر اعادہ کا عدم لزوم ہے، کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ نے اعادہ کا حکم نہیں دیا، جو شخص نماز کے لیے آئے اور صف میں کوئی گنجائش نہ پائے، تو کہا گیا وہ اکیلا صف بنالے، اس کے لیے صف سے کسی کو پیچھے لانا مکروہ ہے، بعض نے کہا: بلکہ وہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد اگلی صف سے کسی کو پیچھے کرلے، جو اس حکمِ نبوی (جس کی رو سے بعد میں آنے والا صف سے کسی کو پیچھے کھینچ لے) کو جانتا ہو اور جسے وہ کھینچے وہ اس کا کہا مانے۔

⑤ صفوں کو سیدھی رکھنا اور درمیان میں خلا نہ چھوڑنا

امام کے لیے مستحب ہے کہ وہ صفیں سیدھی اور برابر کرنے اور خلا نہ چھوڑنے کا (مسلسل گاہے بگاہے) حکم دیتا رہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے رخ انور ہماری طرف کرتے اور کہتے: «تَرَاصَّوْا وَاعْتَدِلُوْا» ''ساتھ ساتھ ہو جاؤ اور معتدل رہو۔''[2] اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا، انہی کی ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: ''صفیں برابر کیا کرو کہ ایسا کرنا نماز کی تمامیت سے ہے۔''[3]

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہماری صفیں تیر کی طرح سیدھی کراتے، پھر ایک موقع پر محسوس کیا کہ اس حکم کو ہم اچھی طرح سمجھ چکے ہیں، تو ایک دن جب رخِ انور ہماری طرف تھا، تو دیکھا کہ ایک نمازی کا سینہ آگے کو نکلا ہوا ہے، تو فرمایا: تم صفیں ضرور برابر کروں گے یا پھر اللہ تمہارے درمیان اختلاف ڈال دے گا۔''[4] اسے خمسہ نے نقل کیا، ترمذی نے صحت کا حکم لگایا، احمد اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا: ''صفیں برابر کرو، کندھے ایک دوسرے کی سیدھ میں رکھو اور ایک دوسرے کے ساتھ نرمی سے جڑو اور درمیان میں خلا ختم کرو کہ شیطان بھیڑ کے بچے کی مانند گھس آنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''[5] ابو داود، نسائی اور بیہقی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ۱٦۲۹۷. [2] صحیح البخاری: ۷۱۹؛ صحیح مسلم: ٤۳٤. [3] صحیح البخاری: ۷۲۳؛ صحیح مسلم: ٤۳۳. [4] صحیح البخاری: ۷۱۷؛ صحیح مسلم: ٤۳٦. [5] صحیح، مسند أحمد: ۲٦۲/٥.

فرمایا: ''پہلی صفوں کو مکمل کیا کرو، اگر کوئی نقص ہو، تو وہ پچھلی صف میں ہونا چاہیے۔''[1] بزار نے حسن سند کے ساتھ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ اس قدم سے بہتر اور اجر کے لحاظ سے اعظم قدم کوئی نہیں جو اگلی صف میں موجود خلا کو پر کرنے کی غرض سے اٹھایا جائے۔

نسائی ، حاکم اور ابن خزیمہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے صف ملائی، اللہ اسے ملائے گا اور جس نے صف توڑی، اللہ اسے توڑے گا۔''[2] بخاری اور ترمذی کے علاوہ باقی جماعت نے سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی، کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: ''تم اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے، جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس بناتے ہیں؟ عرض کی گئی: وہ کیسے بناتے ہیں؟ فرمایا: ''اگلی صفوں کو مکمل رکھتے اور بالکل ساتھ جڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔''[3]

⑥ پہلی صف میں اور صفوں کی داہنی جانب میں کھڑا ہونے کی ترغیب

قبل ازیں فرمانِ نبوی گزرا کہ اگر لوگ جانتے ہوتے کہ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑا ہونے میں کیا (فضیلت) ہے، تو اگر اس کے لیے قرعہ اندازی بھی کرنا پڑتی تو کرتے، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ لوگ پہلی صف میں کھڑا ہونے سے کچھ ہچکچاتے ہیں، تو کہا: ''آگے بڑھو اور میری اقتدا کرو اور پیچھے والے تمہاری اقتدا کریں، لوگ پیچھے ہونے کو معمول بنالیں گے تو اللہ انہیں مستقل ہی پیچھے کر دے گا۔''[4] اسے مسلم، نسائی، ابوداود اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، ابوداود اور ابن ماجہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صفوں کی داہنی جانب میں کھڑے نمازیوں پر رحمت کرتا ہے اور فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔''[5] احمد اور طبرانی کے ہاں صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْأَوَّلِ» ''بے شک پہلی صف والوں پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور فرشتے ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔'' عرض کیا: اور دوسری صف پر؟ آپ نے پھر صرف پہلی کا نام لیا، صحابہ نے عرض کیا: اور دوسری پر؟ اب فرمایا: ''اور دوسری پر بھی۔''[6]

⑦ مکبر بننا

جب ضرورت ہو کہ امام کی تکبیروں کی آواز بعض مقتدیوں تک نہیں پہنچ رہی، تو مکبر بننا مستحب ہے، لیکن بلا ضرورت مکبر بننا بالاتفاق مکروہ بدعت ہے۔

---

① صحیح، سنن أبي داود: ٦٧١؛ سنن نسائي: ٨١٧. ② صحيح، سنن أبي داود: ٦٦٦؛ سنن نسائي: ٨١٨؛ صحيح ابن خزيمة: ١٥٤٩. ③ صحيح مسلم: ٤٣٠؛ سنن أبي داود: ٦٦١. ④ صحيح مسلم: ٤٣٨؛ سنن أبي داود: ٦٨٠؛ سنن نسائي: ٧٩٤. ⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ٦٧٦؛ سنن ابن ماجه: ١٠٠٥. ⑥ ضعيف، مسند أحمد: ٤/ ٢٦٩؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ١٩.

مساجد

① مساجد کی اہمیت

امتِ محمدیہ کے خصائص میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری زمین اس کے لیے طہور (جس کے ساتھ تیمم کیا جا سکتا ہے) و مسجد (نماز گاہ) کر دی گئی ہے، تو جہاں بھی کسی مسلمان کو نماز کا وقت آ لے، وہیں پڑھ سکتا ہے، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی تھی؟ فرمایا: ''مسجدِ حرام'' عرض کی: پھر کون سی؟ فرمایا: ''پھر مسجد اقصیٰ'' میں نے کہا: دونوں کے درمیان کتنا عرصہ حائل ہے؟ فرمایا: ''چالیس سال'' پھر فرمایا: ''جہاں بھی نماز کا وقت تمہیں آ لے وہیں پڑھ لو، وہی مسجد ہے، ایک روایت کے الفاظ ہیں: «وَكُلُّهَا مَسْجِدٌ» ''ساری زمین ہی مسجد ہے۔''[1] اسے جماعت نے روایت کیا۔

② تعمیرِ مسجد کی فضیلت

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی رضا کے حصول کی نیت سے مسجد تعمیر کی اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔''[2] متفق علیہ، احمد، ابن حبان اور بزار نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی، خواہ وہ قطاۃ پرندہ کے گھونسلے کی مثل ہو (یعنی چھوٹی سی) اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔''[3]

③ مسجد کی طرف جاتے ہوئے دعائے مسنون

اس ضمن میں درجِ ذیل روایات وارد ہیں:

① سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں نبی کریم ﷺ جب گھر سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے: «بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ» ''اللہ کے نام کے ساتھ اور اسی پہ میرا بھروسہ ہے، اے اللہ! میں اس امر سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ راستہ بھولوں یا بھلایا جاؤں یا لغزش کھاؤں یا کھلایا جاؤں یا ظلم کروں یا کوئی مجھ پہ کرے یا طیش میں آؤں یا کوئی مجھ پہ آئے۔''[4] اسے اصحابِ سنن نے نقل کیا اور ترمذی نے صحیح قرار دیا۔

---

① صحیح البخاری: ٣٤٢٥؛ صحیح مسلم: ٥٣٣. ② صحیح البخاری: ٤٥٠؛ صحیح مسلم: ٥٣٣.
③ صحیح، مسند أحمد: ١/ ٢٤١؛ مسند الطيالسی: ٢٦١٧. ④ صحیح، سنن أبی داود: ٥٠٩٤؛ سنن ترمذی: ٣٤٢٧.

② اصحاب سنن ثلاثہ نے اور ترمذی نے حسن قرار دیتے ہوئے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا: ''جو گھر سے نکلتے وقت پڑھے: «بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» تو اسے جواب میں کہا جاتا ہے: «حَسْبُكَ هُدِيْتَ وَكُفِيْتَ وَوُقِيْتَ وتنحّى عَنْهُ الشيطانُ» ''تمہیں کفایت اور ہدایت ملی اور تم بچا لیے گئے اور شیطان اس سے کنارا کش ہوا۔''[1]

③ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے نکلتے تو یہ کہتے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَخَلْفِيْ نُوْرًا وَفِيْ عَصَبِيْ نُوْرًا وَفِيْ لَحْمِيْ نُوْرًا وَفِيْ دَمِيْ نُوْرًا وَفِيْ شَعْرِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَشَرِيْ نُوْرًا» مسلم کی روایت میں ہے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَفِيْ لِسَانِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْ فِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْ مِنْ خَلْفِيْ نُوْرًا وَمِنْ أَمَامِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِيْ نُوْرًا وَمِنْ تَحْتِيْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ أَعْطِنِيْ نُوْرًا»[2]

④ احمد، ابن خزیمہ اور ابن ماجہ نے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے حسن کہہ کر سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب آدمی گھر سے نماز کے لیے چلے تو کہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَايَ هٰذَا فَإِنِّيْ لَمْ أَخْرُجْ أَشِرًا وَلَا بَطَرًا وَلَا رِيَاءً وَلَا سُمْعَةً وَخَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سُخْطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ أَسْأَلُكَ أَنْ تُنْقِذَنِيْ مِنَ النَّارِ وَأَنْ تَغْفِرَلِيْ ذُنُوْبِيْ إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ»

''اے اللہ! میں ریا کی خاطر گھر سے نہیں نکلا ہوں، بلکہ تیری رضا کی خاطر اور تیری ناراضی سے بچنے کے لیے میری دعا ہے کہ تو مجھے آگ سے بچا لے اور میرے گناہوں کو معاف فرما کہ تیرے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔'' تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر کر دیتا ہے، جو اس کے لیے استغفار کرتے ہیں اور اللہ اس پر اپنے چہرہ کے ساتھ متوجہ رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ نماز کو پوری کر لے۔''[3]

④ مسجد میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت کی دعا

مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے مسنون ہے کہ پہلے دایاں پاؤں داخل کرے اور کہے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ[4] بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ[5]

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٥٠٩٥؛ سنن ترمذی: ٣٤٢٦. [2] صحیح البخاری: ٦٣١٦؛ صحیح مسلم: ٧٦٣.
[3] ضعیف، سنن ابن ماجه: ٧٧٨؛ مسند أحمد: ٣/ ٢١. [4] صحیح، سنن ا بی داود: ٤٦٦. [5] صحیح، سنن ابن ماجه: ٧٧١.

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ » [1] اور جب نکلے تو پہلے بایاں پاؤں باہر کرے اور کہے: « بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ [2] اَللّٰھُمَّ اعْصِمْنِیْ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ » [3]

⑤ مسجد جانے اور وہاں بیٹھنے کی فضیلت

① احمد اور شیخین نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو دن کو بھی مسجد گیا اور شام کے اوقات میں بھی، اللہ صبح و شام میں جنت میں اس کے لیے مہمانی تیار کرتا ہے۔'' [4]

② احمد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان نے اور ترمذی نے حسن جبکہ حاکم صحیح قرار دے کر سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی کی مسجد میں آمد و رفت معمول بنی دیکھو، تو اس کے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

﴿ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ﴾ (التوبة:١٨)

''اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور زکاۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے۔'' [5]

③ مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے گھر میں وضو کیا، پھر کسی مسجد کا رخ کیا، تاکہ فرض نماز ادا کرے، اس کا اٹھا ہر ایک قدم اس کے رفعِ درجہ اور ہر دوسرا اس کے گناہ مٹانے کا سبب بنے گا۔'' [6]

④ طبرانی اور بزار نے بسند صحیح سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد ہر متقی کا گھر ہے اور اللہ ہر اس کے لیے رَوح، رحمت اور پلِ صراط سے جنت کی طرف اس کے گزر جانے کا ضامن ہے، مسجد جس کا گھر ہے۔'' [7]

⑥ تحیۃ المسجد

جماعت نے سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی مسجد آئے، تو بیٹھنے سے قبل دو رکعت پڑھے۔'' [8] (اسے تحیۃ المسجد کا نام دیا گیا ہے۔)

---

① حسن، مسند أبی یعلی: ٦٨٢٢. ② صحیح، سنن ابن ماجه: ٧٧١. ③ صحیح، سنن ابن ماجه: ٧٧٣.
④ صحیح البخاری: ٦٦٢؛ صحیح مسلم: ٦٩٩. ⑤ ضعیف، سنن ترمذی: ٣٠٩٣؛ سنن ابن ماجه: ٨٠٢.
⑥ صحیح مسلم: ٦٦٦. ⑦ صحیح، مجمع الزوائد: ٢/ ٢٢؛ مسند البزار: ٤٣٤. ⑧ صحیح البخاری: ٤٤٤؛ صحیح مسلم: ٧١٤.

⑦ افضل ترین مساجد

امام بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نماز کے برابر ہے اور میری مسجد میں ایک ہزار اور مسجد اقصی میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔''[1] امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز دیگر مساجد کی ہزار نمازوں سے افضل ہے، ماسوائے کعبہ کے کہ اس میں ایک نماز میری مسجد کی سو نمازوں کی مثل ہے۔''[2] جماعت نے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا: ''(عبادت کی غرض سے اور زیادہ ثواب سمجھتے ہوئے) سفر نہ کیا جائے، مگر تین مساجد کی طرف، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔''[3]

⑧ مساجد کی زیب وزینت

احمد، ابوداوٗد، نسائی، ابن ماجہ نے اور ابن حبان نے حکمِ صحت لگا کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی، حتی کہ لوگ مساجد کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ بازی اور فخر ومباہات کریں۔''[4] ابن خزیمہ کی روایت کے الفاظ ہیں: ''ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ مساجد کی تعمیر تو عالی شان کریں گے، مگر عبادت سے اسے آباد رکھنے والے کم ہی ہوں گے۔''[5]

(بقول اقبال

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا)

ابوداوٗد نے اور ابن حبان نے صحیح قرار دے کر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ» (بقول محشی ضرورت سے زیادہ اونچی اور لمبی چوڑی مساجد بنانے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا۔) ابوداوٗد نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا اضافہ کیا کہ تم ضرور انہیں مزین کرو گے، جیسے یہود ونصاری نے (اپنے گرجا گھر) مزین کیے۔[6] ابن خزیمہ نے صحیح قرار دے کر نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مساجد کی تعمیر کا حکم دیا اور ہدایت دی کہ لوگوں کو بارش سے محفوظ رکھو اور انہیں سرخ کرنے اور زرد کرنے (آرائش وزیبائش) سے بچنا کہ لوگوں کی (دورانِ نماز میں) توجہ خراب کرو۔[7] اسے بخاری نے معلقاً نقل کیا۔

---

① ضعيف جدًا، سنن ابن ماجه: ١٤٠٦. ② صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٣٤٣، ٣٩٧، شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے صحیح قرار دیا۔
③ صحيح البخاري: ١١٨٩؛ صحيح مسلم: ١٣٩٧. ④ صحيح، سنن أبي داود: ٤٤٩؛ سنن ابن ماجه: ٧٣٩.
⑤ ضعيف، صحيح ابن خزيمة: ١٣٢٣. ⑥ صحيح، سنن أبي داود: ٤٤٨؛ صحيح ابن حبان: ١٦١٥.
⑦ صحيح البخاري، قبل الرقم: ٤٤٦.

⑨ مساجد کو صاف اور خوشبو دار رکھنا

احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے جید سند کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گلی محلوں میں مساجد بنانے کا حکم دیا اور یہ کہ انہیں مستحکم بنائیں اور صاف و پاک رکھیں۔[1] کہتی ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب (جمعے کے لیے) منبر پر بیٹھتے تو عبداللہ (المجمر) مسجد میں کوئی خوشبو دار بوٹی سلگاتے۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ پر میری امت کی نیکیاں پیش کی گئیں حتی کہ مسجد سے تنکا نکال باہر کرنے کی بھی (نیکیاں شامل تھی)۔''[3] اسے ابو داؤد نے نقل کیا اور ابن خزیمہ نے حکمِ صحت لگایا۔

⑩ مساجد کی دیکھ بھال اور حفاظت

مساجد چونکہ عبادت کی جگہیں ہیں، لہٰذا گندگی اور ناگوار بدبو سے ان کی حفاظت ضروری ہے، مسلم نے یہ فرمانِ نبوی نقل کیا کہ ''یہ مساجد پیشاب اور گندگی وغیرہ کے لیے نہیں یہ تو اللہ کا ذکر کرنے اور قرآن کی تلاوت کے لیے ہیں۔''[4] احمد نے صحیح سند سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی مسجد میں تھوک دے، تو اسے چاہیے کہ اسے صاف کرے کہ مبادا کسی مومن کے کپڑے یا جسم کو لگ جائے اور اسے ایذا ہو۔''[5] مسلم اور بخاری نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز میں کوئی اپنے سامنے مت تھوکے، کیونکہ وہ اللہ سے محوِ مناجات ہے، جب تک اپنی نماز گاہ میں ہے اور نہ دائیں طرف کہ ادھر فرشتہ ہے، بلکہ بائیں جانب یا پاؤں تلے تھوکے (یہ اس زمانہ کی مساجد کے لحاظ سے جب کچے فرش تھے اور کوئی دری یا چٹائی بچھی نہ ہوتی تھی) اور پھر اسے دفن کرے۔''[6] بالاتفاق صحیح حدیث میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے لہسن، پیاز یا گندنا (یا بو والی کوئی بھی چیز) کھائی (یا اگر دانت صاف نہیں کیے اور منہ سے بو آ رہی ہے یا مثلاً سگریٹ و حقہ کی بو) تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ ہو (جب تک بو قائم ہے) کیونکہ فرشتوں کو بھی ان اشیا سے ایذا ہوتی ہے جن سے بنی آدم کو ہوتی ہے۔''[7] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہِ جمعہ میں کہا: اے لوگو! تم دو درختوں سے کھاتے ہو، یعنی لہسن اور پیاز اور میں انہیں خبیث خیال کرتا ہوں، میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی سے ان کی بو محسوس ہوتی تو آپ کے حکم سے اسے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا تھا، تو جو اسے کھانا چاہے، وہ خوب پکا کر ان کی بو ختم کر کے کھائے۔[8] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے تخریج کیا۔

⑪ مساجد میں اعلانِ گمشدگی، خرید و فروخت اور شعر و شاعری کرنے کی کراہت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی کو مسجد میں اعلان گمشدگی کرتا دیکھے، تو کہے: اللہ کرے وہ نہ ملے، کیونکہ مساجد اس غرض کے لیے نہیں بنیں۔''[9] اسے مسلم نے نقل کیا، انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحیح، سنن أبی داود: ٤٥٥. ② مسند المؤطا للجوهری: ٥٥٣. ③ ضعیف، سنن أبی داود: ٤٦١؛ سنن ترمذی: ٢٩١٧. ④ صحیح مسلم: ٢٨٥. ⑤ صحیح ابن خزیمة: ٢٨٥. ⑥ صحیح البخاری: ٤١٦. ⑦ صحیح مسلم: ٥٦٤. ⑧ صحیح مسلم: ٥٦٧؛ سنن نسائی: ٧٠٧. ⑨ صحیح مسلم: ٥٦٨.

نے فرمایا: ''اگر مسجد میں تجارتی معاملات طے ہوتے دیکھو تو کہو: اللہ کرے نفع نہ ہو۔''[1] اسے نسائی اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی حسن قرار دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر خرید وفروخت سے منع کیا اور اس بات سے کہ اشعار پڑھے جائیں اور گمشدگی کا اعلان کیا جائے اور اسی طرح جمعے کے دن نماز سے قبل حلقے بنا لینے سے بھی روکا۔[2] اسے پانچوں نے تخریج کیا اور ترمذی نے حکمِ صحت لگایا، شعر گوئی سے مراد ایسے اشعار جن میں کسی مسلمان کی ہجو یا ظالم کی مدح یا فحش گوئی وغیرہ (فضولیات) ہوں، لیکن جن میں حکمت کی باتیں، اسلام (اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح وتوصیف اور نیکی کی ترغیب ہو، تو اس میں حرج نہیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے، تو دیکھا کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں اشعار سنا رہے ہیں، تو انہیں ناگواری سے دیکھا، وہ گویا ہوئے میں یہ کام اس شخصیت کی موجودگی میں بھی کرتا تھا جو آپ سے افضل تھی، پھر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: تمہیں اللہ کا واسطہ، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا، مجھے فرماتے تھے: ''میری طرف سے (مشرکوں کی ہجو کا) جواب دو، اے اللہ! اس کی روح القدس کے ساتھ مدد فرما۔'' انہوں نے کہا: ہاں، سنا تھا۔[3] متفق علیہ۔

⑫ مسجد میں مالی اعانت اور چندے کی اپیل کرنا

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: دستِ سوال دراز کرنا، اصلاً ہی حرام ہے، چاہے مسجد ہو یا اس کا غیر مگر مجبوری اور ضرورت کے تحت، اگر کوئی مجبور ہے اور مسجد میں مالی اعانت کا سوال کیا اور کسی کی ایذا رسائی کا سبب نہیں بنا مثلاً کہ گردنیں پھلانگے اور جھوٹ بولے اور شور کرے یا مثلاً خطیب خطبہ دینے میں مشغول ہے یا کوئی درس وتعلیم ہو رہی ہے تو اس دوران میں بات کرنے لگ جائے، تو اگر ایسی کوئی صورتِ حال نہیں، تب جائز ہے۔

⑬ مساجد میں شور کرنا

ایسے طریقے سے آوازیں بلند کرنا کہ نمازیوں کی توجہ خراب ہو اور چاہے یہ آواز بلند کرنا، تلاوتِ قرآن کے ساتھ ہی ہو، یہ حرام ہے، اس سے درسِ علم مستثنیٰ ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے تو لوگ نمازوں میں مصروف بآوازِ بلند قراءت کر رہے تھے، تو فرمایا: ''نمازی اپنے رب سے مناجات کر رہا ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ غور کرے کہ وہ کس سے محوِ مناجات ہے (جو اس کی آہستہ آواز بھی سنتا ہے، لہٰذا آواز بلند کرنے کی ضرورت نہیں) اور قرآن پڑھتے ہوئے آواز بلند نہ کیا کرو۔''[4] اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے، تو لوگوں کو بلند آواز میں تلاوت کرتے سنا، تو پردہ اٹھایا اور فرمایا: ''سنو! تم میں سے ہر ایک اپنے رب سے

---

① صحيح، سنن ترمذى: ١٣٢١؛ صحيح ابن حبان: ١٦٥٠. ② حسن، سنن أبى داود: ١٠٧٩؛ سنن ترمذى: ٣٢٢. ③ صحيح البخارى: ٤٥٣؛ صحيح مسلم: ٢٤٨٥. ④ صحيح، مسند أحمد: ٢/ ٣٦، ٦٧؛ صحيح ابن خزيمة: ٢٢٣٧.

مناجات کر رہا ہے، تو ایک دوسرے کو ایذا مت دو اور نہ تلاوت کرتے ہوئے آوازیں بلند کرو۔''[1] اسے ابوداود، نسائی، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا، ان کے بقول یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

⑭ مسجد میں باہم گفتگو کرنا

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مسجد کے اندر آپس میں مباح گفتگو کرنا جائز ہے، امورِ دنیا ہوں یا دیگر مباحات اگرچہ اس دوران میں ہنسی وغیرہ کا وقوع بھی ہوتا ہو، جب تک مباح موضوع ہے، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ صبح کے بعد سورج طلوع ہونے تک وہیں تشریف فرما رہے اور اس دوران میں (ذکر اذکار کے بعد) لوگ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے حتی کہ جاہلیت کے احوال بھی زیرِ بحث آئے، اثنائے گفتگو ہنس بھی لیتے اور خود آپ مسکراتے۔[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

⑮ مسجد میں کھانے پینے اور سونے کی اباحت

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ عہدِ نبوی میں ہم مسجد میں سو بھی لیتے تھے اور قیلولہ بھی کرتے اور ہم نوجوان تھے۔[3] (یہ بات اس لیے کہی کہ احتلام ہونے کا خدشہ نوجوانوں میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے) امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ثابت ہے کہ اصحابِ صفہ مسجد میں ہی میں سوتے تھے، اسی طرح جب عرینہ قبیلے والے آئے اور سیدنا علی، صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہما اور کئی دیگر صحابہ مسجد میں ہی سو جاتے تھے، ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ نے قبولِ اسلام سے قبل مسجد ہی میں تین راتیں گزاریں اور یہ سب عہدِ نبوی میں ہوا، شافعی الام میں لکھتے ہیں: اگر مشرک مسجد میں رات گزارے اور اس طرح مسلمان بھی تو کوئی حرج نہیں البتہ مشرک کو مسجد حرام کے قریب نہ آنے دیا جائے، سیدنا عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم عہدِ رسول میں مسجد کے اندر روٹی اور گوشت تناول کر لیتے تھے۔[4] اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے نقل کیا۔

⑯ ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنا

نماز کی طرف آتے وقت اور مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے انگلیاں ایک دوسری میں پھنسانا مکروہ ہے، دیگر اوقات میں مکروہ نہیں، چاہے مسجد کے اندر ہو (یا باہر) سیدنا کعب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عمدگی سے وضو کیا، پھر مسجد کا رخ کیا وہ اپنی انگلیاں ایک دوسری میں نہ پھنسائے، کیونکہ وہ نماز میں ہے۔''[5] اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے تخریج کیا۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مسجد میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ ایک آدمی مسجد کے وسط میں انگلیاں ایک دوسری میں ڈالے بیٹھا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ سمجھ نہ سکا پھر آپ ملتفت ہوئے اور فرمایا: ''جب کوئی مسجد میں ہو، تو انگلیاں ایک دوسری میں نہ ڈالے، کیونکہ یہ شیطان کا فعل ہے اور آدمی

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٣٣٢؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٣١١. [2] صحیح مسلم: ٦٧٠. [3] صحیح البخاري: ٤٤٠، مسند أحمد: ٢/ ١٢؛ سنن ابن ماجه: ٧٥١. [4] صحیح، صحیح ابن حبان: ١٦٥٦؛ سنن ابن ماجه: ٣٣٠٠. [5] صحیح، سنن أبی داود: ٥٦٢؛ سنن ترمذی: ٣٨٦.

جب تک مسجد کے اندر ہے (گویا) نماز میں ہے حتی کہ مسجد سے چلا جائے۔''[1] اسے احمد نے تخریج کیا۔

⑰ ستونوں کے درمیان نماز پڑھنا

امام کے لیے بھی اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے لیے بھی جائز ہے کہ ستونوں کے درمیان نماز پڑھے، چنانچہ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کعبہ کے اندر داخل ہوئے تھے، تو دو ستونوں کے درمیان نماز ادا کی تھی،[2] سعید بن جبیر، ابراہیم تیمی اور سوید بن غفلہ ستونوں کے درمیان کھڑے امامت کرا لیتے تھے! جہاں تک مقتدی تو اگر آگے پیچھے گنجائش ہو تو ان کی نسبت ستونوں کے درمیان ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، ہاں اگر جگہ کی تنگی ہو تو حرج نہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے سے منع کیے جاتے اور وہاں سے ہٹا دیے جاتے تھے،[3] اسے حاکم نے نقل کیا اور حکمِ صحت لگایا، معاویہ بن قرہ اپنے والد سے راوی ہیں، کہتے ہیں: ہمیں عہدِ نبوی میں ستونوں کے درمیان صفیں بنانے سے منع کیا جاتا تھا اور وہاں سے ہمیں ہٹا دیا جاتا،[4] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا اور اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے، سعید بن منصور نے سنن میں سیدنا ابن مسعود، ابن عباس اور حذیفہ رضی اللہ عنہم سے اس کی نہی نقل کی ہے، ابن سید الناس کہتے ہیں، صحابہ میں کوئی اس کا قائل معروف نہیں۔

وہ مقامات جہاں نماز پڑھنا منع ہے

① قبرستان میں

چنانچہ بخاری، مسلم، احمد اور نسائی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیا کی قبور کو مساجد بنا لیا تھا۔''[5] احمد اور مسلم کے ہاں سیدنا ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قبور کی طرف (رخ کیے) نماز نہ پڑھو اور نہ ان کے اوپر بیٹھو۔''[6] انہی نے سیدنا جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات سے پانچ دن قبل فرماتے تھے سنا: ''سابقہ امم نے اپنے انبیا اور صالحین کی قبروں کو مسجد بنا لیا، خبردار! تم ایسا مت کرنا، میں تمہیں اس سے روک رہا ہوں۔''[7] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ حبشہ میں ایک کنیسہ دیکھا تھا، جسے ماریہ کہتے تھے اور اس میں تصاویر تھیں، فرمایا: ''یہ لوگ کسی عبدِ صالح کے فوت ہونے پر اس کے مدفن کو مسجد بنا لیتے تھے اور تصویر بھی، یہ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔''[8] اسے بخاری، مسلم اور نسائی نے تخریج کیا، آپ سے مروی ہے کہ فرمایا: ''اللہ قبور کی زیارت کرنے والوں پر لعنت

---

① ضعيف، مسند أحمد: ٣/ ٤٣. ② صحيح البخاري: ٣٩٧؛ صحيح مسلم: ١٣٢٩. ③ صحيح، المستدرك للحاكم: ١/ ٢١٨. ④ صحيح، سنن ابن ماجه: ١٠٠٢. ⑤ صحيح البخاري قبل الرقم: ٣٢٧. ⑥ صحيح مسلم: ٩٧٢؛ مسند أحمد: ٤/ ١٣٥. ⑦ صحيح مسلم: ٥٣٢. ⑧ صحيح البخاري: ١٣٤١؛ صحيح مسلم: ٥٢٨.

کرے اوران پہ جو وہاں مساجد بنالیتے اور چراغ روشن کرتے ہیں۔''[1]

کثیر علماء نے اس نہی کو کراہت پر محمول کیا ہے، چاہے مقبرہ نمازی کے آگے ہو یا پیچھے، ظاہر یہ نے اس نہی کو تحریمی قرار دیا اور یہ کہ قبرستان میں نماز ہوتی ہی نہیں، حنابلہ کے نزدیک بھی یہی ہے، اگر کم از کم تین قبریں ہوں، اگر ایک یا دو ہوں تب نماز پڑھ لینا صحیح تو ہے، لیکن مع الکراہت، اگر قبریں قبلہ رخ ہوں، لیکن اگر کسی اور سمت میں ہوں، تب کراہت نہیں۔

② گرجا اور بیعہ (یعنی یہودیوں کے معبد) میں

سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کنیسہ (عیسائیوں کے عبادت خانے) میں نماز پڑھی ہے۔ شعبی، عطاء اور ابن سیرین اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے، امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیعہ میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر اس بیعہ میں نہیں جس میں تصاویر ہوں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نجران سے خط لکھا گیا، کہ ہم بیعہ سے عمدہ اور صاف ستھری جگہ نہیں پاتے تو انہیں جواب لکھا، وہاں پانی میں بیری کے پتے ڈال کر چھڑکاؤ کرو اور نماز پڑھ لو! حنفیہ اور شافعیہ کنیسہ اور بیعہ میں نماز پڑھنے کی مطلق کراہت کے قائل ہیں۔

③ کوڑا اور گوبر پھینکنے کی جگہ، ذبح خانہ، سڑک کے کنارے، اونٹوں کی آرام گاہ، عوامی حمام اور کعبہ کی چھت پر

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے: کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ، ذبح خانہ، قبرستان، عام گزرگاہ، غسل خانے میں، اونٹوں کے باڑے میں اور کعبہ کی چھت پر۔[2] اسے ابن ماجہ، عبد بن حمید اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: اس کی سند قوی نہیں، ذبح خانے اور کوڑے کی جگہ میں نہی کی علت یہ کہ وہ محلِ نجاست ہیں، لہٰذا وہاں ادائیگی نماز حرام ہے، اگر کوئی دری وغیرہ نہ ہو، اگر ہو تب جمہور کے نزدیک مکروہ ہے، احمد اور اہلِ ظاہر کے نزدیک دری وغیرہ پر بھی حرام ہے، اونٹوں کے رہنے کی جگہ نہی کی علت یہ ہے کہ وہ جنوں سے پیدا شدہ ہیں، بعض نے کوئی اور وجہ بیان کی (فتح الباری میں ہے کہ ان کے بدک جانے اور یوں نمازی کو ضرر پہنچنے کے خدشہ کے پیش نظر یہ نہی صادر کی) سڑک کے کنارے نہی کی علت لوگوں کی آمد و رفت ہے جس کی وجہ سے شور وشرابا ہوگا اور نمازی کی توجہ بٹے گی اور خشوع ختم ہوگا، جہاں تک کعبہ کی چھت تو چونکہ اس حالت میں نمازی قبلہ رخ نہ ہوگا، جس کا نماز میں حکم ہے، لہٰذا کثیر علماء کعبہ کی چھت پر عدم صحتِ نماز کے قائل ہیں، بعض حنفیہ کے برخلاف جو جواز مع الکراہت کے قائل ہیں، کراہت اس لیے کہ اس میں ترکِ تعظیم ہے، جہاں تک عوامی حمام خانوں میں نماز پڑھنے کی کراہت، تو کہا گیا اس وجہ سے کہ یہ محلِ نجاست ہیں، جمہور کراہت کے قائل ہیں، اگر نجاست دور کر دی جائے، احمد، ظاہریہ اور ابوثور کے نزدیک حمام میں نماز ہوتی ہی نہیں۔

---

① ضعیف، سنن ترمذی: ۳۲۰؛ سنن نسائی: ۲۰۴۲. ② ضعیف، سنن ترمذی: ۳۴۶؛ سنن ابن ماجہ: ۷۴۶.

کعبہ کے اندر نماز کی ادائیگی

کعبہ کے اندر نماز ادا کرنا صحیح ہے چاہے، فرض ہو یا نفل، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے اندر داخل ہوئے، آپ کے ہمراہ سیدنا اسامہ بن زید، بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم بھی تھے اور دروازہ بند کر لیا گیا، جب کھلا تو سب سے پہلے میں داخل ہوا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر نماز پڑھی؟ کہا: ہاں، دونوں یمانی ستونوں کے درمیان،[1] اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا۔

سترہ

① سترہ کا حکم

مستحب ہے کہ نماز پڑھنے والے کے آگے سترہ ہو، جس کے آگے (نمازی اور سترہ کے درمیان) سے گزرنا ممنوع ہے اور اسے چاہیے کہ اپنی نظر اس سترہ سے متجاوز نہ کرے، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی نماز پڑھے، تو بہتر ہے کہ اپنے آگے سترہ رکھ لے اور اس سے قریب ہو کر کھڑا ہو۔''[2] اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نمازِ عید کے لیے نکلتے تو ایک بھالہ ساتھ لے جانے کا کہتے، جو آپ کے آگے گاڑا جاتا، آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے، سفر میں بھی یہی کرتے تھے، پھر امراء نے اسے اختیار کر لیا۔[3] اسے بخاری، مسلم اور ابوداود نے نقل کیا، حنفیہ اور مالکیہ کی رائے میں نمازی کے لیے سترہ رکھنا تب مستحب ہے، جب کسی کے آگے سے گزرنے کا اندیشہ ہو اگر ایسی بات نہیں تب یہ مستحب نہیں، ان کے مدِ نظر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان میں نماز کرائی اور آپ کے آگے کچھ نہ تھا۔[4] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا اور بیہقی نے بھی اور کہا: اس کے لیے سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے شاہد ہے جس کی سند اس سے اصح ہے۔

② سترہ کس طرح کا ہو؟

ہر وہ چیز سترہ بنائی جا سکتی ہے، جسے نمازی اپنے آگے گاڑ سکے، حتی کہ اپنی جائے نماز کے کنارے کو بھی، سیدنا سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی نماز پڑھے، تو سترہ رکھے، چاہے اپنے تیر کا ہو۔''[5] اسے

---

[1] صحيح البخاري: ١٥٩٨؛ صحيح مسلم: ١٣٢٩. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٦٩٧؛ سنن ابن ماجه: ٩٥٤.
[3] صحيح البخاري: ٤٩٤؛ صحيح مسلم: ٥٠١؛ سنن أبي داود: ٦٨٧. [4] ضعيف، سنن أبي داود: ٧١٨؛ مسند أحمد: ١/ ٢٢٤؛ سنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ٢٧٣. [5] صحيح، مسند أحمد: ٤٠٤٣؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٥٢.

احمد اور حاکم نے نقل کیا: اور کہا یہ مسلم کی شرط پر ہے، ہیثمی کہتے ہیں: احمد کے رجال صحیح کے رجال ہیں، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی نماز پڑھے، تو اپنے آگے کوئی چیز رکھ لے، اگر کچھ نہ پائے تو لاٹھی گاڑ لے، اگر یہ بھی نہ ہو تو ایک لکیر ہی کھینچ دے، اب اس کے سامنے گزرنے سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔''[1] اسے احمد، ابو داود اور ابن حبان نے نقل کیا، بقول ابن حبان و احمد صحیح ہے، امام ابن مدینی رحمہ اللہ نے بھی صحیح قرار دیا، امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس حدیث کے ساتھ اس حکم میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں، روایات میں مذکور ہے کہ آپ نے مسجد نبوی میں ستون سامنے کر کے نماز پڑھی، اسی طرح درخت سامنے رکھ کر، گھر میں تہجد پڑھتے، تو عموماً سامنے چارپائی ہوتی تھی، جس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا لیٹی ہوتیں، اپنی سواری سامنے کر کے نماز پڑھی اسی طرح پالان کا پچھلا حصہ آگے رکھ کر بھی، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نماز میں ہوتے تو ہمارے آگے سے چوپائے گزرتے رہتے، آپ سے اس کا ذکر ہوا، تو فرمایا: ''اگر کوئی چیز سامنے کر لو یا پالان کا پچھلا حصہ ہی تب کوئی ضرر نہیں۔''[2] اسے احمد، مسلم، ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی نے کہا: حسن صحیح ہے۔

③ مقتدیوں کو الگ سے سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں

امام کا سترہ مقتدیوں کا بھی شمار ہوگا، چنانچہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے، کہتے ہیں: ہم آپ کے ہمراہ اذاخر نامی گھاٹی سے اترے (یہ مکہ کے قرب میں واقع ہے) نماز کا وقت ہوا، تو ایک دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی، ایک بکری کا بچہ آیا اور آپ کے آگے سے گزرنے لگا، آپ اسے پیچھے کرتے گئے، حتی کہ آپ کا پیٹ دیوار کو جا لگا، اسے آپ نے اپنے پیچھے (مقتدیوں کے آگے) سے گزرنے پر مجبور کیا۔[3] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں گدھی پر سوار آیا اور میں تب قریب البلوغت تھا، آپ اس وقت منیٰ میں جماعت کرا رہے تھے، تو صف کے ایک حصہ کے آگے سے گزر کر صف میں شامل ہوا اور گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا، تو کسی نے مجھ پر کسی طرح کا اعتراض نہ کیا۔[4] اسے جماعت نے روایت کیا، ان روایات میں مقتدی کے آگے سے گزرنے کے جواز پر دلالت ہے اور یہ کہ سترہ امام کے لیے اور اکیلے نماز پڑھنے والے کی نسبت سے ہے۔

④ سترے کے قریب کھڑے ہونے کا استحباب

امام بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اہل علم نے سترے کے قریب کھڑے ہونا مستحب سمجھا ہے، بس اتنی جگہ چھوڑ کر کہ سجدہ کر سکے، اسی طرح صفوں کا باہمی فاصلہ (اور پہلی صف کا امام سے) بھی اسی قدر ہونا چاہیے، سابق الذکر حدیث میں ہے: ((وَلْيَدْنُ مِنْهَا)) ''اس سے قریب ہو۔'' سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک دیوار کو سامنے رکھے، نماز پڑھی اور آپ اس

---

① ضعيف، سنن أبي داود: ٦٨٩؛ سنن ابن ماجه: ٩٤٣. ② صحيح مسلم: ٤٩٩؛ سنن أبي داود: ٦٨٥.
③ صحيح، سنن أبي داود: ٧٠٨. ④ صحيح البخاري: ٤٩٣؛ صحيح مسلم: ٥٠٤؛ سنن أبي داود: ٧١٥.

سے تقریباً تین گز کے فاصلہ پر کھڑے تھے۔[1] اسے احمد، بخاری اور نسائی نے نقل کیا، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اتنی جگہ چھوڑی ہوئی تھی کہ بکری گزر پائے۔[2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

⑤ نمازی اور اس کے سترے کے درمیان سے گزرنے کی تحریم

احادیث نمازی کے آگے سے یا اس کے اور سترہ کے مابین سے گزرنے کی تحریم پر دال ہیں اور یہ کبیرہ گناہ ہے، بشر بن سعید راوی ہیں کہ زید بن خالد نے کسی کو ابوجہیم کے پاس پوچھنے بھیجا کہ نمازی کے آگے سے گزرنے کے بارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا ہے، انہوں نے کہلوایا کہ آپ نے فرمایا: ''اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا جان لے کہ اس پر اس پاداش میں کیا گناہ ہے، تو چالیس ٹھہرا رہے، یہ اس کے لیے اس امر سے بہتر ہو کہ اس کے آگے سے گزرے۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''آگے سے گزرنے والا، اگر جان لے کہ اس پر کیا گناہ عائد ہوا، تو چالیس برس انتظار کرنا گزرنے سے اسے بہتر لگے۔''[4] اسے بزار نے بسند صحیح نقل کیا، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ابن حبان وغیرہ نے لکھا کہ حدیث میں مذکورہ تحریم کا تعلق جب نمازی نے اپنے آگے سترہ رکھا ہے، اگر نہیں رکھا تب (بوقت ضرورت) آگے سے گزرنا حرام نہیں، ابوحاتم (ابوحاتم سے مراد ابن حبان ہیں) نے اس کے لیے اپنی صحیح میں سیدنا مطلب ابن ابووداعہ رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ حدیث سے حجت پکڑی، کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طواف سے فارغ ہو کر مطاف کے کنارے پر آئے اور دو رکعتیں پڑھیں اور سامنے سے طواف کرنے والے گزرتے رہے اور آپ کے اور ان کے درمیان کوئی سترہ نہ تھا۔[5] لکھتے ہیں: اس روایت میں نمازی کے آگے سے گزرنے کی اباحت پر دلیل ہے اگر اس نے سترہ نہ رکھا ہو اور یہ دلالت بھی ملی کہ سابق الذکر روایات وغیرہ میں جو ایسا کرنے پر شدید وعید ہے، وہ تب جب سترہ رکھا ہو اور کوئی نمازی اور سترہ کے درمیان سے گزرے۔ ابوحاتم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: راوی نے بیان کیا کہ آپ کے اور طوافین کے درمیان کوئی سترہ نہ تھا، اور پھر مطلب سے ایک روایت نقل کی جس میں ہے کہ آپ نے طواف کے بعد حجر اسود کے برابر کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھیں اور طواف میں مشغول مرد و زن آپ کے آگے سے گزرتے رہے، درمیان میں سترہ بھی نہ تھا (بقول محشی الروضہ میں ہے کہ اگر بغیر سترہ رکھے نماز پڑھے یا سترہ تو ہے، مگر اس سے دور کھڑا ہے، تو اصح یہ ہے کہ اسے آگے سے گزرنے والے کو روکنے کا حق نہیں، کیونکہ یہ اس کی کوتاہی ہے، اس صورت میں گزرنا حرام نہیں لیکن اولیٰ اس کا ترک ہے)۔

⑥ آگے سے گزرنے والے کو روکنے کی مشروعیت

اگر نمازی نے سترہ رکھا ہے، تو اس کے لیے مشروع ہے کہ آگے سے گزرنے والے کو روکے، انسان ہو یا حیوان، لیکن اگر

---

① صحیح البخاری: ٥٠٦؛ سنن نسائی: ٧٤٨. ② صحیح البخاری: ٤٩٦؛ صحیح مسلم: ٥٠٧. ③ صحیح البخاری: ٥١٠؛ صحیح مسلم: ٥٠٧. ④ صحیح لغیرہ، سنن ابن ماجه، ٩٤٤. ⑤ ضعیف، سنن نسائی: ٢٩٥٩؛ صحیح ابن خزیمة: ٨٠٥ صحیح ابن حبان: ٢٣٦٣.

وہ سترے کے آگے سے گزرے، تب روکنا مشروع نہیں اور گزرنے سے اسے کوئی ضرر لاحق نہ ہوگا، حمید بن ہلال کہتے ہیں: میں اور میرا ایک ساتھی باہم علمی مذاکرہ میں مشغول تھے کہ ابو صالح سمان کہنے لگے: میں تمہیں سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے سنی ایک حدیث سناتا ہوں اوران کا یہ واقعہ میرے سامنے ہوا، میں اور وہ سامنے کوئی چیز رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے کہ بنی ابومعیط کا ایک نوجوان آیا اور چاہا کہ آگے سے گزر جائے، تو سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا، اسے کوئی جانے کی جگہ نہ ملی تو پھر کوشش کی اب کے زیادہ سخت ہاتھ رکھا، وہ کھڑا ہوگیا اور بڑ بڑ کرنے لگا، پھر لوگوں میں گھل مل گیا اور بعد میں مروان کے پاس جا کر شکایت کی (مروان کے اقارب میں سے تھا اور مروان تب مدینہ کا امیر تھا) سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ بھی اس کے پیچھے مروان کے پاس جا پہنچے، تو اس نے کہا: آپ کا یہ بھتیجا آپ کی شکایت لے کر آیا ہے؟ تو سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرمایا: ''جب کوئی سترہ رکھ کر نماز پڑھے اور کوئی آگے سے گزرنا چاہے، تو اسے حق ہے کہ اسے روکے، اگر وہ انکار کرے، تو اس سے لڑے، کیونکہ وہ شیطان ہے۔''[1] اسے بخاری و مسلم نے تخریج کیا۔

⑦ نماز کسی چیز سے نہیں ٹوٹتی

سیدنا علی، عثمان ابن مسیب، شعبی، مالک، شافعی، سفیان ثوری رحمہم اللہ اور احناف کا موقف ہے کہ نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی کیونکہ ابوداود نے ابو وداک سے نقل کیا کہتے ہیں، ایک قریشی نوجوان سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کے آگے سے گزرا، وہ نماز پڑھ رہے تھے، تو انہوں نے تین دفعہ اسے روکا، سلام پھیرا تو کہا: نماز کو کوئی چیز قطع نہیں کرتی، لیکن میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے: ''ہر ممکن کوشش کرو کہ آگے سے گزرنے والے کو روکو، کیونکہ وہ شیطان ہے۔''[2]

نماز میں مباح امور

درج ذیل امور کی اباحت ہے:

① تأوّہ (ہچکی لے لے کر رونا) اور آہ و بکا کرنا

چاہے یہ اللہ کی خشیت سے ہو یا کسی اور وجہ سے مثلاً مصائب اور پریشانی یا بھوک کی وجہ سے کہ اتنی زور کی لگی ہو کہ روکنا مشکل ہے، قرآن میں ہے:

﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا﴾ (مریم:۵۸)

''جب (اہل ایمان) پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔''

آیت نماز میں مشغول اور دیگر دونوں کو شامل ہے، سیدنا عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور

---

① صحيح البخاري: ٥٠٩؛ صحيح مسلم: ٥٠٥. ② ضعيف، سنن أبي داود: ٧٢٠.

آپ کے سینے سے رونے کی وجہ سے ہنڈیا کے ابلنے جیسی آواز آرہی تھی، ① اسے احمد، ابو داود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی صحیح ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: معرکہ بدر میں ہم میں سوائے سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کے کوئی گھڑسوار نہ تھا، ہم سب آرام کر رہے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت تلے کھڑے نماز میں لگے تھے اور روتے رہے تھے، حتی کہ اسی حالت میں صبح کر دی۔ ② اسے ابن حبان نے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ آپ نے ایک موقع پر حکم دیا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو میرا حکم پہنچاؤ کہ وہ لوگوں کو نمازیں پڑھائیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ! وہ ایک رقیق القلب آدمی ہیں، جب قرآن پڑھیں گے، تو رونے پر قابو نہ رکھ پائیں گے، کہتی ہیں: میرے ذہن میں یہ ذکر کرنے سے اصل مقصد یہ تھا کہ کہیں لوگ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منحوس خیال نہ کرنے لگ جائیں، یہ باور کرتے ہوئے کہ وہ اول شخص ہیں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہوئے، مگر آپ نے دوبارہ کہا: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو میرا حکم سناؤ کہ امامت کرائیں اور ساتھ ہی کہا: «إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوْسُفَ» ③ یعنی مصر کی وہ خواتین جن کا ذکر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہوا کہ جو منہ سے وہ بات کہتی تھیں جو ان کے دل میں نہ تھی۔ اسے احمد، ابو داود، ابن حبان نے جبکہ ترمذی نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے حکم کو برقرار رکھنا، حالانکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کیفیت جان لی تھی، اس کے جواز پر دلیل ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ نمازِ صبح میں سورۂ یوسف پڑھی، جب ﴿إِنَّمَآ أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِيٓ إِلَى اللَّهِ﴾ (یوسف: ۸۶) تک پہنچے تو بلند آواز سے رونے لگے۔ ④ اسے بخاری، سعید بن منصور اور ابن منذر نے نقل کیا، اس میں ان حضرات کا رد ہے، جو قائل ہیں کہ رونے سے نماز ٹوٹ جائے گی، اگر روتے ہوئے (کم از کم) دو حرف منہ سے نکل گئے، چاہے یہ اللہ کی خشیت سے ہو یا کسی اور سبب سے، ان کا کہنا کہ روتے ہوئے دو حرف نکلنا (گویا) کلام ہے، غیر مسلّم ہے، رونا اور چیز ہے اور کلام کرنا اور چیز۔

② بوقتِ ضرورت (گوشۂ چشم سے) جھانک لینا

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ نماز دائیں بائیں جھانک لیتے تھے، لیکن گردن مبارک نہیں موڑتے تھے۔ ⑤ اسے احمد نے نقل کیا، ابو داود راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کی اور اس اثنا آپ مسلسل گھاٹی کی طرف ملتفت رہے، ابو داود کہتے ہیں، دراصل آپ نے ادھر ایک گھڑسوار رات کو پہرہ دینے کی غرض سے بھیجا تھا (تو اس کے انتظار میں یہ کر رہے کہ پتہ لگے، وہ بخیریت آرہا ہے) ⑥ ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نماز کے دوران میں کسی چیز کی طرف نظر اٹھائی اور اسے دیکھنے لگے، اسے احمد نے نقل کیا، اگر کسی ضرورت کے بغیر تانک جھانک کرے، تو یہ مکروہِ تنزیہی ہے، کیونکہ یہ خشوع اور اللہ پر متوجہ ہونے کے منافی ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے

---

① صحيح، سنن أبي داود: ٩٠٤؛ سنن نسائي: ١٢١٣. ② صحيح، صحيح ابن حبان: ٢٢٥٧؛ صحيح ابن خزيمة: ٨٩٩. ③ صحيح البخاري: ٧١٣؛ صحيح مسلم: ٧١٨. ④ صحيح البخاري، تعليقا: ٢/٢٠٦.
⑤ صحيح، مسند أحمد: ٢٧٥. ⑥ سنن أبي داود: ٩١٦.

نبی کریم ﷺ سے نماز میں تانک جھانک کرنے کے بارے پوچھا، تو فرمایا: ((اِخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ)) ''یہ بندے کی نماز سے شیطان کا حصہ ہے جو وہ چپکے سے اخذ کرتا ہے۔''[1] اسے احمد، بخاری، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ''اے لوگو! تانک جھانک سے بچو کہ ایسا کرنے والے کی کوئی نماز نہیں، اگر نوافل میں ایسا کرنے پر تم مغلوب ہو جاؤ، تو (کم از کم) فرائض میں اس سے ہر ممکن حد تک بچو۔''[2] اسے احمد نے نقل کیا سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے کہا: ''نماز میں التفات کرنے سے بچو، کہ نماز میں ایسا کرنا ثواب میں کمی کا سبب ہے، اگر ضروری ہو تو نوافل میں کرو، فرائض میں نہیں۔''[3] اسے ترمذی نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا، سیدنا حارث اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے سیدنا یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو پانچ کاموں کا حکم دیا اور بنی اسرائیل کو بھی، ان میں یہ بھی ہے کہ جب نماز پڑھو، تو تانک جھانک نہ کیا کرو، اللہ تعالیٰ اپنا چہرہ بندے کے چہرے کے بالمقابل کر لیتا ہے، جب وہ نماز پڑھتا ہے، جب تک ادھر ادھر التفات نہ کرے۔''[4] اسے احمد اور نسائی نے تخریج کیا، سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ بندے پر اثنائے نماز متوجہ رہتا ہے، جب تک التفات نہ کرے، جب یہ کرے تو وہ اس سے پھر جاتا ہے۔''[5] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا اور کہا: مسند کے لحاظ سے صحیح ہے، یہ سب چہرے کے ساتھ التفات کے بارے میں ہے، جہاں تک سارا بدن موڑ کر التفات کرنا، اس طور کہ قبلہ سے پھر جائے، تو اس سے بالاتفاق نماز ٹوٹ جائے گی، کیونکہ قبلہ رو رہنا واجب ہے۔

③ سانپ، بچھو، بھڑ اور ان جیسی موذی اشیا کا (دورانِ نماز) مارنا اگرچہ یہ عملِ کثیر کا مقتضی ہو

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں اگر دو سیاہ آئیں تو انہیں مارو، یعنی سانپ اور بچھو۔''[6] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول ترمذی حسن صحیح ہے۔

④ کسی ضرورت سے تھوڑا سا چل لینا

سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم ﷺ گھر میں نماز پڑھ رہے ہوتے اور دروازہ بند ہوتا، تو اس دوران میں آ جاتی اور دروازہ کھٹکھٹاتی، تو اسی حالت میں چل کر میرے لیے دروازہ کھولتے، پھر اپنی نماز گاہ کی طرف لوٹ جاتے، (راوی نے بیان کیا کہ دروازہ قبلہ کی طرف واقع تھا۔)[7] اسے احمد، ابوداود، نسائی نے جبکہ ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا، تو دروازے کے قبلہ کی جہت واقع ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس دوران میں قبلہ رخ رہے، تو یہ اس ضمن کا ضابطہ ہے، اسی طرح اگر دروازہ

---

[1] صحيح البخاري: ٧٥١؛ سنن أبي داود: ٩١٠. [2] ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٤٤٣؛ اس میں عطاء بن عجلان ہے جو ضعیف ہے۔ [3] ضعيف، سنن ترمذي: ٥٨٩. [4] صحيح، سنن ترمذي: ٢٨٦٣؛ مسند أحمد: ٤/ ١٣٠. [5] ضعيف، سنن أبي داود: ٩٠٩؛ سنن نسائي: ١١٩٤. [6] حسن، سنن أبي داود: ٩٢١؛ سنن ترمذي: ٣٩٠؛ سنن ابن ماجه: ١٢٤٥. [7] حسن، سنن أبي داود: ٩٢٢؛ سنن ترمذي: ٦٠١.

داہنی یا بائیں جانب ہے، تو منہ قبلہ رخ کیے چل کر کھول سکتا ہے، دارقطنی نے سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ قبلہ رخ یا داہنی طرف یا بائیں طرف واقع دروازہ کھول دیتے، البتہ قبلے کی طرف پیٹھ نہ ہونے دیتے،[1] ازرق بن قیس رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہواز میں ایک دریا کے کنارے سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نماز پڑھنے لگے اور گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھام رکھی تھی، تو وہ پیچھے ہٹنے لگا، تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتے گئے، ایک خارجی یہ دیکھ رہا تھا، کہنے لگا: اللہ اس بوڑھے کو رسوا کرے، کیسی نماز پڑھ رہا ہے؟ نماز کے بعد کہنے لگے: میں نے تمہاری بات سنی، میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ چھ یا سات یا آٹھ غزوات میں شرکت کی ہے اور میں آپ کی طرف سے تیسیر (آسانیاں پہنچانے) کا عینی شاہد ہوں، نماز قطع کرنے کی نسبت یہ میرے لیے ہلکا امر تھا کہ جانور کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتا رہوں کہ مبادا وہ بھاگ نکلے اور میرے لیے مشقت کا سامان کرے، اور سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے عصر کی دو رکعتیں ادا کیں۔[2] اسے احمد، بخاری اور بیہقی نے نقل کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ زیادہ چلنے کے بارے میں فتح الباری میں لکھتے ہیں: فقہاء کا اجماع ہے کہ فرض نماز میں زیادہ چلنا، اسے باطل کر دے گا، تو سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ کی یہ مذکورہ روایت اس امر پر محمول ہے کہ تھوڑا چلے تھے۔

⑤ نماز کے دوران میں بچے کو اٹھائے رکھنا

سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس حال میں نماز پڑھائی کہ آپ نے (اپنی نواسی) سیدہ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو اٹھایا ہوا تھا، جب رکوع جاتے تو اسے اتار دیتے اور سجدہ سے اٹھ کر دوبارہ اسے اٹھا لیتے، راوی کہتے ہیں: میں ان سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ یہ کون سی نماز تھی، ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے زید بن ابو عتاب عن عمرو بن سلیم سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ صبح کی نماز تھی،[3] بقول ابو عبدالرحمن (یہ عبداللہ بن امام احمد ہیں) ابن جریج رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا (جس میں ہے کہ یہ نمازِ صبح تھی) اسے احمد اور نسائی وغیرہما نے نقل کیا، فاکہانی رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں: گویا سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ کے اس طرح اٹھائے رکھنے میں حکمت عربوں کی اس روش کا رد اور انکار تھا، جو وہ بیٹیوں کو اٹھانا مکروہ سمجھتے تھے، تو اس کا قلع قمع کرنا چاہا، حتی کہ دورانِ نماز میں بھی اٹھایا، ان کے منع میں مبالغہ کے نقطہ نظر سے اور کبھی بالفعل بیان قول سے زیادہ قوی ہوتا ہے، عبداللہ بن شداد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز کے لیے نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور آپ سیدنا حسن یا حسین رضی اللہ عنہ کو اٹھائے ہوئے تھے، تو انہیں بٹھلایا اور نماز شروع کر دی، اس دوران میں سجدہ طویل کیا، میں نے سر اٹھایا تو دیکھا لڑکا حالتِ سجدہ میں نبی کریم ﷺ کی پشت پر سوار ہے، میں پھر سجدے میں چلا گیا، فارغ ہو کر لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ایک سجدہ آپ نے اتنا طویل کیا کہ ہم سمجھے کوئی معاملہ ہوا ہے، یا پھر وحی نازل ہو رہی ہے، فرمایا: ''ایسا کچھ نہ تھا، دراصل میرا بیٹا مجھ پر سوار ہو گیا تھا، تو میں نے چاہا کہ جلدی نہ کروں، تاکہ وہ اپنا ارمان پورا کر لے۔''[4] اسے احمد، نسائی اور حاکم نے

---

① ضعيف، سنن الدارقطني: ١٨٣٦. ② صحيح البخاري: ١٢١١؛ مسند أحمد: ٤/ ٤٢٠. ③ صحيح البخاري: ٥١٦؛ صحيح مسلم: ٥٤٣. ④ صحيح، سنن نسائي: ١١٤٠؛ مسند أحمد: ٦/ ٤٦٧.

نقل کیا، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ امام شافعی رحمہ اللہ اوران کے موافقین کے مؤقف کی دلیل ہے، جو قائل ہیں کہ فرض اورنفل پڑھتے ہوئے بچہ، بچی یا کسی بھی طاہر حیوان کو اٹھائے رکھنا جائز ہے، امام کے لیے بھی اور مقتدی کے لیے بھی۔

امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب نے اسے نفل پر محمول کیا ہے اور فرض میں وہ عدم جواز کے قائل ہیں، جبکہ پہلے گزرا کہ یہ نمازِ صبح کا واقعہ ہے، کہتے ہیں: بعض مالکیہ اس کے نسخ کے مدعی ہیں، بعض نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جبکہ بعض نے کہا: یہ بوجہ مجبوری تھا، یہ سب قول باطل اور مردود ہیں، اس کی کوئی دلیل نہیں، کوئی مجبوری نہ تھی بلکہ حدیث صحیح ہے اور اس کے جواز میں صریح ہے اوراس میں قواعدِ شرع کے مخالف کوئی چیز نہیں، کیونکہ آدمی طاہر ہے اور جو (نجاست) اس کے پیٹ میں ہے، وہ قابلِ نظر اندازی ہے، کیونکہ معدہ میں ہے (وہ تو ہر نمازی کے پیٹ میں ہے) بچے کے کپڑے طہارت پر محمول ہیں اور شرعی دلائل اس کے جواز پر قائم ہیں، دورانِ نماز میں افعال نماز کے مبطل نہیں، اگر وہ قلیل ہوں یا پے در پے نہ ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل بیانِ جواز کے لیے تھا، اس سے ابوسلیمان خطابی کے اس دعوی کا بھی رد ہوتا ہے کہ اشبہ یہ ہے کہ اس میں آپ کی مرضی شامل نہ تھی، سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کو نماز میں اس لیے اٹھایا، کیونکہ وہ پہلے سے آپ کے ساتھ تھی اور جب دوسری رکعت کے لیے اٹھے، وہ از خود سوار ہوگئی، بقول ان کے یہ وہم نہ کیا جائے کہ دوسری مرتبہ عمداً اسے اٹھایا تھا، کیونکہ پھر تو یہ عملِ کثیر ہوا اور دل کو مشغول کرنے والا ہے، اگر چادر کا نشان آپ کو مشغول کرنے کا باعث بن سکتا ہے، تو یہ آپ کے لیے شاغل کیونکر نہ ہوا؟، یہ امام خطابی رحمہ اللہ کی کلام ہے اور یہ باطل اور مجرد دعوی ہے، اس کی تردید مسلم کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: «فَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا» ''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے تو اسے بھی اٹھا لیتے۔'' اور «فَإِذَا رَفَعَ مِنَ السُّجُوْدِ أَعَادَهَا» ''سجدے سے جب اٹھتے، تو اسے پھر اسی پوزیشن میں لے آتے۔'' اسی طرح صحیح مسلم کے علاوہ روایت میں مذکور ان کلمات سے: «خَرَجَ عَلَيْنَا حَامِلاً أُمَامَةَ فَصَلَّى......» الخ جہاں تک چادر کا قضیہ تو اسے واپس کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بلا فائدہ دل کو مشغول کرنے والی تھی، سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کے بارے ہم تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ دل کی شاغل تھی، اگر ہے تو اس کے کئی فوائد مترتب ہیں اور قواعدِ شرع کا بیان جو ہم ذکر کر چکے، تو اس کی اصل ان فوائد کی غرض سے مشغل ہے، بخلاف چادر کے تو درست یہی ہے کہ یہ فعل بیانِ جواز کے لیے اور ان فوائد کی آگہی دینے کے لیے تھا، تو یہ ہمارے لیے جائز اور قیامت تک مسلمانوں کے لیے جاری شرع ہے۔

⑥ نماز میں مشغول شخص کو سلام کہنا اور اس سے مخاطب ہو کر کوئی بات کہہ دینا اور اس کے لیے جائز ہے کہ جواب میں ہاتھ سے اشارہ کر دے

چنانچہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی کام سے بھیجا، یہ تب جب آپ بنی مصطلق سے لڑنے جا رہے تھے، میں واپس آیا، تو آپ اونٹ پر بیٹھے نماز میں لگے ہوئے تھے، میں نے آپ سے مخاطب ہو کر بات کی آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا، میں نے پھر بات کی آپ نے پھر اشارہ کیا، میں آپ کی قراءت سن رہا تھا اور سر سے آپ (رکوع

سجود کا) اشارہ کر رہے تھے، فارغ ہوئے تو میرے کام کے بارے پوچھا اور فرمایا: ''جواب اس لیے نہ دیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، عبداللہ بن عمر عن صہیب سے مروی ہے کہ میرا گزر ہوا، تو آپ نماز میں مشغول تھے، میں نے سلام کہا: آپ نے اشارہ سے جواب مرحمت کیا، راوی کہتے ہیں، شاید کہا: انگلی سے اشارہ کیا تھا۔[2] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی صحیح ہے، انہی سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا نبی کریم ﷺ دورانِ نماز میں صحابہ کے سلام کا کیسے جواب دیتے تھے؟ کہا: ہاتھ کے اشارہ سے،[3] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے نقل کیا اور ترمذی نے حکمِ صحت لگایا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (بوقتِ ضرورت) نماز کے دوران میں ہاتھ سے اشارہ کر دیتے تھے،[4] اسے احمد، ابوداود اور ابن خزیمہ نے تخریج کیا، اور اس کی سند صحیح ہے، اس میں انگلی، ہاتھ یا سر کا اشارہ کرنا شامل ہے، یہ سب نبی کریم ﷺ سے وارد ہے (کسی کام سے روکنے یا آگاہ کرنے کی غرض سے کھانس دینے کو بھی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے)۔

⑦ دورانِ نماز کسی بات سے آگاہ کرنے کے لیے سبحان اللہ کہنا یا ہاتھ پہ ہاتھ مارنا

مردوں کو حکم ہے کہ کسی ضرورت کے وقت سبحان اللہ کہیں، جبکہ عورتوں کو ہاتھ پہ ہاتھ مارنے کی ہدایت ہے، مثلاً اگر امام کی کسی غلطی پر اس کی تنبیہہ مقصود ہے یا کسی نے دروازہ بجایا تو اسے آنے کی اجازت کے طور پر یا اندھے کی رہنمائی کے لیے یا کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو، سیدنا سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جسے نماز کے دوران میں کوئی معاملہ درپیش ہوا، وہ سبحان اللہ کہے، عورتوں کے لیے تصفیق (ہاتھ پر ہاتھ مارنا) اور مردوں کے لیے تسبیح ہے۔''[5] اسے احمد، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا۔

⑧ امام کو لقمہ دینا

امام کو لقمہ دینا جائز ہے، چاہے واجب مقدار وہ پڑھ چکا ہو یا ابھی نہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ایک مرتبہ نماز میں قراءت کرتے ہوئے مشابہ لگ گیا، فارغ ہوئے تو پوچھا: ''ابی (بن کعب) موجود تھے؟'' وہ بولے جی ہاں، فرمایا: ''لقمہ کیوں نہ دیا؟''[6] اسے ابوداود وغیرہ نے نقل کیا اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

⑨ چھینک آنے یا کوئی خوشخبری ملنے پر الحمد للہ پڑھنا

سیدنا رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، تو چھینک ماری، پھر کہا: «اَلْحَمْدُلِلّٰهِ حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضىٰ» نماز کے بعد آپ نے پوچھا: ''یہ نماز

---

① صحيح مسلم: ٤٥٠؛ مسند أحمد: ٣/ ٣٣٨، ٣٣٩. ② صحيح، سنن أبى داود: ٩٢٥؛ سنن ترمذى: ٣٦٧؛ سنن نسائى: ١١٨٥. ③ صحيح، سنن أبى داود: ٩٢٧؛ سنن ترمذى: ٣٦٨؛ مسند أحمد: ٦/ ١٢. ④ صحيح، سنن أبى داود: ٩٤٣؛ مسند أحمد: ٤٢١. ⑤ صحيح البخارى: ٤٨٤؛ صحيح مسلم: ٤٢١. ⑥ صحيح، سنن أبى داود: ٩٠٧؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٧٦.

میں کس نے کلام کی؟'' سب چپ رہے، دوسری اور تیسری مرتبہ پوچھا، تو سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ بول اٹھے، یہ میں تھا یا رسول اللہ! فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! ان کلمات کو اوپر لے جانے کے لیے تیس سے زائد فرشتوں کی دوڑ لگی، کہ کون انہیں پہلے حاصل کرے۔''[1] اسے نسائی اور ترمذی نے نقل کیا، بخاری نے اسے تھوڑے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا۔

⑩ کسی عذر کی بنا پر نمازی کا اپنے کپڑے یا عمامہ وغیرہ پر سجدہ کرنا

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کئی دفعہ ایک کپڑا زیب تن کیے نماز پڑھتے اور اس کے فاضل حصے سے سردی یا گرمی سے بچاؤ کرتے،[2] اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا، بغیر عذر ایسا کرنا مکروہ ہے۔

⑪ مذکورہ بالا کے علاوہ جو افعال دورانِ نماز صحیح ہیں ان کا مختصر ذکر

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے نماز میں ان مباح افعال کی تلخیص لکھی ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں صادر ہوئے، لکھتے ہیں آپ (تہجد کی) نماز پڑھتے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی قبلہ کی جہت لیٹی ہوتی تھیں، سجدہ میں جاتے تو (جگہ کی تنگی کے باعث) انہیں ہاتھ لگاتے، تو وہ پاؤں سمیٹ لیتیں اور جب آپ اگلے قیام کے لیے اٹھتے تو دوبارہ پاؤں لمبے کرلیتیں۔[3] کئی دفعہ دورانِ تہجد شیطان آڑے آتا اور نماز قطع کرنے کی کوشش کرتا، تو آپ اسے گردن سے پکڑ لیتے، حتی کہ اس کا لعاب ہاتھ مبارک پر بہتا، ایک دفعہ منبر پر آپ نے نماز پڑھائی، رکوع بھی وہیں کیا، اور سجدہ کے لیے الٹے قدم پیچھے ہٹے اور اتر کر زمین پر کیا، پھر دوبارہ منبر پر چڑھے، دیوار کو سترہ بنائے نماز پڑھا رہے تھے کہ بکری نے گزرنا چاہا، آپ مسلسل اسے روکتے رہنے، حتی کہ پیٹ مبارک سامنے دیوار کو جا لگا اور وہ پیچھے سے گزرنے پر مجبور ہوئی، نماز میں تھے کہ بنی عبد المطلب کی دو لونڈیاں آئیں اور باہم لڑنے لگیں، آپ نے نماز کی حالت میں ہی، دونوں کو ایک دوسری سے الگ کیا، احمد کے الفاظ ہیں کہ دونوں نے آپ کے گھٹنے مبارک پکڑے، آپ نے نماز سے پھرے بغیر دونوں کو الگ کیا، ایک دفعہ آپ نماز میں تھے کہ آگے سے لڑکا گزرنے لگا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ دیا، وہ واپس مڑ گیا، یہی معاملہ ایک لونڈی کے ساتھ بھی ہوا تھا، لیکن وہ اشارہ سمجھ نہ سکی اور گزرتی گئی، نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''یہ وہی کرتی ہیں جو من میں آئے۔''[4] اسے احمد نے نقل کیا، سنن میں بھی مذکور ہے۔

نماز کی حالت میں آپ پھونک مار لیتے تھے، جہاں تک یہ حدیث: (اَلنَّفْخُ فِي الصَّلَاةِ كَلَامٌ) ''نماز کے دوران پھونک مارنا ایسے ہی ہے جیسے بولنا۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں، یہ دراصل سعید بن منصور نے سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً نقل کی ہے، آپ دورانِ نماز میں رو لیتے تھے، کھانسی آتی تو کھانس لیتے! سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: دن کی ایک ساعت تھی جس میں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتا تھا، آکر اجازت مانگتا، اگر آپ نماز میں ہوتے تو کھانس کر آگاہ

---

① صحيح، سنن ترمذی: ٤٠٤؛ سنن نسائی: ١٠٦١. ② ضعيف، مسند أحمد: ١/ ٢٥٦. ③ صحيح البخاری: ٣٨٢؛ صحيح مسلم: ٥١٢. ④ ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٢٩٤؛ سنن ابن ماجه: ٩٤٨.

کرتے،تو میں اندر آ جاتا۔[1] اسے نسائی اور احمد نے نقل کیا،آپ کئی دفعہ جوتوں سمیت بھی نماز پڑھ لیتے تھے،سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے نقل کیا،آپ نے جوتوں سمیت نماز پڑھ لینے کا حکم یہود کی مخالفت میں دیا تھا (جن کے ہاں یہ جائز نہ تھا) آپ ایک چادر زیبِ تن کیے بھی نماز پڑھ لیتے تھے،لیکن اکثر یہی تھا کہ دو کپڑے پہنے ہوتے (یعنی ایک بالائی دھڑ کے لیے اور ایک نچلے دھڑ کے لیے)۔

⑫ مصحف سے دیکھ کر نماز میں قراءت کرنا

ذکوان مولی عائشہ ماہِ رمضان میں انہیں قرآن سے دیکھ کر تراویح پڑھاتا اور امامت کراتا تھا۔[2] اسے مالک نے نقل کیا اور یہ شوافع کا مذہب ہے، بقول امام نووی رحمہ اللہ اگر قرآن کے صفحات بدلے (دیکھ کر قراءت کرتے ہوئے) تو نماز خراب نہ ہوگی ،اگر غیرِ قرآن کسی عبارت کو دیکھا اور دل میں اسے دہرایا،تو بھی نماز خراب نہ ہوگی، چاہے طویل عبارت ہو،لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے،امام رحمہ اللہ شافعی کی الاِملاء میں اس پر نص ہے۔

⑬ دورانِ نماز غیر اعمالِ نماز کے بارے سوچنا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اذان کے وقت شیطان ہوا خارج کرتا ہوا، دور بھاگ جاتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے اور جب مکمل ہو جاتی ہے،تو واپس آ جاتا ہے، پھر نماز جب شروع ہو،تو نمازیوں کے دل میں نت نئی سوچیں ڈالتا رہتا ہے کہ فلاں چیز یاد کرو، فلاں یاد کرو، کئی دفعہ تو آدمی بھول جاتا ہے کہ کتنی رکعتیں پڑھیں، اگر ایسا ہو کہ پتہ نہ چلے کہ تین پڑھی ہیں یا چار،تو تشہد میں سہو کے دو سجدے ادا کرو۔''[3] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، بخاری نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا کہ میں حالتِ نماز میں لشکر تیار کر لیتا ہوں، اس حالت میں نماز ہو تو جاتی ہے،مگر نمازی کو چاہیے کہ پوری توجہ اللہ کی طرف رکھے اور کسی طرح کے خیالات اپنے قریب نہ پھٹکنے دے، اس کی بجائے آیات کے معانی میں تفکر و تدبر کرے اور اعمالِ نماز کی طرف دھیان دے، آدمی کی نماز کا وہی حصہ لکھا جاتا ہے، جسے اس نے توجہ سے اور شعور کی حالت میں ادا کیا ہو۔ ابوداود، نسائی اور ابن حبان کے ہاں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرمایا:''کئی نمازی نماز پڑھ کر واپس ہوتے ہیں اور ان کے لیے نماز کا دسواں حصہ، کئی کے لیے نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا، تیسرا، اور آدھا حصہ لکھا جاتا ہے۔''[4]

بزار نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اللہ عز وجل فرماتا ہے: میں انہی نمازیوں کی نماز قبول کرتا ہوں، جنہوں نے دورانِ نماز میں میری عظمت ملحوظ رکھی اور ریا کاری نہ کی اور معصیت چھوڑ دینے کا عزم کیا، دن میرے ذکر میں بسر کیا، مسکین پر رحم کیا، مسافر، بیواؤں اور مصیبت زدگان کا خیال رکھا، اسے سورج جیسا نور عطا ہوگا اور میری

---

① ضعيف، سنن نسائی: ۱۲۱۰؛ سنن ابن ماجه: ۷۳۰۸. ② صحيح البخاری تعليقاً، كتاب الاذان باب: ٥٤.
③ صحيح البخاری: ٦٠٨؛ صحيح مسلم: ۳۸۹. ④ حسن، سنن أبی داود: ۷۹٦.

نگہبانی میں رہے گا، اس کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر کردوں گا، تاریکیوں میں اس کے لیے نور کردوں گا اور جہالت میں علم! میری مخلوق میں یہ ایسے ہے جیسے جنت میں فردوس۔''[1] ابو داود نے زید بن خالد سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے عمدگی سے وضو کیا، پھر پوری توجہ سے دو رکعتیں پڑھیں اور کوئی بھول چوک نہ کی تو اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''[2]

مسلم نے سیدنا عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، کہتے ہیں میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! شیطان نماز کے دوران حائل ہو جاتا ہے اور میری قراءت کو خراب کرتا ہے، فرمایا: ''یہ ایک خاص شیطان ہے، جس کا نام خِنزب ہے (جس کی ڈیوٹی نماز خراب کرنا ہے) جب ایسا ہو تو تین مرتبہ اعوذ باللہ پڑھ کر (سینے میں) بائیں طرف پھونک مارو۔'' کہتے ہیں: یہی کیا تو اللہ اسے مجھ سے لے گیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کہا: میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے مابین تقسیم کر رکھا ہے، آدھی اس کی اور آدھی میری اور میرے بندے کے لیے وہ جو وہ مانگے، جب وہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہتا ہے، تو اللہ کہتا ہے، میرے بندے نے میری حمد کی، جب وہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کہتا ہے، تو اللہ کہتا ہے: میرے بندے نے میری ثنا کی، جب اس نے کہا: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ تو اللہ نے کہا: میرے بندے نے میری تمجید کی اور اپنا آپ میرے سپرد کیا، جب کہا: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ تو کہا: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے مانگا پھر جب اس نے کہا: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہا، یہ میرے بندے کو حاصل ہو اور جو اس نے مانگا۔''[3]

مکروہاتِ نماز

سنن نماز میں سے جن کا ذکر گزرا، کسی بھی سنت کا ترک مکروہ ہے، اسی طرح درجِ ذیل امور بھی:

① فضول میں اپنے کپڑے یا بدن کے ساتھ مصروف رہنا

(خواہ مخواہ ہاتھ کبھی سر، کبھی ناک، کان اور کبھی ڈاڑھی پر لے جانا وغیرہ اِلّا یہ کہ ضرورت ہو، تب یہ مکروہ نہیں، سیدنا معیقب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺ سے نماز کے دوران میں (سجدہ کی جگہ سے) کنکریاں صاف کرنے کے بارے پوچھا، تو فرمایا: ''بہتر ہے نہ کرو، اگر ضروری ہو تو صرف ایک بار کرلو۔''[4] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے، تو وہ کنکریاں صاف نہ کرتا پھرے۔''[5] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے نقل کیا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے یسار نامی ایک

---

① ضعيف جدًا، مسند البزار: ٣٤٨. ② حسن، سنن أبی داود: ٩٠٥. ③ صحيح مسلم: ٣٩٥؛ سنن أبی داود: ٨٢١. ④ صحيح البخاری: ١٢٠٧؛ صحيح مسلم: ٥٤٦. ⑤ ضعيف، سنن أبی داود: ٩٤٥؛ سنن ترمذی: ٣٧٩.

غلام سے کہا، جس نے نماز پڑھتے ہوئے پھونک ماری تھی: ((تَرِّبْ وَجْهَكَ لِلَّهِ)) ''اپنے چہرے کو اللہ کی خاطر خاک آلود ہونے دے۔''[1] اسے احمد نے جید سند سے نقل کیا۔

② نماز میں کمر پر ہاتھ رکھنا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے دوران میں کمر پر ہاتھ رکھنے سے منع کیا،[2] اسے ابوداؤد نے نقل کیا اور اس کی شرح میں لکھا یعنی اپنی کمر کا سہارا لینا۔

③ آسمان کی طرف نظر اٹھانا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''نماز کے دوران میں آسمان کی طرف نظریں اٹھانے والے باز آجائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ان کی نظر ہی اچک لے۔''[3] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے نقل کیا۔

④ کسی چیز کی طرف دیکھنے میں مشغول ہونا

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر اوڑھے نماز پڑھی، جس میں نشان بنے ہوئے تھے، پھر فرمایا: ''اس کے نشانوں نے میری توجہ خراب کی ہے، اسے ابوجہم کو دے آؤ اور ان سے انجانیہ لے آؤ۔''[4] انجانیہ وہ موٹی چادر جس میں کوئی نشان یا تصویر نہ ہو (دراصل ابوجہم نے یہ نشانوں والی چادر آپ کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی تھی، آپ نے اس کے بدلے ان سے ان کی صاف چادر مانگ لی، تاکہ وہ ہدیہ واپس کرنے پر آزردہ نہ ہوں) اسے مسلم اور بخاری نے بیان کیا، بخاری نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک باریک کپڑا بطور پردہ گھر کے ایک طرف لٹکا دیا، آپ نے ان سے کہا: ''اسے ہٹالو کہ اس کی تصاویر نماز میں میرے آڑے آتی ہیں۔''[5] اس حدیث میں دلیل ہے کہ کسی تحریر پر (لمحہ بھر) نظریں گاڑنے سے نماز فاسد نہ ہوگی۔

⑤ آنکھیں بند کر لینا

بعض نے اسے مکروہ اور بعض نے جائز بلا کراہت کہا، کراہت میں مروی حدیث صحیح نہیں ہے، بقول امام ابن قیم رحمہ اللہ درست یہ کہا جاتا ہے، اگر آنکھیں کھلی رکھنے سے توجہ خراب نہ ہوتی ہو، لیکن اگر سامنے کوئی ایسے مناظر یا نقش نگار وغیرہ ہیں کہ نظر ادھر بھٹکتی ہو تو یہ افضل ہے، لیکن مطلقاً آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا مکروہ نہیں، بلکہ اس حال میں اسے مستحب کہنا اصول شرع اور اس کے مقاصد سے اقرب ہے۔

---

① ضعيف، مسند أحمد: ٢٦٥٧٢. ② صحيح، سنن أبي داود: ٩٤٧. ③ صحيح مسلم: ٤٢٩؛ سنن نسائي: ٣/ ٣٩. ④ صحيح البخاري: ٣٧٣؛ صحيح مسلم: ٥٥٦. ⑤ صحيح البخاري: ٣٧٤.

⑥ سلام کے وقت دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرنا

سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھتے (اور کئی لوگ سلام کے وقت ہاتھوں سے بھی اشارہ کرتے) تو فرمایا: ''انہیں کیا ہوا ہے کہ ہاتھوں کے ساتھ سلام کرتے ہیں، گویا یہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہیں، ہاتھوں کو زانووں پر ہی ٹکے رہنے دیا کرو، صرف زبان سے کہو: ((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ)) [1] اسے نسائی نے نقل کیا۔

⑦ چہرہ ڈھانپے رکھنا اور سدل کرنا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سدل سے منع فرمایا، اور یہ کہ نمازی چہرہ ڈھانپے، [2] اسے احمد نے نقل کیا، بقول حاکم مسلم کی شرط پر صحیح ہے، امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سدل یہ ہے کہ کپڑا لٹکائے رکھے (مثلاً گردن کے پیچھے ٹکائے مفلر یا چادر کے دونوں کنارے لٹک رہے ہوں) اور وہ زمین پر لگا رہے، کمال بن ہمام نے کہا: یہ قبا پہننے والے پر صادق آتی ہے، اگر بازو اس کے آستینوں سے باہر نکال رکھے ہوں (صرف کندھے پر ڈال لی ہو)

⑧ کھانا پیش ہونے پر

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کھانا پیش کر دیا گیا اور ادھر اقامت شروع ہوگئی، تو پہلے کھانا کھا لو۔'' [3] اسے احمد اور مسلم نے تخریج کیا، نافع سے مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کھانا پیش کیا جاتا اور ادھر نماز کی اقامت شروع ہو جاتی، تو وہ کھانے سے فارغ ہو کر جماعت میں شامل ہوتے حالانکہ وہ امام کی قراءت سن رہے ہوتے تھے۔ [4] (دراصل وہ روزے سے ہوتے تھے اور افطاری میں کھانا پیش کر دیا جاتا تھا، زیادہ کھانے کا تو رواج نہ تھا اور ادھر نمازیں لمبی لمبی ہوتی تھیں، تو بقدرِ ضرورت کھا کر آتے اور جماعت میں ملتے تھے) اسے بخاری نے نقل کیا، بقول امام خطابی رحمہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے سے ابتدا کرنے کا یہ حکم اس لیے دیا، تاکہ نفس اس سے اپنی حاجت پوری کر لے، پھر آدمی اس حال میں نماز میں داخل ہو کہ کسی طرح کی جلدی نہیں اور کھانے کی رغبت اس کی توجہ خراب کرنے کا باعث نہ بنے کہ رکوع وسجود میں جلد بازی سے کام لے اور یوں نماز کے حق کے ایفا میں کوتاہی کا مرتکب ہو۔

⑨ اس حالت میں نماز پڑھنے کی کراہت کہ وہ اخبثین (چھوٹے اور بڑے پیشاب) کو دبائے کھڑا ہے اور اس جیسے امور جو دل کو مشغول رکھنے کا باعث ہوں

احمد ابوداؤد، نے جبکہ ترمذی نے حسن کہہ کر سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں کسی ایک کے لیے بھی حلال نہیں: امام صرف اپنے لیے دعا کرے اور واحد کے صیغے استعمال کرے، اگر ایسا کیا تو اس نے نمازیوں

---

① صحيح مسلم: ٤٣١؛ سنن أبي داود: ٩٩٨؛ سنن نسائي: ١١٨٤. ② حسن، سنن أبي داود: ٦٤٣؛ سنن ترمذي: ٣٧٨؛ سنن ابن ماجه: ٩٦٦. ③ صحيح البخاري: ٦٧١؛ صحيح مسلم: ٥٥٧. ④ صحيح البخاري: ٦٧.

سے خیانت کی (یہ اس دعا میں جو بالجہر کرے اور مقتدی بھی اس میں شامل ہوں، بخلاف سری دعا کے جو صرف اپنے لیے کر رہا ہے، وہاں ایسا کرنا مکروہ نہیں) دوم یہ کہ کوئی کسی کے گھر کے اندر تانک جھانک نہ کرے، اجازت لینے سے قبل اور سوم کہ نماز اس حال میں شروع کرے کہ اسے چھوٹے یا بڑے پیشاب کی حاجت تھی۔''[1] احمد، مسلم اور ابوداؤد کے ہاں سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''کوئی کھانے کی موجودگی میں اور بول و براز کی حاجت ہوتے ہوئے نماز نہ پڑھے۔''[2]

⑩ نیند کے غلبہ کے وقت نماز پڑھنا

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر اونگھ آرہی ہو تو پہلے سو جاؤ تا کہ چوکس ہو جاؤ اگر اسی حالت میں نماز پڑھی، تو شاید وہ استغفار کرنا چاہے اور منہ سے کوئی اور خراب لفظ نکل جائے۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی رات کو تہجد کے لیے اٹھے اور قرآن کے الفاظ اس کی زبان پر ٹوٹ رہے ہوں اور کچھ نہ جانے کہ کیا پڑھ رہا ہے تو (نماز چھوڑے اور) لیٹ جائے۔''[4] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

⑪ مسجد میں مقتدی کا اپنے لیے کوئی جگہ خاص کر لینا کہ ہمیشہ ادھر ہی نماز پڑھے

سیدنا عبدالرحمن بن شبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوے کی مانند ٹھونگے مارنے (تیز تیز نماز پڑھنے) اور (نماز میں) درندے کی مانند (بازو بچھا کر) بیٹھنے سے منع فرمایا اور اس امر سے کہ کوئی مسجد میں اپنی جگہ خاص کر لے، جیسے اونٹوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔[5] اسے احمد، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے نقل کیا اور حاکم نے حکمِ صحت لگایا۔

نماز توڑنے والے امور

درج ذیل افعال سے نماز ٹوٹ جائے گی:

①، ② جان بوجھ کر کھانا پینا

ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اجماع ہے کہ جس نے حالتِ نماز میں عمداً کچھ کھا یا پی لیا، تو اسے لازم ہے کہ نئے سرے سے نماز پڑھے، جمہور کے نزدیک یہی حکم نفل نماز کا بھی ہے، کیونکہ جو فرض نماز کو باطل کرنے والا عمل ہے، وہی اس کے لیے بھی ہے۔ (بقول محشی اس میں طاؤس اور اسحاق رحمہما اللہ کی مخالف رائے ہے، ان کے خیال میں یہ عملِ قلیل ہے، سعید بن جبیر اور ابن زبیر رحمہما اللہ کے بارے منقول ہے کہ نفل نماز میں پانی پیا تھا۔)

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ٩٠؛ سنن ترمذی: ٣٥٧. [2] صحیح البخاری: ٢١٢؛ صحیح مسلم: ٧٨٦.
[3] صحیح البخاری: ٢١٢؛ صحیح مسلم: ٧٨٦. [4] صحیح مسلم: ٧٨٧؛ سنن أبی داود: ١٣١١. [5] حسن، سنن أبی داود: ٨٦٢؛ سنن ابن ماجه: ١٤٢٩.

③ عمداً ایسی کلام کرنا جس کا مصلحتِ نماز سے تعلق نہ ہو

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (شروع میں) اثنائے نماز ہم ایک دوسرے سے کوئی ضروری بات کر لیتے تھے، حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ (البقرة:٢٣٨) ''اللہ کے سامنے نہایت سکون سے کھڑے رہو۔'' تو اس سے روک دیے گئے،[1] اسے جماعت نے روایت کیا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حالتِ نماز میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہہ لیا کرتے تھے اور آپ جواب بھی دیتے، جب نجاشی کے ملک سے واپس ہوئے تو ایک دفعہ آپ نماز میں تھے کہ ہم نے سلام کہا، مگر آپ نے جواب نہ دیا تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! پہلے تو آپ جواب دے لیتے تھے فرمایا: «إِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا» ''نماز کی مشغولیت اب اس سے مانع ہے۔''[2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

اگر بوجہ لاعلمی یا بھول کر کلام کر لی تو نماز صحیح ہے، چنانچہ سیدنا معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز میں تھا کہ کسی نے چھینک ماری میں نے کہا: «يَرْحَمُكَ اللّٰهُ» لوگوں نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا: افسوس میری ماں مجھے گم پائے مجھے ایسی نظروں کیوں دیکھ رہے ہو؟ اب وہ اپنے زانوؤں پر ہاتھ مارنا شروع ہوئے، جب دیکھا کہ مجھے چپ کراتے ہیں، تو خاموش ہو گیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، میرے ماں باپ آپ پر قربان، ایسا احسن اور حکیم معلم نہ آپ سے قبل دیکھا اور نہ بعد میں، نہ تو ترشی اختیار کی، نہ مارا اور نہ کوئی درشت لفظ بولا، فقط یہ کہا: ''ان نمازوں میں کوئی عام گفتگو یا کلام کرنی مناسب نہیں، یہ تو تسبیح، تکبیر اور قراءتِ قرآن کے لیے ہیں۔''[3] اسے احمد، مسلم، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، تو سیدنا معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ نے بوجہ لاعلمی کلام کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اعادہ کا حکم نہیں دیا، جہاں تک لوگوں کی کلام کے ساتھ عدم بطلان تو اس حدیثِ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مدنظر، کہتے ہیں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، پھر سلام پھیرا، تو سیدنا ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا نماز میں کمی ہو گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں فرمایا: ''نہ کمی ہوئی اور نہ میں بھولا ہوں۔'' انہوں نے عرض کی: بلکہ آپ بھول گئے ہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا: ''کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہا ہے؟'' انہوں نے کہا: جی ہاں! تو آپ نے (چھوٹی ہوئیں) دو رکعتیں پڑھائیں اور سہو کے دو سجدے کیے۔[4] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، مالکیہ نے اصلاحِ نماز سے متعلق کسی چیز کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ زیادہ نہ ہو اور اگر سبحان اللہ کہنے سے (امام کو) سمجھ نہ آ رہی ہو، بقول امام اوزاعی رحمہ اللہ جس نے عمداً دورانِ نماز کوئی بات کی اور غرض اصلاحِ نماز تھی، تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی، اس شخص کے بارے جو نمازِ عصر پڑھ رہا تھا، لیکن (بھولے سے) اونچی آواز سے قرآن کی قراءت شروع کر دی، تو مقتدیوں میں سے کسی نے کہا: یہ عصر ہے، کہا: اس کی نماز باطل نہ ہوئی۔

---

① صحيح البخاري: ٤٥٣٤؛ صحيح مسلم: ٥٣٩. ② صحيح البخاري: ٧١٤؛ صحيح مسلم: ٥٧٣.
③ صحيح مسلم: ٥٣٧؛ سنن أبي داود: ٩٣٠. ④ صحيح البخاري: ٧١٤؛ صحيح مسلم: ٥٧٣.

④ عمداً عملِ کثیر کرنا

علماء نے قلت و کثرت میں باہم اختلاف کیا، تو کہا گیا کثیر اتنا عمل کہ دور سے اسے کوئی دیکھے تو سمجھے کہ نماز میں نہیں ہے، بصورتِ دیگر عملِ قلیل ہے، بعض نے کہا: (یقین سے) ناظر خیال کرے کہ شاید وہ نماز میں نہیں ہے، امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ فعل جو نماز کی جنس سے نہیں، اگر کثیر ہے تو بلا اختلاف نماز باطل کر دے گا اور اگر قلیل ہے، تب بلا اختلاف نہیں۔ تو یہ ہے ضابطہ، پھر قلیل و کثیر کے ضبط میں باہم اختلاف کیا گیا اور چار نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں، خود ان کا مختار چوتھا نقطہ نظر ہے، بقول ان کے یہی مشہور اور صحیح ہے، مصنف (امام مسلم جن کی صحیح کی شرح لکھی) اور جمہور کا بھی اسی پر قطع ہے کہ اس کا مرجع عرفِ عام ہے، تو جسے لوگ قلیل سمجھتے ہیں، اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی، جیسے اشارے سے سلام کا جواب دینا، جوتا اتارنا، عمامہ اٹھانا یا رکھنا یا کوئی اور ہلکا کپڑا (رومال یا ٹوپی) پہننا یا اتارنا، چھوٹے بچہ کو اٹھانا اور اتارنا، گزرنے والے کو روکنا، کپڑے میں تھوک کر کے ملنا اور ان جیسے امور، اور جسے عام لوگ کثیر سمجھتے ہیں، جیسے مسلسل کئی قدم چلنا اور متواتر کوئی فعل کرتے رہنا، تو اس سے نماز ٹوٹ جائے گی، لکھتے ہیں: پھر اصحاب (شوافع) متفق ہیں کہ کثیر عمل تب نماز توڑنے کا باعث بنے گا، اگر پے در پے ہو، لیکن اگر وقفہ وقفہ سے ہو مثلاً ایک قدم چلا پھر کچھ دیر رکا، پھر دوسرا اٹھایا، یا دو قدم چلا پھر وقفہ سے اگلے دو قدم اٹھائے، اگر قرار دیں کہ دو قدم چلنا ضار نہیں اور یہ (وقفہ وقفہ سے) کرتا رہا، حتی کہ سو قدم بھی اگر چل لیے تو ہمارے اصحاب کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹے گی، کہتے ہیں جہاں تک خفیف حرکات مثلاً تسبیح پر انگلیاں پھیرنا یا خارش کرنا یا حل یا عقد (گرہ باندھنا یا کھولنا) تو صحیح و مشہور یہ ہے کہ اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی، چاہے یہ عمل کثیر اور پے در پے ہو، البتہ یہ مکروہ ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کی نص ہے کہ اگر انگلیوں پر آیات (ساتھ ساتھ، یا عید کی تکبیریں) گنتا رہا، تو اس سے نماز نہ ٹوٹے گی، لیکن اولیٰ اس کا ترک ہے۔

⑤ بغیر کسی عذر عمداً نماز کے کسی رکن یا شرط کا ترک

بخاری و مسلم نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے مسیء صلاۃ سے فرمایا تھا: ''واپس جاؤ اور دوبارہ نماز پڑھو، کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔''[1] (کیونکہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی تھی، لہٰذا جو ایسا کرے گا اس کی نماز نہ ہوگی، ابن رشد کہتے ہیں: بالاتفاق جس نے بغیر وضو نماز پڑھ لی، اس پر اعادہ واجب ہے، چاہے عمداً یہ کیا یا بھول کر، اسی طرح جس نے عمداً یا بھول کر غیرِ قبلہ جہت میں نماز پڑھ لی، بالجملہ جس نے صحتِ نماز کی شروط میں سے کسی شرط کا اخلال کیا (نقص اور کوتاہی) کی اس پر اعادہ واجب ہے۔

⑥ نماز میں ہنسنا یا مسکرانا

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے ہنسنے سے نماز کے ٹوٹ جانے پر اجماع نقل کیا ہے، بقول امام نووی رحمہ اللہ یہ اس امر پر محمول ہے کہ

---

[1] صحیح البخاری: ٧٥٧، صحیح مسلم: ٣٩٧.

ہنستے ہوئے اس کے منہ سے (کم از کم) دو حروف صادر ہوئے (آواز کے ساتھ ہنسا مثلاً ہا ہا) اکثر علماء کا کہنا ہے کہ تبسم میں حرج نہیں اور اگر ہنسی غالب آئی اور اس کے روکنے پر قادر نہ ہوا، تب اگر یہ معمولی ہے تو نماز نہیں ٹوٹے گی اور اگر کثیر ہے۔ تب ٹوٹ جائے گی، قلت اور کثرت کا ضابطہ عرفِ عام ہے۔

نماز کی قضا

علماء متفق ہیں کہ ناسی (جسے نماز پڑھنا بھول گیا) اور سوئے ہوئے پر نماز کی قضا واجب ہے، حدیث گزری ہے کہ ''جو بھول گیا یا کسی نماز سے سو تارہ گیا، وہ جب یاد آئے ادا کر لے۔''[1] اگر کوئی (نماز کا پورا وقت) بے ہوش رہا، تو اس کے ذمہ قضا نہیں (کیونکہ اس سے فریضہِ نماز ساقط تھا) اِلّا یہ کہ جب ہوش آیا تو اتنا وقت تھا کہ وضو کرے اور نماز شروع کر دے، عبدالرزاق نے نافع سے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک دفعہ کوئی ایسا عارضہ لاحق ہوا کہ گم صم ہو گئے اور نماز نہ پڑھ سکے، پھر جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو اس نماز کی قضا نہ دی، ابن جریج ابن طاوس عن ابیہ سے راوی ہیں کہ اگر مریض پر بے ہوشی طاری ہوئی پھر افاقہ ہوا، تو وہ نماز کی قضا نہ دے گا، معمر کہتے ہیں: میں نے امام زہری رحمہ اللہ سے بے ہوش کے بارے میں پوچھا تو کہا: قضا نہیں دے گا، حماد بن سلمہ نے یونس بن عبید عن حسن بصری و محمد بن سیرین سے نقل کیا کہ بے ہوش کے ذمہ اس نماز کا اعادہ نہیں جس کے بعد وہ ہوش میں آیا۔

عمداً تارکِ نماز کے بارے جمہور کا موقف ہے کہ وہ گناہ گار ہے اور اس پر قضا واجب ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں عمداً نماز ترک کرنے والے کے لیے قضا مشروع نہیں اور نہ یہ اس سے صحیح ہے، بلکہ وہ (تلافی مافات کے لیے) بکثرت نوافل پڑھے، ابن حزم رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ان کی کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جس نے جان بوجھ کر کسی نماز کا ترک کیا، حتی کہ اس کا وقت نکل گیا، وہ اب کبھی بھی اس کی قضا پر قادر نہیں، اب اسے چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ اعمالِ صالحہ کرے، نوافل پڑھے اور توبہ و استغفار کرے، تاکہ روزِ قیامت اس کا میزان بھاری ہو، امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کہتے ہیں: خروجِ وقت کے بعد اس کی قضا دے، بلکہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ تو کہتے ہیں: جس نے عمداً ایک اور کئی نمازیں ترک کیں، وہ نمازِ حاضر سے قبل انہیں ادا کرے، اگر چھوڑی گئی نمازیں پانچ یا اس سے کم ہیں، چاہے قضا دیتے دیتے نمازِ حاضر کا وقت نکل بھی جائے، لیکن اگر ان کی تعداد پانچ سے زائد ہے، تب پہلے حاضر نماز پڑھ لے، امام ابن حزم رحمہ اللہ کے بقول ہمارے قول کی صحت کی برہان یہ آیت ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ○ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴾ (الماعون: ٤۔٥)

''ہلاکت ہے نمازیوں کے لیے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔''

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٤٤١.

اور: ﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴾(مریم:۵۹)

''ایسے لوگ ان کے جانشین بنے، جنھوں نے نماز ضائع کی اور خواہشات کے غلام بنے، یہ عنقریب دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔''

اگر عمداً نماز کا تارک وقت نکل جانے کے بعد اس کا مداوا کرسکتا ہوتا تو اس کے لیے ویل نہ ہوتی اور نہ غی (ہلاکت) اس کا مقدر ہوتی جیسے اس شخص کے لیے ویل اور غی نہیں، جس نے نماز کو اس کے اخیر وقت تک موخر کیا، جسے اس نے پا لیا ہے، نیز اللہ نے ہر نماز کے لیے ایک وقت محدود کر رکھا ہے جس کی ابتدا اور انتہا معلوم ہے، جو معین وقت میں شروع ہوتا اور معین وقت میں ختم ہو جاتا ہے، تو اس شخص کے جس نے قبل از وقت نماز پڑھ لی اور اس شخص کے درمیان فرق نہیں جس نے بعد از وقت پڑھی، کیونکہ دونوں نے ہی غیرِ وقت میں پڑھی ہے اور یہ دونوں میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کرنا، بلکہ دونوں اللہ کی حدود پھلانگنے میں ایک برابر ہیں، اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ﴾(الطلاق:۱)

''جس نے اللہ کی حدوں سے تجاوز کیا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔''

علاوہ ازیں قضا کا ایجاب شارع کا حق ہے اور غیر اللہ کے لیے تشریع جائز نہیں، شرع وہی جو اللہ نے لسانِ نبوت کے ذریعے مقرر کی ہے، تو ہم کسی نماز کے عمداً تارک پر قضا واجب کرنے والوں سے پوچھتے ہیں، ہمیں اس نماز کے بارے میں بتلائیے جس کا آپ اسے حکم دے رہے ہیں، کیا یہ حکم وہی ہے، جو اللہ نے دیا، یا یہ کوئی اور ہے؟ اگر کہیں وہی ہے تو ہم کہیں گے (اس کا مطلب ہوا کہ) عمداً اس کا تارک عاصی نہیں ہے، کیونکہ اس نے اللہ کے حکم پر عمل کیا اور تمہارے اس قول کے لحاظ سے وہ گناہ گار نہ ہوا اور یہ کہ عمداً نماز ترک کرنے والے پر حتی کہ اس کا وقت نکل جائے کوئی ملامت نہیں اور یہ بات کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا، اگر کہیں یہ وہ نماز نہیں جس کا حکم اللہ نے دیا، تو ہم کہیں گے تم نے ٹھیک کہا اور اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے! جب اقرار کر چکے ہو کہ تم اسے اس فعل کا حکم دے رہے ہو، جو اللہ نے نہیں دیا، پھر ہم ان سے اس شخص کی بابت سوال کریں گے، جس نے وقت کے بعد عمداً نماز کا ترک کیا، کہ آیا یہ اطاعت ہے یا معصیت؟ اگر کہو اطاعت ہے تو یہ کہہ کر سب متقی اہلِ اسلام کے اجماع، قرآن اور سنتِ ثابتہ کی مخالفت کی اور اگر کہو معصیت ہے، تو ٹھیک کہا اور معصیت اطاعت کی قائم مقام نہیں ہوسکتی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے نمازوں کے اوقات معین کیے ہیں اور ہر وقت کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہے، نہ اس سے قبل ادا کی جاسکتی ہے اور نہ اس کے بعد، اس پر پوری امت متفق ہے تو اگر وقت کے بعد اس کا ادا کرنا جائز ہوتا، تو نماز کے لیے اخیر وقت معین کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اور (نعوذ باللہ) یہ لغو کلام ہوتا اور اللہ اس سے پاک ہے، نیز ہر عمل وقتِ معین کے ساتھ معلق کیا گیا ہے، لہٰذا غیرِ وقت میں ادا کرنا صحیح نہیں، وگرنہ وقت مقرر کرنے کی کیا ضرورت؟

طویل کلام کے بعد کہا: اگر عمداً کسی نماز کا ترک کرنے والے حتی کہ اس کا وقت نکل جائے، کے ذمہ قضا ہوتی تو اللہ تعالیٰ

اور اس کا رسول اس سے غافل نہ رہتے اور نہ بھولتے اور نہ اس کے ترکِ بیان کے ساتھ ہمیں مشکل میں ڈالتے، خود کہا: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ (مریم:٦٤) ''اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں۔'' اور ہر وہ مسئلہ جو قرآن وسنت میں نہیں وہ باطل ہے، نبی کریم ﷺ کی صحیح حدیث ہے جس سے عصر کی نماز فوت ہوگئی، گویا اس کا اہل و مال برباد ہوا۔''[1] لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ جس کی (عمداً) نماز رہ گئی، اب اس کے پاس اس کے تدارک کی کوئی سبیل نہیں، اگر کہیں تدارک ہے، پھر تو وہ فوت نہ ہوئی، جیسے نماز بھولنے والے سے نماز فوت نہیں ہوتی اور اس میں کوئی اشکال نہیں، امت یہ حکم لگانے میں متفق ہے کہ جس نماز کا وقت نکل گیا، وہ فوت ہوئی، تو یقینی اجماع کی رو سے اس کا فوت ہونا صحیح ہے، اگر اس کی قضا اور ادا ممکن ہوتی، تو اسے فائت کہنا کذب و باطل ہوا (کیوں کذب و باطل ہوا؟ فائت اس وجہ سے کہا کہ اس کا وقت نکل گیا چاہے عمداً یا نسیاناً یا عذراً) لہٰذا یقینی طور پر ثابت ہوا کہ ایسی نماز کی اب کبھی بھی قضا ممکن نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی یہی رائے رکھتے تھے، اسی طرح ان کے بیٹے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی اور سیدنا سعد بن ابی وقاص، سلمان فارسی، ابن مسعود رضی اللہ عنہم، قاسم بن محمد بن ابوبکر، بدیل عقیلی، محمد بن سیرین، مطرف بن عبداللہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ وغیرہم (ابھی اور بھی ان کی کچھ باتیں باقی ہیں، میں انہیں قابلِ توجہ نہ سمجھتے ہوئے ترک کرتا ہوں، لگتا ہے کتاب کے مصنف بھی ان کے ہمنوا ہیں، تبھی تفصیل سے ان کی باتیں نقل کیں اور) آخر میں کہا: ایسے شخص کے لیے اب یہی ہے کہ کثرت سے توبہ واستغفار کرے اور نوافل ادا کرے، کیونکہ اللہ نے کہا:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ○ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴾ (مریم:٥٩۔٦٠)

'' پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے، مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔'' (اس سے کہاں ظاہر ہوا کہ وہ قضا نہ دے) اور کہا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (آل عمران: ١٣٥)

''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔''

امت کا اس پر اجماع ہے اور تمام نصوص بھی اس پر وارد ہوئی ہیں کہ نفلی عبادت خیر کا ایک حصہ رکھتی ہے، جس کی مقدار اللہ کے علم میں ہے، اور فرائض بھی خیر کا حصہ رکھتے ہیں جن کی مقدار بھی اللہ کے علم میں ہے۔ تو چاہیے کہ وہ نفلی عبادت کے اس حصے کو ضرور حاصل کرے جو فرائض کے حصے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو۔ اور یقینا اللہ نے خبر دی ہے کہ وہ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور یہ بھی کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: ٥٥٢؛ صحيح مسلم: ٦٢٦.

بیمار کی نماز

جسے مرض وغیرہ کوئی عذر لاحق ہو، جس کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے قاصر ہے، تو جائز ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے، اگر بیٹھنے کی بھی استطاعت نہیں، تو پہلو کے بل لیٹ کر اور اشارے سے رکوع و سجود کرے اور سجدے کو رکوع کی نسبت ذرا جھکا کر رکھے، قرآن میں ہے: ﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا ﴾ (النساء:١٠٣) کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اللہ کا ذکر کرو۔''
سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں: مجھے بواسیر تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، تو فرمایا: ''اگر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی طاقت نہیں، تو بیٹھ کر پڑھو، اگر اس کی بھی طاقت نہیں، تو پہلو کے بل ہو کر۔''[1] اسے مسلم کے سوا باقی سب نے تخریج کیا، نسائی نے یہ اضافہ کیا کہ اگر پہلو کے بل ہو کر بھی نہیں پڑھ سکتے، تو لیٹ کر پڑھو کہ ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة: ٢٨٦) یعنی اللہ ہر ایک کو اتنی ہی زحمت و تکلیف دیتا ہے جس کی اس میں ہمت اور طاقت ہو۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مریض کی عیادت کو آئے تو دیکھا کہ وہ تکیے پر نماز پڑھ رہا ہے، تو اسے کھینچ لیا اور فرمایا: ''زمین پر پڑھنے کی کوشش کرو، اگر نہیں کر سکتے، تو اشارے سے رکوع و سجدہ کرو اور سجدے کو رکوع سے ذرا جھکا ہوا کرو۔''[2] اسے بیہقی نے نقل کیا، ابو حاتم نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا، عدم استطاعت میں اعتبار مشقت کا ہے یا یہ اندیشہ کہ کہیں مرض بڑھ نہ جائے یا یہ کہ شفایابی میں تاخیر ہو جائے یا مثلاً سر درد کا خوف ہو، بیٹھ کر اگر ادا کر رہا ہے، تو اس کی صفت یہ ہے کہ تربُّع (چار زانو) کی حالت میں بیٹھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانوں بیٹھے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا۔[3] اسے نسائی نے روایت کیا اور حاکم نے حکمِ صحت لگایا، تشہد کی مانند بیٹھنا بھی جائز ہے۔
اس شخص کی نماز کا طریقہ جو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر بھی پڑھنے سے عاجز ہے تو بعض کے مطابق پہلو کے بل ہو کر پڑھے، اگر یہ نہیں کر سکتا، تو چت لیٹ کر، اس حالت میں بقدرِ طاقت اس کی ٹانگیں قبلہ کی طرف ہوں گی (تاکہ چہرہ کا رخ قبلہ رخ ہو) امام ابن منذر رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا، اس بابت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایک ضعیف حدیث بھی وارد ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا: ''مریض میں اگر استطاعت ہے، تو کھڑے ہو کر نماز پڑھے، اگر نہیں تو بیٹھ کر اگر سجدہ کرنے کی طاقت نہیں، تو سر سے اس کا اشارہ کرے اور سجود کو رکوع سے زیادہ جھکا ہوا کرے، اگر بیٹھ کر پڑھنے کی بھی طاقت نہیں تو قبلہ رخ ہوئے دائیں پہلو کے بل پڑھے، اگر اس کی بھی تاب نہیں تو چت لیٹ کر، تب اس کے پاؤں قبلہ کی طرف ہوں۔''[4] اسے دارقطنی نے نقل کیا، بعض حضرات نے کہا: جیسے بھی میسر ہو نماز پڑھ لے! ظاہر احادیث یہ ہے کہ اگر چت لیٹے ہوئے اشارے سے نماز ادا کرنا بھی ممکن نہ ہو، تو اس کے بعد اس پر کوئی چیز واجب نہیں (صحیح یہ ہے جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا آخری حد یہ ہے کہ پلکوں کے اشارہ سے نماز پڑھے، اگر یہ بھی نہیں کرتا تو زبان سے ذکر و اذکار کرتا رہے (نماز کے وقت، اس کی نیت کر کے) اور اگر یہ بھی نہیں تو دل میں ذکر کرے)۔

---

[1] صحيح البخاري: ١١١٧، سنن أبي داود: ٩٥٢. [2] صحيح، مسند البزار: ٥٦٨، السنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ٣٠٦. [3] صحيح، سنن نسائي: ٣/ ٢٢٤، المستدرك للحاكم: ١/ ٢٥٨، ٢٧٥. [4] سنن دارقطني: ١٧٠٦.

نمازِ خوف

علماء نمازِ خوف کی مشروعیت پر متفق ہیں، قرآن میں ہے:

﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾(النساء: ۱۰۲)

''اور (اے پیغمبر ﷺ) جب آپ ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہوں اور انہیں نماز پڑھانے لگو، تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت آپ کے ہمراہ مسلح ہو کر نماز میں کھڑی ہو، جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں، پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی، ان کی جگہ آئے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز ادا کرے، کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ کہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں، اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو مگر ہوشیار ضرور رہنا، اللہ نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: نمازِ خوف کے بارے چھ یا سات احادیث ثابت ہیں، ان میں مذکور کوئی بھی حالت و ہیئت اختیار کر لی جائے تو جائز ہے، بقول امام ابن قیم رحمہ اللہ چھ حالتیں ہیں، بعض کے ہاں اس سے بھی زیادہ ہیں، ان حضرات نے جب بھی کسی طریق میں کسی راوی کی طرف سے کوئی لفظی تغایر دیکھا، تو اسے ایک مستقل ہیئت قرار دے دیا اور یوں ان کی تعداد سترہ ہوئی، لیکن ممکن ہے کہ ان میں سے بعض متداخل ہوں اور یہ صرف اختلافِ رواۃ ہو، بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہی باور کرنا معتمد ہے، ان کا ذیل میں تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے:

① اگر دشمن غیر جہتِ قبلہ میں ہو، تب امام دو رکعتی نماز میں ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھا دے پھر وہ انتظار کرے (تشہد بیٹھے ہوئے بغیر سلام پھیرے) حتی کہ یہ خود انفرادی طور پر دوسری رکعت پڑھ لیں، پھر یہ (سلام پھیر کر) چلے جائیں اور دوسرا گروہ امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شریک ہو (خود ان کی یہ پہلی ہوئی) پھر امام (انہیں بھی ایک رکعت پڑھا کر التحیات میں) انتظار کرے، حتی کہ یہ اپنی دوسری رکعت پڑھ کر امام سے آ ملیں تب وہ (اکٹھا) سلام پھیرے، صالح بن خوات رحمہ اللہ سیدنا سہل بن ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک گروہ نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ صف بندی کی اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہا، آپ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی، پھر آپ (اپنی دوسری رکعت میں) کھڑے رہے، انہوں نے اپنی دوسری رکعت مکمل کی اور سلام پھیر کر دوسرے گروہ کی جگہ چلے گئے اور وہ آ کر آپ کے ہمراہ نماز میں شریک ہوئے، آپ نے اپنی دوسری رکعت

پڑھائی (جوان کی پہلی بنی) پھر (تشہد میں) بیٹھے رہے، حتی کہ یہ اپنی دوسری رکعت پڑھ کر آپ سے آملے، پھر اکٹھے سلام پھیرا۔[1] اسے ماسوائے ابن ماجہ کے سب نے تخریج کیا۔

② دشمن غیر جہتِ قبلہ میں ہو، تو امام ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائے، دوسرا اس اثنا دشمن کے بالمقابل رہے، پھر یہ گروہ پھر کر ان کی جگہ چلا جائے اور وہ آ کر امام کے ہمراہ ایک رکعت ادا کریں، پھر ہر گروہ (انفرادی طور پر) اپنی اپنی (بقیہ، دوسری) رکعت ادا کر لیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو گروہوں میں لشکر کو تقسیم کر کے ایک کو ایک رکعت پڑھائی اور دوسرا اس دوران میں دشمن کے سامنے رہا، پھر یہ پھرے اور ان کی جگہ جا کھڑے ہوئے اور وہ آ کر نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہوئے اور آپ نے انہیں بھی ایک رکعت پڑھائی، پھر سلام پھیر دیا اور ان حضرات نے اٹھ کر اپنی دوسری رکعت مکمل کی اور جوان کی جگہ (ایک رکعت پڑھ کر) چلے گئے تھے، انہوں نے واپس آ کر اپنی دوسری رکعت ادا کی۔[2] اسے احمد اور بخاری و مسلم نے نقل کیا، بظاہر دوسرا گروہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد فوری طور پر بلا انقطاع اپنی دوسری رکعت پڑھے گا، تو یوں ان کی دو مسلسل بنیں، جبکہ پہلا گروہ اپنی دوسری رکعت اس دوسرے گروہ کے پوری نماز (دونوں رکعتیں) پڑھنے کے بعد جب سلام پھیر کر دشمن کے بالمقابل چلا جائے، تو آ کر پڑھے گا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پھر سلام پھیرا اور یہ لوگ کھڑے ہوئے اور اپنے لیے ایک رکعت پڑھی اور پھر (انہوں نے اپنا) سلام پھیرا۔[3]

③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام ہر ایک گروہ کو دو دو رکعتیں پڑھائے، تو پہلی دو اس کی نسبت فرض ہوں گی اور آخری دو نفل اور فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کی اقتدا کرنا جائز ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے صحابہ کے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر دوسرے کو دو اور پھر سلام پھیرا،[4] اسے امام شافعی اور امام نسائی رحمہما اللہ نے نقل کیا، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی (سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے) ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں نمازِ خوف پڑھائی، تو ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر سلام پھیر دیا، اب یہ چلے گئے اور دوسرے آ گئے اور انہیں بھی آپ نے دو رکعتیں پڑھائیں اور سلام پھیر دیا، تو یوں نبی کریم ﷺ کی کل چار اور لوگوں کی دو دو بنیں۔[5] احمد اور شیخین کی انہی سے ایک روایت میں ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ذات الرقاع میں تھے، تو آپ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر چلے گئے اور پھر دوسرے گروہ کو بھی دو پڑھائیں، تو یوں نبی کریم ﷺ کی چار اور لوگوں کی دو دو بنیں۔

④ دشمن قبلہ کی جہت میں ہو تب امام دونوں گروہوں (سب) کو اکٹھے نماز پڑھائے گا، البتہ سجدے میں صرف ایک گروہ شرکت کرے اور دوسرا کھڑا رہے اور جب پہلا گروہ سجدے سے فارغ ہو جائے، تب وہ بھی کر لیں، جب پہلی رکعت سے فارغ ہوں، تو پچھلا گروہ پہلے گروہ کی جگہ چلا جائے اور دوسرا اس کی جگہ آ جائے (جگہ بدل لیں) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري: ٤١٢٩؛ صحيح مسلم: ٨٤٢. [2] صحيح البخاري: ٤١٣٣؛ صحيح مسلم: ٨٣٩.
[3] ضعيف، سنن أبي داود: ١٢٤٤. [4] صحيح، سنن نسائي: ٣/ ١٧٩؛ مسند أحمد: ٥٠٦. [5] صحيح البخاري: ٤١٣٦؛ صحيح مسلم: ٨٤٣.

نبی کریم ﷺ نے اپنے پیچھے ہماری دو صفیں بنوائیں اور دشمن قبلہ رخ تھا، آپ نے تکبیر کہہ کر نماز شروع کرائی اور سبھی نے نیت باندھی اور رکوع سبھی نے اکٹھے کیا، پھر آپ اور پہلی صف والے والوں نے سجدہ کیا اور تب دوسری صف والے دشمن کے سامنے کھڑے رہے، آپ اور پہلی صف والے جب سجدے سے فارغ ہوئے، تو دوسری صف والوں نے سجدہ کیا، پھر جب اٹھے تو وہ اگلی صف کی جگہ اور وہ ان کی جگہ ہو گئے، دوسری رکعت کا رکوع بھی سب نے ایک ساتھ کیا، مگر سجدے میں صرف آپ اور پہلی صف والے گئے اور دوسری صف کھڑی رہی آپ کے اور پہلی صف والوں کے سجدے کے بعد یہ لوگ سجدے میں گئے اور تشہد میں گئے اور تشہد سب نے اکٹھے پڑھا، پھر آپ نے سب کے ساتھ سلام پھیرا۔[1] اسے احمد، مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے تخریج کیا۔

⑤ دونوں گروہ امام کے ساتھ نماز میں داخل ہوں، پھر ایک گروہ دشمن کے سامنے کھڑا رہے اور دوسرا گروہ امام کے ہمراہ ایک رکعت ادا کرے، پھر یہ چلے جائیں اور دوسرا گروہ آ کر انفرادی طور پر اپنے لیے ایک رکعت ادا کرے اور اس دوران میں امام حالتِ قیام میں منتظر رہے، پھر انہیں دوسری (یہ امام کی بھی دوسری بنی اور ان کی بھی) رکعت پڑھائے، پھر دشمن کے سامنے کھڑا گروہ آئے اور اپنے لیے انفرادی طور سے ایک رکعت ادا کرے اور اس وقت امام اور دوسرا گروہ حالتِ تشہد میں بیٹھے رہیں، یہ حضرات بھی رکعت مکمل کر کے ان کے ساتھ شریکِ تشہد ہوں اور سلام اکٹھے پھیریں۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے غزوۂ نجد میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نمازِ خوف پڑھی، آپ نے نمازِ عصر شروع کی تو ایک گروہ آپ کے ہمراہ نماز میں شریک ہوا اور دوسرا دشمن کے بالمقابل رہا اور ان کی پشت قبلہ کی طرف تھی، آپ نے تکبیرِ تحریمہ کہی تو سبھی نے، انہوں نے بھی جو آپ کے ساتھ تھے اور انہوں نے بھی جو دشمن کے مقابل تھے، تکبیر کہی پھر ایک رکعت پڑھائی اور اس گروہ نے بھی یہ رکعت پڑھی، جو آپ کے ساتھ تھا، پھر سجدہ کیا اور اس گروہ نے بھی جو آپ کے ساتھ تھا، جبکہ دوسرا اس اثنا دشمن کے مقابل رہا، پھر یہ حضرات دشمن کے سامنے ہو گئے اور دوسرے گروہ نے آ کر رکوع و سجدہ کیا (گویا حالتِ قیام میں وہ بھی شریک تھے) نبی کریم ﷺ اس دوران میں حالتِ قیام میں رہے، پھر یہ لوگ اٹھے اور آپ کے ساتھ دوسری رکعت ادا کی اور سب نے سجدہ کیا، اب یہ سب تشہد کی حالت میں بیٹھ رہے اور دشمن کے سامنے کھڑے گروہ نے آ کر رکوع و سجدہ کیا (گویا دوسری رکعت کے قیام میں وہ بھی شریک تھے) اور تشہد میں آپ اور ان لوگوں سے آ ملے اور سلام اکٹھے پھیرا، رسول اللہ ﷺ سمیت سب کی یہ دو دو رکعتیں بنیں۔[2] اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا۔

⑥ ہر گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے، تو اس طرح امام کی دو اور باقی سب کی ایک ایک رکعت بنے گی، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ذی قرد میں نماز (خوف) پڑھائی، لوگوں نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنائیں، ایک

---

① صحيح مسلم: ٨٤٠؛ سنن نسائی: ٣/ ١٧٥؛ سنن ابن ماجه: ١٢٦٠. ② صحيح، سنن أبی داود: ١٢٤٠؛ سنن نسائی: ٣/ ١٧٣.

آپ کے پیچھے تھی اور دوسری دشمن کے سامنے تھی، تو آپ کے پیچھے والی صف نے ایک رکعت پڑھی، پھر یہ ان کی جگہ اور وہ ان کی جگہ ہو گئے، تو انہیں بھی آپ نے ایک رکعت پڑھائی۔[1] اسے نسائی اور ابن حبان نے نقل کیا اور اس پر صحت کا حکم لگایا، انہی سے مروی ہے کہ کہا: ''اللہ نے تمہارے نبی پر حضر میں چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔''[2] اسے احمد، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے تخریج کیا، ثعلبہ بن زہدم راوی ہیں کہ ہم طبرستان میں سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے، تو انہوں نے پوچھا: آپ میں سے کس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نمازِ خوف پڑھی ہے؟ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تو (انہیں امام بنا دیا اور) انہوں نے (لشکر کو دو گرہوں میں تقسیم کر کے) ہر گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور مقتدیوں نے اسی پر اکتفا کیا،[3] اسے ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا۔

خوف میں نمازِ مغرب کی کیفیت

نمازِ مغرب کی قصر نہیں ہوتی اور نہ کسی بھی روایت میں حالتِ خوف میں نمازِ مغرب کی کیفیت سے تعرض ہے، اسی لیے اس کے ضمن میں اختلاف ہے حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک امام پہلے گروہ کو دو اور دوسرے گروہ کو ایک رکعت پڑھائے گا، شافعی اور احمد نے جائز قرار دیا کہ پہلے کو ایک اور دوسرے کو دو رکعتیں پڑھائے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے منقول ہے کہ ایسا کیا تھا۔

اگر بالفعل لڑائی جاری ہو

جب گھمسان کا رن پڑ رہا ہو، تو ہر کوئی جیسے بھی بن پڑے (اپنی اپنی) نماز پڑھ لے، سواری کی حالت میں یا پیدل اور چاہے قبلہ رخ ہونا ممکن ہو یا نہ ہو، رکوع و سجود اشارے سے کر سکتا ہے، جیسے بھی ہو اور سجدے کا اشارہ رکوع سے کچھ جھکا ہوا کرے، جن ارکانِ نماز کی ادائیگی سے عاجز ہو، وہ اس سے ساقط سمجھے جائیں گے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر خوف کی شدت ہو، تو پیدل اور سوار جیسے بھی نماز ادا کرو۔''[4] صحیح بخاری میں اس کے الفاظ ہیں: اگر خوف کی نہایت شدت ہو، تو پاؤں کے بل کھڑے کھڑے یا سواری کی حالت میں قبلہ رخ ہو کر یا اس کے بغیر نماز ادا کر لی جائے۔''[5] مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر خوف نہایت شدید ہو تو سوار یا کھڑے کھڑے پڑھو اور اشارے سے ارکان انجام دو۔

طالب (جو کسی کے تعاقب میں ہے) اور مطلوب (جس کا پیچھا کیا جا رہا ہے) کی نماز کی کیفیت

جو دشمن کا پیچھا کر رہا ہے اور ڈر رہے کہ (اگر نیچے اتر کر نماز پڑھی تو) وہ ہاتھ سے نکل جائے گا تو وہ اشارے سے نماز ادا کر

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ۳/ ۱۶۹. [2] صحیح مسلم: ۶۸۷؛ سنن أبی داود: ۱۲۴۷. [3] صحیح، سنن أبی داود: ۱۲۴۶؛ سنن نسائی: ۳/ ۱۶۸. [4] صحیح، سنن ابن ماجہ: ۱۲۵۸. [5] صحیح البخاری: ٤٥٣٥.

لے، چاہے وہ قبلہ رخ نہ بھی ہو، اس ضمن میں مطلوب بھی یہی کرے، انہی سے ملحق ہے، ہر وہ کہ دشمن جس کے لیے رکوع وسجود میں مانع بنا ہوا ہے یا اسے جان، اہل یا مال کا دشمن، چور یا درندے سے خطرہ ہے، تو جس جہت بھی ممکن ہو، وہ اشاروں سے نماز پڑھ لے، بقول امام عراقی رحمہ اللہ ہر مباح ہرب (بھاگنے کے دوران) میں، یہ سیلاب سے ہو یا آگ سے، یہی کرے، اگر نارمل طریقے سے ادائیگی ممکن نہیں، اسی طرح قرض خواہ اور تنگ دست قرضدار بھی یہی کر سکتا ہے اور ایسا شخص بھی جس کے ذمہ قصاص ہے اور اسے معافی مل جانے کی امید ہے، جب وارثوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گا، سیدنا عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن سفیان ہذلی کی طرف بھیجا، جو عرفات کی طرف کہیں تھا، فرمایا: ''اسے قتل کر آؤ۔'' میں نے اسے دیکھ لیا اور ادھر نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا، میں نے سوچا: اگر نماز موخر کی اور اس کی طلب میں رہا، تو ممکن ہے فوت ہو جائے، تو میں چلتے چلتے اشارے سے نماز پڑھنے لگا، جب قریب پہنچا تو اس نے کہا: تم کون ہو؟ میں نے کہا: میں ایک عرب ہوں، مجھے خبر ملی ہے کہ تم اس شخص (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) سے مقابلہ کے لیے لوگ جمع کر رہے ہو، تو میں تمہارے لشکر میں شامل ہونے آیا ہوں، کہنے لگا: میں یہی کر رہا ہوں، کہتے ہیں ایک ساعت اس کے ساتھ چلتا رہا، جب موقع ملا تو تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔[1] اسے احمد اور ابوداؤد نے نقل کیا حافظ نے اس کی سند حسن قرار دی۔

سفر میں نماز

نمازِ سفر کے کئی احکام ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

① چار رکعتی نماز کا قصر کرنا

قرآن میں ہے:

﴿ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾

''اور جب تم سفر میں ہو تو، کوئی حرج نہیں کہ نماز قصر ادا کرو، اگر ڈرو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈالیں گے۔'' (النساء: ۱۰۱)

آیت میں خوف کے ساتھ تقیید غیر معمول بہ ہے، چنانچہ سیدنا یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کا لوگوں کے قصر کر کے نماز ادا کرنے کے بارے کیا خیال ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ ﴾ الخ آج تو ایسی حالت نہیں ہے؟ کہنے لگے: مجھے بھی یہی تردد ہوا جو تمہیں ہوا ہے، تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، تو فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر صدقہ ہے، اسے قبول کرو۔''[2] اسے سوائے بخاری کے دیگر سب نے تخریج کیا، ابن جریر نے ابو منیب جرشی سے نقل کیا، کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی کسی نے یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو قصر کو خوف کے ساتھ مقید کیا

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ۱۲۴۹؛ مسند أحمد: ۳/ ۴۹٦. [2] صحیح مسلم: ٦٨٦؛ سنن أبی داود: ۱۱۹۹.

ہے، جب کہ ہم نے اب امن میں ہیں کوئی خوف نہیں تو کہا: تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں اسوہ حسنہ ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نماز جب مکہ میں فرض ہوئی تو اس کی دو دو رکعتیں تھیں، جب آپ نے مدینہ ہجرت کی تو سوائے مغرب کے ہر ایک میں مزید دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا، مغرب کو اس لیے چھوڑا کہ وہ دن کی نمازوں کو وتر بناتی ہے، اسی طرح فجر کو اس کی طویل قراءت کی وجہ سے چھوڑا گیا، تو مسافر مکہ والی نماز پڑھے گا۔[1] اسے احمد، بیہقی، ابن حبان اور ابن خزیمہ نے نقل کیا اور اس کے راوی ثقہ ہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ چار رکعتی نمازوں کا قصر کر کے انہیں دو رکعتیں ادا فرماتے تھے، جب سے سفر شروع کرتے، حتیٰ کہ مدینہ واپس آ جائیں، آپ سے ثابت نہیں کہ چار رکعتی نماز سفر میں پوری پڑھی ہو اور ائمہ کے ہاں اس بابت کوئی اختلاف نہیں، اگرچہ حکمِ قصر کے بارے ان کے مابین اختلاف موجود ہے۔ تو سیدنا عمر، علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر اور جابر رضی اللہ عنہم اس کے وجوب کے قائل ہیں اور یہی حنفیہ کا مؤقف ہے، مالکیہ کے نزدیک قصر سنتِ مؤکدہ ہے، جس کی جماعت سے بھی زیادہ تاکید ہے، اگر مسافر مسافر امام نہیں پاتا، تو اپنی علیحدہ قصر نماز پڑھ لے، مقیم کی اقتدا اس کے لیے مکروہ ہے، حنابلہ کی رائے میں قصر جائز اور پوری پڑھنے سے افضل ہے اور یہی شوافع کے ہاں لیکن قصر کی مسافت کو پہنچ کر۔

۲ قصر کی مسافت (کتنا سفر کرنا ہو تو قصر کر سکتا ہے؟)

آیت سے متبادر تو یہ ہے کہ لغت میں جس پر بھی سفر کا اطلاق ہے، چاہے طویل ہو یا قصیر، تو اس میں نماز قصر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دو نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے اور روزہ چھوڑنے کی بھی رخصت ہے، سنت میں کچھ ایسا وارد نہیں، جو اس اطلاق کو مقید کرے، ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس مسئلے میں بیس سے زائد اقوال نقل کیے ہیں، ہم اس ضمن کے اصح وارد کا ذکر کر رہے ہیں۔ احمد، مسلم، ابو داؤد اور بیہقی نے یحییٰ بن یزید سے نقل کیا کہتے ہیں میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نمازِ قصر کے بارے پوچھا، تو کہنے لگے: نبی کریم ﷺ جب تین میل یا فرسخ کی مسافت کے سفر پہ نکلتے تو قصر کرتے تھے۔[2] حافظ ابن حجر فتح الباری میں رقمطراز ہیں: یہ اس کے بیان میں اصح اور صریح ترین روایت ہے، امیال اور فراسخ کے تردد کو سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت دور کرتی ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ایک فرسخ کا سفر کرتے، تو قصر کرتے تھے۔[3] اسے سعید بن منصور نے روایت کیا، ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص میں لکھتے ہیں: سعید نے اپنے سکوت کے ساتھ اس روایت کو ہے اور معروف یہ ہے کہ ایک فرسخ تین میل کا ہے، تو یہ حدیثِ ابو سعید سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں واقع شک کا رفع کرتی ہے، اور اس کم از کم مسافت کو بیان کرتی ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے قصر کیا اور یہ تین میل ہے فرسخ ۵۵۴۱ میٹر جبکہ میل ۱۷۴۸ میٹر ہے۔

اور قصر کے ضمن میں اقل ترین مسافت ایک میل ہے، اسے ابن ابی شیبہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بسندِ صحیح نقل کیا، یہی ابن حزم رحمہ اللہ کا اخذ ہے۔ جو میل سے کم مسافت پر ترکِ قصر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ (بارہا) جنازوں

---

[1] حسن، مسند أحمد: ٦/ ٢٤١؛ صحيح ابن حبان: ٢٧٣٨؛ صحيح ابن خزيمة: ٣٠٥. [2] صحيح مسلم: ٦٩١؛ سنن أبي داود: ١٢٠١. [3] ضعيف، مصنف ابن أبي شيبة: ٨١١٣.

کے ہمراہ بقیع کی طرف نکلے ہیں، اسی طرح قضائے حاجت کے لیے کھلے میدان کی طرف جاتے تھے،لیکن قصر نہیں کیا، عام فقہاء جو اس ضمن میں طویل سفر کی شرط لگاتے ہیں جو بعض کے نزدیک کم ازکم دو منزل اور بعض کے نزدیک تین منزل پر مشتمل ہو (قدیم زمانے میں ہر دس/ پندرہ میل کی ایک منزل ہوتی تھی، جہاں پہنچ کر مسافر ستاتے) تو ان کا جواب ابو القاسم خرقی نے المغنی میں دیا اور لکھا: میں ان ائمہ کے اختیار کردہ اس موقف کے لیے کوئی حجت نہیں دیکھتا، کیونکہ اس ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال باہم متعارض اور مختلف ہیں۔

لہٰذا اس اختلافِ اقوال کے پیش نظر یہ حجت بننے کے قابل نہیں، پھر سیدنا ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس امر کے برخلاف منقول ہے،جس کے ساتھ ہمارے اصحاب نے حجت پکڑی، پھر اگر یہ بھی موجود نہ ہوتے،تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے ہوتے ہوئے بھی ان فقہاء کا قول حجت نہیں ہوسکتا،اور جب ان کے اقوال ثابت نہیں ہیں،تو اس تقدیر (مسافت کے تعین) کی طرف مصیر ممتنع نہیں،جس کا انہوں نے ذکر کیا،اس کی دو وجہیں ہیں،ایک یہ کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے، جو ہم نے روایت کی اسی طرح ظاہرِ قرآن کے بھی کیونکہ اس کا ظاہر ہر اس کے لیے قصر کی اباحت ہے، جو سفر پر نکلے کیونکہ کہا:

﴿ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ﴾ (النساء: ١٠١)

''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کرلو۔''

اور خوف کی شرط سیدنا یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کے ساتھ ساقط ہوئی، تو باقی ظاہر آیت ہر طرح کے سفر کو متناول رہا اور فرمانِ نبوی: ((يَمْسَحُ الْمُسَافِرُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ)) ''مسافر تین دن مسح کرسکتا ہے۔''[1] مدتِ مسح کے بیان کے لیے وارد ہے، لہٰذا اس کے ساتھ یہاں احتجاج نہ کیا جائے گا پھر تھوڑی مسافت کا تین ایام میں قطع کرنا ممکن ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سفر کا نام دیا ہے، جب فرمایا: ((لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ إِلَّا مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ)) ''کسی مومنہ کے لیے حلال نہیں کہ ایک دن کا بھی سفر محرم کے بغیر کرے۔''[2]

دوم یہ کہ تقدیر کا باب صرف توقیف ہے، لہٰذا مجرد رائے کے ساتھ اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص اس صورت میں کہ اس کے لیے کوئی اصل نہیں، جس کی طرف اسے لوٹایا جائے اور نہ نظیر جس پر اسے قیاس کرلیا جائے اور حجت ان حضرات کے ساتھ ہے، جو قصر کو ہر مسافر کے لیے مباح قرار دیتے ہیں، اِلّا یہ کہ اس کے برخلاف پر اجماع منعقد ہو اور اس میں جہاز اور ٹرین کا سفر مستوی ہے، جیسے سفرِ اطاعت اور غیرِ اطاعت سفر بھی اور جس کا عمل ایسا ہے کہ ہمیشہ اسے سفر درپیش رہتا ہے، مثلاً ملاح اور تاجر (اور روزانہ دوسرے شہر و علاقہ جا کر ملازمت کرنے والے) تو ان کے لیے قصر اور روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، کیونکہ یہ حقیقۃً مسافر ہیں۔

---

[1] المعجم الكبير للطبراني: ٣٧٥٩. [2] صحيح البخاري: ١٠٨٨؛ صحيح مسلم: ١٣٣٩.

③ کہاں سے قصر کرنا شروع کر دیا جائے؟

جمہور علماء قائل ہیں کہ حضر چھوڑتے اور شہر سے نکلتے ہی قصر شروع ہو جاتی ہے اور واپسی پر پوری نہ پڑھے جب تک شہر و بستی کی اولین آبادی میں داخل نہ ہو جائے، بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ میرے علم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام اسفار میں ہمیشہ مدینہ سے نکل کر ہی قصر نماز ادا کی ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم نے ظہر مدینہ میں آپ کے ہمراہ چار رکعات پڑھیں اور (پھر سفر شروع ہوا تو) ذوالحلیفہ پہنچ کر (عصر کی نماز) دو رکعت پڑھی، اسے جماعت نے نقل کیا، بعض سلف کی رائے تھی کہ جس نے سفر کی نیت کر لی ہے، وہ فوراً قصر شروع کر سکتا ہے، چاہے ابھی گھر میں ہی ہو۔

④ مسافر پوری نماز کب پڑھے؟

جب تک وہ سفر میں ہے قصر کرے گا، اگر کسی اپنے کام جس کے ہونے کا وہ منتظر ہے کے، مدِنظر قیام کر لیا تو بھی نماز قصر کرے، کیونکہ وہ مسافر شمار ہے چاہے اس میں کئی سال لگ جائیں، لیکن اگر کسی معین مدت تک قیام کا ارادہ کر لیا، تو امام ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے میں یہ قیام بھی سفر کے حکم سے اسے نہیں نکالے گا، چاہے یہ قیام طویل ہو یا قصیر، اِلّا یہ کہ اس جگہ کو اپنا (مستقل) وطن بنالے، اس ضمن میں علماء کے ہاں اختلافِ آراء ہے، جن کی امام ابن قیم رحمہ اللہ نے تلخیص کی ہے اور اپنی رائے (جس کا ذکر ہوا) کو ترجیح دی، لکھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں بیس دن قیام کیا تھا اور اس دوران میں آپ قصر کرتے رہے (بیس دن انتظار کے باوجود جب یہ جنگ نہیں ہوئی تو آپ واپس ہوئے) لکھتے ہیں آپ نے امت کو ہدایت نہیں دی کہ اگر کسی کا قیام اس سے طویل ہو جائے، تو وہ قصر نہ کرے، لیکن آپ کا اتنے عرصے کا یہ قیام اتفاقاً ہو گیا اور یہ قیام دورانِ سفر میں ہے، تو یہ حکمِ سفر سے خارج نہیں کرتا، چاہے طویل عرصہ کا ہو یا قلیل عرصہ کا جب تک انسان متوطن (مستقل اقامت اختیار کرنے والا) نہ بنے یا اسی جگہ کسی متعین عرصہ کے لیے قیام کا عزم کرلے۔ سلف اور خلف نے اس مسئلہ میں باہم کثیر اختلاف کیا ہے، بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض اسفار میں انیس دن قیام کیا اور اس دوران میں قصر نماز ادا کرتے رہے، تو ہم جب انیس دن کے قیام (کا ارادہ) رکھتے، تو قصر پڑھتے تھے اور اگر اس سے زائد کا ارادہ ہوتا تو پوری پڑھتے۔[1] احمد کی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اشارہ فتحِ مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کی مدت کی طرف ہے، کیونکہ آپ کا حنین کا پروگرام تھا، وہیں مکہ قیام کا ارادہ نہ کیا تھا، تو یہ آپ کی وہ اقامت ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کی، ان کے غیر نے کہا: بلکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد تبوک کے مقام پر آپ کا قیام ہے، جیسے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تبوک میں آپ نے بیس دن قیام کیا تھا اور اس دوران میں قصر نماز پڑھتے رہے۔[2] اسے احمد نے مسند میں تخریج کیا، سیدنا مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شام کے ایک علاقہ

---

① صحيح البخاري: ١٠٨٠؛ سنن ابن ماجه: ١٠٧٥. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٢٣٥؛ مسند أحمد: ٣/ ٢٩٥.

میں چالیس دن قیام کیا، سیدنا سعد رضی اللہ عنہ قصر اور ہم پوری نماز پڑھتے رہے، نافع سے منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما آذر بائیجان میں چھ مہینے نماز قصر پڑھتے رہے، کیونکہ برفباری کی وجہ سے سفر ناممکن تھا، حفص بن عبیداللہ کہتے ہیں: سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ شام میں دو برس رہے اور اس دوران میں قصر کرتے رہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ صحابہ کرام ہرمز میں چھ ماہ رہے اور قصر نماز ادا کرتے رہے، امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں سیدنا عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کابل میں دو برس رہا، تو وہ قصر کرتے رہے اور کبھی اس دوران جمعہ نہیں کرایا، ابراہیم کہتے ہیں، سلف رے میں سال بھر یا اس سے بھی زائد قیام کرتے، اسی طرح سجستان میں دو سال گزارے اور نماز قصر کی، تو یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہدی ہے اور یہی صائب ہے۔

جہاں تک اس سلسلے میں فقہاء کے مسالک کا تعلق ہے، تو امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: اگر چار دن کے قیام کا ارادہ ہے تو (شروع ہی سے) پوری نماز پڑھے، اس سے کم میں قصر، ان مذکورہ بالا آثار کو انہوں نے اس امر پر محمول کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان صحابہ نے قیام کا مطلقاً ارادہ نہ کیا تھا، بلکہ کہتے تھے کہ آج روانہ ہوجائیں گے، کل ہوجائیں گے (یعنی اس تردد میں قیام طویل ہوتا گیا) مگر اس تاویل کا محلِ نظر ہونا مخفی نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا پھر (ارادہ کر کے) وہیں رہے تاکہ اسلام کو رسوخ حاصل ہو اور شرک کی بنیادیں منہدم ہوں اور اور آس پاس کے قبائلِ عرب کا معاملہ دیکھیں اور قطعی طور پر یہ امر معلوم ہے کہ یہ کئی ایام کے قیام کا محتاج تھا، ایک یا دو دن میں تو یہ تمام معاملات ٹھیک نہ ہوسکتے تھے، اسی طرح آپ کا تبوک میں قیام کہ آپ دشمن کے منتظر تھے اور معلوم ہے کہ مسلمانوں اور قیصر کے درمیان کئی مراحل کا فاصلہ حائل تھا، جو کئی ایام کا محتاج تھا اور آپ کے علم میں تھا کہ یہاں چار دن کا کام نہیں پھر سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما آذر بائیجان میں برفباری کی وجہ سے چھ ماہ قصر کرتے رہے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ سلسلہ چار دن میں ختم ہونے والا نہیں کیونکہ برفباری بند ہونے کے بعد اسے پگھلنے میں کئی ہفتوں کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ راستے کھل جائیں، اسی کی مثل سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا شام میں دو برس اور صحابہ کرام کا ہرمز میں سات ماہ کا قیام اور سب کو معلوم تھا کہ یہ حصار و جہاد چار ایام میں ختم ہونے والے نہیں۔

اصحابِ احمد نے کہا ہے کہ اگر کوئی جہاد کے لیے یا بادشاہ کے محبوس کرنے یا بیماری کی وجہ سے قیام پذیر ہے تو قصر کرتا رہے، چاہے اس کا ظنِ غالب ہو کہ قلیل مدت میں روانہ ہوسکتا ہے یا طویل میں اور یہی درست موقف ہے، لیکن انہوں نے اس میں ایک شرط لگائی ہے، جس پر کتاب وسنت، اجماع اور عملِ صحابہ سے کوئی دلیل نہیں، وہ یہ کہ انہوں نے کہا: اس شرط پر کہ اس کی حاجت کے پورا ہونے کا احتمال ہو، اس مدت میں جو حکمِ سفر کی قاطع نہیں اور یہ جو چار ایام سے کم ہو۔ ہم ان پوچھتے ہیں: تم نے یہ شرط کیونکر لگائی؟ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور تبوک میں چار سے زائد دن قیام کیا اور اس دوران میں قصر کرتے رہے اور صحابہ کرام کے لیے کوئی بات نہ کہی اور نہ انہیں بیان کیا کہ آپ کا چار دن سے زائد قیام کا ارادہ نہیں جبکہ آپ جانتے تھے کہ لوگ آپ کی اتباع واقتدا کریں گے، لیکن اس سلسلے میں ایک حرف تک نہیں کہا کہ چار سے زائد دن کا قیام ہو تو بجائے قصر کے پوری کرو، حالانکہ یہ وضاحت کرنا (اگر ضروری ہوتی تو) نہایت اہم تھا، اسی طرح آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل انہوں نے

بھی مدتِ اقامت میں کوئی بات نہیں کی، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر چار دن سے زائد قیام کا ارادہ ہوتو (شروع ہی سے) پوری پڑھے، اگر اس سے کم کا ہوتو قصر کرے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر پندرہ دن کے قیام کا ارادہ کر کے اترا ہے، تو پوری پڑھے، وگرنہ قصر اور یہی امام لیث بن سعد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، تین صحابہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہ ہیں سیدنا عمر، عبداللہ بن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں اگر چار دن کا قیام کرو تو چار پڑھو، ان سے ایک قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسا بھی منقول ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر دس دن کا قیام ہو تو پوری پڑھے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت بھی یہی ہے، حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: جب تک کسی شہر میں وارد نہیں ہوتا (یعنی جب تک حالتِ سفر میں ہے) قصر کرتا رہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مؤقف ہے کہ جب تک زاد و مزاد (سفر کا سامان) رکھ نہیں دیتا، قصر کرتا رہے، ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ اگر کسی کام کے لیے قیام کیا، جس کے ہونے کا وہ منتظر ہے اور کچھ علم نہیں کہ کل ہو یا آج ہو یا کب ہو؟ وہ مسلسل قصر کرتا رہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ سے ایسے شخص کے بارے ایک قول یہ منقول ہے کہ سترہ دن قصر کرے یا اٹھارہ دن، اس کے بعد نہ کرے، ابن منذر رحمہ اللہ نے اِشراف میں لکھا: اہلِ علم کا اجماع ہے کہ مسافر جب تک قیام کا عزم نہیں کرتا، قصر کرتا رہے، چاہے کئی سال اسی حیص بیص میں گزر جائیں۔

⑤ سفر میں سنتیں اور نوافل

جمہور علماء قصر نماز ادا کرنے والے کے لیے نفل ادا کرنے کی عدم کراہت کے قائل ہیں، اس ضمن میں انہوں نے راتبہ (سنتیں) اور غیر راتبہ (نوافل، غیر مؤکدہ) کا فرق نہیں کیا، بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں فتحِ مکہ کے (اگلے) روز آٹھ رکعات (چاشت کے وقت) پڑھیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں نبی کریم ﷺ سفر میں سواری پر بیٹھے نوافل پڑھتے رہے، جس طرف بھی آپ کا رخ ہوتا (رکوع وسجود کے لیے) سر کے ساتھ اشارہ کرتے، حسن کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر میں فرض نماز سے قبل اور بعد میں سنتیں پڑھتے تھے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کی رائے تھی کہ سفر میں فرضوں کے ساتھ سنتوں کی ادائیگی مشروع نہیں، البتہ تہجد ہے، بعض حضرات کو سنتیں پڑھتے دیکھ کر کہا، اگر میں نے سنتیں ہی پڑھنا ہیں، تو فرض نماز کو ہی پورا کیوں نہ پڑھ لوں؟ کہتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رہا ہوں، آپ دو سے زائد نہ پڑھتے تھے، حتی کہ اللہ نے آپ کو فوت کر لیا، پھر سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ رہا، وہ بھی یہی کرتے رہے اور اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (الأحزاب: ۲۱) اسے بخاری نے نقل کیا، ابن قدامہ نے حسن کے اور قولِ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے مابین یہ تطبیق دی کہ حدیثِ حسن دال ہے کہ ایسا کر لینے میں حرج نہیں، جبکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث دال ہے کہ ایسا نہ کرنے میں حرج نہیں۔

⑥ جمعے کے دن سفر کرنا

اس میں کوئی حرج نہیں ہاں عین نماز کے وقت (سفر شروع کرنے سے) احتراز کرے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو کہتے

سنا: اگر آج جمعہ نہ ہوتا تو میں نے سفر پہ نکلنا تھا، تو کہا: نکل سکتے ہو، کیونکہ جمعہ سفر سے مانع نہیں ہے، امام زہری رحمہ اللہ نے ایک دفعہ بروزِ جمعہ دن چڑھے سفر کا ارادہ کیا، تو بعض نے اعتراض کیا، تو کہا: نبی کریم ﷺ نے جمعہ کے دن سفر کیا ہے۔

دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا

درجِ ذیل حالات میں جائز ہے کہ ظہر اور عصر، مغرب اور عشا کو جمع کر کے پڑھا جائے، چاہے جمع تقدیم کرے یا تاخیر۔

① عرفہ اور مزدلفہ میں

علماء متفق ہیں کہ عرفہ میں ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت میں جمع کر کے ادا کرنا اور مزدلفہ میں (اسی شام) مغرب اور عشا کو عشا کے وقت میں جمع کر کے ادا کرنا سنت ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہی کیا تھا۔

② سفر میں جمع کرنا

اکثر اہل علم کے قول کے مطابق یہ جائز ہے، تقدیم کرے یا تاخیر، اس ضمن میں نازل (اثنائے سفر منزل پہ اترا ہوا) اور سائر (جو حالتِ سفر میں ہے) کے درمیان فرق نہیں، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک میں اگر (کسی منزل سے) سورج زائل ہونے کے بعد سفر شروع کرتے تو ظہر و عصر کو اکٹھا ادا کر لیتے، ظہر کے وقت میں اور اگر زوال سے قبل سفر شروع کرتے، تو ظہر کو مؤخر کر کے اسے عصر کے ساتھ جمع کر کے پڑھتے، اسی طرح اگر کسی منزل سے قبل از غروب سفر کرتے، تو مغرب کو مؤخر کر کے اسے عشا کے ساتھ جمع کر کے ادا کرتے اور اگر غروب کے بعد سفر کرتے تو عشا کو مغرب کے ساتھ جمع کر کے ادا فرما لیتے،[1] اسے ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن حدیث ہے۔ کریب عن ابن عباس سے مروی ہے کہ کہا: کیا تمہیں سفر میں نبی کریم ﷺ کی نماز کے بارے نہ بتلاؤں؟ عرض کیا: کیوں نہیں، کہا: جب زوال کے بعد چلتے تو ظہر و عصر کو (عصر کے وقت میں) ادا فرماتے اور اگر اس سے قبل سفر شروع کرتے، تو عصر کو مقدم کر کے اسے ظہر کے ساتھ پڑھ کر سوار ہوتے اور یہی مغرب اور عشا کے ضمن میں کرتے،[2] اسے امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں نقل کیا، بیہقی نے بھی جید سند کے ساتھ یہ نقل کیا اور کہا: سفر میں دو نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنا، صحابہ اور تابعین کے ہاں مشہور و مستعمل امور میں سے ہے۔[3]

امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک روز غزوۂ تبوک میں نبی کریم ﷺ نے نماز مؤخر کی پھر باہر آئے اور ظہر و عصر کو جمع کر کے پڑھایا، پھر (خیمے میں) داخل ہو گئے، پھر باہر آئے اور مغرب اور عشا کو اکٹھے پڑھایا،[4]

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٢٠٨؛ سنن ترمذي: ٥٥٣. ② صحيح، مسند أحمد: ١/ ٣٦٧؛ مسند الشافعي: ١/ ١٨٦. ③ السنن الكبرى: للبيهقي: ٣/ ١٦٣. ④ صحيح، مؤطاامام مالك: ١/ ١٤٢.

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بلا شبہ یہ ٹھہرنے کی حالت میں تھا، ابن قدامہ رحمہ اللہ المغنی میں اس حدیث کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں: امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث صحیح اور ثابت الاسناد ہے، اہلِ سیر کے بقول غزوۂ تبوک سن نو ہجری میں تھا، اس حدیث میں ان حضرات کا قوی رد ہے، جو قائل ہیں کہ مسافر اس صورت میں جمع کر کے پڑھ سکتا ہے، جب سفر جاری ہو (سفر کے دوران میں کسی جگہ اترا ہونے کی صورت میں ایسا نہیں کر سکتا) کیونکہ اس واقعہ میں آپ نے نازل حالت میں جمع کیا ہے، اس حدیث کو مسلم نے بھی اپنی صحیح میں تخریج کیا، لہٰذا اس کا اخذ متعین ہے، کیونکہ صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ صریح فی الحکم بھی ہے اور کوئی روایت اس کے معارض نہیں اور اس لیے کہ جمع کرنا سفر کی رخصتوں میں سے ہے، تو یہ جاری سفر کے ساتھ خاص نہیں، جیسے قصر ہے اور جیسے مسح ہے، لیکن افضل تاخیر ہے (یعنی ظہر کو عصر اور مغرب کو عشا کے وقت میں پڑھنا)

جمع اور قصر میں نیت کی شرط نہیں، بقول امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہ جمہور علماء کا قول ہے، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ جب صحابہ کو جمع و قصر کراتے، تو انہیں جمع و قصر کی نیت کا حکم نہ دیتے تھے، بلکہ آپ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے اور اکیلی ظہر کی نماز پڑھائی، تو پہلے سے خبر نہ دی تھی کہ آپ بعد ازاں عصر پڑھانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں، پھر آپ نے نمازِ عصر پڑھائی اور صحابہ نے جمع کی نیت نہ کی ہوئی تھی اور یہ جمع تقدیم ہے، اسی طرح جب آپ مدینہ سے نکلے، تو ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی جماعت کرائی اور انہیں قصر کی نیت کا حکم نہ دیا، جہاں تک دونوں جمع کردہ نمازوں کی موالات (ترتیب سے ان کی ادائیگی) تو بقول ان کے صحیح یہ ہے کہ یہ کسی صورت میں شرط نہیں، نہ جمع تقدیم اور نہ جمع تاخیر کی صورت میں، کیونکہ اس کے لیے شرع میں کوئی حد نہیں اور اس لیے کہ اس کی مراعات کرنے سے رخصت کا مقصد فوت ہو جائے گا (کیسے فوت ہوگا ذرا اس کی بھی وضاحت کر دیتے، کوئی پوچھے ترتیب کے ساتھ پہلے ظہر اور عصر اور اسی طرح پہلے مغرب اور پھر عشا ادا کرنے میں کیا مشکل درپیش ہے، رہا یہ امر کہ اس کا ذکر نہیں ہوا، تو یہ اتنی بدیہی بات ہے کہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں) امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے اگر گھر میں نمازِ مغرب جمع کی نیت سے پڑھی، پھر مسجد آیا تو عشا کی نماز باجماعت ادا کر لی، تو یہ جائز ہے، اس کا مثل امام احمد رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

③ بارش میں جمع کرنا

اثرم نے اپنی سنن میں ابو سلمہ بن عبدالرحمن (بن عوف) رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ اگر بارش ہو رہی ہو، تو مغرب اور عشا کو جمع کر کے ادا کر لینا مسنون ہے، بخاری نے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بارش کی رات مغرب اور عشا کو جمع کر کے پڑھایا۔[1]

اس بارے میں مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ شافعیہ نے مقیم کے لیے (بھی) ظہر و عصر اور مغرب و عشا کو جمع کر کے ادا کرنا جائز قرار دیا ہے لیکن فقط جمع تقدیم اور صرف بارش کے عذر کی بنا پر، اگر بارش پہلی نماز شروع کرتے وقت اور سلام پھیرنے اور دوسری شروع کرتے وقت ہو رہی ہے، مالک کے ہاں مسجد میں ہو رہی ہو یا متوقع ہو یا تاریکی مع کیچڑ کی صورت میں مغرب اور عشا کو جمع تقدیم کر کے پڑھنا جائز ہے اگر کیچڑ اتنا زیادہ ہو کہ جوتے پہننا دشوار ہو رہا ہو، بارش کی بنا پر ظہر و عصر کو اکٹھے

[1] صحیح البخاری: ٥٤٣.

ادا کرنا انہوں نے مکروہ قرار دیا، حنابلہ کے نزدیک فقط مغرب اور عشا کے مابین جمع جائز ہے، تقدیم بھی اور تاخیر بھی برفباری، اولے برسنے، کیچڑ، شدید سردی اور ایسی بارش کی صورت میں جس سے کپڑے بھیگیں اور یہ رخصت ان لوگوں کے لیے خاص ہے جو دور سے آکر مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے عادی ہیں اور راستوں میں کیچڑ سے آلودہ ہونے اور کپڑے خراب ہونے کا خدشہ ہے یا جوتے پہننا ممکن نہیں، جو مسجد میں ہیں یا گھر میں جو جماعت کراتے ہیں یا مسجد جانے کا محفوظ راستہ اور بارش سے بچنے کا ذریعہ (چھتری) موجود ہے یا مسجد گھر کے قریب ہی ہے تب جمع جائز نہیں۔

④ مرض یا معذوری کی وجہ سے جمع کرنا

امام احمد، قاضی حسین، خطابی اور شوافع کے متولی کی رائے ہے کہ مرض کے عذر کے سبب جمع کرنا جائز ہے، تقدیماً بھی اور تاخیراً بھی، کیونکہ اس میں بارش کی نسبت مشقت زیادہ شدید ہے، بقول امام نووی رحمہ اللہ دلیل کے لحاظ سے یہ قوی ہے، المغنی میں ہے کہ مرض جمع کی اباحت کا سبب ہے، اگر ہر نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا مریض کے لیے مشقت اور ضعف کا باعث ہو۔ حنابلہ نے توسّع اختیار کیا، تو اصحابِ اعذار اور خائف کے لیے بھی جمع کو جائز قرار دیا، اسی طرح دایہ کے لیے جس کے لیے ہر نماز کے وقت کپڑے دھونے کی مشقت ہے اور مستحاضہ کے لیے بھی اور جسے سلس البول (پیشاب کے قطرے گاہے بگاہے نکلتے رہنے) کا مرض لاحق ہو اور وضو وطہارت سے کسی وجہ سے عاجز کے لیے بھی اور جسے اپنی جان، مال یا عزت کا خوف ہو، اسی طرح جسے دکانداری میں مشکل پیش آرہی ہو اور ہر نماز کے وقت جانا نقصان کا باعث بن رہا ہو، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جمع کے ضمن میں اوسع مذہب امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، تو انہوں نے بوجہِ مشغولیت بھی جمع کرنا جائز قرار دیا، نسائی نے اسے نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، یہاں تک کہا کہ باورچی، تندورچی اور ان جیسوں کے لیے بھی جمع جائز ہے، جنہیں مالی نقصان کا خدشہ ہو۔

⑤ ضرورت کے تحت جمع کرنا

نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ائمہ کی ایک جماعت حضر میں ضرورت کی وجہ سے جوازِ جمع کی قائل ہے اور اسے معمول بنا لینا بھی، یہ ابن سیرین اور مالکیہ کے اشہب کا مذہب ہے، امام خطابی رحمہ اللہ نے اسے قفال اور اصحابِ شافعی میں سے شاشی کبیر سے بھی نقل کیا اور یہی مؤقف ابو اسحاق مروزی اور اصحاب الحدیث کی ایک جماعت کا ہے، ابن منذر رحمہ اللہ نے بھی یہی اختیار کیا، اس کی تائید سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا ظاہر بھی کرتا ہے: "أَرَادَ أَنْ لاَ يُحْرِجَ أُمَّتَهُ" چاہا کہ اپنی امت کو حرج میں نہ ڈالیں۔ تو اسے کسی مرض وغیرہ کے ساتھ معلّل نہیں کیا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ مشار الیہ حدیث مسلم نے نقل کی، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشا کے مابین جمع کیا، بغیر خوف اور بارش کے، ان سے کہا گیا نبی کریم ﷺ نے کیوں ایسا کیا؟ کہا: "أَرَادَ أَنْ لاَ يُحْرِجَ أُمَّتَهُ"[1] بخاری ومسلم نے ان سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں سات (اکٹھی، یعنی رکعتیں) اور آٹھ (اکٹھی) پڑھائیں، یعنی مغرب اور عشاء اور ظہر وعصر۔[2] مسلم

---

① صحیح مسلم: ۷۰۵. ② صحیح البخاری: ۵۴۳.

میں عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہمیں ایک روز عصر کے بعد سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خطبہ دیا حتی کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے ظاہر ہو گئے اور لوگ کہنے لگے: نماز، نماز! بنی تمیم کا ایک آدمی تو نماز نماز پکارتا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھے تم سنت سکھلا رہے ہو؟ تیری ماں مرے! پھر کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ ظہر و عصر اور مغرب وعشا کو جمع کر کے ادا کیا، عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بات سن کر میرے سینے میں کچھ خلش سی پیدا ہوئی، تو میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے اس بارے میں استفسار کیا، تو انہوں نے تصدیق کی۔

فائدہ

المغنی میں ہے کہ اگر پہلی نماز کے وقت میں جمع کر کے ادا کی پھر اگلی کے وقت سے قبل عذر ختم ہو گیا، تو اب اسے دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس نے وہ نماز پڑھ لی ہے اور بری الذمہ ہو چکا ہے کیونکہ جب اسے ادا کیا، تو وہ حالتِ عذر میں تھا، تو عذر کے زوال کے بعد وہ نماز باطل نہ ہو جائے گی، جیسے کوئی تیمم کر کے نماز ادا کرنے والا، اگر وقت کے اندر اندر پانی پا لے تو اسے اب دہرانے کی ضرورت نہیں۔ [1]

کشتی، ٹرین اور جہاز میں نماز

ان تینوں میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، جیسی بھی حالت و کیفیت بنے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے کشتی میں ادائیگیِ نماز کے بارے پوچھا گیا، تو فرمایا: ''کھڑے ہو کر پڑھو اِلّا یہ کہ پانی میں گرنے کا خوف ہو۔'' [2] اسے دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شیخین کی شرط پر ہے، عبداللہ بن ابو عتبہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے ایک دفعہ سیدنا جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ کشتی میں سفر کیا، تو نماز کا وقت ہوا، تو ان صحابہ نے کھڑے ہو کر باجماعت نماز کرائی، حالانکہ ساحل قریب تھا اور وہ ادھر جا کر پڑھ سکتے تھے، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا۔ [3]

سفر کی دعائیں

مسافر کے لیے مستحب ہے کہ گھر سے نکلتے وقت یہ کہے: «بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ» [4] پھر درج ذیل ادعیہ ماثورہ میں سے جو دعا چاہے پڑھے، بعض ذکر کی جاتی ہیں:

---

[1] صحیح مسلم:٧٠٦. [2] صحیح، سنن الدارقطنی:١/ ٢٩٥؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٧٥. [3] صحیح، مصنف عبدالرزاق:٥/ ٥٨٢؛السنن الكبرى للبيهقي: ٣/ ١٥٥. [4] صحیح، سنن أبي داود: ٥٠٩؛ سنن ابن ماجه: ٣٨٨٤.

① علی بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کے پاس سواری لائی گئی، جب رکاب میں پاؤں رکھا تو کہا: «بِسْمِ اللَّهِ» جب اچھی طرح بیٹھ چکے تو کہا: «اَلْحَمْدُ لِلَّهِ» پھر یہ دعا پڑھی ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ○ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (الزخرف: ١٣۔١٤) پھر تین دفعہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا پھر کہا: ''سُبْحَانَكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ إِنَّهٗ لَايَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ'' پھر ہنس پڑے، میں نے کہا: امیر المومنین! کس وجہ سے ہنسی آئی؟ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ سب کرتے دیکھا تھا، پھر آپ ہنسے تھے، میں نے بھی تمہاری طرح آپ سے ہنسی کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ''رب اپنے بندے سے خوش ہوتا ہے جب وہ عرض کرتا ہے: «رَبِّ اغْفِرْ لِيْ» ''اے رب! مجھے معاف کر دے۔ وہ کہتا ہے، میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔''[1] اسے احمد، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: شرطِ مسلم پر یہ صحیح ہے۔

② ازدی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر نکلتے ہوئے اونٹ پر بیٹھ جاتے، تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے، پھر کہتے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ○ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (الزخرف: ١٣۔ ١٤)

«اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوىٰ وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضىٰ اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ»

''اے اللہ! ہم اس سفر میں تجھ سے نیکی، تقویٰ اور ایسے عمل کرنے کی توفیق مانگتے ہیں جو تجھے پسند ہوں، اے اللہ! اس سفر کو آسان کر اور اس کی دوری ہمارے لیے سمیٹ دے، اے اللہ! تو ہی سفر میں ہمارے ساتھ اور گھر والوں کے لیے ہمارا جانشین ہے، اے اللہ! میں سفر کی صعوبتوں، تکلیفوں اور اہل و مال میں برے مناظر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

واپسی پر بھی یہ کہتے اور مزید یہ بھی: «آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ» ''ہم لوٹنے والے ہیں اور توبہ کرنے والے، خاص اپنے رب کو پوجنے والے اور اسی کی تعریف کرنے والے ہیں۔''[2] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر نکلنے کا ارادہ فرماتے، تو کہتے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الضُّبْنَةِ فِي السَّفَرِ وَالْكَآبَةِ فِي الْمُنْقَلَبِ اَللّٰهُمَّ اطْوِ لَنَا الْأَرْضَ وَهَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ»

''اے اللہ! سفر میں تو ہی ہمارا ساتھی ہے، اور گھر والوں سے ہمارا جانشین ہے میں سفر کی تنگیوں سے تیری پناہ کا طالب ہوں، اور برے منظر کو دیکھنے سے، اے اللہ! زمین کی دوری کو ہمارے لیے سمیٹ دے اور اسے ہمارے لیے آسان بنا۔''

---

[1] صحيح، مسند أحمد: ٧٥٣؛ سنن أبي داود: ٢٦٠٢. [2] صحيح مسلم: ١٣٤٢؛ مسند أحمد: ٢/ ١٥٠.

جب واپسی کا سفر شروع کرتے تو کہتے: «آئِبُونَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ» گھر میں جب داخل ہوتے، تو کہتے: «تَوْباً تَوْباً لِرَبِّنَا أَوْباً لَا يُغَادِرُ عَلَيْنَا حَوْباً» ''اللہ کی طرف توبہ کرتے ہوئے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے، امید ہے وہ ہماری کامل بخشش کر دے گا۔''[1] اسے احمد، طبرانی اور بزار نے رجالِ صحیح پر مشتمل سند کے ساتھ تخریج کیا۔

④ سیدنا عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو کہتے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ»

''اے اللہ! میں تجھ سے سفر کی دشواری، اندوہناک منظر، صلاح کے بعد فساد، مظلوم کی بد دعا اور اہل و مال میں برے منظر سے پناہ مانگتا ہوں۔''

واپسی پر بھی یہی کہتے، البتہ «الأَهْلِ وَالْمَالِ» کے الفاظ کہتے، یعنی اھل کو مقدم کرتے۔[2] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

⑤ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ یا سفر پر نکلتے تو (پہلی) رات ہونے پر یوں دعا گو ہوتے:

«يَا أَرْضُ رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِيْكِ وَشَرِّ مَا خُلِقَ فِيْكِ وَشَرِّ مَا دَبَّ عَلَيْكِ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ كُلِّ أَسَدٍ وَأَسْوَدٍ وَ مِنَ الْحَيَّةِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنْ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ شَرِّ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ»

''اے زمین! میرا اور تمہارا رب اللہ ہے، میں اللہ کے ساتھ تیرے اور تیری سطح پہ بسنے والی ہر مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، ان سب سے جو تم پر چلتے ہیں اور ہر درندے اور اژدہا سے۔''[3] اسے احمد و ابوداود نے نقل کیا۔

⑥ سیدہ خولہ بنت حکیم سلمیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی جگہ اترے، پھر کہے: «أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ كُلِّهَا مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ» ''میں اللہ کے مکمل کلمات کے ساتھ اس کی سب مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اس نے پیدا کی۔'' تو جب تک ادھر قیام پذیر رہے، اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی،[4] اسے سوائے بخاری اور ابوداود کے دیگر سب نے نقل کیا۔

⑦ عطاء بن ابومروان اپنے والد سے راوی ہیں کہ کعب (احبار) نے حلف اٹھا کر بیان کیا کہ سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بستی میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے، تو اس پر نظر پڑتے ہی کہتے:

---

[1] حسن، لغيره، مسند أحمد: ١/ ٢٥٦، المعجم الاوسط: ١٥٥١. [2] صحيح مسلم: ١٣٤٣؛ مسند أحمد: ٥/ ٨٢.
[3] ضعيف، سنن أبي داود: ٢٦٠٣. [4] صحيح مسلم: ٢٧٠٨؛ سنن ترمذي: ٣٤٣٧؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٤٧.

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْأَرْضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنَ وَمَا أَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ أَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهٖ وَشَرِّ مَا فِيْهَا »

''اے ساتوں آسمانوں اور جن پر وہ سایہ فگن ہیں، کے رب اور اے ساتوں زمینوں اور جو وہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، کے رب اور شیاطین اور ہواؤں کے میں تیرے ساتھ اس کے شر سے اور جو اس کے اندر ہے، کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔''[1] اسے نسائی، ابن حبان اور حاکم نے تخریج کیا، آخری دو نے اسے صحیح قرار دیا۔

⑧ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کرتے، تو جب کسی قریہ کو دیکھتے جس میں دخول کا ارادہ ہوتا، تو تین مرتبہ کہتے: «اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهَا، اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا جَنَاهَا وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا »

''اے اللہ! تو ہمارے لیے اس میں برکت فرما، اس کے فوائد سے ہمیں متمتع فرما، اس کے باسیوں کی نظر میں ہمیں محبوب کر اور اس کے صالح باسیوں کو ہمارا دوست بنا۔''[2] اسے طبرانی نے اوسط میں جید سند سے نقل کیا۔

⑨ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سرزمین پر جس میں داخلے کا ارادہ ہوتا، مطلع ہوتے تو کہتے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهٖ وَخَيْرِ مَا جَمَعْتَ فِيْهَا وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جَمَعْتَ فِيْهَا اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا حِمَاهَا وَأَعِذْنَا مِنْ وَبَائِهَا وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا »

''اے اللہ! میں تجھ سے اس کی خیر کا سوالی ہوں اور ہر اس کی خیر کا جو تو نے اس میں جمع کیا اور اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور ہر اس کے شر سے جو تو نے اس میں جمع کیا، اے اللہ! ہمیں اس کے فوائد عطا کر اور اس کی وبا سے ہمیں بچا اور اس کے باسیوں کی نظر میں ہمیں محبوب کر اور اس کے صالح باسیوں کو ہمارا دوست بنا۔''[3] اسے ابن سنی نے (عمل الیوم واللیلۃ میں) روایت کیا۔

⑩ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے تو صبح کے وقت یہ دعا پڑھتے: «سَمَّعَ سَامِعٌ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَحُسْنِ بَلَائِهٖ عَلَيْنَا رَبَّنَا صَاحِبْنَا وَأَفْضِلْ عَلَيْنَا عَائِذاً بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ »

''ہم اللہ کی حمد کرتے اور اس کی نعمتوں کا اقرار کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو ہمارا مصاحب بن اور ہم پر کرم فرما، آگ سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔''[4] اسے مسلم نے تخریج کیا۔

---

① حسن لغیرہ، صحیح ابن خزیمۃ: ۲۵٦٦. ② ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ٤٧٥٢. ③ ضعیف، عمل الیوم واللیلۃ لابن اسنی: ٥٢٧. ④ صحیح مسلم: ۲۷۱۸.

جمعہ

① یومِ جمعہ کی فضیلت

وارد ہے کہ روزِ جمعہ ہفتے کا بہترین دن ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہترین دن جس پر سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعے کا دن ہے، اسی میں تخلیقِ آدم ہوئی، اسی دن انہیں جنت میں داخلہ ملا، اسی دن وہاں سے نکلے اور قیامت بھی جمعے کے دن قائم ہوگی۔[1] اسے مسلم، ابوداود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا اور ترمذی نے حکمِ صحت لگایا۔
سیدنا ابولبابہ بدری راوی رضی اللہ عنہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جمعے کا دن سیدِ ایام ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی عظمت عید الفطر اور عید الضحیٰ سے بھی بڑھ کر ہے، اس کی پانچ خصوصیات ہیں:

① اس میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق کی۔

② اسی دن انہیں زمین پر اتارا۔

③ اسی دن ان کی وفات ہوئی۔

④ اس میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اس میں جو دعا کی جائے قبول ہوتی ہے، جب تک کسی حرام کام کی دعا نہ کرے۔

⑤ اور اسی میں قیامت قائم ہوگی، اس دن فرشتوں، آسمانوں، زمین، ہواؤں، پہاڑوں، سمندروں سمیت ہر چیز لرزہ براندام رہتی ہے کہ کہیں قیامت نہ برپا ہو جائے۔''[2] امام عراقی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

② جمعے کے دن دعا کرنا

یومِ جمعہ کے آخری لحات میں گڑگڑا کر دعائیں کرنی چاہئیں، چنانچہ سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا اور نبی کریم ﷺ بھی بیٹھے تھے کہ ہم اللہ کی کتاب (تورات) میں لکھا پاتے ہیں کہ جمعے کے دن ایک ساعت ایسی ہے، جس میں بندۂ مومن نماز پڑھتا ہوا ہو تو جو اللہ سے مانگے اس کی طلب پوری کی جائے گی، کہتے ہیں: اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے لقمہ دیا اور کہا: ''یا ساعت کا کچھ حصہ۔'' میں نے عرض کی: سچ کہا، واقعی یہی ہے! راوی کہتے ہیں: میں نے پوچھا: یہ کون سی گھڑی ہے؟ کہا: دن کی ساعات میں سے آخری ساعت، میں نے کہا: لیکن آپ نے تو ذکر کیا کہ بندۂ مومن نماز میں لگا ہوا ہو اور وہ تو نماز کی ساعت نہیں (یعنی اوقاتِ مکروہہ میں داخل ہے) آپ نے فرمایا: ''یہ بات ٹھیک ہے، لیکن انسان اگر نماز کے انتظار میں بیٹھ رہے، تو وہ نماز میں مشغول کے حکم میں ہوتا ہے۔''[3] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی

---

[1] صحيح مسلم: ٨٥٤؛ سنن ابن داود: ١٠٤٦؛ سنن ترمذی: ٤٨٨. [2] حسن، سنن ابن ماجه: ١٠٨٤.
[3] حسن، سنن ابن ماجه: ١١٣٩.

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جمعے کے دن ایک ساعت ہے، اگر کسی مسلمان کو وہ نصیب ہو جائے، تو جو خیر کی دعا بھی اس میں کرے، اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے گا اور یہ عصر کے بعد ہے۔''[1] اسے احمد نے نقل کیا، بقول عراقی صحیح ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ''روزِ جمعہ کی بارہ ساعات ہیں اور ان میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اس میں کوئی مسلمان اللہ سے دعا کرتا پایا جائے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' اور فرمایا: ''اسے عصر کے بعد آخری ساعت میں تلاش کرو۔''[2] اسے نسائی، ابوداود اور مستدرک میں حاکم نے نقل کیا اور کہا: مسلم کی شرط پر صحیح ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اسے حسن قرار دیا۔

سیدنا ابوسلمہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: چند صحابہ کرام جمع تھے، تو ان کے مابین جمعے کے دن کی اس ساعتِ قبولیت کا ذکر چھڑ گیا، تو اس امر میں ان کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا کہ یہ جمعے کے دن کی آخری ساعت میں ہے،[3] اسے سعید نے سنن میں نقل کیا، بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ صحیح ہے، احمد نے کہا: اکثر روایات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ قبولیتِ دعا کی امید والی یہ گھڑی نمازِ عصر کے بعد ہے اور زوالِ آفتاب کے بعد بھی موجود ہے، جہاں تک مسلم اور ابوداود کی سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ نبی کریم ﷺ کو اس ساعت کے بارے فرماتے سنا کہ یہ خطیب کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز پوری ہونے تک ہے، تو اسے اضطراب اور انقطاع کے ساتھ معلّل کیا گیا ہے۔

③ شبِ جمعہ اور دن کے وقت کثرت سے درود بھیجنے کا استحباب

سیدنا اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے افضل ایام میں سے جمعے کا دن ہے، اسی دن تخلیقِ آدم ہوئی اور اسی دن وہ فوت ہوئے اور قیامت بھی اسی روز قائم ہوگی، اس دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ وہ مجھے پیش کیا جاتا ہے۔'' لوگوں نے عرض کی: آپ پر ہمارا درود کیسے پیش کیا جائے گا، جبکہ آپ مٹی میں مل جائیں گے؟ فرمایا: ''اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ انبیا کے جسم کھائے۔''[4] اسے سوائے ترمذی کے باقی پانچ نے نقل کیا، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جمعے کے دن اور اس کی رات (جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب) کثرت سے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا مستحب ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا: ((أَكْثِرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَيْلَةَ الْجُمُعَةِ)) ''شبِ جمعہ اور جمعہ کے روز مجھ پہ کثرت سے درود پڑھا کرو۔''[5] اور رسول اللہ ﷺ سیدِ انام ہیں اور جمعے کا دن سیدِ ایام ہے، لہٰذا اس دن آپ پر درود پڑھنے کا ایک امتیاز ہے، جو کسی اور دن کو حاصل نہیں، پھر ایک اور حکمت بھی ہے، وہ یہ کہ آپ کی امت کو دنیا و آخرت کی جو خیر و بھلائی ملی ہے، وہ اس نے آپ ہی کے واسطہ سے حاصل کی ہے، تو اللہ نے امتِ محمدیہ کے لیے دونوں جہانوں کی خیر جمع کر دی ہے، تو عظیم تر شرف جو انہیں حاصل ہوگا وہ بروزِ جمعہ ہوگا کہ اس میں وہ جنت کے اپنے محلات میں بھیجے جائیں گے، یہ جنت میں ان

---

① حسن، مسند أحمد: ٣/ ٦٥. ② صحيح، سنن أبی داود: ١٠٤٨؛ سنن نسائی: ٣/ ٩٩، ١٠٠. ③ دیکھیے: نیل الاوطار: ١٢٠٤. ④ صحيح، سنن أبی داود: ١٠٤٧؛ سنن ابن ماجه: ١٠٨٥. ⑤ حسن، مسند الشافعی: ١/ ١٧٢؛ السنن الكبرى للبيهقی: ٣/ ٢٤٩ سلسلة الاحاديث الصحيحة: ١٤٠٧.

کے لیے یوم مزید (مزید نعمتوں کے حصول کا باعث) اور دنیا میں ان کے لیے یوم عید ہے، اور اس دن اللہ ان کی حاجات کو پورا کرتا اور دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے، تو اس سب کی معرفت وعلم نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے ہوئی، لہٰذا اس عظیم احسان وکرم کے شکرانہ کے طور پر اس دن ورات آپ پر بکثرت درود پڑھا جائے تا کہ آپ کا کچھ حق ادا ہو سکے۔

④ جمعہ کے دن یا اس کی شب سورہ کہف پڑھنے کی فضیلت

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جمعے کے دن سورۂ کہف پڑھی، اس کے لیے سارا ہفتہ منور بنا دیا گیا۔''[①] اسے نسائی، بیہقی اور حاکم نے تخریج کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے بروز جمعہ سورۂ کہف کی تلاوت کی، اس کے قدم تلے سے ایک نور بلند ہو کر آسمان کی عنان تک جاتا ہے اور یہ قیامت کے روز اسے روشنی عطا کرے گا اور اس کے ہفتہ کے سب گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''[②] اسے ابن مردویہ نے جید سند سے نقل کیا (مفتیِ مصر) الشیخ محمد عبدہ نے اس ضمن میں ایک فتوی صادر کیا تھا کہ سورۂ کہف کی تلاوت اگر مسجد میں کی جائے تو اتنی بلند آواز سے نہ ہو کہ نماز میں لگے لوگ پریشان ہوں یا اس کا عدم سماع کر کے اور اپنی باتوں وغیرہ میں مشغول ہو کر گناہ گار بنیں، لہٰذا اس طریقہ سے اسے پڑھنا باعثِ حذر ہے۔

⑤ غسل ومسواک کرنا اور خوشبو لگا کر صاف ستھرا لباس پہننا

ہر جمعہ پڑھنے جانے والے کے لیے یہ سب مستحب ہے، اسی طرح اس کے لیے بھی جو لوگوں کے کسی اجتماع میں جا رہا ہے اس میں، مرد، عورت، بڑے، چھوٹے اور مقیم ومسافر کی کوئی تمیز نہیں سبھی کو صفائی ستھرائی اور زیب وزینت کے لحاظ سے احسن حالت میں ہونا چاہیے، اس بارے درج ذیل روایات ہیں:

① سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر مسلمان کو جمعے کے دن نہانا چاہیے اور اچھے کپڑے پہنے اور اگر خوشبو میسر ہے تو وہ بھی لگائے۔''[③] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

② سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ سے خطبہ جمعہ میں سنا: ''اگر ہو سکے تو ہر ایک جمعہ ادا کرنے کے لیے خاص لباس خرید لے، جسے کام کاج کے وقت نہ پہنے۔''[④] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

③ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی جمعے کے دن غسل کرے اور ہر ممکن طور پر صفائی ستھرائی کرے، تیل یا خوشبو لگائے پھر مسجد جا کر کسی دو کے درمیان گھس کر نہ بیٹھے اور نوافل ادا کرے پھر خطبہ شروع ہو تو مکمل خاموشی سے سنے تو پورے ہفتہ کے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''[⑤] اسے احمد اور بخاری نے نقل کیا۔

---

① صحیح، عمل الیوم واللیلة للنسائی: ۹۸۵۲، المستدرك للحاكم: ۲/ ۳۶۸. ② ضعیف جدًا، اللمعة فی خصائص یوم الجمعة: ۸۸؛ کنز العمال: ۲۶۰۵؛ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ③ صحیح البخاری: ۷۸۹؛ صحیح مسلم: ۸۴۶. ④ صحیح، سنن أبی داود: ۱۰۷۸؛ سنن ابن ماجه: ۱۰۹۵. ⑤ صحیح البخاری: ۳۸۳؛ مسند أحمد: ۵/ ۴۳۸.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی روایت میں مزید تین ایام کے، کا ذکر بھی کیا کرتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نیکی کا عمل دس گنا رکھا ہے، گناہوں کی بخشش صغیرہ گناہوں کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ ابن ماجہ کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے: ((مَا لَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرَ)) ''جب تک وہ کبائر کا ارتکاب نہیں کرتا۔''[1]

④ احمد کی صحیح سند کے ساتھ روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جمعے کے دن ہر مسلمان پر حق ہے کہ غسل و مسواک کرے اور خوشبو لگائے۔''[2]

⑤ طبرانی کی اوسط اور کبیر میں ثقہ رواۃ کی سند سے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جمعہ کے دن فرمایا: ''اے اہلِ اسلام! یہ ایسا دن ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے عید بنایا ہے، تو اس روز غسل اور مسواک کیا کرو۔''[3] امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کے راوی ثقہ ہیں۔

⑥ جمعے کے لیے جلدی نکلنا

مقتدیوں کے لیے جمعے کے لیے کو جلدی جانا مندوب ہے، علقمہ کہتے ہیں میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جمعے کے لیے نکلا، تو انہوں نے پایا کہ تین لوگ ان سے بھی پہلے آچکے ہیں، تو کہنے لگے: میں آج چوتھا بنا، لیکن چوتھا بھی اللہ سے دور تو نہیں، رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا تھا: ''قیامت کے روز لوگ جمعہ کے لیے نکلنے کے حساب سے بیٹھے ہوں گے، اول پھر ثانی پھر ثالث پھر رابع اور رابع اللہ سے دور تو نہیں۔''[4] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا اور منذری نے اسے حسن قرار دیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے بروزِ جمعہ غسلِ جنابت کی مثل غسل کیا، پھر جمعے کے لیے گیا، تو گویا اس نے اونٹ کی قربانی دی اور جو دوسری ساعت میں نکلا، گویا اس نے گائے قربان کی اور جو تیسری ساعت میں نکلا گویا اس نے سینگوں والا مینڈھا قربان کیا اور جو چوتھی میں گیا، گویا اس نے مرغی اللہ کی راہ میں صدقہ کی اور جو پانچویں گھڑی پہنچا، گویا اس نے انڈا اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور جب خطیب نکل آئے، تو فرشتے (آمد کی ترتیب لکھنا ختم کر کے) وعظ سننے حاضر ہو جاتے ہیں۔''[5]
اسے سوائے ابن ماجہ کے جماعت نے نقل کیا، امام شافعی رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان ساعات سے مراد دن کی (معروف) ساعات (گھنٹے) ہیں، تو انہوں نے صبح سے ہی جمعہ کے لیے نکلنا مندوب قرار دیا، امام مالک رحمہ اللہ کا مؤقف ہے کہ یہ مذکورہ گھڑیاں دراصل ایک ساعت کے (پانچ) اجزا ہیں، جو زوال سے قبل اور اس کے بعد ہیں، بعض حضرات نے کہا: یہ قبل از زوال ساعت کے اجزا ہیں، بقول ابن رشد رحمہ اللہ یہی اظہر ہے، کیونکہ زوال کے بعد جانا تو واجب ہو جاتا ہے۔

---

① صحيح مسلم: ٢٣٣؛ سنن ابن ماجه: ١٠٨٦؛ سنن الكبرى للبيهقي: ٤١٣٥. ② صحيح، مسند أحمد: ٥/ ٣٦٣. ③ مجمع الزوائد: ٢/ ١٧٢، ١٧٣. ④ ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٠٩٤. ⑤ صحيح البخاري: ٨٨١؛ صحيح مسلم: ٨٥٠.

⑦ مسجد جا کر گردنیں پھلانگنا

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اہلِ علم سے نقل کیا کہ وہ یوم جمعہ (مسجد میں آ کر) گردنیں پھلانگنا مکروہ سمجھتے ہیں اوراس کے بارے سختی کے قائل ہیں، سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص داخل ہوا اور گردنیں پھلانگتا آگے بڑھنے لگا، آپ نے فرمایا: ''بیٹھ جاؤ، تم نے ایذا دی اور تاخیر بھی کی ہے۔''[1] اسے احمد، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا ابن خزیمہ وغیرہ نے اس پر صحت کا حکم لگایا، خطیب اس سے مستثنیٰ ہے یا جسے آگے کوئی گنجائش نظر آئی ہو اور وہاں تک پہنچنے کی یہی سبیل ہے یا ایسا شخص جو کسی مجبوری سے اٹھا تھا اور اب اپنی جگہ واپس جانا چاہتا ہے، بشرطیکہ لوگوں کی ایذا نہ ہو، سیدنا عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینہ میں نمازِ عصر ادا کی، پھر آپ نکل گئے (واپسی پر جب) دیکھا کہ آپ کی سرعت سے حاضرین متعجب ہیں، تو فرمایا: ''مجھے یاد آیا کہ کچھ سونا گھر میں رکھا ہے، تو برا جانا کہ پڑا رہے، تو اسے صدقہ کرنے کا حکم دینے گیا تھا۔''[2] اسے بخاری اور نسائی نے نقل کیا۔

⑧ جمعے سے قبل نوافل پڑھنے کی مشروعیت

جمعے سے قبل خطیب کے آنے تک نوافل میں لگے رہنا مسنون ہے، اس کے پہنچنے پر اس سے رک جائے، البتہ تحیۃ المسجد پھر بھی پڑھی جا سکتی ہے، وہ تو اثنائے خطبہ بھی پڑھی جا سکتی ہے، لیکن ہلکی پھلکی اِلَّا یہ کہ خطبہ کا آخر ہو، اس طرح کہ اب وقت تنگ ہے، تب نہ پڑھے:

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جمعے کا خطبہ شروع ہونے سے قبل نوافل پڑھتے رہتے اور جمعے کے بعد دو رکعتیں پڑھتے اور بیان کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی کرتے تھے۔[3] اسے ابوداوٗد نے نقل کیا۔

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جمعے کے دن غسل کیا، پھر جمعے کے لیے گیا اور جو مقدر میں تھا نوافل ادا کیے، پھر خاموشی سے خطبہ سنا پھر اس کے ساتھ نماز پڑھی تو اگلے جمعہ تک کے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور مزید تین دن کے بھی۔''[4] اسے مسلم نے تخریج کیا۔

③ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص داخل ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، تو آپ نے اس سے پوچھا: ''کیا سنتیں پڑھ لی ہیں؟'' اس نے کہا: نہیں، فرمایا: ''دو رکعتیں پڑھ لو۔''[5] اسے جماعت نے نقل کیا۔ ایک روایت میں ہے: ''جب کوئی جمعہ کو آئے اور امام خطبہ دے رہا ہے، تو دو مختصر سنتیں پڑھ لے۔''[6] اسے احمد، مسلم اور ابوداوٗد نے نقل کیا ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''جب کوئی جمعہ کو آئے اور خطیب آ چکا ہو (گویا ابھی خطبہ شروع نہیں کیا) تو وہ دو رکعت

---

① صحيح، سنن أبی داود: ١١١٨؛ صحيح ابن خزيمة: ١٨١١. ② صحيح البخاری: ٨٥١؛ سنن نسائی: ٣/ ٨٤.
③ صحيح، سنن أبی داود: ١١٢٨؛ مسند أحمد: ٥٨٠٧. ④ صحيح مسلم: ٨٥٧. ⑤ صحيح البخاری: ٩٣١؛ سنن ابن ماجه: ١١١٢. ⑥ صحيح، سنن أبی داود: ١١١٧؛ سنن ترمذی: ٥١٠.

پڑھ لے۔''① متفق علیہ۔

⑨ جسے اونگھ آ رہی ہے وہ جگہ بدل لے

مسجد میں موجود شخص پر اگر اونگھ کا غلبہ ہو رہا ہے، تو وہ اٹھ کر جگہ بدل لے، تا کہ اس نقل و حرکت سے اس کی اونگھ ختم ہو جائے اور وہ چوکس ہو، اس میں جمعے کا دن اور دیگر برابر ہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب مسجد میں کسی کو اونگھ آئے، تو وہ جگہ بدل لے۔''② اسے احمد، ابو داود اور بیہقی نے جبکہ ترمذی نے حسن صحیح کہہ کر نقل کی ہے۔

نمازِ جمعہ کا وجوب

علماء کا اجماع ہے کہ نمازِ جمعہ فرضِ عین ہے (ہر مکلف مسلمان پر اس کی ادائیگی فرض ہے) اور یہ دو رکعتیں ہیں، قرآن میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الجمعة: ٩)

''اے اہلِ ایمان! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے، تو اللہ کی یاد کے لیے جلدی کرو اور خرید و فروخت ترک کر دو، اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

① بخاری اور مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: ''اللہ نے جمعے کا دن سابقہ امم پر بھی فرض کیا تھا، لیکن انہوں نے اس بابت اختلاف کیا، اللہ نے اس کی ہمیں توفیق دی اور لوگ اس ضمن میں ہمارے تابع (بعد میں) ہیں کہ یہودیوں کا (تعظیم کا) دن کل (ہفتہ) اور عیسائیوں کا پرسوں (اتوار) ہے۔''③

② سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی بابت جو جمعہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں، فرمایا: ''میں نے ارادہ بنا لیا تھا کہ کسی کو نماز پڑھانے کا کہہ کر ایسوں کے گھروں کو ان سمیت جلا دوں۔''④ اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، منبر پر کھڑے فرمایا: ''لوگ جمعہ کے ترک کی روش چھوڑ دیں یا پھر اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلین میں سے ہو جائیں گے۔''⑤ اسے مسلم، احمد اور نسائی نے سیدنا ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث سے نقل کیا۔

④ سیدنا ابو جعد ضمری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ''جس نے حقیر سمجھتے ہوئے تین جمعے چھوڑے، اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔''⑥ اسے خمسہ نے تخریج کیا، احمد اور ابن ماجہ کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں اسی کی مثل مروی ہے،

---

① صحيح البخاري: ٩٣٠؛ صحيح مسلم: ٨٧٥. ② صحيح، سنن أبي داود: ١١١٩؛ سنن ترمذي: ٥٢٦.
③ صحيح البخاري: ٢٣٨؛ صحيح مسلم: ٨٥٥. ④ صحيح مسلم: ٦٥٢؛ مسند أحمد: ١/ ٤٠٢. ⑤ صحيح مسلم: ٨٦٥؛ سنن نسائي: ٣/ ٨٨، ٨٩. ⑥ صحيح، سنن أبي داود: ١٠٥٢؛ سنن ترمذي: ٥٠٠.

ابن سکن نے اسے صحیح قرار دیا۔

جمعہ کن پر واجب اور کن پر واجب نہیں

ہر مسلمان آزاد، عاقل، بالغ، مقیم اور جو مسجد جانے پر قادر ہے، پر جمعہ واجب ہے۔

درج ذیل پر یہ غیر واجب ہے:

①،② عورت اور نابالغ پر، اس پر سب کا اتفاق ہے۔

③ وہ مریض جس کے لیے مسجد جانا پر مشقت ہے یا بیماری بڑھنے کا یا شفا میں تاخیر ہونے کا اندیشہ ہے، اسی سے ملحق ہے وہ شخص جو مریض سنبھالنے کا ذمہ دار ہے، اگر ہمہ وقت اسے اس کی ضرورت ہے۔ سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''جمعہ ہر مسلمان پر حق اور واجب ہے، مگر چار قسم کے افراد: غلام (جسے اس کا آقا جمعے کی اجازت نہ دے) عورت، نابالغ اور مریض۔''[1] بقول امام نووی رحمہ اللہ اس کی اسناد بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے، بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کئی ایک نے اس پر حکمِ صحت لگایا۔

④ مسافر پر اگرچہ وہ جمعے کے وقت نازل حالت میں ہو، اکثر اہل علم کا یہی خیال ہے کہ مسافر پر بہر صورت جمعہ واجب نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسفار میں کبھی جمعہ منعقد نہیں کیا، آپ نے عرفہ میں جمعہ کے دن تھے، مگر بجائے جمعہ پڑھانے کے ظہر کے وقت میں ظہر وعصر کی جمع تقدیم سے ادائیگی کی اور یہی آپ کے بعد خلفائے راشدین نے کیا۔

⑤،⑥ قرض دار تنگ دست جسے ڈر ہے کہ اگر جمعہ پڑھنے گیا تو محبوس کر لیا جائے گا، اسی طرح وہ شخص جس کی طلب میں ظالم حاکم لگا ہوا ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اذان سنی اور نہ آیا، اس کی کوئی نماز نہیں، اِلّا یہ کہ وہ معذور ہو۔'' عرض کی: کیسا عذر؟ فرمایا: ''خوف یا مرض۔''[2] اسے ابوداود نے بسند صحیح نقل کیا۔

⑦ ہر معذور کے لیے ترکِ جماعت کی رخصت ہے

مثلاً بارش، کیچڑ، سردی اور ان جیسے اعذار، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بارش والے روز اپنے مؤذن سے کہا کہ (أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدا رسول اللّٰه) کے بعد (حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ) کی بجائے (صَلُّوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ) کہو، راوی کہتے ہیں ایسا لگا کہ لوگوں کو یہ ناگوار لگا ہے، تو کہا: یہ اس ذات نے بھی کیا جو مجھ سے بہتر ہے، بے شک جمعہ عزیمت ہے اور میں نے براجانا کہ تمہیں حرج میں ڈالوں اور تم کیچڑ میں چل کر آؤ۔[3] ابوملیح رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ جمعے کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ بارش ہوئی، حالانکہ اتنی زیادہ نہ تھی، مگر آپ نے منادی کرائی کہ گھروں میں ہی نماز پڑھ لی جائے،[4] اسے

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٠٦٧. [2] صحیح، سنن أبی داود: ٥٥١؛ سنن ابن ماجه: ٧٩٣. [3] صحیح، سنن أبی داود: ١٠٦٦؛ سنن ابن ماجه: ٩٣٨. [4] صحیح، سنن أبی داود: ١٠٥٩؛ سنن ابن ماجه: ٩٣٩.

ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا، تو ان سب مذکورین پر جمعہ واجب نہیں، بلکہ ان پر ظہر کی نماز عائد ہے اور جو ان میں سے جمعے کے لیے چلا جائے تو اس کا جمعہ صحیح ہے، اب اسے ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں، خواتین عہدِ نبوی میں جمعہ پڑھنے آیا کرتی تھیں۔

جمعے کا وقت

جمہور صحابہ و تابعین کی رائے میں جمعے کا وقت وہی ہے، جو نمازِ ظہر کا ہے، احمد، بخاری، ابو داؤد، ترمذی اور بیہقی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورج کے زوال کے بعد جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔[1] احمد اور مسلم کے ہاں سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ تب پڑھا کرتے تھے، جب سورج ڈھل جاتا (وسط آسمان سے) ہم جب واپس ہوتے تو دیواروں کا سایہ ابھی تھوڑا تھوڑا ہوتا تھا، امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جمعے کا وقت تب (شروع ہوگا) جب زوال ہو اور یہی سیدنا عمر، علی، نعمان بن بشیر اور عمرو بن حریث رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد ائمہ زوال کے بعد جمعہ کراتے تھے، حنابلہ اور اسحاق کی رائے ہے کہ جمعہ کا وقت نمازِ عید کے اول وقت سے لے کر ظہر کے آخری وقت تک ہے، ان کا استدلال احمد، مسلم اور نسائی کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے منقول روایت سے ہے کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ پڑھاتے پھر ہم سورج ڈھلنے پہ اپنے اونٹوں کی طرف جاتے اور انہیں آرام کراتے۔[2] اور اس میں تصریح ہے کہ زوال سے قبل جمعہ سے فارغ ہو لیتے تھے (روایت کے الفاظ: حین تزول الشمس کا تعلق بجائے اونٹوں کو سایہ کی جگہ بٹھلانے کے جمعے سے ہونا زیادہ محتمل ہے، تاکہ دیگر روایات سے مطابقت ہو) اسی طرح عبداللہ بن سیدان سلمی کی روایت، کہتے ہیں میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے جمعہ پڑھا، تو ان کا خطبہ و نماز نصف نہار سے قبل تھی، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھتا رہا، ان کا خطبہ و نماز بھی، اسی طرح تھی حتی کہ میں کہتا: دن کا نصف ہو گیا ہے؟ اور یہی دورِ عثمانی میں معمول رہا، حتی کہ میں پوچھتا یہ زوال کا وقت ہے؟ کسی کو نہ دیکھا کہ اس پر نکتہ چینی کرتا ہو یا اس کا انکار کرتا ہو۔[3] اسے دارقطنی اور احمد نے روایت کیا، بقول ان کے بیٹے عبداللہ کے انہوں نے اس کے ساتھ حجت لی اور کہا: سیدنا ابن مسعود، جابر، سعید اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے کہ انہوں نے زوال سے قبل نمازِ جمعہ پڑھ لی اور ان پر انکار نہیں کیا گیا: تو یہ اجماع کی مانند ہو گیا ہے، جمہور نے حدیثِ جابر کا یہ جواب دیا کہ یہ تعجیلِ نماز کے بیان میں مبالغہ پر محمول ہے، جو زوال کے بعد ہی تھی، مگر بغیر ابراد کیے کہ گرمی کی شدت ٹھہر جانے کا انتظار کیا جائے (جیسے نمازِ ظہر بارے حکم دیا تھا) اور نماز اور اونٹوں کی راحت کا کام بعد از زوال تھا، جہاں تک عبداللہ بن سیدان کا اثر تو وہ ضعیف ہے، امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تابعِ کبیر ہیں، مگر ان کا ثقہ و عدل ہونا معروف نہیں، ابن عدی رحمہ اللہ کے بقول مجہول کے مشابہ ہیں (ان کی بابت کوئی خاص معلومات نہیں) بخاری نے کہا: ان کی

---

[1] صحيح البخاري: ٩٠٤؛ سنن أبي داود: ١٠٨٤. [2] صحيح مسلم: ٨٥٨؛ سنن نسائي: ٣/ ١٠٠. [3] ضعيف، سنن دارقطني: ٢/ ١٧.

حدیث پر متابعت نہیں کی جاتی اور اس سے اقوی روایات اس کے معارض ہیں، ابن ابی شیبہ نے سوید بن غفلہ سے نقل کیا کہ انہوں نے سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بعد از زوال نمازِ جمعہ پڑھی، اس کی اسناد قوی ہے۔

لوگوں کی (کم از کم) کتنی تعداد ہو کہ جن کے ساتھ جمعے کا انعقاد ہو؟

علماء کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ جماعت کا وجود صحت جمعہ کی شروط میں سے ایک شرط ہے، سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مدنظر جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مذکور ہے کہ ''جمعہ ہر مسلمان پر با جماعت ادا کرنا حق اور واجب ہے۔'' البتہ اس تعداد میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ جمعہ منعقد ہوگا، اس ضمن میں پندرہ مذاہب ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ان کا ذکر کیا ہے، راجح رائے یہ ہے کہ کم از کم دو سامع ہونا چاہئیں، کیونکہ آپ نے فرمایا: ((اَلْاِثْنَانِ فَمَا فَوْقَهَا جَمَاعَةٌ)) ''دو اور اس سے زائد جماعت ہیں۔''[1] امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بالا جماع تمام نمازیں دو کے ساتھ منعقد ہو جائیں گی اور جمعہ بھی ایک نماز ہے، لہٰذا یہ کسی ایسے حکم کے ساتھ مختص نہیں ہو سکتی، جو دیگر کے برخلاف ہو، اِلاّ یہ کہ کوئی دلیل ہو جو کہ یہاں نہیں ہے، عبدالحق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جمعے کے حاضرین کی تعداد میں کوئی حدیث ثابت نہیں، یہی امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا: اور یہی میلان امام طبری، داؤد، نخعی اور ابن حزم رحمہ اللہ کا ہے۔

جمعہ کہاں ہو؟

جمعے کی ادائیگی شہر، بستی، مسجد، دیگر عمارتوں، ان کے صحنوں اور ملحق میدانوں میں صحیح ہے، ایک سے زائد جمعہ کے اجتماعات کا انعقاد کا اہتمام بھی صحیح ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ بحرین کو لکھا تھا کہ جہاں کہیں بھی لوگ ہیں، وہ جمعے کا اہتمام کریں،[2] اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، بقول احمد اس کی سند جید ہے اور یہ شہروں اور دیہات دونوں کو شامل ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اسلام میں مسجدِ نبوی کے بعد پہلا جمعہ بحرین کی ایک بستی جواثی میں ہوا،[3] اسے بخاری اور ابوداؤد نے نقل کیا، لیث بن سعد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اہلِ مصر اور ساحل کے باسی عہدِ عمری اور عثمانی میں ان کے حکم سے جمعہ کا اہتمام کرتے تھے، اور یہاں کئی صحابہ بھی موجود تھے۔[4] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ دیکھتے کہ مکہ اور مدینہ کے مابین موجود دیہات والے جمعہ منعقد کرتے ہیں، تو کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتے،[5] اسے عبدالرزاق نے بسندِ صحیح نقل کیا (ابن حجر کے بقول یہ صحیح الاسناد ہے)۔

---

[1] ضعیف، سنن ابن ماجه: ٩٧٢. [2] نیل الاوطار: ٢/ ٤٩٨، ٤٩٩. [3] صحیح البخاری: ٨٩٢؛ سنن أبی داود: ١٠٦٨. [4] نیل الاوطار: ٢/ ٤٩٩. [5] نیل الاوطار: ٢/ ٤٩٩.

ان شروط کے بارے میں بحث جو فقہاء نے (انعقادِ جمعہ کے ضمن میں) عائد کیں

پہلے گزرا کہ وجوب جمعہ کی شروط میں مرد، آزاد، مقیم اور کسی ایسے عذر سے خالی ہونا، جو (شرعاً) جمعہ چھوڑ دینے کا موجب بنے اور جیسا کہ ذکر ہوا جمعہ کے انعقاد کی صحت کے لیے جماعت کا ہونا مشروط ہے، تو سنت میں بس یہی قدر مذکور ہوئی ہے اور اس کا ہمیں مکلف کیا ہے، اس کے علاوہ جو بعض فقہا نے کچھ اور شروط عائد کی ہیں، تو وہ کتاب وسنت سے کسی اصل کی طرف راجع نہیں اور نہ ان کا کوئی مستند ہے، ہم یہاں الروضہ الندیہ کے مصنف کی اس بات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں کہ جمعہ دیگر نمازوں ہی کی طرح ہے، ان سے مختلف نہیں، کیونکہ اس کے عام نمازوں سے مختلف ہونے کی کوئی دلیل وارد نہیں، اس کلام میں بعض کی عائد کردہ ان شروط کا رد ہے کہ جمعہ کے انعقاد کی شروط میں سے امامِ اعظم (صدر یا وزیرِ اعظم یا بادشاہ) کا موجود ہونا اور مصرِ جامع (بڑا شہر) اور حاضرین کی مخصوص تعداد تو ان شروط کے لیے کوئی دلیل نہیں، جو ان کے استحباب کا بھی اثبات کرے، چہ جائے کہ انہیں واجب یا شرط کہیں، بلکہ اگر کسی جگہ دو آدمی جمع تھے (مسجد یا ایسی عمارت میں جہاں نماز باجماعت کا باقاعدہ اہتمام ہوتا ہو تو اس لحاظ سے میرے خیال میں جمعہ باقی نمازوں سے مختلف ہے کہ کہیں ثابت نہیں کہ سلف میں سے کسی نے گھر میں جمعہ کرایا ہو، جیسے جماعت کرالی جاتی ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں افراط اور تفریط دونوں سے پرہیز ضروری ہے) اور انہوں نے جمعہ کرالیا، کوئی تیسرا حاضر نہ تھا، تو انہوں نے اپنے آپ پر عائد واجب کی ادائیگی کر لی، اگر ان میں سے ایک نے خطبہ دے دیا، تو یہ عمل بالسنت ہوگیا اور اگر خطبہ ترک بھی کر دیا، تو حرج نہیں، کیونکہ یہ سنت ہے (مصنف کی یہ کلام ان کی سابقہ کلام کے متضاد ہے، پہلے لکھا کہ جمعہ واجب ہے، جمعہ صرف دو رکعتوں کا نام نہیں کہ بس وہی واجب ہوں، بلکہ خطبہ اور نماز) اگر سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت نہ ہوتی تو ایک آدمی کا فعل (جمعہ کی اقامت) بھی کفایت کرنے والا ہوتا، جیسے دیگر نمازیں ہیں (وہ ایک سے کب باجماعت منعقد ہوتی ہیں؟) جہاں تک روایت میں یہ جو ذکر کیا جاتا ہے: (مِنْ أَرْبَعَةٍ إِلَى الْوُلَاةِ) ''خطیب سمیت چار عدد ہوں۔'' تو محدثین نے تصریح کی ہے کہ یہ کلامِ نبوت میں سے نہیں اور نہ کسی صحابی کی کلام ہے کہ اس کے معنی کے بیان یا تاویل کرنے کی ضرورت ہو، یہ تو حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے، لہٰذا اس فاضل عبادت کی نسبت جسے اللہ نے ہفتہ میں ایک بار فرض کیا ہے اور اسے شعائرِ اسلام میں سے ایک شعار بنایا ہے، یعنی نمازِ جمعہ، ان ساقط اقوال اور جعلی مذاہب اور نا درست اجتہادات کو جو پیشِ نظر رکھے، اس پر تعجب ہی کیا جائے گا، کسی کہنے والے نے کہا: خطبہ دو رکعتوں کی طرح ہے، تو جس سے یہ فوت ہوا اس کا جمعہ نہ ہوا، گویا اسے متعدد طرق کے ساتھ وارد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں پہنچا کہ ''جس سے جمعہ کی ایک رکعت رہ گئی (وہ دوسری رکعت میں مسجد آیا) وہ اب ایک اور رکعت ملا لے تو اس کی نماز تام ہوئی۔''[1] اور نہ اس قائل کو اس کے علاوہ کوئی دیگر حدیث ملی۔

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ١١٢١.

بعض نے کہا: امام کے ساتھ کم از کم تین لوگ ہوں، تو جمعہ منعقد ہوگا، بعض نے چار کہا، اسی طرح سات، نو، بارہ، بیس، تیس، چالیس، پچاس، ستر اور کئی دیگر اقوال بھی ملتے ہیں، بعض نے بغیر تقیید کے کثیر لوگ کہا، بعض نے قرار دیا کہ جمعہ صرف بڑے شہر میں ہوگا، بعض نے اس کی تعریف یہ کی کہ جس کے باسیوں کی تعداد اتنے ہزار ہو، بعض نے کہا: جس میں جامع (مسجد) اور حمام ہو (اجتماعی غسل خانے، در اصل خلفائے بنی امیہ کے اور دیگر مابعد ادوار میں سرکاری طور سے اجتماعی حمام ہوتے تھے) بعض نے اور باتیں بھی کہیں، ایک نے کہا: جمعہ واجب نہ ہوگا مگر امامِ اعظم کے ساتھ، اگر وہ حاضر نہیں یا کسی وجہ سے وہ مختل العدالت (نااہل اور فاسق و فاجر یا کوئی اور عیب والا) ہے تو جمعہ واجب اور مشروع نہ ہوگا اور اس طرح کے دیگر اقوال جو کم علمی کے غماز اور عالمانہ شان کے برخلاف ہیں اور نہ اس بارے میں کتاب وسنت میں ایک حرف بھی موجود ہے، جو ان اقوال کو یا ان میں سے کسی کے صحتِ جمعہ کی شرط یا اس کے فرائض میں سے ایک فرض یا ارکان میں سے ایک رکن ہونے پر دلیل ہو، تو نہایت تعجب ہے، ان حضرات پر جنھوں نے ذاتی رائے سے یہ سب باتیں کہیں، ان کا شریعتِ مطہرہ سے کوئی تعلق نہیں، یہ سب ان کی ذہنی سوچ کا نتیجہ ہے، کتاب وسنت کا ہر عارف انصاف پسند اسے جانتا ہے۔

اس ضمن میں ثالث کتاب اللہ اور سنتِ رسول ہے، جیسے قرآن نے کہا:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء:۵۹)

''اگر آپس میں تنازع ہو تو اللہ ورسول کی طرف رجوع کرو۔''

اور ﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾

''مومنوں کی روش یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ وہ ان میں فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا، اور مان لیا۔'' (النور:۵۱)

اور: ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ (النساء: ٦٥)

''تمہارے رب کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگی نہ محسوس کریں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

تو ان سے واضح طور ثابت ہوا کہ ہر قسم کے تنازعات میں مرجع اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول ہے، ان کے سوا اللہ نے کسی بندے کو حق نہیں دیا، اگرچہ وہ علم وفضل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کہ وہ شرعی امور میں ذاتی رائے سے کوئی بات طے کرے، جس پر کتاب وسنت کی کوئی دلیل نہ ہو، اگر مجتہد کے لیے رخصت ہے کہ عدم دلیل کی صورت میں اپنی رائے پر عمل کرلے تو غیرِ مجتہد کو حق حاصل نہیں کہ اس کی رائے پر عمل پیرا ہو (تقلید کرے) مجتہد چاہے جو کوئی بھی ہو (تو غیر مجتہد یعنی عوام الناس خود تو اس قابل نہیں کہ شرعی احکام کی تفاصیل خود جان پائیں، پھر کیسے معاملہ چلے گا؟ آگے مصنف نے اس روش پر سخت تنقید کی ہے کہ

ذاتی رائے پر مبنی تفاصیل وشروط عائد کی جائیں اور اس روش پر بھی کہ بلا سوچے سمجھے، ان اقوال کا اخذ اور ان ائمہ کی تقلید کی جائے ، لکھتے ہیں) اس ضمن میں میری تنقید کسی ایک مسلک کے ساتھ مختص نہیں اور نہ کسی ایک علاقہ کے ساتھ ، بلکہ عمومی ہے اور امرِ واقع یہ ہے کہ بعد والے پہلوں کے تابع بنے ہوئے ہیں اور یوں سختی سے عمل پیرا ہیں، گویا یہ سب قرآن میں موجود ہوں، حالانکہ یہ حدیثِ خرافہ ہے (خرافہ جس کی جمع خرافات ہے، دراصل مکہ کا ایک باشندہ تھا، جو کئی برس غائب رہا، ایک دن واپس ہوا اور دعوی کیا کہ اسے جن اپنے ساتھ لے گئے تھے اور یہ سب عرصہ اس نے ان کے ساتھ گزارا ہے اور جنوں کے بارے عجیب وغریب حکایات اور باتیں بیان کیں، تو ہر عجیب وغریب بات پر جس کی اصل کا علم نہ ہوا حدیثِ خرافہ کا اطلاق کیا جائے گا جو مرورِ ایام سے خرافات ہوگیا) آخرِ مبحث لکھتے ہیں: اس عبادت میں جیسا کہ ذکر گزرا بغیر برہان، قرآن، شرع اور عقل کے شروط کثیر ہوئیں۔

خطبہ جمعہ

خطبہ جمعہ کا حکم

جمہور اہلِ علم خطبہ جمعہ کے وجوب کے قائل ہیں ، ان کا استدلال نبی کریم ﷺ سے مروی ثابت روایات سے ہے، جن میں مذکور ہے کہ آپ نے ہر جمعہ کو خطبہ دیا، نیز آپ کی اس عمومی ہدایت سے بھی: « صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ » [1]
اور جو قرآن میں اللہ تعالٰی نے ارشاد کیا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ (الجمعة:٩)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔''

تو ذکر کی طرف اس امر بالسعی سے اس کا وجوب ظاہر ہے، کیونکہ غیرِ واجب کے لیے سعی واجب نہیں، انہوں نے (آیت میں مذکور) ذکر کے لفظ کو خطبے کے ساتھ مفسر کیا ہے، کیونکہ وہ اس پر مشتمل ہوتا ہے، امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان ادلہ کا مناقشہ کیا ،پہلی دلیل کا جواب یہ دیا کہ مجرد فعل وجوب کا افادہ نہیں دے سکتا، دوسری دلیل کا جواب دیا کہ اس میں فقط اتنا ہی مذکور ہے کہ نماز کا اس صفت پر ایقاع کیا جائے اور خطبہ نماز نہیں، تیسری کا جواب دیتے ہوئے کہا: جس ذکر کی طرف سعی کا حکم دیا، وہ نماز ہے، غایتِ امر یہ ہے کہ دونوں مراد لی جائیں اور وجوبِ نماز پر اتفاق واقع ہوا ہے، جبکہ وجوبِ خطبہ بابت نزاع ہے، تو وجوب کے لیے یہ دلیل کے بطور قوی نہیں ، پھر لکھا ظاہر وہی جو حسن بصری ، داود ظاہری اور جوینی

[1] صحيح البخاري: ٦٣١؛ صحيح ابن خزيمة: ٣٩٧.

(بقول محشی اور عبدالمالک بن حبیب اور مالکیہ کے ابن ماجشون) کی رائے ہے کہ خطبہ فقط مندوب ہے۔

امام کے منبر پر چڑھنے کے بعد سلام کہنے، منبر پر بیٹھ جانے پر، اذان ہونے اور حاضرین کا اپنا رخ خطیب کی طرف کر لینے کا استحباب

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھتے تو سلام کہتے،[1] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا اور اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔ یہی روایت اثرم کی سنن میں شعبی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً مذکور ہے، مراسیلِ عطاء وغیرہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر جلوہ افروز ہوتے، تو رخِ انور لوگوں کی طرف کرتے اور کہتے: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ» بقول شعبی سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی یہی کیا کرتے تھے! سائب بن یزید سے منقول ہے کہ عہدِ نبوی میں جمعہ کے دن اذان تب دی جاتی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہو جاتے (اس سے قبل اذان نہ ہوتی تھی، یہ جسے ہم پہلی اذان کہتے ہیں اس کا رواج تب ہوا) جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور لوگوں کی کثرت ہوئی، تو انہوں نے زوراء (جو بازار سے متصل ایک جگہ تھی) پر ایک اور اذان کہلوانا شروع کر دی (یعنی اس اذان سے قبل جو خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف ایک موذن تھا۔[2] (یہ بات اس تناظر میں کہی کہ اموی دور میں جمعے کے دن دمشق وغیرہ میں بیک وقت کئی موذنین اذانیں دیتے تھے، تاکہ ہر چہار اطراف کے لوگ سن سکیں) اسے بخاری، نسائی اور ابوداود نے نقل کیا، انہی کے ہاں ایک روایت میں ہے کہ دورِ عثمانی میں ایک اذان ہوتی تھی (جسے روایات میں تیسری اذان اس اعتبار سے کہا گیا کہ پہلی اذان وہ جو خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے بعد ہوتی تھی اور دوسری اذان سے مراد جماعت کی اقامت اور اس اذانِ عثمانی پر تیسری کا اطلاق باعتبارِ زمن کے ہوا، کیونکہ متاخر زمانہ میں اس کا ایقاع ہوا، حالانکہ وقت کے لحاظ سے یہ پہلی ہوئی، چنانچہ ہم آج اسے پہلی کا نام ہی دیتے ہیں) تو معاملہ اسی پر ثابت ہوا (جو آج تک ہے) احمد اور نسائی کے ہاں ایک روایت میں ہے کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بیٹھ جانے کے بعد اذان دیتے تھے اور اقامت تب کہتے، جب آپ منبر سے اتر آتے، عدی بن ثابت اپنے والد اور وہ ان کے دادا سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر کھڑے ہوتے، تو حاضرین اپنے چہرے آپ کی طرف کر لیتے تھے۔[3] اسے ابن ماجہ نے تخریج کیا، اگرچہ اس میں مقال ہے البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھا: صحابہ وغیرہم کے اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے اور وہ دورانِ خطبہ چہرہ امام کی طرف کرنا مستحب قرار دیتے ہیں۔

خطبہِ جمعہ کے اللہ کی حمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا و توصیف، وعظ اور قراءت پر مشتمل ہونے کا استحباب

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر کلام جس کی ابتدا اللہ کی حمد سے نہ کی جائے، وہ اجذم

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ۱۱۰۹؛ سنن الکبری للبیهقی: ۳/ ۲۰۴، ۲۰۵. [2] صحیح البخاری: ۹۱۲؛ سنن أبی داود: ۱۰۸۷. [3] صحیح، سنن ابن ماجه: ۱۱۳۶.

(ناقص) ہے۔"[1] اسے ابوداود اور احمد نے بالمعنی نقل کیا، ایک روایت میں ہے "جس خطبہ میں شہادت (کا کلمہ) نہ ہو وہ یدِ جذماء (کوڑھ زدہ ہاتھ) کی طرح ہے۔"[2] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ تشہد پڑھتے (جمعہ کا خطبہ مسنونہ) تو یہ الفاظ کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ أَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِيْراً بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَإِنَّهٗ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئاً»[3] ابن شہاب رحمہ اللہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشہد (خطبہ مسنونہ) کے بارے پوچھا گیا، تو اسی طرح کہا البتہ کہا: «وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى»[4] یہ دونوں روایتیں ابوداود نے نقل کیں، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کھڑے ہو کر خطبہ (جمعہ) دیتے اور دو خطبوں کے مابین (کچھ دیر) بیٹھتے تھے اور خطبے میں آیات کی قراءت کرتے اور لوگوں کی تذکیر فرماتے۔[5] اسے سوائے بخاری اور ترمذی کے جماعت نے تخریج کیا، انھی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن لمبی تقریر نہ کرتے تھے، بس چند مختصر باتیں ہوتیں۔[6] اسے ابوداود نے نقل کیا، سیدہ ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے سورۂ ق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر یاد کر لی کہ آپ ہر جمعے منبر پر اس کی قراءت کیا کرتے تھے، جب لوگوں کو خطبہ دیتے۔[7] اسے احمد، مسلم، نسائی اور ابو داود نے نقل کیا سیدنا یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر «وَنَادَوْا يَا مَالِكُ»[8] (الزخرف: ۷۷) پڑھتے سنا۔ متفق علیہ، ابن ماجہ کی سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے جمعے کے دن وعظ کرتے ہوئے سورۂ تبارک پڑھی،[9] الروضہ میں ہے جاننا چاہیے کہ مشروع خطبہ وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ اس میں لوگوں کو ترغیب و ترہیب دلاتے، تو درحقیقت یہی خطبہ کی روح ہے، جس کی خاطر اسے مشروع کیا گیا، جہاں تک اللہ کی حمد، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور قرآن میں سے کچھ پڑھ لینا تو یہ سب شریعتِ خطبہ کے اصل مقصود سے خارج ہے اس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں وجود اس امر کی دلیل نہیں کہ یہی حتمی طور سے مقصود اور خطبۂ جمعہ کی لازمی شرط ہے، کوئی منصف مزاج اختلاف نہ کرے گا کہ اصل مقصود وعظ و تذکیر ہے نہ کہ جو آغاز میں حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام کے کلمات ادا ہوئے۔ عربوں کا (بعثت کے بعد سے) عرف چلا آرہا ہے کہ جب کوئی تقریر کے لیے کھڑا ہوتا، تو شروع میں اللہ کی حمد و ثنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتا، یہ بہت عمدہ اور حسن ہے، لیکن یہ مقصود نہیں بلکہ مقصود اس کا مابعد ہے، اگر ایسا ہو کہ کسی مجلس میں کوئی خطیب کھڑا ہو اور اس کے خطبہ و تقریر کا موضوع اور باعث صرف حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام ہو، تو یہ مقبول بات نہ ہوگی (کیونکہ یہ تو کوئی بھی اور بیٹھے بیٹھے بھی کر سکتا ہے) بلکہ یہ ذوقِ سلیم

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٤٨٤١، مسند أحمد: ٢/ ٣٠٢. [2] صحيح، سنن ترمذي: ١١٠٦. [3] ضعيف، سنن أبي داود: ١٠٩٧. [4] ضعيف، سنن أبي داود: ١٠٩٨. [5] صحيح مسلم: ٨٦٢؛ سنن أبي داود: ١٠٩٤؛ ابن ماجه: ١١٠٤. [6] حسن، سنن أبي داود: ١١٠٧. [7] صحيح مسلم: ٨٧٣؛ سنن أبي داود: ١١٠٢؛ سنن نسائي: ٣/ ١٠٣. [8] صحيح البخاري: ٣٢٣٠؛ صحيح مسلم: ٨٧١. [9] صحيح، سنن ابن ماجه: ١١١١.

پر گراں گزرے گا، تو یہ سب متقرر ہونے کے بعد واضح ہوا کہ خطبہ جمعہ کو وعظ ونصیحت کی غرض سے مشروع کیا گیا ہے، اگر خطیب نے یہ کیا تو گویا امرِ مشروع کر لیا، البتہ آغاز میں حمد وثنا اور صلاۃ وسلام اور درمیان میں (یا کسی بھی مرحلہ پر) آیاتِ قرآنی کی قراءت کرنا، یا قرآن کے حوالے سے بات کرنا اتم واحسن ہے۔

دونوں خطبے کھڑے ہو کر دینے اور دونوں کے درمیان ہلکا سا بیٹھنے کی مشروعیت

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر دیتے تھے، پھر بیٹھ جاتے اور پھر کھڑے ہوتے (دوسرے خطبہ کے لیے) جیسے تم آج کل کرتے ہو۔[1] اسے جماعت نے تخریج کیا، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کھڑے ہو کر دونوں خطبے دیتے اور دونوں کے درمیان تھوڑی دیر بیٹھتے تھے، تو جو کہے کہ آپ بیٹھ کر خطبے دیتے تھے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے دو ہزار سے زیادہ مرتبہ آپ کے ہمراہ نماز پڑھی ہے (نمازِ پنجگانہ اتنی مدت آپ کی صحبت میں رہا ہوں، کبھی نہیں دیکھا کہ بیٹھ کر خطبہ جمعہ دیا ہو)[2] اسے احمد، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا، ابن ابی شیبہ نے طاؤس سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابو بکر، عمر اور عثمان نے ہمیشہ کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ سب سے پہلے بیٹھ کر خطبہ دینے والے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے[3] (یہ جب وہ بہت بوڑھے ہو گئے، جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے، یہ بھی مذکور ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ آخری عمر میں خطبہ تو کھڑے ہو کر دیتے، مگر تھک جاتے تو سانس لینے کو دم بھر بیٹھ جاتے، مگر اس دوران میں خاموش رہتے تھے) امام شعبی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تب بیٹھے، جب ان کا جسم بھاری ہو گیا اور خاصے لحیم وشحیم ہو گئے تھے، بعض ائمہ نے خطبہ دیتے ہوئے اور دو خطبوں کے درمیان ذرا بیٹھ جانے کو واجب قرار دیا اور اس کا اخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کے فعل سے کیا، لیکن مجرد فعل وجوب کا افادہ نہیں دیا کرتا۔

خطبہ میں آواز بلند رکھنے (اگر لاؤڈ سپیکر نہیں) اور اسے مختصر رکھنے اور تیاری کر کے دینے کا استحباب

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا فرمایا: ''آدمی کی نماز کا طویل اور خطبہ کا مختصر ہونا، اس کی فقہ (سمجھ داری) کی علامت ہے، تو نماز (نمازِ جمعہ) کو لمبا کرو اور خطبہ کو مختصر رکھو۔'' (افسوس آج کل اس کا الٹ ہے)[4] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، اس امر کو اس کے فقیہ ہونے کی علامت اس لیے قرار دیا، کیونکہ فقیہ نپے تلے الفاظ بولنے پر قادر ہے، تو وہ مختصر مگر جامع گفتگو کرے گا، سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز معتدل ہوتی تھی، اسی طرح آپ کا خطبہ جمعہ بھی۔[5] اسے سوائے بخاری اور ابو داود کے جماعت نے نقل کیا، سیدنا عبد اللہ بن ابو اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کی نسبت نماز کو طویل رکھتے تھے۔[6] اسے نسائی نے صحیح سند سے نقل کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ

---

[1] صحیح البخاری: ۹۲۸؛ صحیح مسلم: ۸۶۱. [2] صحیح مسلم: ۸۶۶؛ سنن أبی داود: ۱۱۰۱؛ سنن ابن ماجه: ۱۱۰۵. [3] المصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۱۱۲. [4] صحیح مسلم: ۸۶۹؛ مسند أحمد: ٤/ ۲٦۳.
[5] صحیح مسلم: ۸٦٦؛ سنن ترمذی: ۵۰۷. [6] صحیح، سنن نسائی: ۳/ ۱۰۹.

جب آپ خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ جاتیں (آخرت کا تصور کر کے)، آواز بلند ہو جاتی اور بڑے سنجیدہ رہتے۔ (ہمارے کچھ خطبا کی طرح نہیں کہ خطاب دلپذیر بھی اور لمبا بھی، پھر لوگوں کو بوریت سے بچانے کے لیے جا بجا شعروشاعری، تو اس طرح سارا تاثر جاتا رہتا ہے، ہمارے لڑکپن میں عام کہتے اور سنتے آج فلاں صاحب نے یوں کہا، آج فلاں صاحب بہت گرجے، کبھی نہ سنا کہ آج بڑا اثر ہوا اور ہم نے فلاں فلاں کوتاہیاں چھوڑنے کا عزم کر لیا، اللہ ہدایت دے) لگتا آپ کسی (حملہ آور) لشکر سے ڈرا رہے ہیں، کہتے: «صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ» ''دشمن صبح کو حملہ آور ہوا ہی چاہتا ہے یا شام کو (یہ انداز ہوتا)۔''[1] اسے مسلم اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

امام نووی رحمہ اللہ کا قول

مستحب ہے کہ خطبہ فصیح، بلیغ، منظم اور واضح ہو، بغیر تمطیط اور تقعیر کے (سُر اور طرزیں نکالے بغیر) نہ تو مسجع و مقفع ہو اور نہ بازاری الفاظ استعمال کرے، کیونکہ یہ اثر سے خالی ہوں گے اور نہ ہی وحشی (متروک اور ثقیل) الفاظ ہوں کہ سمجھ ہی نہ آسکیں، بلکہ عام فہم اور پُرشوکت الفاظ استعمال کیے جائیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کا قول

نبی کریم ﷺ کے خطبات اللہ تعالیٰ، فرشتوں، اس کی کتب، اس کے رسل، اس کی ملاقات، جنت و دوزخ، جو اللہ نے اپنے اولیا کے لیے اور جو اپنے اعدا اور اہلِ معصیت کے لیے تیار کر رکھا ہے، کے ذکر اور راہِ طاعت کے اصول کی تذکیر و تقریر پر مشتمل ہوتے تھے اور حاضرین کے دل ایمان و توحید سے بھر جاتے اور اللہ اور اس کے ایام (جو اس نے سابقہ اقوام پر عذاب کیا) کی معرفت سے لبریز ہو جاتے، آپ عام خطبا کی مثل نہ تھے (جو بعض شعلہ بیان اور بعض شیریں سخن و بیان ہوتے ہیں اور طرزیں نکالتے ہیں اور لوگ بس طرزوں میں مگن اور سر دھنتے ہی رہ جاتے ہیں) عام خطبے خلائق کے مابین مشترک امور کا افادہ دیتے ہیں اور یہ زندگی کا نوحہ اور موت سے تخویف (اللہ و رسول کی باتوں کی بجائے روزمرہ کے موضوعات و مسائل پر بات ہوتی ہے) تو یہ نہ دل میں ایمان و توحید کی تحصیل کا ساماں کرتے ہیں اور نہ معرفتِ خاصہ عطا کرتے ہیں اور نہ ان میں اللہ کے ایام کی تذکیر ہے، نہ اس کی محبت پیدا کرنے اور اس سے لقاء کی تشویق، تو سامعین اس حال میں تقریر سن کر نکلتے ہیں کہ کچھ دینی استفادہ نہیں کیا اور کچھ تغیر حاصل نہ ہوا (بلکہ صرف ذوق کی تسکین ہوئی) ہائے کاش! میں جان پاؤں، ان تقریروں سے کون سا ایمان اور کس قسم کی توحید کی تحصیل ہوئی؟ اور کیا علمِ نافع ملا؟

جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے خطبوں میں تامل کرے، وہ انہیں ہدایت، توحید، صفاتِ ربانی، اصولِ ایمان، دعوت الی اللہ اور اس کی صفات اور نعمتوں کے ذکر کا کفیل پائے گا، جس سے دلوں میں اس کی محبت بڑھتی تھی اور اسی طرح اس کے عذاب سے

---

[1] صحیح مسلم: ٨٦٧؛ سنن ابن ماجه: ٥٤.

خوف کا احساس بھی، اور لوگ اس کے ذکر و شکر کی طرف مائل ہوتے تھے، تو ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت ، اس کے اسما و صفات کا ذکر موجزن ہوتا اور اس حال میں اٹھتے کہ اللہ کی محبت ان کے دلوں میں جاگزین ہو چکی ہوتی، اب اس کی مکمل اطاعت کے لیے کمر کس لینے کا عزم باندھ لیتے، پھر جوں جوں زمانہ گزرتا اور نورِ نبوت مخفی ہوتا گیا، اور شرائع اور دینی تعلیمات محض رسوم بن کر رہ گئیں (بقول شاعر: رہ گئی رسمِ اذان روحِ بلالی نہ رہی) تو اب بس ظاہری نمود و نمائش ہی باقی رہی، شریعت کے حقائق اور مقاصد نظروں سے اوجھل ہو گئے اور لوگوں نے رسوم و رواج کو سنت کا نام دے دیا اور ان کے خطیبوں کا مطمح نظر یہ بن گیا کہ الفاظ پُر شوکت اور انداز دلپذیر ہو، تو مسجع و مقفع اور علمِ بدیع سے آراستہ عبارات کے نمونے پیش ہونے لگے، جن سے سامعین کے قلوب کو کچھ حاصل نہیں ہوتا (صرف کان مستفید و متلذذ ہوتے ہیں) اور مقصود فوت ہو جاتا ہے۔

کسی عارضی امر کی وجہ سے خطبہ کو عارضی طور سے روک دینا

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما مسجد میں آئے، دونوں نے سرخ قمیصیں پہنی ہوئی تھیں اور گرتے پڑتے آگے کی جانب رواں دواں تھے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر آئے ، انہیں اٹھایا اور اپنے آگے بٹھلایا، پھر فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول نے بجا کہا کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں، میری ان بچوں پر جب نظر پڑی، تو صبر نہ کر سکا، تو خطبہ منقطع کر کے انہیں اٹھایا ہے۔''[1] اسے خمسہ نے تخریج کیا۔ سیدنا ابورفاعہ عدوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں (لوگوں کو پھلانگتا ہوا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا اور آپ خطبہ دے رہے تھے، تو عرض کی: یا رسول اللہ! میں ایک غریب الدیار مسافر ہوں، نہیں جانتا دین کیا ہے، تو اس بارے میں جاننا چاہتا ہوں ، آپ میری طرف متوجہ ہوئے ، خطبہ موقوف کیا اور نیچے اتر آئے ، ایک لکڑی کی کرسی لائی گئی، جس کے پائے لوہے کے تھے، آپ اس پر تشریف فرما ہوئے اور مجھے دین کی تعلیم دینے لگے، پھر اٹھے اور خطبہ مکمل کیا۔[2] اسے مسلم اور نسائی نے نقل کیا۔

امام بن قیم رحمہ اللہ کا قول

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت کے تحت یا کسی صحابی کے سوال کے باعث عارضی طور پر خطبہ روک دیتے تھے، پہلے جواب دیتے اور پھر خطبہ مکمل کرتے، کئی دفعہ کسی ضرورت کے مدنظر منبر سے اتر آئے ، پھر واپس ہوتے اور خطبہ مکمل فرماتے، آپ خطبہ کے اثنا کسی سے مخاطب ہو کر بات بھی کر لیتے تھے مثلاً اے فلاں! بیٹھ جاؤ یا اے فلاں! سنتیں پڑھ لو اور کئی دفعہ حالات کے مناسب احکامات بھی جاری کرتے۔

دورانِ خطبہ گفتگو کرنے کی حرمت

جمہور وجوبِ انصات (مکمل خاموشی) اور اثنائے خطبہ حرمتِ کلام کی رائے رکھتے ہیں، کوئی نیکی کی بات یا حکم بھی نہیں دینا

---

[1] صحیح۔ سنن أبی داود: ۱۱۰۹؛ سنن ترمذی: ۲۷۷٤. [2] صحیح مسلم: ۸۷٦؛ سنن نسائی: ۸/ ۲۲۰.

یا منکر سے نہی، چاہے وہ خطبہ سن رہا ہو (آواز آ رہی ہو) یا نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے خطبہ کے دوران میں بات کی وہ اس گدھے کی مثل ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں اور جس نے کسی سے کہا: چپ ہو جاؤ، اس کا بھی اب جمعہ نہیں۔''[1] اسے احمد، ابن ابی شیبہ، بزار اور طبرانی نے نقل کیا، ابن حجر رحمہ اللہ بلوغ المرام میں لکھتے ہیں: اس کی سند جید ہے، سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جمعہ میں تین طرح کے لوگ حاضر ہوتے ہیں:

① جس نے مسجد میں لغو کیا (بجائے خطبہ سننے کے کسی کام میں مشغول ہوا) تو اسے جمعہ سے یہی کچھ ملا (ثواب سے محروم ہے)

② جو دعا کرتا رہا (اثنائے خطبہ) تو اللہ چاہے، تو اسے عطا کر دے یا چاہے تو عطا نہ کرے (اسے بھی خطبہ کا ثواب نہ ملا، البتہ اس کا معاملہ پہلے سے مختلف ہے کہ یہ دعا میں لگا رہا، اگر اس کی دعا اللہ نے قبول کر لی، تو جمعہ سے اس کا یہی حظ ونصیب ہے)

③ جس نے مکمل خاموشی سے جمعہ سنا، کسی مسلمان کی گردن نہ پھلانگی اور نہ کسی کی ایذا رسانی کی تو ایسوں کے لیے جمعہ اگلے دس ایام کے (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے (دس دن اس کے لیے) کیونکہ اللہ فرماتا ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ١٦٠)[2] اسے احمد اور ابوداود نے جید سند سے نقل کیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر جمعے کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہے، کسی سے کہا: خاموش رہو، تو تم نے لغو کیا۔'' (یعنی اتنا کہنے سے بھی ثواب سے محرومی ہوگی)[3] اسے سوائے ابن ماجہ کے جماعت نے نقل کیا۔''

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے، خطبہ شروع کیا اور کسی آیت کی تلاوت کرنے لگے، میرے پہلو میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے، میں نے ان سے کہا: اے اُبی! یہ آیت کب نازل ہوئی تھی؟ وہ بالکل خاموش رہے، میں نے پھر پوچھا: وہ پھر چپ رہے، خطبہ ختم ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتر آئے، تو سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ مجھ سے کہنے لگے تمہارے لیے اس جمعہ سے بس یہی ہے، جو تم نے لغو کیا (یہ بات کی) سلام کے بعد میں آگے ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ سنایا تو فرمایا: ''اُبی (رضی اللہ عنہ) نے ٹھیک کہا، جب خطیب خطبہ دے رہا ہو، تو اس کے فارغ ہونے تک مکمل خاموشی اختیار کرو۔''[4]

اسے احمد اور طبرانی نے نقل کیا، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس حکم سے ان لوگوں کو خارج کیا، جن تک خطیب کی آواز نہیں پہنچ رہی، اگرچہ ان کے لیے خاموش رہنا مستحب قرار دیا، ترمذی نے امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ سے خطبہ کے دوران سلام میں کا جواب دینے اور چھینک مار کر الحمد للہ کہنے والے کو شرعی جواب دینے کی رخصت نقل کی، امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے اگر کسی نے دورانِ میں خطبہ میں تشمیتِ عاطس کیا، تو مجھے امید ہے، اس کے ثواب میں فرق نہ پڑے گا، کیونکہ تشمیت سنت ہے، ہاں سلام کہنے کو میں مکروہ سمجھتا ہوں، البتہ جواب دینے میں حرج نہیں سمجھتا، کیونکہ سلام کرنا سنت مگر جواب دینا فرض ہے۔

---

① ضعيف، مسند أحمد: ١/ ٢٢٠. ② حسن، سنن أبي داود: ١١١٣. ③ صحيح البخاري: ٩٣٤؛ صحيح مسلم: ٨٥١؛ سنن أبي داود: ١١١٢. ④ صحيح، مسند أحمد: ٥/ ١٩٨؛ مجمع الزوائد: ٢/ ١٨٥.

جب خطبہ نہ ہو رہا ہو (مثلاً دو خطبوں کا درمیانی وقفہ یا خطیب نے عارضی طور پر خطبہ منقطع کیا ہے) تب کلام کر لینا جائز ہے، ثعلبہ بن ابو مالک کہتے ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ چکے ہوتے، تو لوگ آپس میں گفتگو کر لیتے حتیٰ کہ اذان ختم ہوتی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر خطبہ شروع کرتے، تب دونوں خطبے ختم ہونے تک کوئی نہ بولتا، پھر جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ منبر سے اتر آتے، تو پھر بھی نماز شروع ہونے تک کسی نے کسی سے کوئی بات کرنی ہوتی تو کر لیتا،[1] اسے شافعی نے اپنی مسند میں نقل کیا، احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اقامت کے دوران میں خود بھی لوگوں سے حال چال اور قیمتوں کے بارے میں بات کر لیتے تھے۔

نمازِ جمعہ کی ایک رکعت یا اس سے بھی کم کا پانا

اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ جسے امام کے ساتھ نمازِ جمعہ کی (کم از کم) ایک رکعت مل گئی، وہ جمعے کا مدرک ہوا، اب (سلام کے بعد) وہ (تین نہیں بلکہ) ایک مزید پڑھ کر نمازِ جمعہ مکمل کر لے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ''جس نے نمازِ جمعہ کی ایک رکعت پالی، وہ اس کے ساتھ دوسری ملا لے اس کی نماز مکمل ہو جائے گی۔''[2] اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے تخریج کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا لیکن ابوحاتم نے اس کا مرسل ہونا قوی قرار دیا ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے (کسی) نماز کی ایک رکعت ملی (گویا) اس نے اس پوری نماز کو پالیا۔''[3] اسے جماعت نے نقل کیا، لیکن جسے ایک سے کم رکعت ملی، وہ جمعہ کا مدرک نہ بنا، اکثر علماء کے مطابق اسے اب ظہر کی نماز کے طور پر چار رکعتیں پڑھنا ہوں گی، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جسے جمعہ کی ایک رکعت ملی، وہ دوسری پڑھ کر مکمل کرے اور جس کی دونوں رہ گئیں، وہ اب چار پڑھے۔''[4] اسے طبرانی نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا، بقول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اگر جمعہ کی ایک رکعت پالی، تو دوسری کا اضافہ کر لو، اگر انہیں التحیات میں پایا، تو اب چار پڑھو۔[5] اسے بیہقی نے نقل کیا اور یہ شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور (حنفیہ کے) محمد بن حسن رحمہ اللہ کا مسلک ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا: جس نے تشہد امام کے ہمراہ پالیا، اس نے جمعہ پالیا، وہ امام کے سلام کے بعد دو رکعت پڑھے اس کا جمعہ ہو گیا۔

رش میں کیسے نماز پڑھے؟

امام احمد اور امام بیہقی رحمہما اللہ نے سیار سے نقل کیا کہتے ہیں: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خطبہ میں کہتے سنا: بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مسجد بنائی اور ہم مہاجرین و انصار آپ کے ساتھ تھے، جب رش ہو اور سجدہ کی جگہ نہ ملے، تو آگے والے بھائی کی کمر پر سر ٹکا لو۔ ان کی نظر بعض لوگوں پر پڑی جو (بوجہ ازدحام) باہر راستے میں نماز پڑھ رہے تھے، تو ان سے کہا: مسجد کے اندر آ کر پڑھو۔[6]

---

[1] صحیح، مسند الشافعی: ٤٢٦؛ السنن الکبری للبیهقی: ٥٦٨٦. [2] صحیح، سنن ابن ماجه: ١١٢٣؛ سنن دارقطنی: ١٥٩٠. [3] صحیح البخاری: ٥٨٠؛ صحیح مسلم: ٦٠٧. [4] صحیح، مجمع الزوائد: ٢/ ١٩٢. [5] السنن الکبری للبیهقی: ٣/ ٢٠٤. [6] صحیح، مسند أحمد: ٣٢؛ السنن الکبری للبیهقی: ٢/ ١٨٢، ١٨٣.

جمعے سے پہلے اور بعد کی سنتیں

جمعے کے بعد چار یا دو رکعتیں پڑھنا مسنون ہے، چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو جمعے کے بعد نماز پڑھے، وہ چار رکعات پڑھے۔‘‘[1] اسے مسلم، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن دو رکعتیں گھر میں ادا کیا کرتے تھے۔[2] اسے جماعت نے نقل کیا، امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ جمعہ کے بعد گھر جا کر دو رکعتیں پڑھتے تھے، اور پڑھنے والوں کو حکم دیا کہ چار پڑھیں، جیسا کہ گزرا، ہمارے شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر مسجد میں پڑھے تو چار اور گھر میں پڑھے، تو دو پڑھے (کم از کم) بقول مصنف احادیث اسی پر دال ہیں، ابوداود نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے نقل کیا کہ جب وہ مسجد میں پڑھتے تو چار اور گھر آ کر پڑھتے تو دو پڑھتے تھے۔[3] صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ گھر آ کر جمعے کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اگر چار رکعات پڑھے، تو اکٹھی پڑھے، بعض نے کہا: دو دو کر کے، افضل یہی ہے کہ گھر میں ادا کرے، اگر مسجد میں پڑھنی ہیں تو بہتر ہے، فرض نماز والی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ پڑھے۔

جہاں تک جمعہ سے قبل نوافل تو ان کی بابت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعے سے قبل اذان کے بعد (مسجد میں) کوئی نماز نہ پڑھا کرتے تھے اور نہ کسی نے آپ سے ایسا کرنا نقل کیا ہے، آپ کے عہد میں ایک ہی اذان ہوتی اور وہ تب جب آپ منبر پر بیٹھ جاتے، تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے، پھر آپ یکے بعد دیگرے دو خطبے دیتے اور پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اقامت کہتے اور آپ جمعہ کی نماز کراتے، لہٰذا اذان کے بعد تو آپ کے لیے کوئی سنت یا نفل پڑھنا ممکن ہی نہ تھا اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اور نہ کسی نے نقل کیا کہ آپ خطبہ کے لیے نکلنے سے قبل گھر میں کوئی سنتیں یا نوافل ادا کرتے تھے اور نہ قول کے ساتھ قبل از جمعہ کوئی نماز مقرر فرمائی ہے، البتہ جمعہ کے لیے مسجد آ جانے والوں کو ترغیب ضرور دلائی بغیر اس کے لیے کوئی وقت مقرر کیے، آپ کے الفاظ ہیں: «مَنْ بَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَمَشٰى وَلَمْ يَرْكَبْ وَصَلّٰى مَا كُتِبَ لَهٗ» ’’جس نے جمعہ کو جانے میں جلدی کی اور پیدل چل کر گیا اور حسبِ استطاعت نوافل ادا کیے۔‘‘[4] اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے منقول ہے کہ جب وہ بروزِ جمعہ مسجد آتے، تو ہر کوئی حسبِ استطاعت نوافل میں لگ جاتا، تو کوئی ان میں سے دس، کوئی بارہ اور کوئی آٹھ رکعات پڑھتا اور بعض اس سے کم، اسی لیے جمہور ائمہ متفق ہیں کہ جمعے سے قبل وقت کے ساتھ موقت کوئی نماز نہیں، جیسے دیگر نمازوں کے لیے اذان کے بعد یا دوسرے لفظوں میں وقت شروع ہونے کے بعد راتبہ نماز ہے، جیسے فرمایا: «بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ» ’’اذان اور اقامت کے مابین نماز ہے۔‘‘[5] جو کسی تعداد کے ساتھ مقدر ہو، کیونکہ اس طرح کی نماز کا ثبوت یا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوگا یا فعل سے اور آپ نے یہاں اس ضمن میں کچھ مسنون نہیں کیا نہ قولاً اور نہ فعلاً۔

---

[1] صحيح مسلم: ٨٨١؛ سنن أبي داود: ١١٣١؛ سنن ترمذي: ٥٢٣. [2] صحيح البخاري: ٩٣٧؛ صحيح مسلم: ٨٨٢. [3] صحيح، سنن أبي داود: ١١٣٠. [4] صحيح، سنن أبي داود: ٣٤٥؛ سنن ترمذي: ٤٩٦؛ سنن ابن ماجه: ١٠٧٨. [5] صحيح البخاري: ٦٢٤؛ صحيح مسلم: ٨٣٨.

اگر جمعہ اور عید ایک ہی دن آجائیں؟

اس صورت میں عید پڑھنے والوں سے جمعہ (کا وجوب) ساقط ہے، چنانچہ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی، پھر جمعہ (نہ پڑھنے) کی رخصت دے دی اور کہا: «مَنْ شَاءَ أَنْ يُصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ» ''جو جمعہ پڑھنا چاہتا ہے پڑھ لے۔''[1] اسے خمسہ نے نقل کیا، ابن خزیمہ اور حاکم نے اس پر صحت کا حکم لگایا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج کے دن دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں، تو جو چاہے عید (پڑھ لے یہ) اسے جمعہ سے کفائیت کر جائے گی البتہ ہم جمعہ کرائیں گے۔''[2] اسے ابوداود نے نقل کیا، امام کے لیے مستحب ہے کہ وہ جمعہ کرائے، تاکہ جو پڑھنا چاہتا ہے، وہ پڑھ لے، اسی طرح جن حضرات سے عید رہ گئی، وہ اب جمعہ کو آجائیں گے، جو جمعہ نہ پڑھے، وہ حنابلہ کے نزدیک ظہر کی نماز پڑھے گا، لیکن بظاہر یہ عید پڑھنے والوں سے (اگر وہ جمعہ کے لیے نہیں آتے) ساقط ہے، کیونکہ ابوداود نے ابن زبیر کی بابت نقل کیا کہ انہوں نے کہا: ایک دن میں دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں، تو انہوں نے صبح سویرے صرف عید کی نماز دو رکعتیں کرائی، کوئی زائد نماز نہیں پڑھی، پھر عصر کے وقت نمازِ عصر کرائی (نہ جمعہ کرایا اور نہ ظہر کی جماعت)۔[3]

نمازِ عیدین

عیدین کی نماز ہجرت کے پہلے سال مشروع کی گئی اور یہ سنتِ مؤکدہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہمیشگی کی اور مردوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ ان کے لیے نکلیں، اس کے کئی پہلو محلِ بحث ہیں، ذیل میں ان کا ملخص پیش کیا جاتا ہے:

① غسل کرنے، خوشبو لگانے اور عمدہ لباس پہننے کا استحباب

جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر عید میں یمنی چادر زیب تن کرتے۔[4] اسے امام شافعی اور امام بغوی رحمہما اللہ نے نقل کیا، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ عیدین کے موقع پر عمدہ ترین میسر لباس پہنا جائے اور خوشبو لگائی جائے اور عید الاضحیٰ میں حسب استطاعت قیمتی جانور خرید کر ذبح کریں۔[5] اسے حاکم نے نقل کیا اور اس کی سند میں اسحاق بن برزخ نامی راوی ہے، جسے ازدی نے ضعیف جبکہ ابن حبان نے ثقہ قرار دیا (بقول محشی حاکم نے کہا: اگر اسحاق کا مجہول ہونا نہ ہوتا تو میں اس حدیث پر صحت کا حکم لگاتا، ذہبی بھی ان کے موافق ہیں) امام ابن قیم رحمہ اللہ کے بقول آپ عیدین میں اپنا خوبصورت ترین لباس زیب تن فرماتے تھے، آپ کے پاس ایک حلہ تھا، جسے عیدین اور جمعہ میں پہنا کرتے تھے۔

---

① صحیح، سنن أبی داود: ۱۰۷۰؛ سنن نسائی: ۳/ ۱۹۴؛ سنن ابن ماجہ: ۱۳۱۰. ② صحیح، سنن أبی داود: ۱۰۷۳؛ سنن ابن ماجہ: ۱۳۱۱. ③ صحیح، سنن أبی داود: ۱۰۷۲. ④ مسند شافعی: ۱/ ۱۵۲. ⑤ المستدرك للحاكم: ٤/ ۲۳۰، ۲۳۱.

② عید الفطر میں نماز کے لیے جانے سے قبل کچھ کھانا جبکہ عید الاضحیٰ میں نہ کھانا

عید الفطر میں مسنون ہے کہ (اگر کھجوریں کھانی ہیں تو) طاق عدد میں کھجوریں کھائی جائیں، جبکہ عید الاضحیٰ میں واپس آکر کچھ کھایا جائے، بہتر ہے اپنی قربانی سے ہی ابتدا کرے اگر قربانی کا ارادہ ہے (اور جلدی کر لی ہے) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر میں جانے سے پہلے طاق تعداد میں کھجوریں تناول کرتے تھے۔[1] اسے احمد اور بخاری نے نقل کیا۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ عید الفطر کو کچھ کھائے بغیر نہ جاتے (اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عید الفطر میں ملنے ملانے میں دیر ہوسکتی ہے، جبکہ عید الاضحیٰ میں ہر کسی کو واپسی کی جلدی ہوتی تھی، تاکہ قربانی کرے) جبکہ عید الاضحیٰ میں واپس آکر کھاتے۔[2] اسے ترمذی، ابن ماجہ اور احمد نے نقل کیا احمد نے یہ اضافہ کیا کہ عید الاضحیٰ میں اپنی ذبح کردہ قربانی ہی سے کھاتے۔[3] مؤطا میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ لوگوں کو حکم تھا کہ عید الفطر میں جانے سے قبل کچھ تناول کریں، بقول امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ہم اس کے استحباب میں کسی کی مخالف رائے نہیں جانتے۔

③ عیدین عید گاہ (یا میدان) میں ادا کرنا

مسجد میں ان کی ادائیگی جائز ہے، لیکن آبادی سے باہر کھلے میدان میں ادا کرنا افضل ہے (بقول محشی ماسوائے مکہ کے کہ وہاں حرم کے اندر ان کی ادائیگی افضل ہے) (یہ بات ابن حجر نے بھی فتح میں لکھی ہے) اگر کوئی مجبوری یا عذر نہ ہو مثلاً بارش وغیرہ، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عیدین کو عید گاہ میں ادا کیا ہے، ماسوائے ایک مرتبہ کے جب بارش ہوگئی تھی، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک عید کے موقع پر بارش ہوگئی تو آپ نے مسجد میں نمازِ عید پڑھائی۔[4] اسے ابو داود، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا اور اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں لکھا: اس کی سند ضعیف ہے، بقول امام ذہبی رحمہ اللہ یہ حدیث منکر ہے۔

④ عورتوں اور بچوں کا بھی عیدین کے لیے نکلنا

ان کا بھی جانا مشروع ہے، اس ضمن میں کنواری، شادی شدہ اور جوان یا بوڑھی کا فرق نہیں، حتی کہ حیض والی خواتین بھی جائیں، کیونکہ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ہمیں حکم تھا کہ کنواریوں اور حائضہ خواتین کو بھی ہمراہ لے کر جائیں، حائضہ نماز سے الگ رہیں گی، مگر اجتماعی دعا میں شرکت کریں گی۔[5] متفق علیہ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین میں اپنی ازواج مطہرات اور بیٹیوں سمیت آتے تھے۔[6] اسے ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

① صحيح البخاري: ٩٥٣، مسند أحمد: ٣/ ٢٣٢. ② صحيح، سنن ترمذي: ٥٤٢؛ سنن ابن ماجه: ١٧٥.
③ حسن، مسند أحمد: ٥/ ٣٥٢ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ ④ ضعيف، سنن أبي داود: ١١٦٠؛ سنن ابن ماجه: ١٣١٣. ⑤ صحيح البخاري: ٩٧٤؛ صحيح مسلم: ٨٩٠. ⑥ ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٣٠٩؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٣/ ٣٠٧.

سے مروی ہے، کہتے ہیں: میں ایک عید الفطر یا عید الاضحیٰ میں آپ کے ہمراہ نکلا، آپ نے مردوں کو خطبہ دیا، پھر عورتوں کی طرف آئے، تو انہیں وعظ و نصیحت کی اور انہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔[1] اسے بخاری نے نقل کیا۔

⑤ واپسی میں راستہ بدل لینا

اکثر اہلِ علم امام اور ماموم دونوں کے لیے واپسی کا راستہ بدل لینے کے قائل ہیں، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ عید سے واپسی پر راستہ بدل لیتے تھے۔[2] اسے بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جس راستہ سے عید کو جاتے، واپسی پر اس سے دیگر کسی راستہ سے آتے تھے۔[3] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا، لیکن راستہ نہ بدلنا بھی جائز ہے، ابو داود، حاکم اور بخاری کی التاریخ الکبیر میں سیدنا بکر بن مبشر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے، کہتے ہیں: میں صحابہ کرام کے ساتھ عیدین کو جایا کرتا تھا تو (مدینہ کی وادی) بطحان کے اندر سے گزر کر ہم عید گاہ پہنچتے اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ عید ادا کرتے، پھر اسی راستہ سے واپس ہوتے۔[4] بقول ابن سکن رحمہ اللہ اس کی سند ٹھیک ہے۔

⑥ نمازِ عید کا وقت

اس کا وقت سورج کے تقریباً تین میٹر بلند ہونے سے لے کر زوال تک ہے۔ حسن بن احمد بناء نے سیدنا جندب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ ہمیں نماز عید الفطر پڑھاتے، جبکہ سورج دو نیزوں کی بلندی پر ہوتا اور عید الاضحیٰ کی نماز تب پڑھاتے جب وہ ایک نیزے کی بلندی پر ہوتا تھا۔[5] امام شوکانی رحمہ اللہ اس روایت کے بارے لکھتے ہیں: یہ نمازِ عیدین کے وقت کی تعیین کے بارے وارد احسن ترین روایت ہے، اس سے عید الاضحیٰ کی نماز کی تعجیل اور عید الفطر کی نماز کے نسبتاً کچھ تاخیر کرنے کا استحباب ظاہر ہوا، ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول عید الاضحیٰ کی تعجیل مسنون ہے، تاکہ قربانیاں جلد ذبح ہوں اور فطر کی تاخیر تاکہ صدقہ فطر نکالنے کے لیے وقت مل سکے، کہتے ہیں: میں اس بابت کسی اختلاف سے واقف نہیں ہوں۔

⑦ عیدین کے لیے اذان و اقامت

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں نبی کریم ﷺ بغیر اذان و اقامت کے نمازِ عید پڑھاتے تھے، منادی تک نہ کرائی جاتی کہ «الصَّلَاةُ جَامِعَةٌ» اور یہی مسنون ہے کہ ان میں سے کوئی فعل نہ کیا جائے، سیدنا ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عیدین میں اذان نہ ہوتی تھی۔[6] متفق علیہ۔ مسلم کی عطاء عن جابر سے روایت میں ہے کہ امام کے نکلتے وقت یا پہنچ جانے پر نہ اذان ہے اور نہ اقامت اور نہ کوئی اور اعلان ہوتا تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ بغیر

---

① صحيح البخاري: ٩٧٧. ② صحيح البخاري: ٩٨٦. ③ صحيح، سنن ترمذي: ٥٤١؛ مسند أحمد: ٢/ ٣٣٨.
④ ضعيف، سنن أبي داود: ١١٥٨؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٢٩٦، ٢٩٧. ⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ١١٨٤؛ سنن نسائي: ١٤٨٤. ⑥ صحيح البخاري: ٩٦٠؛ صحيح مسلم: ٨٨٦.

اذان و اقامت کے عیدین کی نماز کراتے تھے اور آپ کھڑے ہو کر دو خطبے دیتے اور دونوں کے درمیان میں کچھ دیر بیٹھتے۔[1]
اسے بزار نے تخریج کیا۔

⑧ نمازِ عیدین میں (اضافی) تکبیرات

نمازِ عید دو رکعتیں ہیں، مسنون ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد قراءت سے قبل سات تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں تکبیرِ قیام کے بعد پانچ تکبیریں اور ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین بھی کرے (بقول محشی رفع الیدین سیدنا عمر اور ان کے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ نقل کی ہے) عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے راوی ہیں (سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید میں کل بارہ تکبیریں کہیں (عام تکبیراتِ نماز سے زائد) سات پہلی اور پانچ دوسری میں اور نمازِ عید سے قبل اور بعد کوئی نماز (یعنی سنت، نفل اور تحیہ وغیرہ) نہیں پڑھی،[2] اسے احمد اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، بقول امام احمد رحمہ اللہ میرا یہی مسلک ہے۔ ابو داود اور دارقطنی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نمازِ عید الفطر میں سات تکبیریں پہلی رکعت اور پانچ دوسری رکعت میں ہیں اور دونوں میں قراءت سے قبل ہیں۔[3] یہی راجح ترین قول ہے اور اسی طرف صحابہ و تابعین اور ائمہ کے اکثر اہلِ علم کا رجحان ہے، امام ابن عبد البر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن طرق کے ساتھ مروی ہے، اس کے راویوں میں سیدنا عبد اللہ بن عمرو، ابن عمر، جابر، عائشہ، ابو واقد اور عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہم ہیں، کسی قوی یا ضعیف طریق کے ساتھ اس کا برخلاف آپ سے مروی نہیں، آپ ہر دو تکبیروں کے مابین معمولی سا سکتہ کرتے تھے، لیکن اس دوران میں کسی طرح کا ذکر کرنا، آپ سے مروی نہیں، البتہ طبرانی اور بیہقی نے قوی سند کے ساتھ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول اور فعل سے نقل کیا کہ وہ اس دوران میں اللہ کی حمد و ثنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ و سلام کا کوئی جملہ کہتے تھے،[4] یہی سیدنا حذیفہ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما سے منقول ہوا۔

تکبیرات سنت ہیں ان کے ترک سے نمازِ عید باطل نہ ہوگی، چاہے عمداً کرے یا سہواً، بقول ابن قدامہ رحمہ اللہ میں اس بابت کسی اختلاف سے واقف نہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس امر کو ترجیح دی کہ اگر سہواً ترک کرے، تب سجدہ سہو نہ کرے گا (گویا عمداً کرے تو ان کے خیال میں سجدہ سہو ادا کرے)

⑨ نمازِ عید سے قبل یا بعد میں نماز پڑھنا (نوافل وغیرہ)

ثابت نہیں کہ نمازِ عید سے قبل یا بعد کوئی اس کی سنتیں ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ عید گاہ پہنچ کر اس سے قبل اور بعد کوئی نماز نہ پڑھا کرتے تھے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن نکلے اور دو رکعت نماز پڑھائیں، نہ ان سے قبل

---

[1] ضعیف، مسند البزار: ٦٥٧؛ مجمع الزوئد: ٢/ ٢٠٣. [2] صحیح، سنن ابن ماجه: ١٢٧٨؛ مسند أحمد: ٢/ ١٨٠. [3] صحیح، سنن أبي داود: ١١٥٢؛ سنن دارقطني: /٤٨. [4] حسن، تمام المنة: ٣٥٠.

کوئی نماز ادا کی اور نہ ان کے بعد۔[1] اسے جماعت نے نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے عید کی نماز سے پہلے یا بعد کوئی نماز نہیں پڑھی اور بتلایا کہ یہی فعلِ نبوی تھا۔[2] اسے ترمذی اور حاکم نے نقل کیا، بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بابت نقل کیا کہ وہ نمازِ عید سے قبل نماز پڑھنا مکروہ قرار دیتے تھے،[3] جہاں تک مطلق نوافل تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا کہ اس کے بارے منع کسی دلیلِ خاص کے ساتھ ثابت نہیں، اِلّا یہ کہ ایسا وقتِ کراہت میں ہو اور وہ تو سب ایام کا یہی معاملہ ہے۔

⑩ کن سے نمازِ عید صحیح ہے؟

نمازِ عید کا وقوع مردوں، عورتوں، بچوں، مسافروں اور مقیموں سب سے صحیح ہے، چاہے جماعت کے ساتھ اور چاہے انفرادی طور پر، گھر میں یا مسجد میں یا عید گاہ میں، جس سے جماعت رہ گئی، تو وہ دو رکعتیں پڑھ لے، بخاری نے اس عنوان سے باب باندھا ہے: ”بَابٌ إِذَا فَاتَ الْعِيْدُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ“ عورتیں (جو عید گاہ نہیں گئیں) بھی اور دیگر گھر والے بھی دو رکعتیں عید کی نماز کی نیت کر کے پڑھ سکتے ہیں اور دیہات میں رہنے والے بھی، کیونکہ آپ نے فرمایا: ((هٰذَا عِيْدُنَا أَهْلِ الإِسْلَامِ)) ”یہ ہم اہلِ اسلام کی عید ہے۔“[4] یعنی سب کا نام لیا سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے زاویہ (یہ بصرہ کے نواح میں ایک جگہ تھی جہاں ان کا محل اور جاگیر تھی) میں اپنی تمام آل و اولاد اور غلاموں وغیرہ کو جمع کیا اور اپنے ایک غلام ابن ابو عتبہ سے شہر والوں کی طرح عید پڑھوائی اور تکبیریں بھی کہیں، عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: دیہات والے بھی عید گاہ میں جمع ہوں اور دو رکعتیں ادا کریں، عطاء رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر نمازِ عید باجماعت رہ جائے تو دو رکعت پڑھ لے۔

⑪ خطبۂ عید

نمازِ عید کے بعد خطبہ سنت ہے اور اس کا سننا بھی، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے موقع پر عید گاہ کی طرف نکلتے اور سب سے پہلے نماز پڑھاتے پھر سلام پھیر کر لوگوں کے مقابل کھڑے ہوتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے، تو انہیں وعظ و نصیحت کرتے، حضرے ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہی معمول رہا پھر میں مروان بن حکم (جب وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں امیرِ مدینہ تھے) کے ہمراہ عید کے لیے نکلا، ایک عید الاضحیٰ یا عید الفطر عید کے موقع پر، عید گاہ پہنچے تو دیکھا، وہاں کثیر بن صلت نے منبر (عارضی سا، مٹی سے) بنایا ہوا ہے، مروان نے جاتے ہی نماز سے قبل اس پر چڑھنا چاہا، تو میں نے اس کا کپڑا کھینچا، مگر وہ چھڑا کر چڑھ گیا اور نماز سے قبل خطبہ دیا، فارغ ہوئے تو میں نے اس سے کہا: اللہ کی قسم! تم نے تبدیلی کر ڈالی، کہنے لگا: ابو سعید! اب حالات بدل گئے ہیں: لوگ اتنا صبر نہیں کرتے اور نماز کے بعد ہمارا خطبہ سننے کے لیے

---

[1] صحيح البخاری: ٩٨٩؛ صحيح مسلم: ٨٨٤؛ سنن أبی داود: ١١٥٩. [2] صحيح، سنن ترمذی: ٥٣٨؛ مسند أحمد: ٢/ ٥٧. [3] صحيح البخاری، تعليقا: ٢/ ٤٧٦. [4] صحيح البخاری، تعليقاً: كتاب العيدين، باب اذا فاته العيد صلى ركعتين.

نہیں بیٹھتے، تو میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ خطبہ نماز سے قبل کر دیا ہے۔[1] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، عبداللہ بن سائب سے مروی ہے، کہتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ عید کو حاضر ہوا۔ آپ نے نماز پڑھائی پھر فرمایا: ''اب ہم خطبہ دینا چاہتے ہیں جو سننا چاہے سن لے اور جو جانا چاہے اسے جانے کی اجازت ہے۔''[2] اسے نسائی، ابو داود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، جن روایات میں بھی عید کے دو خطبوں کا ذکر ہے اور یہ کہ دونوں کے مابین امام (جمعہ کی طرح) کچھ دیر بیٹھے وہ ضعیف ہیں، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: خطبہ عید کے تکرار کے بارے کچھ ثابت نہیں۔

خطبے کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ کرنا مستحب ہے، نبی کریم ﷺ سے اس کا غیر منقول نہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آپ اپنے سب خطبوں کا افتتاح اللہ کی حمد کے ساتھ ہی کیا کرتے تھے، آپ سے کسی ایک حدیث میں بھی ثابت نہیں کہ آپ نے عید کے دونوں خطبوں کا افتتاح تکبیر سے کیا ہو، دراصل ابن ماجہ نے اپنی سنن میں سیدنا سعد القرظ رضی اللہ عنہ موذنِ نبی کے بارے نقل کیا کہ آپ خطبہ کی خاموشیوں کے درمیان تکبیر پڑھا کرتے تھے۔[3] اور عیدین کے خطبہ میں بکثرت تکبیر کہا کرتے تھے، یہ اس امر پر دال نہیں کہ افتتاح اس کے ساتھ کرتے، لوگوں نے عیدین اور الاستسقا کے خطبہ کے افتتاح کے بارے باہم اختلاف کیا، تو بعض نے کہا: دونوں کا افتتاح تکبیر سے ہوگا، بعض نے کہا خطبہ استسقا کو استغفار کے ساتھ شروع کرے، بعض نے کہا: حمد سے افتتاح کرے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بقول یہی درست ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے: ((كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَايُبْدَأُ فِيْهِ بِالْحَمْدُ لِلَّهِ فَهُوَ أَجْذَمُ)) ''ہر سنجیدہ کام جسے الحمد للہ سے شروع نہ کیا جائے وہ نا تمام ہے۔''[4] اور آپ اپنے سب خطبوں کا آغاز حمد کے الفاظ کے ساتھ ہی کیا کرتے تھے، جہاں تک کثیر فقہاء کا یہ کہنا کہ خطبہ استسقا کا آغاز استغفار اور خطبہ عید کا تکبیر کے ساتھ کرے، تو ان کے پاس نبی کریم ﷺ کی سنت سے کوئی دلیل نہیں، بلکہ سنت اس کے بر خلاف کی مقتضی ہے۔

⑫ نمازِ عید کی قضا

ابو عمیر بن انس کہتے ہیں مجھے میرے کچھ انصاری صحابی چچاؤں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ شوال کے موقع پر موسم ابر آلود تھا، تو ہم نے روزے کی حالت میں صبح کی، دن کے آخر میں کچھ سوار آئے اور نبی کریم ﷺ کے حضور گواہی دی کہ انہوں نے رات چاند دیکھ لیا تھا، تو نبی کریم ﷺ نے روزہ توڑ دینے کا حکم دیا اور یہ کہ کل عید کے لیے نکلیں گے۔[5] اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے بسندِ صحیح نقل کیا، اس حدیث میں ان حضرات کے لیے حجت ہے، جو قائل ہیں کہ اگر کسی عذر کی بنا پر نمازِ عید فوت ہو جائے، تو اگلے دن پڑھ لی جائے۔

---

① صحیح البخاری: ٩٥٦؛ صحیح مسلم: ٨٨٩. ② صحیح، سنن أبی داود: ١١٥٥؛ سنن ابن ماجه: ١٢٩٠.
③ ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٢٨٧. ④ صحیح، سنن نسائی: ١٥٥٦. ⑤ صحیح، سنن أبی داود: ١١٥٧؛ سنن ابن ماجه: ١٦٥٣.

⑬ عیدین کے موقع پر لعب ولہو، غنا اور کھانے پکوانا

مباح لعب (کھیل کود) اور لہو بری (جس میں کوئی غیر شرعی فعل اور قول نہ ہو) اور حسن غنا (اچھی آواز والوں سے نعتیں، حمد اور غیر فحش اشعار وغیرہ گا لینا) دین کی ان شرائع میں سے ہے، جنہیں اللہ نے عیدوں میں مشروع کیا ہے، تاکہ بدن کی ریاضت اور ذوق کی تسکین ہو، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے آئے، تو اہلِ مدینہ کے لہو ولعب کے سال میں دو دن تھے، تو آپ نے فرمایا: ''اللہ نے اس کے بدلے ان سے بہتر تمہیں دو دن عطا کیے ہیں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔''[1]

اسے نسائی اور ابن حبان نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عید کے موقع پر حبشہ کے لوگ (جو بعض ان کے مدینہ آئے ہوئے تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی کرتب دکھلانے لگے، تو آپ نے مجھے اپنے کندھے کے پیچھے سے ان کے اس تماشے کا نظارہ کرایا اور جب تک میں نے خود بس نہ کیا، آپ وہیں کھڑے رہے۔[2] اسے احمد اور شیخین نے تخریج کیا، انہی کی ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ ایک عید کے دن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے گھر آئے اور اس وقت دو لڑکیاں معرکہِ بعاث کے بارے کہے گئے گیت گا رہی تھیں (بعاث اوس کے ایک قلعہ کا نام تھا، اس کے پاس خزرج کے خلاف اوس کا مشہور معرکہ ہوا تھا، جس میں طرفین کے بڑے بڑے سردار کام آگئے، یہ ہجرت سے تھوڑی مدت قبل ہی پیش آیا) تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (غصہ میں) تین دفعہ کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں شیطان کا مزمور؟ (آلہِ موسیقی) آپ دوسری طرف کو منہ کر کے لیٹے ہوئے تھے، تو فرمایا: ''رہنے دو اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے، تو آج کے دن ہماری عید ہے۔''[3] بخاری کی روایت میں ہے، کہتی ہیں: جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے باتوں میں لگ گئے، تو میں نے انہیں ٹہوکا دیا تو وہ کھسک گئیں، آگے حبشیوں کے مذکورہ تماشہ کا ذکر کیا اور کہا: وہ ڈھالیں اور بھالے لے کرتب دکھلا رہے تھے، تو یا تو آپ نے پیشکش کی اور کہا: ''کیا انہیں دیکھنا چاہو گی'' یا میں نے خود یہ خواہش ظاہر کی، تو آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نظارہ کیا، آپ انہیں ہلاشیری بھی دیتے جاتے اور کہتے: «دُوْنَكُمْ يَا بَنِيْ أَرْفِدَة» ''شاباش اے بنی ارفدہ۔'' پھر جب میں اُکتا گئی، تو فرمایا: ''بس کافی ہے۔'' میں نے کہا: جی ہاں، تو فرمایا: ''چلی جاؤ۔''[4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: ابن سراج نے ابو زناد عن عروہ عن عائشہ سے نقل کیا کہ آپ نے اس موقع پر یہ بھی کہا: ''تاکہ مدینے کے یہودیوں کو پتہ چلے کہ ہمارے دین میں فُسحۃ (کشائش اور کھلا پن) ہے اور میں حنیفیہ سَمحہ (سیدھا اور سہل و آرام دہ) کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں۔''[5] احمد اور مسلم کی سیدنا نُبیشہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایامِ تشریق (عید الاضحیٰ اور مابعد کے تین ایام) کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے ایام ہیں۔''[6]

---

① ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٨٩٤. ② صحيح البخاري: ٤٥٤، صحيح مسلم: ٨٩٢. ③ صحيح البخاري: ٩٥٢. ④ صحيح البخاري: ٩٥٠، صحيح مسلم: ٨٩٢. ⑤ صحيح، مسند أحمد: ٢٤٨٥٥. ⑥ صحيح مسلم: ١١٤١، مسند أحمد: ٥/ ٧٥، سنن نسائي: ٧/ ١٧٠.

⑭ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں عملِ صالح کی فضیلت

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان ایام میں کیے گئے عملِ صالح سے بڑھ کر کسی دن کا عملِ صالح اللہ کو محبوب نہیں۔“ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! جہاد بھی نہیں؟ فرمایا: ”جہاد بھی نہیں۔“ اِلّا یہ کہ کوئی مجاہد اللہ کی راہ میں نکلا پھر جان و مال سمیت قربان ہوگیا۔“[1] اسے سوائے مسلم اور نسائی کے جماعت نے نقل کیا، احمد اور طبرانی کے ہاں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے کہ ”عشرہ ذی الحجہ سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک عظمت والے ایام کوئی اور نہیں اور نہ ان میں کیے گئے عمل سے زیادہ پسند تو ان میں کثرت سے تہلیل (لاالہ الا اللّٰہ)، تکبیر (اللّٰہُ أکبر) اور تحمید (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) کا ورد کیا کرو۔“[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت: ﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ﴾ (الحج: ۲۸) ”معلوم ایام میں اللہ کے نام کا ذکر کرو“ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ان سے مراد عشرہ ذی الحجہ ہے، سیدنا ابن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم ان ایام میں بازار نکل آتے اور اجتماعی تکبیریں کہلواتے۔[3] اسے بخاری نے نقل کیا، سعید بن جبیر رحمہ اللہ عشرہ ہذا میں اتنی محنت کرتے (اعمالِ صالحہ کرنے میں) کہ بیان سے باہر ہے۔[4] امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ان دس دنوں کا عمل اللہ کی راہ میں اس جہاد کے برابر ہے، جس میں روزانہ مجاہد روزہ رکھے اور رات کو پہرہ دے اِلّا یہ کہ شہادت واقع ہو، بقول ان کے مجھے یہ حدیث بنی مخزوم کے ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس عشرہ میں عبادت اللہ کو پسند ترین ہے، اس کے ہر دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر اور ہر رات کا قیام شبِ قدر کے قیام کے برابر ہے۔“[5] اسے ترمذی، ابن ماجہ اور بیہقی نے نقل کیا۔

⑮ عیدین میں ایک دوسرے کو تہنیت اور مبارک باد دینے کا استحباب

جبیر بن نفیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحابہ کرام عید کے دن جب ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے: ”تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكَ“ اللہ ہم سے اور آپ سے قبول کرے۔[6] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی سند حسن ہے۔

(یہ عربوں کا تہنیت کا روایتی جملہ ہے اور دورِ حاضر میں بھی مستعمل ہے، تیونس میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک ساتھی نے بتلایا کہ وہاں ہر جماعت کے موقع پر مسجد سے باہر آتے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے یہی جملہ بولتے ہیں، بعض حضرات ظاہر پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عیدین کے مواقع پر صرف یہی جملہ کہنا جائز سمجھتے ہیں، ان کی یہ روش صحیح نہیں، ہر کوئی اپنی زبان میں تہنیتی الفاظ کہہ سکتا ہے، صحابہ تو عربی تھے، لہٰذا انہوں نے عربی میں ہی مبارک باد کہی تھی)

---

① صحیح البخاری: ۹۶۹، سنن أبی داود: ۱٤۳۸، سنن ترمذی، ۷۵۷. ② مسند أحمد: ۲/ ۷۵، عبد بن حمید: ۸۰۷، شعیب ارناؤط رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ ③ صحیح البخاری، تعلیقاً: ۲/ ٤۵۷. ④ حسن، شعب الایمان: ۳۷۵۲.
⑤ ضعیف، سنن ترمذی: ۷۵۸، سنن ابن ماجه: ۱۷۲۸. ⑥ صحیح، تمام المنة: ۳۵٤.

⑯ ایامِ عیدین میں تکبیریں کہنا

یہ سنت ہے، عید الفطر کے بارے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر جو اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''

اور عید الاضحیٰ کے بارے کہا:﴿ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾(البقرۃ:۲۰۳)

''اور اللہ کو چند گنے ہوئے دنوں میں یاد کرو۔''

اور کہا:﴿ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾(الحج: ۳۷)

''اسی طرح اس نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا، تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی۔''

جمہور علماء قائل ہیں کہ عید الفطر میں تکبیریں کہنا نماز کے لیے جانے کے وقت سے لے کر خطبہ شروع ہونے تک ہے اس کے بارے میں کئی روایات موجود ہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر صحابہ کی روایات صحیح ہیں! حاکم لکھتے ہیں: یہ سنت ہے اور اہل الحدیث کے ہاں یہ متداول ہے، امام مالک، امام احمد، امام اسحق اور امام ابوثور رحمہم اللہ نے یہی کہا: بعض نے کہا: چاند رات سے ہی تکبیریں شروع کر دینی چاہئیں، عید گاہ کو جانے تک پھر وہاں پہنچنے کے بعد بھی حتی کہ امام نکلے، عید الاضحیٰ میں اس کا وقت یومِ عرفہ (نو ذوالحج) کی صبح سے لے کر ایامِ تشریق کے آخری دن کی عصر کی نماز تک ہے اور یہ تین دن ہیں: گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: اس بارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں، صحابہ سے وارد اس ضمن کا صحیح ترین قول سیدنا علی اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے جو کہتے ہیں کہ یومِ عرفہ کی صبح تا آخری یومِ منیٰ (یعنی تیرہ ذی الحجہ) کی عصر تک، اسے ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے نقل کیا، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا عمل اسی پر ہے، یہ حضرات عمر اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب بھی تھا، ایامِ تشریق میں تکبیر کہنے کا استحباب کسی خاص وقت نہیں، بلکہ ہر وقت ہی کہی جا سکتی ہے بخاری نے (معلقاً) نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں اپنے خیمہ سے اس کی صدائیں لگایا کرتے تھے اور لوگ سن کر مسجد میں اور بازار میں ان کی ہمنوائی کرتے، حتی سارا منیٰ تکبیروں کی آوازوں سے گونج اٹھتا،[1] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما منیٰ میں ان ایام میں نمازوں کے بعد، اپنے بستر پر، اپنے خیمہ میں اور جہاں کہیں ہوتے حتی چلتے ہوئے بھی تکبیریں کہتے، سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا (بطورِ خاص) یومِ نحر (عید الاضحیٰ) میں تکبیریں کہتیں، خواتین تشریق کی راتوں میں ابان بن عثمان اور عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ کے پیچھے تکبیریں کہتی تھیں، اسی طرح مسجد میں لوگوں کے ساتھ بھی۔[2]

بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ آثار ان ایام میں (ہر وقت) تکبیرات کہنے کے ذکر پر مشتمل ہیں، نمازوں سے فراغت پر اور

---

① صحیح البخاری، تعلیقاً: ۲/ ۴۵۷۔ ② صحیح البخاری، تعلیقاً: ۹۷۰۔

دیگر احوال میں بھی، اس ضمن میں علماء کے درمیان کئی جگہ اختلاف رائے ہوا، تو بعض نے تکبیر کہنے کو نمازوں کے بعد مقصور کیا، بعض نے انہیں فرض نمازوں کے ساتھ خاص کیا نوافل کے نہیں، بعض نے مردوں کے ساتھ مختص کیا، اسی طرح بعض نے جماعت کے ساتھ خاص قرار دیا، منفرد کے لیے نہیں اوران نمازوں کے ساتھ جو اداء پڑھی جائیں، قضاء نہیں، پھر مقیم کے ساتھ مسافر نہیں پھر شہروں میں رہنے والے اہلِ دیہہ (دیہاتی) نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کا اختیار بظاہر ان سب مذکورین کو اس کا شمول ہے اور جو آثار ذکر کیے، ان سے یہی مترشح ہوتا ہے، جہاں تک صیغۂ تکبیر تو اس ضمن میں معاملہ واسع ہے اور اس بابت صحیح ترین روایت وہ جسے عبدالرزاق نے سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا کہ کہا: یہ تکبیر کہا کرو:

(اَللّٰہُ أَکْبَرُ اَللّٰہُ أَکْبَرُ اَللّٰہُ أَکْبَرُ کَبِیْراً)[1]

سیدنا عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ منقول ہیں:

(اَللّٰہُ أَکْبَرُ اَللّٰہُ أَکْبَرُ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ أکبر اَللّٰہُ أَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ)۔[2]

① السنن الکبری للبیھقی: ۳/ ۳۱٦. ② نیل الاوطار: ۲/ ٦۲۱.

زکاۃ کے مسائل

① زکاۃ کی تعریف

زکاۃ اس چیز کا اسم ہے، جو انسان اللہ کا حق سمجھ کر (اپنے مال میں سے) فقراء کے لیے نکالتا ہے، برکت کی امید، تزکیہِ نفس اور خیرات کے ساتھ، اس کے نمو (بڑھوتی) کے مدِنظر اسے زکاۃ کا نام دیا گیا ہے، یہ زکاء سے ماخوذ ہے جو نماء، طہارت اور برکت ہے، قرآن میں ہے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ﴾(التوبة:١٠٣)

''ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے آپ انہیں (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔''

یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے، بیاسی (۸۲) آیات میں یہ نماز کے ساتھ مقرون کر کے ذکر کی گئی ہے، اس کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

جماعت نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے جب سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ کیا، تو فرمایا: ''تم اہلِ کتاب کی قوم کے پاس جا رہے ہو تو انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا، اگر قبول کرلیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ نے ایک رات و دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر یہ بھی مان لیں تو بتلاؤ کہ اللہ نے ان کے اموال پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے (حسبِ شروط) وصول کر کے ان کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی، اگر یہ بھی مان لیں تو ان کے عمدہ مال لینے سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بدعا سے بچنا کہ اللہ اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔''[①] طبرانی نے اوسط اور صغیر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے مالداروں پر زکاۃ فرض کی ہے، اس مقدار میں جو ان کے فقراء کو کافی ہو، فقراء کو جو بھوک و ننگ پہنچتی ہے، اس کا سبب ان کے مالداروں کا بخل ہی ہوتا ہے اور اللہ ایسا کرنے پر ان سے سخت حساب لے گا اور انہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھائے گا۔''[②] بقول طبرانی ثابت بن محمد زاہد اس کے ساتھ متفرد ہیں، بقول حافظ ابن حجر وہ ثقہ اور صدوق ہیں، ان سے بخاری وغیرہ نے روایت لی ہے باقی رواۃ بھی ٹھیک ہیں، اسلام کے اوائل میں مکہ میں زکاۃ کا فریضہ مطلق تھا، یعنی اس ضمن میں کوئی خاص مقدار متعین نہ تھی، نہ نصاب کی اور نہ دینے کی بلکہ اسے

---

① صحيح البخاري: ١٣٩٥؛ صحيح مسلم: ١٩. ② ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ٣٦٠٣؛ المعجم الصغير للطبراني: ٤٤٤.

مسلمانوں کی ذاتی صوابدید پر رکھا گیا تھا، مشہور قول کے مطابق ہجرت کے دوسرے برس تمام انواع مال میں سے اس کی مقدار اور نصاب کی تفصیل بیان کی گئی۔

② زکاۃ کی ادائیگی کی ترغیب

① اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ﴾(التوبہ: ۱۰۳)

یعنی معین مقدار میں بطور فرض زکاۃ کے یا پھر غیر متعین بطور نفلی صدقہ کے تو تطہیر اور تزکیہ سے مراد بخل، طمع، دناءت اور فقراء اور بے کسوں کی نسبت انہیں قساوتِ قلبی سے پاک کرو اور دیگر متعلقہ رذائل سے: ﴿ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ یعنی ان کا تزکیہ کرو، خیرات کے ساتھ اور خلقی و عملی برکات کے ساتھ، تا کہ وہ اس کی وجہ سے دنیوی واخروی سعادت کے اہل بنیں۔

② اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ○ اٰخِذِيْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ○ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَفِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴾

''بیشک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو نعمتیں ان کا رب انہیں دیتا ہوگا، ان کو لے رہے ہوں گے، وہ قبل ازیں نیکیاں کرتے تھے، رات کے تھوڑے سے حصہ میں سوتے اور اوقات سحر میں استغفار کرتے تھے اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا ہے۔'' (الذاریات: ۱۵۔۱۹)

توان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کی خاص صفت احسان کو بنایا اور یہ کہ ان کے احسان کا مظہر قیامِ شب، سحر میں استغفار اور فقیر پر شفقت و رحم کھاتے ہوئے اسے اس کا حق دینے میں ہے۔

③ مزید فرمایا:

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ﴾(التوبۃ: ۷۱)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں کہ اچھے کام کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔''

یعنی وہ جماعت جس میں اللہ برکت ڈالتا اور اپنی رحمت اس کے شاملِ حال کرتا ہے، یہ وہ جو اللہ پر ایمان رکھتی ہو اور اس کے افراد ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہوں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں اور اپنے اور اللہ کے مابین تعلق کو نماز اور آپس کے باہمی تعلق کو ادائیگی زکاۃ کے ساتھ مضبوط کرتے ہوں۔

④ ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کو تمکین فی الارض (زمین میں ایک غالب قوم کی حیثیت سے ہونے) کی غایات میں سے ایک غایت قرار دیا، چنانچہ کہا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (الحج:٤١)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں اقتدار دیں تو نماز پڑھیں (نماز کا اہتمام کریں)، زکوٰۃ ادا کریں، نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

① امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوکبشہ انماری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین باتیں یاد رکھنا، میں قسم کھا کر انہیں بیان کرتا ہوں، اول: صدقہ کرنا مال میں کمی نہ کرے گا، دوم: کسی نے صبر کے ساتھ حق تلفی اور ظلم کو برداشت کیا تو اللہ اس کی عزت میں اضافہ ہی کرے گا، سوم: کسی نے اگر دستِ سوال دراز کرنا اپنا پیشہ بنالیا تو اللہ اس پر فقر کا دروازہ کھول دے گا۔''[1]

② احمد نے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا دے کر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقات قبول کرتا اور انہیں اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ پکڑتا ہے اور کرنے والے کے لیے ان کی اس طرح پرورش کرتا ہے، جیسے کوئی گھوڑے کے بچے کی کرتا، حتیٰ کہ (صدقہ کے بطور دیا گیا) ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل بن جاتا ہے۔'' وکیع کہتے ہیں: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں یوں ہوئی:

﴿ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ ﴾ (التوبة: ١٠٤)

''بے شک اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور صدقات لیتا ہے۔''

اور کہا: ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ (البقرة: ٢٧٦)

''اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''[2]

③ امام احمد رحمہ اللہ نے بسندِ صحیح سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ تمیم کا ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ایک مالدار آدمی ہوں، تو مجھے بتلائیں کس طرح اللہ کی راہ میں خرچ کروں؟ فرمایا: ''اپنے مال کی زکاۃ نکالا کرو، اس سے تمہیں تطہیر حاصل ہوگی اور صلہ رحمی کیا کرو اور مسکین، پڑوسی اور مانگنے والے کے حق کو پہچانو۔''[3]

④ انہی کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں ہے کہ ''تین باتیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں: ایک کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو جس کے لیے اسلام سے کوئی حصہ ہے، اس شخص کی مانند نہ کرے گا، جس کا اسلام سے کوئی حصہ نہیں اور اسلام کے تین حصے ہیں: نماز، روزہ اور زکاۃ، دوم کہ اللہ دنیا میں کسی بندے کا متولی نہ بنے گا کہ پھر روزِ قیامت اسے کسی اور کی تولیت میں کر دے

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ٢٣٢٥؛ سنن ابن ماجه: ٤٢٢٨. [2] حسن، سنن ترمذی: ٦٦٢؛ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ [3] ضعیف، مسند أحمد: ٣/ ١٣٦؛ مجمع الزوائد: ٣/ ٦٣.

(ایسا نہیں ہوگا) اور سوم کہ آدمی کسی قوم سے محبت نہ کرے گا (کسی قوم کی بودوباش، رہن وسہن اور طرزِ زندگی کو عزیز سمجھ کر اختیار نہ کرے گا) مگر اللہ اسے انہی کے ساتھ کر دے گا اور ایک چوتھی بات بھی ہے امید ہے کہ اس پر بھی قسم کھالوں تو گناہگار نہ بنوں گا، وہ یہ کہ اللہ دنیا میں کسی کی پردہ پوشی نہ کرے گا، مگر قیامت کے روز بھی اس کا بھرم رکھے گا۔''[1]

⑤ طبرانی نے اوسط میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر کوئی اپنے مال کی زکاۃ دیتا ہو تو؟ فرمایا: ''اس کی برکت سے اس کے مال کا شر جاتا رہے گا۔''[2]

⑥ بخاری ومسلم نے سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اقامتِ نماز، ادائیگی زکاۃ اور ہر مسلم کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔

③ زکاۃ نہ دینے سے ترہیب

① اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾(التوبة:٣٤-٣٥)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے (دردناک عذاب) کی خوش خبری سنا دو، جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔''

② اور فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾(آل عمران:١٨٠)

''جو لوگ مال میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے، بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں بلکہ ان کے لیے برا ہے، وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔''

① احمد اور شیخین نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زکاۃ ادا نہ کرنے والے مالدار کا

---

[1] صحيح، مسند أحمد: ٦/ ١٤٥؛ مجمع الزوائد: ١/ ٣٧. [2] حسن لغيره، صحيح ابن خزيمة: ٤/ ١٣؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٣٩٠.

خزانہ و مال لوہے کے چوڑے توے بنا کر جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، تو ان کے ساتھ اس کی پیشانی اور پہلو داغے جائیں گے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب کر دے، اس روز میں جس کا دورانیہ پچاس ہزار سال ہے، پھر اس کا فیصلہ کیا جائے گا تو یا تو جنت کی طرف یا پھر جہنم کی طرف، ہر اونٹوں والا جو ان کی زکاۃ نہیں نکالتا، اسے ایک وسیع میدان میں کھڑا کر کے اس پر اس کے اونٹ چھوڑے جائیں گے، آخری ٹولی گزرتے گزرتے پھر سے پہلی ٹولی آجائے گی اور یہی ہوتا رہے گا، تا آنکہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب سے فارغ ہو جائے، پھر اس کا فیصلہ کیا جائے گا یا تو جنت کی طرف یا پھر جہنم کی طرف، اسی طرح دیگر مویشی پالنے والوں کے ساتھ سلوک ہوگا، جو ان کی زکاۃ نہیں نکالتا رہا۔'' صحابہ نے کہا: گھوڑوں والوں کی بابت کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: ''ان کی پیشانی میں قیامت تک خیر بندھی ہے، گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک جو مالک کے لیے اجر کا باعث بنے گا، دوم اس کے لیے پردہ پوشی اور سوم اس کے لیے (روزِ قیامت) وِزر (بوجھ) ثابت ہوگا، جہاں تک پہلی قسم تو یہ وہ گھوڑے جنہیں ان کے مالک نے اللہ کی راہ (میں استعمال کرنے) کے لیے تیار کیا ان کا کھایا پیا ہر لقمہ اس کے لیے اجر میں اضافے کا سبب ہوتا ہے، راوی کہتے ہیں: آپ نے ان کے ابوال اور لید کے بھی باعثِ اجر ہونے کا ذکر کیا، تو اللہ کی راہ میں ان کے اٹھائے ہر قدم کے بدلے اجر ہے۔ دوم وہ گھوڑے جنہیں کسی نے بطورِ معاش پالا، وہ تنگی اور آسانی میں ان کی پشت اور پیٹ کا حق نہیں بھولتا (اس کا یہ روزگار ہے اور وہ زکاۃ ادا کرتا ہے) اور سوم جو مالک کے لیے بوجھ (وبال) ثابت ہوں گے، تو یہ وہ گھوڑے جنہیں کسی نے غرور و تکبر اور فخر و مباہات کے لیے پالا تھا، تو یہ (وبال) ہیں۔'' صحابہ نے گدھوں بارے پوچھا، تو فرمایا: ''ان کی بابت اللہ نے مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں کیا، ہاں قرآن کی یہ آیت بڑی جامع و مانع ہے (جس میں سب کا احاطہ ہے) فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ (الزلزال: ۷۔۸)

''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا، اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''[1]

(۲) شیخین نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اس کی زکاۃ ادا نہیں کرتا، تو وہ مال روزِ قیامت اس کے لیے زہریلا سانپ بنا دیا جائے گا، جس کی پیشانی پر دو نقطے ہوں گے اور وہ طوق بن کر اس کے گلے میں لپٹ جائے گا، پھر اسے اپنے جبڑوں میں کس لے گا اور کہے گا، میں تمہارا مال ہوں میں تمہارا خزانہ ہوں (کہاں بھاگتے ہو)۔'' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ الخ (آل عمران: ۱۸۰)[2]

(۳) ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے گروہِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ایسی ہیں اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں پائی جائیں، اگر وہ کسی قوم میں ہو جائیں تو اس کے برے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري: ٤٩٦٢؛ صحيح مسلم: ٩٨٧. [2] صحيح البخاري: ١٤٠٣؛ سنن نسائي: ٥/ ١٢، ١٤.

① کسی قوم میں زنا عام نہ ہوگا مگر نتیجتاً ان میں امراض پھیل جائیں گے، یعنی نئے نئے امراض جو کبھی سنے نہ دیکھے (مثلاً ایڈز وغیرہ، جن کی بابت یہی کہا گیا ہے کہ جنسی بے راہروی سے پھیلتے ہیں)۔

② ناپ تول میں کمی نہ ہوگی، مگر اس کے نتیجے میں قحط سالی، تنگیٔ گزران اور حکمران کے ظلم کا شکار ہوں گے۔

③ زکاۃ ادا کرنا چھوڑ دیں گے، تو بارشیں برسنا بہت کم ہو جائیں گی، اگر جانور اور مویشی نہ ہوں تو بالکل ہی بند ہو جائیں (ان کی خاطر تھوڑی بہت ہو جایا کرے گی)۔

④ اللہ اور اس کے رسول کی عہد شکنی کریں گے تو اجنبی دشمن ان پر مسلط ہوگا جو ان کا مال و اسباب غصب کر لے گا۔

⑤ شریعت نافذ نہ کریں گے، تو ان کے درمیانی شدید خانہ جنگی ہوگی۔''[1]

⊛ شیخین نے احنف بن قیس سے نقل کیا کہتے ہیں میں قریش کے چند معززین کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک ملگجے بالوں اور لباس والا ایک شخص (یہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے) آیا اور کھڑے کھڑے سلام کیا پھر گویا ہوا کانزین (اموال جمع کر کے خزانے بنانے والوں) کو خوشخبری دو کہ ایک پتھر جہنم کی آگ سے تپایا جائے گا پھر وہ ان کے سینے پر رکھا جائے گا، حتی کہ کندھے کی طرف سے نکل آئے گا پھر ادھر رکھا جائے گا، تو سینے سے برآمد ہوگا تو وہ اس کارروائی سے متزلزل ہو جائے گا، یہ کہہ کر وہ شخص مڑ کر ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، کہتے ہیں: میں ان کے پیچھے گیا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا، ابھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے، میں نے کہا: مجھے محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کو آپ کی بات ناگوار لگی ہے، کہنے لگے: وہ بے شعور ہیں! میرے خلیل نے مجھے کہا: میں نے کہا: کون آپ کا خلیل؟ کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوذر! کیا احد (پہاڑ) دیکھ رہے ہو؟ میں نے سورج کی طرف نظر کی تا کہ اندازہ لگاؤں کتنا دن باقی ہے، میرا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ مجھے کسی کام سے احد کی طرف بھیجنا چاہتے ہیں، عرض کی: جی یا رسول اللہ! فرمایا: ''مجھے پسند نہیں کہ احد جتنا سونا میرے پاس ہو کہ اسے جمع رکھوں سوائے تین دینار کے۔'' کہنے لگے یہ لوگ عقل نہیں رکھتے، یہ دنیا جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ کی قسم! نہ میں ان سے دنیا مانگوں گا اور نہ دین کی بابت ان سے کچھ استفسار کروں گا، حتی کہ اللہ سے جاملوں۔[2]

④ زکاۃ کی ادائیگی سے پہلوتہی کرنے والے کا حکم

زکاۃ ان فرائض میں سے ہے، جن پر امت کا اجماع ہے اور یہ ایسا مشہور امر ہے کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتا ہے، اس طرح کہ اگر کسی نے اس کے وجوب کا انکار کیا، تو وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور بوجہِ کفر قتل کر دیا جائے، الّا یہ کہ کوئی نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے کہ وہ اسلام کے احکامات سے عدم ناواقفیت کی بنا پر معذور ہے ایسے افراد جو اس کے وجوب کا اعتقاد تو رکھتے ہیں مگر ادائیگی سے کوتاہی کرتے ہیں وہ گناہ گار ہیں لیکن اسلام سے خارج نہیں، حاکم کو چاہیے کہ زبردستی ان سے زکاۃ وصول کرے اور کوئی تعزیری سزا دے لیکن یہ تعزیر مالی نہ ہوگی، مال سے صرف زکاۃ ہی وصول کرے، البتہ احمد نے شافعی

---

[1] حسن، سنن ابن ماجه: ٤٠١٩. [2] صحيح البخاري: ١٤٠٧؛ صحيح مسلم: ٩٩٢.

سے قدیم میں کہا کہ زکاۃ بھی لے اور نصف مال بھی اور یہ اس کی سزا ہے کیونکہ احمد، نسائی، ابو دود، حاکم اور بیہقی کی بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ سے روایت میں ہے کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اونٹوں والوں پر ہر چالیس میں ایک بنت لبون (جو تیسرے سال میں ہو) ہے، کوئی اونٹ اس حساب سے الگ نہ کیا جائے جس نے خوشدلی اور ثواب کی طلب کرتے ہوئے زکاۃ ادا کر دی وہ ماجور ہوا اور جو ممتنع ہوا تو ہم (زبردستی) زکاۃ وصول کریں گے اور اس کا آدھا مال بھی، یہ ہمارے رب کے عائد کردہ واجب حقوق میں سے ایک حق ہے اور آلِ محمد کے لیے اس میں سے کچھ بھی حلال نہیں۔''[1] احمد سے اس کی اسناد کے بارے پوچھا گیا تو کہا ٹھیک ہے، حاکم بہز کے بارے کہتے ہیں: ان کی حدیث صحیح ہوتی ہے (بقول محشی شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث بارے کہا: اہلِ علم کے نزدیک یہ ثابت نہیں اگر ثابت ہوتی تو ہم بھی اسی کے قائل ہوتے) اگر کوئی لوگ زکاۃ کے وجوب کا اعتقاد رکھنے کے باوجود اس کی ادائیگی سے انکار کرتے ہیں اور ان کے پاس قوت بھی ہے تو ان سے زکاۃ کی خاطر لڑائی کی جائے گی حتی کہ اسے ادا کریں، چنانچہ شیخین نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں لوگوں سے قتال پر مامور ہوں حتی کہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں، اگر ایسا کر دیا تو اپنے اموال اور جانیں مجھ سے محفوظ کروالیں، مگر حقِ اسلام کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔''[2]

جماعت نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہتے ہیں وفاتِ نبوی کے بعد سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو بعض قبائل نے زکاۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا، وہ ان سے لڑنے پر تیار ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا اور کہا: آپ کیونکر لڑ سکتے ہیں جبکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس وقت لڑنے کا حکم ہے جب تک وہ کلمہ نہ پڑھ لیں، جس نے کلمہ پڑھ لیا اس کی جان و مال محفوظ ہوئے مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ پر ہے اس پر وہ بولے اللہ کی قسم! میں ان سے ضرور جنگ کروں گا، جنہوں نے نماز اور زکاۃ کے مابین فرق کیا ہے، جبکہ زکاۃ حقِ مال ہے، اللہ کی قسم! اگر ایک بچھڑا بھی روکا جسے وہ عہدِ نبوی ادا کیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے لڑوں گا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں جان گیا کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذہن اس بارے بالکل واضح ہے تو میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

⑤ کن پر زکاۃ واجب ہے؟

یہ مسلمان، آزاد، مالکِ نصاب پر واجب ہے، جو کسی بھی نوعِ مال کے نصاب کا مالک ہو، جس پر زکاۃ عائد ہے، نصاب کی شروط یہ ہیں:

① وہ ان ضروریات و حاجات سے زائد ہو جن سے کسی کو بھی مفر نہیں، لہٰذا طعام، لباس، گھر، سواری اور آلاتِ حرفت پر زکاۃ عائد نہیں۔

---

[1] حسن، سنن أبی داود: ١٥٧٥. [2] صحیح البخاری، ٢٥؛ صحیح مسلم: ٢١.

④ اس پر ہجری سال گزر گیا ہو، اس کی ابتدا نصاب کے مالک ہونے کے دن سے ہوگی اور یہ بھی ضروری ہے کہ سال بھر نصاب کامل رہا ہو، اگر سال کے اثنا یہ کم ہوا پھر مکمل ہوا تو اب نئے سرے سے سال کا حساب ہوگا، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہمارا (شوافع) امام مالک، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اس مال کی نسبت جس کی عین (اصل) میں زکاۃ عائد ہے اور اس میں سال گزرنے کا اعتبار ہے، مثلاً سونا، چاندی اور مویشی تو ان کی بابت شرط ہے کہ پورا سال نصاب مکمل رہے، اگر سال کے دوران میں کسی لحظہ اس میں کمی ہوئی تو مکمل ہونے پر پھر سے سال کا حساب شروع کرنا ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اس ضمن میں رائے یہ ہے کہ سال کے اول اور آخر میں نصاب مکمل ہونا چاہیے، دورانِ سال میں اگر وہ کم بھی ہوا تو حرج نہیں حتی کہ مثلاً اگر کسی کے پاس دوسو درہم تھے (سال کے شروع میں) پھر سال کے دوران میں سوائے ایک درہم کے سب خرچ ہو گئے یا مثلاً چالیس بکریاں تھیں اور سوائے ایک کے سب تلف ہوئیں پھر سال کے آخر میں پھر سے نصاب کامل ہو گیا تو زکاۃ عائد ہوگی، یہ شرط زرعی اجناس اور پھلوں کی پیداوار پر لاگو نہیں، ان کی زکاۃ کٹائی کے دن ہی نکالنا ہوگی، قرآن نے کہا:

﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾(الأنعام:١٤١)

''کٹائی کے دن ہی ان کا حق (زکاۃ) ادا کرو۔''

امام عبدری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اموالِ زکاۃ دو قسموں پر ہیں: ایک جن کی بذاتِ خود بڑھوتی ہوتی ہے، جیسے غلہ اور پھل تو ان کی زکاۃ ان کے وجود کے ساتھ ہی نکالنا ہوگی، دوسری قسم جو بڑھوتی کی غرض سے روکے رکھے جائیں، جیسے درہم و دنانیر، سامانِ تجارت اور مویشی تو ان کی نسبت سال گزرنے کی شرط ہے، ان کے نصاب میں زکاۃ عائد نہیں ہوتی، حتی کہ سال گزرے، یہی تمام فقہاء نے کہا۔

⑥ نابالغ اور دیوانے کے مال کی زکاۃ

نابالغ اور دیوانے کے سرپرست پر واجب ہے کہ ان کے مال سے زکاۃ نکالے، اگر وہ حدِ نصاب کو پہنچ گیا ہے، عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی یتیم کا سرپرست بنا، جس کے نام کوئی مال ہے، تو وہ اس مال کو تجارت میں لگائے، اسے (جوں کا توں) چھوڑے نہ رکھے کہ تاکہ زکاۃ دے دے کر ہی وہ ختم ہو جائے۔''[1] اس کی سند ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں اس کے لیے ایک مرسل شاہد ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے مطلقاً ایجابِ زکاۃ والی صحیح احادیث کے عموم کے ساتھ اسے مؤکد کہا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ان یتیموں کے مال کی زکاۃ نکالا کرتی تھیں، جو ان کے زیرِ سرپرستی تھے۔[2] امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اس بابت اختلاف ہے، تو کئی صحابہ کرام مالِ یتیم میں زکاۃ نکالنے کے قائل ہیں ان میں سیدنا عمر، علی، عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم تھے اور یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا موقف ہے۔

---

① ضعیف، سنن ترمذی: ٦٤١؛ سنن الدارقطنی: ١٩٧٠. ② مصنف ابن ابی شیبة: ٤/ ٣٩٠.

⑦ قرضدار مالکِ نصاب

جس کے پاس اتنا مال ہے، جو حدِ نصاب کو پہنچتا ہے لیکن وہ قرضدار ہے تو اولاً اپنے قرض کے بقدر مال الگ کرے اور باقی اگر نصاب کو پہنچے تو اس کی زکاۃ دے، اگر نہیں پہنچتا تب اس پر زکاۃ واجب نہیں، کیونکہ اس حالت میں وہ (گویا) نصاب کا مالک نہیں، لہٰذا (وہ شرعاً مالدار نہیں) اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: «لَا صَدَقَةَ إِلَّا عَنْ ظَهْرِ غِنیً» ''صدقہ وہ جو اپنے پیچھے مالداری چھوڑے۔''[1] اسے احمد نے موصولاً اور بخاری نے معلقاً نقل کیا ایک روایت میں ہے کہ زکاۃ ان کے مالداروں سے وصول کر کے انہی کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے، اس میں برابر ہے کہ وہ قرض ہو جو اللہ کا اس کے ذمہ ہے یا بندوں کا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: «فَدَیْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ» ''اللہ کا قرض ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے۔''[2] یہ آگے بھی آئے گی۔

⑧ جو فوت ہو گیا اور اس کے ذمہ زکاۃ عائد تھی

تو یہ اس کے ترکے سے نکالی جائے (بقول محشی یہ امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق اور امام ابوثور رحمہم اللہ کا مسلک ہے) اور یہ قرضداروں، وصیت (اگر کی ہے) اور وارثوں پر مقدم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ﴾ (النساء:١٢) ''قرضوں کی ادائیگی اور مالی وصیت پوری کرنے کے بعد۔'' اور زکاۃ اللہ کا قائم قرض ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے ہیں، کیا میں اس کی طرف سے رکھ لوں؟ فرمایا: ''اگر تمہاری والدہ کے ذمہ کسی کا قرض ہوتا، تو کیا تم اسے ادا کرتے؟'' کہا: جی ہاں، فرمایا: ''تو اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے چکایا جائے۔''[3] اسے شیخین نے تخریج کیا۔

⑨ ادائیگی زکاۃ میں نیت کی شرط

زکاۃ عبادت ہے، لہٰذا اس کی صحت کے لیے شرط ہے کہ نیت ہو اور زکاۃ نکالنے والا ادائیگی کے وقت وَجْهُ اللّٰهِ (اللہ کی رضا اور تقرب) کا قصد اور اس کے ثواب کی طلب کرے اور اس کے دل میں ہو کہ وہ فرض زکاۃ ادا کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ﴾ (البينة:٥) ''مسلمانوں کو حکم ہے کہ عبادت کا جو کام بھی کریں اخلاصِ نیت سے کریں۔'' صحیح بخاری میں (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی) ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر ایک کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔''[4] امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے ادا کرتے وقت نیت کو مشروط کہا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: ادا کرتے وقت اور واجب الاداء چکاتے وقت، احمد نے ادائیگی سے تھوڑا عرصہ قبل نیت کر لینا بھی جائز قرار دیا۔

---

[1] صحيح البخاري، تعليقا: ٥/ ٣٧٧؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٣٠. [2] صحيح البخاري: ١٩٥٣؛ صحيح مسلم: ١١٤٨. [3] صحيح البخاري:٦٦٩٩؛ صحيح مسلم: ١١٤٨/ ١٥٥. [4] صحيح البخاري: ١؛ صحيح مسلم: ١٩٠١.

⑩ وجوب کے وقت اس کی ادائیگی

زکاۃ جب واجب ہوتو فوراً اس کی ادائیگی ضروری ہے، وقتِ وجوب سے تاخیر حرام ہے، اِلّا یہ کہ کسی کے پاس فوری استطاعت نہ ہوتب ادائیگی میں تاخیر جائز ہے، احمد اور بخاری نے سیدنا عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نمازِ عصر پڑھی، آپ سلام کے بعد فوراً گھر تشریف لے گئے، پھر واپس آئے اور لوگوں کے چہروں پر تعجب کے آثار دیکھ کر فرمایا: ''نماز میں مجھے یاد آیا کہ گھر میں کچھ سونا پڑا ہے تو اچھا نہ لگا کہ رات بھر وہ یہیں رہے، تو اسے تقسیم کردینے کا حکم دے کر آیا ہوں۔''[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے اور التاریخ الکبری میں بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زکاۃ مال میں اگر شامل ہوگی تو اسے تباہ کردے گی۔'' اسے حمیدی نے بھی روایت کیا اور یہ اضافہ بھی کہ ''اگر تمہارے مال پر زکاۃ واجب ہو چکی ہو اور تم ادا نہ کرو، تو حرام حلال کو ختم کر ڈالے گا۔''[2]

⑪ وجوب سے قبل ادائیگی زکاۃ

یہ جائز ہے، چاہے اگلے دو برس کی ہو! چنانچہ زہری رحمہ اللہ کے بارے منقول ہے کہ وہ حرج نہ سمجھتے تھے کہ سال پورا ہونے سے قبل زکاۃ ادا کر دی جائے، حسن (بصری) سے پوچھا گیا: اگر کوئی (آیندہ) تین سال کی اکٹھی زکاۃ ادا کر دے؟ کہا: ٹھیک ہے ادا ہو جائے گی، امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے امام مالک، امام ربیعہ، امام سفیان ثوری، امام داود اور امام ابوعبید بن حارث رحمہم اللہ نے کہا: ایسا کرنا جائز نہیں، ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جو وجوبِ زکاۃ کو سال گزرنے پر معلق کرتی ہیں جن کا ذکر گزرا، اس کا تسلیم کرنا صحتِ تعجیل کے قول کے لیے باعثِ نقصان نہیں، کیونکہ وجوب حولانِ حول (سال گزرنے) کے ساتھ متعلق ہے اور اس میں کوئی نزاع نہیں، نزاع تو اس سے قبل ادائیگی کرنے کے جائز ہونے میں ہے، علامہ ابن رشد رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کیا یہ عبادت ہے یا مستحقین کا واجب حق؟ تو جس نے عبادت کہا اور اسے نماز کے ساتھ تشبیہ دی، ان کے ہاں قبل از وقت اس کا اخراج جائز نہیں اور جن حضرات نے موجلاً واجب ہونے والے حق کے اسے مشابہ قرار دیا ان کے ہاں وقت سے قبل رضا کارانہ طور پر اس کا اخراج جائز ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے مؤقف کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے حجت پکڑی کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی زکاۃ قبل از وقت بطورِ قرض وصول کر لی تھی۔[3]

⑫ زکاۃ دینے والے کو دعا دینا

زکاۃ وصول کرتے وقت اسے دعا دینا مستحب ہے، کیونکہ قرآن میں ہے:

---

[1] صحیح البخاری: ٨٥١؛ سنن نسائی: ٣/ ٨٤. [2] ضعیف، مسند الشافعی: ٥٥؛ مسند الحمیدی: ٢٣٧.
[3] حسن، سنن أبی داود: ١٦٢٤.

﴿ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ﴾(التوبۃ:۱۰۳)

''ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انہیں پاک کرے گا اور انہیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن ابو اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زکاۃ کا مال لایا جاتا، تو یہ دعا دیتے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ» میرے والد جب زکاۃ لائے تو کہا: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ آلِ أَبِيْ أَوْفىٰ» [1] اسے شیخین وغیرہما نے نقل کیا۔ نسائی نے سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے حق میں جس نے زکاۃ کے طور پر ایک عمدہ اونٹنی بھیجی تھی، یہ دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَفِيْ أَهْلِهِ» ''اے اللہ اس میں اور اس کے اہل میں برکت کر۔'' [2] بقول امام شافعی رحمہ اللہ امام کے لیے سنت یہی ہے کہ زکاۃ وصول کرتے ہوئے متصدق کے حق میں دعا کرے مثلاً کہے: ''آجَرَكَ اللّٰهُ فِيمَا أَعْطَيْتَ وَبَارَكَ لَكَ فِيمَا أَبْقَيْتَ'' ''جو تم نے دیا اللہ اس کا اجر دے اور جو باقی ہے اس میں برکت دے۔ یا صرف: ''جَزَاكَ اللّٰهُ'' کہہ دے، اسے ابن ماجہ نے مختصراً نقل کیا اور اس کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے۔

وہ اموال جن میں زکاۃ واجب ہے

اسلام نے سونا، چاندی، غلہ، پھلوں، سامانِ تجارت، چوپاؤں، معدنیات اور محفوظ مال میں زکاۃ ادا کرنا واجب قرار دیا ہے۔

نقدین یعنی سونے چاندی کی زکاۃ [3]

نقدین میں زکاۃ کا وجوب

سونے چاندی نے بارے قرآن نے کہا:

﴿ وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴾(التوبۃ: ۳٤)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔''

تو ان میں زکاۃ واجب ہے چاہے یہ نقدی (دینار و درہم جو ماضی میں سونا چاندی سے بنتے تھے) کی شکل میں ہوں یا زیورات کی صورت یا پھر غیر ڈھلا ہوا ہو، جو ان میں سے حدِ نصاب کو پہنچ جائے اور سال گزرنے کی شرط پوری ہو اور نصاب کی

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٩٧؛ صحيح مسلم: ١٠٧٨. [2] صحيح، سنن نسائي: ٢٤٥٨. [3] انہیں نقدین اس لیے کہا گیا کہ ماضی میں کرنسی انہی دو سے ڈھالی جاتی تھی سونے سے دینار اور چاندی سے درہم۔

مقدارقرض اورضروری (روزمرہ کے گھرداری والے) اخراجات سے زائد ہو۔

سونے کا نصاب اورزکاۃ کی مقدار

سونے پر کچھ عائد نہیں حتی کہ وہ بیس دینار (یا اس کے برابر، آجکل کے حساب سے تقریباً ساڑھے سات تولے) ہوجائے، اگر بیس دینار ہوں اوراس پر سال گزرجائے تواس میں ربع العشر (لفظی ترجمہ: دسویں حصے کا ایک چوتھائی) ہے یعنی آدھا دینار، اور جو بیس دینار سے زائد ہوں تواسی حساب سے زکاۃ دی جائے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے میں زکاۃ عائد نہ ہوگی، حتی کہ وہ بیس دینار ہوجائیں، اگر ہوں اورسال گزرجائے تو ان میں نصف دینار ہے، اگر بیس سے زائد ہوں، تواسی حساب سے زکاۃ لاگو ہوگی، کسی مال میں زکاۃ واجب نہ ہوگی، حتی کہ سال گزرے۔''[1] اسے احمد، ابوداود، اوربیہقی نے نقل کیا، بخاری نے اسے صحیح اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا، زریق مولی بنی فزارہ سے منقول ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلیفہ بننے کے بعد انہیں خط لکھا کہ اپنے پاس آنے والے تاجروں کے ان اموال سے جو وہ تجارت میں لگاتے ہیں، ہر چالیس دیناروں سے ایک دینار کی شرح سے زکاۃ وصول کرو، جو چالیس سے کم ہوں تواسی حساب سے اور یہ بیس تک اگر بیس سے ایک بٹا تین دینار بھی کم ہو تواس سے زکاۃ نہ لو، جس سے زکاۃ وصول کرو، اسے رسید جاری کرو، جس میں تحریر ہو کہ یہ اب سال بھر تک بری الذمہ ہے، اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں لکھتے ہیں: سنت جس میں ہمارے ہاں اختلاف نہیں یہ ہے کہ بیس دینار جب ہوجائیں، توان پر زکاۃ عائد ہوجائے گی، اسی طرح درہم اگر دوسو ہوجائیں توان پہ زکاۃ عائد ہوئی۔

چاندی کا نصاب اورزکاۃ کی مقدار

چاندی میں کچھ عائد نہیں حتی کہ دوسو درہم (کے بقدر، آجکل کے حساب سے تقریباً باون تولے) ہو تب ان میں ربع العشر یعنی دسویں حصے کا ایک چوتھائی ہے، دوسو سے زائد پر بھی اسی حساب سے، جتنے بھی ہوں، نقد (سونا چاندی) کی زکاۃ میں نصاب مکمل ہوجانے کے بعد کوئی عفو نہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تمہارے لیے گھوڑوں اورغلام لونڈیوں کی بابت عفو کی ہے (ان پر کوئی زکاۃ نہیں لی) لیکن چاندی کی زکاۃ ادا کرو، ہر چالیس درہم میں ایک درہم کی شرح سے (لیکن تب جب ان کی مجموعی تعداد دوسو درہم ہو) اگر ایک سو ننانوے بھی ہوں توکوئی چیز واجب نہیں، اگر دو سو ہوجائیں توان کی زکاۃ پانچ درہم ہے (دسویں حصہ کے ایک چوتھائی کے حساب سے)۔''[2] اسے اصحاب سنن نے تخریج کیا، امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے بخاری سے اس حدیث کے بارے پوچھا: توکہا: صحیح ہے، لکھتے ہیں: اہل علم کے ہاں معمول بہ یہ ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم میں زکاۃ نہیں اورایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے، پانچ اوقیہ دوسو بنے۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۱۵۷۳؛ السنن الکبری للبیھقی: ٤/ ١٦٠. [2] صحیح، سنن أبی داود: ۱۵۷٤؛ سنن ترمذی: ٦٢٠؛ سنن نسائی: ٥/ ٣٧.

نقدین (دینار اور درہم) کو باہم خلط کر لینا

جس کے پاس موجود سونا نصاب سے کم ہے، اسی طرح اس کے پاس چاندی بھی ہو، لیکن وہ بھی نصاب سے کم ہو، تو اس صورتحال میں دونوں کو باہم خلط نہ کیا جائے تا کہ اس طرح نصاب بن جائے کیونکہ دونوں الگ الگ جنس ہیں، لہٰذا خلط نہ کیا جائے گا، جیسے گائے اور بکریوں کے ضمن میں اصول ہے، اگر مثلاً کسی کے پاس ۱۹۹ درہم اور ۱۹ دینار ہیں تو اس کے ذمہ کوئی زکاۃ نہیں۔

اگر کسی کا مال قرضوں میں پھنسا ہوا ہو

اس سلسلے میں دو طرح کا قرض ہوتا ہے، ایک کہ قرضدار معترف ہے اور ادائیگی کا وعدہ کیا ہوا ہے، تو اس طرح کے مال کے بارے متعدد آراء ہیں:

① مالک پر زکاۃ عائد ہے، البتہ ادا تب کرے گا، جب اسے اپنا قرض وصول ہو، تب سابقہ مدت کی زکاۃ ادا کر دے، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سفیان ثوری، ابوثور رحمہ اللہ، احناف اور حنابلہ کا مذہب ہے۔

② اسے فی الفور زکاۃ ادا کرنا واجب ہے، چاہے ابھی قرض واپس نہ ہوا ہو، کیونکہ وہ اس کی وصولی پر قادر ہے (قرضدار معترف ہے اور چکانے کا کوئی وعدہ کیا ہوا ہے) لہٰذا زکاۃ ادا کرنے کا وہ پابند ہے، اس کی نظیر امانت ہے، یہ سیدنا عثمان، ابن عمر، جابر رضی اللہ عنہم، طاؤس، نخعی، حسن، زہری، قتادہ اور شافعی رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

③ اس پر زکاۃ عائد ہی نہیں (نہ فی الفور اور نہ جب قرض واپس ہو) کیونکہ یہ مال غیر نامی مال ہے (یعنی جس میں بڑھوتی نہیں یعنی جسے تجارت میں نہیں لگایا گیا) لہٰذا زکاۃ واجب نہیں جیسے گھریلو سامان، یہ عکرمہ رحمہ اللہ کا موقف تھا، سیدہ عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول کیا جاتا ہے۔

④ اگر ایک برس کے لیے قرض دیا ہوا ہے، تب وہ زکاۃ دے گا، یہ سعید بن مسیب اور عطاء بن ابورباح رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔

دوسری حالت یہ کہ قرضدار ایک غریب آدمی ہے (اور کچھ پتہ نہیں کہ واپس کرے گا یا نہیں؟ یا کب کرے گا) یا وہ انکاری ہے یا ٹال مٹول کر رہا ہے، تو اس بارے بھی کئی آراء ہیں: قتادہ، اسحاق، ابوثور اور حنفیہ کے نزدیک اس صورت میں زکاۃ واجب نہیں، کیونکہ اس مال کے ساتھ انتفاع اس کے بس میں نہیں، بعض نے کہا: جب کبھی واپس ہو جائے تو سابقہ مدت کا حساب کر کے زکاۃ ادا کر دے، یہ امام ثوری اور امام ابوعبید رحمہما اللہ کا قول ہے، کیونکہ یہ مال تھا، تو اسی کی مِلک اور اب اس کے تصرف میں بھی آچکا، تو سابقہ کی زکاۃ دے، اس کی مثال مالدار کے ذمہ قرض کی سی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ سے اس بابت دو اقوال منقول ہیں، عمر بن عبدالعزیز، حسن، لیث، اوزاعی اور مالک رحمہم اللہ کہتے ہیں: جب یہ واپس ہو تو ایک سال کی زکاۃ ادا کر دے۔

بانڈز کی زکاۃ

ان کی حیثیت چونکہ دیونِ مضمونہ (واجب الاداء قرض) کی دستاویز کی سی ہے، لہٰذا ان میں زکاۃ واجب ہے، جب وہ

نصاب کو پہنچ رہے ہوں، کیونکہ ان کا فوری طور پر واپس کر کے کرنسی لے لینا ممکن ہے۔

زیورات کی زکاۃ

علماء متفق ہیں کہ الماس، درّ، یاقوت، لؤلؤ، مرجان، زبرجد اور اس طرح کے قیمتی پتھروں اور موتیوں میں زکاۃ عائد نہیں، اِلّا یہ کہ ان کی تجارت کرتا ہو، تب ان کی بھی زکاۃ ہے، خواتین کے (زیرِ استعمال) سونے چاندی کے زیورات کے بارے اختلافِ آراء ہے، تو امام ابوحنیفہ اور امام ابن حزم رحمہم اللہ بشرطے نصاب ان میں زکاۃ کے وجوب کے قائل ہیں، انہوں نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت سے استدلال کیا، کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے پاس دو خواتین آئیں، جنہوں نے سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے، تو آپ نے ان سے کہا: ''کیا پسند کرو گی کہ اللہ قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟'' کہا: نہیں، فرمایا: ''تب پھر اپنے ہاتھوں میں پہنے ہوئے ان کنگنوں کی زکاۃ ادا کیا کرو۔''[1] سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، میں اپنی خالہ کے ہمراہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئی اور ہم نے سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے، فرمایا: ''کیا ڈرتی نہیں ہو کہ مبادا اللہ تعالیٰ آگ کے کنگن پہنا دے، اس کی زکاۃ دو۔''[2] بقول امام ہیثمی رحمہ اللہ اس کی سند حسن ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں نبی کریم ﷺ میرے ہاں آئے، تو میرے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھیاں دیکھیں، فرمایا: ''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟'' عرض کی: میں نے پہننے کے لیے تیار کرائی ہیں۔'' فرمایا: ''ان کی زکاۃ ادا کرو گی۔'' کہا نہیں یا کہا: جو اللہ کی مشیت ہوگی، فرمایا: ''پھر عذاب جہنم کا حقدار ہونے کے لیے یہی کافی ہوگا۔''[3] اسے ابوداود، دارقطنی اور بیہقی نے نقل کیا۔

ائمہ ثلاثہ قائل ہیں کہ عورتوں کے زیورات میں زکاۃ نہیں، چاہے جتنے بھی ہوں، بیہقی نے روایت کیا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا: کیا زیور میں زکاۃ ہے؟ کہا: نہیں، کہا گیا: اگر ہزار دینار کی قیمت کے ہو جائیں؟ کہا: چاہے اس سے بھی زیادہ کے ہوں! امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کیا کہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما اپنی بیٹیوں کو سونے کے زیورات پہناتی تھیں، جن کی مالیت تقریباً پچاس ہزار تھی اور ان کی زکاۃ نہ دیتی تھیں،[4] موطا میں عبدالرحمن بن قاسم اپنے والد سے راوی ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی کفالت میں ان کے بھائی کی یتیم لڑکیاں تھیں، جن کے لیے زیورات تیار کرائے تھے تو ان کی زکاۃ نہ نکالتی تھیں، اسی میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے اور ان کی زکاۃ نہ دیا کرتے تھے۔[5] بقول امام خطابی رحمہ اللہ قرآن کا ظاہر (بقول محشی ان کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا﴾ زیورات میں وجوبِ زکاۃ کی رائے دینے والوں کا شاہد ہے اور اثر بھی ان کا مؤید ہے، جس نے اس کا اسقاط کیا، اس نے قیاس کو مدِنظر رکھا اور ان کے ساتھ بھی اثر کا ایک حصہ ہے، البتہ احتیاط یہی ہے کہ زیورات کی زکاۃ ادا کی جائے، یہ اختلافِ آراء ان زیورات کی نسبت ہے، جن کا پہننا خواتین کے لیے حلال ہے، لیکن اگر کسی خاتون نے کوئی ایسا زیور لیا، جو

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ١٥٦٢؛ سنن ترمذي: ٦٣٧؛ سنن نسائي: ٥/ ٣٨. [2] ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ١٥٤.
[3] صحيح، سنن أبي داود: ١٥٦٥. [4] السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ١٣٨. [5] المؤطا امام مالك: ١/ ٢٥٠.

بنیادی طور پہ عورتوں کا نہیں مثلاً عورتوں کی زیب و زینت کا سامان جیسے تلوار کا قبضہ (اگر یہ سونے کا بنوالیا یا کوئی شو پیس) تو یہ اس کی نسبت حرام ہے اوراس پر سب کے نزدیک زکاۃ عائد ہے، یہی حکم سونے و چاندی کے برتنوں کا ہے۔

خاتون کے حقِ مہر میں زکاۃ

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ قائل ہیں کہ حقِ مہر میں زکاۃ عائد نہیں ہوگی، مگر جب یہ اس کے قبضہ میں آئے گا، کیونکہ یہ اس چیز سے بدل ہے، جو مال نہیں، لہٰذا قبضہ میں آنا شرط ہے، پھر دوسری شرط قبضے میں آنے کے بعد یہ ہے کہ سال گزرے، ہاں اگر اس کے پاس مہر کے علاوہ کوئی اور نصاب موجود تھا، تو مہر سے اگر کچھ وصول ہوا تو اسے بھی اس نصاب کے ساتھ ملا لے گی اور سال گزرنے کے ساتھ زکاۃ ادا کرے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ قائل ہیں کہ مہر پر زکاۃ دینا لازم ہے، جب سال گزر جائے، سال کے آخر میں لازم ہے کہ تمام مہر کی زکاۃ نکالے، اگرچہ ابھی تک دخول نہ ہوا ہو، یہ خدشہ کہ ارتداد وغیرہ کی وجہ سے نکاح فسخ ہو جائے یا کہ بوجہِ طلاق اس کا نصف ملے گا، اس میں مؤثر نہ ہوگا! حنابلہ کے نزدیک مہر کی حیثیت قرض کی سی ہے، تو اس کا حکم بھی قرضوں میں پھنسے مال کا ہے، تو اگر یہ ضرورت سے زائد ہے، تو قبضے میں آنے کے بعد تمام گزری مدت کی زکاۃ نکالنا واجب ہوگا اور اگر یہ (قرض) تنگ دست یا اس کے انکاری کے پاس ہے، تو امام خرقی رحمہ اللہ کے بقول: اس میں بھی زکاۃ واجب ہے، اس ضمن میں دخول سے قبل اور بعد میں فرق نہیں، اگر طلاق کی صورت میں آدھا مہر ساقط ہوگیا، تو باقی آدھے کی قبضے میں آنے کے بعد زکاۃ نکالنا ضروری ہوگا، اسی طرح اگر قبضے میں آنے سے قبل فسخِ نکاح ہونے کی صورت میں سارا مہر ساقط ہوگیا، تب اس کے ذمہ کوئی چیز نہیں۔

کرائے پر دیے گھروں کی زکاۃ

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کی رائے میں کرائے پر دینے والا معاہدہ ہونے کے ساتھ ہی کرایہ (لینے) کا حقدار نہیں بنتا، بلکہ تب جب کرائے کی مدت گزرے تو اس پر بنا کرتے ہوئے جس نے گھر کرائے پر اٹھایا اس پر کرائے کے مال کی زکاۃ واجب نہ ہوگی، مگر جب اس کے قبضہ میں آئے اور پھر اس پر سال گزرے اور یہ بھی کہ نصاب کو پہنچتا ہو، حنابلہ کا موقف ہے کہ معاہدہ ہونے کے ساتھ ہی مالک کرائے کی رقم کا مالک بن جاتا ہے (چاہے رقم اس کے قبضے میں آئی یا نہیں) لہٰذا اس بنا پر اسی وقت سے سال گزرنے کا حساب ہوگا، اگر وہ رقم حدِ نصاب کو پہنچ رہی ہے، اس معاہدہ کے فسخ ہونے کا امکان وجوبِ زکاۃ کے لیے مانع نہیں، جیسے دخول سے قبل حقِ مہر ہے، اگر کرائے کی رقم اس کے قبضہ میں آچکی ہے، تو اس کی زکاۃ نکال دے اور اگر ادھار ہے تو اس کا حکم قرض میں دی گئی رقم جیسا ہے، جو معجّل ہو یا موجل (قبضے میں آنے کے بعد معاہدہ ہونے سے گزری مدت کی زکاۃ ادا کی جائے گی، اگر سال یا سال سے زیادہ گزرا ہے) امام نووی رحمہ اللہ کی مجموع میں ہے کہ اگر گھر وغیرہ (دکان یا کوئی بھی عمارت) کرائے پر دی اور کرائے کی رقم قبضے میں آگئی تو (سال گزرنے پر) بلا اختلاف زکاۃ عائد ہوگی۔

سامانِ تجارت کی زکاۃ

سامانِ تجارت کی زکاۃ کا حکم

صحابہ، تابعین اور مابعد ادوار کے جمہور علماء وفقہاء سامانِ تجارت پر وجوبِ زکاۃ کے قائل ہیں، ان کی اس ضمن میں دلیل ابو داود اور بیہقی کی سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جنہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم تجارت کے لیے رکھے سامان کی زکاۃ نکالیں۔[1] دارقطنی اور بیہقی نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اونٹوں، گائے اور بکریوں میں اور گھر کے سامان میں زکاۃ عائد ہے۔''[2] امام شافعی، امام احمد، امام ابوعبید، امام دارقطنی، امام بیہقی اور عبد الرزاق نے ابوعمرو بن حماس عن ابیہ سے نقل کیا، کہتے ہیں: میرا چمڑے اور بڑے برتنوں کا کاروبار تھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا، تو ہدایت دی کہ اپنے مال کی زکاۃ ادا کیا کرو، میں نے عرض کی: امیر المومنین یہ تو چمڑا ہے؟ کہا: اس کی قیمت کا حساب لگا کر اس کی زکاۃ نکالو۔[3] المغنی میں ہے کہ یہ قصہ مشہور ہوا اور کسی طرف سے انکار نہ ہوا، لہٰذا یہ اجماع کے مترادف ہے، ظاہر یہ سامانِ تجارت میں عدمِ زکاۃ کے قائل ہیں، بقول امام ابن رشد رحمہ اللہ اس کا سبب قیاس کے ساتھ وجوبِ زکاۃ کے مسئلہ میں ان کی اختلافی رائے ہے، اسی طرح سیدنا سمرہ اور ابوذر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا حدیثوں کی صحت میں ان کا اختلاف، جہاں تک قیاس جس پر جمہور نے اعتماد کیا وہ یہ ہے کہ سامانِ تجارت مال ہے، جس کی بڑھوتی مقصود ہے، لہٰذا وہ ان تین اجناس سے مشابہ ہے جن پر بالاتفاق زکاۃ عائد ہے، یعنی غلہ، مویشی اور سونا چاندی، المنار (از علامہ رشید رضا مصری) میں ہے کہ جمہور علمائے ملت سامانِ تجارت میں وجوبِ زکاۃ کے قائل ہیں، البتہ اس کے بارے کتاب وسنت کی کوئی نصِ قطعی موجود نہیں، کچھ روایات ہیں جو ایک دوسری کی تقویت کرتی ہیں، ان کے ساتھ ساتھ نصوص کی طرف مستند اعتبار ہے، وہ یہ کہ سامانِ تجارت نقدی کی مثل ہی ہے، ان کے اور درہم ودینار کے مابین فرق نہیں وہ ان کے اثمان (قیمتیں) ہی تو ہیں، البتہ نصاب ثمن جو کہ نقدی ہے اور مثمن جو کہ سامانِ تجارت ہے، کے مابین متقلب ہے، تو اگر سامانِ تجارت میں زکاۃ واجب نہ قرار دیں، تو سب یا اکثر مالدار اپنے نقد مال کو سامانِ تجارت (خریدنے میں) لگا دیں اور کوشاں رہیں کہ کبھی نقدین (درہم ودینار) پر سال پورا نہ ہو اور اس حیلہ سازی سے ہمیشہ دونوں کو زکاۃ سے بچاتے رہیں، اس مسئلہ میں معتبر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اغنیا کے مال میں فقراء کی مواسات اور مصالحِ عامہ کی دیکھ بھال کے لیے زکاۃ کا ادا کرنا فرض کیا ہے، اغنیا کو اس کا فائدہ بخل کی رذیلت سے ان کے نفوس کی تطہیر اور فقراء اور دیگر مستحقین کے ساتھ مہربانی کے ساتھ ان کا تزکیہ اور مصالحِ عامہ کے کاموں میں اور لوگوں کے مصائب ومشکلات کے ازالہ میں حکومت اور امت کی مدد پھر اس میں مفاسد کی روک تھام اور جرائم کی بیخ کنی ہے، اگر دولت

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ١٥٦٢. [2] ضعیف، سنن دارقطنی: ٢/ ١٠٠؛ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ١٤٧.

[3] ضعیف، سنن دارقطنی: ١/ ١٤.

چند خاندانوں میں مرتکز ہو کر رہ جائے (کہ تب غربت کا مارا آدمی تنگ آ کر چوری چکاری پر اتر آئے) اسی طرف یہ آیت اشارت کناں ہے: ﴿ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ﴾(الحشر:۷) ''تا کہ مال تمہارے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔'' تو کیا یہ امر معقول ہے کہ تاجران شرعی مقاصد سے مستثنیٰ کیے جائیں، حالانکہ عین ممکن ہے کہ کسی قوم کی ثروت و دولت کا اکثر حصہ انہی کی دسترس میں ہو۔

سامانِ تجارت کی تعریف

المغنی میں ہے کہ کوئی سامان برائے تجارت تب قرار پائے گا اگر درج ذیل دو شرطیں پائی جائیں:

① بالفعل اس کی ملک میں ہو مثلاً خرید و فروخت کر سکے اور شادی بیاہ، خلع، قبولِ ہدیہ، وصیت اور ہر قسم کا مباح تصرف (جو سامان ان اغراض میں استعمال ہو سکے) اس لیے کہ جس کے لیے مجرد مِلک میں دخول کے ساتھ حکمِ زکاۃ ثابت نہ ہو، تو مجرد نیت کے ساتھ یہ ثابت نہیں ہوتا، جیسے روزہ ہے اور کوئی فرق نہیں کہ عوض کے ساتھ مالک بنے یا بغیر عوض کے کیونکہ یہ کافی ہے کہ بالفعل مالک بنا تو یہ مالِ موروث سے مشابہ ہے۔

② اس سامان کے تملُّک کے وقت نیت ہو کہ یہ برائے تجارت ہے، اگر یہ نیت نہ کی تو وہ بغرضِ تجارت شمار نہ ہوگا، اگرچہ بعد ازاں یہ نیت کر بھی لی، اگر وراثت میں حصہ ملا اور اس کا قصد ہوا کہ یہ برائے تجارت ہے، تو مجرد قصد سے وہ برائے تجارت نہ بنے گا، اس لیے کہ اصل قنیۃ ہے (قبضہ میں آنا) اور تجارت ایک عارضی امر ہے تو مجرد نیت کے ساتھ کوئی اس کی حیثیت میں نہ ہوگا جیسے مثلاً کوئی مقیم سفر کی نیت کرے، تو عملاً سفر شروع کیے بغیر وہ مسافر کے حکم میں نہ ہوگا (کہ نیت کر کے ہی قصر پڑھنا شروع کر دے) اگر کسی نے کوئی سامان تجارت کی غرض سے خریدا پھر اس بارے تملُّک کی نیت کر لی، تو اب وہ ملکیتی سامان ہوا اور اس سے زکاۃ ساقط ہوئی (خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس سامان میں زکاۃ عائد ہوگی، جس میں بذریعہِ تجارت بڑھوتی کا ارادہ ہے، رہا وہ سامان جو آرائش کے لیے مثلاً گھر میں رکھا ہے چاہے، وہ لاکھوں کا ہو اس میں زکاۃ عائد نہیں)۔

مالِ تجارت کی زکاۃ نکالنے کی کیفیت

جس کے پاس بقدرِ نصاب (اتنی قیمت کا ہے کہ نصاب کو پہنچتا ہے) سامانِ تجارت ہے اور اس پر سال گزر گیا، تو وہ قیمت کا حساب کر کے زکاۃ نکال دے (ڈھائی فیصد کی شرح سے) اور تاجر ہر سال اپنے سامانِ تجارت کے بارے یہ کرے، اگر پورا سال نصاب کامل رہے (بقول محشی اس میں امام مالک کا اختلاف ہے جو قائل ہیں کہ اگر سال کے کسی حصہ میں نصاب سے کم بھی سامان ہوا اور سال کے آخر میں بقدرِ نصاب ہو گیا تو زکاۃ دینی پڑے گی) اگر نصاب سے کم قیمت کا سامان ہے اور سال کا ایک حصہ اسی کیفیت میں گزرا پھر قیمتِ نماء بڑھ گئی یا عام قیمتیں بڑھ گئیں اور وہی سامان بقدرِ نصاب ہو گیا یا مثلاً اتنی قیمت میں اسے بیچ دیا تو نصاب ہے، یا سال کے ایک حصہ میں مزید سامان کا مالک بنا جس کو ساتھ ملا کر نصاب کامل ہوا تو اب سے سال کا حساب شروع کرے گزشتہ مدت شمار نہ ہوگی، یہ امام ثوری، احناف، شافعی، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور اور ابن منذر رحمہم اللہ کا

مسلک ہے، پھر اگر سال کے دوران میں نصاب ناقص ہوا، جبکہ شروع میں اور سال کے آخر میں مکمل تھا، تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سال منقطع نہ ہوا، کیونکہ ایسا کرنے میں مشقت ہے کہ ہمہ وقت وہ اس کی قیمت سے آگاہ رہے کہ نصاب کے مطابق ہے یا نہیں؟ حنابلہ کے نزدیک اگر سال کے دوران میں ناقص ہوا، پھر زیادہ ہو کر نصاب کے مطابق ہوا تو اب نئے سرے سے سال کا حساب شروع کرے۔

زرعی اجناس اور پھلوں کی زکاۃ

زرعی اجناس اور پھلوں کی زکاۃ کا وجوب

اللہ تعالیٰ نے زرعی اجناس اور پھلوں پر زکاۃ عائد کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾(البقرة:٢٦٧)

''مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں، ان میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾(الأنعام: ١٤١)

''اور اللہ ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو (بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور (بعض میں) نہیں جب یہ چیزیں پکیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو اللہ کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔''

بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما (حَقَّهٗ) سے مراد فرض زکاۃ ہے، جو عشر اور نصف عشر ہے۔

عہدِ نبوی میں جن اجناس کی زکاۃ وصول کی گئی

یہ گندم، جو، کھجوریں اور منقہ ہیں، ابو بردہ سیدنا ابوموسی اور معاذ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو یمن بھیجا، تا کہ اہلِ یمن کو دین کی تعلیم دیں، تو حکم دیا کہ زکاۃ کی وصولی نہ کریں، مگر ان چار اجناس کی: گندم، جو، کھجور اور منقہ۔[1] اسے دارقطنی، حاکم، طبرانی اور بیہقی نے نقل کیا اور کہا: اس کے راوی ثقہ ہیں اور یہ متصل ہے، امام ابن منذر اور ابن

---

[1] صحيح، سنن الدارقطني: ٢/ ٩٤؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٠١.

عبد البر رحمہ اللہ لکھتے ہیں علماء کا اجماع ہے کہ زکاۃ صرف گندم، جو، کھجور اور منقہ میں عائد ہے، ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گندم، جو، کھجور، منقہ اور مکئی میں زکاۃ قرار دی۔[1] اس کی سند میں محمد بن عبید اللہ عرزمی ہے۔ جو متروک ہے۔

جن اجناس پر زکاۃ عائد نہیں

سبزیوں اور سوائے انگور اور کھجوروں کے پھلوں پر زکاۃ عائد نہیں۔ امام عطاء بن سائب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن مغیرہ نے موسیٰ بن طلحہ کی زمین پر لگی سبزیوں کی زکاۃ وصول کرنا چاہی تو وہ کہنے لگے، آپ یہ نہیں کر سکتے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: ''ان پر زکاۃ نہیں۔''[2] اسے دار قطنی، حاکم نے اور اثرم نے اپنی سنن میں نقل کیا اور یہ قوی مرسل ہے، بقول موسیٰ بن طلحہ رحمہ اللہ کے نبی کریم ﷺ سے ان پانچ اجناس کی زکاۃ منقول ہے: گندم، جو، سلت (یہ جو کی ایک نوع ہے) منقہ اور کھجور، ان کے ماسوا زمین کی کسی پیداوار پر عشر عائد نہیں اور کہا: سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے سبزیوں پر زکاۃ وصول نہ کی تھی،[3] امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ سب احادیث مرسل ہیں، البتہ یہ متعدد طرق ہیں، جو ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، پھر ان کی تائید میں کئی صحابہ مثلاً سیدنا عمر، علی اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں، امام اثرم رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایک عامل نے انہیں خط لکھا، جس میں انار اور شفتالو کی زکاۃ کے بارے دریافت کیا، جن کی پیداوار انگوروں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، تو انہیں لکھا ان پر عشر عائد نہیں، یہ جنگلی کانٹے دار (ببول وغیرہ) درختوں کی مانند ہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں اہلِ علم کا عمل اسی پر ہے کہ سبزیوں پر عشر عائد نہیں، بقول امام قرطبی رحمہ اللہ زکاۃ دراصل مقتات (غذائی اجناس) سے متعلق ہے، نہ کہ ان سبزیوں میں، طائف میں انار، شفتالو اور لیموں کی فصل عام تھی، تو ثابت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان پر عشر لیا ہو اور نہ خلفاء میں سے کسی نے، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: گھوڑوں، غلام ولونڈی، خچروں، گدھوں، سبزیوں، خربوزوں اور وہ پھل جن کا کیل (یا وزن) نہیں کیا جاتا اور کیے جاتے ہیں، ماسوائے انگوروں اور تازہ کھجوروں کے کہ اس سے فی الجملہ زکاۃ لی جائے گی، چاہے خشک حالت میں ہوں یا تر حالت میں، تو دیگر مذکورہ سب کا عشر آپ کی ہدی وسنت سے ثابت نہیں۔

فقہاء کی آراء

اس امر پر تو اتفاق ہے کہ زرعی پیداوار اور پھلوں پر زکاۃ عائد ہے، اختلاف دراصل ان اصناف کے بارے ہے، جن پر زکاۃ واجب ہے، تو اس ضمن میں کئی آراء ہیں، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

① امام حسن بصری، ثوری اور شعبی رحمہم اللہ کی رائے

ان کے نزدیک عشر نہیں مگر انہی اجناس پر جو منصوص علیہ ہیں (جن کا ذکر سنت میں ہوا) اور یہ گندم، جو، مکئی، کھجور اور منقہ ہیں، کیونکہ ان کے ماسوا میں کسی کا ذکر وارد نہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی رائے کو حق قرار دیا ہے۔

---

① ضعیف، سنن ابن ماجہ: ۱۸۱۵. ② صحیح، السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ١٢٩؛ سنن دار قطنی: ٢/ ٩٧.
③ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ١٢٩.

② امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے

ان کے نزدیک زمین کی اگائی ہر فصل پر عشر عائد ہے، اس ضمن میں سبزیوں اور دیگر میں کوئی فرق نہیں، بس شرط یہ ہے کہ ان کی زراعت سے قصد زمین سے غلہ کا حصول اور اس کا قابلِ کاشت رکھنا تھا انہوں نے ایندھن، بانس، گھاس پھوس اور ان درختوں کا استثنا کیا جو ثمر آور نہیں، ان کا استدلال نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے عموم سے ہے: «فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ» ''بارانی کھیتی میں عشر ہے۔''[1] اسے جماعت نے تخریج کیا، تو یہ عام ہے، جو تمام اصناف و اجناس کو متناول ہے اور اس لیے کہ ان کی کاشت سے مقصد زمین کی نماء ہے تو یہ اجناس سے مشابہ ہے۔

③ امام ابو یوسف اور امام محمد (صاحبین) رحمہما اللہ کی رائے

ان کے نزدیک بھی زمین کی سب پیداوار پر زکاۃ عائد ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بغیر علاجِ کثیر (خصوصی اہتمام اور بندوبست کیے) سال بھر تک باقی رہ سکے (اگر ذخیرہ کی جائے تو سال بھر خراب نہ ہو) چاہے پیداوار مکیل ہو (جن کا کیل ہو) جیسے اجناس، یا موزون ہو (جن کا وزن کیا جاتا ہے) جیسے روئی اور چینی، اگر ایسی فصل ہے جو سال بھر ذخیرہ نہیں ہوسکتی، جیسے ککڑی، کھیرا، خربوزہ اور اس جیسی سبزیاں اور پھل تو ان میں زکاۃ نہیں۔

④ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

ان کے ہاں زمین کی پیداوار پر وجوبِ زکاۃ کی شرط یہ ہے کہ وہ باقی رہ سکے اور خشک ہو کر بھی قابلِ استعمال ہو اور اس کے اگنے میں انسانوں کی محنت شامل ہو، برابر ہے کہ مقتات ہو، جیسے گندم، جو یا غیر مقتات، جیسے تل اور عصفر کا دانہ، ان کے نزدیک سبزیوں، انجیر، انار اور سیب جیسے پھلوں میں زکاۃ نہیں۔

⑤ امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف

زمین کی ہر پیداوار میں زکاۃ ہے، بشرطیکہ کہ وہ غذا کے طور پر مستعمل ہو، انسانوں نے اسے کاشت کیا ہو، جیسے گندم اور جو ہیں، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہمارا مذہب (مذہبِ شافعی) یہ ہے کہ اشجار میں سوائے انگوروں اور کھجوروں کے کسی پر زکاۃ نہیں اور اجناس سے انہی میں جو ذخیرہ کی جاتی اور بطورِ غذا استعمال کی جاتی ہیں (جیسا کہ ان کا ذکر گزرا) اور سبزیوں میں زکاۃ نہیں، امام احمد رحمہ اللہ زمین کی ہر اس پیداوار (اجناس اور پھلوں) میں زکاۃ کے وجوب کے قائل ہیں، جو خشک ہو جاتی اور باقی رہتی ہیں اور جن کا ماپ کیا جاتا ہے اور لوگوں نے اپنی زمینوں میں انہیں کاشت کیا ہو، چاہے وہ غذا ہوں جیسے گندم یا وہ قطنیات سے ہوں (یہ سوائے گندم اور جو کے دیگر حبوب، ان کا یہ نام اس لیے پڑا کہ انہیں گھروں میں ذخیرہ کیا جاتا ہے مثلاً دالیں اور چنے وغیرہ) یا ابازیز سے ہوں، جیسے دھنیا اور زیرہ یا بیجوں میں سے ہوں جیسے السی کا بیج، کھیرا اور ککڑی یا ترکاریوں

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٨٣؛ سنن أبي داود: ١٥٩٦.

کے بیج، ان کے نزدیک ان خشک پھلوں پر بھی زکاۃ عائد ہے جو ان اوصاف کے جامع ہوں جیسے کھجور، منقہ، کشمش، انجیر، بادام، بندق (یہ ایک درخت ہے جس میں پھل لگتا ہے) اور پستہ ہیں، دیگر پھلوں میں ان کے نزدیک زکاۃ عائد نہیں مثلاً اخروٹ، امرود، سیب اور وہ کشمش اور انجیر جو خشک نہیں کیے جاتے اور نہ سبزیوں میں جیسے ککڑی، کھیرا، خربوزہ، شلجم اور گاجر۔

زیتون کی زکاۃ

امام نووی رحمہ اللہ کے بقول زیتون پر ہمارے ہاں زکاۃ واجب نہیں اور یہی امام حسن بن صالح، ابن ابولیلی اور ابوعبید رحمہم اللہ کا قول ہے، امام زہری، اوزاعی، لیث، مالک، ثوری، ابو حنیفہ اور ابو ثور رحمہم اللہ کے نزدیک اس میں زکاۃ ہے، زہری، لیث اور اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا: پیداوار کا اندازہ کر کے تیل کی صورت میں زکاۃ نکالی جائے، امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ نچوڑ لینے کے بعد اس کا عشر وصول کیا جائے، اگر یہ پانچ وسق ہو۔

اختلافِ مذکور کا سبب اور اس کا نتیجہ

امام ابن رشد رحمہ اللہ لکھتے ہیں، ان حضرات کے درمیان جو زکاۃ کو مجمع علیہ اصناف پر مقصور کرتے ہیں اور ان کے درمیان جو اسے ہر مدخر (جسے ذخیرہ کیا جائے) اور مقتات (غذائی جنس) پر عائد سمجھتے ہیں، اختلاف کا سبب یہ ہے کہ پہلوں کے نزدیک زکاۃ کا صرف چار اصناف کے ساتھ متعلق ہونا آیا، ان کے عین کے مدِنظر ہے یا ان میں موجود کسی علت کے مدِنظر؟ اور یہ ان کا بطورِ غذا استعمال۔ تو جس نے کہا: ان کے عین (وجود) کے مدنظر ہے، تو اس نے وجوب کو انہی چار پر مقصور کیا اور جنہوں نے کہا: یہ علتِ اقتیات کی وجہ سے ہے، تو اس نے تمام غذائی اجناس پر زکاۃ کا اجرا کیا، اسی طرح غذائی اجناس پر قصرِ وجوب کرنے والوں اور ان حضرات کے درمیان جو زمین سے اگنے والی ہر چیز پر زکاۃ عائد کرتے ہیں، ماسوائے ان اشیا کے جن کی عدم زکاۃ پر اجماع ہوا، مثلاً گھاس، ایندھن اور بانس، کے مابین اختلاف کا سبب قیاس کا لفظ کے عموم کے معارض ہونا ہے، تو لفظ عموم کو مقتضی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: «فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ» [1] اور (ما) بمعنی (الذی) ہے، جو عموم کے الفاظ سے ہے، اسی طرح یہ آیت: (وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ) الآیۃ، اس کے آخر میں کہا: ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الأنعام: ١٤١) ''کٹائی کے دن ہی اس کا حق ادا کرو۔'' جہاں تک قیاس کا تعلق ہے، تو وہ یہ کہ زکاۃ کے ساتھ مقصود بھوک کا مداوا ہے اور یہ عموماً اسی چیز کے ساتھ ہوگا، جو غذا ہوتی ہے، تو جن حضرات نے عموم کو اس قیاس کے ساتھ خاص کیا، انہوں نے غیر مقتات اشیا پر زکاۃ کا اجرا نہیں کیا اور جنہوں نے عموم کے پہلو کو ترجیح دی، ان کے نزدیک دیگر اشیا بھی زکاۃ کے دائرہ میں داخل ہیں، ماسوائے ان کے جن کا اخراج اجماع نے کیا، جو حضرات مقتات پر متفق ہیں، ان کا کئی اشیا بارے ذیلی اختلاف ہوا کہ کیا یہ مقتات ہیں یا نہیں؟ اور کیا متفق علیہ اشیا پر قیاس کر کے کئی دیگر اشیا (جو بھی مقتات ہوں مثلاً جو عہدِ نبوی میں موجود نہ تھیں، بعد کی پیداوار ہیں لیکن وہ مقتات ہیں) پر

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٥٩٦.

زکاۃ عائد کی جاسکتی ہے؟ جیسے امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے زیتون کے بارہ میں باہم اختلاف کیا، امام مالک رحمہ اللہ اس میں وجوبِ زکاۃ کے قائل ہیں، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے آخری عمر میں جب وہ مصر میں تھے، اس سے منع کیا، اختلاف کا سبب یہی کہ آیا زیتون غذا ہے یا نہیں؟

زرعی پیداوار اور پھلوں کی زکاۃ کا نصاب

اکثر اہلِ علم کا مؤقف ہے کہ پھل اور زرعی اجناس میں تب تک زکاۃ واجب نہ ہوگی، جب تک وہ پانچ وسق نہ ہوں، چھلکا اور توڑی صاف کر کے، اگر چھلکا صاف نہ کیا جائے، تب اس کا نصاب دس وسق ہے چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ وسق سے کم میں زکاۃ نہیں۔''[1] اسے احمد اور بیہقی نے جید سند سے نقل کیا سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھجوریں اور اجناس اگر پانچ وسق سے کم ہیں، تو ان پر زکاۃ عائد نہیں۔''[2] وسق بالا جماع ساٹھ صاع ہے،[3] یہ صراحت سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے اور یہ منقطع حدیث ہے، امام ابوحنیفہ اور امام مجاہد رحمہما اللہ کی رائے ہے کہ قلیل وکثیر سب میں زکاۃ واجب ہے، کیونکہ حدیث: «فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ»[4] عام ہے اور اس لیے کہ اس میں سال گزرنے کی قید نہیں، لہٰذا نصاب کی بھی قید نہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ اس رائے کا مناقشہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: صریح صحیح اور محکم روایات میں عشر والی اجناس کا نصاب پانچ وسق مذکور ہے، جہاں تک حدیثِ مذکور جس کی طرف استناد کرتے ہوئے نصاب کی قید کا الغا کیا اور کہا: یہ قلیل وکثیر سب کو متناول ہے اور خاص اس کے معارض ہے اور عام کی دلالت قطعی ہے، خاص کی طرح اور جب دونوں باہم متعارض ہوں، تو احوط کو مقدم رکھا جائے اور یہ وجوبِ زکاۃ ہے، تاکہ دونوں حدیثوں پر عمل ممکن ہو سکے اور دونوں میں سے کسی ایک کا دوسری کے ساتھ رد کرنا (رد کرنا) جائز نہیں، تاکہ کلیۃً کسی ایک کا الغا نہ ہو، لہٰذا اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے، تاکہ اس فرمان پر بھی عمل ہو اور اس فرمان پر بھی، لکھتے ہیں: درحقیقت (ان کے دعویٰ کے برعکس) ان دونوں حدیثوں کے درمیان کسی بھی طور کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ آپ کا فرمان: «فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ» کے ساتھ دراصل اس پیداوار کو ممیز کرنا مقصود تھا، جس پر عشر ہے، اس پیداوار سے جس پر نصف عشر ہے، رہی مقدار تو یہ حدیث اس بارے میں ساکت ہے اور دوسری حدیث میں نصاب مذکور ہے، تو اس صریح صحیح اور محکم نص سے کیونکر عدول جائز ہے جو کسی تاویل کی بھی محتمل نہیں؟ اور کیوں مجمل ومتشابہ نص کو مدِ نظر رکھا جائے، جس کی غایت یہ ہے کہ وہ عموم سے متعلق ہے، انہوں نے خاص، محکم اور مبین کے ساتھ اس کے بیان کا قصد کیوں نہیں کیا، جیسے دیگر عمومات کے بارے ہوتا ہے کہ ان کی مخصص نصوص کے ساتھ تبیین کی جاتی ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فرمانِ نبوی: «لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ» متفق علیہ خاص ہے،

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٠٥؛ صحيح مسلم: ٩٧٩. [2] صحيح، سنن أبي داود: ١٥٥٨. [3] ضعيف، سنن أبي داود: ١٥٥٩. [4] صحيح البخاري: ١٤٨٣؛ سنن أبي داود: ١٥٩٦.

جس کی تقدیم اوران کی ذکر کردہ روایت کے عموم کی تخصیص واجب ہے، جیسے ہم نے حدیث: «فِيْ كُلِّ سَائِمَةٍ مِنَ الْإِبِلِ الزَّكَاةُ» [1] کو اس حدیث کے ساتھ خاص کیا: «لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسٍ ذَوْدٍ صَدَقَةٌ» ''پانچ سے کم اونٹوں میں زکاۃ نہیں۔'' [2] اورحدیث: «فِي الرِّقَةِ رُبْعُ الْعُشْرِ» ''چاندی میں دسویں حصہ کا چوتھائی۔'' [3] کو اس حدیث کے ساتھ: «لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ أَوَاقٍ صَدَقَةٌ» ''پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکاۃ نہیں۔'' اوراس لیے کہ یہ بھی مال ہے، جس میں زکاۃ واجب ہے، تو تمام زکوۃ والے اموال جن پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے۔ کی طرح قلیل مقدار پر زکاۃ عائد نہ ہوگی، ان کی نسبت سال گزرنے کی قید اس لیے نہیں کہ ان کی کٹائی کے ساتھ ہی ان کا نماء مکمل ہو جاتا ہے، نہ کہ ان کا ذخیرہ کرنے کے ساتھ اور دیگر میں سال گزرنے کی قید لگائی گئی کیونکہ ان میں کمالِ نماء کا مظنہ سال گزرنا ہے اور نصاب کا اعتبار اس لیے کیا تا کہ اتنی مقدار ہو کہ (اپنے اہل وعیال کو غذا کی فراہمی کے بعد) دوسرے مستحقین کی مواسات کر سکے، کیونکہ زکاۃ صرف مالداروں پر عائد کی گئی ہے اور مالداری کا حصول نصاب کے بغیر نہ ہوگا، جیسے دیگر زکوۃ والے اموال ہیں۔

صاع کی مقدار ساڑھے تین سیر ہے، اگر ایسی پیداوار ہے، جس کا کیل نہیں کیا جاتا، تو امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے زعفران، روئی اور جو وزن کی جانے والی اشیا ان کے ساتھ ملحق ہیں، کے بارے لکھا کہ ان کا نصاب سولہ سو عراقی رطل ہے تو یہ وزن پانچ وسق کے قائم مقام ہے اور عراقی رطل تقریبا ایک سو تیس درہم (کے وزن) کا ہے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے بقول اگر ایسی پیداوار ہے جس کا کیل نہیں ہوتا، تو اس میں زکاۃ واجب نہ ہوگی مگر جب اس کی قیمت اس کے سب سے چھوٹے پیمانے کے بقدر کی قیمت کے برابر پہنچے، تو روئی میں زکاۃ تب لاگو ہوگی جب اس کی قیمت پانچ وسق کو پہنچ جائے مثلاً گندم وغیرہ کے پانچ وسق کی قیمت کو کیونکہ بنفسہٖ اس کا اعتبار ممکن نہیں، لہٰذا اس کے غیر کے ساتھ حساب کیا جائے گا، جیسے سامانِ تجارت کی نسبت بھی یہی ضابطہ روبعمل ہوگا کہ سونا چاندی کے نصاب میں سے جس کی قیمت دوسرے کی نسبت کم ہوگی، تو جب اس کے مساوی اس کی قیمت ہوگی، تو زکاۃ عائد ہوگی، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: لازم ہے کہ وہ پانچ گنا ہو، اپنے رائج اعلیٰ ترین پیمانے کے حجم سے، تو روئی میں زکاۃ واجب نہ ہوگی، اِلَّا یہ کہ پانچ قناطیر کی مقدار میں ہو، کیونکہ زکاۃ عائد کرنے کے لیے وسق کے ساتھ اندازہ لگانا، ان اجناس کے ضمن میں جن کا وسق ہوتا ہے، اس اعتبار سے ہے کہ وہ ان کے کیل یا وزن کا اعلیٰ ترین پیمانہ ہے (گویا ضابطہ ان کے ہاں یہ ہوا کہ دیگر ہر جنس اپنے اعلیٰ ترین پیمانہ جو بھی ہو، کا اگر پانچ گنا ہے، تب اس پر زکاۃ عائد ہوگی)۔

زکاۃ کی شرح

پانی لگانے کے طریقوں کے مختلف ہونے سے زکاۃ کی شرح میں فرق پڑے گا، تو اگر کسی پیداوار کو بارانی پانی لگا، تو اس میں عشر ہے، لیکن اگر کسی آلے وغیرہ کے ساتھ یا قیمتاً پانی لگا ہو تو اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] صحیح، سنن أبي داود: ١٥٦٧؛ سنن نسائی: ٥/ ٢٩. [2] صحیح البخاری: ١٤٠٥؛ صحیح مسلم: ٩٧٩.

[3] صحیح، سنن أبی داود: ١٥٦٧؛ سنن ترمذی: ٦٢٠.

مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بارش یا سیلاب یا خودکار ندی کے ذریعہ سیراب ہونے والی فصل میں عشر ہے اور جس کھیت کو کنویں سے یا جانور کی مدد سے نہر سے پانی لگایا گیا، تو اس میں نصف عشر ہے۔''[1] اسے بیہقی اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: صحیح ہے، یہی بات امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جن فصلوں کو بارش اور چشمے سیراب کریں، ان میں دسواں حصہ (زکاۃ) ہے اور جن فصلوں کو (رہٹ سے) پانی کھینچ کر سیراب کیا جائے، ان میں بیسواں حصہ (زکاۃ) ہے۔[2] اگر کچھ کو بارش اور کچھ کو اس کی محنت سے پانی لگا ہو تو اگر دونوں مساوی ہیں، تو اس کی زکاۃ عشر کا تین بٹا چار ہوگی، بقول امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ہم اس میں اختلاف نہیں پاتے اور اگر ایک طریقہ زیادہ دفعہ مستعمل ہوا، تو امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک اقل کا حکم اکثر کے حکم کے تابع ہوگا، امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے، کھیتی باڑی کے اخراجات مثلاً کٹائی، اٹھوائی، بالیوں سے اس کے اخراج، صفائی اور نگرانی وغیرہ کے تو یہ مالک کے خالص مال سے ادا ہوں گے زکاۃ کے مال سے انہیں منہا نہ کیا جائے گا، سیدنا ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا موقف تھا کہ یہ اخراجات پیداوار سے منہا کر لیے جائیں، جابر بن زید نے سیدنا ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اس آدمی کے بارے نقل کیا، جو قرض لے کر اسے اپنی کاشتکاری اور اہل وعیال پر خرچ کرے، تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: پیداوار ہونے پر سب سے قبل قرض ادا کرے پھر باقی پیداوار (اگر وہ پانچ وسق نکلے) کی زکاۃ نکالے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کھیت پر جو رقم لگی اسے منہا کرے، پھر باقی کی زکاۃ نکالے، اسے امام یحییٰ بن آدم رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں نقل کیا، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے عطا کے بارے نقل کیا کہ وہ بھی ان اخراجات کے منہا کرنے کے قائل تھے اور باقی کا اگر نصاب کامل ہے تو اس کی زکاۃ نکالے ورنہ نہیں۔

خراجی زمین کی زکاۃ

زرعی زمین درج ذیل اقسام کی طرف تقسیم کی گئی ہے:

① عشری زمین

یہ جس کا مالک اپنی رضامندی سے اسلام لے آیا، یا وہ جسے بزورِ شمشیر فتح کیا گیا اور فاتحین کے درمیان تقسیم کی گئی یا (کسی کی ملکیت نہ تھی تو) مسلمانوں نے اسے آباد کیا۔

② خراجی زمین

جو بزورِ بازو فتح کی گئی اور اسے فصل کی ایک متعین مقدار دینے کی شرط پر اس کے مالکوں کے ہاتھ میں ہی چھوڑا گیا،

---

[1] ضعیف، المستدرك للحاكم: ۱/ ۴۰۱؛ السنن الكبرى للبيهقي: ۴/ ۱۲۹؛ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] صحيح البخاري: ۱۴۸۳؛ سنن ابن ماجه: ۱۸۱۶.

زکاۃ جیسے عشری زمین پر عائد ہے، اسی طرح خراجی زمین پر بھی ہے، اگر اس کے مالک اسلام لے آئیں یا اگر کسی مسلمان نے اسے خرید لیا ہے، تب اس کا عشر بھی دینا ہوگا اور خراج بھی، دونوں میں سے ایک کا وجوب دوسرے کے لیے مانع نہیں، امام بقول ابن منذر رحمہ اللہ یہی اکثر علماء کا قول ہے، عمر بن عبد العزیز، ربیعہ، زہری، یحییٰ انصاری، مالک، اوزاعی، حسن بن صالح، ابن ابو لیلی، لیث، ابن مبارک، احمد، اسحق، ابو عبید رحمہم اللہ اور داود بھی یہی رائے رکھتے تھے، اس پر ان کا استدلال کتاب وسنت اور قیاس سے ہے۔

جہاں تک کتاب تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ (البقرۃ: ۲٦۷)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔''

تو مطلقاً ادائیگی زکاۃ کا ایجاب کیا چاہے وہ خراجی زمین ہو یا عشری ہو، جہاں تک سنت تو آپ کا یہ فرمان: ((فِیْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ)) یہ بھی عام ہے جو خراجی اور عشری دونوں کو متناول ہے، رہا قیاس تو اس لیے کہ زکاۃ اور خراج مستحقین کا حق ہیں، جن کا سبب الگ الگ ہے، تو ایک دوسرے کے لیے مانع نہیں، جیسے کوئی حالتِ احرام میں کسی کا مملوک شکار قتل کر ڈالے اور اس لیے کہ عشر نص کے ساتھ واجب ہے، تو اس سے خراج مانع نہ ہوگا جو اجتہاد کے ساتھ واجب ہوا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے میں خراجی زمین میں زکاۃ نہیں اور اس میں فقط خراج ہی واجب رہے گا، جو (کسی مسلمان کی مملوکہ ہونے سے) پہلے تھا اور وجوب عشر کی شروط میں سے ہے کہ زمین خراجی نہ ہو۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ادلہ اور ان کا مناقشہ

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے مذہب کے لیے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا جو کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان کی ملکیتی زمین میں عشر اور خراج اکٹھے نہیں ہو سکتے۔''[1] اس حدیث کے ضعف پر اجماع ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ عن حماد عن ابراہیم نخعی عن علقمہ عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے روایت کرنے میں یحییٰ بن عنبسہ منفرد ہیں، بیہقی نے السنن والآثار میں لکھا، اس مذکور کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے حماد عن ابراہیم سے ان کے قول کے بطور نقل کیا، لیکن یحییٰ مذکور نے اسے مرفوع بنا دیا اور یحییٰ کا ضعف ڈھکی چھپی بات نہیں، وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع روایتیں نقل کیا کرتا تھا، یہ بات احمد بن عدی الحافظ نے کہی، جیسا کہ ہمیں ابو سعید مالینی نے ان سے خبر دی، ائمہ احناف میں سے کمال بن ہمام نے بھی یحییٰ کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ان کی دوسری دلیل احمد، مسلم اور ابو داود کی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ روایت ہے، کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الکامل لابن عدی: ۷/ ۲۵۵؛ الموضوعات لابن الجوزی: ۱/ ۱۵۱۔

«مَنَعَتِ الْعِرَاقُ قَفِيزَهَا وَدِرْهَمَهَا وَمَنَعَتِ الشَّامُ مُدَّيَهَا وَدِينَارَهَا وَ مَنَعَتِ مِصْرُ إِرْدبها وَدِينَارَهَا وَعُدْتُمْ مِنْ حَيْثُ بَدَأْتُمْ» ''عراق نے اپنا قفیز (یہ ایک پیمانہ تھا) اور درہم روک لیا، اسی طرح شام نے اپنا مد (یہ بھی ایک پیمانہ تھا) اور دینار اور مصر نے اپنا اردب اور دینار اور تم ابتدا کی جانب لوٹے۔''[1] تین مرتبہ یہ کہا، (بقول محشی اس حدیث سے وجہِ دلالت کہ یہ اس صورتحال کے بارے پیشین گوئی ہے جو پیدا ہوگی کہ واجب حقوق کی تلفی ہوگی اور یہ خراج سے عبارت ہے، تو اگر عشر واجب ہوتا تو اس کے ساتھ اس کا بھی ذکر کرتے) اس حدیث میں خراجی زمین سے زکاۃ کی عدم وصولی پر دلالت نہیں، علماء نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ ان ممالک کے باشندے آخر کار اسلام قبول کر لیں گے اور ان سے جزیہ ساقط ہو جائے گا، یہ آخر الزمان میں واقع ہونے والے فتنوں کی طرف اشارہ ہے جن کا نتیجہ زکاۃ و جزیہ جیسے حقوق کے منع کی صورت نکلے گا، امام نووی رحمہ اللہ نے یہ دونوں تاویلیں ذکر کر کے لکھا، اگر حدیث کا معنی ان (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہمنواؤں) کے حسبِ زعم ہوتا تو اس سے لازم آتا کہ وہاں درہم و دینار اور سامانِ تجارت کی بھی زکاۃ وصول نہ کی جائے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔

ان کی تیسری دلیل یہ کہ مروی ہے کہ دہقان بہر الملک جب مسلمان ہوا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس کی زمین اس کے حوالے کر دی جائے اور اس سے خراج وصول کیا جائے، تو یہ خراج کے اخذ میں صریح ہے، جبکہ عشر وصول نہ کرنے کا حکم صریح نہیں، تو ثابت یہ ہوا کہ کسی کے اسلام لانے سے خراج ساقط نہ ہوگا، جبکہ عشر کا سقوط لازم نہیں، خراج کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کے قبولِ اسلام کی وجہ سے اس کے سقوط کا توہم ہو سکتا تھا، جزیہ کی مانند اور عشر تو معلوم امر ہے کہ وہ آزاد مسلمان پر واجب ہے تو اس کے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی، جیسے مویشیوں اور درہم و دینار کی زکاۃ اس سے لینے کا بھی ذکر نہیں کیا یا اس لیے کہ اس دہقان کے پاس اتنی زمین نہ تھی جس پر عشر عائد ہوتا۔

چوتھی دلیل یہ کہ ولاۃ و عمال کا فعل عشر اور خراج کے مابین عدم جمع کا ہے، بقول مؤلف ان کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے نقل کیا کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے خراج اور عشر کے مابین جمع کیا تھا۔

پانچویں دلیل یہ کہ خراج عشر سے جداگانہ حیثیت میں ہے، کیونکہ خراج عقوبۃً جبکہ عشر عبادۃً واجب ہے اور ایک شخص میں دونوں کا اجتماع ممکن نہیں کہ اس پر دونوں اکٹھے واجب ہوں اور یہ حالتِ ابتدا میں تو ممکن لیکن حالتِ بقا میں ممنوع ہے اور خراج کی سب صورتوں کی اساس قہر و غلبہ نہیں بلکہ بعض دفعہ تو بغیر قہر و قوت کے بھی روبعمل ہوا ہے، جیسے ارضِ خراج سے قریبی زمین یا جسے چھوٹے ندی نالوں کے پانی کے ساتھ سیراب کیا۔

ان کی چھٹی دلیل یہ ہے کہ خراج اور عشر کا سبب ایک ہے اور وہ ارضِ نامیہ (بڑھوتی والی/ قابلِ کاشت) ہونا حقیقۃً یا حکماً، اس کی دلیل یہ کہ اگر بالفرض وہ شور والی زمین ہو، جس سے کوئی پیداوار حاصل نہیں ہوتی، تو نہ اس میں عشر عائد ہوگا اور نہ خراج، تو

---

[1] صحيح مسلم: ٢٨٩٦؛ سنن أبي داود: ٣٠٣٥.

جب سبب ایک ہے تو ایک زمین پر دونوں کا اجرا نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ایک سبب کے ساتھ ایک ہی نوع کے دو حق متعلق نہیں کیے جا سکتے، جیسے کوئی اونٹوں کے نصاب کا مالک بنا سال کی تجارت کے لیے تو اب اس کے ذمہ دو زکاتیں عائد نہ ہوں گی (کہ اونٹوں کی بھی زکاۃ دے اور ان کے بیچنے سے حاصل شدہ رقم کی بھی) جواب یہ ہے کہ معاملہ یہ نہیں، عشر کا سبب زمین سے حاصل ہونے والی فصل ہے، جبکہ خراج (فصل پر نہیں بلکہ) زمین پر ہے، چاہے اسے کاشت کرے یا ویسے ہی چھوڑے رکھے، بالفرض اگر سبب ایک ہونا تسلیم بھی کر لیں تو ایک ہی سبب کے ساتھ دو وظیفوں کے متعلق ہونے سے کچھ مانع نہیں، جو زمین ہے جیسا کہ کمال بن ہمام نے لکھا۔

کرائے پر لی زمین کی پیداوار کی زکاۃ

جمہور علماء کی رائے ہے کہ جس نے پٹے پر زمین لے کر کاشتکاری کی تو اب زکاۃ اس کے ذمہ ہے نہ کہ مالک کے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں زکاۃ مالک پر عائد ہے، امام ابن رشد رحمہ اللہ لکھتے یں ان کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کیا عشر حقِ زمین ہے یا حقِ پیداوار؟ تو ان کے نزدیک عشر ان دو میں سے ایک کا حق ہے تو اس بابت اختلاف کیا کہ دونوں میں سے کون اَولی ہے کہ اسے موضعِ انفاق کی طرف منسوب کیا جائے؟ اور وہ پیداوار اور زمین کا ایک مالک کے لیے ہونا تو جمہور کی رائے یہ بنی کہ یہ وہ جس میں زکاۃ واجب ہوتی ہے اور وہ ہے پیداوار جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا میلان یہ ہوا کہ وہ جو اصلِ وجوب ہے جو کہ زمین ہے (لہٰذا زمین کے مالک پر زکاۃ عائد ہے) امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے جمہور کی رائے کو راجح قرار دیا اور کہا: زکاۃ پیداوار میں واجب ہوتی ہے، مالک کے ذمہ زکاۃ قیمت کی طرح عائد ہوگی (وہ حاصل شدہ کرائے کی زکاۃ بشرطِ نصاب ادا کرے گا) اگر بغرضِ تجارت یہ کیا ہے، اسے حقِ زمین قرار دینا صحیح نہیں کہ اگر یہ ہوتا تب کاشت نہ کرنے کی صورت میں بھی عشر عائد ہوتا، جیسے خراج ہے اور پھر یہ زمین کی شرح سے طے کی گئی ہوتی نہ کہ حاصل شدہ پیداوار کی شرح سے اور پھر اسے فے کے مصارف میں صرف کرنا واجب ہوتا نہ کہ مصارفِ زکاۃ میں۔

کھجوروں اور انگوروں کے نصاب کا اندازہ بذریعہ تخمینہ لگا کر نہ کہ تول کر

جب کھجوروں اور انگوروں کے درختوں پر بُور آ جائے اور صاف لگے کہ پھل اب پکے گا (خراب نہ ہوگا) تو اس کے نصاب کا اندازہ تخمینہ کے ساتھ ہوگا، نہ کہ تولنے کے ساتھ، اس کا طریقہ یہ کہ کوئی امانت دار اور تجربہ کار شخص ملاحظہ کر کے تخمینہ لگائے کہ اتنی پیداوار ہوگی پھر اس کی زکاۃ طے کرے، پھر جب فصل خشک ہو تو اس کے لگائے گئے اندازہ پر مقرر کردہ زکاۃ ادا کی جائے (اس صورت میں کہ پھل خشک کرنا) سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوۂ تبوک کے سفر پر تھے، جب وادی قریٰ پہنچے تو ایک عورت اپنے باغ میں تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا کہ اس کے باغ کی پیداوار کا اندازہ لگاؤ، خود آپ نے فرمایا: ''دس وسق ہوں گے۔'' اسے ہدایت کی کہ ''پیداوار کا حساب رکھے۔''[1] اسے بخاری نے نقل کیا تو یہ

[1] صحيح البخاري: ١٤٨١؛ صحيح مسلم: ١٣٩٢.

سنت نبوی ہے اور بعد میں صحابہ کا اسی پر عمل تھا اور یہی اکثر اہل علم کا یہ مختار ہے (امام مالک رحمہ اللہ کے بقول یہ واجب ہے، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے سنت قرار دیا) احناف نے مخالفت کی، کیونکہ تخمینہ ایک ظن و گمان ہے، تو اس کے ساتھ شرعی حکم لازم نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی رائے درست نہیں، سنتِ نبوی ہی اہدیٰ ہے اور تخمینہ کا تعلق ظن و گمان سے نہیں، بلکہ یہ پھلوں کی مقدار کی معرفت میں اجتہاد ہے، اس طرح کا جو تلف شدہ املاک کی تقویم (قیمت لگانے) میں کیا جاتا ہے! تخمینہ لگانے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ عموماً تازہ پھل تیزی سے تناول کر لیے جاتے ہیں، تو اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کھائے جانے اور اتارے جانے سے پیشتر ان کا تخمینہ لگے، پھر جب زکاۃ کی شرح طے ہو چکی تو ان کے مالک جو چاہیں تصرف کریں، اندازہ لگانے والے کو چاہیے کہ وہ توسّع کرتے ہوئے ثلث یا ربع مقدار شامل نہ کرے تا کہ اس مقدار کو مالکوں، ان کے مہمانوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے لیے چھوڑ دے پھر آفت کو بھی ذہن میں رکھے کہ کچھ پرندے کھا جائیں گے اور کچھ راہی اور کچھ آندھیوں سے ضائع ہوں گے، لہٰذا ضروری ہے کہ اندازہ لگاتے ہوئے ثلث یا ربع مقدار منہا رکھے، وگرنہ مالکوں کو نقصان ہوگا، سیدنا سہل بن ابوحثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''جب تخمینہ لگاؤ تو ثلث یا ربع کو شامل نہ کیا کرو۔''[1] اسے احمد، سوائے ابن ماجہ کے اصحابِ سنن، حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دے کر تخریج کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ اکثر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، بشیر بن سیار سے مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوحثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو اہلِ اسلام کے اموال کے تخمینہ پر مامور کیا اور ہدایت دی، اگر پاؤ کہ لوگ پھل پکنے کے موسم میں اپنے باغوں میں قیام پذیر ہیں، تو ان کے کھانے کی مقدار کو تخمینہ میں شامل نہ کرنا۔[2] امام مکحول رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خُراص (تخمینہ لگانے والوں) کو روانہ کرتے تو ہدایت دیتے کہ لوگوں پر تخفیف کرنا کہ «فَإِنَّ فِي الْمَالِ الْعَرِيَّةَ وَالْوَاطِئَةَ وَالْآكِلَةَ» ''یقیناً مال میں موہوب لہ، مسافروں اور کھانے والوں کا حق ہوتا ہے۔'' یعنی قابلِ زکاۃ پیداوار سے وہ مقدار منہا کر دو جو کسی کو کھانے کے لیے دے دے اور جو دوست احباب کھا لیں۔ اسے ابو عبید نے نقل کیا اور کہا: (الواطئۃ) سے مراد (السابلۃ) راہ چلتے لوگ ہیں) ان کا یہ تسمیہ اس وجہ سے پڑا کہ وہ باغات کو گزرتے ہوئے روندتے ہیں، آکلۃ سے مراد مالک اور اس کے دوست واحباب ہیں۔

مالک کے لیے جائز ہے کہ کٹائی سے قبل پیداوار میں سے کھاتا رہے اور اسے حساب میں شامل نہ کیا جائے گا، کیونکہ عموماً یہ کوئی زیادہ مقدار نہیں ہوتی، یہ اسی طرح کا معاملہ ہے، جو پھلوں والے اتارنے سے قبل اور اتارتے ہوئے تھوڑا بہت کھاتے رہتے ہیں، تو جب فصل کی کٹائی اور چھلکوں وغیرہ سے صفائی کی جائے تو حاصل شدہ موجود مقدار کی زکاۃ نکالی جائے، امام احمد رحمہ اللہ سے کاشتکاروں کے درختوں اور کھیتوں سے لے کر کھانے بارے پوچھا گیا، تو کہا: کوئی حرج نہیں کہ حسبِ ضرورت کھاتا رہے، یہی امام شافعی، امام لیث اور امام ابن حزم رحمہم اللہ نے کہا (جبکہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک زکاۃ ادا کرنے کے وقت اسے بھی حساب میں شامل کیا جائے گا)۔

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ١٦٠٥؛ سنن ترمذی: ٦٤٣. [2] ضعیف، کتاب الأموال لابی عبید: ١٤٤٨.

غلہ اور پھلوں کا باہم انضمام کر لینا

علماء متفق ہیں کہ ایک پھل کی مختلف اقسام ایک دوسرے کے ساتھ منضم کی جا سکتی ہیں، چاہے جودت، رداءت اور رنگ کا فرق ہو، اسی طرح منقہ اور گندم کی انواع اور غلہ کی تمام اجناس باہم منضم کی جا سکتی ہیں (بقول محشی اگر عمدہ نوع ردی نوع کے ساتھ منضم کی جائے تو زکاۃ ہر دو کی مقدار کے حساب سے نکالی جائے گی، اگر کوئی پھل متعدد اقسام کا ہے تو اکھٹا کر کے اوسط کے لحاظ سے عشر کی مقدار نکالی جائے) اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ سامانِ تجارت کا اثمان (ان کی مالیت/ قیمتوں) اور اثمان کا سامانِ تجارت کے ساتھ انضمام ہو سکتا ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف اسی جنس کے ساتھ انضمام ہوگا جس کے ساتھ وہ خریدی گئی، کیونکہ اسی کا نصاب معتبر ہے، اس بات پر اتفاق ہے کہ نصاب مکمل کرنے کی خاطر ایک جنس دوسری کے ساتھ منضم نہ کی جائے سوائے اجناس اور پھلوں کے تو مویشیوں کی ایک جنس دوسری جنس کے ساتھ خلط نہ کی جائے، مثلاً اونٹ اور گائیں بلکہ دونوں کا الگ الگ نصاب اگر ہو تو زکاۃ عائد ہوگی، اور پھل اپنی غیرِ جنس کے ساتھ خلط اور منضم نہ کیے جائیں گے تو کھجور منقہ کے ساتھ منضم نہ کی جائے، غلہ کی مختلف اصناف کے باہم انضمام کے بارے اختلاف ہوا، تو اولی اور احق رائے یہ ہے کہ نصاب مکمل کرنے کی غرض سے یہ باہم خلط نہ کی جائیں اور ہر جنس کا نصاب علیحدہ سے پورا کیا جائے، کیونکہ جنس الگ الگ ہے لہٰذا جو گندم کے ساتھ نہ ملائے جائیں اور نہ کھجور منقہ کے ساتھ۔ اور نہ چنے دالوں کے ساتھ! یہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک رائے بھی یہی ہے، کثیر علمائے سلف نے بھی یہی موقف اختیار کیا، بقول ابن منذر اس امر پر اجماع ہے کہ اونٹ، گائے اور بکریوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منضم نہ کیا جائے اور نہ تمر کو منقہ کے ساتھ، مختلف اجناس کے باہم انضمام کر لینے کے قائلین کے پاس کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔

فصلوں اور پھلوں میں زکاۃ کب واجب ہوگی؟

فصل میں زکاۃ تب واجب ہوگی جب دانہ سخت اور موٹا ہو جائے اور پھلوں میں تب جب ان کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے اور اس کی معرفت کچی کھجور کے سرخی مائل ہونے سے ہوگی اور انگوروں میں جب مٹھاس آنا شروع ہو (بقول محشی یہ جمہور کا مذہب ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک فصل اور پھل ظاہر ہوتے ہی زکاۃ واجب ہو جائے گی) اور زکاۃ نہ نکالی جائے گی مگر اجناس کی (چھلکوں وغیرہ سے) صفائی کے بعد اور پھلوں کی تب جب ان میں پختگی آ چکی ہو، اگر کاشتکار نے دانے کے سخت ہونے کے بعد فصل کا سودا کر لیا یا پھلوں کا جب ان کی صلاحیت ظاہر ہوگئی تو اب دونوں کی زکاۃ اسی کے ذمہ ہوگی، نہ کہ خریدار کے ذمہ، کیونکہ سببِ وجوب عقد ہے اور وہ اس کی مِلک میں ہے۔

زکاۃ میں عمدہ مال نکالنا

اللہ تعالی نے زکاۃ دینے والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ طیب اور عمدہ مال بطورِ زکاۃ نکالیں اور ردی مال کے صدقے سے منع

فرمایا، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ (البقرۃ:۲۶۷)

''مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں، ان میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا (کہ اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو اور ان کو کبھی نہ لو اور جان رکھو کہ اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔''

ابو داود اور نسائی وغیرہما نے سہل بن حنیف عن ابیہ سے نقل کیا، کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے کھجور کی دو قسموں سے منع کیا (کہ انہیں زکاۃ کے بطور نکالا جائے) ایک جُعرور اور دوم حبیق۔ ① (یہ دونوں ردی قسمیں شمار ہوتی ہیں) دراصل کئی لوگ زکاۃ میں دینے کے لیے ردی پھل الگ کر لیتے تھے، تو اس سے منع کیا اور حکم دیا کہ: ﴿ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ﴾ (البقرہ: ۲۶۷) سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے باغات والے تھے، ہمارے لیے کوئی اور طعام نہ ہوتا تھا تو جب بھوک لگتی تو چھڑی مار کر اس سے خشک و تازہ کھجور اتارتے اور بھوک مٹاتے تو کئی حضرات ردی اور خشک کھجور کا خوشہ لٹکا دیتے، تو اللہ نے آیتِ مذکورہ نازل کی اور باور کرایا کہ اگر اس قسم کی کھجور انہیں دی جائے تو وہ اسے ہرگز قبول نہ کریں، تو اس کے بعد ہماری روش تبدیل ہوگئی اور ہم عمدہ مال (تصدُّق کے لیے) لانے لگے۔ ② اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن غریب صحیح ہے، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ اس میں دلیل ہے کہ مالک کے لیے جائز نہیں کہ عمدہ مال سے ردی چھانٹ کر اسے زکاۃ میں نکالے، یہ کھجور میں تو نص ہے اور دیگر اجناس کو اس پر قیاس کرے۔

شہد کی زکاۃ

جمہور علماء کے نزدیک شہد میں زکاۃ نہیں، بقول امام بخاری رحمہ اللہ شہد کی زکاۃ کے بارے (نبی کریم ﷺ سے) صحت کے ساتھ کچھ مذکور نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میرا موقف یہ ہے کہ اس سے زکاۃ نہ لی جائے، کیونکہ روایات و آثار میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، تو یہ نظر انداز کیے جانے کے قابل ہے، امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: شہد میں وجوبِ زکاۃ کے بارے کوئی روایت ثابت نہیں، اور نہ اجماع میں، لہٰذا اس میں زکاۃ نہیں، بقول مولف اس بارے میں اگرچہ کوئی حدیث تو ثابت نہیں البتہ آثار ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں (اس میں وجوبِ زکاۃ کے بارے میں) اور اس لیے کہ یہ درختوں کے بُور اور پھولوں سے متولد ہوتا ہے اور پھر یہ کیل اور ذخیرہ کیا جاتا ہے، لہٰذا کھجور اور غلے کی طرح اس میں بھی زکاۃ واجب ہے اور اس لیے کہ اس میں زروع وثمار کی نسبت مشقت کم ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے شہد میں ایجابِ زکاۃ کے ضمن میں شرط عائد کی ہے کہ وہ عشری زمین سے حاصل ہوا ہو، ان کے ہاں اس کے لیے کسی نصاب کی شرط نہیں تو قلیل ہو یا کثیر، اس سے عشر وصول کیا

① صحیح، سنن أبی داود: ۱۶۰۷؛ سنن نسائی: ۵/ ۴۳. ② صحیح، سنن ترمذی: ۲۹۸۷.

جائے، امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے لیے نصاب کی قدغن لگائی، جو دس فرق ہے اور ایک فرق سولہ عراقی رطل کا ہوتا ہے (اور عراقی رطل ۱۳۰ درہم کے وزن برابر ہے) ان کے نزدیک خراجی اور عشری زمین کا فرق بھی نہیں، ایک فرق (ان کے نزدیک) چھتیس رطل کا ہے۔

مویشیوں کی زکاۃ

صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ اونٹوں، گائیوں اور بکریوں میں زکاۃ کا وجوب ثابت ہے، امت کا اس پر اجماع ہے، ان میں وجوبِ زکاۃ کی درج ذیل شروط ہیں:

① نصاب کو پہنچ رہے ہوں ② سال گزر جائے ③ اور یہ کہ سائمہ ہوں یعنی سال کا اکثر حصہ جنگل کا چارہ چرتے رہے ہوں (چارہ قیمۃً نہ خریدا گیا ہو) جمہور کے ہاں اس آخری شرط کا بھی اعتبار ہے، البتہ امام مالک اور امام لیث رحمہما اللہ نے مطلقاً تمام مویشیوں پر زکاۃ کا ایجاب کیا چاہے، وہ سائمہ ہوں یا معلوفۃ (جنہیں خرید کر چارہ دیا جاتا رہا) پھر عاملہ (بوجھ برداری وغیرہ کے لیے مستعمل) ہوں یا غیر عاملہ ہوں، لیکن احادیث سائمہ کی تقیید میں صریح ہیں اور اس کا مفہوم افادہ دیتا ہے کہ معلوف میں زکاۃ نہیں، کیونکہ اس لفظ کا استعمالِ نبوی خالی از فائدہ نہیں ہوسکتا، بقول ابن عبدالبر رحمہ اللہ فقہائے امصار میں سے میں کسی کو نہیں جانتا جس نے امام مالک اور امام لیث رحمہما اللہ کی موافقت کی ہو۔

اونٹوں کی زکاۃ

اگر پانچ سائم اونٹ ہوں اور سال گزرے تو ان کی زکاۃ ایک بکری ہے، (بقول محشی شاۃ کے لفظ کا اطلاق بھیڑ اور دنبہ کے بچے پر ہوتا ہے جس کی عمر ایک سال سے زیادہ ہو، اسی طرح بکری کے ایک سال سے زائد عمر کے بچہ پر بھی) اگر دس عدد ہوں تو ان کی زکاۃ دو بکریاں ہیں، زیادہ ہونے پر اسی شرح سے ہر پانچ کے عوض ایک بکری ہے، حتی کہ پچیس (۲۵) ہو جائیں تب ان کی زکاۃ ایک بنت مخاض ہے اور یہ ایسی اونٹنی جو دوسرے برس میں ہے، یا ابن لبون یہ وہ اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہے، (بقول محشی زکاۃ میں نر اونٹ نہ لیا جائے گا اگر نصاب میں صرف اونٹنیاں ہوں سوائے ابن لبون کے اور یہ بھی تب جب بنت مخاض موجود نہیں، اگر سارے نر اونٹ ہیں تب نر بطورِ زکاۃ وصول کرنا جائز ہے) اگر چھتیس (۳۶) ہوئے تو ان کی زکاۃ ایک بنت لبون ہے (جو اونٹنی تیسرے برس میں داخل ہوئی) چھیالیس (۴۶) میں ایک حُقّہ، یہ وہ اونٹنی جو چوتھے برس میں داخل ہوئی، اکسٹھ (۶۱) میں جَذعہ (ایسی اونٹنی جو پانچویں برس میں داخل ہوئی) چھہتر (۷۶) میں دو بنت لبون، اکانوے (۹۱) میں دو حقہ اونٹنیاں ایک سو بیس تک، اس سے زائد ہر چالیس میں ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ ہے، اگر زکاۃ کے ضمن میں مطلوبہ عمر کی اونٹنیاں نہیں مل رہیں تو مثلاً جس پر جذعہ بطورِ زکاۃ عائد ہے اور اس کے پاس جذعہ موجود نہیں، لیکن حقہ موجود ہے تو وہ اس سے قبول کرلیا جائے اور ساتھ میں دو بکریاں بھی اگر میسر ہوں یا بیس درہم، جس پر حقہ نکالنا واجب ہوا اور وہ

اس کے پاس نہیں، البتہ جذعہ ہے تو وہ لے لیا جائے اور کارندہ اسے دو بکریاں یا بیس درہم دے، جس پر حقہ عائد ہے اور وہ اس کے پاس نہیں اور بنت لبون ہے، تو وہی وصول کی جائے اور ساتھ میں دو بکریاں یا بیس درہم دے اور جس پر مثلاً بنت مخاض دینا عائد ہوا اور یہ موجود نہیں البتہ ابن لبون ہے تو وہی قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ دینا پڑے گا، جس کے پاس چار اونٹ ہیں اس پر زکاۃ عائد نہیں اِلّا یہ کہ ان کا مالک دینا چاہے (رضا کارانہ طور پر)۔

تو اس مذکورہ تفصیل پر سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں عمل کیا اور کسی نے مخالفت نہ کی، زہری سالم عن ابیہ سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ کی تفاصیل لکھوائی ہوئی تھیں، لیکن ابھی اپنے عمال کو ارسال نہ کی تھیں (کہ فوت ہو گئے) تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نکلوا کر ان کے مطابق زکاۃ نافذ کی پھر ان کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اور ان کی وفات تک یہی شرح لاگو رہی اور اسی کی وصیت کی۔[1]

گائے بھینس کی زکاۃ

ان کا کم از کم نصاب تیس سائمہ گائے (بیل یا بھینس) ہیں اور سال گزر جائے تو ان میں ایک تبیع یا تبیعہ ہے یعنی نر یا مادہ جس کی عمر ایک برس ہو، پھر انتالیس (۳۹) تک کچھ اور نہیں، اگر چالیس (۴۰) ہوئے تو ان کی زکاۃ ایک مسنہ ہے، یہ جس کی عمر دو برس ہو، پھر انسٹھ (۵۹) تک کچھ اور نہیں، ساٹھ (۶۰) ہونے پر دو تبیعے، ستر (۷۰) میں ایک مسنہ اور ایک تبیع یا تبیعہ، اسی (۸۰) میں دو مسنہ، نوے (۹۰) میں تین تبیعہ، ایک سو بیس (۱۲۰) میں تین مسنہ یا چار تبیعہ، اس سے زائد ہر تیس پر ایک تبیع یا تبیعہ اور ہر چالیس میں ایک مسنہ ہے۔

غنم (بکریاں، چھترے اور مینڈھے وغیرہ) کی زکاۃ

ان کا کم از کم نصاب چالیس سائمہ غنم ہیں پھر سال گزرنے پر ایک بکری ہے، یہ ایک سو بیس (۱۲۰) تک، ۱۲۱ تا ۲۰۰ تک دو بکریاں، ۲۰۱ تا ۳۰۰ تک تین بکریاں اور اس کے بعد ہر سو پر ایک بکری ہے، ان کی زکاۃ کے ضمن میں ضان (بھیڑ اور دنبہ) سے جذع (جو ابھی ایک سال سے کم عمر کا ہے) اور معز (بکری/بکرا) سے ثنی وصول کی جاسکتی ہے (یہ جو دوسرے سال میں داخل ہوئی) بالاتفاق ان کی زکاۃ میں نر کا دینا جائز ہے، اگر سارا ریوڑ نر پر ہی مشتمل ہے اور اگر سارا ریوڑ مادہ پر مشتمل ہے یا دونوں ہیں، تو احناف کے نزدیک تب بھی صرف نر زکاۃ میں دیے جاسکتے ہیں، دیگر کے ہاں تب صرف مادہ دینا ہی متعین ہے۔

اوقاص کا حکم

یہ وقص کی جمع ہے، اس سے مراد مقرر کردہ دو عدد کے درمیان کا عدد، علماء کا اتفاق ہے کہ یہ قابلِ عفو ہے (اس صورت میں کچھ عائد نہیں) کیونکہ کلامِ نبوی سے ثابت ہوا کہ اگر اونٹوں کی تعداد پچیس ہو تو ان کی زکاۃ ایک بنت مخاض ہے اور جب چھتیس

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٥٦٨.

سے پینتالیس تک ہو، تو اس میں ایک بنت لبون ہے،[1] اسی طرح گائے اور بھیڑ بکریوں کے بارے بھی مختلف اعداد ذکر کیے تو ۲۶ تا ۳۵ کا عدد وقص ہے، تو اس درمیانی تعداد پر کچھ عائد نہیں اور یہی حکم دیگر اوقاص کے بارے میں ہے۔

جو جانور زکاۃ میں نہ لیے جائیں

ارباب اموال کے حق کی مراعات ضروری ہے اور ان کے اموال کی زکاۃ وصول کرتے وقت زکاۃ میں ان کے سب سے عمدہ اور بہترین جانور نہ لیے جائیں، الّا یہ کہ خوشدلی سے خود پیش کریں اسی طرح مستحقین کے حق کی رعایت کرنا بھی واجب ہے، تو ایسے عیب والا جانور وصول نہ کیا جائے جو جانوروں سے متعلق تجربہ رکھنے والوں کی نظر میں نقص شمار ہو الّا یہ کہ تمام جانور ہی عیب دار ہوں، مناسب یہ ہے کہ زکاۃ کی وصولی اور اخراج درمیانے مال سے ہو۔

① سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں لکھا: ”ولا تُؤخَذُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ ولا ذَاتُ عُوَارٍ ولا تَيْسٌ“ کہ زکاۃ میں ایسی بوڑھی جس کے دانت گر چکے ہوں، کانی اور سانڈ وصول نہ کیا جائے۔[2]

② سیدنا سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے زکاۃ کی وصولی پر مامور کارندوں کو منع کیا تھا کہ وہ گھریلو اور دودھ کے لیے پالی گئی بکری، قریب الولادت حاملہ اور سانڈ وصول کرے۔[3]

③ سیدنا عبداللہ بن معاویہ غاضری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین باتیں ہیں جس نے اختیار کیں، اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا: جس نے اکیلے اللہ کو معبود بنایا اور اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہ مانا، اور اپنے مال کی خوش دلی سے ہر سال زکاۃ ادا کی اور اس ضمن میں بوڑھا، خارش زدہ بیمار، چھوٹا اور کمزور اور کم دودھ دینے والا جانور نہ دے، بلکہ درمیانی قسم کا، اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے سب سے بہترین جانور نہیں مانگتا اور نہ یہ کہ برے ترین دو۔“[4] اسے ابو داود اور طبرانی نے جید سند سے نقل کیا۔

مویشیوں (اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکریوں) کے علاوہ دیگر جانوروں کی زکاۃ

دیگر جانوروں مثلاً گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی کوئی زکاۃ نہیں الّا یہ کہ وہ برائے تجارت ہوں، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے تمہارے گھوڑوں اور غلام ولونڈیوں پر کوئی زکاۃ عائد نہیں کی۔“[5] اسے احمد اور ابو داود نے جید سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کے بارے سوال ہوا کہ کیا ان کی زکاۃ ہے؟ تو فرمایا: ان کی بابت کوئی حکم نازل نہیں ہوا، ہاں یہ ایک آیت ہے؟ جو بہت جامع مانع ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزال: ۷۔۸)

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٥٦٨؛ سنن ترمذي: ٦٢١. ② صحيح البخاري: ١٤٥٥. ③ تلخيص الحبير: ٢/ ١٦٢. ④ صحيح، سنن أبي داود: ١٥٨٢. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ١٥٩٤.

''جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔''[1]

اسے احمد نے تخریج کیا، حارثہ بن مضرب سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حج کیا، کہتے ہیں شام کے اشراف ان کے پاس آئے اور کہا: اے امیر المومنین! ہمارے پاس غلام، لونڈیاں اور دواب ہیں (یعنی گھریلو چوپائے جنہیں دودھ کے لیے پالا گیا) آپ ان کی زکاۃ ہم اسے وصول کیجیے اور ہمیں تطہیرِ مال کا موقع دیں، کہنے لگے: یہ کام مجھ سے قبل کے دونوں نے نہیں کیا (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ) لیکن انتظار کرو تا کہ میں مسلمانوں سے مشاورت کرلوں۔[2] اسے ہیثمی نے وارد کیا اور کہا: احمد اور طبرانی نے کبیر میں اس کی تخریج کی ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں، امام زہری رحمہ اللہ نے سلمان بن یسار سے نقل کیا کہ اہلِ شام نے سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ ہمارے گھوڑوں اور غلام ولونڈیوں کی زکاۃ وصول کرلیں، انہوں نے انکار کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، انہوں نے بھی انکار لکھ بھیجا، انہوں نے دوبارہ بات کی انہوں نے پھر خط لکھا اور اب کے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جواب آیا کہ اگر وہ ایسا کرنا پسند کرتے ہیں تو زکاۃ لے لو اور انہی پر (ان کے فقراء پر) خرچ کردو اور ان کے غلام اور لونڈیوں کو دو۔[3] اسے مالک اور بیہقی نے نقل کیا۔

ایک سال سے کم عمر مویشیوں کی زکاۃ

جو اونٹوں، گائے یا ریوڑ کے نصاب کا مالک بنا اور سال کے دوران میں ان میں سے کئی نے بچے جنے تو بڑوں کا سال مکمل ہونے پر ان کو بھی گنتی میں شامل کرنا ہوگا اور اکثر اہلِ علم کے قول کے مطابق اصل اور نتاج کو ایک مال کے طور پر باور کیا جائے گا، کیونکہ مالک اور شافعی نے سیدنا سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہدایت جاری کی کہ ریوڑ کے جنے بچوں کو شمار کیا جائے۔[4] اسے مالک نے موطا میں نقل کیا، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ابوثور رحمہم اللہ کے نزدیک انہیں حساب میں شامل نہ کیا جائے گا، اِلّا یہ کہ ان کے بغیر بڑے جانوروں کا نصاب بن رہا ہو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مزید کہا: چھوٹے مویشی نصاب میں منضم کیے جائیں، چاہے یہ خریدے گئے ہوں یا انہی مویشیوں نے جنے ہوں اور سال گزرنے پر ان کی بھی زکاۃ نکالی جائے، امام شافعی رحمہ اللہ نے شرط لگائی کہ یہ اس کی مِلک میں شامل جانوروں نے سال پورا ہونے سے قبل جنے ہوں، لیکن جس کا سارا نصاب ہی چھوٹے جانوروں پر مشتمل ہے، تو امام ابوحنیفہ، محمد، داود اور شعبی رحمہم اللہ کے نزدیک ان پر زکاۃ عائد نہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، ان کی دلیل احمد، ابوداود، نسائی اور دارقطنی اور بیہقی کی سیدنا سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے منقول روایت ہے، کہتے ہیں، ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عاملِ زکاۃ آیا، تو میں نے سنا کہتا تھا مجھے ہدایت ملی ہے کہ دودھ پیتے چوپائے زکاۃ میں وصول نہ کروں۔[5] اس کی سند میں ہلال بن حباب ہے، جسے کئی ایک نے ثقہ کہا، جبکہ بعض

---

[1] صحيح مسلم: ٩٨٧؛ مسند أحمد: ٢/ ٣٨٣. [2] مسند أحمد: ١/ ١٤، ٣٢؛ صحيح ابن خزيمة: ٢٢٩٠.
[3] المؤطا امام مالك: ١/ ٢٧٧؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ١١٨. [4] المؤطا امام مالك: ١/ ٢٦٥؛ مسند الشافعي: ١/ ٢٣٩. [5] حسن، سنن أبي داود: ١٥٧٩؛ سنن نسائي: ٥/ ٢٩؛ مسند أحمد: ٤/ ٣١٥.

نے اس میں کلام کی (ضعیف قرار دیا) امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اور امام احمد رحمہ اللہ سے ایک قول بھی یہی ہے کہ چھوٹوں میں بھی بڑوں کی طرح زکاۃ واجب ہے، کیونکہ جب انہیں بڑوں کے ہمراہ شمار کیا جاتا ہے، تو اگر صرف یہی ہوں تو بھی شمار کرنا ہوگا، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک چھوٹے جانوروں کی زکاۃ انہی میں سے وصول کی جائے۔

مویشیوں کو جمع اور الگ الگ کرنا

سیدنا سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملِ زکاۃ نے یہ بھی کہا کہ ہم مجتمع جانوروں کو متفرق اور متفرق کو جمع نہ کریں گے، کہتے ہیں ایک شخص ان کے پاس زکاۃ کی غرض سے بڑی کوہان والی اونٹنی لایا (خوب موٹی تازی) مگر انہوں نے لینے سے انکار کیا۔[1] اسے احمد، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا اور منجملہ باتوں کے یہ بھی ہدایت دی کہ متفرق جانوروں کو جمع اور جمع کو متفرق نہ کیا جائے اس ڈر سے کہ زکاۃ لاگو نہ ہو اور جو دو مالکوں کے درمیان مشترک ہوں تو عائد زکاۃ دونوں سے برابری کی بنیاد پر وصول کی جائے گی۔[2] اسے بخاری نے نقل کیا، امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں لکھتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ مثلاً تین افراد کی مِلک میں چالیس چالیس بکریاں ہیں، اب ہر ایک پر بطورِ زکاۃ ایک بکری دینا عائد ہے تو وہ اس سے بچنے کے لیے سب کو باہم جمع کر لیں کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ کل ایک سو بیس بنیں اور اس تعداد پر ایک بکری زکاۃ عائد ہوتی ہے (یہ متفرق کو جمع کرنے کی مثال ہے) یا دو شریک کاروں کی مِلک میں مشترکہ طور پر دو سو ایک بکریاں ہوں اب اس تعداد پر تین بکریاں عائد ہوتی ہیں، تو وہ متفرق کر لیں (کاروبار تو اکٹھا ہے، لیکن کم زکاۃ دینے کے لیے اپنا اپنا حصہ علیحدہ کر لیا) تو اس طرح کرنے میں دونوں پر ایک ایک بکری عائد ہوگی، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ ایک جہت سے مالکوں اور ایک جہت سے عاملِ زکاۃ کو خطاب ہے، تو دونوں کو حکم دیا کہ جمع و تفریق نہ کریں، مالک اس غرض سے کہ زکاۃ کم ہو جائے اور کارندہ اس ڈر سے کہ کہیں زکاۃ کم نہ ہو جائے، تو آپ کے قول ((خشية الصدقة)) کا مراد و مفہوم ہے کہ ''خَشْيَةَ أَنْ تَكْثُرَ الصَّدَقَةُ أَوْ تَقِلَّ'' یعنی زکاۃ کم یا زیادہ ہونے کے ڈر سے، تو جب یہ دونوں امور کو محتمل ہے، تو کسی ایک پر محمول کرنا دوسرے کی نسبت اولیٰ نہیں، لہٰذا اکٹھے دونوں پر محمول کرنا ہوگا، احناف کے نزدیک اس کے مخاطب صرف زکاۃ کی وصولی پر مامور کارندے ہیں کہ وہ ایک مالک کی مِلک میں موجود جانوروں کو اس طور متفرق نہ کریں کہ جس سے زکاۃ زیادہ ہو مثلاً ایک شخص کے پاس ایک سو بیس بکریاں ہیں، تو وہ اسے تین حصوں میں تفریق کر دیں تاکہ اس طرح تین بکریاں عائد ہوں یا مثلاً ایک آدمی کی مِلک جانوروں کو دوسرے کی ملک جانوروں کے ساتھ منضم کر دے کہ اس طرح کرنے سے زکاۃ زیادہ ہو جائے مثلاً ایک کے پاس ایک سو ایک بکریاں ہوں اور دوسرے کے پاس بھی اتنی ہی تو جمع کرنے سے تین بکریاں وصول ہوں گی، جبکہ علیحدہ علیحدہ معاملہ کرنے سے دو بکریاں عائد تھیں۔

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ١٥٧٩؛ سنن نسائي: ٥/ ٢٩؛ مسند أحمد: ٤/ ٣١٥. [2] صحيح البخاري: ١٤٥٠.

کیا شراکت کی کوئی تاثیر ہے؟

احناف کا مؤقف ہے کہ تجارتی شراکت کی کوئی تاثیر نہیں، چاہے شراکتِ شیوع ہو (جس میں مال شرکاء کے مابین مشترک اور مشاع ہو) یا شراکتِ جوار (مال سب کا الگ الگ اور متمیز ہو لیکن باڑہ اور چراہ گاہ ایک ہے) تو مالِ مشترک میں زکاۃ واجب نہ ہوگی، مگر جب ہر ساجھے دار کا حصہ علیحدہ طور سے نصاب کو پہنچے، کیونکہ مجمع علیہ ضابطہ و اصل یہ ہے کہ زکاۃ معتبر نہیں مگر ایک شخص کی ملکیت کے ساتھ، مالکیہ کا مؤقف ہے کہ مویشیوں میں شریک زکاۃ کے ضمن میں ایک مالک کی مانند باور ہوں گے، شراکت کا کوئی اثر نہیں اِلّا یہ کہ ہر شریک (علیحدہ طور پر بھی) نصاب کا مالک ہو اور اس کے ساتھ ساتھ شراکت کی نیت بھی ہو اور ہر ایک کا مال دوسرے کے مال سے متمیز ہو، بصورتِ دیگر دونوں شریک باور ہوں گے اور یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک زکاۃ کا اہل ہو، شراکت کی تاثیر صرف مویشیوں اور اس میں جو شرکاء پر تقسیم شدہ مال سے اخذ کیا جائے، ہر ایک کی نسبت سے جو زکاۃ عائد ہوتی ہے، اگر کسی شریک کے لیے ایسا مال ہے، جو غیر مخلوط ہے تو سارا ہی مخلوط شمار ہوگا۔

شافعیہ کے نزدیک ان دونوں شراکتوں میں سے ہر ایک زکاۃ کے باب میں مؤثر ہے اور دو یا سب اشخاص کا مال ایک کے مال کی مانند تصور ہوگا، پھر کبھی اس کا اثر وجوبِ زکاۃ میں ہوسکتا ہے اور کبھی زکاۃ کی تکثیر میں اور کبھی اس کی تقلیل میں، اول کی مثال جیسے دو آدمیوں میں سے ایک کے لیے بیس بکریاں ہوں، تو شراکت کے ساتھ ایک بکری زکاۃ عائد ہوئی جبکہ اگر الگ کریں تو کوئی زکاۃ نہیں، تکثیر کی مثال جیسے دونوں میں سے ہر ایک کے پاس سو بکریاں ہیں تو ہر ایک پر ڈیڑھ بکری زکاۃ عائد ہوئی، لیکن اگر الگ الگ کریں تو ہر ایک پر ایک بکری واجب ہوتی ہے اور تقلیل کی مثال تین افراد جن میں سے ہر ایک کے پاس چالیس بکریاں ہیں تو شراکت سے سب پر ایک بکری زکاۃ عائد ہوتی ہے، تو تینوں شرکاء میں ہر ایک کے ذمہ ثلث بکری (۱/۳) آئے گی، لیکن اگر علیحدہ سے معاملہ کریں، تو ہر ایک کے ذمہ پوری بکری بطورِ زکاۃ عائد ہوگی، انہوں نے اس کے لیے درج ذیل شروط عائد کی ہیں:

① شرکاء اہلِ زکاۃ میں سے ہوں۔

② مخلوط مال نصاب کو پہنچ رہا ہو۔

③ اس پر سال گزر چکا ہو۔

④ باڑے، چراگاہ، پانی کے گھاٹ اور دودھ دوہنے کی جگہ پر کسی کے مال کی الگ شناخت نہ ہو اور سب کا چرواہا بھی ایک ہو۔

⑤ اور اگر سب مویشی ایک ہی جنس کے ہیں تو سب کا سانڈ بھی ایک ہو، امام احمد رحمہ اللہ نے بھی شوافع کی مثل کہا، البتہ انہوں نے شراکت کی تاثیر کو صرف مویشیوں پر مقصور کیا ہے نہ کہ دیگر اموال میں بھی۔

رکاز (دفینہ یا خزانہ وغیرہ جو کسی کے ہاتھ لگا) اور معدنیات کی زکاۃ

رکاز کا معنی

رکاز رَکَزَ یَرْکِزُ سے مشتق ہے: (إذَا خَفِیَ) پوشیدہ اور مخفی ہوا، اسی سے قرآن نے کہا: ﴿اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ (مریم: ۹۸) ''مدھم آواز، کھسر پھسر۔'' یہاں اس سے مراد زمانۂ جاہلیت کے دفینے (بقول محشی اس کا پتہ اس پر نقش اسم و علامت سے لگے گا، تو اگر اس پر اسلام کے عہد کی علامت ہے تو وہ رکاز نہیں بلکہ لقطہ (راستہ میں گری پڑی چیز) ہے اسی طرح وہ دفینہ بھی لقطہ قرار پائے گا جس پر جاہلیت کی یا اسلام کی کوئی علامت نہیں، یعنی پتہ نہیں چل رہا کہ جاہلیت کا دفینہ ہے یا عہدِ اسلامی کا) امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں امر جس کے بارے ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں اور اہل علم کو اسی پر متفق پایا، وہ یہ ہے کہ رکاز وہ دفینہ ہے، جو دورِ جاہلیت کے دفینوں میں سے پایا جائے، اگر اس کا حصول مال خرچ کر کے نہیں ہوا اور نہ بڑی مشقت (اور کھدائی) سے بس اتفاقاً مل گیا، لیکن اگر کئی لوگ تلاشِ مسلسل میں رہتے ہیں، کبھی کوئی خزانہ ہاتھ لگ جاتا ہے اور کبھی نہیں تو وہ رکاز نہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: رکاز اسم ہے، اس کا جسے خالق نے یا مخلوق نے رکز کیا (اسے دفینہ بنایا)۔

معدن کا معنی اور فقہاء کے نزدیک اس میں زکاۃ کی شرط

معدن (عَدَنَ فِی الْمَکَانِ) سے مشتق ہے، یَعْدِنُ عُدُوْناً و عَدْناً جب اس میں مقیم رہا، اسی سے قرآن میں ہے: ﴿جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ (التوبة: ۷۲) اس لیے کہ جنت دارِ اقامت وخلود ہے، علماء نے ان معدنیات کے بارے باہم اختلاف کیا جن کے ساتھ وجوبِ زکاۃ متعلق ہے تو امام احمد رحمہ اللہ کا میلان یہ ہے کہ زمین سے نکلی ہر ذی قیمت چیز جو اس کی جنس سے نہیں، پر زکاۃ عائد ہے، مثلاً سونا، چاندی، لوہا، پیتل، سیسہ، یاقوت، زبرجد، زمرد، فیروز، بلور، عقیق، سرمہ، تارکول، پٹرول، گندھک، پھٹکری اور ان جیسی اشیا شرط یہ لگائی کہ وہ بذاتِ خود یا اس کی قیمت نصاب کی حد تک پہنچ رہی ہو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ وجوبِ زکاۃ ہر اس کے ساتھ متعلق ہے جو آگ میں اگر ڈالیں تو ڈھل جائے اور پگھل جائے، جیسے سونا، چاندی، لوہا اور پیتل، جہاں تک مائع مواد (مثلاً تارکول) یا ایسا جامد جو آگ میں پگھلتا نہیں جیسے یاقوت تو ان پر زکاۃ عائد نہیں، ان کے ہاں نصاب کی بھی شرط نہیں تو قلیل مقدار ہو یا کثیر اس کا خُمس (پانچواں حصہ) نکالنا واجب ہے جبکہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے وجوبِ زکاۃ کو سونے اور چاندی پر مقصور کیا اور امام احمد رحمہ اللہ کی طرح اس سونے کا بیس مثقال اور چاندی کا دو سو درہم ہونا مشروط کیا، اس امر پر متفق ہیں کہ ان کے ضمن میں سال گزرنے کی شرط نہیں اور فصل کی طرح وجود کے ساتھ ہی زکاۃ کی ادائیگی واجب ہوگی، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کی زکاۃ ربع العشر (دسویں حصے کا چوتھائی) ہے اور مصرف وہی جو زکاۃ کے مصارف ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان کا مصرف مصرفِ فے ہے۔

رکاز اور معدن میں زکاۃ کی مشروعیت

اس ضمن میں اصل سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْعَجْمَاءُ جَرْحُهَا جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ)) ''جانور کے لگائے زخم کا کوئی تاوان یا دیت نہیں، اسی طرح کنویں اور کان میں گر کر مرنے والے کے لیے بھی اور دفینوں میں خمس (پانچواں حصہ، یعنی اسے بیت المال میں جمع کرانا یا زکاۃ کے مصارف میں خرچ کرنا ہوگا) ہے۔''[1] اسے جماعت نے نقل کیا۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ کے بقول ہم کسی کو نہیں جانتے سوائے امام حسن رحمہ اللہ کے جس کی رائے اس حدیث کے خلاف ہو تو انہوں نے ارضِ حرب اور ارضِ عرب میں موجود رکاز و معدن کے مابین فرق کیا، تو ارضِ حرب کے رکاز و معدن میں خمس نکالنا واجب کہا جبکہ ارضِ عرب کے رکاز و معدن پر زکاۃ، بقول امام ابن قیم رحمہ اللہ قولہ: ((اَلْمَعْدِنُ جُبَارٌ)) میں دو اقوال ہیں: ایک کہ اگر کسی نے کھدائی کے لیے کوئی مزدور رکھا تھا جو ملبہ تلے آ کر مر گیا، تو یہ جبار ہے، اس قول کی تائید اسے ((اَلْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْعَجْمَاءُ جُبَارٌ)) کے ساتھ مقرون کرنے کے ذکر سے ملتی ہے۔ دوم کہ اس میں زکاۃ نہیں، اس کی تائید اس کے (وفی الرکاز الخُمُسُ) کے ساتھ ذکر سے ملتی ہے، تو معدن اور رکاز کے مابین فرق کیا، تو رکاز میں خمس واجب کیا، کیونکہ وہ ایسا مال ہے، جو بغیر کسی کلفت اور مشقت کے حاصل ہوا، معدن سے اسے ساقط کیا، کیونکہ اس کا حصول کلفت و مشقت کا محتاج ہوتا ہے۔

اس رکاز کی صفت جس کی زکاۃ نکالنا واجب ہے

جس رکاز میں خمس واجب ہے، یہ وہ جو مال ہو سونا، چاندی، لوہا، سیسہ، تانبا اور برتن اور ان سے مشابہ، یہ احناف، حنابلہ، اسحاق اور ابن منذر رحمہم اللہ کا مذہب ہے، امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت اور امام شافعی رحمہ اللہ کے دو میں سے ایک قول بھی یہی ہے، ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ خمس واجب نہ ہوگا، مگر (ان کی) اثمان (قیمت) سونا چاندی میں۔

اس کی جگہ جہاں سے یہ پایا جائے مندرجہ ذیل اقسام میں سے ایک ہوگی:

① کسی بے آباد زمین سے ملا، یا ایسی زمین جس کا مالک معلوم نہیں یا ایسا راستہ جو گزرگاہ نہیں یا کھنڈرات سے تو اس میں بلا اختلاف پانچواں حصہ نکالنا ہوگا اور باقی اس کا جسے یہ ملا، چنانچہ نسائی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راستہ میں گری پڑی چیز کے بارے پوچھا گیا، تو فرمایا: ''اگر یہ آباد راستہ یا آبادی سے ملا تو ایک برس تک اعلان کرائے اور تشہیر کرے، اگر مالک پھر بھی نہ آئے تو اس کا ہوا اور جو آباد راستے یا آبادی سے نہ ملا تو اس کا اعلان و تشہیر کرانے کی ضرورت نہیں بلکہ (فوری طور پر) اس کا ہوا اور اس میں سے اور رکاز میں سے پانچواں حصہ (راہِ خدا میں) نکالنا ہوگا۔''[2]

② اگر ایسی جگہ سے ملا جو اس نے کسی سے خریدی ہے، تو وہ اسی کا ہے کیونکہ رکاز زمین کا دفینہ ہے، لیکن صرف زمین کی ملکیت

---

[1] صحیح البخاري: ٦٩١٢؛ صحیح مسلم: ١٧١٠. [2] حسن، سنن نسائی: ٥/ ٤٤.

اس کے نام ہونے سے وہ بھی اس کی مِلک نہ ہوگا، بلکہ اس کا پتہ چلنے سے تو یہ مباحات مثلاً گھاس پھوس، ایندھن اور شکار وغیرہ کے مرتبہ میں ہے، جیسے شکاری کسی اور کی زمین میں پائے تو کرنے اور پانے والا ہی زیادہ حقدار ہوگا، اِلّا یہ کہ پرانا مالک اس پر دعوی جتلائے (کہ یہ میں نے دفن کیا تھا) تب اسی کی بات (بشرطِ ثبوت) تسلیم ہوگی کہ وہی اس کا زیادہ حقدار ہے، کیونکہ یہ اس کے ہاتھ میں تھی، لیکن اگر اس نے دعوی نہیں جتلایا یا اسے پتہ ہی نہیں چلا، تو وہ اس کا ہوا جسے ملا، یہ ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے ہے، حنابلہ کے ہاں بھی اصح یہی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا مؤقف ہے کہ یہ سابقہ مالک کا ہے، اگر وہ مدعی ہے کہ ہاں میں نے اسے دبایا تھا، وگرنہ اس سے قبل کے مالک کا اگر وہ مدعی ہے، وگرنہ اس سے بھی پہلے مالک کا حتی اس شخص کا پتہ چل جائے، جس نے زمین میں یہ دفینہ دبایا تھا، اگر گھر میراث کی رو سے کسی کی مِلک میں آیا تو اس پر میراث کا حکم لاگو ہوگا، اگر ورثا متفق ہوئے کہ وہ دفینہ مورِث (فوت شدہ) کا نہیں، تو وہ اول مالک کا ہے، اگر مالک کا پتہ نہیں چل رہا، تو وہ اس ضائع مال کی مانند ہے، جس کا مالک نامعلوم ہے، امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ زمین کے اولین مالک کا ہے یا پھر ورثا کا وگرنہ بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔

③ کسی مسلمان یا ذمی کی ملکیتی زمین سے ملا، تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک صاحبِ مِلک کا ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، احمد سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ پانے والے کا ہوگا، امام حسن بن صالح اور امام ابو ثور رحمہما اللہ نے بھی یہی کہا، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اسے مستحسن قرار دیا، اس وجہ سے جو گزرا کہ زمین کا مالک بننے سے اس کے دفائن بھی اس کی ملکیت قرار نہ پائیں گے، ہاں اگر (سابقہ) مالک دعوی نہیں کرتا، تب یہ اس کا ہے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ یہ مالک کا ہے، اگر اس کا دعوی ہے کہ اس نے اسے دبایا تھا، وگرنہ اس سے قبل کے مالک کا (یا اس سے قبل......) تو جاہلیت کے دفینے پر خمس دینا واجب ہے اور بقیہ اس کے اقدم مالک کا اگر وہ معلوم ہے، لیکن اگر وہ مر چکا تو یہ اس کے وارثوں کو دیا جائے، اگر وہ معلوم ہیں، بصورتِ دیگر اس پر بیت المال کا حق ہے، یہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام محمد رحمہم اللہ کا مسلک ہے، احمد اور ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا: یہ اس کا ہے جسے ملا اگر مالکِ زمین اس کا دعوی نہ کرے، اگر کرے تو بالاتفاق اسی کا ہوا اور خمس نکالنا ہوگا، چاہے قلیل ہو یا کثیر، اس میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک نصاب کا اعتبار نہیں، امام مالک رحمہ اللہ سے اصح روایت بھی یہی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے جدید میں کہا: اس میں نصاب کا اعتبار ہے (جو سونے اور چاندی کا ہے) سال گزرنے کی شرط بالاتفاق لاگو نہیں۔

خمس کس پر واجب ہے؟

جمہور علماء کے نزدیک پانے والے پر یہ عائد ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی، عاقل ہو یا مجنون، البتہ مجنون اور نابالغ کی طرف سے ان کا سر پرست خمس جمع کرائے گا، امام ابن منذر رحمہ اللہ کے بقول جن اہل علم سے ہم نے اخذ و استفادہ کیا ان کا اجماع ہے کہ اگر ذمی کو دفینہ ملے تو وہ بھی خمس نکالنے کا پابند ہے، یہ بات امام مالک، اہلِ مدینہ، ثوری، اوزاعی، اہلِ عراق، اہلِ رائے وغیرہم سب نے

کی، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: خمس اسی پر واجب ہے جس پر زکاۃ عائد ہے (مسلمان عاقل بالغ پر) کیونکہ یہ زکاۃ ہے۔

خمس کا مصرف

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک خمس کا وہی مصرف ہے، جو زکاۃ کا ہے، امام احمد اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے عبداللہ بن بشر خشعمی عن رجل من قومہ سے روایت نقل کی کہ میں کوفہ کے ایک قدیمی گرجا میں چل پھر رہا تھا کہ مجھ پر ایک مٹکا آن گرا، دیکھا تو اس میں چار ہزار درہم تھے میں انہیں لے کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، کہنے لگے اس کے پانچ حصے کرو، میں نے کر دیے تو ایک حصہ اٹھا کر بقیہ کی بابت کہا: یہ تمہارے ہیں، میں جب واپس ہوا تو مجھے بلایا اور کہا: کیا تمہارے پڑوس میں فقراء اور مساکین ہیں، عرض کی: جی ہاں، تو کہا: یہ خمس بھی لو اور اسے ان میں تقسیم کر دینا۔[1] امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اس کا مصرف مالِ فے والا مصرف ہے، ان کا استدلال شعبی کی روایت سے ہے، جو کہتے ہیں ایک شخص کو شہر کے باہر سے ہزار دینار کا دفینہ ملا، وہ اسے لے کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، تو انہوں نے اس سے دوسو دینار لے کر بقیہ اس کے حوالے کیے اور ان دوسو دیناروں کو حاضرین میں تقسیم کرنے لگے، تو کچھ بچ گئے، تو پوچھا دفینہ والا کہاں ہے؟ وہ کھڑا ہوا تو باقی اسے دیے اور کہا: یہ تمہارے ہوئے (بطورِ انعام)[2] المغنی میں ہے اگر یہ زکاۃ ہوتی (زکاۃ کا مصرف) تو زکاۃ کے مستحقین کے لیے خاص کرتے دفینہ پانے والے کو نہ دیتے اور پھر اس لیے کہ یہ ذمی پر بھی عائد ہے جبکہ اس کے ذمہ تو زکاۃ واجب نہیں ہوتی۔

سمندر سے نکالی گئی اشیا کی زکاۃ

جمہور کے مطابق سمندر سے نکالی گئی اشیا مثلاً موتی، مرجان، زبرجد، عنبر اور مچھلیوں وغیرہ پر زکاۃ عائد نہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت وجوبِ زکاۃ کی ہے، اگر وہ حدِ نصاب تک پہنچ رہی ہو، امام ابو یوسف رحمہ اللہ موتی اور عنبر میں ان کے ہمنوا ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ عنبر میں زکاۃ نہیں کہ یہ تو ایسی چیز ہے، جسے سمندر نے باہر اگلا ہے، بقول سیدنا جابر رضی اللہ عنہ عنبر میں زکاۃ نہیں یہ اس کے آخذ کے لیے غنیمت ہے۔

مالِ مستفاد (منافع) کی زکاۃ

جسے اس مال سے کمایا جس میں سال گزرنے کا اعتبار ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی مال نہیں اور وہ نصاب تک پہنچ رہا ہے یا اسی کی جنس سے مال تو اس کے پاس موجود ہے مگر نصاب کو نہیں پہنچ رہا، البتہ مالِ مستفاد نصاب تک جا پہنچا اور پھر ایک سال گزرا، تو اس میں زکاۃ عائد ہوگی، مستفاد مال درجِ ذیل تین اقسام میں سے کوئی ایک قسم ہوگا:

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ١٥٧. [2] تلخيص الحبير: ٢/ ١٩٣.

① مالِ مستفاد اس کی نماء سے ہو مثلاً تجارت کا منافع اور حیوانات کا نتاج (اولاد) اور یہ سال گزرنے میں اپنی اصل کے تابع ہیں، تو جس کے پاس سامانِ تجارت ہے یا جانور جو حدِ نصاب کو پہنچ رہے ہیں، تو اسے مزید سامان بصورتِ منافع حاصل ہوا یا سال کے دوران میں جانوروں نے بچے جنے تو سب سے زکاۃ کا اخراج واجب ہوگا، اصل سے بھی اور مستفاد سے بھی، اس بابت کوئی اختلاف نہیں (یہ نہیں کہ وہ منافع اور نتاج کو الگ سے شمار کرے کہ اگر نصاب تک نہ پہنچے تو زکاۃ نہ نکالے)

② مستفاد جنسِ نصاب سے ہو، اس سے متفرِع یا اس سے متولّد نہ ہو کہ اس کا حصول الگ سے خرید کر یا بصورتِ ہبہ یا بصورتِ میراث ہوا ہو، تو ایسے مال کی بابت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ مستفاد مال نصاب کے ساتھ ضم کیا جائے اور یہ سال گزرنے اور زکاۃ نکالنے کے اعتبار سے اس کا تابع ہوگا اور فائدہ کی اصل کے ساتھ ہی زکاۃ نکالی جائے گی، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا: نصاب میں تو یہ مستفاد اصل کے تابع ہے، لیکن اس کے سال کا الگ سے حساب کرنا ہوگا چاہے اصل نقدی کی صورت ہو یا جانور ہو، مثلاً کسی کے پاس دو سو درہم تھے، پھر سال کے اثناء (ان پیسوں سے) ایک سو اور کما لیا تو سال پورا ہونے پر وہ دونوں کی زکاۃ ادا کرے گا (یعنی تین سو کی) امام مالک جانور کے ضمن میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسی رائے رکھتے ہیں، لیکن نقدین (درہم و دینار) میں امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے کی مثل۔

③ مستفاد اس کے پاس موجود مال کی جنس سے نہ ہو، یہ سال گزرنے میں اور نصاب کے حساب میں اصل کے ساتھ ضم نہ کیا جائے گا، بلکہ اگر یہ علیحدہ سے نصاب ہے، تو اس کے سال کا حساب الگ ہوگا اور سال کے آخر میں اس کی زکاۃ ادا کی جائے گی، یہ جمہور کا قول ہے۔

زکاۃ عین اسی مال میں سے نکالنا واجب ہے یا کسی بھی صورت میں؟

احناف، امام مالک اور امام شافعی و امام احمد رحمہم اللہ سے ایک روایت کے مطابق زکاۃ عین اسی مال سے واجب ہوتی ہے، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا دوسرا قول ہے کہ یہ صاحبِ مال کے ذمہ میں ہے (کسی بھی دیگر جنس کی صورت میں زکاۃ نکال سکتا ہے، مثلاً سونے چاندی کی زکاۃ نقدی کی صورت میں) نہ کہ عینِ مال میں، اس اختلاف کا اثر اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ مثلاً کوئی دو سو درہم کا مالک ہے اور ان پر دو سال گزرے اور زکاۃ نہیں دی تو جو عین میں وجوبِ زکاۃ کے قائل ہیں، ان کے نزدیک اب وہ ایک سال کی زکاۃ دے گا، کیونکہ پہلے سال کے بعد تو وہ نصاب سے کم ہوئے اس زکاۃ کے بقدر جو اس پر واجب تھی (مگر اس نے نہیں نکالی) جو پانچ درہم تھے اور جن حضرات نے کہا: وہ اس کے ذمہ میں واجب تھی، ان کے نزدیک وہ دو سال کی زکاۃ نکالے کیونکہ زکاۃ اس کے ذمہ تھی، لہٰذا نصاب دوسرے سال بھی مکمل ہی باور ہوگا، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے وجوب فی الذمہ کو راجح کہا اور لکھا: ہمارے زمانہ سے عہدِ نبوی تک امت کے مابین اس امر میں اختلاف نہیں کہ جس پر گندم، جو، کھجور، چاندی، اونٹوں، گائے بھینس یا ریوڑ کی زکاۃ واجب تھی تو اس نے کسی اور جنس کی صورت میں زکاۃ ادا کر دی مثلاً کھجور

کی غیرِ کھجور اور سونے چاندی کی غیرِ سونا چاندی کی شکل میں، تو یہ منع نہیں اور نہ مکروہ ہے بلکہ برابر ہے کہ عین اسی مال سے زکاۃ ادا کرے یا اپنے پاس موجود ان کے غیر سے یا اس مال سے جسے خریدا یا اسے ہبہ ملا یا جو قرض کے بطور پکڑا تو یقینی طور پر یہی صحیح ہے کہ زکاۃ واجب فی الذمہ ہوتی ہے، نہ کہ عین اسی میں کہ اگر یہ ہوتا تو اس کے لیے بالکل ہی حلال نہ ہوتا کہ ان کے غیر سے زکاۃ ادا کرے اور ایسا کرنا منع ہوتا، جیسے اس کے لیے بھی منع ہوتا جو اس سب کی کسی چیز میں اس کا شریک ہے کہ اپنے شریک کو اس عین کے غیر سے دے جس میں ان کی باہمی شراکت داری ہے الا یہ کہ وہ لینے پر راضی ہو اور پھر بیع کے حکم پر، نیز اگر زکاۃ عینِ مال سے نکالنا واجب ہوتا تو دو میں سے ایک وجہ سے خالی نہ ہو، تیسری کوئی نہیں، کہ یا تو زکاۃ اس مال کے اَجزا میں سے ہر جزو میں ہو یا بغیر اس کے عین سے اس کی کسی چیز میں! تو اگر اس کے ہر جزو میں ہو تو اس کے لیے حرام ہو کہ اصلاً ہی اس میں سے کچھ فروخت کر دے، ایک دانہ بھی کیونکہ اس جزو میں بھی مستحقین شریک ہوں گے اور خود اس پر بھی حرام ہو کہ اس سے کوئی چیز کھائے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کیا اور یہ بلا اختلاف باطل ہے اور پورے طور سے اس کا مثل بھی لازم ہو کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ شاید وہ بیچ دے یا اس سے کھالے جو مستحقین کا حق تھا، لہٰذا ہماری ذکر کردہ توجیہہ یقیناً صحیح ہے۔

زکاۃ واجب ہو جانے کے بعد لیکن ادا کرنے سے پیشتر اگر مال تلف ہو جائے؟

اگر وجوبِ زکاۃ کی شروط کے ساتھ زکاۃ واجب ہو چکی تھی، تو وہ صاحبِ مال کے ذمہ میں باقی رہے گی، چاہے اس کی کوتاہی یا غلطی سے مال تلف ہو یا اس کے بغیر، یہ اس قول پر کہ زکاۃ واجب فی الذمہ ہوتی ہے جو امام ابن حزم رحمہ اللہ کی رائے اور امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر اس میں اس کی غلطی نہیں تھی تب زکاۃ ساقط ہو جائے گی، اگر بعض حصہ تلف ہوا تو اس حصہ کی زکاۃ ساقط ہوئی، یہ اس قول پر بنا کرتے ہوئے کہ زکاۃ عین المال سے متعلق ہے، لیکن اگر تلف اس کی غلطی سے ہوا تب زکاۃ ساقط نہ ہوگی! امام شافعی، حسن بن صالح، اسحاق، ابوثور اور ابن منذر رحمہم اللہ کے نزدیک اگر ادائیگی پر قدرت سے قبل نصاب تلف ہوا تو زکاۃ ساقط ہو جائے گی اور اگر اس کے بعد ہوا تب نہیں، امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس رائے کو راجح کہا، لکھتے ہیں: ان شاء اللہ صحیح یہ ہے کہ زکاۃ نصاب تلف ہو جانے سے ساقط ہو جاتی ہے، اگر اس کی طرف سے ادائیگی زکاۃ میں کوتاہی نہیں ہوئی، کیونکہ زکاۃ کا وجوب بطورِ مواسات ہے، لہٰذا اس طور واجب نہ ہوگی کہ مال موجود نہ ہو اور اس پر زکاۃ عائد کریں کہ اگر دے تو خود فقر کا شکار ہو جائے، کوتاہی کا مطلب یہ ہے کہ زکاۃ کے اخراج پر قادر تھا لیکن سستی کی (اور بروقت نہیں ادا کی) لیکن اگر ادائیگی کی استطاعت نہ تھی، تب اس پہ کوئی دوش نہیں، چاہے یہ اس وجہ سے کہ مستحق نہ ملا یا مثلاً مال اس سے دور تھا، یا فرض حصہ موجود مال میں نہ تھا بلکہ خرید کر دینا تھا تو یہ میسر نہ ہوا یا اس کی تگ و دو میں تھا اور اس طرح کے اسباب، اگر مال تلف ہونے کے باوجود زکاۃ واجب ہونا قرار دیں اور مالک کے لیے ادا کرنا ممکن ہے، تو ضرور ادا کرے، وگرنہ اسے حالات بہتر ہونے تک مہلت دی جائے، جب بغیر کسی پریشانی کے ادائیگی ممکن ہو، اگر کسی انسان کے مقروض کو یہ مہلت دیے جانے کا شرع نے حکم دیا ہے، تو اللہ کا مقروض تو مہلت ملنے کا زیادہ حقدار ہے، کیونکہ زکاۃ اللہ کا حق ہے۔

اگر زکاۃ کا مال علیحدہ کر دیا تھا مگر وہ ضائع ہو گیا

اگر مستحقین کو دینے کے لیے زکاۃ علیحدہ کر لی تھی، تو سب یا اس کا بعض حصہ ضائع ہو گیا، تو اس کے ذمہ اعادہ ہے، کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ اللہ کے مقرر کردہ حصے کو مستحقین تک اسے پہنچائے، امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے حفص بن غیاث، جریر، معتمر بن ابوسلیمان، زید بن حباب اور عبدالوہاب بن عطاء سے نقل کیا، حفص نے ہشام بن حسان عن حسن بصری سے، جریر نے مغیرہ اوران کے اصحاب سے، معتمر نے معمر عن حماد سے، زید نے شعبہ عن حکم سے اور عبدالوہاب نے ابن ابوعروبہ عن حماد عن ابراہیم نخعی سے، یہ سب متفق ہوئے کہ جس نے زکاۃ کا مال علیحدہ کر لیا تھا پھر وہ ضائع ہو گیا تو کہا: یہ جائز نہیں اسے دوبارہ نکالنا پڑے گا، عطاء سے اس کا جائز ہونا منقول ہے۔

ادائیگی میں تاخیر سے زکاۃ ساقط نہ ہو گی

جس پر کئی برس گزرے اور اس نے واجب زکاۃ ادا نہ کی، اسے (جب زکاۃ نکالنے کا ارادہ کرے) تمام سالوں کی زکاۃ نکالنا ہو گی، چاہے اسے وجوبِ زکاۃ کا علم تھا یا نہیں اور چاہے وہ دار الاسلام میں تھا یا دار الکفر میں، بقول ابن منذر رحمہ اللہ اگر فسادی کسی شہر پر غالب آ گئے اور اس شہر کے باسی کئی سال زکاۃ ادا نہ کر سکے، پھر امام (حکمران) نے ان باغیوں پر قابو پا لیا، تو اس شہر والوں سے وہ گزشتہ سب سالوں کی زکاۃ وصول کرے گا، یہ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوثور رحمہم اللہ کا موقف ہے۔

عین کے بدلے قیمت (نقدی یا کسی اور جنس کی صورت میں) زکاۃ ادا کرنا

جن زکاتوں میں نص موجود ہے، ان میں عین کے بدلے قیمت بطورِ زکاۃ ادا کرنا جائز ہے اِلّا یہ کہ وہ پاس نہ ہو اور بازار میں بھی نایاب ہو، یہ اس لیے کہ زکاۃ عبادت ہے اور عبادت کی ادائیگی صحیح نہیں مگر شرعاً مامور بہ جہت اور طریق سے ہی اور تاکہ فقراء اغنیاء کے اعیان اموال میں مشارک بن سکیں، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن بھیجا تو ہدایت کی کہ غلہ کی اجناس کی زکاۃ اسی جنس کی صورت میں، غنم سے بکری (اور بھیڑ وغیرہ) اور اونٹوں کی اونٹوں اور گائے کی گائے کی صورت میں وصول کروں۔[1] اسے ابوداود، ابن ماجہ، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا اور اس میں انقطاع ہے، کیونکہ عطاء کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حق یہ ہے کہ زکاۃ عینِ مال سے نکالنا واجب ہے، اس کے بدلے قیمت ادا نہ کی جائے مگر کسی مجبوری کی بنا پر، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے قیمت کا اخراج بھی مجوز کیا، چاہے وہ عین کے اخراج پر قادر ہو کیونکہ زکاۃ مستحق کا حق ہے، تو اس کی نظر میں عین اور قیمت میں فرق نہیں، بخاری نے تعلیقاً صیغۂ جزم کے ساتھ نقل کیا کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے اہلِ یمن سے کہا تھا کہ آپ لوگ زکاۃ میں جو اور مکئی کے بدلے یمن کے کپڑے دے سکتے ہو، یہ تمہارے لیے زیادہ آسان اور مدینہ میں اصحاب کے لیے بہتر ہے (کیونکہ وہاں ان کی زیادہ ضرورت تھی)۔[2]

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ١٥٩٩؛ سنن ابن ماجه: ١٨١٤. [2] صحیح البخاری، تعلیقاً: ٣/ ٣١١؛ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ١١٣.

مشترک مال کی زکاۃ

اگر مال دو یا زیادہ شرکاء کے درمیان مشترک ہے، تو کسی ایک پر زکاۃ واجب نہ ہوگی، حتی کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے نصاب کامل ہو، یہی اکثر اہلِ علم کا قول ہے، یہ حیوانات کی نسبت دیگر میں خلط سے جس کی بابت اختلافِ آراء کا ذکر گزرا ہے۔

زکاۃ سے فرار

امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، امام اسحاق اور امام ابوعبید رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ جو کسی بھی نوعیت کے مال کے نصاب کا مالک بنا، تو سال گزرنے سے قبل اسے بیچ دیا یا ہبہ کر دیا، یا اس کا ایک جزو تلف کر دیا، زکاۃ سے فرار کے قصد سے، تو اس سے زکاۃ ساقط نہ ہوگی اور سال کے اختتام پر اسے اس سے وصول کیا جائے گا، اگر اس کا یہ تصرف سال ہونے کے قریب تھا، اگر سال کے شروع میں ایسا کیا تب نہیں، کیونکہ تب یہ فرار نہ سمجھا جائے گا، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک زکاۃ ساقط ہو جائے گی، کیونکہ بہر حال سال پورا ہونے سے قبل ہی نصاب ٹوٹ چکا ہے، لیکن ایسا کرنے پر وہ گناہ گار اور اللہ کا نافرمان ہوا، پہلوں نے اس آیت سے استدلال کیا:

﴿ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ○ وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴾(القلم:١٧-٢٠)

''ہم نے ان لوگوں کی اسی طرح آزمائش کی ہے جس طرح باغ والوں کی آزمائش کی تھی، جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے اور ان شاء اللہ نہ کہا، پس وہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے (راتوں رات) اس پر ایک آفت پھر گئی تو وہ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔''

تو اللہ تعالیٰ نے ان کے زکاۃ سے اس فرار کی پاداش میں ان کا معاقبہ کیا اور اس لیے کہ ان کے حصے کا اسقاط کیا جن کا استحقاق پورا ہو چکا تھا، لہٰذا زکاۃ ساقط نہ ہوئی، جیسے کوئی مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے (اس قصد سے کہ اسے وراثت نہ ملے) اور اس لیے کہ ایسا کرنے والے نے فاسد قصد کیا ہے، تو حکمت یہی ہے کہ اس کا مقصود پورا نہ ہونے دیا جائے، جیسے کوئی اپنے مورث کو اس کے ترکے کا مالک بننے میں استعجال کا مظاہرہ کرتے ہوئے قتل کر ڈالے تو شارع نے اسے محروم کر کے اس کا معاقبہ کیا ہے۔

زکاۃ کے مصارف

یہ آٹھ عدد ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (التوبة:٦٠)

''زکاۃ مفلسوں اور محتاجوں اور اس کی وصولی کے کام پر مامور لوگوں کا حق ہے اور وہ جن کی تالیف قلبی مقصود ہو اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، یہ مصارف اللہ کی طرف سے مقرر کردیے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

سیدنا زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بیعت کی اس اثناء ایک شخص آیا اور کہا: مجھے زکاۃ سے عطا کیجیے، تو آپ نے فرمایا: ''اللہ نے زکاۃ کے مستحقین کا بیان کیا ہے، جو آٹھ اصناف و اجزا ہیں اگر تم ان میں سے کسی میں ہو تب میں تمہیں تمہارا حق دوں گا۔''[1] اسے ابو داؤد نے تخریج کیا، اس کی سند میں عبد الرحمن افریقی ہے، جس کو کئی ایک نے ضعیف قرار دیا ہے، آگے آیت میں مذکوران آٹھ اصناف کی تفصیل دی جاتی ہے:

①، ② فقراء و مساکین

یہ ایسے محتاج جن کے پاس بقدرِ کفایت مال نہیں ہے، ان کے بالمقابل ذی کفایت اغنیا ہیں یعنی جن کے پاس ضروریات پوری کرنے کا مال موجود ہے! پہلے گزرا کہ وہ مقدار جس کے ساتھ انسان غنی ہوگا، وہ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی اکل وشرب، لباس ومسکن، سواری اور ضرورت کے جانور اور آلاتِ حرفت اور ان جیسی جن سے مستغنی نہیں ہوا جا سکتا، بنیادی ضروریات سے زائد اتنے مال کا ہونا جو نصاب تک پہنچ رہا ہو، تو ہر وہ آدمی جس کے پاس یہ مقدار معدوم ہے، وہ فقیر ہے اور زکاۃ کا مستحق ہے، چنانچہ حدیثِ معاذ میں ہے کہ زکاۃ ان کے اغنیاء سے وصول کر کے ان کے فقراء کو دی جائے تو جس سے زکاۃ وصول کی جائے، وہ غنی نصاب کا مالک ہے اور جسے وہ دی جائے وہ اس کا مقابل یعنی فقیر جو اس قدر مال کا مالک نہیں، جس کا غنی مالک ہے، حاجت وفاقہ اور زکاۃ کے استحقاق کے لحاظ سے فقیر اور مسکین کے مابین فرق نہیں، آیت میں فقراء اور مساکین کے درمیان واوِ عاطفہ کا استعمال جو تغایر کی مقتضی ہوتی ہے، ہماری بات کے مناقض نہیں، تو مساکین درحقیقت فقراء کی ہی ایک قسم ہیں، جن کے لیے ایک وصفِ خاص ہے اور یہ باہمی تغایر میں کافی ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ مساکین وہ فقراء ہیں، جو سوال کرنے اور مانگنے سے تعفف کا مظاہرہ کرتے ہیں اور لوگوں کو عموماً ان کی تنگدستی کا علم نہیں ہو پاتا تو آیت نے ان کا اسی لیے ذکر کیا کہ تاکہ زکاۃ نکالنے والے ایسوں کا کھوج لگائیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں جو ایک یا دو لقمے مانگتا پھرتا ہے، بلکہ وہ ہے جو (محتاجگی کے باوجود) تعفف کرتا ہے (مانگنے سے بچتا ہے) چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (البقرة:٢٧٣) ''لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔''[2] ایک روایت میں ہے: ''مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے چکر کاٹے کہ کہیں سے ایک اور کہیں سے دو لقمے مل جائیں، لیکن مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں جو اس کی تمام ضروریات کے لیے کافی ہو اور اس کا

---

[1] ضعیف، أبی داود: ١٦٣٠. [2] صحیح البخاری: ٤٥٣٩؛ صحیح مسلم: ١٠٣٩/ ١٠٢.

(اس کے ظاہرِ حال سے) پتہ بھی نہیں چلتا کہ اسے صدقہ دیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے معاونت کی اپیل کرتا ہے۔''[1] (لہٰذا زکاۃ دینے والوں کا فرض ہے کہ ایسوں کا کھوج لگائیں اوران کی عزتِ نفس مجروح کیے بغیر اسے زکاۃ وخیرات دیں) اسے بخاری ومسلم نے نقل کیا۔

فقیر کو کتنی زکاۃ دی جائے

زکاۃ کے مقاصد میں سے ہے کہ فقیر کی ضروریات پورا کرنے کے لیے اسے اتنا مال دیا جائے کہ وہ حالتِ فقر سے نکل کر حالتِ غنیٰ میں آجائے اور مستقل طور پر اس کی احتیاج ختم ہوسکے اور یہ معاملہ احوال واشخاص کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: جب زکاۃ دو تو (اس انداز سے دو کہ) مالدار بنادو، قاضی عبد الوہاب نے کہا: امام مالک رحمہ اللہ نے اس کی کوئی حد بیان نہیں کی بس یہ کہا کہ اسے بھی دی جاسکتی ہے، جس کے پاس اپنا گھر ہے اور خادم بھی اور جانور بھی اگر اسے (بقیہ ضروریات پوری کرنے کے لیے) زکاۃ کی ضرورت ہے، حدیث میں وارد ہے جس سے دلالت ملتی ہے کہ سوال کرنا فقیر کے لیے حلال ہے، حتی کہ اتنا مال پالے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو اور وہ عمر بھر کے لیے مستغنی ہوجائے (اتنی رقم جمع کرلے کہ اس سے کوئی کاروبار شروع کرسکے، تاکہ پھر لینے والا نہیں بلکہ دینے والا بن جائے) سیدنا قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے ذمہ کسی کا قرض لے لیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاونت کا خواہاں ہوکر آیا، فرمایا: ''یہیں رہو حتی کہ ہمارے پاس زکاۃ کا مال آئے تو تمہیں اس میں سے دینے کا حکم دوں گا۔'' پھر فرمایا: ''اے قبیصہ! سوال کرنا حلال نہیں مگر ان تین میں سے ایک کے لیے: ایک جس نے اپنے ذمہ کسی کا قرض لے لیا، اب اسے چکانے کے لیے حلال ہے کہ لوگوں سے مدد کی اپیل کرے جب اتنا مال جمع ہوجائے، تو اب رک جائے، دوم جسے کوئی ایسی آفت پہنچی کہ اس کا سارا مال ختم کرگئی (دوکان یا گھر میں آگ لگ گئی) تو اس کے لیے بھی حلال ہے کہ بقدرِ ضرورت مالی تعاون کی اپیل کرلے، اس حد تک کہ گزارے کے لیے مال جمع ہوجائے اور سوم جو فاقہ کشی کا شکار ہوا اور اس کی قوم کے تین صاحبانِ عقل نے تصدیق کی کہ واقعی وہ تنگدستی میں ہے تو اس کے لیے تعاون کی اپیل کرنا حلال ہے، تو جو ان تینوں اصناف میں نہیں مگر پھر بھی مانگتا ہے تو جو ملے وہ اس کی نسبت حرام ہے، وہ حرام کھائے گا۔''[2] اسے احمد، مسلم، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا۔

کیا صحیح، سالم، قوی اور کمانے پر قادر شخص کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

ایسے کو زکاۃ نہ دی جائے، کیونکہ وہ غنی کی مثل ہے، چنانچہ عبید اللہ بن عدی بن خیار سے روایت ہے کہ مجھے دو صاحبوں نے بتلایا کہ وہ حج وداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ زکاۃ تقسیم فرمارہے تھے، تو انہوں نے بھی سوال کیا، آپ نے ہماری طرف نگاہِ مبارک کی اور پھر جھکالی کیونکہ ہمیں آپ نے مضبوط وقوی پایا، فرمایا: ''اگر چاہو تو تمہیں اس میں سے کچھ

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٧٩، صحيح مسلم: ١٠١/ ١٠٣٩. [2] صحيح مسلم: ١٠٤٤، سنن أبي داود: ١٦٤٠.

دے دوں، لیکن بات یہ ہے کہ اس پر غنی کا اور کمانے پر قادر قوی شخص کا کوئی حق نہیں۔''[1] اسے ابوداود اور نسائی نے تخریج کیا، بقول امام خطابی رحمہ اللہ یہ حدیث اس امر میں اصل و ضابطہ ہے کہ جس کے لیے مال معلوم نہیں، تو اس کا معاملہ عدم پر محمول ہے اور اس میں دلیل ہے کہ امر زکاۃ میں ظاہری جسمانی قوت و مضبوطی کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس کے پاس کوئی کسب ہے یا نہیں (کئی دفعہ آدمی قوی اور مضبوط ہے، مگر روزگار نہیں ملتا اور کوئی ہنر بھی پاس نہیں، تو ایسے بھی زکاۃ کے حقدار ہیں) تو کئی دفعہ آدمی کمانے پر قادر تو ہے، مگر اس کا ہاتھ اخرق ہے (پوری طاقت کا حامل نہیں) کام نہیں کرسکتا تو حدیث کی دلالت کی رو سے یہ بھی زکاۃ کے مستحقین میں داخل ہے، ریحان بن یزید سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

«لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ»

''مالدار کے لیے زکاۃ لینا حلال نہیں اور جو صاحبِ قوت اور سلیم الاعضاء ہو۔''[2]

اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور حکمِ صحت لگایا۔

یہ امام شافعی، امام اسحاق، امام ابوعبید اور امام احمد رحمہم اللہ کا موقف ہے، جبکہ احناف کے نزدیک قوی کے لیے زکاۃ لینا جائز ہے، اگر وہ دوسو یا زائد درہم کا مالک نہیں (صاحبِ نصاب نہیں) امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام غزالی رحمہ اللہ سے ان خاندانوں کے قوی مردوں کی بابت پوچھا گیا جن کا تکسّب بالبدن (جسمانی مشقت کر کے معاش کمانا) معمول نہیں کہ آیا انہیں فقراء کے حصہ سے زکاۃ دی جاسکتی ہے؟ کہا: ہاں، لکھتے ہیں: یہ جواب صحیح ہے اور اس قاعدہ پر جاری ہے کہ اس ضمن میں کمائی والے کسی ہنر اور پیشہ کا جاننا معتبر ہے۔

ایسا مالکِ نصاب جو اپنی ضروریات پوری کرنے پر قادر نہیں

جو کسی بھی نوعِ مال کے نصاب کا مالک تو ہے، لیکن ضروریات پوری کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، مثلاً کثرتِ عیال کی وجہ سے یا مہنگائی کے سبب تو وہ اس لحاظ سے تو غنی ہے کہ نصاب کا مالک ہے اور اس پر زکاۃ عائد ہے، لیکن اس جہت سے وہ فقیر متصور ہے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جملہ ضروریات پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لہٰذا فقراء کے زمرہ میں سمجھ کر اسے زکاۃ دی جاسکتی ہے! امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں جس کے پاس زرعی زمین ہے مگر اس کی پیداوار اتنی نہیں کہ اس کی جملہ ضروریات پوری ہوں، تو وہ فقیر (کے حکم میں) ہے، اسے حسبِ ضرورت زکاۃ دی جاسکتی ہے، اس پر یہ قدغن نہ لگائی جائے کہ پہلے اپنی جائیداد بیچے (تب وہ زکاۃ کا مستحق بنے گا) المغنی میں میمونی سے منقول ہے کہ کہا: میں نے ابوعبداللہ احمد بن حنبل سے بحث کی اور کہا: کبھی آدمی کے پاس اونٹ و غنم وغیرہ ہیں اور اتنے کہ زکاۃ واجب ہو، لیکن وہ فقیر باور ہوگا کیونکہ اس کی ضروریات پورا کرنے سے اس کا مال قاصر ہے تو کیا اسے زکاۃ دی جاسکتی ہے؟ کہا: ہاں، اس لیے کہ اتنے مال کا یہ مالک نہیں جو اسے مستغنی

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٦٣٣؛ سنن نسائي: ٥/ ٩٩. [2] صحيح،سنن أبي داود:١٦٣٤؛ سنن ترمذي: ٦٥٢.

بنادے اور نہ ہی مزید کے کسب پر قادر ہے، تو یہ اس کی مثل ہے، جو اتنے مال کا مالک نہیں جو حدِ نصاب تک پہنچ رہا ہو۔

③ زکاۃ کی وصولی پر مامور کارندے

یہ جنہیں حاکم یا اس کا نائب اغنیا سے زکاۃ کی وصولی پر مقرر کرے، ان میں زکاۃ کے اموال کی حفاظت کرنے والے، زکاۃ کے مویشی چَرانے والے اور اس کا حساب کتاب رکھنے والے بھی داخل ہیں، واجب ہے کہ یہ مسلمان ہوں اور ان میں سے نہ ہوں جن پر زکاۃ حرام ہے، مثلاً آلِ رسول اور یہ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب ہیں، چنانچہ مطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ میں اور سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کی: آپ ہمیں صدقات کی وصولی کی ذمہ داری سونپیں، تاکہ ہمیں بھی وہ منفعت حاصل ہو، جو دوسرے ایسے لوگوں کو ہوتی ہے، آپ نے فرمایا: ''بے شک زکاۃ محمد اور آلِ محمد کے لیے حلال نہیں، یہ تو لوگوں کی اوساخ (میل کچیل) ہے۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

یہ کارندے اغنیا بھی ہو سکتے ہیں، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''غنی کے لیے زکاۃ حلال نہیں مگر پانچ قسم کے اغنیا کے لیے:

① اس کی وصولی پر مامور سرکاری کارندہ
② جو زکاۃ کی چیز خریدے
③ غارم (مقروض اور جسے کوئی چٹی پڑ گئی)
④ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلنے والا
⑤ زکاۃ کی کوئی چیز جو کسی مسکین (وغیرہ) کو دی گئی اور اس نے کسی غنی کو وہ ہدیۃً بھیج دی۔''[2] اسے احمد، ابو داود، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

اور زکاۃ کا جو مال وہ لیں گے، وہ (زکاۃ نہیں بلکہ) ان کی خدمات کا صلہ و معاوضہ (تنخواہ) ہوگا، عبداللہ سعدی سے منقول ہے کہ وہ شام سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے آئے، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: مجھے بتلایا گیا ہے کہ آپ کوئی سرکاری کام بجا لاتے ہو، لیکن تنخواہ وصول نہیں کرتے؟ وہ بولے آپ نے ٹھیک سنا کیونکہ میری مالی حالت اچھی ہے، میرے پاس گھوڑے بھی ہیں اور غلام بھی اور میں چاہتا ہوں میری یہ خدمات مسلمانوں پر صدقہ ہوں، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میرے بھی یہی خیالات تھے جو آپ کے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے معاوضہ دیتے تو میں کہتا: مجھ سے زیادہ محتاج کو دے دیں۔ ایک مرتبہ مجھے کوئی مال دینے لگے، تو میں نے یہی کہا: تو فرمایا: ''جو مال اللہ تعالیٰ بغیر سوال و طلب کیے اور بغیر طمع کے دے دے تو اسے لے لو اور چاہو تو اپنے کاروبار میں لگا لو یا چاہو اپنی طرف سے صدقہ کر دو اور اگر نہ ملے تو اس کی لالچ نہ کرو۔''[3] اسے بخاری اور نسائی نے تخریج کیا، مناسب یہ ہے کہ تنخواہیں اور معاوضے اتنے ہوں کہ لازمی ضروریات پوری ہو سکیں۔

سیدنا مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی سرکاری کام کا ذمہ دار بنا اور اس کے پاس گھر

---

① صحیح مسلم: ۱۰۷۲؛ مسند أحمد: ٤/ ۱٦٦. ② صحیح، سنن ابی داود: ۱٦۳٥؛ سنن ابن ماجه: ۱۸٤۱.
③ صحیح البخاری: ۱٤۷۳؛ صحیح مسلم: ۱۰٤٥.

نہیں تو (سرکاری مال سے جو خدمات کے عوض ملے) گھر بنائے، شادی نہیں کی تو وہ شادی کرائے، خادم نہیں تو اسے حاصل کرے، اسی طرح جس کے پاس سواری نہیں تو اسے خرید ے اور جو اس کے سوا کوئی چیز لے تو وہ خائن ہوگا۔''[1] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا اور اس کی سند جید ہے، بقول امام خطابی رحمہ اللہ اس کی دو تاویلیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ آپ نے اجرت و معاوضہ سے خادم اور گھر کا اکتساب مباح قرار کیا اور اب اس کے لیے روا نہیں کہ اس کے سوا کسی اور چیز کا کسب کرے، دوسری توجیہہ یہ کہ عامل کے لیے رہائش اور خدمت مہیا کرنا ہوگی، اگر اس کے پاس (پہلے سے) رہائش اور خادم نہیں ہیں، تو جب تک یہ ذمہ داری اس کے پاس ہے اس کے کام کاج کے لیے خادم رکھا جائے اور کرائے پر گھر لے کر دیا جائے۔

④ مؤلفۃ القلوب

یہ جن کی تالیفِ قلبی اور اسلام پر انہیں مضبوط کرنا مقصود ہے، اس وجہ سے کہ وہ کمزور (یا تازہ) اسلام والے ہیں یا مقصود ان کے شر سے اہل اسلام کو محفوظ رکھنا ہو یا اس طرح کا کوئی اور جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت مقصد ہو، فقہاء نے مؤلفۃ القلوب کو مسلمانوں اور کفار میں تقسیم کیا ہے، جہاں تک مسلمان تو یہ چار اقسام ہیں:

① مسلمانوں کے سادات اور لیڈر حضرات کہ انہیں کچھ عطا ہو تو کفار سے ان کے ہم مثل قائدین کے بارے طمع ہو کہ وہ بھی اسلام قبول کر لیں گے (یہ سوچ کر کہ مسلمان اپنے معززین سے اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں) جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عدی بن حاتم اور زبرقان بن بدر کو بیت المال سے خطیر رقم دی، حالانکہ وہ حسن الاسلام تھے، یہ اس وجہ سے کہ اپنی قوم کے ممتاز افراد میں سے تھے۔

② ضعیف الاسلام مسلمانوں کے لیڈران جن کی قوم و قبیلے ان کے مطیع ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور خوشدلی سے جہاد وغیرہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، یہ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن سے حاصل شدہ غنیمت سے فتحِ مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے مکہ کے بعض سرداروں کو گرانقدر ہدایا دیے تھے اور کئی ان میں سے ضعیف الایمان تھے، مگر اس نوازے جانے اور حسنِ سلوک کی وجہ سے بعد ازاں حسن الاسلام ثابت ہوئے اور خدمات انجام دیں۔

③ مسلمان مملکت کی سرحدوں پر رہائش پذیر لوگ جنہیں اس غرض سے مال دیا جائے کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کرتے رہیں اور جب دشمن حملہ آور ہو تو دفاع کریں، مؤلف المنار (علامہ رشید رضا مصری) لکھتے ہیں: میرے خیال میں ان لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ مرابطہ (وہ فوجی یا رضا کار جو سرحدوں کی حفاظت پر مامور ہیں) کی قبیل سے ہے اور ان کے لیے فقہاء نے مال غنیمت سے حصہ خاص کیا ہے، ہمارے زمانہ میں تالیفِ مذکور کے زیادہ لائق وہ مسلمان ہیں، جنہیں کفار کی جانب سے ترغیب و تحریص ہے، تاکہ ان کی حمایت کریں یا ان کے دین میں داخل ہو جائیں، ہم دیکھتے ہیں کہ استعماری قوتیں (یہ مولفِ کتاب کا زمانہ آج سے ستر برس قبل) تمام عالم اسلام کو غلام بنا لینے کے درپے ہیں اور بھاری سرمایہ کاری کر کے مسلمانوں کے ذی حیثیت لوگوں کو اپنا ایجنٹ بناتی ہیں، تاکہ ان ریشہ دوانیوں میں وہ ان کا ساتھ دیں، اسی طرح اپنے دین میں شامل کرانے کی غرض

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٢٩٤٥؛ مسند أحمد: ٤/ ٢٢٩.

سے بھی بھاری مال خرچ کرتے ہیں، تو اس طرح کے مسلمان بھی مؤلفۃ القلوب ہیں انہیں سرمایہ دے کر دوسری طرف جانے سے بچایا جانا چاہیے۔

④ مسلمانوں کے وہ افراد حکومت کو جن کی خدمات کی (زکاۃ کی وصولی اور تقسیم کرنے وغیرہ میں) مختلف میدانوں میں ضرورت ہے۔

جہاں تک کفار تو یہ دو قسموں پر ہیں

① جن کی اس طرح سے تالیف کر کے امید ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے، جیسے نبی کریم ﷺ نے صفوان بن امیہ کے ساتھ معاملہ کیا کہ فتحِ مکہ کے روز انہیں امان دی اور انہیں چار مہینے مہلت دی، تا کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیں، وہ تب مکہ سے دور تھے، بعد میں آئے اور مسلمانوں کے ساتھ غزوہ حنین میں حاضر ہوئے، حالانکہ ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور نبی کریم ﷺ نے ان سے ہتھیار ادھار لیے تھے، پھر حنین سے حاصل شدہ مال غنیمت سے انہیں کثیر اونٹ عطا کیے، اتنے زیادہ اونٹ دیکھ کر وہ بولے: یہ ایسے شخص کی عطا ہے، جسے فقر کا کوئی ڈر نہیں اور کہا: اللہ کی قسم! نبی کریم ﷺ نے مجھے عطا کیا جب کہ آپ تمام لوگوں سے مجھے مبغوض تھے، مگر آپ مسلسل عطا کرتے رہے، حتی کہ ایک دن آیا کہ آپ تمام جہان سے مجھے محبوب بن گئے۔

② جس کے شر کا اندیشہ ہو تو اس کے تدارک کی غرض سے اسے عطا کیا جائے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی تھے جو نبی کریم ﷺ کے پاس آتے، اگر آپ انہیں مال عطا کرتے تو وہ اسلام کی تعریفوں کے پل باندھتے اور کہتے بڑا اچھا دین ہے اور اگر نہ دیتے تو بدخوئی کرتے، ان میں ابوسفیان بن حرب، اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن تھے، آپ نے ان میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ عطا کیے۔

احناف کا مسلک ہے کہ اب مؤلفۃ القلوب کا مصرف ختم ہو چکا کہ اللہ کا دین اب تقویت پا چکا ہے، منقول ہے کہ عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کے پاس آئے اور (عہدِ نبوی کی طرح کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں تالیف قلبی کے بطور بہت کچھ عطا کیا تھا) اپنا حصہ طلب کیا انہوں نے دینے کا لکھ دیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ دستاویز لے کر آئے، تو انہوں نے انکار کر دیا اور اسے پھاڑ دیا اور کہا: نبی کریم ﷺ تمہیں اسلام پر جمائے رکھنے کے مقصد سے عطا فرماتے رہے، اب اللہ نے دینِ اسلام کو غلبہ عنایت کر دیا ہے اور وہ تم سے اب مستغنی ہے، اگر اسلام پر ثابت قدم رہو تو اس میں تمہاری بھلائی ہے، بصورت دیگر ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (الکھف:۲۹) ''کہہ دیجیے! یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے، تو جو چاہے مومن بنے اور جو چاہے کفر کرے۔'' وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لوٹے اور کہنے لگے خلیفہ آپ ہیں یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ؟ آپ نے ہمیں خط لکھ دیا مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پھاڑ دیا ہے، وہ بولے اس معاملہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مرضی چلے گی، حنفیہ کہتے ہیں تو یوں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی اور صحابہ میں سے کسی نے اس کی مخالفت یا انکار نہ کیا، اسی طرح سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے کہیں منقول نہیں کہ اس مد میں زکاۃ کا مال خرچ کیا ہو، (بقول مؤلف) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اجتہادی رائے تھی، جو یہ ہوئی کہ انہیں اب دینا مصلحت کا تقاضا نہیں، کیونکہ اسلام کے قدم اب راسخ ہو چکے اوران کے ارتداد سے اسلام کا کوئی نقصان نہیں، سیدنا عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کا اس صنف کو عطا نہ کرنا ان کے مؤقف کی صحت پر دال نہیں، کیونکہ انہیں بھی اس کی ضرورت پیش نہ آئی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مصرف اب ساقط ہوا، بلکہ جب کبھی عہدِ نبوی کی طرح کے حالات ہوں اوراس مد میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتواسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے اوراستدلال میں معتمد علیہ تو کتاب وسنت ہی ہے، تو یہ دونوں ایسا مرجع ہیں، جن سے کسی حال میں عدول نہ کیا جائے گا۔ احمد اور مسلم نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام (کے نام) پر کسی چیز کا سوال نہ کیا جاتا مگر آپ عطا کرتے، ایک آدمی نے مالی معاونت مانگی، تو آپ نے زکاۃ کے مال سے دو پہاڑوں کے مابین بکریوں سے بھری وادی اسے عطا کی، وہ اپنے قبیلہ کے پاس لوٹا اور یوں گویا ہوا: اے لوگو! مسلمان ہو جاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا اس شخص کی سی ہے جسے مطلقاً فقر و فاقہ کا ڈر نہ ہو۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تالیفِ قلبی کے جواز کی رائے جبائی، بلخی اور ابن مبشر نے اختیار کی ہے، (بقول محشی اسی طرح مالک، احمد اور ایک روایت کے مطابق شافعی نے) امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کافر کی تالیف قلبی نہ کی جائے، البتہ فاسق اس مد سے مستفید ہوسکتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک اسلام کے ہر سو منتشر ہوجانے کے باوصف یہ مصرف اب ساقط ہوا، ان کا اس پر استدلال سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ابوسفیان، عیینہ، اقرع اور عباس بن مرداس کو عدم عطا سے ہے، بظاہر بوقتِ ضرورت اس کا جواز ہے، اگر کسی حکمران کے دور میں ایسے شر پسند لوگ موجود ہیں، جو تبھی مطیع ہوتے ہیں اگر انہیں مال دیا جائے اور اتنی طاقت نہیں کہ بزور انہیں دائرۂ اطاعت میں لایا جائے، توان کے ساتھ مؤلفۃ القلوب کا معاملہ کا جا سکتا ہے، اس ضمن میں اسلام کے فشوّ واشاعت کی کوئی تاثیر نہیں، کیونکہ خصوصیت سے اس ضمن میں وہ کچھ نافع نہیں، المنار میں لکھتے ہیں فی الجملہ یہی موقف حق اور صائب ہے اجتہاد دراصل اس کی تفاصیل میں ہوسکتا ہے کہ کس کا اس پر استحقاق یا کتنی مقدار میں عطا ہو وغیرہ، اس سلسلے میں اہلِ شوریٰ سے مشاورت ضروری ہوگی، جیسے خلفائے راشدین اجتہادی امور میں کرتے رہے، یہ شرط عائد کرنا کہ حاکم کا ایسے لوگوں کو بقوت دائرۂ طاعت میں لانا ممکن نہ ہو، محلِ نظر ہے کیونکہ یہ قاعدہ مطرد (ہر جگہ لاگو) نہیں بلکہ اس ضمن میں اصل اخف الضررین اور خیرالمصلحتین ہے (یعنی اتنی قوت تو ہے کہ انہیں بزور جھکایا جا سکے لیکن اس میں مالی و جانی اتلاف سے بچنے کی غرض سے اس سے اخف کو بروئے کار لایا جائے کہ انہیں کچھ رقم دے دلا کر منالیا جائے)

⑤ رقاب

(لفظی ترجمہ: گردنوں میں) اس سے مراد غلام ولونڈیاں آزاد کرانا اور بالخصوص مکاتَب (جس سے مالک نے معاہدہ کیا کہ اتنے عرصہ میں اتنے پیسے لادوتوتم آزاد) تو زکاۃ کے مال کے ساتھ ان کی معاونت کی جاسکتی ہے، تاکہ غلامی سے ان کی گردن چھوٹے اسی طرح غلام ولونڈی خرید کر آزاد کر دیے جائیں، سیدنا براء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ!

---

[1] صحیح مسلم: ۲۳۱۲، مسند أحمد: ۳/ ۱۰۸.

مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں، جو مجھے جنت سے قریب اور آگ سے دور کر دے، فرمایا: ''گردن چھڑواؤ اور نسمہ (جان) آزاد کراؤ۔'' وہ بولا: یا رسول اللہ! کیا یہ ایک ہی نہیں؟ فرمایا: ''نسمہ آزاد کرانے کا مطلب یہ کہ تم اکیلے کسی غلام یا لونڈی کو خرید کر آزاد کر دو، جبکہ فکِ رقبہ یہ ہے کہ اس ضمن میں معاونت کرو۔''[1] اسے احمد اور دار قطنی نے نقل کیا اور اس کے راوی ثقہ ہیں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ پر حق ہے کہ ان کی مدد کرے: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، مکاتب جو معاہدہ کی رقم ادا کرنے کا خواہاں ہے اور حرام کاری سے بچنے کی غرض سے شادی کرنے والا۔''[2] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے تخریج کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علماء نے قولہ تعالیٰ: ﴿وَ فِي الرِّقَابِ﴾ کی مراد کے بارے باہم اختلاف کیا، تو سیدنا علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر، لیث رحمہم اللہ، ثوری، حنفیہ، شافعیہ اور اکثر اہلِ علم کا موقف ہے کہ اس سے مراد مکاتب غلام و لونڈی ہیں، تو اس پر زکاۃ کے ساتھ ان کی معاونت کی جائے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مالک، احمد، ابوثور، ابوعبیدہ اور ابن منذر رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ مراد یہ کہ گردنیں خریدی جائیں، تاکہ انہیں آزاد کیا جائے، امام بخاری رحمہ اللہ کا میلان بھی یہی ہے، ان کی حجت یہ ہے کہ اگر اس مد کو صرف مکاتب کے ساتھ خاص کیا جائے، تو یہ تو غارمین کے حکم میں داخل ہوگا (جو الگ سے زکاۃ کا ایک مصرف ہے) کیونکہ مکاتب غارم ہی تو ہے نیز غلام و لونڈی خرید کر آزاد کر دینا، مکاتب کی اعانت سے اولیٰ ہے، کیونکہ عین ممکن ہے اس کی مدد کر دی جائے، مگر پھر بھی اسے آزادی نہ مل سکے، کیونکہ جب تک وہ معاہدے کی رو سے آخری درہم تک ادا نہ کرے، وہ غلام ہی ہے اور اس لیے کہ خریدنا تو ہر وقت میسر ہے، بخلاف مکاتب کے، بقول امام زہری رحمہ اللہ دونوں مراد ہیں اور یہ ظاہر ہے کیونکہ آیت دونوں امور کو محتمل ہے، بلکہ وہ قیدی بھی اس میں شامل ہوں گے، جن پر کوئی مالی جرمانہ یا ہرجانہ عائد ہے، تو اس کی ادائیگی کر کے انہیں رہائی دلائی جا سکتی ہے، اگرچہ یہ غارمین میں بھی داخل سمجھے جا سکتے ہیں اور سیدنا براء رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث دال ہے کہ فکِ رقاب ان کے عتق سے دیگر ہے۔

⑥ غارمین

یہ ایسے حضرات جنہوں نے قرض اٹھائے مگر اب چکانے سے قاصر ہیں، ان کی کئی اقسام ہیں: جس نے کوئی چٹی اپنے ذمہ لی یا کسی کے قرض کا ضامن بنا تھا تو اب اس پر ادائیگی لازم ہوئی جو اس کا سب مال ختم کر گئی یا جو اپنی کسی ضرورت کے لیے مقروض بنا یا کسی معصیت سے تائب ہوا، تو یہ سب زکاۃ لینے کے مستحق ہیں۔ جس سے اپنے جرمانے اور قروض چکا سکیں، احمد، ابوداود، ابن ماجہ نے جبکہ ترمذی نے حسن قرار دے کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوال کرنا حلال نہیں مگر تین کے لیے: فقیر جس کے پاس کچھ نہ ہو، ذی غرم جسے ادا کرنا بڑا دشوار ہوا ہے اور اس کے بس سے باہر ہے اور جس نے اپنے رشتہ دار یا دوست قاتل کی طرف سے دیت ادا کرنے کی حامی بھری اور بے بس ہے اب اگر ادا نہیں کرتا تو

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ٤/ ٢٩٩؛ سنن دار قطني: ٢/ ١٣٤. [2] صحیح، سنن ترمذي: ١٦٥٥؛ سنن نسائي: ٦/ ١٦١.

اس کا دوست یا رشتہ دار قتل کر دیا جائے گا۔''[1] مسلم نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی، کہتے ہیں: عہدِ نبوی میں ایک شخص کو پھلوں کے کاروبار میں بہت نقصان ہوا اور وہ مقروض ہو گیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صدقات دینے کا حکم دیا، لوگوں نے دیے مگر اس کا قرض اتنا زیادہ تھا کہ ادا نہ ہو سکا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے کہا: ''جتنا مل رہا ہے اسی پر اکتفا کرو۔'' (بقول محشی یعنی ابھی یہی لے لو اور باقی اس کے حالات بہتر ہونے پر ملے گا)[2]

قبل ازیں سیدنا قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ کی روایت گزری، جس میں ذکر ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے ذمہ کسی کا قرض لیا، پھر تعاون لینے خدمتِ نبوی میں آئے تو آپ نے کہا تھا ادھر ہی رکو زکاۃ کے اموال آنے دو، تو ان سے تمہیں دینے کا حکم دوں گا، عربوں کے ہاں جب کوئی فتنہ ایسا برپا ہوتا جو کسی دیت وغیرہ میں غرامت (چٹی پڑ جانے) کا موجب بنتا تو کوئی ایک اصلاح کی غرض سے اور تاکہ خون خرابہ نہ ہو، آگے بڑھتا اور اپنے ذمہ لے لیتا، بلاشبہ یہ مکارمِ اخلاق کا تقاضا تھا، تو لوگوں کو جب پتہ چلتا کہ کسی نے نیکی کے اس کام کی حامی بھری ہے تو اس کی مدد اور تعاون میں مبادرت کرتے، اگر وہ خود بھی اس ضمن میں چندے کی اپیل کرتا تو اسے نقصِ قدر نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ اس کے برعکس یہ فخر کی بات باور ہوتی اور اس غرض کے لیے زکاۃ کا مال لینے کی یہ شرط نہ ہوتی کہ وہ اس کی ادائیگی سے قاصر ہے بلکہ اپنی مالی حالت اچھی ہونے کے باوجود اسے حقدار سمجھا جاتا تھا۔

⑦ فی سبیل اللہ

(اللہ کی راہ میں) یہ بھی زکاۃ کے مصارف میں سے ایک ہے، انہی الفاظ میں قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے، یعنی اللہ کی مرضات کی طرف پہنچانے والا علم وعمل کا کوئی بھی راستہ، جمہور علماء کے نزدیک اس سے یہاں مراد جہاد ہے اور (سبیل اللہ) کا یہ حصہ ان رضا کار مجاہدوں کو دیا جائے گا، جو جہاد کے عوض حکومت سے کوئی معاوضہ یا تنخواہ نہیں لیتے چاہے وہ اغنیا ہوں یا فقراء، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث گزری، جس میں تھا: «لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلَّا لِخَمْسَةٍ: اَلْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ» الخ[3] اس سبیل اللہ میں حج داخل نہیں جہاں زکاۃ خرچ کی جائے، کیونکہ وہ صرف صاحبِ استطاعت پر فرض ہے نہ کہ اس کے غیر پر، تفسیر المنار میں ہے، البتہ حج کے راستوں کو پرامن بنانے اور رکھنے پر اس مصرف سے خرچ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح حاجیوں کو کھانے پینے اور صحت کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اگر ان کاموں کے لیے کوئی اور مصرف موجود نہیں، کیونکہ (فی سبیل اللہ) تمام عام شرعی مصالح کو شامل ہے، جو دین وریاست کے امور کے والی ہوں اور ان سب میں سرفہرست جنگی استعداد، لشکر کے لیے ہتھیار، غذا اور دیگر ساز وسامان جس میں مجاہد کا لباس اور جوتے وغیرہ بھی، البتہ جہاد کے بعد وہ یہ سامان بیت المال کو واپس کرنے کا پابند ہوگا، اگر ایسا سامان ہے جو باقی رہنے والا ہے، مثلاً ہتھیار اور گھوڑا وغیرہ کیونکہ ان کی ملکیت اس کے نام دائمی نہیں یہ تو بغرضِ جہاد ایک عارضی صفت کی رو سے ہے، تو جب یہ صفت زائل ہوگی تو یہ سامان واپس جمع کرانا ہوگا، بخلاف دیگر

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ١٦٤١؛ سنن ترمذی: ٦٥٣. [2] صحیح مسلم: ١٥٥٦؛ سنن أبی داود: ٣٤٦٩.

[3] صحیح لغیرہ، سنن ابی داود: ١٦٣٥.

مصارف کے کہ وہ اس صفت کے فقدان کے بعد بھی جس کی رو سے زکاۃ لی تھی، واپس نہ کریں گے، اس کے عموم میں خیراتی ہسپتالوں کا قیام، سڑکوں کی تعمیر ومرمت، فوجی نقطہ نظر سے اٹھائے گئے اقدامات مثلاً قلعوں، خندقوں اور چھاؤنیوں کی تعمیر بھی داخل ہے، ہمارے دور میں فی سبیل اللہ کے ضمن میں ایک نہایت اہم مصرف مبلغینِ اسلام کی تیاری اور انہیں بلادِ کفر کی طرف روانہ کرنے پر خرچ کرنا ہے جیسے کفار اپنے ادیان کی نشرواشاعت کے لیے مال خرچ کرتے ہیں، اسی سے دینی مدارس پر خرچ کرنا بھی شامل ہے اور ان کے اساتذہ کی تنخواہیں اور طلباء کے وظائف اور دیگر اخراجات البتہ غنی عالم کو اس وجہ سے اس مصرف میں سے نہ دیا جائے کہ وہ دینی عالم ہے، چاہے وہ لوگوں کے افادہ میں لگا ہو، ہاں! اگر اس کا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں تب اس کا حقدار ہے۔

⑧ ابن سبیل

علماء متفق ہیں کہ اس سے مراد سفر پر نکلا ہوا جو اپنے دیار سے دور ہے اور سفر کی تکمیل کے لیے مال کا محتاج ہے، تو وہ بھی اس کا مستحق ہے، اگر کسی اور مد سے اسے سفر کے اخراجات نہیں ملتے، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ سفرِ معصیت میں نہ ہو، سفرِ مباح کے بارے اختلاف ہوا تو شوافع کے ہاں راجح اس کا اس مصرف کی زکاۃ کا حقدار ہونا ہے، حتی کہ اگر اس کا یہ سفر سیر و سیاحت کے لیے ہی ہو، امام شافعیہ رحمہ اللہ کے نزدیک ابن سبیل کی دو قسمیں ہیں:

① جو کسی جگہ مقیم ہے اور وہاں سے سفر شروع کرتا ہے، چاہے وہ اس کا وطن ہی ہو۔

② اجنبی ہے اور کسی علاقہ سے گزر رہا ہے، تو یہ دونوں اس کے حقدار ہیں، اگرچہ قرض ملنے کا امکان بھی ہو اور چاہے وہ اپنے شہر میں مالدار ہی ہو۔

امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں مستحقِ زکاۃ ابن سبیل صرف وہ جو دورانِ سفر کسی جگہ پر ہے، نہ کہ وہ جو سفر شروع کرنا چاہتا ہے، نیز اگر کوئی اسے قرض دینے والا مل سکتا ہے، تب اس کا استحقاق نہیں، اگر اپنے شہر میں اس کے پاس مال ہے، اگر کوئی قرض دینے والا نہیں ملتا یا اپنے وطن میں صاحبِ مال نہیں تب زکاۃ دی جا سکتی ہے۔

کیا ہر زکاۃ دینے والا ان سب مصارف میں بقدرِ حصہ دے یا کسی ایک میں ساری زکاۃ دے سکتا ہے؟

آیت میں مذکور آٹھوں اصناف یعنی فقراء، مساکین، زکاۃ کی وصولی پر مامور سرکاری کارندے (یہ تب اگر سرکار کی طرف سے ان کی تنخواہیں مقرر نہیں) مؤلفۃ القلوب، غلام ولونڈی، غارمین، ابن سبیل اور فی سبیل اللہ! تو علماء کے ہاں اختلافِ آراء ہے کہ زکاۃ ان سب پر تقسیم کرے یا چاہے تو کسی ایک مصرف میں ساری زکاۃ دے دے؟ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک اگر زکاۃ کا مالک یا اس کا وکیل خود زکاۃ جمع کرا رہا ہے یا تقسیم کر رہا ہے تو اب عمال کا مصرف ساقط ہوا اب دیگر سات مصارف میں زکاۃ خرچ کرنا واجب ہوا اگر وہ معاشرے میں موجود ہیں، وگرنہ جو موجود ہیں، انہیں دی جائے اور کسی موجود صنف کو ترک کرنا جائز نہیں، اگر ترک کیا تو اس کے ذمہ اس صنف کی زکاۃ باقی رہے گی، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں اگر زکاۃ کا مال کثیر ہے، جسے ان سب مصارف میں تقسیم کرنا ممکن ہے، تب تو کرے اور اگر قلیل ہے تو کافی ہے کہ کسی ایک (یا دو) صنف میں

خرچ کر دے، امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ تلاش و جستجو کر کے ان میں سے زیادہ محتاج کا پتہ چلائے اور اَولیٰ فاَولیٰ کی ترتیب سے دے، اگر کسی برس ملحوظ کرے کہ عام فقر و فاقہ ہے (مہنگائی بہت ہے) تو فقراء کو ترجیح دے، اگر کسی سال مسافروں کی بہتات پائے، تو انہیں مقدم رکھے، احناف اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک اسے کامل اختیار ہے کہ ان اصناف میں سے جس صنف میں چاہے خرچ کرے، یہی سیدنا حذیفہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی حسن بصری اور عطاء بن ابورباح رحمہما اللہ کا قول ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مزید کہا کہ ان اصناف میں سے کسی صنف کے ایک شخص کو بھی ساری زکاۃ دے سکتا ہے۔

اس اختلافِ رائے کا سبب اور اس کا ثمرہ

امام ابن رشد رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس اختلاف کی وجہ لفظ کا معنی کے لیے معارضہ ہے، تو لفظ ان سب کے درمیان تقسیمِ زکاۃ کو مقتضی ہے، جبکہ معنوی اقتضاء یہ ہے کہ اہلِ حاجت کو ترجیح دے، کیونکہ اصل مقصود تو سدِ حاجت ہے، ان کے نزدیک آیت میں سب اصناف کا شمار تمیزِ جنس کے لیے ہے، یعنی یہ توضیح کہ زکاۃ کے مستحقین کون کون ہیں کہ اس غرض سے کہ ہر کوئی اپنی زکاۃ کے مال میں ان سب کو شریک کرے، تو لفظ کی جہت سے اول اور معنوی جہت سے ثانی اظہر ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے لیے حجت ابوداود کی صُدائی سے روایت کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اسے زکاۃ کے مال سے کچھ عطا ہو، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے صدقات کے بارے نبی یا اس کے غیر کو مرضی کرنے کا اختیار نہیں دیا، بلکہ خود اس نے آٹھ اصناف مقرر کی ہیں: اگر تم ان میں سے ہو تو تمہیں بھی دے دیتا ہوں۔''[1]

جمہور کی رائے کی شافعی کے قول پر ترجیح

مصنف الروضۃ الندیۃ لکھتے ہیں: ساری زکاۃ کسی ایک صنف کو دے دینا ہی تحقیقِ کلام کے لائق ہے، خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کو ان آٹھ اصناف کے ساتھ مختص کیا ہے، ان کے غیر کے لیے یہ جائز نہیں، اس کا ان کے ساتھ اختصاص اس امر کو مستلزم نہیں کہ یہ ان سب پر برابر تقسیم ہو اور نہ یہ کہ زکاۃ قلیل ہو یا کثیر لازمی طور پر ان آٹھوں اصناف میں تقسیم ہو بلکہ مراد و مفہوم یہ ہے کہ جنسِ زکاۃ ان اصناف کی جنس کے لیے ہے، تو جس پر کوئی نوعِ زکاۃ واجب ہوئی اور ان اصناف کی جنس میں نکال دی، تو اس نے اللہ کے حکم پر عمل کر لیا اور اس سے یہ فریضہ ادا ہوا، اگر کہا جائے واجب یہ تھا کہ زکاۃ کو ان آٹھ پر تقسیم کرے، اگر سب موجود ہوں تو یہ اس میں حاصل مشقت و حرج کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مجموعی تعامل کے بھی مخالف ہے، اگر یہ لازم کہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دفعہ سیدنا سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ کو ساری زکاۃ دے دینا اس کے برخلاف عمل ہے۔ (بقول محشی ان پر ایک کفارہ عائد ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ یہ بنی زریق کی زکاۃ کی وصولی پر مامور صاحب سے وصول کریں اور اپنا کفارہ ادا کر دیں) کہیں کوئی ایسی چیز وارد نہیں جو زکاۃ کو بیک وقت آٹھوں اصناف پر تقسیم کرنا ضروری کرتی ہو، اس ضمن میں حدیثِ معاذ بھی حجت کے لیے ٹھیک نہیں، جس میں انہیں حکم ملا تھا کہ اغنیاء سے زکاۃ لے کر ان (اہلِ یمن) کے فقراء کو

---

[1] ضعیف، سنن ابی داود: ١٦٣٠.

دے دیں، کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کی ایک جماعت کی زکاۃ تھی اور جنسِ اصناف میں صرف کی گئی، اسی طرح زیاد بن حارث صدائی کی حدیث پھر مذکورہ بالانقل کی پھر لکھا کیونکہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن زیاد افریقی ہیں اور کئی ایک نے ان میں کلام کی ہے، بالفرض اگر اس کا حجت کے لیے ٹھیک ہونا مان بھی لیں، تو زکاۃ کے اجزا کرنے سے مراد اس کے مصارف کا تجزیہ ہے (صدائی کی روایت کے الفاظ: فَجَزَّأَهَا ثَمَانِيَةَ أَجْزَاءٍ کی طرف اشارہ ہے) جیسا کہ یہی آیت کا ظاہر ہے، اگر مراد خود زکاۃ کا آٹھ اجزا میں حصے بخرے کرنا ہوتا اور یہ کہ ہر جزو کی زکاۃ کسی اور جزو میں صرف کرنا جائز نہ ہو تو کسی معدوم جزو کی زکاۃ بھی کسی اور جزو کو دے دینا صحیح نہ ہو اور یہ اہلِ اسلام کے اجماع کے برخلاف ہے۔

نیز اگر یہ تسلیم کرلیں تو یہ دراصل اس مجموعی زکاۃ کے اعتبار سے ہے جو حاکم کے پاس جمع ہو نہ کہ ہر فرد کی زکاۃ کے اعتبار سے، لہٰذا کوئی ایسی چیز نہیں جو تقسیط (آٹھ اجزا بنانے) کے وجوب پر دال ہو، بلکہ جائز ہے کہ کوئی اپنی زکاۃ کسی ایک صنف کو اور دوسرا کسی اور صنف کو دے دے ہاں اگر کسی علاقہ کی زکاۃ حاکم کے پاس جمع ہوتی ہے اور یہ آٹھوں اصناف بھی ادھر موجود ہیں تو ہر ایک کو اس میں سے دینا واجب ہوگا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان آٹھوں پر برابر کے لحاظ سے تقسیم کی جائے بلکہ (حسبِ ضرورت) کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دے سکتا ہے، یہ بھی اسے اختیار ہے کہ کسی صنف کو کلیۃً محروم رکھے جب اس میں کوئی مصلحت دیکھے، مثلاً اس کے پاس زکاۃ کا مال جمع ہوا ادھر جہاد آن حاضر ہوا تو اب زیادہ ضروری اور مناسب یہ ہوگا کہ سارا مالِ زکاۃ جہاد کی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے، اگر ضرورت پڑے، اس طرح اگر کسی وقت کسی اور صنف کو ساری زکاۃ دینے میں مصلحت ہو تو ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

زکاۃ کن پر حرام ہے؟

یہ درج ذیل ہیں

① کافر اور ملحد

یہ جن کے کفر و الحاد پر فقہاء بیک آواز ہوئے، چنانچہ حدیث میں ہے: «تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ» تو ھم ضمیر کا مرجع مسلمان ہیں نہ کہ غیر مسلم، بقول امام ابنِ منذر رحمہ اللہ اہلِ علم جن سے ہم نے نقل کیا، کا اجماع ہے کہ ذمی کو زکاۃ کے مال سے کچھ نہ دیا جائے، لیکن مؤلفۃ القلوب اس سے مستثنیٰ ہیں، جیسا کہ گزرا، ہاں، انہیں نفلی صدقات دیے جا سکتے ہیں، قرآن میں ہے: ﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا﴾ (الدھر: ۸) ''اور باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہے، فقیروں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔'' حدیث میں ہے: «صَلِي أُمَّكِ» ''اپنی والدہ سے صلہ رحمی کے تقاضے پورے کرو۔'' حالانکہ وہ مشرک تھی۔[1]

---

[1] صحيح البخاري: ٢٦٢٠؛ صحيح مسلم: ١٠٣/ ٥٠.

② بنی ہاشم

ان سے مراد آلِ علی، آلِ عقیل، آلِ جعفر، آلِ عباس اور آلِ حارث ہیں (عقیل اور جعفر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے، عقیل حالتِ کفر میں فوت ہوئے ان کے بیٹے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ تھے، جنہیں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے آگے کوفہ بھیجا تھا) امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم اس بابت کسی اختلاف کو نہیں جانتے کہ آل ہاشم کے لیے فرض زکاۃ جائز نہیں اور مسلم کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مذکور ہے: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا يَنْبَغِيْ لِآلِ مُحَمَّدٍ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ» ''آل محمد کے لیے زکاۃ حلال نہیں کہ یہ لوگوں کی میل ہیں۔''[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے زکاۃ کی کھجوروں میں ایک کھجور منہ میں ڈال لی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکالی اور کہا: ''کیا جانتے نہیں یہ زکاۃ کی ہیں؟''[2] متفق علیہ۔ علماء نے بنی مطلب کے بارے باہم اختلاف کیا تو امام شافعی رحمہ اللہ ان کے لیے بھی زکاۃ کے عدم حلال کے قائل ہیں، کیونکہ شافعی، احمد اور بخاری نے سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہتے ہیں: خیبر کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ذوی القربی) والا حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب میں تقسیم کیا اور بنی نوفل اور بنی عبدِ شمس کو اس سے محروم کیا، تو میں اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! ہم بنی ہاشم کے فضل کے منکر نہیں، اس وجہ سے جو اللہ نے آپ کو ان میں سے مبعوث کیا، لیکن ہمارے (قرابتی) بھائیوں بنی مطلب کی کیا خصوصیت ہے کہ انہیں بھی آپ نے یہ حصہ عطا کیا، جبکہ ہمیں اس سے محروم رکھا ہے حالانکہ ہماری قرابت داری یکساں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم (بنی ہاشم) اور بنی مطلب نہ جاہلیت میں باہم الگ ہوئے اور نہ اسلام میں، ہم اور وہ ایک ہی چیز ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈالا۔''[3]

امام ابن حزم رحمہ اللہ کے بقول تو ثابت ہوا کہ اصلا ہی کسی چیز میں ان کے مابین فرق نہ کیا جائے گا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق دونوں ایک چیز ہیں اور انہیں آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا درست ہے اور اگر وہ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، تو زکاۃ ان پر حرام ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ بنی مطلب زکاۃ پر استحقاق رکھتے ہیں (ان کے محتاجین) امام احمد رحمہ اللہ سے یہ دونوں اقوال منقول ہیں اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی ہاشم پر زکاۃ لینا حرام قرار دیا، اسی طرح ان کے موالی پر بھی (ان کے آزاد کردہ غلام) سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں، راوی ہیں کہ آپ نے بنی مخزوم کے ایک شخص کو زکاۃ کی وصولی کے لیے بھیجا تو انہوں نے ان سے کہا: میرے ساتھ چلو تا کہ تمہیں بھی استفادہ ہو، وہ بولے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بابت پوچھ لوں، کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، تو آپ نے فرمایا: ''زکاۃ ہمارے لیے حلال نہیں اور کسی (قوم وقبیلہ) کے موالی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔''[4] اسے احمد، ابو داود، اور ترمذی نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن صحیح ہے، علماء کا نفلی صدقات کی بابت اختلاف ہے کہ آیا یہ ان کے لیے حلال ہیں یا حرام؟ امام شوکانی رحمہ اللہ اس میں موجود آراء کی تلخیص

---

[1] صحيح مسلم: ١٠٧٢. [2] صحيح البخاري: ١٤٩١؛ صحيح مسلم: ١٠٦٩. [3] صحيح البخاري: ٣٥٠٢؛ مسند أحمد: ٤/ ٨٥. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١٦٥٠؛ سنن ترمذي: ٦٥٧.

کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جان لو کہ آپ کے قول: «لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ» ''ہمارے لیے صدقہ (زکاۃ) حلال نہیں۔'' کا ظاہر فرض و نفل دونوں کی ان کے لیے عدم حلت پر دال ہے، ایک جماعت نے جن میں امام خطابی رحمہ اللہ بھی ہیں نفلی کے بھی حرام ہونے پر اجماع نقل کیا، تعاقب کیا گیا کہ کئی ایک نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نفلی صدقے کے بارے جواز نقل کیا ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس بابت جو ان سے نقل کیا گیا اس میں اس کی واضح دلالت نہیں ہے، جہاں تک آلِ نبی تو اکثر حنفیہ نے کہا اور شوافع سے بھی یہی صحیحاً منقول ہے، اسی طرح حنابلہ سے کہ نفلی صدقات ان کے لیے حلال ہیں، فرض نہیں، کہتے ہیں کیونکہ ان پر حرام جو ہیں وہ لوگوں کی اوساخ ہیں اور یہ زکاۃ ہوئی نہ کہ نفلی صدقات، البحر میں لکھا ہے کہ نفلی صدقہ کا استثنا ہبہ، ہدیہ اور وقف پر قیاس نے کیا ہے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک نفلی صدقہ بھی ان پر حرام ہے، فرض کی طرح کیونکہ دلیل نے دونوں کا فرق نہیں کیا (گویا جمہور کے نزدیک نفلی صدقہ آل رسول کے لیے حرام نہیں)۔

③، ④ آباء اور ابناء

فقہاء متفق ہیں کہ آباء، اجداد، اسی طرح ماؤں، دادیوں، بیٹوں، پوتوں، بیٹیوں اور ان کی اولاد کو زکاۃ دینا جائز نہیں، کیونکہ بیٹے پر (ویسے ہی) واجب ہے کہ اپنے آباء او پر تک پر خرچ کرے اسی طرح اپنی اولاد نیچے تک پر خرچ کرے اگر وہ فقراء ہوں تو اس کے مال میں ان کا بھی حق ہے تو اگر انہیں زکاۃ دی تو گویا اپنے نفس کے لیے جلبِ نفع کیا، ان پر واجب خرچ کا اسقاط کرنے کے ساتھ، امام مالک نے دادا، دادی اور پوتوں کا استثنا کیا اور انہیں زکاۃ دینا جائز قرار دیا، کیونکہ ان کا خرچہ اس کے ذمہ نہیں (بقول محشی ابن تیمیہ کے خیال میں والدین کو زکاۃ دینا جائز ہے اگر ان کا خرچہ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا اور وہ محتاج ہیں) یہ اس حالت میں کہ وہ فقراء ہوں، لیکن اگر وہ اغنیا ہیں اور رضا کارانہ اللہ کی راہ میں جہاد پر نکلے ہیں تب (فی سبیل اللّٰہ) کی مد میں انہیں زکاۃ دی جا سکتی ہے، جیسے (بوقتِ ضرورت) غارمین کی مد میں بھی، کیونکہ ان کے قرضوں کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں ہے، اسی طرح عاملین کی مد میں سے دی جا سکتی ہے، اگر وہ اس صفت کے حامل ہوں۔

⑤ بیوی

امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اجماع ہے کہ کوئی اپنی بیوی کو زکاۃ نہیں دے سکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا نان ونفقہ اس کی ذمہ داری ہے، لہٰذا والدین کی مانند وہ بھی اس کی زکاۃ سے مستغنیٰ ہے، اِلّا یہ کہ بیوی مقروض ہو، تب غارمین کی مد سے اسے زکاۃ دی جا سکتی ہے، تا کہ قرض کی ادائیگی کرے۔

⑥ زکاۃ کو عام تقرُّبِ الٰہی میں صرف کرنا

زکاۃ کا ان قربات میں صرف کرنا جائز نہیں، جن کے ساتھ اللہ کا تقرُّب مقصود ہو، ماسوائے ان مصارف کے جن کا ذکر آیات میں ہوا، لہٰذا مساجد اور پلوں کی تعمیر، راستوں کی مرمت، مہمانوں کی ضیافت، مُردوں کی تجہیز و تکفین اور اس طرح کے

امور میں زکاۃ صرف نہیں کی جاسکتی، ابوداود کہتے ہیں: میں نے سنا کہ احمد سے سوال ہوا کیا مردوں کی تکفین زکاۃ سے کی جاسکتی ہے؟ کہا: نہیں اور نہ میت کا قرضہ اس سے چکایا جائے، البتہ زندہ کا قرضہ زکاۃ سے چکایا جانا جائز ہے، اس کی وجہ یہ کہ میت غارم نہ ہوگی، کہا گیا کہ وہ تو اس کے اہل کو دیا جاتا ہے، کہا: اگر اس کے اہل پر ہے تب ٹھیک ہے۔

زکاۃ کی تقسیم کون کرے؟

نبی کریم ﷺ زکاۃ کی وصولی کے لیے اپنے کارندے مقرر فرماتے تھے اور اسے (بذاتِ خود) مستحقین میں تقسیم کرتے تھے، سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی یہی کرتے رہے، اس ضمن میں اموالِ ظاہرہ (فصلیں، پھل، مویشی اور معدنیات) اور اموالِ باطنہ (سامانِ تجارت اور سونا چاندی اور دفینے) کے مابین فرق نہیں، جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، تو شروع میں یہی طریقہ کار جاری رکھا، لیکن جب ملحوظ کیا کہ اموالِ باطنہ کی کثرت ہے اور محسوس کیا کہ ان کے تتبع وجستجو کرنے میں امت پر حرج اور اربابِ اموال کے لیے ضرر ہے، تو اجازت دی کہ اصحابِ اموال خود ہی اپنے اموال (باطنہ) کی زکاۃ دے لیا کریں، فقہاء متفق ہیں کہ اموالِ باطنہ کی زکاۃ مالک خود ہی تقسیم کر لیا کریں، کیونکہ سائب بن یزید راوی ہیں کہ میں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے منبرِ رسول پر خطبہ دیتے ہوئے سنا، کہا: یہ تمہاری زکاۃ کا مہینہ ہے، تو تم میں سے جس پر قرض ہے، وہ پہلے اپنا قرض چکا لے تاکہ پتہ لگے کہ زکاۃ کے لیے کتنا مال بچا ہے،[1] اسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے بسند صحیح نقل کیا، امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس میں کوئی اختلاف نہیں اور ہمارے اصحاب (شوافع) نے اس پر اجماع کا دعوی کیا ہے۔

کیا اموالِ باطنہ کی زکاۃ حکومت کو جمع کرانا افضل ہے؟

تاکہ سرکاری سطح پر اسے تقسیم کیا جائے؟ یا خود ہی مستحقین میں تقسیم کر دینا، شافعیہ کے ہاں مختار یہ ہے کہ حکمران اگر خائن اور کرپٹ نہیں، تو انہیں جمع کرانا افضل ہے، حنابلہ کہتے ہیں: افضل یہ ہے کہ خود مالک تقسیم کرے، لیکن اگر سلطان کے پاس جمع کرادی تو جائز ہے، البتہ امام مالک رحمہ اللہ اور احناف کے نزدیک اموالِ ظاہرہ کے جمع وتقسیم کی حقدار انتظامیہ ہے، شوافع اور حنابلہ کا موقف اموالِ ظاہرہ بارے بھی وہ ہے جو باطنہ کے بارے ہے کہ حکمران چاہے عادل ہو یا ظالم، اس کے پاس زکاۃ جمع کرادینے سے مالک بری الذمہ ہو جائے گا، اگر حکمران مسلمان ہے تو چاہے عادل ہو یا جائر اس کے پاس زکاۃ جمع کرانے کی صورت میں مالک بری الذمہ ہو جائے گا، اِلّا یہ کہ وہ زکاۃ کے اموال کو شرعی مصارف میں تقسیم نہ کرتا ہو، تب افضل یہ ہے کہ مالک خود اسے تقسیم کرے، اِلّا یہ کہ حکمران یا زکاۃ کی وصولی پر مقرر سرکاری کارندہ اس کی طلب کرے۔

① سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ بنی تمیم کا ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: یارسول اللہ! جب میں زکاۃ آپ کی طرف سے مقرر کردہ کارندے کے پاس جمع کرادوں تو کیا میرا ذمہ اب ختم ہوا؟ فرمایا: ''ہاں! جب تم نے میرے قاصد کے پاس زکاۃ جمع کرادی تو تم بری الذمہ ہوئے اور تمہیں اجر مل گیا، اگر کسی نے غلط استعمال کیا تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا۔''[2] اسے احمد نے نقل کیا۔

---

[1] صحیح، السنن الکبری للبیھقی: ٤/ ١٤٨. [2] ضعیف، مسند أحمد: ١٢٣٩٤؛ بقول محشی یہ ضعیف ہے۔

② سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد اقرباء نوازی اور دوست پروری ہوگی اور ایسے امور ہوں گے، جنہیں تم منکر خیال کرو گے۔'' عرض کی گئی: تو آپ اس طرح کی صورتِ حال میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: ''تم اپنے ذمہ عائد حقوق کی ادائیگی کر دیا کرنا اور اللہ سے اپنے حقوق کا سوال کرنا۔''[1] متفق علیہ۔

③ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ اگر ہمارے حکام ہمارے حقوق نہ دیتے ہوں، لیکن ہم سے اپنے حقوق مانگتے ہوں تو؟ فرمایا: ''تم سننا اور اطاعت کرنا اور ان پر ان کے گناہوں کا بوجھ اور تم پر تمہارے گناہوں کا بوجھ ہوگا۔''[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔ بقول امام شوکانی رحمہ اللہ باب کی مذکورہ احادیث کے ساتھ جمہور نے استدلال کیا کہ غیر عادل حکمرانوں کے پاس زکاۃ جمع کرائی جاسکتی ہے اور ایسا کر کے مالک بری الذمہ ہوگا۔

یہ دار الاسلام کی نسبت، جہاں تک معاصر حکومتیں (یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی جب برصغیر کی طرح مصر بھی استعمار کے پنجہ میں گرفتار تھا) تو علامہ رشید رضا (مؤلف تفسیر المنار، انہوں نے کئی دفعہ ہند کا دورہ بھی کیا تھا، ندوہ کی ایک کانفرنس کی صدارت کی اور ان کی اس میں تقریر کا ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ نے کیا تھا، دار العلوم دیوبند بھی آئے تھے) نے لکھا دورِ حاضر کے اکثر مسلمان غیر اسلامی حکومتوں کے تحت رہ رہے ہیں، نہ تو اب دعوت وتبلیغ کا کام سرکاری سطح پر ہوتا ہے اور نہ اسلام کے دفاع یا عینی یا کفائی جہاد کا کوئی وجود ہے اور نہ اسلامی ادوار کی طرح زکاۃ کی وصولی اور شرعی مستحقین پر اس کی تقسیم کا اہتمام ہے، اکثر مسلمان انگریزوں کے محکوم اور بعض کے حکمران مرتد یا سیکولر اور بعض سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے افرنگی ممالک کے تحت اور باجگزار ہیں، انگریزوں نے انہیں مسلمان عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے لگا رکھا ہے کہ نام اسلام کا لیتے رہیں لیکن سیاست انگریزوں کی چلے، تو ان حکومتوں کے پاس زکاۃ جمع کرانا جائز نہیں، چاہے حکمران اپنے آپ کو امیر المسلمین وغیرہ ہی کہتا ہو اور ملک کا سرکاری مذہب اسلام کو قرار دیتا ہو، ہاں جہاں کہیں صحیح آزاد مسلمان حکمران موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی استعماری طاقتوں کے محکوم و ماتحت نہیں تو ظاہری اموال کی زکاۃ ان کے پاس جمع کرانا ضروری ہے، اسی طرح اموالِ باطنہ کی بھی اور نقدین (کرنسی) کی بھی اگر وہ اس کی طلب کریں، اگرچہ یہ حکمران اپنے احکام میں ظالم ہی ہوں، جیسا کہ فقہاء نے لکھا۔

زکاۃ صالح افراد کو دینے کا استحباب

زکاۃ کے مقررہ مستحقین کا مسلمان ہونا واجب ہے، چاہے وہ صالح ہوں یا فاسق، لیکن اگر معلوم ہو کہ اس مال کو حرام کاموں (شراب ونشہ وغیرہ) میں خرچ کرے گا، تب اسے نہ دی جائے، تاکہ سدِّ ذریعہ ہو، اگر یہ بات معلوم نہ ہو سکے تب دے دی جائے، مناسب یہ ہے کہ زکاۃ دینے والا اہلِ صلاح وعلم کو تلاش کرے اور ان افراد کو جو واقعی گھر بار اور ذمہ داریوں والے ہیں اور معلوم ہے کہ انہی پر خرچ کریں گے، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن اور ایمان کی مثال اس بندھے ہوئے گھوڑے کی سی ہے، جو رسی کے طول تک (دائرہ میں) گھومتا پھرتا رہتا ہے، پھر اس کلے کے پاس

---

① صحيح البخاري: ٧٠٥٢، صحيح مسلم: ١٨٤٣. ② صحيح مسلم: ١٨٤٦؛ سنن ترمذي: ٢١٩٩.

واپس ہو جاتا ہے، جس کے ساتھ اس کی رسی بندھی ہے، تو اسی طرح جس کے دل میں ایمان ہے، وہ کبھی غفلت وسہو کا شکار ہو جاتا ہے، مگر جلد (توبہ کر لیتا اور) ایمان کے کلے کے پاس واپس آ جاتا ہے، تو اے لوگو! متقی لوگوں کو کھانے کھلایا کرو اور خیرات وصدقات اپنے معروف اہلِ ایمان کو دیا کرو۔''[1] اسے احمد نے جید سند سے نقل کیا، بقول سیوطی یہ حسن ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: بے نماز فقراء کو کچھ نہ دیا جائے، حتی کہ توبہ کر لیں اور نماز باقاعدگی سے ادا کرنا شروع کر دیں اور یہ ضروری ہے کیونکہ ترکِ نماز کبیرہ گناہ ہے، تو اس کے مرتکب کے ساتھ تعاون کرنا جائز نہیں حتی کہ اپنی روش چھوڑ دے، تارکِ نماز سے عابث (فاجر وفاسق اور لہو ولعب میں پڑے ہوئے) لوگ اور وہ بھی ملحق ہیں جو برے کاموں سے باز نہیں آتے اور گمراہی کو چھوڑنے پر تیار نہیں، جن کے ضمیر خراب ہو چکے اور فطرت کو زنگ لگ چکا ہے اور ان کا حاسہ خیر معطل ہو چکا ہے، تو ایسے لوگوں کو زکاۃ نہ دی جائے، اِلَّا یہ کہ زکاۃ دینے سے امید ہو کہ وہ راست پر آ جائیں گے اور اپنے آپ کی اصلاح کر لیں گے اور ان کا جذبہ خیر بیدار ہو جائے گا اور دینی حمیت جاگ اٹھے گی۔

زکاۃ دینے والے کو اپنی زکاۃ خریدنے سے نہی

نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ زکاۃ دینے والا اپنی زکاۃ (کی چیز) خریدے تاکہ جس چیز کو اللہ کی رضا کے لیے اپنے سے جدا کیا تھا، اس کی طرف واپس نہ ہو، جیسے مہاجرین کو منع کیا تھا کہ دوبارہ مکہ آباد ہوں (یا وہاں زیادہ دیر قیام رکھیں) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کو اپنا گھوڑا بطورِ صدقہ دیا تاکہ اللہ کی راہ میں اسے استعمال کرے تو اسے بازار میں بکتا پایا تو چاہا کہ خرید لیں، لیکن پہلے نبی کریم ﷺ سے اس بابت سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: ''مت خریدو اور اپنی زکاۃ میں عود نہ کرو۔''[2] اسے شیخین، ابوداود اور نسائی نے نقل کیا، بقول نووی یہ نہی تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی تو کسی چیز کو صدقہ کرنے یا زکاۃ کے طور پر دینے والے کے لیے مکروہ ہے۔ اسی طرح نذر دی گئی چیز اور جو بھی بغرضِ تقرب دی جائے کہ جسے دی ہے اس سے خرید لے یا وہ اسے ہبۃً اسی کو واپس کر دے یا اپنے اختیار ومرضی سے اسے مالک بنا دے ہاں اگر اسے وراثت میں مل گئی تب کراہت نہیں (میرے خیال میں اسی طرح ہبۃً دی گئی بھی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سیدنا بریرہ رضی اللہ عنہا کے ہاں صدقہ کا گوشت بھیجا، تو انہوں نے اس میں سے کچھ پکا کر آپ کے ہاں بھیج دیا تو آپ نے تناول فرمایا اور کہا: یہ اس کے لیے صدقہ تھا لیکن ہمارے لیے ہبہ ہوا) ابن بطال رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اکثر علماء نے آدمی کا اپنا صدقہ خرید لینے کو اسی حدیثِ عمر کی رو سے مکروہ کہا ہے، بقول ابن منذر حسن، عکرمہ، ربیعہ اور اوزاعی نے اس کی رخصت دی، ابن حزم نے بھی اس رائے کو راجح کہا اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا، کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں مگر پانچ قسم کے افراد کے لیے: ① اللہ کی راہ میں جہاد پر نکلا ہوا ② زکاۃ کی وصولی پر مامور ③ غارم ④ وہ شخص جو زکاۃ کی چیز خرید لے (بظاہر اس میں اور منہی عنہ کے مابین فرق ہے تو یہاں یہ مراد ہونا محتمل ہے کہ کسی کی دی ہوئی زکاۃ نہ کہ اپنی دی ہوئی کو خریدے)

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ۳/ ۵۵. [2] صحیح البخاري: ۱۴۸۹؛ صحیح مسلم: ۱۶۲۱.

⑤ کسی مسکین کو صدقہ ملا تو اس نے وہ سب یا اس میں سے کچھ تحفۃً کسی مالدار شخص کو دے دیا۔''[1]

خاوند اور اقارب کو زکاۃ دینے کا استحباب

اگر بیوی کے پاس قابلِ زکاۃ مال ہے، تو وہ اپنے شوہر کو دے سکتی ہے، اگر وہ اس کا مستحق ہے کیونکہ بیوی تو شوہر کے نان و نفقہ کی ذمہ دار نہیں اور اس کا ثواب بنسبت دوسروں کو دینے کے زیادہ ہوگا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: یا نبی اللہ! آپ نے آج صدقہ کا حکم دیا ہے، میرے پاس زیورات ہیں، میں انہیں صدقہ کرنا چاہتی ہوں، تو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا زعم ہے کہ وہ اور ان کا بیٹا اس صدقے کے اوروں کی نسبت زیادہ حقدار ہیں؟ فرمایا: ''ابن مسعود نے ٹھیک کہا، وہ اور اس کا بیٹا تیرے اس صدقے کے زیادہ حقدار ہیں۔''[2] اسے بخاری نے نقل کیا اور یہی امام شافعی، امام ابن منذر، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہ اللہ اور اہلِ ظاہر کا مذہب ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا موقف ہے کہ ان کو زکاۃ دینا جائز نہیں، اس حدیثِ زینب کا جواب دیا کہ یہ نفلی صدقہ کے بارے وارد ہے نہ کہ فرض کے بارے، امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: اگر شوہر زکاۃ کا مال اسی پر خرچ کرے گا، تب جائز نہیں، لیکن اگر کسی اور مد میں خرچ کرے تب جائز ہے، جہاں تک دیگر اقارب مثلاً بھائی، بہنیں، چچے تائے، ماموں، پھوپھیاں اور خالائیں تو اکثر اہلِ علم کے مطابق انہیں زکاۃ دینا جائز ہے، اگر وہ مستحق ہوں، کیونکہ آپ کا فرمان ہے: ''مسکین پر صدقہ کا اجر اجرِ صدقہ ہے (ایک اجر) لیکن رشتہ دار پر صدقہ کرنے کے دو اجر ہیں: ایک صلہ رحمی کا اور دوسرا صدقہ کرنے کا اجر۔''[3] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا۔

طالب علموں کو زکاۃ دینا

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر کوئی کسبِ معاش پر قادر تو ہے، لیکن علومِ شرعیہ کی تحصیل میں مشغول ہے اور کسب کے لیے وقت نکالنا اس کے لیے ممکن نہیں تو اسے زکاۃ لینا حلال ہے، کیونکہ تحصیلِ علم فرضِ کفایہ ہے، لیکن جس سے تحصیلِ علم نہیں ہو رہی (فیل ہوتا رہتا ہے اور وقت ضائع کر رہا ہے) تو اس کے لیے زکاۃ حلال نہیں، کیونکہ وہ کسب پر قادر ہے، چاہے وہ مدرسہ ہی میں مقیم ہو اور یہ جو ہم نے ذکر کیا صحیح و مشہور ہے، کہتے ہیں: وہ شخص جو اس لیے کسبِ معاش نہیں کرتا کہ اسے نفلی عبادات کا شوق ہے اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، تو بالاتفاق اسے زکاۃ دینا حلال نہیں کیونکہ اس کی اس نفلی عبادت کا فائدہ صرف اسی پر مقصور ہے، بخلاف علم حاصل کرنے میں مشغول کے (کہ وہ اس سے لوگوں کو دین سکھلائے گا)۔

اپنی زکاۃ سے اپنا قرض چکانا

امام نووی رحمہ اللہ المجموع میں رقمطراز ہیں، اگر کسی تنگ دست کے ذمہ قرض ہے اور اس نے ارادہ کیا کہ اپنی زکاۃ کے مال

---

[1] صحیح لغیرہ، سنن أبی داود: ١٦٣٥. [2] صحیح البخاری: ١٤٦٢. [3] صحیح، سنن ترمذی: ٦٥٨؛ سنن ابن ماجہ: ١٨٤٤.

سے اس کی ادائیگی کرے، تو اس میں دو رائیں ہیں، اصح یہ کہ ایسا کرنا جائز نہیں اور یہ امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، کیونکہ زکاۃ اس کے ذمہ میں ہے، تو اسے کسی کے قبضہ میں دینے سے ہی وہ بری الذمہ ہوگا، دوسری رائے یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، یہ امام حسن بصری اور امام عطاء رحمہ اللہ کا قول ہے، کیونکہ اگر اسے ادا کر کے اس میں سے کچھ لے لیا، تو یہ جائز ہے تو اسی طرح یہ بھی اگر اس کے قبضہ میں نہ دیا، جیسے اگر کسی کے پاس امانت کے درہم ہوں اور انہیں وہ زکاۃ کے بطور دے دے تو یہ اس کے لیے جائز چاہے، قبضہ میں لے یا نہیں لیکن اگر اس شرط کے ساتھ زکاۃ دی کہ اسے وہ اس کا قرض باور کر کے اسے لوٹا دے تو یہ صحیح نہیں اور بالاتفاق زکاۃ ساقط نہ ہوگی اور بالاتفاق اس کے ساتھ قرض ادا کرنا صحیح نہ ہوگا، اگر دونوں کی نیت یہی ہو مگر (زبان سے) اسے مشترط نہ کیا ہو، تو بالاتفاق یہ جائز ہے اور اس کی زکاۃ ادا سمجھی جائے گی اور اگر زکاۃ وصول کر کے اس نے اپنا قرض سمجھ کر اسے واپس کیا تو وہ بری الذمہ ہوا۔

زکاۃ منتقل کرنا

فقہاء ایک شہر سے دوسرے شہر کے مستحقین کی طرف زکاۃ منتقل کرنے کے جواز پر متفق ہیں، اگر اس شہر کے لوگ اس سے مستغنی ہوں، احادیث میں تصریح ہے کہ ہر شہر والوں کی زکاۃ اسی شہر کے فقراء پر صرف کی جائے گی اور (وہاں فقراء موجود ہوتے ہوئے) کسی اور جگہ منتقل نہ کی جائے، کیونکہ زکاۃ سے مقصود ہر شہر کے فقراء کو اغنیاء بنانا ہے، تو اگر وہاں فقراء کی موجودگی کے باوجود اس کی دوسری جگہوں کو منتقلی جائز قرار دی جائے، تو اس کا نتیجہ اس شہر کے فقراء کے بدستور محتاج وفقیر رہنے کی صورت ملے گا، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی سابق الذکر حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت دی تھی کہ انہیں بتلانا ان کے ذمہ زکاۃ ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر انہی کے فقراء پر تقسیم کی جائے گی، سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہمارے پاس زکاۃ اکھٹی کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کارندے آئے، تو ہمارے مالداروں سے زکاۃ جمع کی اور ہمارے فقراء میں بانٹ دی، میں ایک یتیم لڑکا تھا تو مجھے بھی ایک جوان اونٹنی ملی۔[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا۔ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہیں ایک دور میں زکاۃ جمع کرنے پر مامور کیا گیا، واپس آئے تو امیرِ شہر نے کہا: مال کہاں ہے؟ کہنے لگے مال جمع کرنے مجھے بھیجا تھا؟ میں نے اسے وہیں خرچ کر دیا جہاں عہدِ نبوی میں خرچ کیا کرتے تھے۔[2] اسے ابو داود اور ابن ماجہ نے تخریج کیا، طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے خط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ جو کسی شہر سے نکل کر کسی اور شہر گیا، تو اس کی زکاۃ وعشر اس کے قبیلے کے شہر میں تقسیم کی جائے گی، اسے اثرم نے اپنی سنن میں نقل کیا۔

فقہاء نے ان احادیث کے ساتھ استدلال کیا کہ مشروع یہ ہے کہ ہر شہر کی زکاۃ اسی شہر کے فقراء پر تقسیم کی جائے، کسی اور شہر زکاۃ منتقل کرنے کے بارے اختلاف ہے، اس امر پر اجماع کے بعد کہ دور کے مستحقین تک اسے منتقل کرنا جائز ہے، اگر اس شہر کے باسی اس سے مستغنی ہوں (جیسا کہ گزرا) تو احناف کے نزدیک مکروہ ہے، لیکن اگر (اپنے شہر کے فقراء چھوڑ کر) کسی

---

[1] ضعیف، سنن ترمذی: ٦٤٩. [2] صحیح، سنن أبی داود: ١٦٢٥؛ سنن ابن ماجه: ١٨١١.

اور جگہ رہنے والے اپنے محتاج اقرباء کی طرف زکاۃ منتقل کی تو یہ جائز ہے، کیونکہ اس میں صلہ رحمی ہے یا دوسرے شہر کے لوگوں کو اس کے شہر کے لوگوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہو یا ایسا کرنے میں اہلِ اسلام کی زیادہ مصلحت ہو، یا دارالحرب سے منتقل کر کے دارالاسلام لائی جائے یا طالبانِ علم کی طرف (اگر اپنے شہر میں کوئی دینی مدرسہ موجود نہیں) یا وہ اگر معجّل زکاۃ ہے، سال پورا ہونے سے پہلے تو ان سب صورتوں میں زکاۃ کا منتقل کرنا مکروہ نہیں۔

امام شافعیہ رحمہ اللہ کے نزدیک زکاۃ منتقل کرنا جائز نہیں اور ضروری ہے کہ اسی شہر میں صرف کی جائے، جہاں سے اکٹھی کی گئی، اِلّا یہ کہ وہاں مستحقین نہ ملیں، عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اسی علاقہ میں قیام پذیر رہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھیجا تھا، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، پھر وہ عہدِ عمری میں واپس مدینہ آئے، تو انہوں نے دوبارہ اسی عہدہ پر لوٹا دیا وہاں سے انہوں نے زکاۃ کے اموال کا ایک تہائی بھیجا، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور انہیں کہا: میں نے تمہیں جابیاً (سرکار کے لیے مال جمع کرنے) نہیں بھیجا اور نہ جزیہ اکٹھا کرنے والا، لیکن اس لیے کہ مالداروں سے زکاۃ وصول کرو اور انہی کے فقراء کو لوٹا دو، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا جواب آیا کہ دراصل یہاں کوئی محتاج اب بچا نہیں اور یہ سامان بچ گیا تھا، اگلے برس زکاۃ کے اموال کا نصف بھیجا اور یہ سب بیان کیا، پھر تیسرے برس ساری زکاۃ مدینہ بھیج دی اور بتلایا کہ یہاں فقر و محتاجگی عنقا ہو چکی اور ایک شخص بھی نہیں ملا جو زکاۃ کا مستحق ہو۔[1] اسے ابوعبیدہ نے نقل کیا۔

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: زکاۃ منتقل کرنا جائز نہیں، اِلّا یہ کہ کسی اور علاقہ میں حاجت و ضرورت ہو، تب حاکم اجتہاد سے کام لیتے ہوئے زکاۃ ادھر منتقل کر سکتا ہے، حنابلہ کہتے ہیں کسی شہر کی زکاۃ اتنی دور منتقل کرنا جائز نہیں جہاں قصر نماز پڑھنی جائز ہو جائے، وہیں یا مسافتِ قصر سے پہلے پہلے قرب و جوار میں اسے تقسیم کرنا واجب ہے۔

بقول ابوداود امام احمد رحمہ اللہ سے میری موجودگی میں پوچھا گیا، کیا زکاۃ ایک سے دوسرے شہر منتقل کی جا سکتی ہے؟ کہا: نہیں، پوچھا: اگر وہاں رشتہ دار ہوں؟ کہا: پھر بھی نہیں لیکن اس شہر کے فقراء اگر مستغنی ہوں تب اس کا جواز ہے، ان کا ابوعبید کی سابق الذکر حدیث سے استدلال ہے، ابن قدامہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر کسی نے زکاۃ (اپنے شہر میں فقراء موجود ہوتے ہوئے) منتقل کر لی تو ادا ہو گئی۔

اکثر اہلِ علم کے قول میں اگر آدمی ایک شہر میں اور اس کا مال (اور کاروبار) دوسرے شہر میں ہے تو (تقسیمِ زکاۃ کے لحاظ سے) معتبر وہ شہر ہے، جہاں اس کا مال ہے کیونکہ وہی زکاۃ کے وجوب کا سبب ہے اور وہاں کے مستحقین کی اس پر نظریں ہیں، اگر بعض مال اس جگہ بھی ہے جہاں وہ رہائش پذیر ہے، تو ساری زکاۃ اسی جگہ تقسیم کرنے کا مجاز ہے، یہ مال کی زکاۃ میں جہاں تک فطرانہ تو یہ اسی جگہ تقسیم کیا جائے گا، جہاں اس پر واجب ہوا، چاہے اس کا مال و کاروبار ادھر ہو یا نہیں کیونکہ فطرانہ کا تعلق اس کے وجود کے ساتھ ہے اور وہ سببِ وجوب ہے نہ کہ مال۔

---

[1] كتاب الأموال لابى عبيد: ١٩١٠.

زکاۃ کے مصارف میں غلطی ہوجانا

اگر زکاۃ دینے والے سے خطا سرزد ہوگئی اور غیر مستحق کو زکاۃ تھما بیٹھا پھر اسے اپنی خطا کا پتہ لگا تو کیا اسے نئے سرے سے زکاۃ دینی پڑے گی؟ اس مسئلے میں فقہاء کی آراء باہم مختلف ہوئیں، چنانچہ امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام حسن اور امام ابوعبیدہ رحمہم اللہ کی رائے میں نئے سرے سے زکاۃ دینے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کا اس سے مطالبہ کیا جائے، معن بن یزید راوی ہیں کہ میرے والد نے صدقے کے کچھ دینار مسجد میں ایک شخص کے پاس رکھوائے (کہ وہ اسے کسی مستحق کو دے دے) وہ اس نے مجھے دے دے، انہیں جب پتہ چلا تو کہا: میں تمہیں تو نہ دینا چاہتا تھا اور معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے یزید! تمہیں نیت کا اجر مل گیا اور اے معن! تم نے جو لیا وہ اب تمہارا ہوا۔''[1] اسے امام احمد اور امام بخاری رحمہما اللہ نے نقل کیا، اس حدیث میں اگرچہ احتمال ہے کہ یہ نفلی صدقہ ہو لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ((لَكَ مَا نَوَيْتَ)) میں (ما) عموم کا افادہ دیتا ہے، ان کے لیے حجت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بھی ہے، کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی نے کہا: میں آج رات صدقہ کروں گا تو وہ نکلا اور اپنا صدقہ ایک چور کے ہاتھ میں رکھ دیا، صبح ہر طرف چرچا ہوا کہ رات ایک چور پر صدقہ کیا گیا، وہ سن کر بولا، اے اللہ! تیری حمد ہے (یہ تعجباً کہا) آج میں مزید صدقہ کروں گا، چنانچہ اس رات وہ نکلا اور ایک طوائف کے ہاتھ میں صدقہ رکھ دیا، صبح باتیں ہوئیں کہ شبِ گزشتہ ایک زانیہ پر صدقہ ہوا، پھر اگلی رات ایک غنی کے ہاتھ اپنا صدقہ تھما دیا اور صبح یہی باتیں ہوئیں تو اس نے کہا: اے میرے مالک! تیری حمد ہو، خواب میں کسی کہنے والے نے اس سے کہا: چور کے ہاتھ جو تمہارا صدقہ لگا تو شاید وہ چوری سے باز آجائے، اسی طرح طوائف شاید اپنا پیشہ ترک کردے اور رہا وہ مالدار تو شاید یہ اسے شرم دلانے کا باعث بنے تو وہ بھی اللہ کے دیے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگے۔[2] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے تخریج کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا تھا جس نے آپ سے صدقہ سے عطا کرنے کا سوال کیا: ''اگر تم ان مصارف میں سے ہو تب میں تمہیں تمہارا حق دوں گا۔''[3] ایک دفعہ آپ نے دو ہٹے کٹے آدمیوں کو زکاۃ سے کچھ عطا کیا اور فرمایا: ''چاہو تو لے لو، وگرنہ اس مال پر غنی کا اور کمانے پر قدرت رکھنے والے کا کوئی حق نہیں۔''[4] المغنی میں ہے، اگر غنی کی حقیقت کا اعتبار کیا جائے، تب ان کا یہ قول قابلِ اکتفاء نہیں، امام مالک، امام شافعی، امام ابویوسف، امام ثوری اور امام ابن منذر رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ غیر مستحق کو زکاۃ دینا جائز نہیں اگر اسے پتہ چل گیا کہ غلط شخص کو دے بیٹھا تو زکاۃ ابھی اس کے ذمہ باقی رہے گی اور ضروری ہے کہ مستحق کو دے تو اس کی مثال قرض کی سی ہے، امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی کو فقیر خیال کرتے ہوئے زکاۃ دے دی، پھر ظاہر ہوا کہ وہ تو غنی تھا، تو اس کے بارے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ادا ہوگئی اور دوم کہ نہیں ہوئی، اگر معلوم ہوا کہ جسے زکاۃ دی وہ غلام، کافر، ہاشمی یا زکاۃ دینے والے کا ایسا رشتہ دار تھا، جسے زکاۃ دینا جائز نہیں تب قولاً

---

[1] صحيح البخاري: ١٤٢٢؛ مسند أحمد: ٣/ ٤٧٠. [2] صحيح البخاري: ١٤٢١؛ صحيح مسلم: ١٠٢٢.
[3] ضعيف، سنن أبي داود: ١٦٣٠. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١٦٣٣.

واحداً اس کی زکاۃ ادا نہیں ہوئی، کیونکہ فقیر کی پہچان تو کئی دفعہ مشکل ہوسکتی ہے، ان مذکورین کی نہیں جیسے قرآن نے کہا: ﴿الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (البقرة: ۲۷۳) ''سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف انہیں مالدار سمجھتا ہے۔''

علانیہ زکاۃ وصدقہ دینا

جائز ہے کہ صدقہ کا اظہار کر کے اور علی الاعلان دے، چاہے فرض صدقہ ہو یا نفل لیکن ریا سے بچے (ریا کی غرض و نیت نہ ہو) لیکن اس کا اخفاء بہر حال افضل ہے اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرة: ۲۷۱)

''اگر تم خیرات ظاہراً دو تو وہ بھی خوب ہے، اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔''

احمد اور شیخین کے ہاں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات قسم کے افراد ہیں، جنہیں روزِ قیامت اللہ اپنے عرش کا سایہ نصیب کرے گا، جس دن اس کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا: ① عادل حکمران، ② ایسا نوجوان جس نے اپنی جوانی اللہ کی عبادت میں گزاری، ③ وہ آدمی جس کا دل مساجد میں لگا رہے، ④ وہ دو آدمی جو اللہ کی رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں اور اس پر ایک دوسرے سے ملیں اور جدا ہوں، ⑤ وہ شخص جس کے دائیں ہاتھ نے صدقہ کیا اور اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلا، (انتہائی پوشیدہ صدقہ کرتا ہے)، ⑥ وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے جس سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں ⑦ اور وہ شخص جس کو حسن و جمال اور منصب والی عورت برائی کی دعوت دے تو وہ کہہ دے میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔

فطرانہ

یہ وہ صدقہ جو رمضان کے اختتام پر واجب ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کے ہر فرد پر واجب ہے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، مذکر ہو یا مؤنث، آزاد ہو یا غلام، بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام، آزاد، مرد و عورت اور چھوٹے اور بڑے پر فطرانہ عائد کیا، کھجوروں یا جو (وغیرہ) کا ایک صاع۔[1]

فطرانے کی حکمت

اس کی مشروعیت سن دو ہجری کے ماہِ شعبان میں ہوئی تا کہ یہ روزہ دار کے لیے طہرہ (روزوں کی کمی کوتاہی کی تلافی کا ذریعہ) ہو، یعنی روزوں کے دوران میں جو لغو و رفث اس سے تقصیرات واقع ہوئیں، ان کی تلافی ہو اور تا کہ فقراء اور تنگ دست افراد کی معاونت ہو، ابوداود، ابن ماجہ اور دارقطنی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرانہ کو فرض

---

① صحيح البخاري: ۱۵۰۳؛ صحيح مسلم: ۹۸٤.

کیا تا کہ یہ روزہ دار کے لیے اس کے لغو و رفث کا طہرہ بنے اور تا کہ مساکین بھی عید کی خوشیاں منا سکیں تو جس نے اسے نمازِ عید سے قبل ادا کر لیا، تو یہ فطرانہ ہوا وگرنہ یہ عام صدقہ ہوا۔[1]

کن پر یہ واجب ہے؟

ہر آزاد مسلمان پر جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ایک رات و دن کی غذا سے زائد ایک صاع کی مقدار طعام کا مالک ہو (بقول محشی یہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور بقول شوکانی یہی حق ہے، احناف کے نزدیک جو نصاب کا مالک ہو) واجب ہے کہ اپنا اور جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے، کی طرف سے فطرانہ ادا کرے مثلاً بیوی، اولاد اور خدام اور ہر وہ جن کے معاملات اس کے ذمہ ہیں اور وہی ان کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہے۔

فطرانے کی مقدار

فطرانہ میں واجب ایک صاع ہے (بقول محشی ایک صاع چار مد کا ہوتا ہے اور ایک مد کی مقدار ایک درمیانہ قد و قامت کے آدمی کے دونوں کفوں میں آنے والی مقدار ہے) گندم، جو، کھجور، منقہ، پنیر، چاول، مکئی اور اس طرح کی اجناس جو انسانی غذا ہیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیمت (پیسوں) کی شکل میں بھی فطرانہ دینا جائز ہے، مزید کہا: اگر کوئی گندم سے فطرانہ نکالے تو اسے آدھا صاع دینا کافی ہے (کیونکہ گندم اس علاقہ کی اس دور میں اجنبی فصل تھی جو شام سے درآمد کی جاتی تھی) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ خدری راوی ہیں کہ ہم عہدِ نبوی میں ہر چھوٹے بڑے اور آزاد و غلام کی طرف سے منقہ کا ایک صاع بطورِ فطرانہ نکالا کرتے تھے، ہمیشہ یہی کرتے رہے حتی کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں حج یا عمرہ کے لیے آئے تو منبر پر اس کے بارے میں بات کی اور کہا: میرا خیال ہے کہ شام سے درآمد کی جانے والی گندم کے دو مد (نصف صاع) کھجوروں کے ایک صاع کے برابر ہے، تو لوگوں نے یہی اپنا معمول بنا لیا، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لیکن میں تو جب تک زندہ ہوں اسی مقدار میں فطرانہ دیتا رہوں گا جو عہدِ نبوی میں ادا کرتا رہا۔[2] اسے جماعت نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ بعض اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ ہر جنس سے ایک صاع نکالنا ہے اور یہی امام شافعی اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے، جبکہ بعض اہل علم نے کہا: سوائے گندم کے ہر چیز کا صاع ہے، تو اس کا نصف صاع جائز ہے اور یہ سفیان، ابن مبارک رحمہما اللہ اور اہلِ کوفہ کی رائے ہے۔

فطرانے کی ادائیگی کب واجب ہوگی؟

فقہاء متفق ہیں کہ یہ رمضان کے آخری ایام میں واجب ہوتا ہے، لیکن اس وقت کی تحدید میں اختلافِ آراء ہے، جب یہ فوری طور پہ واجب ہو تو امام ثوری، امام احمد، امام اسحاق، اور امام شافعی رحمہم اللہ کا جدید قول اور امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ

---

[1] صحيح، سنن أبى داود: ١٦٠٩؛ سنن ابن ماجه: ١٨٢٧. [2] صحيح البخاری: ١٥٠٨؛ صحيح مسلم: ٩٨٥؛ سنن ترمذی: ٦٧٣.

ہے کہ چاند رات سورج غروب ہونے سے اس کا وقت ہے، کیونکہ یہی وقت ہے جب رمضان کا اختتام ہوا، امام ابوحنیفہ، امام لیث، امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم قول اور امام مالک رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس کا وقتِ وجوب عید کے دن کی فجر کے طلوع کے بعد سے ہے، اس اختلاف کا نتیجہ اس نومولود میں ظاہر ہوگا جو روزِ عید فجر سے قبل اور غروبِ آفتاب کے بعد پیدا ہوا کہ آیا اس کی طرف سے فطرانہ نکالنا واجب ہے یا نہیں؟ تو اول قول پر اس پر واجب نہیں، کیونکہ وہ وقتِ وجوب کے بعد پیدا ہوا، ثانی پر واجب ہے کیونکہ وقتِ وجوب سے قبل پیدا ہوا۔

وقتِ وجوب سے قبل معجلاً اسے ادا کر دینا

جمہور فقہاء کے نزدیک عید سے ایک یا دو دن پیشتر ادا کرنا جائز ہے، بقول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگوں کے نمازِ عید کے لیے نکلنے سے پہلے پہلے فطرانہ نکال دیں۔[1] امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما عید سے ایک یا دو دن قبل ادا کر دیتے تھے، اس مدت سے زائد کے بارے اختلاف ہوا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ماہِ رمضان شروع ہونے سے پہلے بھی ادا کرنا جائز ہے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ رمضان کے شروع میں دینا جائز ہے، یہی امام مالک رحمہ اللہ نے کہا اور امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ ایک یا دو دن کی تقدیم جائز ہے، ائمہ متفق ہیں کہ وجوب سے تاخیر کی صورت میں فطرانہ ساقط نہ ہوگا، ایک قرض کی مانند اس کے ذمہ باقی رہے گا، حتی کہ ادا کر دے اگرچہ آخری عمر میں ہی جا کر، اس امر پر ان کا اتفاق ہے کہ عید کے دن سے اس کی تاخیر جائز نہیں، البتہ امام ابن سیرین اور امام نخعی رحمہما اللہ سے اس کا جواز منقول ہے، بقول امام احمد رحمہ اللہ مجھے امید ہے اس میں حرج نہ ہوگا، ابن رسلان نے کہا: بالاتفاق یہ حرام ہے، کیونکہ یہ زکاۃ ہے، لہٰذا اس کا مؤخر کرنا گناہ ہے، جیسے نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دینا اور پہلے حدیث گزری کہ جس نے نمازِ عید سے قبل اس کی ادائیگی کر دی تب تو فطرانہ ہوا بصورتِ دیگر ایک عام صدقہ۔

فطرانے کا مصرف

فطرانے کے مصارف وہی جو زکاۃ کے آٹھ مصارف ہیں اور زیادہ حقدار فقراء ہیں، کیونکہ حدیث میں ((طُعْمَةٌ لِلْمَسَاكِيْنَ))[2] کا لفظ گزرا ہے، بیہقی اور دارقطنی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃِ فطر فرض کی اور فرمایا: ''کم از کم آج کے دن انہیں (فقراء کو) بے نیاز کر دو۔''[3] بیہقی کی روایت میں ہے کہ آج کے دن چکر لگانے سے انہیں بچالو، زکاۃ منتقل کرنے کے بارے بحث میں اس جگہ کا ذکر گزرا جہاں اس کی ادائیگی کی جائے۔

ذمی کو فطرانہ دینا

امام زہری، امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام ابن شبرمہ رحمہم اللہ نے ذمی کو فطرانہ دینا جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] صحیح البخاری: ١٥١١؛ صحیح مسلم: ٩٨٤؛ سنن أبی داود: ١٦١٣. [2] حسن، سنن أبی داود: ١٦٠٩.
[3] ضعیف، سنن الدارقطنی: ٢/ ١٥٣.

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾(الممتحنة: ٨)

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔''

کیا زکاۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے؟

اسلام کی مال کی طرف نظر ایک نظرِ واقعی ہے(یعنی میدانی حقائق سے موافق) وہ اس کی نظر میں حیات کی اساس اورانفرادی اوراجتماعی نظام کا قوام ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (النساء: ٥) ''اورتم اپنے وہ مال نادان لوگوں کے سپرد نہ کرو جواللہ نے تمہارے لیے گزر بسر کا ذریعہ بناتے ہیں۔''

اور یہ مقتضی ہے کہ اس طرح سے اس کی تقسیم کی جائے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات ازقسم کھانا، لباس، رہائش اور وغیرہ میں اسے کفایت کرے، تاکہ اسلامی معاشرے میں کوئی فرد اس طرح نہ ہو کہ کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں، تقسیمِ مال کا سب سے افضل اوراشمل ذریعہ اورتاکہ خودانحصاری کا حصول ہو، زکاۃ کا نظام ہے، یہ تنگیِ حال کے وقت فقراء کا حدِ کفایت تک معیارِ زندگی بلند کرتی ہے اوراسے دنیا کی سختیوں سے اورحرمان کے دکھ سے بچاتی ہے، زکاۃ ایک احسان نہیں جو مالدار کسی فقیر پر کرتا ہے، بلکہ یہ ایک حق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مالدار کے ہاتھ میں بطورِ امانت رکھا ہے اوراسے محتاجوں تک پہنچانے کا وسیلہ بنایا ہے، اسی سے یہ حقیقتِ کبریٰ ظاہر ہوئی کہ مال صرف اغنیا پر وقف نہیں کہ ان کے غیر کا اس پر کوئی حق نہ ہو، بلکہ مال سب کے لیے ہے، یعنی مساویانہ طور پر اغنیاء اورفقراء کے لیے، مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی توضیح کرتا ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾(الحشر:٧)''تاکہ مال صرف مالداروں کے مابین ہی گردش نہ کرتا رہے۔'' بلکہ فقراء بھی مستفید ہوں، زکاۃ مال میں واجب حق ہے، جس سے فقراء کی دادرسی ہو اور وہ بھوک وننگ سے بچیں، خوف سے امن میں آئیں اور مطمئن زندگی نصیب ہو، اگرصرف زکاۃ کے اموال سے ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، تو مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی حقِ واجب ہے اور یہ کسی معین شرح کے ساتھ مقید نہیں، تو جس سے بھی انہیں کفایت ملے، مالدار رضا کارانہ طور پر اپنے مال سے اتنی مقدار دیں، جس سے معاشرے کی بھوک وننگ ختم ہو، امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قولہ تعالیٰ:﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ ''اور مال دے اس کی محبت (کو حاصل کرنے کے لیے)۔''(البقرۃ: ١٧٧) کے ساتھ ان حضرات نے استدلال کیا جو قائل ہیں کہ مال میں زکاۃ کے سوا بھی حق ہے اور نیکی کا کمال اسی کے ساتھ حاصل ہوگا، بعض نے کہا: اس سے مرادفرض زکاۃ ہے، لیکن اول قول اصح ہے، کیونکہ دارقطنی نے سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے نقل کیا، کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾الخ ''بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو

اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، (آسمانی) کتابوں پر، اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال سے محبت کے باوجود خرچ کرے۔“[1] اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے بھی نقل کیا اور کہا: اس کی سند میں ابوحمزہ میمون اعور ہے جو ضعیف قرار دیے گئے ہیں، بیان اور اسماعیل بن سالم نے شعبی سے یہ حدیث موقوفاً نقل کی ہے اور یہ اصح ہے، بقول مؤلف حدیث کی سند میں اگرچہ مقال ہے لیکن آیتِ ہذا کا مدلول اس کی معنوی صحت کی تائید کرتا ہے کیونکہ ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ (اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكَاةَ) سے قبل مذکور ہوا، لہٰذا یہ دلیل ہے کہ ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ ﴾ الخ سے مراد فرض زکاۃ نہیں کہ وگرنہ تو یہ تکرار ہوا۔ واللہ اعلم

تفسیر المنار میں آیت: ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ کی تفسیر میں لکھا کہ استاذ امام (الشیخ محمد عبدہ) کا کہنا ہے کہ اس سے مراد نفلی صدقات ہیں اور یہ بر (نیکی) کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور زکاۃ کی طرح ہی واجب ہے، جب حالات اس کے متقاضی ہوں اور اس میں کسی معین نصاب یا سال گزرنے کی بھی شرط نہیں، بلکہ حسبِ استطاعت وضرورت، اگر اس کے پاس صرف روٹی ہے اور کسی مضطر نے صدا لگائی اور اسے یا اس کے اہل وعیال اس کی ضرورت نہیں تو اسے دے دے، ان نفلی صدقات میں صرف مضطرین کا ہی حق نہیں، بلکہ اللہ نے مومن کو حکم دیا ہے کہ وہ غیرِ زکاۃ سے بھی اقارب کو دے اور یہ اس کی طرف سے نیکی اور صلہ رحمی کے سب سے بڑھ کر حقدار ہیں، انسان کی جبلت ہے کہ وہ غیروں کی نسبت اپنے اقارب کے فقر و فاقہ سے زیادہ الم محسوس کرتا ہے، کیونکہ ان کا اس سے ایک تعلقِ قرابت ہے اور ان کی مسکینی اس کی مسکینی اور ان کی عزت اس کی بھی عزت ہے، تو جو قطع رحمی کرے اور اس امر پر راضی ہو کہ وہ تو نعمتوں سے محظوظ ہو اور اس کے اقرباء زندگی کی تلخیوں کا شکار اور دکھی ہوں وہ دین اور فطرت سے دور اور خیر و برّ سے بعید ہے، جو جتنا قریبی ہوگا، اس کا حق اتنا ہی آکد ہوگا اور اس سے صلہ رحمی کرنا افضل ہے، اسی طرح حکم ہوا کہ ﴿ الْيَتٰمٰى ﴾ کو دے، کیونکہ ان کا کفیل فوت ہو چکا ہے، اب ان کی کفالت معاشرے کے مالداروں پر حقِ واجب ہے، تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائیں اور ان کی تربیت خراب نہ ہو پھر وہ اپنے لیے اور معاشرے کے لیے بھی ایک بوجھ اور مصیبت بن جائیں (چوری چکاری پر اتر آئیں)۔

نفلی صدقات کا اگلا مصرف ﴿ الْمَسٰكِيْنَ ﴾ ذکر ہوا، یہ وہ جن کا کسب ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہے اور وہ قلیل پر راضی ہو کر دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچ کر بیٹھے ہوئے ہیں، تو صاحبِ استطاعت کا فرض ہے کہ ان کی مواسات اور دادرسی کرے ﴿ ابْنَ السَّبِيْلِ ﴾ سے مراد جو گھربار اور اقرباء سے دور ہے اور اتنا مال پاس نہیں کہ ضروریات پوری ہوں، تو اس کا بھی حق ہے ﴿ وَالسَّآئِلِيْنَ ﴾ یہ وہ جنہیں کسی عارضی حاجت کی وجہ سے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش آئی، کبھی کوئی کسی اور کی مواسات کے لیے چندے کی اپیل کرتا ہے، شرعاً سوال کرنا حرام ہے مگر ضرورت کے تحت اس کا جواز ہے اور سائل پر واجب ہے کہ اسے اپنا پیشہ نہ بنالے ﴿ وَفِي الرِّقَابِ ﴾ گردنیں آزاد کرانے میں، یہ ارقاء (غلام ولونڈی) کو خرید کر آزاد کر دینے پر مشتمل ہے، اسی طرح مکاتبین (جن سے مالکوں کا معاہدہ ہوا کہ اتنے عرصے میں اتنی رقم ادا کر دیں تو وہ آزاد قرار پائیں گے) کی اقساط کی ادائیگی پر ان کی مدد کرنے کو بھی اور قیدیوں کے جرمانے اور فدیے ادا کرنا۔

---

[1] ضعیف، سنن الدارقطنی: ۲/ ۱۲۵.

اس نوع پر خرچ کرنے کو مسلمانوں کے اموال میں حقِ واجب قرار دینے میں شرع کی گردنیں چھڑانے میں رغبت پر دلیل ہے اور یہ اعتبار کرنے میں کہ انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے تا کہ وہ آزاد ہو، مگر احوالِ عارضہ میں جن کی مصلحتِ عامہ متقاضی ہے کہ قیدی غلام بنے، اسے ماسبق سے موخراً (اور علیحدہ) ذکر کیا ہے، کیونکہ ان اصناف میں حاجت کبھی زندگی کی حفاظت کے لیے جبکہ غلام کی آزادی کی طرف حاجت کمالِ حیات کے لیے ہوتی ہے، غیر مالِ زکاۃ سے ان اصناف پر خرچ کرنا کسی زمن اور معین نصاب کے ساتھ مقید نہیں اور نہ شرع نے اس غرض سے نکالے مال کی مقدار متعین کی ہے، جیسے زکاۃ کے ضمن میں کی، یہ تو حسنِ سلوک کرنے کا مطلق امر ہے جو معطی کی صوابدید اور استطاعت پر چھوڑا گیا، ہر انسانی جان قیمتی ہے اور اسے ہلاکت و ضیاع سے بچانا صاحبِ قدرت پر واجب ہے، افسوس لوگوں نے ان حقوقِ عامہ کے بارے غفلت سے کام لیا ہے جبکہ کتابِ عزیز نے اس کی نہایت رغبت دلائی ہے۔

جہاں تک ان لوگوں کو صدقات وخیرات دینا جنہوں نے سوال کو پیشہ بنا لیا ہوا ہے، تو امرِ واقع یہ ہے کہ تمام مذکورہ اصناف میں یہ سب سے کم استحقاق والے ہیں، کیونکہ یہ کمانے پر قادر ہیں، مگر تن آسانی اختیار کرتے ہوئے سوال کرنے کو پیشہ بنا لیا ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہر شہر کے مالداروں کا فرض ہے کہ وہ وہاں کے اہلِ فقر و احتیاج کا خیال رکھیں، اگر نہیں کرتے تو حاکم انہیں مجبور بھی کر سکتا ہے، اگر صرف زکاۃ سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اور نہ بیت المال سے، اس کی دلیل یہ آیت ہے پھر یہ مذکورہ آیت کا حوالہ دیا نیز کہا: ﴿وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ الخ (النساء:۳٦) ''اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور قرابت والے کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔'' تو یوں اللہ تعالیٰ نے ان ذکر کردہ لوگوں کا حق واجب کیا ہے، ایک جگہ فرمایا: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ﴾ (المدثر:۴۲-۴۴) ''کہ تم دوزخ میں کیوں جا پڑے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے۔'' تو اللہ نے مسکین کو کھانا کھلانے کو وجوبِ نماز کے ساتھ مقرون کیا۔

نبی کریم ﷺ سے صحیح طرق سے یہ فرمان مروی ہے کہ: ((مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللّٰهُ)) ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔''[1] جس کے پاس اس کی ضرورت سے زائد اور فاضل مال ہے اور ادھر اس کا کوئی مسلم بھائی بھوک و ننگ کا شکار ہے، مگر اس نے اس کی داد رسی نہ کی، تو بلا شبہ اس نے اس پر رحم نہ کیا، عثمان نہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبد الرحمن بن ابوبکر صدیق نے انہیں بیان کیا کہ اصحابِ صفہ محتاج و فقیر لوگ تھے اور نبی کریم ﷺ نے حکم دیا ہوا تھا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرا (ان میں سے) لے جایا کرے اور جس کے پاس چار کا ہو وہ پانچواں یا چھٹا بھی ان میں سے لے جایا کرے۔[2] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے تنہا چھوڑتا ہے۔''[3] تو جس نے کسی کو بھوکا ننگا چھوڑا جبکہ وہ اس کی داد رسی پر قادر تھا تو

---

① صحیح البخاری: ۷۳۷٦؛ صحیح مسلم: ۲۳۱۹. ② صحیح البخاری: ٦۰۲. ③ صحیح البخاری: ۲۴۴۲؛ صحیح مسلم: ۵۸۰.

(گویا) اس نے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس فاضل سواری یا طعام ہے، وہ ایسوں کی مدد کردے، جن کے پاس یہ نہیں۔'' کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس تناظر میں مختلف اصنافِ مال کا ذکر کرتے رہے، حتیٰ کہ ہمارا خیال ہوا کہ ہمارے فاضل مال پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ [1]

یہ صحابہ کرام کی عمومی روش ہے، جس کی بابت سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بتلایا، سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بھوکے کو کھانا کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور قیدی چھڑواؤ۔'' [2] اس بارے کتاب و سنت میں کثیر صحیح نصوص ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ نے مالداروں پر فرض کیا ہے کہ اپنے مال سے اتنی مقدار نکالیں، جس سے فقراء کی ضروریات پوری ہوں، اگر کہیں بھوک، ننگ اور مشقت ہے تو اس وجہ سے ہے کہ مالدار اپنا فرض ادا نہیں کر رہے، ایسوں کی نسبت اللہ پر حق ہے کہ روزِ قیامت ان کا محاسبہ کرے اور انہیں سزا دے (یہ کتاب کے شروع میں بطور مرفوع حدیث کے گزری ہے) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ کہا: مال میں زکاۃ کے سوا بھی حق ہے، سیدہ عائشہ، حسن بن علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم تینوں نے ایک سائل سے کہا تھا، اگر تم کسی ضرورت و احتیاج کی وجہ سے سوال کر رہے ہو، تو تمہارا ہم پر واجب حق ہے، سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور تین سو صحابہ سے صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ ایک سفر میں تھے کہ زادِ راہ ختم ہو گیا سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (جو امیرِ لشکر تھے) نے حکم دیا کہ ہر کوئی اپنے پاس موجود تمام طعام لائے تو اسے دو بوریوں میں جمع کیا اور مساویانہ طور پر ہر کسی کو روزانہ کی غذا دیتے رہے۔

تو یہ صحابہ کرام کی طرف سے اجماع کا انعقاد ہے اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، شعبی، مجاہد اور طاؤس رحمہم اللہ وغیر ہم سے منقول ہے کہ مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی حق ہے، یہ بھی کہا کہ اگر مالداروں کے پاس ان کی حاجت سے زائد طعام موجود ہے، تو کسی مسلمان یا ذمی کو حالتِ اضطرار تک پہنچنا ہی نہیں چاہیے کہ وہ مردار یا خنزیر کا گوشت کھائے (مالداروں کو چاہیے کہ وہ ایسی نوبت نہ آنے دیں) اگر وہ نہیں دیتے تو اس پر ان سے قتال بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر اس اثنا غریب آدمی قتل ہو جائے تو اس کے قاتل سے قصاص لیا جائے گا (یعنی ایسی صورتحال میں لڑ جھگڑ کر اپنا حق وصول کیا جا سکتا ہے) اور اگر مالدار اس کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس کا خون رائیگاں ہے اور وہ اللہ کی لعنت کا حقدار ہے، کیونکہ اس نے حق روکا ہوا تھا اور وہ باغی طائفہ میں شمار ہوگا، قرآن میں ہے:

﴿فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (الحجرات: ۹)

''اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے، تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔''

اور مانعِ حق اپنے بھائی کا باغی ہے، جس کا اس کے مال میں حق ہے، اسی لیے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکاۃ سے

---

[1] صحیح مسلم: ۱۷۲۸، سنن أبی داود: ۱٦٦۳. [2] صحیح البخاری: ۳۰٤٦؛ سنن أبی داود: ۳۱۰۵.

لڑائی کی تھی، مؤلف کہتے ہیں ہم نے اس مسئلے پر اس لیے تفصیل سے بات کی اور بکثرت کتاب وسنت کی نصوص ذکر کیں، تاکہ واضح کریں کہ اسلام رحمت وشفقت والا دین ہے اور وہ دورِ حاضر کے دیگر مذاہب سے انسانی دادرسی کے معاملہ میں بہت آگے ہے اور اس میں رفاہ وخیر کا پہلو بہت نمایاں ہے اور وہ اس کے سامنے ایسے ہیں، جیسے چمکتے ہوئے سورج کے مقابلے میں لڑکھڑاتی لو والی کوئی شمع۔

نفلی صدقات

اسلام نے مال خرچ کرنے کی دعوت دی اور ایسے اسلوب سے اس کی ترغیب دلائی جو دلوں کو کھینچ لیتا ہے اور نفس میں ایک اطمینان دوڑ جاتا ہے، اسلام انسان کے جذبۂ ترحم اور خیر سگالی کو بیدار کرتا ہے، تاکہ معاشرے کے اہلِ حاجت وفقر کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کرے، اس سلسلے میں درج ذیل آیات پیش کی جاتی ہیں:

① ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾(البقرة: ٢٦١)

''جولوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانے کی سی ہے، جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہتا ہے اور بھی زیادہ دیتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

② ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ۬ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾(آل عمران: ٩٢)

''جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم خرچ کرو گے، اللہ اس کو جانتا ہے۔''

③ ﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾(الحديد: ٧)

''اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) پر اس نے تمہیں دسترس دی، اس میں سے خرچ کرو، جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔''

اسی طرح درج ذیل احادیث ہیں:

① ''صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا اور برے طریقہ سے موت آنے کو ٹالتا ہے،''[1] اسے ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا۔

② ''صدقہ آدمی کی عمر میں اضافہ کرتا اور اس سے بری موت دور کرتا ہے اور اللہ اس سے کبر وفخر کو لے جاتا ہے۔''[2]

---

[1] ضعيف، سنن ترمذی: ٦٦٤؛ صحيح ابن حبان: ٣٣٠٩. [2] ضعيف جدًا، المعجم الكبير للطبرانی: ١٧/ ٢٢، ٢٣، مجمع الزوائد: ٣/ ١١٠.

③ ''ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں اور ان میں سے ایک دعا کرتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو خلف (بدل) عطا فرما اور دوسرا یہ بد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! نہ دینے والے کو تلف (بربادی اور تلفی) عطا فرما۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا۔

④ ''لوگوں کے ساتھ بھلائی کے کام کرنا برے انجام سے بچاتا ہے اور مخفی طور سے صدقہ کرنا، اللہ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر معروف (اچھا قول یا فعل) صدقہ ہے اور دنیا کے اہلِ معروف آخرت میں بھی اہلِ معروف ہوں گے اور دنیا میں اہلِ منکر وہاں بھی ایسے ہی ہوں گے اور جنت میں اولین داخل ہونے والے اہلِ معروف ہوں گے۔''[2] اسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا منذری نے اس پر سکوت کیا۔

صدقات کی انواع

صدقہ اعمالِ بر کے کسی معین فعل و عمل پر ہی مقصور نہیں، بلکہ عمومی قاعدہ یہ ہے کہ ہر بھلائی کا کام صدقہ ہے، اس ضمن میں بعض احادیث درج ذیل ہیں:

① نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔'' عرض کی گئی: اے اللہ کے نبی! جو گنجائش نہ پائے، فرمایا: ''کوئی کام کرے اور کچھ کما کر صدقہ کردے۔'' عرض کی: اگر یہ بھی نہ پائے؟ کہا: ''کسی طالبِ مدد ضرورتمند کی (کسی بھی ضمن میں) مدد کردے۔'' کہا گیا: اگر یہ بھی نہ پائے؟ تو فرمایا: ''بھلائی کے کام کرے اور شر سے رکا رہے تو یہی اس کے لیے صدقہ ہے۔''[3] اسے بخاری (مسلم اور نسائی) نے نقل کیا۔

② ایک حدیث میں ہے: ''روزانہ ہر نفس پر صدقہ کرنا لکھا گیا ہے تو اس میں سے یہ بھی کہ دو جھگڑا کرنے والوں کے مابین عدل کے ساتھ تصفیہ کرادے، کسی کا سامان اس کی سواری پر لادنے میں مدد دے دے، راستہ سے کوئی تکلیف والی چیز ہٹا دے تو یہ بھی صدقہ ہے، اسی طرح ہر اچھی بات منہ سے نکالنا اور نماز کے لیے اٹھایا گیا ہر قدم صدقہ ہے،[4] اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر ایک پر روزانہ اپنے نفس پر اپنی جانب سے صدقہ کرنا واجب ہے۔'' کہتے ہیں: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کہاں سے صدقہ کروں کہ ہمارے پاس تو اموال نہیں؟ فرمایا: ''صدقہ کے ابواب میں سے تکبیر، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، استغفر اللہ اور اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے منع کرنا، راستے سے کانٹا، ہڈی اور پتھر ہٹا دینا، اندھے کو راہ پر لگانا، گونگے بہرے کو بات سمجھا دینا اور انجان کو راستہ بتلا دینا، ضرورت مند کی مدد کرنا، یہ سب صدقہ کے ابواب ہیں حتی کہ تمہارا اپنی بیوی سے جماع کرنا بھی صدقہ ہے۔''[5] اسے احمد نے نقل کیا اور یہ الفاظ انہی کے ہیں، مسلم نے اسے بالمعنی نقل کیا، مسلم کے ہاں یہ اضافہ بھی ہے کہ صحابہ نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا: یا رسول اللہ!

---

[1] صحیح مسلم: ۱۰۱۰. [2] ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۰۸۲؛ مجمع الزوائد: ۳/ ۱۱۵؛ اس میں عبید اللہ بن ولید وصافی ہے جو ضعیف ہے۔ [3] صحیح البخاری: ۱۴۴۵؛ صحیح مسلم: ۱۰۰۸. [4] صحیح البخاری: ۲۸۹۱؛ صحیح مسلم: ۱۰۰۹. [5] صحیح مسلم: ۱۰۰۶؛ مسند أحمد: ۵/ ۱۶۸، ۱۶۹.

ہمارا کوئی تو اپنی شہوت پوری کرے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اسے اس کا اجر ملتا ہے؟ فرمایا: ''بتلاؤ اگر یہی کام وہ حرام طریقے سے کرے تو کیا گناہ گار نہ ہوگا؟ تو اسی طرح اگر حلال طریقے سے کیا تو ماجور ہوا۔''[1]

④ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ایک جان کے ذمہ روزانہ صدقہ کرنا واجب ہے، کہا گیا: یا رسول اللہ! ہم کہاں سے اموال لائیں کہ صدقہ کریں؟ فرمایا: ''خیر کے ابواب تو بہت ہیں: تسبیح، تحمید، تکبیر، لا الہ الا اللہ، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا، بہرے کو بات سمجھانا، نابینے کی راہ نمائی کرنا، ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا، مدد کے لیے پکارنے والے کے ساتھ جا کر اس کی حاجت پوری کرنا، کمزور کا سامان اٹھا کر اس کی مدد کرنا، سب تیری طرف سے صدقہ شمار ہوگا۔''[2] اسے ابن حبان نے اور بیہقی نے بھی مختصراً نقل کیا، ایک روایت میں ہے کہ خوش روئی سے مل لینا اور پتھر، کانٹا، ہڈی لوگوں کے راستے سے ہٹا دینا اور انجان کو راستہ بتلا دینا بھی صدقہ ہے۔''[3]

⑤ ایک حدیث میں ہے۔''جو آدھی کھجور کا صدقہ کر کے بھی آگ سے بچ سکے تو ضرور بچے جو یہ بھی نہ پائے وہ اچھی بات کے ساتھ اس سے اپنا بچاؤ کرے۔''[4] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

⑥ اور فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کہے گا: اے ابن آدم! میں بیمار ہوا، مگر تو میری عیادت کرنے نہ آیا؟ بندہ کہے گا یا اللہ! تو رب العالمین ہے، کیسے تیری عیادت کرتا؟ اللہ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر کہے گا: میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے نہ دیا؟ کہے گا: اے رب! تجھے کھانا دیتا؟ حالانکہ تو خود سب جہانوں کا رازق ہے، اللہ کہے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہ دیا، اگر اسے کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔'' پھر یہی بات پانی کی بابت ہوگی۔[5] اسے مسلم نے نقل کیا۔

⑦ اور فرمایا: ''مسلمان کوئی درخت نہیں لگاتا یا کوئی کھیتی کاشت نہیں کرتا تو اس سے کوئی انسان، جانور یا کوئی بھی کچھ بھی کھائے تو یہ اس کے لیے صدقہ ہوگا۔''[6] اسے بخاری نے نقل کیا۔

⑧ اور فرمایا: ''ہر معروف (بھلائی) صدقہ ہے اور یہ بھی معروف ہے کہ تو اپنے بھائی سے کشادہ روئی سے ملے اور اپنے ڈول سے کچھ (دودھ یا پانی) اس کے برتن میں ڈال دے۔''[7] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا۔

صدقہ کے زیادہ حقدار

متصدِق کی اپنی اولاد، اس کا اہل اور اس کے اقارب ہیں، اگر خود یا اہل وعیال اور اقارب میں محتاجی ہے تو اجنبی پر صدقہ کرنا جائز نہیں۔

---

① صحيح مسلم: ١٠٠٦؛ مسند أحمد: ٥/ ١٦٧. ② صحيح، صحيح ابن حبان: ٣٣٧٧. ③ صحيح، شعب الايمان للبيهقى: ٧٦١٨. ④ صحيح مسلم: ١٠١٦. ⑤ صحيح مسلم: ٢٥٦٩. ⑥ صحيح البخارى: ٦٠١٢؛ صحيح مسلم: ١٥٥٣. ⑦ سنن ترمذى: ١٩٧٠؛ مسند أحمد: ٣/ ٣٦٠.

① سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہارا کوئی فقیر ہے تو خرچ کرنے کا آغاز اپنے آپ سے کرے، اگر مزید مال ہے تب اہل وعیال پر خرچ کرے اگر اس کے بعد بھی مزید ہے تو اپنے اقارب پر، اگر اس کے بعد بھی ہے، تب یہاں اور وہاں۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

② ایک دفعہ آپ نے فرمایا: ''صدقہ کرو۔'' تو ایک شخص نے کہا: حضور میرے پاس ایک دینار ہے، فرمایا: ''اسے اپنی ذات پر صدقہ (خرچ) کرو۔'' اس نے کہا: ایک اور بھی ہے، فرمایا: ''اپنی بیوی پر اسے صدقہ کرو۔'' اس نے کہا: ایک اور ہے، فرمایا: ''اپنی اولاد پر صدقہ کرو۔'' بولا ایک اور ہے، فرمایا: ''اپنے خادم پر اسے صدقہ کرو۔'' کہا: ایک اور بھی ہے فرمایا: ''تب خود دیکھ لو کہ کون اس کا حقدار ہے۔''[2] اسے ابوداود، نسائی اور حاکم نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا۔

③ اور فرمایا: ''آدمی کو یہی گناہ لے ڈوبے گا کہ جن کی ذمہ داری اس پر ہے وہ ضائع ہو جائیں۔''[3] اسے مسلم ابوداود نے نقل کیا۔

④ اور فرمایا: ''افضل صدقہ وہ ہے جو دشمنی رکھنے والے رشتہ دار پر کیا جائے۔''[4] اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔

خود اپنا صدقہ خراب کرنا

صدقہ کرنے والے پر حرام ہے کہ جس پر صدقہ کیا ہے، اب اسے کوئی زحمت دے یا احسان جتلائے یا ریاکاری کا مظاہرہ کرے، قرآن میں ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ ﴾ (البقرة:٢٦٤)

''اے مومنو! اپنے صدقات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تین قسم کے آدمیوں سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بات تک نہ کرے گا اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت کرے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بولے: تب تو وہ خائب وخاسر ہوئے وہ کون ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا: «اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ» ''کپڑا لٹکانے والا، صدقہ کر کے احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنے والا۔''[5]

حرام مال کا صدقہ

حرام مال کا صدقہ بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت نہیں پاتا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ طیب ہے، صرف طیب کو ہی قبول کرتا ہے اور اللہ نے اہلِ ایمان کو وہی حکم دیا جو رسل کو دیا تھا چنانچہ کہا:

---

① صحيح، سنن أبي داود: ٣٩٥٧؛ سنن نسائي: ٥/ ٧٠. ② حسن، سنن أبي داود: ١٦٩١؛ صحيح ابن حبان: ٣٣٢٦. ③ صحيح مسلم: ٩٩٦؛ سنن أبي داود: ١٦٩٢. ④ صحيح، صحيح ابن خزيمة: ٢٣٨٦؛ مسند أحمد: ٢٣٥٣٠. ⑤ صحيح مسلم: ١٠٦؛ سنن أبي داود: ٤٠٨٧.

﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾(المؤمنون: ٥١)
''اے رسولو! پاکیزہ اور حلال اشیا کھاؤ اور نیک عمل کرو بے شک جو تم کرتے ہو میں خوب جانتا ہوں۔''

اور فرمایا:﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾(البقرۃ:١٧٢) ''اے ایمان والو! پاکیزہ اور حلال اشیا کھاؤ۔''

پھر فرمایا: ''کوئی پراگندہ حال شخص نہایت گڑ گڑا کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے یا رب یا رب کہے جبکہ حال یہ ہو کہ اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور پوری کمائی حرام کی ہو تو کیونکر اس کی دعا قبول ہو؟''[1] اسے مسلم نے نقل کیا، فرمایا: ''جس نے کھجور برابر بھی حلال کی کمائی سے صدقہ کیا اور اللہ صرف حلال کی کمائی کا صدقہ ہی قبول کرتا ہے، تو اللہ اس کے صدقے کو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ قبول کرتا ہے پھر متصدق کے لیے اسے پالتا ہے، جیسے تمہارا کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا پوستا ہے، حتی کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے۔''[2] اسے بخاری نے نقل کیا۔

بیوی کا اپنے شوہر کے مال سے صدقہ کرنا

یہ جائز ہے، اگر جانتی ہو کہ وہ ناراض نہ ہوگا، لیکن اگر نہیں جانتی تب حرام ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب کوئی بیوی گھر کے خرچ سے اس طرح صدقہ کرے کہ نظام خراب نہ ہو تو اسے صدقہ کرنے اور اس کے شوہر کو یہ کمانے اور خادم کو آگے پکڑانے کا اجر ملے گا اور اجر کی اس تقسیم کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ایک کے اجر میں کوئی نقص ہو۔''[3] اسے بخاری نے نقل کیا، سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ حجۃ الوداع میں فرماتے سنا: ''کوئی عورت گھر کے خرچ سے خاوند کی اجازت سے ہی صدقہ کرے۔'' کہا گیا: ''یا رسول اللہ کھانے سے بھی نہیں۔'' فرمایا: ''یہ تو ہمارے افضل اموال ہیں۔''[4] اسے ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، اس سے وہ معمولی مقدار مستثنیٰ ہے جو عرفاً دے دی جاتی ہے، تو اس میں اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ ایک درشت مزاج آدمی ہیں، مسکین آ کر صدا لگاتے ہیں تو کیا گھر کے طعام وغیرہ سے اس کی اذن کے بغیر صدقہ کر سکتی ہوں، فرمایا: ((ارْضَخِيْ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِي اللّٰهُ عَلَيْكِ)) ''تھوڑی مقدار میں دے سکتی ہو اور مال سینت سینت کر نہ رکھو کہ اللہ بھی پھر (ثواب دینے میں) یہی معاملہ کرے گا۔'' اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا۔[5]

تمام مال صدقہ کر دینا

قوی اور کمانے پر قادر مرد کے لیے اپنے تمام مال کو صدقہ کر دینا جائز ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ دینے کا حکم دیا اور اتفاق سے اس وقت میرے پاس کثیر مال تھا، میں نے کہا: آج موقع ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے

---

[1] صحيح مسلم: ١٠١٥؛ سنن ترمذي: ٢٩٨٩. [2] صحيح البخاري: ١٤١٠؛ صحيح مسلم: ١٠١٤.
[3] صحيح البخاري: ١٤٢٥؛ صحيح مسلم: ١٠٢٤. [4] حسن، سنن ترمذي: ٦٧٠. [5] صحيح البخاري: ١٤٣٤؛ صحيح مسلم: ١٠٢٩.

سبقت لے جاؤں، تو میں نصف مال لے کر آیا (یہ اس موقع کی بات ہے جب غزوہ تبوک کی تیاری کے لیے نبی کریم ﷺ نے چندے کی اپیل کی تھی) نبی کریم ﷺ نے استفسار کیا گھر والوں کے لیے کچھ باقی رکھا ہے؟ عرض کی: جتنا لایا ہوں اسی کا مثل ان کی خاطر چھوڑا ہے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر لے آئے، ان سے بھی نبی کریم ﷺ نے یہ استفسار کیا، تو بولے ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو باقی رکھا ہے، میں نے کہا: میں آپ سے کبھی بھی کسی چیز میں سبقت نہیں لے سکتا۔[1] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور حکم صحت لگایا، علماء نے تمام مال کے تصدق کے لیے شرط عائد کی ہے کہ متصدق قوی اور کما رہا ہو، صابر ہو، قرضدار نہ ہو اور یہ نہ ہو کہ جن کی ذمہ داری اس پر ہے وہ بھوک وتنگ کا شکار ہوں، اگر یہ شروط پوری نہ ہوں، تب ایسا کرنا مکروہ ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ ایک صاحب سونے کا انڈہ لے کر آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ مجھے کھدائی سے ملا ہے، آپ صدقہ کے بطور یہ لے لیں اور میرے پاس اس کے سوا کوئی اور مال نہیں، لیکن آپ نے رخِ انور دوسری طرف کر لیا، وہ اس طرف سے آگے ہوا اور یہی بات کہی، مگر آپ نے اعراض کیا، جب بار بار یہی کیا تو نبی کریم ﷺ نے وہ انڈہ لے کر اس کا نشانہ باندھا اگر لگ جاتا تو اسے چوٹ لگتی، پھر فرمایا: ''کیا تمہارا کوئی اپنا سارا مال صدقہ کے لیے لے کر آئے، پھر اس کے بعد لوگوں سے مانگتا پھرے؟ صدقہ وہی ہے جو کر کے تنگی نہ ہو۔''[2] اسے ابوداود اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے اور اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں۔

ذمی اور حربی (جس کی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا امن کا معاہدہ نہیں) پر صدقہ کرنے کا جواز

ذمی اور حربی پر صدقہ کرنا جائز ہے اور مسلمان کو اس پر ثواب ملے گا، اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی تعریف کی اور کہا:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴾ (الدهر:۸)

''اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین، یتیم اور قیدی کو۔''

اور اسیر تب حربی ہی تھے اور فرمایا: ﴿ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ﴾ (الممتحنة: ۸)

''اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے نہ تم سے جنگ کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو۔''

سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میری والدہ ملنے آئیں اور ابھی تک وہ حالتِ شرک پر تھیں، تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! میری والدہ آئی ہیں اور وہ حسن سلوک کی امیدوار ہیں کیا ان کی اعانت کروں؟ فرمایا: ''ہاں کرو۔''[3]

---

[1] حسن، سنن أبی داود: ۱۶۷۸؛ سنن ترمذی: ۳۶۷۵. [2] ضعیف، أبی داود: ۱۶۷۳؛ البتہ مرفوع حدیث صحیح ہے۔
[3] صحیح البخاری: ۲۶۲۰؛ صحیح مسلم: ۱۰۰۳.

جانوروں پر صدقہ

① بخاری و مسلم نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی کہیں جا رہا تھا کہ سخت پیاس لگی ایک کنواں پایا تو اس میں اترا اور پانی پی کر باہر آیا، تو دیکھا ایک کتا مارے پیاس کے زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے، کہنے لگا، آخر یہ بھی تو مخلوق ہے اور جو مارے پیاس کے میرا حال تھا، یہی اس کا بھی ہے تو کنویں میں اتر کر اپنے موزے کو پانی سے بھرا اور اسے منہ سے پکڑ کر (دیواروں کا سہارا لے کر) چڑھا اور کتے کو پانی پلایا، تو اللہ نے اس کی قدردانی کرتے ہوئے اس کی بخشش کر دی۔'' صحابہ کہنے لگے، یا رسول اللہ! جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں بھی ہمارے لیے اجر ہے؟ فرمایا: «فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ» ''ہر جاندار (کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے) میں اجر ہے۔''[1]

② شیخین نے نقل کیا کہ ''پیاس کا مارا ایک کتا ایک کنویں کا چکر لگا رہا تھا کہ بنی اسرائیل کی طوائفوں میں سے ایک طوائف کی اس پر نظر پڑ گئی، تو اس نے موزہ اتارا اور کنویں میں اتر کر پانی سے بھر کر لائی اور کتے کی پیاس بجھائی تو اسی ایک عمل کے نتیجے میں اس کی بخشش ہو گئی۔''[2]

صدقہ جاریہ

احمد اور مسلم نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی فوت ہو جاتا ہے، تو اس کا عمل اب منقطع ہوا ماسوائے ان تین کے: ① کوئی صدقہ جاریہ کر گیا ہو ② علم سکھلایا جس سے انتفاع کا سلسلہ جاری رہا ③ اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا گو ہو۔''[3]

حسنِ سلوک ہونے پر شکریہ ادا کرنا

① ابو داود اور نسائی نے بسندِ صحیح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ کے نام کے ساتھ پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیا کرو اور جو اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرے، اسے دو اور جو تمہارے ساتھ بھلائی کرے اسے بدلہ دو، اگر کچھ نہ پاؤ تو (کم از کم) دعا ہی دے دو۔''[4]

② امام احمد رحمہ اللہ نے ثقہ سند کے ساتھ سیدنا اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں کا شکر گزار نہ ہوا اس نے اللہ کا کیا شکر گزار ہونا ہے۔''[5]

③ ترمذی نے حسن کہہ کر سیدنا اسامہ بن زید سے رضی اللہ عنہ نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کے ساتھ کوئی بھلائی کی گئی اور اس نے کرنے والے سے (جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا) کہا تو اس نے تعریف و شکریہ کا حق ادا کیا۔''[6]

---

[1] صحيح البخاري:٢٣٦٣؛صحيح مسلم:٢٢٤٤. [2] صحيح البخاري:٣٤٦٧؛صحيح مسلم: ٢٢٤٥. [3] صحيح مسلم: ١٦٣١؛ سنن أبي داود: ٢٨٨٠. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١٦٧٢؛ سنن نسائي: ٥/ ٨٢. [5] صحيح، مسند أحمد: ٥/ ٢١١؛ مجمع الزوائد: ٨/ ١٨٠. [6] صحيح، سنن ترمذي: ٢٠٣٥؛ عمل اليوم والليلة: ١٨٠.

روزوں کے مسائل

صیام کا لغوی معنی امساک ہے (یعنی رک جانا)، قرآن میں ہے:

﴿فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا﴾ (مریم:٢٦)

''اگر تم کسی آدمی کو دیکھو تو کہنا کہ میں نے اللہ کے لیے روزے کی نذر مانی ہے تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز کلام نہیں کروں گی۔''

یعنی کلام سے امساک پر صوم کا لفظ استعمال کیا تو یہاں مراد نیت کر کے مفطرات (یعنی جن اشیا اور امور سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے) سے طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک امساک ہے۔

روزے کی فضیلت

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے، مگر روزے کے علاوہ کیونکہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دے سکتا ہوں اور روزہ ڈھال ہے، جب کوئی روزے سے ہو تو نہ فحش بات کرے، نہ شور کرے، نہ غصہ کرے اور اگر کوئی اس سے لڑے یا گالی دے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، اللہ کی قسم! روزے دار کے (کھانے پینے سے ایک مدت تک رکے رہنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی) بو اللہ کے ہاں روزِ قیامت کستوری کی خوشبو سے بھی اطیب ہوگی اور روزہ دار کے لیے دو فرحتیں ہیں: ایک جب وہ روزہ افطار کرتا ہے (تو ایک عجیب سے خوشی و شادمانی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے) اور دوسری تب ملے گی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔''[1] اسے احمد، مسلم اور نسائی نے تخریج کیا۔

② بخاری اور ابوداود کی ایک روایت میں ہے کہ ''روزہ ڈھال ہے، پس جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو فحش بات نہ کرے، نہ جہالت کا مظاہرہ کرے، اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا گالی دے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں، میں روزہ دار ہوں، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں کستوری سی بھی زیادہ خوشبودار ہے، (اللہ کا فرمان ہے) روزہ دار میرے لیے اکل و شرب اور شہوت چھوڑتا ہے، لہٰذا میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور نیکی کا بدلہ دس گناہ ہوتا ہے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم: ١١٥١؛ سنن نسائی: ٤/ ١٦٤. [2] صحیح البخاری: ١٨٩٤؛ سنن أبی داود: ٢٣٦٣.

③ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''روزہ اور قرآن قیامت کے دن شفاعتی بنیں گے، روزہ کہے گا: اے اللہ! میں نے اسے دن کے وقت کھانے پینے اور شہوت سے روکے رکھا تو اس کی بابت میری سفارش قبول فرما: قرآن کہے گا: میں نے رات کو اسے سونے سے روکے رکھا تو اس کی بابت میری سفارش قبول فرما تو دونوں کی یہ سفارش شرفِ قبولیت سے نوازی جائے گی۔''[1] اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا۔

④ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ کوئی ایسا عمل بتلائیں جو جنت میں داخل کر دے، فرمایا: ''روزے رکھا کرو کیونکہ اس کے برابر کوئی عمل نہیں۔'' پھر ایک دفعہ یہی درخواست کی تو تب بھی آپ نے یہی حکم دیا۔[2] اسے احمد، نسائی اور حاکم نے صحیح قرار دیا اور تخریج کیا۔

⑤ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بندہ کسی دن اللہ کی راہ میں (نفلی) روزہ نہیں رکھتا، مگر اس کے بدلے اللہ آگ کو اس کے چہرے سے ستر برس کی مسافت تک دور کر دیتا ہے۔''[3] اسے سوائے ابوداود کے باقی جماعت نے نقل کیا۔

⑥ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ریان نام کا ہے، روزِ قیامت کہا جائے گا: روزے دار کہاں ہیں؟ وہ جب اس سے داخل ہو جائیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا۔''[4] متفق علیہ۔

روزے کی اقسام

اس کی دو قسمیں ہیں: فرض اور نفل، فرض کی تین انواع ہیں:

① رمضان کے روزے ② کفارات کے روزے

③ نذر کے روزے، یہاں رمضان کے اور نفلی روزوں کے بارے میں بات ہوگی، باقی کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

رمضان کے روزے

کتاب وسنت اور اجماع کی رو سے رمضان کے روزے فرض ہیں، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (البقرة:١٨٣)

''مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

پھر فرمایا:

---

① صحیح، مسند أحمد: ٦٦٢٦؛ مسند ابی یعلی: ٣٤٩٠. ② صحیح، سنن نسائی: ٤/ ١٦٥؛ صحیح ابن خزیمة: ١٨٩٣. ③ صحیح البخاری: ٢٨٤٠، صحیح مسلم: ١١٥٣. ④ صحیح البخاری: ١٨٩٦ ؛ صحیح مسلم: ١١٥٢.

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾(البقرة: ۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو، چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔''

جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ امور پر ہے:
① گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ② نماز قائم کرنا ③ زکاۃ ادا کرنا ④ رمضان کے روزے رکھنا ⑤ حج بیت اللہ الحرام۔''[1] سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے بتلایے کہ اللہ نے مجھ پر کون سے روزے فرض کیے ہیں؟ فرمایا: ''ماہِ رمضان کے۔'' عرض کی: اس کے علاوہ بھی؟ فرمایا: ''نہیں! اِلَّا یہ کہ نفلی رکھو۔''[2] امت کا ماہِ رمضان کے روزوں کے وجوب پر اجماع ہے اور کہ یہ اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے جو ضروری ہے کہ ہر ایک کو معلوم ہو، اس کا منکر کافر اور اسلام سے مرتد ہے، ان کی فرضیت بروز سوموار سن دو ہجری کے ماہِ شعبان کی دو تاریخ کو ہوئی۔

ماہِ رمضان اور اس میں عمل کی فضیلت

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ جب رمضان شروع ہونے والا تھا تو فرمایا: ''ایک مبارک مہینہ آنے والا ہے، اللہ نے تم پر اس کے روزے فرض کیے ہیں، اس میں جنت کے دروازے کھولے اور جہنم کے بند کر دیے جاتے ہیں، شیاطین زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں، اس میں ایک رات ایسی ہے (یعنی شبِ قدر) جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس کی خیر سے محروم ہو گیا وہ حقیقی محروم ہے۔''[3] اسے احمد، نسائی اور بیہقی نے تخریج کیا۔
② عرفجہ کہتے ہیں کہ میں عتبہ بن فرقد کی مجلس میں تھا اور وہ رمضان کے بارے بیان کر رہے تھے، اس دوران میں ایک صحابی آ گئے تو عتبہ بوجہ ہیبت چپ ہو گئے، کہتے ہیں: انہوں نے رمضان کے بارے بتلایا: میں نے سنا کہ نبی کریم ﷺ اس بارے فرما رہے تھے: ''جنت کے دروازے کھول دیے جاتے، جہنم کے بند کر دیے جاتے اور شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں، ایک فرشتہ منادی کرتا رہتا ہے: اے خیر کے متلاشی! خوش ہو جاؤ اور اے شر کے طالب! باز رہو، حتی کہ رمضان ختم ہو جائے۔''[4] اسے احمد اور نسائی نے نقل کیا اور اس کی سند جید ہے۔

---

① صحيح البخاري: ٨؛ صحيح مسلم: ٤٥. ② صحيح البخاري: ٤٦؛ صحيح مسلم: ١١. ③ صحيح لغيره، سنن نسائي: ٤/ ١٢٨؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٣٠، ٣٨٥. ④ صحيح، سنن نسائي: ٤/ ١٢٩، ١٣٠؛ مسند أحمد: ٤/ ٣١١، ٣١٢.

③ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نمازِ پنجگانہ اور جمعہ تا جمعہ اور رمضان تا رمضان درمیانی مدت کے گناہوں کے لیے کفارہ ہیں، جبکہ کبائر سے اجتناب کیا جائے۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا

④ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے، اس کی حدود پہچانیں ہراس چیز سے بچا جس سے بچنا ضروری ہے تو اس کے سابقہ گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔''[2] اسے احمد اور بیہقی نے بسندِ جید نقل کیا۔

⑤ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے رمضان کے روزے رکھے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''[3] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا۔

رمضان کے روزے چھوڑنے سے ترہیب

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کی کڑیاں اور دین کی بنیادیں تین ہیں جن پر اسلام کی اساس کھڑی ہے، جس نے کسی ایک کا بھی ترک کیا وہ کافر اور واجب القتل ہوا، وہ یہ ہیں: کلمہ پڑھنا، فرض نماز ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''[4] اسے ابویعلی اور دیلمی نے نقل کیا اور ذہبی نے حکمِ صحت لگایا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے بغیر کسی شرعی رخصت کے رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑا تو اس کی تلافی ساری عمر کے روزے بھی نہیں کر سکتے۔''[5] اسے ابوداود، احمد اور ترمذی نے نقل کیا، بقول امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مذکور ہے کہ جس نے کسی عذر و مرض کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑا تو اب زمانہ بھر کے روزے رکھے تو بھی اس کی تلافی نہیں ہوسکتی،[6] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی یہی کہا کرتے تھے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کے ہاں امرِ متقرر ہے کہ جس نے بلا مرض و عذر رمضان کا روزہ ترک کیا، وہ زانی اور شرابی سے بھی بدتر ہے، بلکہ سلف اس کے اسلام میں شک کرتے اور اسے زندیق و منحرف خیال کرنے لگتے تھے۔

ماہِ رمضان کا آغاز

یا تو چاند نظر آنے سے، چاہے ایک عادل نے گواہی دی ہو یا پھر اگر شعبان کے تیس دن گزر چکے ہوں (یعنی اگر بالفرض موسم ابر آلود تھا اور ہلال دکھائی نہ دیا تو......) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: لوگ ہلالِ رمضان دیکھنے میں لگے تھے کہ مجھے وہ نظر آیا اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ مجھے نظر آ گیا ہے تو آپ نے رمضان کے آغاز کا اعلان کرا دیا،[7] اسے ابوداود، حاکم اور ابن حبان نے نقل کیا اور آخری دونوں نے صحیح قرار دیا۔

---

① صحيح مسلم: ٢٣٣/١٦. ② ضعيف، مسند أحمد: ٣/ ٥٥، صحيح ابن حبان: ٣٤٢٤. ③ صحيح البخاري: ١٩٠، صحيح مسلم: ٧٥٩. ④ ضعيف، مسند ابی يعلى: ٢٣٤٩، مجمع الزوائد: ١/ ٤٨. ⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ٢٣٩٦، سنن ترمذی: ٧٢٣، سنن ابن ماجه: ١٦٧٢. ⑥ صحيح البخاري، قبل الرقم: ١٩٣٥. ⑦ صحيح، سنن أبی داود: ٢٣٤٢، صحيح ابن حبان: ٣٤٤٧.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''چاند دیکھ کر روزوں کی ابتدا کیا کرو اور (عید کا) چاند دیکھ کر ہی اس کا اختتام کیا کرو اور اگر بادل چھائے ہوں تب تیس کی گنتی پوری کرلو۔''[1] اسے شیخین نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ اکثر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، وہ قائل ہیں کہ رمضان شروع کرنے کے بارے میں ایک آدمی کی گواہی قبول کر لی جائے گی، یہی امام ابن مبارک، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ نے فتوی دیا، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہی اصح ہے۔ جہاں تک عید کا چاند ہے تو اس کا فیصلہ اس طرح ہو کہ (موسم اگر ابر آلود ہے اور) رمضان کے تیس دن پورے ہو چکے ہوں یا عام فقہاء کے نزدیک کم از کم دو غیر فاسق آدمی گواہی دیں کہ عید کا چاند دیکھ لیا ہے، البتہ ابوثور رحمہ اللہ کے نزدیک ایک کی گواہی بھی کافی ہے، بقول امام ابن رشد وابوبکر بن منذر رحمہ اللہ نے ایک آدمی کے قول کے ساتھ وجوبِ فطر اور اکل وشرب سے امساک پر اجماع کے انعقاد کے ساتھ حجت پکڑی ہے اور کہا: واجب ہے کہ رمضان شروع ہونے اور ختم ہونے کے ضمن میں بھی یہی معاملہ ہو کیونکہ یہ دونوں علامت ہیں جو فطر کے زمن کو صوم کے زمن سے جدا کرتے ہیں نیز تعبد کے ضمن میں خبرِ واحد قبول کرنا ہر جگہ اسے قبول کرنے پر دال ہے، ماسوائے وہ جس کی تخصیص کے ساتھ دلیل وارد ہوئی کہ اس میں خبر واحد کے ساتھ تعبد نہ ہو، جیسے مالی معاملات وغیرہ کے ضمن میں گواہی کا معاملہ تو ظاہر وہی ہے جو ابوثور نے اختیار کیا۔

مطالع (یعنی طلوعِ ہلال کے اوقات) کا باہم مختلف ہونا

جمہور کی رائے ہے کہ اختلافِ مطالع سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر ایک شہر والوں نے چاند دیکھ لیا ہے تو (اس ملک یا علاقہ کے) تمام شہر والوں پر روزہ رکھنا واجب ہوگا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهِ» ''چاند دیکھ کر روزوں کی ابتدا کرو اور اسے دیکھ کر ہی روزوں کا سلسلہ منقطع کرو۔''[2] یہ خطاب ساری امت کے لیے عام ہے تو ان میں سے کسی نے جس جگہ بھی چاند دیکھ لیا وہ سب کے لیے رؤیت قرار پائے گی، عکرمہ، قاسم بن محمد، سالم، اسحاق، احناف اور شوافع کا مختار یہ ہے کہ ہر اہلِ شہر کی اپنی اپنی رؤیت کا اعتبار ہوگا، دوسرے کسی شہر والوں کی رؤیتِ ہلال ان پر روزے رکھنا لازم نہ کرے گی، کیونکہ کریب رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میں شام گیا ہوا تھا کہ وہاں چاند نظر آنے کے بعد روزے رکھنا شروع کر دیے، ہم نے شام میں چاند کو بروزِ جمعہ دیکھا تھا، پھر رمضان کے آخر میں میری مدینہ واپسی ہوئی تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے پوچھا: آپ لوگوں نے شام میں کس دن چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا: شبِ جمعہ کو، کہا: کیا تم نے خود بھی دیکھا تھا؟ عرض کی: جی ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزے رکھے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا تو کہا کہ لیکن ہم نے تو چاند ہفتے کی رات کو دیکھا تھا، ہم تو اسی حساب سے روزے رکھیں گے حتی کہ تیس مکمل کر لیں یا اگلا چاند دیکھ لیں، میں نے کہا: اہلِ شام کی رؤیت کافی نہ تھی؟ کہا: نہیں! نبی کریم ﷺ کا ہمیں یہی حکم ہے۔[3] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے تخریج کیا، بقول

---

[1] صحيح البخاري: ١٩٠٩، صحيح مسلم: ١٠٨١. [2] صحيح البخاري، ١٩٠٩. [3] صحيح مسلم: ١٠٨٧، سنن أبي داود: ٢٣٣٢، سنن ترمذي: ٦٩٣.

امام ترمذی رحمہ اللہ: یہ حسن صحیح غریب ہے اور اہلِ علم کا اسی حدیث پر عمل ہے کہ ہر شہر والوں کی اپنی اپنی رؤیت ہوگی، فتح العلام شرح بلوغ المرام میں ہے کہ ہر شہر اور آس پاس کے ان علاقے والوں کو جو اسی شہر کی سمت (یعنی جغرافیائی لحاظ سے ایک خاصیت والے علاقے) میں واقع ہیں، ایک رؤیت کافی ہوگی۔

اگر کسی ایک نے چاند دیکھ لیا

آئمہ فقہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس اکیلے نے رمضان کا چاند دیکھ لیا تو وہ اب روزے رکھنا شروع کر دے، امام عطاء رحمہ اللہ نے مخالفت کی اور کہا: جب تک اس کے ساتھ کوئی اور نہ دیکھے وہ روزہ نہ رکھے، ہلالِ عید کے ضمن میں بھی فقہاء نے باہم اختلاف کیا تو حق یہ ہے کہ (اگر کسی اکیلے نے چاند دیکھا تو) روزے رکھنا ختم کر دے جیسا کہ امام شافعی اور امام ابوثور رحمہما اللہ نے کہا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے رؤیت پر صوم اور فطر کا وجوب رکھا ہے تو یقیناً رؤیت اسے حاصل ہے اور یہ ایسا امر ہے جس کا مدار مشاہدہ پہ ہے، لہٰذا مشارکت کا محتاج نہیں۔

روزے کے ارکان

روزے کے دو رکن ہیں جن سے اس کی حقیقت مترکب ہے:

① طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک مفطرات سے امساک، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾(البقرة:١٨٧)

''اب (تمہیں اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد تو) اس کی طلب کرو اور کھاؤ، پیو حتی کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے، پھر روزہ رات تک پورا کرو۔''

خیطِ ابیض اور خیطِ اسود سے مراد دن کی ضیا اور رات کی سیاہی ہے۔ بخاری اور مسلم نے سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ... ﴾ الخ تو میں نے ایک سفید اور ایک سیاہ دھاگہ لیا اور انہیں اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور رات کو اٹھ اٹھ کر انہیں دیکھتا رہا (کہ سیاہ دھاگے کا سفید دھاگے سے پتہ چلتا ہے یا نہیں) مگر پتہ نہ چلا، صبح نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور یہ معاملہ ذکر کیا تو فرمایا: ''اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی روشنی ہے۔''[1]

② نیت: کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾(البينة: ٥)

---

[1] صحيح البخاري: ١٩١٦، صحيح مسلم: ١٠٩٠.

''انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔''

آپ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ»

''اعمال کا مدار نیت پر ہے اور ہر ایک کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔''[1]

ضروری ہے کہ یہ نیت رمضان کی ہر رات فجر سے قبل ہو اس حدیث حفصہ رضی اللہ عنہا کے مدنظر، کہتی ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے فجر سے قبل روزہ رکھنے کا پختہ ارادہ و نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔''[2] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے تخریج کیا اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس پر صحت کا حکم لگایا، نیت رات کے کسی بھی حصے میں کر لینا صحیح ہے، اس سلسلہ میں کوئی عبارت پڑھنا شرط نہیں کیونکہ نیت دل کا فعل ہے، زبان کا اس میں دخل نہیں کیونکہ اس کی حقیقت کسی فعل کا قصد اور ارادہ ہے، اللہ کے امر کے امتثال (یعنی ماننے) اور اس کی رضا کی طلب کے لیے تو جس نے روزے کی نیت سے رات کو ہی (یعنی قبل از سحر) کھانا کھا لیا اس کا روزہ ہو گیا اور جس نے دن کے وسط میں مفطرات سے رک جانے کا عزم کر لیا اللہ کے لیے اخلاص کا مظاہرہ کرتے ہوئے تو اس کی بھی نیت معتبر ہوئی، اب چاہے اس نے سحری نہ کھائی ہو کثیر فقہاء کا کہنا ہے کہ نفلی روزے کی نیت دن کے وقت بھی ہو سکتی ہے، اگر اس نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم ﷺ ایک دن تشریف لائے اور پوچھا: ''کیا کھانے کو کچھ ہے؟'' عرض کی: نہیں! تو فرمایا: ''تب میں روزہ دار ہوں۔''[3] اسے مسلم اور ابوداود نے نقل کیا، احناف نے شرط عائد کی ہے کہ نیت زوال سے قبل واقع ہوئی ہو (یعنی نفلی روزے کی)، امام شافعی رحمہ اللہ کے دو میں سے مشہور قول بھی یہی ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا ظاہر قول یہ ہے کہ بعد از زوال بھی اگر نیت کر لی تو بھی درست ہے۔

روزہ کن پر واجب ہے؟

علماء کا اجماع ہے کہ روزہ ہر مسلمان، عاقل، بالغ، تندرست اور مقیم شخص پر واجب ہے اور اس عورت پر جسے اس دوران حیض یا نفاس جاری نہ ہو۔ کافر، مجنون، نابالغ، مریض، مسافر، حائضہ، اور نفاس والی خاتون پر روزہ واجب نہیں اور نہ بہت بوڑھے پر، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی پر، ان میں سے بعض پر تو مطلقاً ہی روزہ کا وجوب نہیں (مثلاً: کافر، مجنون اور نابالغ) اور بعض کے ولی سے مطلوب ہوگا کہ اسے روزہ رکھنے کا حکم دے اور بعض پر (بعد میں) قضا دینا لازم ہے اور بعض کو روزہ چھوڑ دینے کی رخصت ہے، مگر اسے فدیہ دینا واجب ہے، اب ان سب کا الگ الگ بیان کیا جاتا ہے:

---

[1] صحیح البخاری: ۱؛ صحیح مسلم: ۱۹۰۷. [2] صحیح، سنن أبی داود: ۲٤٥٤؛ سنن ترمذی: ۷۳۰.
[3] صحیح مسلم: ۱۱٥٤؛ سنن أبی داود: ۲٤٥٥.

کافر اور مجنون کا روزہ

روزہ ایک اسلامی عبادت ہے، لہٰذا غیر مسلموں پر یہ واجب نہیں اور مجنون غیر مکلف ہے، کیونکہ وہ مسلوب العقل ہے اور عقل ہی تکالیف (یعنی شرعی احکام لاگو ہونے) کی بنیاد ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین قسم کے افراد مرفوع القلم ہیں: مجنون، حتی کہ صحیح ہو جائے، سویا ہوا حتی کہ بیدار ہو اور نابالغ حتی کہ بالغ ہو آجائے۔''[1] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا۔

نابالغ کا روزہ

اگرچہ نابالغ پر روزہ رکھنا واجب نہیں، مگر اس کے سرپرست کو چاہیے کہ اسے رکھوائے تاکہ صغرسنی سے اس کی مشق ہو اور جب استطاعت ہو اور جتنے وقت کا وہ رکھ سکیں، سیدہ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کی صبح انصار کے محلوں میں منادی کرائی کہ جس نے صبح روزے کی حالت میں کی ہے وہ مکمل کرے اور جس نے (بعد از فجر) کچھ کھا پی لیا ہے وہ بقیہ دن کا روزہ رکھے، کہتی ہیں: تو اس کے بعد ہم نے عاشوراء کا روزہ رکھنا شروع کر دیا اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی رکھواتے اور انہیں اپنے ساتھ مسجد لے کر جاتیں اور انہیں کھلونوں سے بہلاتی رہتیں تو جب کوئی بچہ زیادہ ہی بھوک سے بے تاب ہوتا تو اسے کھانا پکڑا دیتیں مگر کھلاتیں افطار کے وقت ہی۔[2] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

جنہیں روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے اور یہ کہ بدلے میں فدیہ دیں

بہت بوڑھے اور بڑھیا اور ایسا بیمار جس کے تندرست ہونے کی امید نہیں اور مزدور پیشہ اور پر مشقت کام کرنے والے جنہیں کھانے کو کھلا میسر نہیں البتہ وہ نہیں جو ان اعمال کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ ان کا معمول ہے تو ان سب کو روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، اگر روزہ رکھنا ان کے لیے جان جوکھوں کا کام ہے اور ان پر واجب ہے کہ اس کے فدیہ کے بطور روزانہ کسی مسکین کو کھانا کھلائیں، کھانے کی مقدار بعض نے ایک صاع، بعض نے نصف صاع اور بعض نے ایک مد کہی ہے، بہر حال سنت میں اس کی مقدار مذکور نہیں (ظاہر ہے کہ اسے عرف پر رکھا، نیز مہینہ بھر کا ایک آدمی کا راشن اکٹھا بھی دیا جا سکتا ہے) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: بوڑھے کے لیے رخصت دی گئی کہ روزہ نہ رکھے اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا دے اور اس کے ذمے قضا بھی نہیں، اسے دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا اور صحت کا حکم لگایا، بخاری نے عطاء سے نقل کیا کہ انہوں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (البقرة:١٨٤)

''جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن روزہ نہ رکھیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔''

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٤٤٠١؛ سنن ترمذي: ١٤٢٣. [2] صحيح البخاري: ١٩٦٠؛ صحيح مسلم: ١١٣٦.

اور کہنے لگے: یہ منسوخ نہیں، یہ بہت بوڑھے اور بڑھیا کے لیے ہے جن میں روزہ رکھنے کی سکت نہیں تو وہ اس کے عوض روزانہ مسکین کو کھانا کھلا دیں،[1] (بقول محشی مالک اور ابن حزم کا مذہب ہے کہ اس طرح کے بوڑھے اور بوڑھیوں پر نہ فدیہ ہے اور نہ قضا) اور ایسا بیمار جس کی صحت یابی کی امید نہیں (دائم المرض کوئی ایسا مرض جس میں دن بھر بھوکا پیاسا رہنا ممکن نہیں یا دوا لینے کا مسئلہ ہے) تو وہ بھی انہی کے مثل ہے، اسی طرح وہ مزدور جن کی روزی پُر مشقت کام سے وابستہ ہے۔

الشیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں ﴿يُطِيقُونَهُ﴾ سے مراد ضعیف بوڑھے بڑھیائیں، دائم المرض اور ان جیسے لوگ ہیں، مثلاً: وہ مزدور (جو اگرچہ جوان ہیں مگر) ان کی معاش شاق کاموں سے وابستہ ہے، مثلاً: کوئلہ کی کان سے کوئلہ نکالنے والے اسی طرح وہ قیدی جن کا پر مشقت کام کرنا سزا کا حصہ ہے، (یعنی جنھیں قیدِ با مشقت ملی ہو) اگر روزہ رکھنا ان پر شاق گزرتا ہو اور وہ فدیہ کے مالک ہیں، اسی طرح حاملہ اور مرضعہ بھی اگر ڈرتی ہوں کہ سارا دن اکل وشرب سے دور رہنے سے اسے یا اس کی اولاد کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو یہ بھی روزہ چھوڑ سکتی ہے، سیدنا ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کے نزدیک اس پر فدیہ ہے قضا نہیں۔

ابوداود نے عکرمہ رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قولہ تعالیٰ: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ . . .﴾ الخ، کے بارے میں کہا کہ یہ ان بوڑھے اور بڑھیا کے لیے رخصت تھی جو (بصد مشقت) روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں کہ وہ افطار کریں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کی غذا دیں (یعنی پورے دن کی) اسی طرح حاملہ اور مرضعہ اگر اولاد کو نقصان پہنچنے سے ڈریں تو وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور روزانہ ایک مسکین کو طعام دیں۔[2] اسے بزار نے نقل کیا اور آخر میں یہ اضافہ کیا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی امِ ولد لونڈی سے کہا کرتے تھے: تم ان کی مثل ہو جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے تو تمہارے ذمے فدیہ ہے اور تم پر قضا نہیں، دارقطنی نے اس کی اسناد کو صحیح قرار دیا،[3] نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حاملہ کے بارے پوچھا گیا: اگر اسے خطرہ ہو کہ روزہ رکھنے سے بچے کو کوئی نقصان ہوسکتا ہے تو...... کہا: چھوڑ دے اور روزانہ ایک مسکین کو طعام دے، گندم کی ایک مد،[4] اسے امام مالک اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے نقل کیا، ایک حدیث میں ہے ''اللہ نے مسافر کو روزے، نصف نماز، حاملہ اور مرضعہ کو روزے کی چھوٹ دی ہے۔''[5] احناف، ابوعبیدہ اور ابوثور کے نزدیک حاملہ اور مرضعہ فدیہ نہیں بلکہ قضا دیں گی، امام احمد اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر دونوں کو صرف بچے کے بارے میں خدشہ ہو اور اس وجہ سے روزے نہ رکھے تو فدیہ بھی دیں اور قضا بھی اور اگر صرف خود کو ضعف ونقص کا اندیشہ رکھتی ہیں یا اپنے نفس وولد دونوں پر تب تو صرف قضا ہے کچھ اور نہیں۔

جنھیں روزے نہ رکھنے کی چھوٹ ہے، مگر ان پر قضا دینا واجب ہے

یہ اس بیمار کے لیے ہے جسے امید ہے کہ تندرست ہوجائے گا اور مسافر کے لیے، قرآن میں ہے:

---

[1] صحیح البخاري: ٤٥٠٥. [2] شاذ، سنن أبي داود: ٢٣١٨؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٢٣٠. [3] سنن دارقطني: ٢/ ٢٠٥. [4] المؤطا امام مالك: ١/ ٣٠٨؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٢٣٠. [5] صحيح، سنن أبي داود: ٢٤٠٨؛ سنن ترمذي: ٧١٥.

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''مریض اور مسافر بعد ازاں روزوں کی قضا دیں۔''

احمد، ابوداود اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا: کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر روزوں کی فرضیت نازل کی، چنانچہ کہا:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط ﴾ (البقرۃ: ۱۸۴)

''جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔''

جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے (کہ طاقت کے باوجود) روزہ نہ رکھے تو اس کے عوض مسکین کو طعام دیدے (یہ رعایت کچھ عرصہ رہی)، پھر دوسری آیت نازل ہوئی جس میں کہا:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لے سراسر ہدایت ہے، ہدایت کی اور (حق و باطل میں) فرق کرنے کی واضح دلیلیں ہیں تو تم میں سے جو اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس کا روزہ رکھے۔''

اس کی رو سے تندرست مقیم پر روزہ رکھنا واجب کیا جبکہ مریض اور مسافر کو رخصت دی کہ بعد میں رکھ لیں اور بوڑھے اور بڑھیا جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں پاتے، ان کے لیے مسکین کو طعام دینے کا حکم ثابت رکھا۔[1] جس مرض کی وجہ سے ترکِ روزہ کی اباحت ہے یہ وہ جو شدید ہے اور روزہ رکھنے کی صورت اس میں اضافہ ہوسکتا ہے یا شفا یابی مؤخر ہوسکتی ہے، المغنی میں ہے: بعض سلف سے منقول ہے کہ انہوں نے ہر طرح کی مرض میں ترکِ روزہ مباح قرار دیا، حتی کہ جسے انگلی یا داڑھ میں تکلیف ہے، کیونکہ آیتِ ہذا میں عموم ہے اور اس لیے کہ مسافر کے لیے ایسا کرنا مباح ہے، اگرچہ اسے ضرورت نہ ہو (ایسا کرنا مباح ہے واجب تو نہیں پھر کون اس تردُّد میں پڑے گا کہ معمولی تکلیف کی وجہ سے چھوڑ دے جبکہ بعد میں رکھنا تو ہے ہی) تو اسی طرح مریض ہے، یہ بخاری، عطاء رحمہ اللہ اور اہلِ ظاہر کا مذہب ہے، اسی طرح وہ جو فی الحال تو تندرست ہے مگر خدشہ ہے کہ اگر روزہ رکھا تو بیمار ہو جائے گا اور وہ بھی جس پر بھوک یا پیاس کا غلبہ ہو (یعنی کوئی ایسا مرض لاحق ہو کہ بار بار بھوک یا پیاس لگتی ہے یا مثلاً: ہے تو تندرست مگر سحری میں کھانے کو اور پینے کو معمولی مقدار ہے) تو اسے ڈر ہے کہ اگر روزہ رکھا تو اس کی جان کو نقصان ہوسکتا ہے تو اس کے لیے نہ رکھنا لازم ہے، اگرچہ وہ تندرست اور مقیم ہے اور اس کے ذمے قضا ہے۔

قرآن میں ہے:

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۵۰۷.

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾(النساء:۲۹)

''اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔''

اور کہا:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج: ۷۸)

''اس نے دین کو تمہارے لیے پُر از مشقت نہیں بنایا۔''

اگر کسی بیمار نے مشقت برداشت کرتے ہوئے روزہ رکھ لیا تو اس کا روزہ صحیح ہے، البتہ ایسا کرنا ناپسند سمجھا گیا ہے، کیونکہ سمجھا جائے گا کہ اس نے اس رخصت سے اعراض کیا جو اللہ نے اس کے لیے پسند کی ہے اور پھر اس وجہ سے کہ اسے کوئی ضرر لاحق ہو سکتا ہے، عہدِ نبوی میں بعض صحابہ رخصت قبول کرتے جبکہ بعض روزہ رکھ لیتے تھے، سیدنا حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت پاتا ہوں، کیا اگر رکھ لوں تو مجھ پر کوئی گناہ ہے؟ فرمایا: ''یہ اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے قبول کرلے تو خوب اور جو نہ کرے اس پر کوئی حرج نہیں۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مکہ جا رہے تھے اور روزے سے تھے (فتح مکہ کے موقع پر) ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب تم دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو، لہٰذا اب روزہ نہ رکھنا تمہارے لیے تقویت کا باعث ہوگا۔'' کہتے ہیں: یہ ایک رخصت تھی تو بعض نے قبول کی اور بعض نے روزے رکھے، پھر ایک اور مقام پر اترے تو فرمایا: ''اب ایک دن کی مسافت ہے اور دشمن سے جنگ ہو سکتی ہے لہٰذا روزہ نہ رکھنا زیادہ مناسب ہے'' اور ساتھ ہی حکماً کہا: ''نہ رکھو'' تو اب یہ (رخصت نہیں بلکہ) عزیمت تھی (یعنی پختہ حکم) تو ہم سب نے روزہ نہ رکھا، کہتے ہیں: بعد ازاں بھی کئی اسفار میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور روزے رکھتے تھے۔[2] اسے احمد، مسلم اور ابوداود نے تخریج کیا، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ ہم رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد کے لیے نکلتے تو بعض ہم میں سے روزہ رکھتے اور بعض نہ رکھتے تو روزہ رکھنے والا نہ رکھنے والے کو کوئی الزام نہ دیتا یا طنز نہ کرتا تو جو اپنے میں طاقت پاتا وہ روزہ رکھ لیتا اور جو نہ پاتا وہ نہ رکھتا اور یہ دونوں روشیں خوب تھیں۔[3] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ دونوں میں سے افضل کون ہے؟ تو امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کی رائے میں روزہ رکھنا افضل ہے، اس کے لیے جو اس پر قوی ہے جبکہ دوسرے کے لیے نہ رکھنا افضل ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: (سب کے لیے) نہ رکھنا افضل ہے، عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا قول ہے: ''أَفْضَلُهُمَا أَيْسَرُهُمَا'' یعنی جس میں زیادہ آسانی ہو وہ افضل ہے تو جس میں اسی وقت سہل جبکہ بعد میں قضاء دینا نسبۃً مشکل ہو تو اس کے حق میں رکھ لینا افضل ہے،

---

[1] صحیح مسلم: ۱۱۲۱؛ سنن نسائی: ٤/ ۱۸۷. [2] صحیح مسلم: ۱۱۲۰؛ سنن أبی داود: ۲٤۰٦.

[3] صحیح مسلم: ۱۱۱۷؛ سنن ترمذی: ۷۱۳.

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بحث و تحقیق کے بعد یہ رائے دی کہ جس کے لیے روزہ رکھنے میں ضرر و مشقت ہے اسی طرح جو قبولِ رخصت سے معرض ہے تو اس صورت حال میں نہ رکھنا افضل ہے، اسی طرح جو سفر میں طاقت تو پاتا ہے مگر ڈرتا ہے کہ اسے عجب پسند اور ریاکار سمجھا جائے گا تو اس کے حق میں چھوڑ دینا افضل ہے، لیکن جسے یہ سب خدشات نہیں اس کے حق میں رکھ لینا افضل ہے، اگر مسافر نے رات کو روزے کی نیت کر لی تھی اور پھر شروع بھی ہوا مگر دن کے اثنا (اگر مشکل ہوا تو) روزہ توڑ سکتا ہے، چنانچہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے نکلے تو روزے رکھتے گئے حتی کہ کراع الغمیم پہنچے (یہ عسفان سے آگے ایک وادی ہے) لوگ بھی روزے سے تھے آپ کو بتلایا گیا کہ لوگوں کے لیے روزہ رکھنا باعث مشقت بنا ہے اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور سرِ عام نوش فرمایا، اس پر بعض صحابہ نے بھی روزہ توڑ لیا، جبکہ بعض قائم رہے تو آپ نے ان کے بارے میں فرمایا: ((أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ)) ''یہ عاصی ہیں۔''[1] (بقول محشی کیونکہ آپ نے عزماً بالفعل رہنمائی دی تھی کہ روزہ توڑ لیں مگر انہوں نے عمل نہ کیا اور رخصت قبول نہ کی) اسے مسلم، نسائی اور ترمذی نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، اگر کسی نے مقیم حالت میں روزہ رکھا، پھر دن میں سفر درپیش ہو گیا تو جمہور علماء اس کے لیے روزہ توڑنے کے عدم جواز کے قائل ہیں، امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ نے جائز قرار دیا، ان کے مدِ نظر ترمذی کی حسن قرار دی گئی محمد بن کعب سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں رمضان میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا جو سفر کی تیاری میں تھے اور سواری پر ان کے لیے کجاوہ کسا جا چکا تھا اور سفر کا لباس پہن لیا تھا تو اس حالت میں کھانا طلب کیا اور اسے تناول کیا، میں نے کہا: کیا یہی سنت ہے؟ تو کہا: جی ہاں! سنت ہے، پھر سوار ہو گئے،[2] عبید بن جبیر کہتے ہیں: میں سیدنا ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کے ہمراہ فسطاط سے رمضان کے مہینہ میں کشتی میں سوار ہوا تو انہوں نے اپنا دوپہر کا کھانا کھولا اور مجھے کہا: قریب ہو جاؤ! میں نے کہا: ابھی تو آپ آبادی میں ہیں، کہنے لگے: کیا سنتِ نبوی سے اعراض کرتے ہو؟[3] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا اور اس کی سند ثقہ راویوں پر مشتمل ہے، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ یہ دونوں حدیثیں دلیل ہیں کہ سفر پر جانے والا نکلنے سے قبل ہی (نہ کہ سفر شروع کر کے) روزہ افطار کر سکتا ہے، ابن العربی رحمہ اللہ نے لکھا: یہ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ صحیح ہے اور سفر کی تیاری پکڑتے ہی جوازِ فطر کی مقتضی ہے، کہتے ہیں: یہی حق ہے اور وہ سفر فطر کا مبیح ہے جس میں قصر نماز جائز ہو اور اس کی حد بھی وہی جو قصر نماز کی ہے، یعنی جتنی مدت کا قیام اگر ہو تو قصر کرتے رہنا جائز ہے، اس مدت کے بارے میں بحث اور اختلافِ مذاہب کا حال قصر کے موضوع میں گزرا، احمد، ابو داود، بیہقی اور طحاوی نے منصور کلبی سے نقل کیا کہ سیدنا دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ (مشہور صحابیِ رسول) رمضان میں ایک دفعہ دمشق کی ایک بستی سے نکلے اور اتنی مسافت کا سفر کیا جو فسطاط (یہ مصر کا ایک شہر) سے عقبہ (بندرگاہ) کا ہے (بقول محشی تقریباً تین میل) اور روزہ توڑ لیا، ہمراہی لوگوں میں سے کچھ نے توڑنا ناپسند کیا تو جب اپنی بستی

---

[1] صحيح مسلم: ١١١٤؛ سنن ترمذي: ١٧١٠. [2] صحيح، سنن ترمذي: ٧٩٩؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٢٤٦. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٢٤١٢؛ مسند أحمد: ٦/ ٣٩٨.

میں واپس ہوئے تو کہا: اللہ کی قسم! آج ایک ایسا معاملہ دیکھا ہے میرا نہیں خیال تھا کہ ایسا دیکھوں گا، وہ یہ کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی ہدی (یعنی سنت و روش) سے اعراض کیا، پھر کہا: اے اللہ! تو مجھے اب اپنے پاس بلا لے۔[1] اس کی سند کے ماسوائے منصور کلبی کے سب راوی ثقہ ہیں، انہیں بھی عجلی نے ثقہ قرار دیا ہے۔

جن پر ترک اور قضا دونوں واجب ہیں

فقہاء متفق ہیں کہ حائضہ اور نفاس والی خاتون کے لیے روزہ چھوڑنا واجب ہے اور اگر رکھ لیا تو ادا نہ ہوگا اور ان پر واجب ہے کہ قضا دیں، بخاری اور مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ عہدِ نبوی میں حائضہ خواتین کو حکم دیا گیا کہ (روزے چھوڑ دیں اور بعد میں) قضا دیں، البتہ چھوٹ گئیں نمازوں کی قضا کا حکم نہ تھا۔[2] جن ایام میں روزہ رکھنا منع ہے وہ درج ذیل ہیں:

① عیدین کے دن

علماء کا عیدین کے دونوں دن روزہ رکھنے کی حرمت پر اجماع ہے، چاہے یہ فرض روزہ ہو یا نفلی کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم ﷺ نے ان دونوں دنوں کا روزہ رکھنے سے منع کیا ہے، عید الفطر میں اس لیے کہ یہ رمضان کا اختتام ہے اور عید الاضحیٰ کے دن اس لیے تاکہ تم اپنی کی گئی قربانیوں کا گوشت کھاؤ،[3] اسے احمد اور اربعہ نے نقل کیا۔

② ایامِ تشریق کے روزے رکھنے کی نہی

عید الاضحیٰ کے بعد والے تین ایام میں روزے رکھنے کی نہی ہے، کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے منیٰ میں سیدنا عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے ہر جانب منادی کروائی کہ "ان ایام کے روزے نہ رکھو کیونکہ یہ اکل وشرب اور اللہ کے ذکر کے ایام ہیں۔"[4] اسے احمد نے جید سند سے نقل کیا، طبرانی نے اوسط میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک منادی کرنے والا بھیجا جو اعلان کرتا جاتا تھا کہ ان ایام کے روزے نہ رکھو کیونکہ یہ "اکل و شرب اور بعال" (یعنی بیوی سے ہمبستری کرنے) کے دن ہیں۔[5] امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب نے ان حضرات کی نسبت ایام تشریق کے روزے رکھنا جائز قرار دیا جن کے لیے کوئی اس کا سبب ہو، مثلاً: نذر، کفارہ یا قضا لیکن جن کا کوئی سبب نہیں ان کے لیے بلا اختلاف جائز نہیں، اسے انہوں نے اوقاتِ کراہت میں سبھی نمازوں کی نظیر کیا۔

③ اکیلے جمعہ کے دن کو روزہ کے ساتھ خاص کرنا

کیونکہ جمعہ کا دن مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے، لہٰذا شارع علیہ السلام نے بطورِ خاص اس دن کا روزہ رکھنے سے نہی صادر فرمائی،

---

① ضعیف، سنن أبی داود: ٢٤١٣؛ مسند أحمد: ٦/ ٣٩٨. ② صحیح مسلم: ٣٣٥؛ سنن أبی داود: ٢٦٣.
③ صحیح البخاری: ١٩٩٠؛ صحیح مسلم: ١١٣٧. ④ صحیح، مسند أحمد: ٢/ ٥١٣، ٥٣٥. ⑤ صحیح، المعجم الاوسط للطبرانی: ٧٠٥٢، البتہ بعال کے لفظ کی زیادتی درست نہیں۔

جمہور کے نزدیک یہ نہی برائے کراہت ہے نہ کہ تحریم کے لیے اِلَّا یہ کہ اس کے ساتھ جمعرات کا یا پھر ہفتے کا بھی روزہ رکھے (بقول محشی امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک جمعہ کا روزہ مکروہ نہیں) یا اس صورت میں کہ اس کے معمول کے موافق جمعہ آ گیا ہے (یعنی کسی نے معمول بنایا کہ ایک دن چھوڑ کر ایک دن کا روزہ رکھتا ہے تو اس معمول کے مطابق جمعہ آ گیا، یا یومِ عرفہ یا عاشورا جمعہ کے دن آ گیا ہے، تب روزہ رکھنا مکروہ نہ ہوگا) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین سیدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور وہ روزے سے تھیں جبکہ جمعہ کا دن تھا، فرمایا: ''کیا کل روزہ رکھا تھا؟'' کہا: نہیں! پوچھا: ''کیا کل (یعنی ہفتہ کو) رکھو گی؟'' کہا: نہیں! تو فرمایا: ''تب توڑ دو۔''[1] اسے احمد اور نسائی نے جید سند کے ساتھ نقل کیا، سیدنا عامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جمعہ کا دن تمہاری عید ہے تو اس دن روزہ مت رکھو، مگر اس صورت میں کہ جمعرات کا بھی رکھا تھا یا ہفتہ کے دن رکھنے کا ارادہ ہو۔''[2] اسے بزار نے حسن سند سے نقل کیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: جو نفلی روزہ رکھنا چاہتا ہے وہ جمعرات کا رکھ لے، جمعہ کا نہ رکھے کیونکہ یہ اکل و شرب اور ذکر کا دن ہے،[3] اسے ابن ابی شیبہ نے بسندِ حسن نقل کیا، صحیحین میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جمعہ کے دن کا روزہ نہ رکھو، مگر اس صورت میں کہ ایک دن قبل یا بعد کا بھی رکھو۔''[4] مسلم کی روایت میں ہے کہ ''نہ شبِ جمعہ کو قیام کے ساتھ خاص کرو اور نہ اس دن کو روزہ کے ساتھ اِلَّا یہ کہ کسی کے معمول میں جمعہ کا روزہ آ جائے۔''[5]

(۴) ہفتے کے دن کا بطورِ خاص روزہ رکھنا

سیدنا عبداللہ بن بُسر سلمی رضی اللہ عنہ اپنی بہن سیدہ صماء رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھا کرو اِلَّا یہ کہ فرض روزوں میں ہو، اور اگر سوائے انگور کے چھلکے یا درخت کی ٹہنی کے کچھ نہ لے تو اسے ہی چبا لو۔''[6] اسے احمد، اصحابِ سنن اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے، ترمذی نے حسن کہا اور کہا: اس میں معنائے کراہت یہ ہے کہ آدمی بطورِ خاص ہفتے کے دن روزہ رکھنا معمول بنا لے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ہفتے کا دن یہودیوں کے نزدیک تعظیم کا دن تھا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ اور اتوار کے دن باقی ایام کی نسبت اکثر روزے رکھا کرتے اور فرماتے: ''چونکہ یہ دونوں دن ان مشرکوں کی عید ہیں (جو عموماً اکل و شرب کے تہوار ہوتے ہیں) تو میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کروں۔''[7] اسے احمد، بیہقی، حاکم اور ابن خزیمہ نے نقل کیا جبکہ مؤخر الذکر دونوں نے صحیح قرار دیا۔ احناف، شوافع اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ ہفتہ کے دن کو ان ادلہ کے مدنظر روزے کے لیے خاص کرنا مکروہ ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے اس کے برخلاف رائے اختیار کی اور اکیلے (یعنی آگے پیچھے رکھے بغیر) ہفتے والے دن روزہ رکھنا بلا کراہت جائز قرار دیا، مگر حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ١٩٨٦؛ سنن أبي داود: ٢٤٢٢. [2] ضعيف، مسند البزار: ١٠٦٩؛ مجمع الزوائد: ٣/ ١٩٩.
[3] مصنف ابن ابی شيبه ٣/ ٤٤. [4] صحيح البخاري: ١٩٨٤؛ صحيح مسلم: ١١٤٣. [5] صحيح مسلم: ١٤٤.
[6] صحيح، سنن أبي داود: ٢٤٢١؛ سنن ترمذي: ٧٤٤؛ سنن ابن ماجه: ١٧٢٦. [7] ضعيف، مسند أحمد: ٣٢٤٦؛ صحيح ابن حبان: ٣٦٦.

⑤ شک کے دن کا روزہ رکھنے سے نہی

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے سیدنا ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔[1] اسے اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن وصحیح حدیث ہے اور اکثر اہلِ علم کے ہاں اسی پر عمل ہے اور یہی امام ثوری، امام مالک، امام ابن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے، ان سب نے مکروہ قرار دیا کہ کوئی اس دن کا روزے رکھے جس کے بارے میں شک ہے (کہ یہ رمضان کی یکم ہے یا شعبان کی تیس) ان کے اکثر کی رائے ہے کہ اگر رکھ لیا اور بعد میں ظاہر ہوا کہ رمضان کی یکم ہی تھی تو اس کی جگہ پھر روزہ رکھے (کیونکہ امر نبوی کا برخلاف کیا ہے) ہاں اگر یہ دن رمضان کا سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے معمول اور وظیفہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے رکھا تھا (اور دن کے وقت اطلاع آگئی کہ یہ رمضان کی یکم ہے) تب بغیر کراہت کے جائز ہے، چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''رمضان سے ایک یا دو دن قبل روزہ نہ رکھا کرو اِلّا یہ کہ ایسا دن ہو کہ معمول میں اس کا روزہ رکھتے ہو، تب رکھ لو۔''[2] اسے جماعت نے تخریج کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن صحیح ہے اور اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے انہوں نے مکروہ سمجھا ہے کہ رمضان شروع ہونے سے قبل (یعنی یہ واضح ہونے سے قبل کوئی رمضان کا سمجھ کر روزہ نہ رکھے کہ دن کو اطلاع اگر آگئی کہ آج رمضان کا پہلا دن ہے تو اس نے رکھا ہوا ہو ورنہ یہ نفلی بن جائے گا) لیکن اگر اس دن کا روزہ اس کے معمولات میں شامل ہے (یعنی شک کا دن سوموار یا جمعرات کا ہے اور اس کا معمول ہے کہ ہر ہفتے ان دنوں کا روزہ رکھتا ہے) اور اتفاقاً یہ شک والا دن ہوا تب حرج نہیں۔

⑥ صوم الدھر (یعنی روزانہ روزہ رکھنے) سے نہی

پورے سال کا ان ایام سمیت جن کا روزہ رکھنے سے شارع علیہ السلام نے نہی فرمائی ہے روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ آپ کا فرمان ہے: «لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ» ''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس کا کوئی روزہ نہیں۔''[3] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا، اگر عیدین اور ایامِ تشریق چھوڑ کر باقی تمام دن روزہ رکھتا ہے، تب کراہت نہیں اگر اس کی طاقت پاتا ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، اہل علم کی ایک جماعت نے صوم الدھر کو مکروہ جانا، اگر عیدین اور ایامِ تشریق کا بھی رکھتا ہے۔[4] جو ان مذکورہ ایام کا نہ رکھے (اور باقی سب کا رکھے) وہ حدِ کراہت سے خارج ہوا اور وہ صائم الدھر نہ کہلایا، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ سے یہی نقل کیا گیا، نبی کریم ﷺ نے سیدنا حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو سردِ صیام (یعنی روزانہ روزہ رکھنے) پر برقرار رکھا اور فرمایا: ''چاہو تو رکھو اور چاہو تو افطار کرو۔''[5] افضل طریقہ یہ ہے کہ ایک دن رکھے اور ایک دن چھوڑے، یہ اللہ کو زیادہ پسند ہے، آگے اس کا بیان آئے گا۔

---

① صحیح، سنن أبی داود: ٢٣٣٤؛ سنن ترمذی: ٦٨٦. ② صحیح البخاری: ١٩١٤؛ صحیح مسلم: ١٠٨٢.
③ صحیح البخاری: ١٩٧٧؛ صحیح مسلم: ١١٥٩. ④ سنن ترمذی: ٧٦٧. ⑤ صحیح، سنن أبی داود: ٢٤٠٢؛ سنن ابن ماجه: ١٦٦٢.

⑦ بیوی کا شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھنے کی کراہت مگر اس کی اجازت سے

نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ بیوی روزہ رکھے اور اس کا شوہر حاضر ہو (یعنی کہیں سفر پر نہیں) حتی کہ پہلے اس سے اجازت لے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''سوائے رمضان کے شوہر حاضر والی بیوی ایک دن کا روزہ بھی نہ رکھے مگر اس کی اجازت سے۔''[1] اسے شیخین اور احمد نے نقل کیا، علماء نے اس نہی کو تحریمی قرار دیا ہے اور شوہر کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ اگر اس کی بیوی نے بغیر اس کی اجازت کے روزہ رکھ لیا تو تڑوا دے، کیونکہ یہ اس کی حق تلفی ہے اور یہ غیرِ رمضان میں ہے، جیسا کہ حدیثِ ہذا میں مذکور ہوا، رمضان کے روزے رکھنے میں بیوی کو شوہر سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اسی طرح اگر شوہر غائب ہے، تب بھی رکھ سکتی ہے، لیکن اگر دن کے وقت وہ آ گیا تو چاہے تو اس کا روزہ تڑوا سکتا ہے، اسی طرح شوہر اگر بیمار ہے اور اس سے مباشرت سے عاجز ہے، تب بھی اجازت کی ضرورت نہیں۔

وصالِ صوم سے نہی

(بقول محشی وصال سے مراد کہ بعد دیگرے آگے پیچھے کئی روزے رکھنا بغیر افطاری کیے یا سحری کھائے) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: ''وصال سے بچو۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ بھی تو وصال کرتے ہیں! فرمایا: ''تم اس ضمن میں میری مثل نہیں، میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، تم وہی اعمال کیا کرو جن کی تم میں طاقت ہے۔''[2] اسے شیخین نے تخریج کیا، فقہاء نے اس نہی کو کراہت پر محمول کیا ہے، امام احمد، امام اسحاق اور امام ابن منذر رحمہ اللہ نے سحر تک وصال کرنا جائز قرار دیا اگر اس میں روزہ دار کے لیے مشقت نہ ہو (یعنی آٹھ پہر کا روزہ رکھے) کیونکہ بخاری کی سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''وصال مت کرو لیکن اگر کوئی کرنا ہی چاہے تو سحری تک کر لے۔''[3]

نفلی روزے

نبی کریم ﷺ نے درج ذیل دنوں کے روزے رکھنے کی ترغیب دلائی ہے:

① شوال کے چھ ایام کے روزے

سوائے بخاری اور نسائی کے باقی اہلِ جماعت نے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر ان کے ساتھ ہی شوال کے چھ بھی رکھ لیے تو گویا اس نے پورے سال کے

---

[1] صحيح البخاري: ٥١٩٢؛ صحيح مسلم: ١٠٢٦. [2] صحيح البخاري: ١٩٦٦؛ صحيح مسلم: ١١٠٣.
[3] صحيح البخاري: ١٩٦٣؛ سنن أبي داود: ٢٣٦١.

روزے رکھے۔''[1] امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک چاہے اکٹھے چھ دن رکھ لے یا پورے شوال میں پھیلا کر، کوئی ایک دوسرے کی نسبت افضل نہیں، لیکن حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں افضل یہ ہے کہ عید کے اگلے دن سے پے در پے چھ رکھے۔

② ذی الحجہ کے پہلے نو دن کے اور بطورِ خاص یوم عرفہ کا روزہ اور یہ سب غیر حجاج کے لیے ہیں

① سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یوم عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہ مٹا ڈالتا ہے، ایک پچھلے اور ایک آمدہ برس کے، جبکہ عاشوراء کا روزہ گزشتہ ایک برس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''[2] اسے ماسوائے بخاری اور ترمذی کے جماعت نے نقل کیا۔

② سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار معمولات کو کبھی نہ چھوڑا کرتے تھے: عاشورا، عشرۂ ذی الحجہ اور ہر مہینہ کے تین ایام (یعنی ایام بیض) کے روزے اور صبح کی دو سنتیں۔[3] اسے احمد اور نسائی نے نقل کیا۔

③ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یوم عرفہ، یوم نحر اور ایام تشریق ہم اہلِ اسلام کی عید ہیں اور یہ اکل وشرب کے ایام ہیں۔''[4] اسے سوائے ابن ماجہ کے جماعت نے نقل کیا اور ترمذی نے حسن قرار دیا۔

④ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں (یعنی حاجیوں کو) عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔[5] اسے احمد، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، ترمذی کہتے ہیں: اہلِ علم نے یوم عرفہ کا روزہ رکھنا مستحب قرار دیا ہے، لیکن عرفہ میں نہیں۔

⑤ سیدہ ام فضل رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: لوگوں کو عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں شک ہوا کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہیں یا نہیں؟ تو میں نے (شک دور کرنے کے لیے) آپ کی طرف دودھ بھیجا جو آپ نے نوش فرما لیا اور آپ اس وقت عرفہ میں لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے۔[6] (سرِ عام اس لیے پیا تاکہ کسی کو شک نہ رہے کہ آپ روزے سے ہیں اور دودھ اس لیے بھیجا، کیونکہ آپ کی عام عادت تھی کہ دودھ کا ہدیہ رد نہ کرتے تھے بلکہ دودھ رد نہ کرنے کا حکم بھی دیا)۔

محرم میں روزے رکھنا اور بطورِ خاص یوم عاشورا کا اور ایک دن اس سے قبل یا بعد کا بھی

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا: ''رات کے جوف (یعنی وسط) میں۔'' دوسرا سوال ہوا کہ رمضان کے بعد روزے کون سے افضل ہیں؟ فرمایا: ''اللہ کے مہینے کے جسے تم محرم کہتے ہو۔''[7] اسے احمد، مسلم اور ابوداود نے نقل کیا۔

---

① صحيح مسلم: ١١٦٤؛ سنن أبى داود: ٢٤٣٣. ② صحيح مسلم: ١١٦٢؛ سنن أبى داود: ٢٤٢٥. ③ ضعيف، سنن نسائى: ٤/ ٢٢٠؛ مسند أحمد: ٦/ ٢٨٧. ④ سنن أبى داود: ٢٤١٩؛ سنن ترمذى: ٧٧٣. ⑤ ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٧٣٢؛ سنن أبى داود: ٢٤٤٠. ⑥ صحيح البخارى: ١٩٨٨؛ صحيح مسلم: ١١٢٣. ⑦ صحيح مسلم: ١١٦٣؛ سنن أبى داود: ٢٤٢٩.

② سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک یہ یوم عاشورا ہے، اس دن کا روزہ تم پر فرض نہیں، البتہ میں نے رکھا ہے تو جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''[1] متفق علیہ۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: عاشورا کے دن کا روزہ قریش جاہلیت میں ہی رکھا کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ہجرت کے بعد بھی رکھا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا، جب رمضان کے روزے رکھنا فرض ہوا تو فرمایا: ''جو چاہے عاشورا کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''[2] متفق علیہ۔

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشورا کے دن کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے پوچھا یہ کس وجہ سے؟ کہنے لگے: یہ بڑا برکت والا دن ہے، اس دن اللہ نے سیدنا موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دلائی تھی تو سیدنا موسی علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا، آپ نے فرمایا: ''میں تم سے زیادہ موسیٰ کا حقدار ہوں۔'' تو اس کا روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا۔[3] متفق علیہ۔

⑤ سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: یہودی یوم عاشورا کی تعظیم کرتے اور اسے عید کے بطور مناتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ''تم اس کا روزہ رکھو (تا کہ ان کی مخالفت ہو)۔''[4] متفق علیہ۔

⑥ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشورا کا روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا تو عرض کی گئی: یا رسول اللہ! یہ ایسا دن ہے کہ یہود و نصاریٰ اس کی تعظیم کرتے ہیں، فرمایا: ''جب ان شاء اللہ اگلا سال آئے گا تو ہم نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے۔'' کہتے ہیں: لیکن اگلا محرم آنے سے پہلے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔[5] اسے مسلم اور ابوداود نے نقل کیا، ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں آئندہ محرم تک زندہ ہوا تو نویں کا روزہ رکھوں گا۔''[6] یعنی یوم عاشورا کے ساتھ۔ اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

علماء نے ذکر کیا کہ عاشورا کا روزہ تین مراتب پر ہے:

① ان تین ایام کا روزہ رکھیں: نویں، دسویں اور گیارہویں تاریخ کا۔

② نویں اور دسویں کا۔

③ صرف دسویں کا (گویا ایسا کوئی مذہب نہیں کہ صرف نویں تاریخ کا روزہ رکھا جائے، سنا ہے بعض علم کے مدعی حضرات کا عمل وفتوی یہ ہے کہ صرف نویں کا رکھا جائے، مذکورہ بالا سے ان کا رد ہوتا ہے)۔

عاشورا کے دن کھانے پینے میں توسع کرنا

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عاشورا کے دن اپنے نفس اور اہل پر

---

① صحيح البخاري: ٢٠٠٣؛ صحيح مسلم: ١١٢٩. ② صحيح البخاري: ٢٠٠٢؛ صحيح مسلم: ١١٣٠.
③ صحيح البخاري: ٢٠٠٤؛ صحيح مسلم: ١١٣٠. ④ صحيح البخاري: ٢٠٠٥؛ صحيح مسلم: ١١٣١.
⑤ صحيح مسلم: ١١٣٤؛ سنن أبي داود: ٢٤٤٥. ⑥ صحيح مسلم: ١١٣٤؛ سنن ابن ماجه: ١٧٣٧.

کشائش (توسع) کی تو اللہ سارا سال اسے کشائش عطا کرے گا۔'' [1] اسے بیہقی نے شعب میں اور ابن عبد البر نے تخریج کیا (بقول محشی اس کے سب طرق کا مدار دو متروک یا مجہول راویوں پر ہے تو یہ حدیث موضوع ہے) اس کے اور طرق بھی ہیں جو سب ضعیف ہیں، لیکن متعدد ہونے کے باوصف کچھ قوت حاصل ہے جیسا کہ سخاوی نے کہا۔

شعبان کے اکثر ایام کا روزہ رکھنا

نبی کریم ﷺ شعبان کے اکثر ایام کا روزہ رکھتے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے نہیں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے ماسوائے رمضان کے کسی مہینے کے سارے ایام کا روزہ رکھا ہو اور نہیں دیکھا کہ شعبان میں جتنے آپ روزے رکھتے تھے کسی اور ماہ میں اتنے روزے رکھتے ہوں۔ [2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جتنے کثیر روزے آپ شعبان میں رکھتے ہیں، اتنے میں نے آپ کو کسی اور مہینہ میں رکھتے نہیں دیکھا، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ ایسا مہینہ ہے کہ رجب (جو کہ جاہلیت ہی سے بڑا محترم سمجھا جاتا تھا) اور رمضان کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے لوگ اسے نظر انداز کرتے ہیں، حالانکہ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں اعمال رب العالمین کی طرف اٹھائے جاتے ہیں تو میری چاہت ہے کہ میرا عمل اس حال میں لے جایا جائے کہ میں روزے سے ہوں۔'' [3] اسے نسائی (اور احمد) نے نقل کیا اور ابن خزیمہ نے اس پر حکمِ صحت لگایا، لیکن پندرہ شعبان کا اسے افضل سمجھتے ہوئے بطورِ خاص روزہ رکھنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں (یعنی شبِ براءت کا وجود ثابت نہیں، اس سلسلہ میں جو روایات بھی ذکر کی جاتی ہیں وہ سب ضعیف ہیں)۔

حرمت والے مہینوں میں روزے

یہ چار مہینے ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب، ان میں کثرت سے روزے رکھنا مستحب ہے، باہلہ کے ایک شخص سے مروی ہے کہ وہ نبی اقدس ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں وہی شخص ہوں جو سال کے شروع میں آپ کے پاس آیا تھا، فرمایا: ''تم تو بڑی اچھی اور عمدہ ہیئت میں تھے، یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟ کہا: جب سے آپ سے جدا ہوا، صرف رات کو کھانا کھاتا تھا (یعنی روزانہ روزہ رکھتا رہا ہوں) فرمایا: ''کیوں اپنے آپ کو عذاب دیا۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''تم صرف شہرِ صبر (یعنی رمضان) کے پورے روزے رکھا کرو اور ہر ماہ میں ایک دن کا۔'' عرض کی: کچھ زیادہ کی اجازت دیں، مجھ میں قوت ہے، فرمایا: ''چلو دو دن'' عرض کی: مزید کی اجازت دیں، فرمایا: ''حرمت والے مہینوں میں روزے رکھو اور ترک کرو۔'' تین مرتبہ یہی الفاظ کہے اور اپنی تین انگلیوں کے ساتھ اشارہ کیا کہ انہیں اکٹھا کیا، پھر چھوڑا۔ [4] (بقول محشی یعنی اشارہ دیا کہ تین دن

---

[1] منكرًا جدًا، شعب الايمان: ٣٧٩١، الاستذكار: ١٠/ ١٤٠، رقم: ١٤٢٩٤. [2] صحيح البخاري: ١٩٧٠؛ صحيح مسلم: ١١٥٦. [3] حسن، سنن نسائي: ٤/ ٢٠١؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٠١. [4] ضعيف، سنن أبي داود: ٢٤٢٨؛ سنن ابن ماجه: ١٧٤١.

روزے رکھے اور تین دن چھوڑے رکھے) اسے احمد، ابو داود، ابن ماجہ اور بیہقی نے جید سند سے نقل کیا، دیگر مہینوں کی نسبت رجب کے مہینہ میں زیادہ روزے رکھنے کی کوئی زائد فضیلت نہیں، ماسوائے اس امر کے کہ وہ اشہرِ حرمت میں سے ہے، کسی صحیح روایت میں وارد نہیں کہ خصوصیت کے ساتھ رجب میں روزے رکھنے کی کوئی فضیلت ہو اور اس ضمن میں جو وارد ہیں وہ حجت کے قابل نہیں، بقول ابن حجر رحمہ اللہ اس کی یا اس کے روزوں کی یا اس کے کسی خاص دن کے روزہ رکھنے کی فضیلت اور نہ اس کی کسی خاص رات کے قیام کے بارے میں کوئی حجت کے قابل صحیح روایت وارد ہے۔ (جیسے کئی مساجد میں معراج کی مناسبت سے رجب کی ستائیسویں شب کے قیام کا باقاعدہ اعلان واہتمام ہوتا ہے)۔

سوموار اور جمعرات کے دنوں کا روزہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر سوموار اور جمعرات کے دن کا روزہ رکھتے تھے، کسی نے آپ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''اعمال ہر سوموار اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر مسلم۔ یا فرمایا: ہر مومن۔ کی مغفرت فرماتا ہے، ماسوائے ان دو کے جن کی ایک دوسرے سے قطع تعلقی ہو تو وہ کہتا ہے: ان دو کا معاملہ مؤخر کردو۔''[1] اسے احمد نے صحیح سند سے نقل کیا، صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوموار کے روزے کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ وہ دن ہے جس میں میری ولادت ہوئی اور مجھ پر وحی نازل ہوئی۔''[2]

ہر مہینے کے تین ایام کے روزے رکھنا

سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم ہر ماہ میں تین ایام کے روزے رکھا کریں اور یہ ایامِ بیض: تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے ہیں، پھر فرمایا: ''یہ سارا سال ہی روزہ رکھنے کے مترادف ہے۔''[3] اسے نسائی نے نقل کیا اور ابن حبان نے صحت کا حکم لگایا، آپ سے مروی ہے کہ آپ ایک ماہ کے ہفتہ، اتوار، سوموار کا اور اگلے ماہ کی منگل، بدھ اور جمعرات کا روزہ رکھتے،[4] اسی طرح ہر نئے مہینہ کی ابتدا میں تین ایام کا بھی[5] اور مہینہ کے شروع کی جمعرات کا بھی اور اس سے اگلی سوموار کا اور اس سے اگلی سوموار کا بھی روزہ رکھتے تھے۔[6]

ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن چھوڑنا

ابو سلمہ بن عبد الرحمن رحمہ اللہ سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے بتلایا گیا ہے کہ تم ساری ساری رات قیام کرتے ہو اور روزانہ روزہ رکھتے ہو؟'' عرض کی: ایسا ہی ہے، فرمایا: ''روزہ رکھو اور اسے چھوڑو بھی اور قیام کرو اور استراحت بھی کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی، بیوی کا بھی اور مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہیں کافی ہوگا کہ مہینہ

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ٢/ ٣٢٩. [2] صحیح مسلم: ١١٦٢/ ١٩٨؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٩٧. [3] حسن، سنن نسائی: ٤/ ٢٢٢؛ مسند أحمد: ٥/ ١٥٢؛ صحیح ابن حبان: ٣٦٥٦. [4] ضعیف، سنن ترمذی: ٧٤٦. [5] حسن، سنن أبی داود: ٢٤٥٠. [6] ضعیف، مسند أحمد: ٥٦٤٣؛ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے ضعیف قرار دیا۔

میں تین روزے رکھ لیا کرو۔'' کہتے ہیں: میں نے اپنے آپ پر سختی کی تو مجھ پر مشقت ہوگئی، عرض کی: یارسول اللہ! مجھ میں تین سے زیادہ روزے رکھنے کی قوت ہے، فرمایا: ''تب ہر جمعہ میں (یعنی ہر ہفتے، کاش! ہم بھی بجائے ہفتہ کہنے کے اس نبوی اصطلاح کو رواج دیں) تین روزے رکھ لیا کرو۔'' کہتے ہیں: میں نے اپنے آپ پر سختی کی اور اب مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے، عرض کی: یارسول اللہ! اس سے زائد کی قوت پاتا ہوں، فرمایا: ''تب صومِ داودی کو اپنا معمول بنا لو، اس سے زائد نہیں۔'' عرض کی: سیدنا داود علیہ السلام کے روزے کیا تھے؟ فرمایا: ''وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن نہ رکھتے تھے۔''① اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا (بخاری نے بالمعنی اسے نقل کیا) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ کو صومِ داودی محبوب تر ہے، اسی طرح تہجدِ داودی بھی، وہ آدھی رات تک سوئے رہتے، پھر اٹھتے اور ثلث رات تک قیام کرتے، پھر سدس سو جاتے، ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑتے تھے۔''②

نفلی روزہ توڑ لینا

① سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے روز ان کے ہاں تشریف لائے اور آپ کو پانی پیش کیا گیا اور آپ نے نوش کیا، پھر مجھے پکڑا دیا، میں نے کہا: میرا تو روزہ ہے، فرمایا: ''نفلی روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے تو جاری رکھے اور چاہے توڑ لے۔''③ اسے احمد، دارقطنی اور بیہقی نے تخریج کیا، حاکم نے بھی اور کہا: یہ صحیح الاسناد ہے۔

② سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سلمان فارسی اور سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم کی تھی تو ایک دفعہ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملنے ان کے گھر آئے تو دیکھا کہ ان کی اہلیہ سیدہ ام درداء رضی اللہ عنہا میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے ہیں، ان سے کہا: یہ کیا حالت بنائی ہے؟ کہنے لگیں، آپ کے بھائی ابودرداء رضی اللہ عنہ کو دنیا میں کوئی رغبت نہیں، سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ آئے تو طعام تیار کرایا اور ان سے کہا: آپ تناول کریں میرا تو روزہ ہے، وہ بولے: جب تک آپ نہ کھائیں گے، میں بھی نہ کھاؤں گا تو انہوں نے (روزہ توڑ دیا اور) کھانا کھایا، رات کو سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ تہجد کے لیے اٹھنے لگے تو سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ابھی سوتے رہو، پھر اٹھنا چاہا تو پھر کہا: ابھی سوتے رہو، جب رات کا آخری پہر ہوا تو کہا: اب اٹھ جاؤ تو دونوں نے تہجد ادا کی، پھر سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے سمجھایا کہ جس طرح تمہارے رب کا تم پر حق ہے، اسی طرح تمہارے نفس کا بھی حق ہے اور اہل کا بھی حق ہے تو ہر حق والے کو اس کا حق دو، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب آئے تو آپ کو اس کی خبر دی، آپ نے فرمایا: ''سلمان نے درست کہا۔''④ اسے بخاری اور ترمذی نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ طعام کی تو آپ مع چند صحابہ کے تشریف لائے،

---

① صحیح البخاری: ١٩٧٩؛ مسند أحمد: ٢/ ١٩٨. ② صحیح البخاری: ١١٣١؛ صحیح مسلم: ١١٥٩؛ سنن أبی داود: ٢٤٤٨. ③ صحیح، مسند أحمد: ٦/ ٣٤٣؛ سنن ترمذی: ٧٣٢. ④ صحیح البخاری: ١٩٦٨؛ سنن ترمذی: ٢٤١٣.

کھانا رکھا گیا تو ایک صاحب بولے: میں روزے سے ہوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بھائی نے تمہارے لیے تکلف کیا ہے، روزہ توڑ لو اور اس کی جگہ کسی اور دن روزہ رکھ لینا اور یہ بھی اگر چاہو تو ورنہ قضا ضروری نہیں۔''[1] اسے بیہقی نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: اکثر اہلِ علم ان صریح وصحیح احادیث سے استدلال کرتے ہوئے، نفلی روزہ رکھنے والے کے لیے اسے توڑ دینے کے جواز اور اس کی قضا دینے کے استحباب کے قائل ہیں۔

روزے کے آداب

روزے دار کے لیے مستحب ہے کہ درج ذیل آداب کا خیال رکھے:

① سحری

امت کا اس کے استحباب پر اجماع ہے اور اسے ترک کرنے والا گناہگار نہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''سحری کھایا کرو کیونکہ اس میں برکت ہے۔''[2] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، سیدنا مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سحری تناول کیا کرو کیونکہ یہ مبارک غذا ہے۔''[3] اسے نسائی نے جید سند کے ساتھ نقل کیا، برکت کا سبب یہ ہے کہ اس سے روزہ دار قوت ونشاط حاصل کرتا ہے اور روزہ نباہنا آسان ہو جاتا ہے۔

سحری کیسے ثابت ہوگی؟

سحری قلیل یا کثیر طعام کے ساتھ متحقق ہو جائے گی، چاہے ایک گھونٹ پانی پیا ہو، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سحری میں برکت ہے، اسے چھوڑا مت کرو چاہے کسی کو پانی کا ایک گھونٹ ہی ملے، بے شک اللہ سحری کھانے والوں پر رحمت کرتا ہے اور اس کے فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔''[4] اسے احمد نے نقل کیا۔

سحری کا وقت

سحری کھانے کا وقت آدھی رات سے لے کر طلوعِ فجر تک ہے اور مستحب یہ ہے کہ آخری وقت میں کھائی جائے، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سحری کھائی، پھر نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، راوی کہتے ہیں: میں نے پوچھا: اندازاً سحری کھانے کے کتنی دیر بعد؟ کہا: جتنی دیر میں پچاس آیات پڑھی جا سکیں۔[5] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ اصحابِ محمد ﷺ افطاری میں عجلت کرتے اور سحری آخری وقت میں تناول کیا کرتے

---

① حسن، السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٢٧٩. ② صحيح البخاري: ١٩٢٣؛ صحيح مسلم: ١٠٩٥.

③ صحيح، سنن نسائي: ٤/ ١٤٦. ④ حسن، مسند أحمد: ٣/ ١٢، ٤٤. ⑤ صحيح البخاري: ١٩٢١؛ صحيح مسلم: ١٠٩٧.

تھے،[1] اسے بیہقی نے صحیح سند سے نقل کیا، سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ''میری امت ہمیشہ بخیر رہے گی جب تک افطاری میں تعجیل اور سحری میں تاخیر کرتی رہے گی۔''[2] اس کی سند میں سلیمان بن ابوعثمان ہے جو مجہول ہے (بقول محشی بخاری میں روایت ہے: «وَلَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ» ''لوگ ہمیشہ خیر سے ہوں گے اگر غروب ہوتے ہی روزہ افطار کیا کریں گے۔'' اس سے واضح ہوا کہ شیعہ اہلِ خیر نہیں کیونکہ وہ افطاری میں تاخیر کرتے ہیں)۔

طلوعِ فجر میں شک ہونا

جب تک طلوعِ فجر کا یقین نہ ہو کھاتا پیتا رہ سکتا ہے، شک کی وجہ سے نہ رکے، کیونکہ اللہ نے اکل وشرب کی انتہا صبح کے واضح ہو جانے تک رکھی ہے تو فرمایا:

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''تم (سحری) کھاتے پیتے رہو حتی کہ صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ظاہر ہو جائے۔''

ایک شخص نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں سحری کھاتا رہتا ہوں تو جب شک ہو (کہ فجر طلوع ہوگئی یا نہیں) تو رک جاتا ہوں، وہ بولے: جب تک یقین نہ ہو جائے کہ فجر طلوع ہو چکی ہے تو کھا پی سکتے ہو، بقول ابوداود ابوعبداللہ (یعنی امام احمد کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کی کنیت بھی ابوعبداللہ تھی مگر وہ یہاں مراد نہیں) نے کہا: اگر فجر میں شک ہو تو کھا پی سکتا ہے جب تک یقین نہ ہو جائے اور یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاء، اوزاعی اور احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اصحابِ شافعی طلوعِ فجر میں شک کرنے والے کے لیے اکل وشرب کے جواز پر متفق ہیں۔

② جلدی افطار کرنا

روزہ دار کے لیے مستحب ہے کہ افطار میں جلدی کرے اور سورج غروب ہوتے ہی روزہ چھوڑ دے، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ ہمیشہ بخیر رہیں گے، جب تک افطار میں تعجیل کرتے رہیں گے۔''[3] اسے بخاری نے نقل کیا، مناسب یہ ہے کہ طاق عدد میں تازہ کھجوروں کے ساتھ افطار کرے، اگر نہیں پاتا تو تب پانی کے ساتھ، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تازہ کھجوروں کے ساتھ روزہ افطار کیا کرتے تھے اور اگر نہ ہوتیں تو ذرا پرانی کھجوروں کے ساتھ اور اگر یہ بھی نہ ہوتیں تو پانی کے چند گھونٹ پی لیتے،[4] اسے ابوداود نے نقل کیا اور حاکم نے صحیح اور ترمذی نے حسن کہا، سیدنا سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی روزے سے ہو تو کھجور کے ساتھ افطار کرے اور اگر نہ پائے تو پانی کے ساتھ کیونکہ پانی پاک ہے۔''[5] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح

---

① السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٢٣٨. ② ضعيف، مسند أحمد: ٥/ ١٤٦، ١٧٢. ③ صحيح البخاري: ١٩٥٧؛ صحيح مسلم: ١٠٩٨. ④ صحيح، سنن أبي داود: ٢٣٥٦؛ سنن ترمذي: ٦٩٦. ⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ٢٣٥٥؛ سنن ترمذي: ٦٩٥.

ہے، حدیث میں دلیل ہے کہ روزے کو نماز سے قبل اس مذکورہ کیفیت پر افطار کر لینا چاہیے اور نماز کے بعد کھانا کھالے، ہاں اگر کھانا حاضر ہے اور پیش کر دیا گیا ہے تب اس کے ساتھ ابتدا کرے، بقول سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کھانا پیش کر دیا گیا ہو تو نماز سے پہلے اسے تناول کر لو اور یہ نہ ہو کہ اس کی وجہ سے نماز میں عجلت کا مظاہرہ کرو۔''[1] متفق علیہ۔

③ افطار کے وقت روزے کی حالت میں دعا مانگنا

ابن ماجہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا: ''روزہ دار کی افطار کے وقت دعا رد نہیں کی جاتی۔''[2] سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ افطار کے وقت یہ دعا کرتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِرَحْمَتِكَ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْئٍ أَنْ تَغْفِرَ لِيْ'' اے اللہ! میں تیری رحمت کے مدنظر جو ہر چیز پر حاوی ہے، دعا گو ہوں کہ تو میری مغفرت فرما دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی ثابت ہے: «ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى» ''پیاس جاتی رہی، رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ اجر ثابت ہوا۔''[3] مرسلاً مروی ہے کہ آپ اس موقع پر یہ بھی کہا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ» ''اے اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے دیے رزق پر افطار کرتا ہوں۔''[4] ترمذی نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین افراد کی دعا رد نہیں کی جاتی: روزہ دار کی حتی کہ افطار کرے، عادل حکمران کی اور مظلوم کی۔''[5]

④ روزے کے منافی کاموں سے احتراز کرنا

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو افضل تقرُّبات میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے مشروع کیا تاکہ نفس کی تہذیب ہو اور وہ خیر کا عادی بنے تو روزہ دار کو چاہیے کہ ایسے افعال سے بچے جو روزہ مخدوش کرتے ہیں، تاکہ وہ اس عبادت کے ساتھ متنفع ہو اور اس کے لیے تقویٰ حاصل ہو، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾(البقرة:١٨٣)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

کیونکہ روزہ صرف اکل و شرب سے رک جانے کا نام نہیں، بلکہ ان سے بھی اور ان سب سے جن سے اللہ نے نہی فرمائی، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''روزہ صرف اکل و شرب سے (پرہیز) نہیں، بلکہ اصل روزہ لغو و رفث سے (پرہیز) ہے، اگر روزہ دار سے کوئی لڑے یا گالی گلوچ کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، میں روزے سے ہوں۔''[6] اسے ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے، سوائے مسلم کے جماعت

---

① صحيح البخاري: ٦٧٢؛ صحيح مسلم: ٥٥٧. ② ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٧٥٣. ③ حسن، سنن أبي داود: ٢٣٥٨؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٢٢. ④ ضعيف، سنن أبي داود: ٢٣٥٨. ⑤ ضعيف، سنن ترمذي: ٣٥٩٨؛ سنن ابن ماجه: ١٧٥٢. ⑥ صحيح، صحيح ابن خزيمة: ١٩٩٦؛ صحيح ابن حبان: ٣٤٧٠.

نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے قولِ زُور (یعنی جھوٹی اور غلط بات کو) نہ چھوڑا اور نہ اس پر عمل کرنا چھوڑا، تو اللہ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑے۔''[1] انہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں کہ انہیں روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں اور کتنے ہی قیام میں رات گزارنے والے ہیں کہ بجز بیداری کے انہیں کچھ نہیں ملتا۔''[2] اسے نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا کہ یہ شرطِ بخاری پر ہے۔

⑤ مسواک کرنا

روزے کی حالت میں مسواک کرنا مستحب ہے اور اس سلسلہ میں دن کے شروع اور اس کے آخر میں فرق نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ نے شروع نہار یا اس کے آخر میں مسواک کرنا باعثِ حرج نہیں سمجھا، نبی کریم ﷺ روزے کی حالت میں مسواک کرلیا کرتے تھے۔[3] پہلے بھی اس کا ذکر گزرا ہے۔

⑥ اثنائے روزہ دریا دلی اور سخاوت کا مظاہرہ کرنا اور قرآن کا دَوْر کرنا

ویسے تو یہ ہر وقت ہی مستحب ہے، لیکن رمضان میں ان کی زیادہ تاکید ہے، بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ سب سے بڑھ کر سخی تھے اور آپ ماہِ رمضان میں تو نہایت سخاوت کا مظاہرہ کرتے تھے، بالخصوص سیدنا جبریل علیہ السلام کی ملاقات پر اور وہ رمضان میں ہر رات آپ سے ملاقات کو آتے تھے تو آپ سے دورۂ قرآن کرتے اور نبی کریم ﷺ کی سخاوت آندھی سے بھی تیز ہو جاتی تھی۔[4]

⑦ رمضان کے آخری عشرے میں عبادت میں خاص محنت کرنا

بخاری اور مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ جب رمضان کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو آپ شب بیداری کرتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے اور کمر کس لیتے۔[5] مسلم کی ایک روایت میں ہے جتنی محنت آپ آخری عشرہ میں کرتے اتنی کوئی اور ایام میں نہ کرتے۔[6] ترمذی نے صحت کا حکم لگایا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ آخری عشرہ میں گھر والوں کو بھی بیدار رکھتے اور عبادت پر کمر کس لیتے تھے۔[7]

روزے کے مباحات

روزے کی حالت میں درج ذیل امور مباح ہیں:

---

① صحيح البخاري: ١٩٠٣؛ سنن أبي داود: ٢٣٦٢. ② صحيح، سنن ابن ماجه: ١٦٠٩؛ صحيح ابن خزيمة: ١٩٩٧. ③ ضعيف، سنن أبي داود: ٢٣٦٤؛ سنن ترمذي: ٧٢٥. ④ صحيح البخاري: ١٩٠٢؛ صحيح مسلم: ٢٨٠٣. ⑤ صحيح البخاري: ٢٠٢٤؛ صحيح مسلم: ١١٧٤. ⑥ صحيح مسلم: ١١٧٥؛ سنن ترمذي: ٧٩٦. ⑦ صحيح، سنن ترمذي: ٧٩٥؛ مسند أحمد: ١/ ٩٨، ١٢٧.

① نہانا اور پانی میں غوطہ لگانا

ابوبکر بن عبدالرحمن نے بیان کیا: کسی صحابی نے انہیں خبر دی کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ روزے کی حالت میں اپنے سر مبارک پر بوجہ پیاس یا گرمی کے پانی ڈالتے تھے۔[1] اسے احمد، مالک اور ابو داود نے صحیح سند سے نقل کیا، صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ حالتِ جنابت میں صبح کرتے اور روزہ رکھتے، پھر غسل کرتے۔[2] اگر روزہ دار کے پیٹ میں بغیر قصد کے پانی چلا جائے تو اس سے اس کے روزے میں فرق نہیں پڑے گا۔

② سرمہ لگانا یا دوائی ٹپکانا

یہ جائز ہے، چاہے حلق میں اس کا ذائقہ محسوس ہو، کیونکہ آنکھ سے پیٹ کی طرف کوئی راستہ نہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ روزے کی حالت میں سرمہ ڈال لیتے تھے۔[3] یہی شافعیہ کا مسلک ہے، امام ابن منذر رحمہ اللہ نے اسے امام عطاء، حسن، نخعی، اوزاعی، ابوحنیفہ اور ابوثور رحمہم اللہ سے بھی نقل کیا، سیدنا ابن عمر، انس اور ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے اور امام داود رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب تھا، اس باب میں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ کچھ منقول نہیں۔[4]

③ بیوی کو بوسہ دینا

یہ اس کے لیے جائز ہے جسے اپنے آپ پر قابو ہو، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کو بوسہ دے لیتے اور ساتھ لپٹا بھی لیتے اور انہیں اپنے آپ پر بہت قابو تھا۔[5] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ روزے کی حالت میں بیوی کو بوسہ دے دیا، پھر گھبرا کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: آج ایک بڑا کام کر بیٹھا ہوں، وہ یہ کہ روزے کی حالت میں بوسہ دیا ہے، فرمایا: ''کیا خیال ہے کہ اگر روزے کی حالت میں کلی کرو تو؟'' عرض کیا: اس میں کیا حرج ہے؟ فرمایا: ''تو اس میں بھی (کوئی حرج نہیں)۔''[6] امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بوسے کے بارے میں سیدنا عمر، ابن عباس، ابو ہریرہ، عائشہ رضی اللہ عنہم، عطاء، شعبی، حسن، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے رخصت دی ہے، حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ جس کی شہوت متحرک ہے اس کے لیے یہ مکروہ ہے دیگر کے لیے نہیں، لیکن اولیٰ یہی ہے کہ ایسا نہ کرے، اس ضمن میں جوان اور بوڑھے کے مابین فرق نہیں اعتبار تحریکِ شہوت اور خوفِ انزال کا ہے تو اگر جوان یا بوڑھے صحت مند و قوی کی شہوت متحرک ہو تب مکروہ ہے وگرنہ نہیں، بہر حال اولیٰ اس کا ترک ہے چاہے چہرے کو دے یا منہ کو یا کسی اور جگہ، لمس اور معانقہ کا بھی یہی حکم ہے۔

---

① صحيح، سنن أبي داود: ٢٣٦٥؛ مسند أحمد: ٣/ ٤٧٥. ② صحيح البخاري: ١٩٢٥؛ صحيح مسلم: ١١٠٩.
③ حسن، سنن أبي داود: ٢٣٧٨. ④ سنن ترمذي: ٧٢٦. ⑤ صحيح البخاري: ١٩٢٧؛ صحيح مسلم: ١١٠٦.
⑥ صحيح، سنن أبي داود: ٢٣٨٥؛ مسند أحمد: ١/ ٢١.

④ ٹیکہ لگوانا

یہ مطلقاً جائز ہے چاہے طاقت کا ہو یا نہیں اور چاہے رگ میں لگوائے یا جلد کے نیچے کیونکہ یہ اگرچہ پیٹ تک پہنچ جاتا ہے، لیکن معتاد راستے کے ذریعے نہیں (اصح یہ ہے کہ طاقت کا ٹیکہ لگوانا درست نہیں اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، مترجم۔)

⑤ سینگی لگوانا

نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں سینگی لگوائی ہے، لیکن اگر اس سے روزہ دار کو کمزوری ہو تب مکروہ ہے، ثابت بنانی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ لوگ عہدِ نبوی میں روزہ دار کے لیے سینگی لگوانا مکروہ کہتے تھے؟ کہا: نہیں! لیکن اگر کمزوری ہوتی تب (نہیں لگواتے تھے)۔[1] اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا، فصد کا بھی یہی حکم ہے (بقول محشی سینگی سر سے خون نکلوانا اور فصد کسی اور عضو سے)۔

⑥ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

یہ جائز ہے (کیونکہ یہ وضو کا حصہ ہے) لیکن زیادہ شدت سے ڈالنا مکروہ ہے، چنانچہ سیدنا لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب ناک میں (وضو کرتے ہوئے) پانی ڈالو تو مبالغہ کرو اِلَّا یہ کہ روزے سے ہو۔''[2] اسے اصحابِ سنن نے نقل کیا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حسن صحیح ہے، اہلِ علم نے روزہ دار کے لیے ناک میں دوائی ڈالنا مکروہ قرار دیا ہے، ان کی رائے میں اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، حدیث سے ان کی رائے کو تقویت ملتی ہے، امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول اگر وضو کے دوران میں کلی یا ناک میں پانی ڈالا اور وہ حلق تک پہنچ گیا بغیر قصد کے اور اس نے مبالغہ بھی نہیں کیا تھا، تب یہ ضار نہیں، یہی امام اوزاعی، امام اسحاق کا قول جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا دو میں سے ایک قول یہی ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے، جبکہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا، کیونکہ اسے اپنا روزہ دار ہونا یاد تھا، اس کے باوجود پانی پیٹ تک پہنچایا، لہٰذا مفطر ہو گیا، یہ اس کی مثل ہے جس نے عمداً پانی پی لیا، امام ابن قدامہ رحمہ اللہ اول رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ہمارے نزدیک اگر اس کا قصد نہ تھا اور مبالغہ بھی نہ تھا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے مکھی اس کے حلق تک پہنچ جائے۔ (بقول محشی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ تھا کہ اگر روزہ دار کے حلق تک مکھی پہنچ گئی تو روزہ نہ ٹوٹے گا) تو اس کے ساتھ متعمد سے اس کا فرق ہے۔

⑦ وہ چیزیں مباح ہیں جن سے احتراز ممکن نہیں، مثلاً: تھوک نگلنا، راستوں کا غبار، آٹے کا چھان، کھنکھار اور اس کے نحو، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کوئی حرج نہیں کہ کھانا چکھ لے (کہ نمک مرچ کیسی ہے، پھر جلدی سے تھوک دے)

---

[1] صحيح البخاري: ١٩٣٨، سنن أبي داود: ٢٣٧٢؛ سنن ترمذي: ٧٧٥. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٢٣٦٦؛ سنن ترمذي: ٧٨٨.

اسی طرح اگر کوئی چیز خرید رہا ہو تو چکھ سکتا ہے، امام حسن رحمہ اللہ روزے کی حالت میں اپنے پوتے کو اخروٹ کی گری چبا کر کھلاتے تھے، امام نخعی رحمہ اللہ نے بھی اس کی رخصت دی ہے، البتہ عِلک (یعنی ببل گم اور گوند وغیرہ) کا چبانا مکروہ ہے، اگر اس سے اجزا الگ پرزہ پرزہ نہیں ہوتے، اس کی کراہت کے قائلین میں امام شعبی، نخعی، احناف، شافعی اور حنابلہ ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اور امام عطاء رحمہ اللہ نے اس کے چبانے میں رخصت دی، کیونکہ یہ پیٹ تک نہیں پہنچتی تو یہ ایسے ہی ہے جیسے اپنے منہ میں کنکری رکھی، یہ تب ہے اگر اس کے اجزا زبان کی رطوبت میں خلط نہ ہوں، لیکن اگر ہوں اور پیٹ تک پہنچیں تب روزہ ٹوٹ جائے گا، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: خوشبوئیں سونگھنے میں حرج نہیں، لیکن سرمہ لگانا، ٹیکہ لگوانا اور اگر روزہ دار کی احلیل (یعنی پیشاب کے سوراخ) میں دوا ڈالی جائے اور مامومہ اور جائفہ (یہ ایک نوع کے زخم ہیں آگے ان کی تشریح آئے گی) کی مداوات کی جائے تو اس میں اہلِ علم کے ہاں اختلافِ آراء ہیں، بعض کے ہاں ان میں سے کوئی چیز روزہ توڑنے والی نہیں، بعض کے ہاں ان سب مذکورہ سے روزہ ٹوٹ جائے گا، بعض کے ہاں تقطیر (یعنی دوا کے قطرے ڈالنے) سے نہیں باقی سب سے ٹوٹ جائے گا، بعض کے ہاں سرمہ اور تقطیر سے نہیں باقی سب سے، اول رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا: اظہر یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ روزہ اسلام کا اہم رکن ہے، جس کی معرفت کے عام وخاص محتاج ہیں تو اگر حالتِ روزہ میں یہ امور حرام ہوتے اور روزہ ان کے ساتھ فاسد ہوتا تو واجب تھا کہ شارع علیہ السلام ان کا بیان کرتے اور اگر ذکر کیا ہوتا تو صحابہ کو اس کا علم ہوتا اور وہ امت کو اس کی آگاہی دیتے، جیسے دیگر پوری شرع کی دی ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں صحیح، ضعیف، مسند اور مرسل کوئی روایت بھی منقول نہیں تو واضح ہوا کہ اس میں سے کوئی چیز بھی مفطر نہیں، لکھتے ہیں: ایسے احکام جن کے ساتھ عمومِ بلویٰ ہوتا ہو (یہ ایک فقہی اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہے، مفادِ عامہ میں کسی مسئلہ کا ہونا یا فتویٰ دینا) تو ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا عام بیان فرماتے تو معلوم امر ہے کہ سرمہ وغیرہ انہی امور میں سے ہیں جن کے ساتھ عمومِ بلویٰ ہے، جیسے: تیل لگانا، نہانا، بخور (یعنی خوشبودار دھونی لینا) اور خوشبو لگانا تو اگر یہ اشیا مفطرِ صوم ہوتیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تبیین کا ذکر کرتے، جیسے دیگر مفطرات کا کیا ہے جب نہیں کیا تو واضح ہوا کہ یہ خوشبو، بخور اور تیل لگانے جیسی ہیں، بخور کبھی ناک میں چڑھ جاتی اور دماغ تک جا پہنچتی ہے، اسی طرح تیل بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور انسان کو اس سے قوت حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح کی تقویت خوشبو کے ساتھ بھی ملتی ہے تو جب ان سے روزہ دار کو منع نہیں کیا گیا تو یہ ان کے جوازِ استعمال پر بھی دلیل ہے، عہد نبوی میں مسلمانوں کو مامومہ اور جائفہ زخم لگتے، جہاد میں یا دیگر میں تو اگر یہ روزے کے لیے مفطر ہوتے تو اس کی تبیین منقول ہوتی، پھر سرمہ لگانا تغذیہ نہیں اور نہ یہ پیٹ تک پہنچتا ہے تو اسی طرح حقنہ (یہ پیٹ صاف کرنے کے لیے مقعد سے کسی دوا کو داخل کرنا، بقول محشی ان کی مراد حقنہ شرجیہ ہے جس سے روزہ نہیں ٹوٹتا) بھی مغذی نہیں بلکہ یہ بدن میں سے فاسد مواد نکالتا ہے، جیسے کوئی جلاب لے لے یا ایسی گھبراہٹ طاری ہو جو اس کے پیٹ کے اسہال کا موجب بنے اور یہ معدہ تک بھی نہیں پہنچتی اور مامومہ اور جائفہ زخموں کے علاج کی دوا جو معدہ تک پہنچتی ہے، وہ

غذا کے مشابہ نہیں (بقول محشی جائفہ وہ زخم جو پیٹ تک پہنچا ہو اور مامومہ سر میں لگا زخم جوام الدماغ تک جا پہنچا، ان کی مداوات تغذیہ نہیں) اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزے فرض کیے گئے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَلصَّوْمُ جُنَّةٌ» ''روزہ ڈھال ہے۔''[1] روزہ دار کو کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ کھانے پینے سے تقویت حاصل ہوتی ہے، خون کثرت سے بنتا ہے جس میں شیطان دوڑتا ہے، جیسا کہ فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ فَضَيِّقُوْا مَجَارِيَهُ بِالْجُوْعِ وَالصَّوْمِ» ''شیطان انسان کے جسم میں خون کی مانند گردش کرتا ہے، تم بھوکے رہنے اور روزہ رکھنے کے ساتھ اس کی اس گردش میں تنگی کرو۔''[2] تو یہ کھانے پینے کی وجہ سے ہے نہ کہ سرمہ اور حقنہ لگانے سے اور شرمگاہ میں دوا ٹپکانے اور نہ زخموں کے علاج سے۔

⑧ روزہ دار کے لیے (غروبِ آفتاب تا) طلوعِ فجر تک کھانا پینا اور جماع مباح ہے، اگر صبح طلوع ہوگئی اور اس کے منہ میں لقمہ ہے تو ضروری ہے کہ اسے نکال دے یا اگر جماع میں تھا تو فوراً علیحدہ ہو جائے، اگر (اذان ہونے کے بعد) جان بوجھ کر لقمہ نگل لیا یا جماع میں جاری رہا تو روزہ نہ ہوگا، بخاری اور مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بلال رات کی اذان دیتے ہیں تو کھاؤ پیو حتی کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔''[3] (یعنی اذان دینا شروع کریں، یہ نہیں کہ جیسے کثیر لوگ سمجھتے ہیں: ''حی علی الصلاۃ'' تک کھانا پینا جاری رکھ سکتے ہیں بلکہ پہلی اللہ اکبر کے ساتھ ہی یہ سلسلہ موقوف کرنا ہوگا کیونکہ اس کی غایت طلوعِ فجر بنائی ہے تو طلوع ہوتے ہی جس کا علم ہمیں مؤذن کی اللہ اکبر سے ہوتا ہے)۔

⑨ روزہ دار کے لیے مباح ہے کہ حالتِ جنابت میں سحری تناول کرے (اور نماز کے وقت نہالے) اس کے بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت گزر چکی ہے۔

⑩ حائضہ اور نفساء کا خون اگر رات کے کسی وقت بند ہو گیا تو ان کے لیے جائز ہے کہ غسل کو صبح تک مؤخر کر لیں اور اس حالت میں روزہ رکھ لیں اور بعد میں نماز کے لیے غسل وتطہر کر لیں۔

روزہ فاسد اور باطل کرنے والی اشیا

ان کی دو قسمیں ہیں:

(الف) جو روزہ باطل کر دیں گی اور قضا واجب ہوگی۔

---

① صحیح البخاري: ۱۹۰٤؛ صحیح مسلم: ۱۱۵۱. ② صحیح البخاري: ۲۰۳۵؛ صحیح مسلم: ۲۱۷٤.
③ صحیح البخاري: ٦۲۲، ۱۹۱۸؛ صحیح مسلم: ۱۰۹۲.

(ب) ابطال وقضا کے ساتھ ساتھ کفارہ بھی لازم ہوگا۔

(الف) اول درج ذیل امور ہیں:

①، ② جان بوجھ کر کھانا پینا، اگر بھول کر یا غلطی سے یا کسی کے مجبور کرنے پر کھا پی لیا، تب نہ قضا ہے اور نہ کفارہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا تو وہ روزہ پورا کرے، یہ اللہ نے اسے کھلایا اور پلایا ہے۔''[1] اسے جماعت نے نقل کیا۔ بقول امام ترمذی رحمہ اللہ: اکثر اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے یہ امام ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا مسلک تھا، دارقطنی، بیہقی اور حاکم نے کہا کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رمضان میں بھول کر روزہ توڑ لیا تو اس پر نہ قضا ہے اور نہ کفارہ۔''[2] بقول امام ابن حجر رحمہ اللہ اس کی سند صحیح ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے میری امت سے خطا اور بھول چوک معاف کی ہے اور وہ بھی جس پر انہیں مجبور کیا گیا ہو۔''[3] اسے ابن ماجہ، طبرانی اور حاکم نے تخریج کیا۔

③ عمداً قے کرنا

اگر قے کا غلبہ ہوا گیا (یعنی بغیر اس کے چاہے آگئی) تب اس کے ذمے نہ قضا ہے اور نہ کفارہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس پر قے غالب ہوئی اس پر قضا نہیں (یعنی اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) لیکن جس نے عمداً قے کی وہ قضا دے (اس کا روزہ ٹوٹ گیا)۔''[4] اسے احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا اور حاکم نے صحیح قرار دیا، امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کے بارے میں اہل علم کے مابین کسی اختلاف سے میں واقف نہیں، سب متفق ہیں کہ بغیر چاہے اگر قے آگئی تو قضا نہیں، لیکن جس نے عمداً کی اس کے ذمے قضا ہے۔

④، ⑤ حیض ونفاس

ان سے روزہ ٹوٹ جائے گا چاہے غروب آفتاب سے کچھ لحظہ قبل آیا، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

⑥ استمناء (یعنی قصداً منی نکالنا)

چاہے اس کا سبب بیوی کے ساتھ بوس وکنار کرنا ہو یا ساتھ لیٹنا یا ہاتھ کے ساتھ نکالنا (یعنی جلق) اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا واجب ہے، اگر اس کا سبب مجرد نظر یا فکر ہو (یعنی شہوت کی وجہ سے سوچا تو منی نکل آئی) تب یہ ایسے ہی جیسے

---

① صحیح البخاری: ۱۹۲۳؛ صحیح مسلم: ۱۱۵۵. ② حسن، سنن الدارقطنی: ۲/ ۱۷۸؛ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ۲۲۹. ③ سنن ابن ماجه: ۲۰٤٥؛ المستدرك للحاكم: ۲/ ۱۹۸. ④ صحیح، سنن أبی داود: ۲۳۸۰؛ سنن ترمذی: ۷۲۰؛ سنن ابن ماجه: ۱٦۷٦.

دن میں (سوتے وقت) احتلام ہوگیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا اور نہ کوئی چیز واجب ہے، مذی خارج ہونے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر۔

⑦ غذائیت والی چیز کو تناول کرنا

پیٹ تک پہنچانے کے راستے سے جو کہ اس غرض کے لیے عموماً مستعمل ہے، جیسے کوئی نمک کی خاصی مقدار پھانک لے تو اس سے اکثر اہلِ علم کے مطابق روزہ ٹوٹ جائے گا۔

⑧ روزہ توڑنے کی نیت کرنا

کوئی روزے کی حالت میں تھا اگر چہ کوئی چیز تناول نہیں کی مگر نیت توڑنے سے اس کا روزہ اب نہ رہا، کیونکہ نیت روزے کے ارکان میں سے ایک رکن ہے تو جب اس کا نقض کیا افطار کا قصد و تعمد کرتے ہوئے تو لامحالہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔

⑨ اگر یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہوگیا ہے، کھا پی لیا یا یہ خیال کر کے کہ ابھی سحری کا وقت باقی ہے تو اس کے برخلاف ظاہر ہوا تو جمہور علماء کے نزدیک اس کے ذمے قضا ہے، آئمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے، جبکہ امام اسحق، داود، ابن حزم، عطاء، عروہ، حسن بصری اور مجاہد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اس کا روزہ برقرار ہے اور اس کے ذمہ قضا نہیں، کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾(الأحزاب:٥)

''جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو، (اس پر مواخذہ ہے)''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِيْ اَلْخَطَأَ)) ''اللہ نے میری امت سے غلطی سے کوئی فعل ہو جانے کو قابلِ مواخذہ نہیں رکھا۔'' عبد الرزاق نے معمر عن اعمش عن زید بن وہب سے نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک دفعہ لوگوں نے روزہ افطار کیا اور موسم ابر آلود تھا، افطاری کے بعد بدلی کے پیچھے سے سورج نکل آیا تو لوگوں پر یہ بہت شاق ہوا کہنے لگے کہ ہم آج کی قضا دیں گے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں؟ اللہ کی قسم! ہم نے جان بوجھ کر یہ نہیں کیا۔[1] بخاری نے سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا، کہتی ہیں: ایک روز عہدِ نبوی میں موسم ابر آلود تھا، ہم نے اندازے سے کہ غروب ہو چکا ہے روزہ افطار کر لیا، پھر سورج نکل آیا۔[2] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بقول یہ دو اشیا پر دال ہے: اول کہ موسم ابر آلود ہو تو یہ سوچ کر کہ یقینی طور پر غروب کا پتہ چلے تاخیر مستحب نہیں کیونکہ صحابہ نے یہ نہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا حکم نہ دیا، دوم کہ ان پر قضا لاگو نہ ہوگی، کیونکہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کا حکم دیا ہوتا تو یہ منقول و مشہور ہوتا، جیسے ان کا افطار کرنا ہوا تو جب منقول نہیں تو واضح ہوا کہ آپ نے اس کا حکم نہ دیا تھا۔

ب) دوسری قسم جو روزے کا ابطال کر کے قضا اور کفارہ کی موجب ہے، جمہور کے نزدیک یہ فقط ایک ہے اور وہ ہے جماع کرنا،

---

[1] مصنف عبدالرزاق: ٤/ ١٧٩، رقم: ٧٣٩٥. [2] صحيح البخاري: ١٩٥٩.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں تو مارا گیا! فرمایا: ''کیا ہوا؟'' کہا: میں نے روزے کی حالت میں جماع کرلیا ہے، آپ نے فرمایا: ''کیا گردن آزاد کرنے کی استطاعت ہے؟'' کہا: نہیں! فرمایا: ''کیا دو ماہ کے پے در پے روزے رکھ سکتے ہو؟ کہا: نہیں! فرمایا: ''کیا ساٹھ مسکینوں کو طعام دے سکتے ہو؟'' عرض کی: نہیں! پھر وہ بیٹھ گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوروں سے بھرا ایک ٹوکرا لایا گیا تو اسے دیا اور فرمایا: ''اسے صدقہ کردو۔'' وہ کہنے لگا: کیا ہم سے بھی زیادہ فقیر کوئی ہوگا؟ مدینہ کا کوئی گھر ہم سے بڑھ کر محتاج نہیں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، حتی کہ دندان مبارک نظر آئے، پھر فرمایا: ''جاؤ اپنے اہل کو کھلا دو۔''[1] (بقول محشی اس کے ساتھ استدلال ہوا کہ تنگ دستی کی وجہ سے کفارہ ساقط ہوجاتا ہے، یہ شافعی کا دو میں سے ایک قول ہے، احمد کا مشہور مذہب بھی یہی ہے اور بعض مالکیہ کا اسی پر جزم ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک تنگ دستی کے باعث کفارہ ساقط نہ ہوگا) اسے جماعت نے نقل کیا، جمہور کا مذہب یہ ہے کہ شوہر کے ساتھ ساتھ بیوی پر بھی کفارہ دینا واجب ہے، اگر اس کی بھی مرضی شامل تھی، اگر اختیار سے عمداً جماع کیا تھا اور یاد تھا کہ رمضان ہے اور ان کا روزہ ہے، لیکن اگر بھولے سے کرلیا یا مختار نہ تھے کہ اس پر انہیں مجبور کیا گیا، یا ان دونوں کی نیت روزے کی نہ تھی تب کسی پر بھی کفارہ عائد نہیں، اگر بیوی کی مرضی نہ تھی، شوہر نے مجبور کیا یا وہ کسی عذر کے باعث روزہ نہ رکھے ہوئے تھی تب صرف شوہر پر کفارہ عائد ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بیوی پر مطلقاً ہی کفارہ عائد نہیں، نہ اس صورت میں کہ اس کی مرضی شامل تھی اور نہ حالتِ اکراہ میں، اسے صرف قضا لازم ہے، بقول امام نووی رحمہ اللہ بالجملہ اصح یہ ہے کہ صرف شوہر کے ذمے کفارہ ہے اس کے اپنے نفس کا، بیوی پر کوئی چیز عائد نہیں۔ اس لیے کہ یہ حقِ مال ہے جو جماع کے ساتھ مختص ہے تو شوہر پر ہی یہ لاگو ہے نہ کہ بیوی پر بھی مہر کی طرح، امام ابوداود رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام احمد رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ اگر کسی نے رمضان میں روزہ رکھ کر جماع کرلیا تو کیا بیوی کے ذمہ بھی کفارہ ہے؟ کہا: ہم نے نہیں سنا کہ بیوی پر بھی عائد ہوتا ہے (بقول محشی یہ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول دو میں سے ایک روایت ہے) المغنی میں ہے: اس کی وجہ یہ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صرف شوہر کو حکم دیا کہ ایک گردن آزاد کرائے (ساٹھ مساکین کا کھانا دے یا دو ماہ کے پے در پے روزے رکھے) عورت کو اس میں سے کوئی حکم نہیں دیا تھا، حالانکہ علم تھا کہ وہ بھی شریک ہے۔

جمہور کے نزدیک کفارہ دینے کی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے جو اس حدیث میں مذکور ہوئی کہ اولاً گردن آزاد کرانا واجب ہے، اگر اس سے عاجز ہوا تو دو ماہ کے پے در پے روزے رکھے اور اگر ان سے بھی عاجز ہوا تو ساٹھ مساکین کو کھانا دے، اس اوسط سے جو خود اس کے گھر میں مستعمل ہے (امام احمد رحمہ اللہ کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ فی کس گندم کی ایک مد یا کھجور اور جو وغیرہ کا نصف صاع دے)، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ قائل ہیں کہ گندم کا نصف صاع اور دیگر کا ایک صاع دے، امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ نے کہا: ہر نوع کا ایک مد اور یہی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، عطاء، اوزاعی رحمہم اللہ کی رائے تھی اور یہی اظہر ہے کیونکہ جو ٹوکرا

---

[1] صحيح البخاري: ٢٦٠٠؛ صحيح مسلم: ١١١١.

اس شخص کو دیا اس میں پندرہ صاع کھجوریں سما سکتی تھیں اور ایک سے دوسری حالت میں منتقل ہونا درست نہیں، مگر اس شکل میں کہ اس سے عاجز ہو، مالکیہ کا مذہب یہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے کہ وہ ان تین کے مابین مخیر ہے، جو بھی کرے وہ جائز ہے، کیونکہ امام مالک اور امام ابن جریج رحمہما اللہ نے حمید بن عبدالرحمن عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے رمضان میں روزہ توڑ لیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ یا تو گردن آزاد کرائے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور یا پھر ساٹھ مساکین کا کھانا دے،[1] اسے مسلم نے نقل کیا "أوْ" تخییر کا فائدہ دیتا ہے اور اس لیے کہ کفارہ کا لزوم مخالفت کے سبب ہے تو یہ تخییر پر ہے، جیسے قسم کے کفارہ میں ہے، بقول امام شوکانی رحمہ اللہ روایات میں واقع جو ہے وہ ترتیب اور تخییر پر دال ہے اور جنہوں نے ترتیب روایت کی ہے وہ اکثر ہیں اور ان کے ساتھ زیادتِ نقل ہے، مہلب اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے ان روایات کے درمیان تعددِ واقعہ قرار دے کر تطبیق دی، حافظ رحمہ اللہ کے بقول یہ بعید ہے کیونکہ قصہ واضح اور مخرجِ حدیث متحد ہے اور اصل عدمِ تعدد ہے، بعض نے ترتیب کو اولویت اور تخییر کو جواز پر محمول کرنے کے ساتھ تطبیق دی اور بعض نے اس کا عکس کیا۔

جس نے جان بوجھ کر رمضان کے دن میں جماع کیا اور ابھی اس کا کفارہ نہ دیا تھا کہ ایک اور دن پھر جماع کر لیا تو احناف کے نزدیک اس کے ذمہ ایک ہی کفارہ ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، کیونکہ یہ جنایت (یعنی قصور) کی جزا ہے جس کا سبب متکرر ہوا اس کی ادائیگی سے قبل تو دونوں متداخل ہیں، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک امام احمد رحمہ اللہ سے دوسری روایت بھی یہی ہے۔ اس کے ذمے اب دو کفارے ہیں، کیونکہ ہر روز (کا روزہ) ایک مستقل عبادت ہے تو اگر اس کے اِفساد کے باعث کفارہ واجب ہوا تو وہ متداخل نہ ہوگا (یعنی ایک قصور کا ایک کفارہ ہے) جیسے دو رمضان ہوں، اس امر پر اجماع ہے کہ اگر عمداً دن کے وقت جماع کر لیا اور کفارہ دے دیا، پھر ایک اور دن یہ کیا تو اب اس کے ذمے ایک اور کفارہ ہے، اس امر پر بھی اجماع ہے کہ اگر دو (یا زائد) مرتبہ ایک ہی دن میں جماع کیا بغیر اس کے کہ اول جماع کا کفارہ دے چکا ہو تو اس کے ذمے ایک ہی کفارہ ہے، جمہور کے نزدیک اگر اول کا کفارہ دے دیا تو ثانی کا نہیں دے گا، احمد کے نزدیک اس کے ذمے دوسرا کفارہ بھی ہے۔

رمضان کے روزوں کی قضا

روزوں کی قضا فی الفور واجب نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے اس ضمن میں توسُّع ہے، جب چاہے قضا دے دے، اسی طرح کفارہ بھی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بصحت مروی ہے کہ وہ رمضان کے روزوں کی قضا اگلے شعبان میں دیتی تھیں فوراً نہیں، اس کی قدرت کے باوجود،[2] قضا مثلِ ادا ہے بایں معنی کہ جس سے جتنے ایام کے روزے چھوٹے وہ اتنے ایام کے ہی روزے رکھے گا زائد نہیں، قضا میں پے در پے روزے رکھنا بھی واجب نہیں، کیونکہ قرآن نے کہا:

---

[1] صحيح مسلم: ٤٨/ ١١١١. [2] صحيح مسلم: ١١٤٦.

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''جوتم میں سے مریض یا مسافر ہوتو وہ (رمضان کے بعد) اور دنوں میں گنتی پوری کر لے۔''

جو مریض تھا یا مسافر جس وجہ سے اس سے روزے چھوٹے تو ان ایام کی گنتی پوری کرے چاہے پے در پے روزانہ روزہ رکھ کر یا اس کے بغیر کیونکہ اللہ نے مطلقاً قضا کا حکم دیا ہے، پے در پے رکھنے کی قید نہیں لگائی، دارقطنی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے رمضان کے بارے فرمایا: ''چاہے تو مسلسل رکھ لے اور چاہے مفرّق کر کے۔''[1] اگر قضا مؤخر کرتا رہا حتی کہ اگلا رمضان داخل ہو گیا تو پہلے حاضر رمضان کے روزے رکھے، پھر بعد ازاں سابقہ کی قضا دے، اس کے ذمے کوئی فدیہ نہیں، چاہے یہ تاخیر کسی عذر کی بنا پر تھی یا بغیر عذر کے، یہ احناف اور حسن بصری رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ فدیہ نہ ہونے میں احناف کے موافق ہیں، اگر یہ تاخیر کسی عذر کی بنا پر تھی لیکن اگر کوئی عذر نہ تھا تو ان کے نزدیک پہلے حاضر رمضان کے روزے رکھے، پھر سابقہ کی قضا دے اور ساتھ ہی فدیہ بھی، ہر روزے کے عوض ایک مد طعام دے، اس میں ان کے پاس کوئی قابلِ احتجاج دلیل نہیں ہے، بظاہر احناف کا موقف ہی درست لگتا ہے، کیونکہ صحیح نص کے ساتھ ہی شرعی امر متقرر ہوگا۔

جو فوت ہوا اور اس کے ذمہ روزے تھے

علماء کا اجماع ہے کہ جو فوت ہوا اور اس کے ذمے نمازیں تھیں تو اس کا ولی (یعنی وارث اور سرپرست) اس کی طرف سے انہیں ادا کرے کوئی اور نہیں، اسی طرح جس سے روزے چھوٹ گئے تھے تو جب تک وہ زندہ ہے کوئی اور اس کی طرف سے نہیں رکھ سکتا، اگر فوت ہوا اور اس کے ذمے روزے ہیں اور مرنے سے قبل اس کی صحت اس قابل ہو چکی تھی کہ رکھ لیتا تو اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہوا، جمہور جن میں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ ہیں، سے مشہور قول کے مطابق اس کا ولی روزے نہ رکھے بلکہ فدیہ دے، شوافع کا مختار مذہب یہ ہے کہ مستحب ولی کا روزے رکھنا ہے اور یوں میت بری الذمہ ہو جائے گی، فدیہ دینے کی ضرورت نہ رہے گی، ولی سے مراد میت کا قریبی، چاہے یہ عصبہ ہوں (یعنی والد کی طرف سے اقارب) یا وارثوں میں سے کوئی یا کوئی دیگر حتی کہ اگر ولی کی اذن سے اجنبی نے بھی رکھ لیے تو یہ درست ہے لیکن اگر ولی کی اذن نہ تھی تب نہیں، ان کا استدلال احمد اور شیخین کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مر گیا اور اس کے ذمے روزے ہیں تو اس کا ولی اس کی طرف سے رکھ لے۔'' بزار نے ''إِنْ شَاءَ'' کا بھی اضافہ کیا (یعنی اگر چاہے)،[2] شیخین، احمد اور اصحابِ سنن نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس کے ذمے پورے مہینے کے روزے تھے، کیا میں اس کی طرف سے رکھ لوں؟ فرمایا: ''اگر تمہاری والدہ کے ذمے کوئی قرض ہوتا تو ادا نہ کرتے؟'' کہا: کیوں نہیں! فرمایا: ''تو اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کا قرض ادا کیا

---

[1] ضعیف، سنن الدارقطنی: ۲۳۲۹۔ [2] صحیح البخاری: ۱۹۵۲؛ صحیح مسلم: ۱۱۴۷۔

جائے۔"[1] بقول امام نووی رحمہ اللہ: یہی صحیح و مختار ہے اور ہمارا یہی اعتقاد ہے اور ہمارے فقہ و حدیث کے جامع محققین اصحاب (یعنی شوافع) نے ان صحیح و صریح احادیث کے مدِنظر اسے ہی درست قرار دیا۔

وہ ممالک جہاں کے دن طویل اور راتیں چھوٹی ہیں

فقہاء کا ایسے ممالک کے بارے باہم اختلاف ہے جہاں کے دن لمبے اور راتیں چھوٹی ہیں اور وہ جہاں اس کے برعکس ہے کہ کن علاقوں کی توقیت پر وہ چلیں؟ تو کہا گیا کہ معتدل علاقوں کی توقیت پر جن میں تشریع واقع ہوئی ہے، جیسے مکہ اور مدینہ، بعض نے کہا: ان سے قریبی معتدل ممالک اور علاقوں کی توقیت پر۔

شبِ قدر

شب قدر کی فضیلت

شبِ قدر سال کی سب سے افضل رات ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ○ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴾ (القدر: ۱۔۳)

"ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا اور آپ کو کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔"

یعنی اس میں عمل کرنا، مثلاً: نماز و تلاوت اور ذکر و اذکار ان ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں شبِ قدر نہ ہو۔

شبِ قدر تلاش و جستجو کا استحباب

رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں اسے تلاش کرنا مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں نہایت محنت و کوشش فرماتے (یعنی عبادت میں، پہلے روایت گزری کہ آپ اپنی ازواج مطہرات کو بھی بیدار رکھتے اور خود بھی کمر کس لیتے تھے)۔

یہ کون سی رات ہے؟

اس کی تعیین میں کئی آراء ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ اکیسویں رات ہے، بعض کے مطابق تیئسویں، بعض نے پچیسویں اور بعض نے انتیسویں کہا، جبکہ بعض کے مطابق یہ ہر سال طاق راتوں میں ایک سے دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہے، اکثر کے نزدیک یہ ستائیسویں شب ہے، احمد رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جو اسے تلاش کرنا چاہتا ہے وہ ستائیسویں شب میں کرے!"[2] مسلم، احمد، ابو داود اور ترمذی نے حکمِ صحت لگایا اور

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ۲٦۳۹۔ [2] صحیح، مسند أحمد: ۲/ ۲۷۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ وہ قسم کھاتے تھے اور ان شاء اللہ بھی نہ پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جانتا ہوں یہ کون سی رات ہے، یہ وہ رات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کے قیام کا حکم دیا تھا اور یہ ستائیسیوں شب تھی اور اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کی صبح سورج سفید اور بے شعاع طلوع ہوگا۔[1]

شبِ قدر میں قیام و دعا

بخاری اور مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایمان و احتساب (یعنی امید ثواب رکھتے ہوئے) شبِ قدر کا قیام کیا اس کے تمام سابقہ گناہ بخشے گئے۔''[2] احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے صحیح قرار دے کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! اگر مجھے پتہ چل جائے کہ کون سی رات قدر کی رات ہے تو کیا دعا کروں؟ (یعنی کوئی خاص دعا) فرمایا: ''کہو: «اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ» ''اے اللہ! تو بہت درگزر کرنے والا ہے، لہٰذا مجھ سے درگزر فرما۔''[3]

اعتکاف

① اعتکاف کا معنی

کسی چیز کو لازم پکڑ لینا اور اس پر اپنے آپ کو روک لینا، چاہے وہ خیر ہو یا شر، قرآن میں ہے:

﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴾ (الأنبياء:٥٢) ''کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟''

یعنی ''مُقِيْمُوْنَ مُتَعَبِّدُوْنَ لَهَا'' وہاں ٹھہر کر ان کی پوجا کرنے والے، یہاں مراد مسجد کا لزوم اور اس میں اللہ کی طرف تقرُّب کے قصد کے ساتھ اقامت کرنا۔

② اعتکاف کی مشروعیت

علماء کا اس کی مشروعیت پر اجماع ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس ایام کے لیے (یعنی آخری عشرہ) اعتکاف بیٹھا کرتے تھے، سالِ وفات آپ بیس دن اعتکاف بیٹھے۔[4] اسے بخاری، ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، صحابہ کرام اور ازواج مطہرات بھی آپ کے ہمراہ اور آپ کے بعد بھی اعتکاف بیٹھتے تھے، یہ اگرچہ یکے از قربات ہے البتہ اس کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں، بقول امام ابوداود: میں نے امام احمد سے کہا: کیا آپ اعتکاف کی فضیلت کے بارے میں کسی روایت سے واقف ہیں؟ کہا: نہیں! البتہ ضعیف چیزیں موجود ہیں۔

---

① صحيح مسلم: ٧٦٢، سنن أبى داود: ١٣٧٨. ② صحيح البخارى: ١٩٠١، صحيح مسلم: ٧٥٩.
③ صحيح، سنن ترمذى: ٣٥١٣، سنن ابن ماجه: ٣٨٥٠. ④ صحيح البخارى: ٢٠٢٦، سنن أبى داود: ٢٤٧٣.

③ اعتکاف کی اقسام

اعتکاف مسنون اور واجب کی طرف منقسم ہے تو مسنون وہ ہے جو تطوعاً (یعنی رضا کارانہ) کوئی بیٹھ جائے اللہ کے تقرب اور اس کے ثواب کی طلب میں اور نبی کریم ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے، یہ رمضان کے آخری عشرہ میں متاکد ہے، واجب اعتکاف وہ ہے جس کی کوئی نذر مان لے یا تو نذرِ مطلق کے بطور، مثلاً کہے: اللہ کے لیے مجھ پر واجب ہے کہ اتنے دن کا اعتکاف بیٹھوں گا، یا نذرِ معلق، مثلاً کہے: اگر اللہ نے مجھے یا میرے مریض کو شفا دی تو میں اعتکاف بیٹھوں گا (اس میں وہ رمضان کے مسنون اعتکاف کی نیت بھی کر سکتا ہے تب وہ اس کے لیے واجب بن جائے گا) بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی طاعت کی کوئی نذر مانی تو وہ پوری کرے۔''[1] مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ ایک رات کا مسجدِ حرام میں اعتکاف بیٹھوں گا، آپ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرو۔''[2]

④ اعتکاف کی مدت

واجب اعتکاف تو نذر ماننے والے کے حسبِ نذر ہوگا، جبکہ مستحب اعتکاف کا کوئی محدود و معین وقت نہیں، وہ نیتِ اعتکاف کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے کے ساتھ متحقق ہو جاتا ہے، چاہے طویل وقت کے لیے ہو یا قصیر کے لیے، جب تک وہ مسجد میں ہے اسے اعتکاف کا ثواب ملتا رہے گا، جب نکل جائے، پھر دوبارہ آئے تو تجدیدِ نیت کر لے اگر قصدِ اعتکاف رکھتا ہے، (یعنی ہر نماز کے لیے آتے وقت اعتکاف کی بھی نیت کر لے) سیدنا یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں مسجد میں ایک ساعت بھی ٹھہروں تو معتکف ہوتا ہوں، بقول امام عطاء رحمہ اللہ جب تک کوئی مسجد میں رہے اعتکاف میں باور ہوگا (یعنی اگر اس کی نیت کی ہے تو) مستحب اعتکاف کا معتکف جب چاہے اسے منقطع کر سکتا ہے، اس مدت سے قبل بھی جس کی نیت کی تھی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز کے بعد اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہو جاتے، ایک مرتبہ آپ نے آخری عشرہ میں اعتکاف کی نیت کی اور اعتکاف گاہ تیار کرنے کا حکم دیا تو تیار کر دی گئی، کہتی ہیں: میں نے یہ دیکھ کر اپنے لیے بھی اعتکاف گاہ تیار کرنے کا کہا، اس پر دیگر ازواج مطہرات نے بھی اپنی اپنی اعتکاف گاہ تیار کرا لی، آپ نے فجر کی نماز کے بعد جب ان سب کو دیکھا تو فرمایا: ''یہ کیا ہے؟ کیا واقعی نیکی کا انہوں نے ارادہ کیا؟ (یا یہ کہ میرا قرب حاصل ہو)'' کہتی ہیں: آپ نے اپنی اعتکاف گاہ کو ہٹا دینے کا حکم دیا، اسی طرح ازواج مطہرات کی اعتکاف گاہیں بھی اور اس رمضان کا اعتکاف آپ نے مؤخر کر کے شوال کے پہلے عشرہ میں بیٹھے،[3] تو یہ نیت کے بعد اعتکاف کا ارادہ فسخ کرنے (کے جواز) پر دلیل ہے، یہ بھی ثابت ہوا کہ شوہر کو حق ہے کہ اپنی بیوی کو اعتکاف سے منع کر دے، یہی جمہور علماء کا مؤقف ہے، اس امر میں اختلاف ہے کہ اولاً اذن دی ہو تو کیا بعد میں روک سکتا ہے؟ امام شافعی، امام احمد اور امام داود رحمہم اللہ کے ہاں روک

---

① صحيح البخاري: ٦٦٩٦؛ سنن ابی داود: ٣٢٨٩. ② صحيح البخاري: ٢٠٣٢؛ صحيح مسلم: ١٦٥٦.
③ صحيح، سنن أبي داود: ٢٤٦٤.

سکتا ہے، بلکہ اعتکاف گاہ سے (زبردستی) نکال بھی سکتا ہے۔

⑤ اعتکاف کی شروط

معتکف کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان، ممیز (یعنی سمجھ دار) جنابت، حیض اور نفاس سے پاک ہو، لہٰذا کافر اور ناسمجھ نابالغ سے یہ ہونا صحیح نہیں اور نہ جنبی، حائضہ اور نفاس والی سے۔

⑥ اعتکاف کے ارکان

حقیقتِ اعتکاف مسجد میں ٹھہرنا ہے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی نیت کرتے ہوئے یہ غیرِ مسجد میں یا نیتِ طاعت نہ کرے تو اعتکاف منعقد نہ ہوگا، جہاں تک وجوبِ نیت ہے تو یہ اس آیت کے مدنظر: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (البينة:٥) اور اس حدیث کے بھی «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ إِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوىٰ» جہاں تک یہ بات ہے کہ اعتکاف صرف مسجد ہی میں ہوگا تو اس فرمانِ الٰہی کے پیشِ نظر:

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرة:١٨٧)

''مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہونے کی حالت میں ان سے جماع نہ کرو۔''

وجہِ استدلال یہ ہے کہ اگر غیر مسجد میں اعتکاف صحیح ہوتا تو تحریم مباشرت مسجد میں اعتکاف کے ساتھ مختص نہ کی جاتی، کیونکہ یہ اعتکاف کے منافی ہے تو مفہوم یہ ظاہر ہوا کہ اعتکاف صرف مساجد میں ہی ہوتا ہے۔

⑦ اس مسجد کے بارے میں فقہا کی آراء جس میں اعتکاف منعقد ہوگا

اس ضمن میں فقہا کے ہاں اختلافِ آراء ہے کہ کس طرح کی مسجد اعتکاف بیٹھنے کے لیے درست ہے تو امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام اسحاق اور امام ابوثور رحمہم اللہ کے نزدیک ہر وہ مسجد جس میں نمازِ پنجگانہ کی با جماعت ادائیگی کا اہتمام ہوتا ہے (چاہے جمعہ نہ بھی ہوتا ہو) کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر مسجد جس کے لیے مؤذن و امام ہے تو اس میں اعتکاف ٹھیک ہے۔''[1] اسے دارقطنی نے تخریج کیا اور یہ مرسل ضعیف ہے، لہٰذا اس کے ساتھ حجت کا اخذ صحیح نہیں۔ امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور داود کی رائے میں ہر مسجد میں اعتکاف بیٹھنا صحیح ہے، کیونکہ بعض مساجد کی تخصیص کے ضمن میں کوئی صریح چیز وارد نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: افضل یہ ہے کہ جامع مسجد ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ جامع مسجد میں اعتکاف بیٹھے، اگر دیگر کسی مسجد میں اعتکاف بیٹھا تو اس دوران میں اگر جمعہ آ گیا تو اس کا جمعہ فوت ہو جائے گا، معتکف مسجد کے مینار میں اذان دینے جا سکتا ہے (چونکہ پرانے زمانوں میں جب لاؤڈ سپیکر نہ تھے، اذان دینے کے لیے مسجد کے مینار پر چڑھا جاتا تھا تاکہ آواز دور تک پہنچے) اگر اس کا دروازہ مسجد یا اس کے صحن میں کھلتا ہے، اسی طرح مسجد کی چھت پر بھی جا سکتا ہے کیونکہ یہ مسجد کا حصہ ہے، لیکن

[1] موضوع، سنن الدارقطني: ٢/ ١٩٩.

اگر مینار کا دروازہ خارج از مسجد ہو، تب اس کا اذان کے لیے جانا صحیح نہ ہوگا اور اگر گیا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا اگر عمداً یہ کیا، مسجد کے آس پاس کا ملحق میدان (جس میں صفیں بچھتی ہوں) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مسجد کا حصہ شمار ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، امام مالک رحمہ اللہ سے اور امام احمد رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ منقول ہے کہ یہ مسجد کا حصہ نہیں، لہٰذا معتکف وہاں نہیں جا سکتا، اس لیے کہ گھر کی نماز کے لیے تیار کردہ جگہ پر اسم مسجد کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس کے فروخت کر دینے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، صحت سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات مسجدِ نبوی کے اندر اعتکاف بیٹھا کرتی تھیں۔

(نذر پوری کرنے والے) معتکف کا روزہ

معتکف روزہ رکھے تو عمدہ ہے اور اگر نہ رکھے تو اس پر دوش نہیں، بخاری نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے ذمہ زمانۂ جاہلیت سے ایک نذر ہے کہ خانہ کعبہ میں ایک رات کا اعتکاف بیٹھوں گا، فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرو'' تو اس میں دلیل ہے کہ روزہ رکھنا صحتِ اعتکاف کی شرط نہیں، کیونکہ رات کو تو روزہ نہیں رکھا جاتا، سعید بن منصور نے ابوسہل سے نقل کیا کہ میری ایک رشتہ دار خاتون کے ذمے اعتکاف تھا تو میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے اس بارے میں پوچھا، انہوں نے کہا: اس پر روزہ رکھنا واجب نہیں (اعتکاف کے ساتھ) اِلّا یہ کہ تم اس کے ذمہ کر دو، اس پر زہری نے کہا: اعتکاف نہیں مگر روزے کے ساتھ، عمر رحمہ اللہ نے ان سے پوچھا: یہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر رہے ہیں؟ کہا: نہیں! کہا: تو ابوبکر سے؟ کہا: نہیں! کہا: عمر سے؟ کہا: نہیں! میرا خیال ہے کہ کہا: عثمان سے؟ وہ بولے: نہیں! راوی کہتے ہیں: میں وہاں سے نکلا اور عطاء اور طاوس کے پاس پہنچا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا تو طاوس رحمہ اللہ نے کہا: فلاں روزہ رکھنا ضروری خیال نہ کرتے تھے، جبکہ عطاء نے کھل کر کہا: اس کے ذمہ روزہ ضروری نہیں اِلّا یہ کہ یہ بھی نذر کا حصہ ہو۔ امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لوگوں کا اس بارے میں اختلاف ہے، حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک بغیر روزہ کے اعتکاف ہو جاتا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی میلان ہے سیدنا علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ روزہ رکھنا ضروری نہیں، چاہے تو رکھ لے اور چاہے تو نہ رکھے، امام اوزاعی اور امام مالک رحمہما اللہ کی بھی زہری جیسی رائے تھی اور یہی اہل رائے کے نزدیک ہے، سیدنا ابن عمر، ابن عباس اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے اور اسی کے سعید بن مسیب، عروہ اور زہری رحمہم اللہ قائل تھے۔

اعتکاف گاہ میں داخل اور اس سے خارج ہونے کا وقت

پہلے گزرا کہ مندوب اعتکاف کے لیے کوئی محدد وقت نہیں، جب بھی معتکف مسجد میں داخل ہو اور وہاں ٹھہرنے کے ساتھ تقرُّب الی اللہ کی نیت کرے حتی کہ خارج ہو تو وہ معتکف شمار ہوگا، اگر رمضان کے آخری عشرہ کے اعتکاف کی نیت کی ہے تو وہ اعتکاف گاہ میں غروبِ آفتاب سے قبل داخل ہو (یعنی بیسویں تاریخ کے) چنانچہ بخاری کے ہاں سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو میرے ساتھ اعتکاف بیٹھنا چاہتا ہے وہ آخری عشرہ کا اعتکاف بیٹھے۔''[1] عشرہ

---

[1] صحيح البخاري: ٢٠٢٧.

راتوں کی تعداد کا اسم ہے (کیونکہ قمری مہینوں میں رات سے دن کا آغاز ہوتا ہے) اورعشرہ کی پہلی رات اکیسویں شب ہے یا بیسویں کی (بظاہر مراد یہ کہ بیس تاریخ کا روزہ جب ختم ہوگا تو اکیسواں دن شروع ہوا) اور جو روایت کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو نمازِ فجر کے بعد اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہوجاتے،[1] اس کا معنی یہ ہے کہ مسجد کی اس جگہ میں جو اعتکاف کے لیے تیار کی جاتی فجر کے بعد داخل ہوتے تھے،لیکن مسجد میں برائے اعتکاف آپ کا دخول رات شروع ہوتے ہی ہو جاتا تھا۔ جو رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھے اس کا خروج رمضان کے آخری دن غروبِ آفتاب کے بعد ہوگا (یعنی جب اطلاع مل جائے کہ ہلالِ عید طلوع ہو چکا ہے) یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہے،امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: اگر غروب کے بعد نکل گیا تو یہ جائز ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ چاند رات بھی وہیں رہے اور وہیں سے عید گاہ جائے ، اثرم نے اپنی اسناد کے ساتھ ابو ایوب عن ابی قلابہ سے نقل کیا کہ وہ چاند رات مسجد میں ہی گزارا کرتے تھے اور وہیں سے عید پڑھنے نکلتے اور وہ اپنے لیے اپنی اعتکاف گاہ میں کوئی خصوصی چٹائی وغیرہ نہ بچھواتے تھے، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف کو پسند تھا کہ آخری عشرہ کا معتکف چاند رات مسجد ہی میں گزارے اور وہیں سے عید کو جائے ،جس نے ایک یا چند معین ایام کے اعتکاف کی نیت کی اور یہ تطوعاً چاہا (یعنی نذر کے بطور نہیں) تو وہ فجر ہونے سے قبل اعتکاف گاہ میں داخل ہو اور جب نکلنے کا دن ہو تو تب نکلے جب سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا ہو، چاہے یہ رمضان میں ہو یا غیرِ رمضان میں،جس نے ایک یا چند معین راتوں کے اعتکاف کی نیت کی اور یہ تطوعاً کیا تو وہ سورج مکمل غروب ہونے سے قبل داخل ہو اور طلوعِ فجر ہوجانے پر نکلے، بقول ابن حزم رحمہ اللہ کیونکہ رات کا آغاز غروب کے فوری بعد ہوتا ہے اور یہ طلوعِ فجر کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے، جبکہ دن طلوعِ فجر سے شروع اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور ہر ایک وہی کرے گا جس کی اس نے نیت کی، اگر کسی نے مہینہ بھر کے اعتکاف کی نیت کی تو اس کا آغاز مہینہ کی اولین رات سے کرے، لہٰذا غروب ہونے سے قبل معتکف میں داخل ہوجائے اور نکلے تب جب آخری دن کا سورج مکمل غروب ہو جائے (زیادہ بہتر یہ کہنا ہے کہ جب اگلے مہینہ کے چاند کے طلوع ہونے کی خبر ملی اور اگر انگریزی مہینہ کی نیت کی ہے تو اس کا آغاز شب کے بارہ بجے اور اختتام بھی اسی وقت ہوگا)۔

معتکف کے لیے مستحبات و مکروہات

معتکف کے لیے مستحب ہے کہ کثرت سے نفلی عبادات کرے اور اپنے آپ کو (حسبِ استطاعت) نوافل،تلاوت اور ذکر واذکار اور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کے ساتھ مشغول رکھے، اسی طرح بکثرت دعائیں کرے، اس باب میں علمی مطالعہ و دراسہ ،تفسیر، حدیث، انبیاء و صالحین کے واقعات اور دین و فقہ کی کتب کا مطالعہ بھی شامل ہے، بہتر یہ ہے کہ صحنِ مسجد (یا مسجد کی کسی بھی جگہ) نبی کریم ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے خیمہ سا بنالے لیکن فضول باتوں یا حرکات کے ساتھ اشتغال مکروہ ہے (بظاہر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کرنے میں زیادہ حرج نہیں کیونکہ ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہنا دشوار ہے) ترمذی

---

[1] صحیح مسلم: ١٧١٢؛ سنن أبی داود: ٢٤٦٤؛ سنن ترمذی: ٧٩١.

اورابن ماجہ نے سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)) ''کسی کے اسلام کی اچھائی ہے کہ وہ لایعنی اور فضول افعال واقوال کا ترک کرے۔''[1] بالکل خاموش رہنا بھی مکروہ ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے بھی اللہ کا تقرُّب ملتا ہے۔ بخاری، ابو داود اور ابن ماجہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو دیکھا کہ ایک آدمی علیحدہ کھڑا ہوا ہے، پوچھا: ''اسے کیا ہوا؟'' لوگوں نے کہا: یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ بیٹھے گا نہیں بلکہ کھڑا رہے گا، نہ سائے میں جائے گا، نہ کسی سے بات کرے گا اور روزہ رکھے گا تو آپ نے فرمایا: ''اسے کہو! بولے، سائے میں جائے، بیٹھے اور روزہ پورا کرلے۔''[2] ابو داود نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بالغ ہوگیا اسے یتیم نہ کہا جائے اور چپ کا روزہ نہیں ہے۔''[3]

معتکف کے لیے مباح امور

درج ذیل اموراس کے لیے مباح ہیں:

① اعتکاف گاہ سے گھر والوں کو الوداع کہنے کے لیے نکلنا (بظاہر پوری مسجد ہی اعتکاف گاہ ہوتی ہے اس واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے دروازے تک آئے تھے)، ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معتکف تھے میں رات کو ملنے آئی، کچھ دیر باتیں کیں، پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی تو آپ میرے ہمراہ اٹھے تاکہ الوداع کرآئیں، میری رہائش اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے گھر میں تھی، دو انصار کے شخص گزر رہے تھے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو تیزی سے جانے لگے، آپ نے انہیں بلایا، جب آئے تو آپ نے فرمایا: ''یہ صفیہ بنت حیی ہے۔'' انہوں نے کہا: سبحان اللہ، یا رسول اللہ! (ہم آپ کے بارے میں کیسے غلط سوچ سکتے ہیں، ایک روایت میں ہے ان پر آپ کی یہ بات بہت بھاری گزری) آپ نے فرمایا: ''دراصل شیطان ہر انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، میں ڈرا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسواس نہ پیدا کردے۔''[4] اسے بخاری، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا۔

② بالوں میں کنگھی کرنا/کرانا، سر منڈوانا (یا بال چھوٹے کرانا) ناخن ترشوانا اور جسم سے فضول بال یا میل دور کرنا، عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا تو یہ سب مباح امور ہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوتے تھے تو اعتکاف گاہ سے سر مبارک میری طرف نکالتے تو میں دھو دیتی اور کنگھی کر دیتی جبکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔''[5] اسے بخاری، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا۔

③ کسی ضروری کام کے لیے جانا، جس کے بغیر چارہ نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف گاہ سے اپنا

---

① صحیح، سنن ترمذی: ٢٣١٧؛ سنن ابن ماجہ: ٣٩٧٦. ② صحیح البخاری: ٦٧٠٤؛ سنن أبی داود: ٣٣٠٠.
③ صحیح، سنن أبی داود: ٢٨٧٣. ④ صحیح البخاری: ٢٠٣٨؛ صحیح مسلم: ٢١٧٥. ⑤ صحیح البخاری: ٢٠٢٨؛ صحیح مسلم: ٢٩٧.

سر مبارک میرے قریب کر دیتے تو میں کنگھی کر دیتی، آپ درپیش ضروری حاجات (یعنی قضائے حاجت کی غرض) پوری کرنے کے لیے ہی گھر آتے تھے،[1] اسے شیخین وغیرہما نے نقل کیا، امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علماء کا اجماع ہے کہ معتکف بول و براز کے لیے معتکف سے نکل سکتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں (اور اگر اس کا بندوبست مسجد کے اندر نہیں تو گھر بھی جا سکتا ہے) اسی طرح اگر کھانا وغیرہ مسجد میں لایا جانا ممکن نہیں تو اس کے لیے باہر نکل سکتا ہے، اگر قے آنے لگے تو یہ کرنے کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے (اور دوائی لینے بھی) یعنی ہر وہ حاجت جو ضروری ہے اور مسجد کے اندر اس کا بندوبست نہیں تو اسے پوری کرنے کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے اور ضروری ہے کہ کم سے کم وقت میں ضرورت پوری کر کے واپس آجائے، اگر فضول میں طویل وقت صرف کیا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اعتکاف میں بیٹھا شخص جمعہ پڑھنے جا سکتا ہے (اگر اس مسجد میں جمعہ کا اہتمام نہیں)، جنازہ پڑھنے اور مریض کی عیادت کرنے بھی اور گھر والوں کے پاس آسکتا ہے اگر کوئی ضروری ہدایت دینی ہو، لیکن یہ باتیں وہ جلدی جلدی اور کھڑے کھڑے کرے، ایک دفعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اعتکاف میں بیٹھے ہوئے اپنے بھانجے کو سات سو درہم دیے اور کہا: بازار جا کر ایک غلام خرید لاؤ! انہوں نے کہا: میں تو معتکف ہوں تو کہا: اس میں حرج نہیں، قتادہ رحمہ اللہ کے بارے منقول ہے کہ وہ معتکف کو رخصت دیتے کہ جنازہ پڑھنے چلا جائے اور بیمار کی عیادت کو بھی البتہ کھڑے کھڑے بیٹھے نہیں، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف پسند کرتے تھے کہ معتکف اگر عیادت کو جائے تو چھت کے نیچے داخل نہ ہو (یعنی باہر کھڑے عیادت کرے) جمعہ پڑھنے جائے اور جنازہ پڑھنے بھی اور اپنے ضروری کام کے لیے بھی نکل سکتا ہے، کہتے ہیں: چھت والی جگہ میں داخل نہ ہو اِلّا یہ کہ ضرورت ہو، بقول امام خطابی رحمہ اللہ ایک گروہِ علماء نے کہا: معتکف کے لیے جائز ہے کہ جمعہ کو حاضر ہو، مریض کی عیادت اور جنازہ پڑھنے جائے، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور یہ سعید بن جبیر، حسن بصری اور نخعی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ ابو داود نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معتکف ہوتے ہوئے مریض سے گزرتے گزرتے کچھ حال چال پوچھ لیتے۔[2] جو ایک دیگر روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہوا کہ معتکف کے لیے سنت یہ ہے کہ مریض کی عیادت نہ کرے۔[3] تو اس کا معنی ہے کہ اپنے معتکف سے نہ نکلے اس کی عیادت کا قصد کرتے ہوئے، جبکہ اس میں ہے کہ گزرتے گزرتے احوال پُرسی کر لیتے اس کے پاس ٹھہرتے نہیں۔

④ مسجد میں کھا پی اور سو سکتا ہے، البتہ مسجد کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھے، معاملات اور خرید و فروخت کے سودے بھی طے کر سکتا ہے۔

اعتکاف کو باطل کرنے والے امور

درج ذیل میں سے کسی فعل کا ارتکاب اعتکاف باطل کر دے گا:

---

① صحیح البخاری: ۲۰۲۹، صحیح مسلم: ۲۹۷. ② ضعیف، سنن أبی داود: ۲۴۷۲. ③ صحیح، سنن أبی داود: ۲۴۷۳.

① بغیر ضرورت عمداً مسجد سے نکل جانا۔

② مرتد ہو جانا کہ یہ عبادت کے منافی ہے، کیونکہ قرآن نے کہا:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾(الزمر:٦٥)

''اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔''

③، ④، ⑤ دیوانگی طاری ہونے یا نشہ میں ہونے کے سبب عقل زائل ہو جانا اور عورت کو حیض اور نفاس آ جانا، کیونکہ شرطِ تمیز (یعنی ہوش و حواس) مفقود ہوئی اور حیض و نفاس سے طہارت بھی۔

⑥ جماع کرنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ (البقرۃ: ١٨٧)

''ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔''

بغیر شہوت کے لمس میں حرج نہیں، جہاں تک بوجہ شہوت بوسہ دینا یا لمس تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا: اس نے اگر یہ کیا تو برا کیا، لیکن اعتکاف فاسد نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ ایسا کرتے ہوئے انزال ہو جائے، مالک رحمہ اللہ کے ہاں اعتکاف فاسد ہوا کیونکہ یہ محرم مباشرت ہے۔ جیسا کہ انزال ہو تو امام شافعی رحمہ اللہ سے اس بابت دو روایتیں منقول ہیں، بقول امام ابن رشد رحمہ اللہ ان کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کیا حقیقت و مجاز کے درمیان مشترک اسم کے لیے عموم ہے یا نہیں؟ اور یہ اسمِ مشترک کی انواع میں سے ایک ہے جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کے لیے عموم ہے، ان کے نزدیک قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ میں مباشرت کا اطلاق جماع اور اس سے کم تر پر ہے اور جو اس کے لیے عموم نہیں سمجھتے یہی زیادہ مشہور و اکثر ہے۔ وہ قائل ہیں کہ یہ یا تو جماع پر دال ہے یا جماع سے کمتر پہ تو جب ہم کہیں کہ بالا جماع یہ جماع پر دال ہے، تب یہ کہنا باطل ہوگا کہ یہ غیرِ جماع پر دال ہے، کیونکہ ایک اسم کا بیک وقت حقیقت اور مجاز دونوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا اور جس نے انزال کو بمنزلہ جماع کہا تو یہ اس لیے کہ اسی کے معنی میں ہے اور جس نے نہیں کیا تو اس لیے کہ حقیقۃً اس پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اعتکاف کی قضا

جو تطوعاً اعتکاف میں شروع ہوا، پھر اسے قطع کر دیا تو اس کے لیے اس کی قضا دینا مستحب ہے، بعض نے کہا: واجب ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ علم نے معتکف کے بارے اختلاف کیا، اگر اس نے نیت کے مطابق پورا کرنے سے قبل اسے قطع کر لیا ہو تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: اس پر اعتکاف کی قضا واجب ہے، انہوں نے اس امر سے احتجاج کیا کہ نبی کریم ﷺ ایک دفعہ اعتکاف سے نکل آئے تو شوال کے عشرہ میں اعتکاف بیٹھے تھے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ اگر نذر کا اعتکاف نہ تھا یا ایسا کہ اس نے اپنے اوپر واجب کیا ہو اور وہ تطوع کی حیثیت میں بیٹھا تھا تب اس کے ذمے قضا نہیں الا یہ کہ رضا کارانہ طور پر قضا دے لے، امام

شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہر عمل اگر شروع کر دیا، پھر اس سے نکل آئے تو انسان کے ذمہ اس کی قضا نہیں ماسوائے حج اور عمرہ کے لیکن جس نے اعتکاف کی نذر مانی تھی، پھر مدت پوری کرنے سے قبل نکل آیا تو اس پر قضا واجب ہے جب اس پر قدرت پائے، اس پر آئمہ کا اتفاق ہے کہ اگر قضا دینے سے قبل ہی مر گیا تو کوئی اس کی طرف سے قضا نہ دے، البتہ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کا ولی لازماً قضا دے، عبدالرزاق نے عبدالکریم بن امیہ سے نقل کیا، کہتے ہیں: عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کو کہتے سنا کہ ہماری والدہ فوت ہو گئیں اور ان کے ذمہ اعتکاف تھا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو انہوں نے مجھے کہا: تم اس کی طرف سے بیٹھ جاؤ اور روزہ بھی رکھو، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کے فوت ہو جانے کے بعد ان کی طرف سے اعتکاف بیٹھیں۔

معتکف مسجد کی ایک ہی جگہ رہے اور وہاں خیمہ سا بنالے

چنانچہ ابن ماجہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف بیٹھتے تھے۔[1] امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے وہ جگہ دکھلائی جسے آپ اعتکاف گاہ بناتے تھے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ستونِ توبہ (ستونِ توبہ کا نام اس لیے پڑا کہ ایک صحابی نے اس کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیا تھا تا کہ اللہ توبہ قبول کر لے) کے پیچھے آپ کی اعتکاف گاہ تیار کی جاتی اور اس میں بستر لگا دیا جاتا یا چارپائی رکھ دی جاتی تھی۔[2] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ترکی قبہ میں اعتکاف بیٹھے اور اس کے دروازے پر چٹائی کا ایک ٹکڑا لٹکایا گیا۔[3]

کسی معین مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کی نذر ماننا

جس نے مسجد حرام، مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ میں اعتکاف بیٹھنے کی نذر مانی تو اس پر وفائے نذر لازم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِد: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَام وَالْمَسْجِدِ الأَقْصىٰ وَمَسْجِدِيْ هٰذَا» ''عبادت کا زیادہ ثواب ملنے کی غرض سے صرف تین مساجد کا رخ کرنا مشروع ہے: خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور مسجدِ اقصیٰ۔''[4]

لیکن اگر ان تین مذکورہ مساجد کے علاوہ کسی معین مسجد میں نذر مانی تھی، تب اس پر واجب نہیں کہ خاص اسی مسجد میں اعتکاف بیٹھے بلکہ وہ جس مسجد میں چاہے بیٹھ جائے، کیونکہ اللہ نے عبادت کے لیے کوئی معین جگہ خاص نہیں کی اور نہ ان تین کے سوا کسی مسجد کی دیگر پر کوئی فضیلت ہے، مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب دیگر مساجد میں ہزار نمازوں سے افضل ہے، ماسوائے مسجد حرام کے اور مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب میری اس مسجد میں سو نمازیں ادا کرنے سے افضل ہے۔''[5] اگر کسی نے مسجدِ نبوی میں اعتکاف کی نذر مانی تھی تو جائز ہے کہ مسجدِ حرام میں اسے پورا کر لے کیونکہ وہ مسجدِ نبوی سے افضل ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٦٦٩؛ صحيح مسلم: ١١٦٧. [2] ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٧٧٤. [3] صحيح البخاري: ٦٦٩؛ صحيح مسلم: ١١٦٧؛ سنن ابن ماجه: ١٧٧٥. [4] صحيح البخاري: ١١٨٩؛ صحيح مسلم: ١٣٩٧.
[5] صحيح، شعب الايمان: ٣٨٤٦.

جنازے کے مسائل

مرض اور علاج سے متعلق آدابِ سنت

احادیث میں تصریح ہے کہ مرض گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور اس کی وجہ سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، مثلاً:

① بخاری اور مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے، اسے کسی مصیبت میں ڈال دیتا ہے (تاکہ صبر کے ساتھ اس کے اجر میں اضافہ ہو)''[1]

② انہی کی ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کو جو تھکاوٹ، مشقت، غم، حزن اور تکلیف پہنچتی ہے، حتی کہ اگر کانٹا بھی چبھے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں مٹا ڈالتا ہے۔''[2]

③ بخاری نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا میں خدمتِ اقدس میں آیا تو آپ بخار سے تپ رہے تھے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو تو سخت بخار ہے، فرمایا: ''ہاں مجھے اس قدر شدید حرارت ہوتی ہے جتنی تمہارے دو آدمیوں کو ہو۔'' عرض کی: یہ اس لیے کہ آپ کے لیے دو اجر ہیں، فرمایا: ''ہاں! اسی وجہ سے کیونکہ مسلمان کو کانٹا بھی لگے تو اللہ اس کی وجہ سے اس کے گناہ اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔''[3]

④ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کی مثال کھیت کی بالی کی سی ہے، جب ہوا چلتی ہے تو اسے جھکا دیتی ہے اور جب ہوا معتدل ہو تو بسا اوقات وہ آفت لگ جانے سے جھک جاتی ہے، جبکہ فاجر کی مثال صنوبر کے سیدھے تنے والے درخت کی سی ہے، حتی کہ اللہ کی جب مشیت ہوتی ہے تو اسے جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔''[4]

مرض کے وقت صبر

مریض کو چاہیے کہ اپنی تکلیف اور بیماری پر صبر سے کام لے، انسان کو صبر سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا گیا۔

① مسلم نے سیدنا صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا سارا معاملہ خیر ہے اور یہ صرف مومن کی خصوصیت ہے کہ اگر اسے خوشی ملے تو وہ سراپا شکر بن جاتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف ملے تو صبر و رضا کا پیکر بنتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔''[5]

---

① صحيح البخاري: ٥٦٤٥؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٣٧. ② صحيح البخاري: ٥٦٤٢؛ صحيح مسلم: ٢٥٧٣.
③ صحيح البخاري: ٥٦٤٧؛ صحيح مسلم: ٢٥٧١. ④ صحيح البخاري: ٥٦٤٤. ⑤ صحيح مسلم: ٢٩٩٩؛ مسنداحمد: ٤/ ٣٣٢، ٣٣٣.

④ بخاری نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ نے فرمایا کہ اگر میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں کے ساتھ ابتلا میں ڈالوں اور وہ صبر کرے تو اس کا بدلہ اسے جنت کی شکل میں عطا کروں گا۔'' ان سے مراد آنکھیں ہیں۔ ①

⑤ بخاری و مسلم نے عطاء بن ابی رباح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا: ان سے کہنے لگے کہ کیا تمہیں ایک جنتی خاتون نہ دکھلاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! کہا: یہ کالی عورت ہے! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرے کپڑے کھل جاتے ہیں، اللہ سے میرے لیے دعا فرمائیں، آپ نے فرمایا: ''اگر چاہو تو صبر کرو (اس میں) تمہارے لیے جنت ہے اور چاہو تو میں اللہ سے دعا کردوں کہ وہ تمہیں اس سے چھٹکارا دے دے؟'' کہنے لگی: میں صبر کرتی ہوں، لیکن میرا لباس کھل جاتا ہے تو کم از کم اللہ سے دعا کر دیں کہ یہ نہ ہوا کرے تو آپ نے دعا فرمائی۔ ②

مریض کا اپنی تکلیف کے بارے بتلانا

جائز ہے کہ وہ طبیب کو اور دوست کو اپنی تکلیف بیان کردے، لیکن انداز ایسا نہ ہو کہ ناراض ہے اور جزع وفزع کا اظہار کرتا ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گزرا کہ ''مجھے تمہارے دو آدمیوں جتنا بخار چڑھتا ہے۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سر درد کے بارے میں بتلاتے ہوئے کہا تھا: ہائے میرا سر! آپ نے فرمایا تھا: ''بلکہ ہائے میرا سر (یعنی اس وقت آپ کو بھی یہی تکلیف تھی)''③ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے (اپنی والدہ) سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے پوچھا جو بیمار تھیں کہ آپ کیسی ہیں؟ کہا: بیمار ہوں، مناسب یہ ہے کہ مریض اپنی تکلیف بیان کرتے ہوئے پہلے اللہ کی حمد کرے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اگر شکوہ سے قبل شکر ہو تو یہ شکوہ نہ ہوگا اور اللہ کے سامنے شکوہ کرنا تو مشروع ہے، سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿قَالَ إِنَّمَآ أَشْكُوا۟ بَثِّى وَحُزْنِىٓ إِلَى ٱللَّهِ﴾ (یوسف:۸۶) ''اللہ ہی کی بارگاہ میں اپنے غم وحزن کا شکوہ کرتا ہوں۔''

ماثور دعاؤں میں سے ایک یہ ہے: «اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ» ''اے اللہ! میں تیری طرف اپنے ضعف کی شکایت کرتا ہوں۔''④

مریض کے لیے ایام مرض میں وہی اعمال لکھتے جاتے ہیں جو ایامِ صحت میں کرنا اس کا معمول ہو

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بندہ بیمار ہو یا مسافر ہو تو انہی اعمال کی مثل اس کے نامۂ اعمال میں درج کیا جاتا ہے جو مقیم وتندرست ہونے کی حالت میں کرنا اس کا معمول ہو۔''⑤

---

① صحيح البخاري: ٥٦٥٣، مسند أحمد: ٣/ ١٤٤. ② صحيح البخاري: ٥٦٥٢، صحيح مسلم: ٢٥٧٦.
③ صحيح البخاري: ٥٦٦٦. ④ ضعيف، المعجم الكبير للطبراني: ١٠٣٦. ⑤ صحيح البخاري: ٢٩٩٦؛ سنن أبي داود: ٣٠٩١.

مریض کی عیادت

اسلامی آداب میں سے ہے کہ مریض کی عیادت کی جائے، اس کے حق کی پاسداری کرتے ہوئے اور اس کی تطییبِ خاطر کے لیے اس کی خبر گیری کی جائے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مریض کی اول روز عیادت سنت اور اس کے بعد تطوُّع (یعنی مستحب) ہے، بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو اور قیدی چھڑاؤ۔''[1] شیخین نے ایک روایت نقل کی، جس میں ہے کہ ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔'' عرض کیا گیا: کون سے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ''جب ملو تو سلام کہو، وہ بلائے تو جاؤ، تجھ سے کوئی خیر خواہی چاہے تو کرو، چھینک مار کر الحمد للہ پڑھے تو اس کا جواب دو (یعنی یرحمک اللہ کہو) بیمار ہو تو بیمار پرسی کرو اور فوت ہو جائے تو اس کے جنازہ میں جاؤ۔''[2]

عیادت کی فضیلت

① ابن ماجہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی بیمار کی عیادت کی تو آسمان سے ایک منادی یہ ندا دیتا ہے:'' «طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلاً» ''تم بھی پاکیزہ ہوئے اور تمہارا یہ چلنا بھی اور تم نے جنت کی ایک منزل پر جگہ بنالی۔''[3]

② مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عزوجل روزِ قیامت کہے گا: اے ابن آدم! میں بیمار ہوا، مگر تو نے میری عیادت نہ کی، وہ کہے گا: اے اللہ! تو رب العالمین ہے، میں کیسے تیری عیادت کرتا؟ اللہ کہے گا: میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر اس کی عیادت کو آتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر کہے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، مگر تو نے نہ دیا، وہ کہے گا: کیسے یا اللہ؟ تو تو رب العالمین ہے! اللہ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہ دیا اور اگر دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔'' یہی بات اللہ تعالیٰ پانی پلانے کے بارے میں بھی کہے گا۔[4]

③ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو جب تک عیادت میں ہے، خرفۃ الجنۃ میں ہے حتی کہ واپس چلا جائے۔'' کہا گیا: یا رسول اللہ ''خُرْفَةُ الْجَنَّةِ'' کیا ہے؟ فرمایا: ''جنت کے میوے۔''[5]

④ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''کوئی مسلمان اگر کسی مریض مسلمان کی صبح کے وقت عیادت کرے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا گو رہتے ہیں اور اگر شام کو کرے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے

---

① صحیح البخاري: ٥٦٤٩. ② صحیح البخاري: ١٢٤٠؛ صحیح مسلم: ٢١٦٢. ③ حسن، سنن ابن ماجه: ١٤٤٣. ④ صحیح مسلم: ٢٥٦٩. ⑤ صحیح مسلم: ٢٥٦٨؛ سنن ترمذي: ٩٦٧.

لیے دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں اور جنت میں اس کے لیے پھلوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔"[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن ہے۔

آدابِ عیادت

مستحب ہے کہ عیادت کرنے والا مریض کی شفایابی اور عافیت کی دعا کرے اور اسے صبر اور برداشت کرنے کی نصیحت کرے اور اچھے کلمات منہ سے نکالے، جن سے وہ خوش اور اس کی روح توانا ہو، آپ سے مروی ہے کہ "جب مریض کے پاس جاؤ تو اسے طول عمری کی طمع دلاؤ (یعنی ایسی باتیں کہ یہ تو ہلکی سی بیماری ہے کوئی خطرہ نہیں) اس سے تقدیر تو ٹل نہیں سکتی لیکن مریض پر خوشگوار اثر پڑے گا۔"[2] خود آپ جب کسی بیمار کے پاس جاتے تو یہ کلمات کہتے: «لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» "ان شاء اللہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"[3] اور کوشش کرے کہ کم سے کم وقت مریض کے پاس ٹھہرے تاکہ اسے مشقت اور زحمت نہ ہو، اِلّا یہ کہ وہ اس سے زیادہ دیر رکنے کی فرمائش کرے۔

عورتوں کا مردوں کی عیادت کرنا

بخاری نے ایک باب بعنوان: "بَابُ عِيَادَةِ النِّسَاءِ الرِّجَالَ" باندھا اور نقل کیا کہ سیدہ ام درداء رضی اللہ عنہا مسجد میں قیام پذیر ایک انصاری شخص کی عیادت کو گئیں (یہ دمشق کی جامع اموی کا واقعہ ہے) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہجرت کے فوری بعد سیدنا ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما بخار میں مبتلا ہو گئے، کہتی ہیں: میں والد صاحب کے پاس گئی اور ان کا حال پوچھا اسی طرح بلال رضی اللہ عنہ سے بھی، کہتی ہیں: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اس عالم میں یہ شعر پڑھتے تھے:

كُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِيْ أَهْلِهِ وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

ہر شخص اپنے گھر بار میں خوش و خرم صبح کرتا ہے جبکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اور بلال رضی اللہ عنہ کو جب ہوش آتا تو یہ اشعار ان کی زبان پر جاری ہو جاتے:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِيْ هَلْ أَبِيْتَنَّ لَيْلَةً بِوَادٍ وَ حَوْلِيْ إِذْخَرٌ وَجَلِيْلُ
وَهَلْ أَرِدَنْ يَوْماً مِيَاهَ مِجَنَّةٍ وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِيْ شَامَةٌ وَطَفِيْلُ

اے کاش! میں جان پاؤں کہ کیا کبھی میں وادی مکہ میں پھر رات گزاروں گا اور میرے گرد اذخر (ایک قسم کی گھاس) اور جلیل ہوں اور کیا کبھی میرا ورود مجنہ کے چشموں پر ہوگا اور کیا کبھی شامہ و طفیل کو پھر سے دیکھ پاؤں گا؟

کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی آپ نے تو دعا فرمائی: "اے اللہ! تو مدینہ کو ہمارے لیے مکہ کی مثل یا اس سے

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ٣٠٩٨؛ سنن ترمذي: ٩٦٩. [2] ضعيف، سنن ترمذي: ٢٠٨٧؛ سنن ابن ماجه: ١٤٣٨.
[3] صحيح البخاري: ٥٦٥٦.

بھی زیادہ محبوب بنا، اے اللہ! مدینہ کی آب وہوا صحیح فرما، اس کے پیمانوں میں برکت فرمااوراس کا وبائی بخار جحفہ منتقل فرمادے۔“[1]

مسلمان کا کافر کی عیادت کرنا

اس میں حرج نہیں، چنانچہ بخاری رحمہ اللہ نے باب باندھا: ”بَابُ عِيَادَةِ الْمُشْرِكِ“ اس میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی لڑکے کی عیادت کرنے گئے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی خوشی سے کچھ کام کاج کردیتا تھا، آپ نے عیادت کرتے ہوئے فرمایا: ”کلمہ پڑھ لو!“ تو اس نے پڑھ لیا۔[2] سعید بن مسیب رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب جب نزع کے عالم میں تھے تو آپ (عیادت کے لیے) ان کے پاس آئے۔

آنکھوں کی بیماری میں عیادت

ابوداود نے سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ میری آنکھیں دکھنے آئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔[3]

مریض سے دعا کی درخواست کرنا

ابن ماجہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب مریض کے پاس جاؤ تو اس سے دعا کرنے کی درخواست کرو، کیونکہ (اس حالت میں) اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہوتی ہے۔“[4] مؤلف زوائد کے بقول اس کی اسناد صحیح اور راوی ثقہ ہیں البتہ یہ منقطع ہے۔

علاج کرنا/کرانا

کئی احادیث میں شارع علیہ السلام نے علاج کا حکم دیا ہے:

① احمد اور اصحابِ سنن نے جبکہ ترمذی نے حکمِ صحت لگایا اور سیدنا اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں مجلسِ نبوی میں حاضر ہوا، صحابہ اس طرح (خاموش بیٹھے) تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، میں سلام کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا تو دیہاتی لوگ آتے اور پوچھتے: یا رسول اللہ! کیا ہم دوا دارو کرلیا کریں؟ فرمایا: ”ضرور کرو! کیونکہ اللہ نے جو بھی مرض اتاری تو اس کی دوا بھی تیار کی ہے، ماسوائے ایک بیماری کے اور وہ ہے بڑھاپا۔“[5]

---

① صحيح البخاري: ١٨٨٩؛ صحيح مسلم: ١٣٧٦. ② صحيح، سنن أبى داود: ٢٠٩٥. ③ صحيح، سنن أبى داود: ٣١٠٢. ④ ضعيف جدًا، سنن ابن ماجه: ١٤٤١. ⑤ صحيح، سنن أبى داود: ٣٨٥٥؛ سنن ترمذی: ٢٠٣٨؛ سنن ابن ماجه: ٣٤٣٦.

② نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے ہر بیماری کے لیے دوا اتاری ہے، لہٰذا تم علاج کرایا کرو۔''[1]

③ مسلم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر بیماری کی دوا ہے تو جب دوا بیماری کو مل جائے (یعنی جو اس بیماری کی ہے) تو اللہ کے حکم سے شفایابی ہوتی ہے۔''[2]

حرام اشیا کے ساتھ علاج

جمہور علماء شراب اور دیگر حرام اشیا کے ساتھ علاج و تداوی کرنے/کرانے کی حرمت کے قائل ہیں، ان کا درج ذیل احادیث سے استدلال ہے:

① مسلم، ابوداود اور ترمذی نے سیدنا وائل بن حجر حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ سیدنا طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: کیا شراب سے کوئی دوا تیار کی جاسکتی ہے؟ فرمایا: ''وہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔''[3] اس سے شراب کے ساتھ علاج کرنے کی حرمت کا افادہ ملا اور یہ کہ وہ تو بذاتِ خود بیماری ہے۔

② بیہقی نے اور ابن حبان نے صحت کا حکم لگایا اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام کردہ اشیا میں تمہاری شفا نہیں رکھی۔''[4] اسے بخاری نے بھی بحوالہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ذکر کیا۔

③ ابوداود نے سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے بیماری بھی اتاری ہے اور دوا بھی اور ہر بیماری کے لیے دوا بنائی ہے، لہٰذا تم علاج کرایا کرو اور حرام چیز کے ساتھ علاج کیا اور نہ کرایا کرو۔''[5] اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہیں جو اگر شامیوں سے روایت کریں تو ثقہ اور اگر حجازیوں سے روایت کریں تو ضعیف شمار کیے گئے ہیں۔

④ احمد، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے دوائے خبیث سے منع فرمایا، یعنی زہر سے۔[6] مؤلف تفسیر المنار (علامہ رشید رضا مصری) نے افادہ دیا کہ اگر چند قطرے جو ظاہر نہ ہوں اور جو نشہ طاری نہیں کر سکتے، دوا میں شامل کر لیں (یعنی اگر ایسا کرنا ضروری ہے) تو حرج نہیں جیسے لباس میں قلیل سا ریشم لگا لینے کی اباحت ہے۔

کافر معالج

ابن مفلح رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الآداب الشرعیۃ'' میں الشیخ تقی الدین رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی قابلِ اعتماد یہودی یا نصرانی ماہر معالج ہو تو اس سے علاج کرانا جائز ہے، یہ ویسے ہی ہے جیسے کہ اس کے پاس اپنا مال امانت رکھوائے اور کوئی دیگر معاملہ کرے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

---

① صحيح، سنن ابن ماجه: ٣٤٣٦؛ المستدرك للحاكم: ٤/ ٤٤٥. ② صحيح مسلم: ٢٢٠٤؛ مسند أحمد: ٣/ ٣٣٥. ③ صحيح مسلم: ١٩٨٤؛ سنن أبي داود: ٣٨٧٣. ④ صحيح البخاري تعليقاً: ١٠/ ٧٨.
⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ٣٨٧٤. ⑥ صحيح، سنن ترمذي: ٢٠٤٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٤٥٩.

﴿ وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ﴾(آل عمران: ۷۵)

''اہل کتاب میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک خزانہ امانت رکھ دے تو وہ اسے تیری طرف ادا کر دے گا اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھے تو وہ اسے تیری طرف ادا نہیں کرے گا، مگر جب تک تو اس کے اوپر کھڑا رہے۔''

اس آیت میں اہل کتاب سے لین دین کا معاملہ کرنے کا ذکر ہے، صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب ہجرت کی تو راستہ دکھلانے کے لیے ایک مشرک شخص کو اجرت پر رکھا تھا، خزاعہ قبیلہ کے تمام افراد چاہے مسلمان ہوں یا کافر نبی کریم ﷺ کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے، مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (مشہور عرب طبیب) حارث بن کلدہ جو کافر تھا، سے علاج کرانے کا حکم دیا (یہ حکم سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کے لیے تھا جو دل کے مریض تھے) ہاں اگر کوئی مسلمان ماہر معالج موجود ہو تب اسے چھوڑ کر کافر معالج کے پاس جانا مناسب نہیں، لیکن اگر ضرورت ہے کہ یہودی یا عیسائی سے علاج کرائے یا اس کے پاس امانت رکھوائے تو یہ یہود و نصاری کی اس ولایت (یعنی دوستی) میں سے نہیں جس سے (قرآن میں) نہی وارد ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ﴾(المائدہ: ۵۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہود و نصار کو دوست مت بناؤ۔''

اگر اس سے اچھے طریقے سے مخاطب ہو تو اچھی بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (العنکبوت: ۴۶)

''اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔''

ابو الخطاب نے صلح حدیبیہ کی حدیث اور نبی کریم ﷺ کے ایک خزاعی شخص کو اپنا جاسوس بنانے اور اس کی اطلاعات قبول کرنے کے بارے تبصرہ کیا کہ اس میں کافر معالج کی بتلائی مرض کی علامات اور نسخہ قبول کرنے کے جواز پر دلیل ہے، اگر وہ بھروسے والا آدمی ہے۔

خاتون معالج سے علاج کرانے کا جواز

مرد معالج کا خاتون اور خاتون معالج کے لیے مرد کا علاج کرنا جائز ہے، بخاری نے اس عنوان سے ترجمہ قائم کیا: ''هَلْ يُدَاوِيْ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ وَالْمَرْأَةُ الرَّجُلَ'' کیا مرد و عورت ایک دوسرے کا علاج کر سکتے ہیں؟ پھر اس کے تحت سیدہ ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی: کہتی ہیں کہ ہم غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جاتیں اور لوگوں کو پانی

پلاتیں اوران کے کام کاج کرتیں، نیز شہداء کی لاشیں اورزخمیوں کو مدینہ منتقل کرنا ہماری ذمہ داری تھی۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ ضرورت کے تحت اجانب (یعنی غیر محرم) کاایک دوسرے کا علاج کرنا/کرانا جائز ہے اورحسبِ ضرورت لمس ونظر بھی جوعلاج کے دوران میں ضروری ہو، ابن مفلح رحمہ اللہ اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں: اگرعورت بیمار ہے اور ادھر مرد معالج ہے تو بغرضِ علاج ضروری نظر ڈالنا جائز ہے، حتیٰ کہ شرمگاہ پر بھی، اسی طرح آدمی کا آدمی کی نسبت بھی، بقول ابن حمدان اگرکسی مقام پر صرف خاتون معالج ہی ہے تو مرد حضرات اس سے علاج کرا سکتے ہیں، حتیٰ کہ نازک مقامات کا بھی، قاضی کہتے ہیں: طبیب کے لیے جائز ہے کہ حسبِ ضرورت عورت کے اندرونی اعضاء کا معائنہ کرے، اسی طرح مرد کے بھی۔

دم جھاڑے کے ذریعے علاج

ایسا کرنا جائز ومشروع ہے، اگر دم اور پڑھے جانے والے کلمات اللہ کے ذکر پر مشتمل ہوں اورعربی الفاظ اور قابلِ فہم ہوں، کیونکہ نہ سمجھ آنے والے نامانوس الفاظ کی نسبت گمان ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی شرکیہ کلمات ہوں، سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم زمانہ جاہلیت میں دم کیا کرتے تھے، مسلمان جب ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ”مجھ پر اپنے دم پیش کرواوراس دم کے کلمات میں حرج نہیں، جس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔“[2] اسے مسلم اورابوداود نے تخریج کیا، ربیع کہتے ہیں، میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے دم کے بارے پوچھا: تو انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں اگراللہ کی کتاب اورمعروف ذکر اذکار کے ساتھ دم کرو، پھر پوچھا: کیا اہلِ کتاب سے دم کرالیں؟ کہا: ہاں اگروہ معروف کتاب اللہ اورذکر اللہ کے ساتھ دم کریں۔

ذیل میں اس ضمن کی بعض دعائیں ذکر کی جاتی ہیں:

① بخاری اورمسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہلِ خانہ کو دم کرتے اوراس دوران میں دائیں ہاتھ سے چھوتے اور یہ الفاظ کہتے: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ أَذْهِبِ الْبَأْسَ اِشْفِ أَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَماً» ”اے لوگوں کے رب! اس بیماری کو دور کر، شفا دے تو ہی شفا دینے والا ہے تیری شفا کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ بیماری باقی نہ رہے۔“[3]

② مسلم نے سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا: انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ جسم میں ایک جگہ سخت درد ہے تو آپ نے فرمایا: ”اپنا ہاتھ اس جگہ رکھو اور کہو: «بِاسْمِ اللّٰهِ»، پھر سات مرتبہ یہ پڑھو“ «أَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَ أُحَاذِرُ» ”میں اللہ کی عزت وقدرت کے ساتھ پناہ کا طالب ہوں اس چیز کے شر سے جو میں پاتا ہوں اور اندیشہ ہائے دور ودراز میں ہوں۔“ کہتے ہیں: چند مرتبہ یہ دم کرنے سے وہ سارا درد ختم ہوگیا تو اب جسے بھی کوئی درد ہوتا ہے اسے یہ دم بتلاتا ہوں۔[4]

---

① صحيح البخاري: ٥٦٧٩. ② صحيح مسلم: ٢٢٠٠، سنن أبي داود: ٣٨٨٦. ③ صحيح البخاري: ٥٧٤٣، صحيح مسلم: ٢١٩١. ④ صحيح مسلم: ٢٢٠٢، سنن أبي داود: ٣٨٩١.

③ ترمذی نے محمد بن سالم سے نقل کیا کہ مجھ سے ثابت بنانی رحمہ اللہ نے کہا: اگر تمہیں کوئی عارضہ لاحق ہو تو جہاں درد وغیرہ ہو اس جگہ اپنا ہاتھ رکھو، پھر کہو: ((بِسْمِ اللَّهِ أَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللَّهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ مِنْ وَجْعِيْ هٰذَا)) پھر ہاتھ اٹھالو، پھر یہی کرو طاق عدد میں، بتلایا کہ یہ دم انہیں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بتلایا تھا۔

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی ایسے بیمار کی عیادت کی جس کی اجل ابھی حاضر نہیں اور اس کے پاس سات مرتبہ کہا: ((أَسْأَلُ اللَّهَ الْعَظِيْمَ، رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ أَنْ يَشْفِيَكَ)) ''میری اللہ عرشِ عظیم کے مالک سے دعا ہے کہ تجھے شفا دے'' تو اللہ اس مرض سے اسے شفا عطا کرے گا۔''[1] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور بقول ترمذی یہ حسن ہے، حاکم نے اسے بخاری کی شرط پر صحیح قرار دیا۔

⑤ بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو یہ دم کرتے: ((أُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ)) ''میں اللہ کے تام کلمات کے ساتھ تمہیں اس کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان سے اور ہر مہلک زہر والی موذی چیز سے اور ہر بد نظر سے'' اور فرماتے: ''تمہارے جدِ امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کو یہی دم کیا کرتے تھے۔''[2]

⑥ مسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عیادت کی اور یہ دعا فرمائی: ((اَللّٰهُمَّ اشْفِ سَعْدًا)) تین مرتبہ کہا ''اے اللہ! سعد کو شفا دے۔''[3]

شرکیہ تعویذ گنڈوں سے نہی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعویذوں سے نہی فرمائی ہے۔ دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تعویذ لٹکایا اور جس نے گھونگا باندھا، اللہ اسے محروم کرے۔''[4] اسے احمد اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: اس کی سند صحیح ہے، یہاں تعویذ (عربی میں اس کے لیے تمیمۃ کا لفظ استعمال کیا) سے مراد جاہلیت کا تعویذ ہے جسے عرب اپنے بچوں کو باندھا کرتے تھے، تاکہ وہ ان کے حسبِ زعم نظرِ بد سے بچ سکیں تو اسلام نے اس کا ابطال کیا اور اس سے نہی صادر کی۔

② سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ اپنی زوجہ کے گلے میں تعویذ بندھا دیکھا تو اسے کاٹ دیا، پھر کہا: آل عبداللہ اس امر سے بے پروا ہوگئے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے جس کی اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، پھر کہا: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ((اِنَّ الرُّقٰى، وَالتَّمَائِمُ، وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ)) ''(مشرکانہ الفاظ والے) تمام دم،

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٣١٠٦؛ سنن ترمذي: ٢٠٨٣. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٤٧٣٧؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٢٥. [3] صحيح مسلم: ١٦٢٨؛ مسند أحمد: ١/ ١٦٨، ١٧١. [4] ضعيف، مسند أحمد: ٤/ ١٥٤؛ مسند ابي يعلىٰ: ١٧٥٩.

تعویذ اور جادو کرنا/کرانا شرک ہے۔'' لوگوں نے کہا: اے عبداللہ! دم اور تعویذ تو ہم جانتے ہیں، یہ تولۃ کیا ہے؟ کہا: یہ ایک چیز ہے جسے بیویاں شوہروں کی نظروں میں محبوب ہونے کی غرض سے کرتی ہیں۔[1] (بقول محشی کہا گیا: یہ وہ دھاگہ ہے جس میں کوئی جادوٹونہ پڑھا جاتا یا کاغذ جس میں کچھ تحریر ہوتی تھی تاکہ عورتیں مردوں کے دلوں میں جگہ بنائیں یا مرد اس غرض کے لیے کرتے یعنی تعویذِ محبت) اسے حاکم اور ابن حبان نے نقل کیا اور حکمِ صحت لگایا۔

③ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے بازو پر ایک کڑا سا بندھا دیکھا، بقول راوی شاید یہ بھی کہا کہ پیتل کا تو آپ نے فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' کہنے لگا: ''مِنَ الْوَاهِنَةِ'' (کمزوری، ریاح جو بڑھاپے میں کندھوں یا بازو میں یا ان دو رگوں میں ہوجاتی ہے جس کا نام اخدعان ہے)۔ فرمایا: ''یہ تو وہن کو اور زیادہ کرے گا، اسے اتار دو، اگر اسی حالت میں مرجاتے تو کبھی فلاح نہ پاتے۔''[2] اسے احمد نے نقل کیا۔

واہنہ ایک رگ کی بیماری ہے جو کندھے یا پورے بازو میں ہوتی ہے۔ بعض نے کہا: کندھے کی ایک درد ہے، اس آدمی نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اسے اس درد سے بچائے گی پیتل کا یہ کڑا باندھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور اسے تمائم میں سے باور کیا۔

④ ابوداود نے عیسیٰ بن حمزہ سے نقل کیا کہ میں عبداللہ بن عکیم کے پاس گیا اور انہیں حمرۃ تھا (یہ وبائی مرض ہے جس میں بخار آتا ہے اور جسم پر سرخ دانے نمودار ہوجاتے ہیں) کہا: آپ تمیمہ کیوں نہیں باندھ لیتے؟ کہا: ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی چیز باندھی وہ اسی کے سپرد کردیا گیا۔''[3]

کیا کتاب وسنت میں وارد دعائیں لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھی جاسکتی ہیں؟

عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور انہوں نے اپنے دادا سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تم میں سے نیند میں گھبرا جائے (خوف کھائے) وہ یہ دم پڑھے: ((أُعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ)) تو اسے کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔'' سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما یہ دم اپنے سنِ شعور کو پہنچ چکے بچوں کو سکھلایا کرتے تھے اور جو ابھی چھوٹے ہوتے تو ایک کاغذ میں لکھ کر ان کی گردن میں باندھ دیتے۔[4] (مگر گلے میں تعویذ لٹکانے والی بات کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا) اسے ابوداود، نسائی اور ترمذی نے تخریج کیا اور کہا کہ یہ حسن غریب ہے، حاکم نے بھی اسے نقل کیا اور کہا کہ اس کی اسناد صحیح ہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، مالک اور اکثر شوافع بھی ان تعویذوں کے جواز کے قائل ہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، سیدنا ابن عباس، ابن مسعود، حذیفہ رضی اللہ عنہم،

---

① صحيح، سنن ابن ماجه: ٣٥٣٠. ② مسند أحمد: ٤/ ٤٤٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٣١؛ صحيح ابن حبان: ٦٠٨٥. ③ ضعيف، سنن نسائي: ٣٥٧٨؛ سنن ترمذي: ٢٠٧٢. ④ حسن، سنن أبي داود: ٣٨٩٣؛ سنن ترمذي: ٣٥٢٨.

احناف اور بعض شوافع اور امام احمد رحمہ اللہ ۔ ان سے منقول دوسری روایت کے مطابق ۔ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان تعویذوں کو لٹکانا اور باندھنا جائز نہیں، ان کا استدلال سابق الذکر نہی عام کے بارے میں احادیث سے ہے۔

مریض کے لیے منع ہے کہ وہ تندرستوں کے درمیان رہے

جسے کوئی متعدی مرض لگی ہو، اسے تندرستوں کے مابین رہنے سے روک دینا جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((لَا يُوْرَدَنَّ مُمَرِّضٌ عَلٰی مُصِحٍّ)) تو یوں بیمار اونٹوں والوں کو منع کیا تھا کہ انہیں صحیح وتندرست اونٹوں کے پاس لائیں اور یہ آپ کے اس فرمان کے باوجود کہ ((لَا عَدْوٰی وَلَا طِيَرَةَ)) ''نہ کوئی مرض متعدی ہے اور نہ کسی چیز میں نحوست ہے۔''[1]
اسی طرح منقول ہے کہ ایک کوڑھ زدہ شخص کی بابت پتہ چلا کہ وہ آپ سے بیعت کے لیے آنا چاہتا ہے تو آپ نے اسے پیغام بھیجا کہ تمہاری بیعت ہوگئی اور اسے مدینہ داخل ہونے سے روک دیا۔

طاعون زدہ علاقے سے نکلنے یا ادھر کا رخ کرنے کی ممانعت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقے سے نکلنے سے منع فرمایا ہے جہاں طاعون واقع ہو چکا ہو، اسی طرح وہاں جانے سے بھی۔ کیونکہ اس میں اس وبا کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے اور اس لیے یہ وبا ایک ہی علاقہ میں محدود رہے اور (آنے جانے والوں کے ذریعے) دیگر علاقوں میں منتشر نہ ہو، اسے ''اَلْحَجَرُ الصِّحِّيْ'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے (یعنی صحت کی ایمرجنسی) ترمذی نے حسن صحیح کہا اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ''یہ اس رجز وعذاب کا بقیہ ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر بھیجا گیا تھا، اگر کسی جگہ اس کا وقوع ہو اور تم ادھر ہو تو وہاں سے مت نکلو اور اگر کسی جگہ واقع ہو اور تم ادھر نہیں تو ادھر کا رخ نہ کرو!''[2] بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (اپنے دورِ خلافت میں) شام کی طرف نکلے جب مقامِ سرغ پہ پہنچے تو لشکرانِ اسلام کے امراء سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور ان کے دیگر ساتھی آئے اور بتلایا کہ ارضِ شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ مہاجرین اولین کو بلا کر لاؤ، وہ آئے تو اس بابت ان سے مشاورت کی، ان کے بعض نے کہا: ہم ایک مقصد لے کر چلے ہیں اب ہمیں اسے پورا کیے بغیر واپس نہیں ہونا چاہیے جبکہ بعض کی رائے تھی کہ آپ کے ہمراہ بقیہ لوگ (یعنی جو وبا کا شکار نہیں) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں تو ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ انہیں لے کر وبا زدہ علاقے میں جائیں تو انہیں جانے کا کہہ کر انصار کو بلانے کا حکم دیا، وہ آئے تو یہی مسئلہ ان کے سامنے رکھا، بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما: ان سب نے متفقہ طور پر کہا: ہماری رائے ہے کہ آپ لوگوں کو واپس لے چلیں اور انہیں وبا زدہ جگہ لے جانا مناسب نہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے منادی کرادی کہ میں کل صبح واپس ہو رہا ہوں تو آپ سب بھی واپسی کی تیاری کرلو، اس پر سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا اللہ کی تقدیر سے فرار ہوتے ہیں؟

---

[1] صحیح البخاری: ۵۷۰۷؛ صحیح مسلم: ۲۲۲۰. [2] صحیح، سنن ترمذی: ۱۰۶۵.

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے ابوعبیدہ! کاش یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی! ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف فرار ہو رہے ہیں، دیکھو اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم انہیں لے کر دو وادیوں کے سامنے ہوئے ہو ایک تو سرسبز ہے جبکہ دوسری خشک تو اگر سرسبز میں انہیں داخل کیا تو کیا یہ اللہ کی تقدیر سے نہ ہوا؟ اسی طرح اگر انہیں خشک میں لے گئے تو بھی، کہتے ہیں: اسی اثنا میں سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آ گئے جو کہیں کام سے گئے ہوئے تھے، کہنے لگے: اس مسئلہ میں میرے پاس تعلیم نبوی ہے، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جب سنو کہ کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھیلی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر کسی علاقے میں ہو اور تم بھی ادھر ہو تو وہاں سے مت نکلو۔'' کہتے ہیں: اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی حمد کی اور واپس مدینہ آ گئے۔[1]

ہمیشہ موت کو یاد رکھنے اور عمل کے ساتھ اس کے لیے تیاری کرنے کا استحباب

شارع علیہ السلام نے موت کو یاد رکھنے اور عملِ صالح کے ساتھ اس کی تیاری کرنے میں ترغیب دلائی ہے اور اسے خیر کی علامت شمار کیا ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دس میں سے دسواں تھا تو ایک انصاری اٹھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! سب سے دانا اور عقلمند کون شخص ہے؟ فرمایا: ''جو سب سے بڑھ کر موت کا ذکر کرتا ہے اور اس کے لیے زیادہ تیاری کرتا ہے، یہ دانا لوگ ہیں، انہیں دنیا کا شرف بھی ملا اور آخرت کی سرفرازی بھی۔''[2] انہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: «أَكْثِرُوْا مِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَّاتِ» ''لذات توڑنے والی (موت) کو کثرت سے یاد کیا کر۔''[3] ان دونوں کو طبرانی نے بسندِ حسن نقل کیا، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولہ تعالیٰ ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ ''اللہ جس کا سینہ چاہے اسلام کے لیے کھول دے۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''جب نور (اسلام) دل میں جاگزین ہوتا ہے تو وہ کشادہ اور منشرح ہو جاتا ہے!'' صحابہ نے کہا: کیا اس کی معرفت کی کوئی علامت ہے؟ فرمایا: «اَلْإِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَ التَّخَلِّيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ لِقَاءِ الْمَوْتِ» ''ہمیشگی والے گھر کا خیال ہمیشہ دل میں جاگزین ہونا، اس دھوکوں بھری دنیا سے نفرت اور موت سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔'' اسے ابن جریر نے نقل کیا اور اس کے متعدد مرسل و متصل طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں۔[4]

موت کی تمنا کرنے کی کراہت

انسان کے لیے مکروہ ہے کہ موت کی تمنا یا اس کی دعا کرے، اس وجہ سے کہ فقر، بیماری یا کسی مصیبت کا شکار ہو، جماعت نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی پریشانی کی وجہ سے کوئی مرنے کی تمنا نہ کرے، بوقتِ مجبوری یہ کہے: اے اللہ! جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہے، مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے

---

[1] صحیح البخاری: ۵۷۲۹۔ [2] صحیح، سنن ابن ماجہ: ۴۲۵۹؛ شعب الایمان للبیہقی: ۷۹۹۳، ۱۰۵۵۔
[3] حسن، صحیح ابن حبان: ۲۹۹۵۔ [4] تفسیر ابن جریر الطبری: ۱۲/ ۱۰۰؛ تحت تفسیر الآیۃ: الانعام: ۱۲۵۔

موت دے دینا۔''① تمنائے موت سے نہی کی حکمت جو سیدہ ام فضل رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ذکر ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے جو بیمار تھے اور موت کی تمنا کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: ''اے عباس! اے رسول اللہ کے چچا! موت کی تمنا نہ کرو کیونکہ اگر نیک ہو تو مزید نیکیاں ہوتی اور بڑھتی رہیں گی اور اگر نیک نہیں تو پھر بھی موت کی تمنا نہ کرو کہ شاید مہلت ملے اور کسی وقت توبہ کی توفیق نصیب ہو۔''② اسے احمد اور حاکم نے تخریج کیا اور کہا کہ یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے، اگر کسی کو خدشہ اور خوف ہو کہ اس کا دین خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ فتنہ کا شکار بنا دیا جائے گا، تب بلا کراہت اپنے لیے موت کی خواہش اور دعا کرنا جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور دعاؤں میں سے ایک دعا کے الفاظ ہیں: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنَ وَأَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَتَرْحَمَنِيْ وَإِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةً فِيْ قَوْمِيْ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ» ''اے اللہ! میں تجھ سے نیک کام کرنے اور برے کاموں کے ترک کی توفیق اور مساکین کی محبت کا سوالی ہوں اور یہ کہ تو میری مغفرت کرے اور مجھ پر رحم کر اور اگر میری قوم کو کسی فتنہ میں ڈالنے کی مشیت ہو تو مجھے اس فتنہ سے پہلے ہی فوت کر لینا۔''③ اسے ترمذی نے حسن صحیح قرار دے کر نقل کیا، مؤطا میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ یوں دست بدعا ہوئے: «اَللّٰهُمَّ كَبُرَتْ سِنِّيْ وَضَعُفَتْ قُوَّتِيْ وَانْتَشَرَتْ رَعِيَّتِيْ فَاقْبِضْنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مُضَيِّعٍ وَلَا مُفَرِّطٍ» ''اے اللہ! میری عمر بڑھ گئی اور میری قوت کمزور پڑ چکی اور میری رعایا دور دور تک پھیل چکی ہے پس تو مجھے قبل اس کے کہ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو یا کسی کے حق کا ضیاع ہو اپنے پاس بلا لے۔''④

حسنِ عمل کے ساتھ طول عمر کی فضیلت

① عبدالرحمن بن ابی بکرہ اپنے والد سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! کون سا آدمی بہتر ہے؟ فرمایا: ''جس کی عمر طویل ہو اور اس کا عمل بھی نیک ہو۔'' پھر پوچھا کون سا آدمی بدتر ہے؟ فرمایا: ''جس کی عمر طویل لیکن عمل برا ہوا۔''⑤ اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے۔

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمھیں تمہارے بہترین آدمی کی بابت نہ بتلاؤں؟'' عرض کی: جی یا رسول اللہ! فرمایا: ''جس کی عمر طویل اور عمل اچھے ہوں۔''⑥ اسے احمد وغیرہ نے بسند صحیح نقل کیا۔

موت سے قبل کسی عملِ صالح کا ہونا حسنِ خاتمہ کی دلیل ہے

احمد، ترمذی، حاکم اور ابن حبان نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ جب کسی کے ساتھ ارادۂ خیر کرتا ہے تو اسے استعمال کرتا ہے۔'' کہا گیا: وہ کس طرح؟ فرمایا: ''اسے موت سے قبل کسی عملِ صالح کی توفیق دیتا ہے،

---

① صحیح البخاری: ٥٦٧١، صحیح مسلم: ٢٦٨٠. ② صحیح، مسند أحمد: ٦/ ٣٣٩؛ مسند ابی یعلیٰ: ٧٠٧٦.
③ صحیح، سنن ترمذی: ٣٢٣٥. ④ المؤطا امام مالك: ٢/ ٨٢٤. ⑤ صحیح، سنن ترمذی: ٢٣٣٠؛ مسند أحمد: ٥/ ٤٠، ٤٣. ⑥ صحیح، ابن حبان: ٢٩٨١؛ مسند البزار: ١٩٧١.

پھر اسی پر اس کی روح قبض کر لیتا ہے۔[1]

اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے کا استحباب

مناسب ہے کہ مریض اللہ کی رحمت کی وسعت کو یاد کرے اور اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھے، مسلم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفات سے تین دن قبل سنا: آپ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا ہو۔''[2] اس حدیث سے رجا پسندی غالب ہونے اور عفو کی امید رکھنے کا استحباب ثابت ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں اس کی ملاقات ہو جو اس کی ذات کو بہت محبوب ہے کیونکہ وہ رحمن، رحیم، جواد اور کریم ہے اور اسے عفو و رجا پسند ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''ہر ایک کو اسی حالت پر اٹھایا جائے گا جس پر وہ مرا ہوگا۔''[3] ابن ماجہ اور ترمذی نے جید سند سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتے ہوئے نوجوان کی عیادت کو آئے اور پوچھا: ''اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو؟'' کہنے لگا: اللہ سے امید لگی ہے اور اپنے گناہوں کا خوف ہے، فرمایا: ''کسی بندے کے دل میں اس قسم کے وقت میں یہ دونوں چیزیں جمع نہ ہوں گی مگر اسے اس کی حسبِ امید اللہ تعالیٰ عطا کرے گا اور اس خوف سے اسے امن دے گا جو اسے لاحق ہوا۔''[4]

مرنے والے کے پاس دعا اور ذکر کرنے کا استحباب

مستحب ہے کہ مرنے والے کے پاس صالحین آئیں اور اللہ کا ذکر کریں، احمد، مسلم اور اوراصحابِ سنن نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی بیمار یا مرتے شخص کے پاس جاؤ تو خیر کی باتیں کہو کیونکہ فرشتے تمہاری باتوں پر آمین کہتے ہیں۔'' کہتی ہیں: جب سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ (سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر، ان کی وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کر لی تھی) فوت ہوئے تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے ہیں، آپ نے فرمایا: ''یہ دعا کرو!'': ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلَهُ وَأَعْقِبْنِيْ مِنْهُ عُقْبىٰ حَسَنَةً)) ''اے اللہ! مجھے اور مرحوم کو معاف فرما اور میرا انجام بخیر کر۔'' کہتی ہیں: میں نے یہی دعا کی تو اللہ نے مجھے ان سے بہتر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے نواز دیا۔[5] صحیح مسلم میں ان سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، جن کی آنکھیں کھلی رہ گئیں تھیں (اور وہ وفات پا چکے تھے) تو آپ نے ان کی آنکھیں بند کیں اور فرمایا: ''جب روح قبض کی جاتی ہے تو نظر اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔'' ان کے کچھ رشتہ دار چیخ و پکار کرنے لگے تو آپ نے فرمایا: ''اس وقت بھلی باتیں ہی کرو، کیونکہ فرشتے تمہاری باتوں پر آمین کہتے ہیں۔'' پھر یہ دعا کی: ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما، مہدیین میں اس کا درجہ بلند فرما، اس کے لواحقین کا کوئی اچھا جانشین بنا اور اے رب العالمین! ہمارے لیے اور اس کے لیے مغفرت فرما اور اس کی قبر کو کھلی اور منور فرما۔''[6]

---

[1] صحيح، سنن ترمذی: ٢١٤٢؛ مسند أحمد: ٣/ ١٠٦. [2] صحيح مسلم: ٢٨٧٧؛ سنن أبی داود: ٣١١٣.
[3] صحيح مسلم: ٢٨٧٨. [4] حسن، سنن ترمذی: ٩٨٣؛ سنن ابن ماجه: ٤٢٦١. [5] صحيح مسلم: ٩٠٩؛ سنن أبی داود: ٣١١٥. [6] صحيح مسلم: ٩٢٠؛ سنن ابن ماجه: ١٤٥٤.

نزع کے عالم میں کیا کرنا مسنون ہے؟

اس حالت میں درج ذیل امور مسنون ہیں:

① مرتے ہوئے کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرنا

مسلم، ابوداود اور ترمذی نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مرتے ہوؤں کو لا الہ الا اللہ (کہنے) کی تلقین کیا کرو۔''[1] ابوداود اور حاکم نے صحیح قرار دیا اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کی آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوئی، وہ جنت میں داخل ہوا۔''[2] یہ تلقین اس صورت میں ہوگی کہ اگر وہ بذاتِ خود کلمہ نہیں پڑھ رہا، لیکن اگر خود ہی پڑھ رہا ہے تب اس کی ضرورت نہیں، پھر ایسے شخص کو جو سن اور سمجھ رہا ہے، اگر کوئی بے ہوش ہے یا غشی طاری ہے، تب یہ ممکن نہیں، بولنے سے عاجز مرتا ہوا شخص اپنے دل میں کلمہ پڑھ لے، علماء کہتے ہیں: اصرار نہ کیا جائے اور نہ براہِ راست اسے مخاطب کر کے کہا جائے کہ کلمہ پڑھو کہ کہیں تکلیف کے عالم میں وہ تنگ پڑے اور انکار کر دے یا کوئی اور غیر مناسب بات کہہ دے، انداز یہ ہونا چاہیے کہ حاضرین اسے سنا کر اس کا ورد کریں تا کہ وہ خود ہی توجہ کرے اور کلمہ پڑھ لے، اگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو پھر تلقین نہ کی جائے لیکن اگر اس نے پھر کوئی بات کی تب پھر سے اسے تلقین کی ضرورت ہوگی تا کہ اس کے منہ سے نکلا آخری جملہ کلمہ لا الہ الا اللہ ہو۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ مرتے ہوئے شخص کو اس حدیث کے ظاہر کے مدِ نظر کلمہ کے صرف پہلے جزو یعنی لا الہ الا اللہ کی تلقین کی جائے، البتہ بعض کا خیال ہے کہ پورے کلمے کی کیونکہ مقصود تذکرِ توحید تھا جو دونوں اجزا پر متوقف ہے۔

② اسے قبلہ رخ دائیں پہلو کے بل لٹا دیا جائے

چنانچہ بیہقی اور حاکم نے حکمِ صحت لگایا اور سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے آئے تو سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ کے بارے دریافت فرمایا، بتلایا گیا کہ وہ تو فوت ہو چکے اور اپنے ترکہ کے تیسرے حصے کی آپ کے لیے وصیت کی ہے اور یہ بھی وصیت کی تھی کہ مرتے وقت ان کا چہرہ قبلہ رخ کر دیا جائے تو آپ نے فرمایا: «أَصَابَ الْفِطْرَةَ» ''وہ فطرت پر فوت ہوئے۔'' اپنے حصہ میں آیا ثلث مال آپ نے ان کے بیٹے کو واپس کر دیا، پھر ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی اور یہ دعا کی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَأَدْخِلْهُ جَنَّتَكَ»[3] بقول حاکم مرتے ہوئے شخص کا منہ قبلہ رخ کرنے کے بارے اس روایت کے علاوہ میں کوئی اور نہیں جانتا، احمد نے روایت نقل کی کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت قبلہ رخ ہو گئیں اور دائیں بازو کا تکیہ بنا لیا۔[4] یہ وہ صفت و ہیئت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے والے

---

① صحیح مسلم: ٩١٦؛ سنن أبی داود: ٣١١٧. ② سنن أبی داود: ٣١١٦. ③ ضعیف، المستدرك للحاکم: ١/ ٣٥٣؛ السنن الکبری للبیهقی: ٣/ ٣٨٤. ④ ضعیف، مسند أحمد: ٦/ ٤٦١؛ شعیب ارناؤوط حفظہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

کوحکم دیا کہ (شروع میں) اس طرح لیٹے، قبر میں میت بھی اسی طرح ہونی چاہیے، امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک روایت میں ہے کہ میت کے پاؤں قبلہ کی طرف کر کے اسے گدی کے بل لٹانا چاہیے اور سر تھوڑا اٹھا ہو تا کہ اس کا چہرہ قبلہ رو ہو، مگر اول حالت ہی اولیٰ ہے اور جمہور بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

③ اس موقع پر سورۂ یٰس کی تلاوت ہونی چاہیے

کیونکہ احمد، ابوداود، نسائی، حاکم اور ابن حبان۔ آخری دونوں نے حکم صحت لگایا۔ نے سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یٰس قرآن کا دل ہے۔ اللہ اور دارِ آخرت کا چاہنے والا کوئی اس کی تلاوت نہ کرے گا، مگر اسے بخش دیا جائے گا اور اپنے مرتے ہوؤں پر اس کی تلاوت کرو۔''[1] بقول ابن حبان رحمہ اللہ مرتے ہوؤں سے مراد جو نزع کے عالم میں ہوں، یہ نہیں کہ میت پر پڑھی جائے (بقول محشی ابن قطان نے اس روایت کو اضطراب، وقف اور بعض رواۃ کے مجہول الحال ہونے کے ساتھ معلل کیا ہے، دارقطنی سے منقول ہے کہ یہ حدیث مضطرب الاسناد اور مجہول المتن ہے صحیح نہیں) اس معنی کی تائید، احمد کی صفوان سے روایت کرتی ہے، کہتے ہیں کہ مشائخ کہا کرتے تھے: اگر موت کے وقت یٰس پڑھی جائے تو جان نکلنے میں آسانی ہوتی ہے، مؤلف مسند الفردوس نے اسے سیدنا ابو درداء اور ابوذر رضی اللہ عنہما کی طرف مسند کیا، کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مرتے ہوئے کے پاس یٰس نہیں پڑھی جائے گی مگر اللہ اس پر آسانی کر دے گا۔''[2]

④ مرنے کے بعد آنکھیں بند کرنا

مسلم نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، ان کی آنکھیں تب (فوت ہونے کے بعد) کھلی کی کھلی تھیں تو آپ نے انہیں بند کیا، پھر فرمایا: ''جب روح نکلتی ہے تو نظر اس کا پیچھا کرتی ہے۔''[3]

⑤ ڈھانپ دینا

تا کہ متغیر چہرہ نظروں سے چھپ جائے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فوت ہو گئے تو ایک چادر کے ساتھ ڈھانپ دیے گئے،[4] اسے شیخین نے نقل کیا، بالاجماع میت کو بوسہ دینا جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی میت کو بوسہ دیا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تشریف لائے اور جھک کر آپ کو بوسہ دیا اور کہا: ''یَا نَبِیَّاہْ یَا صَفِیَّاہْ'' ہائے نبی، ہائے پیارے!۔[5]

⑥ تجہیز و تکفین میں تاخیر نہ کرنا

میت کے ولی کو چاہیے کہ غسل دینے اور تکفین و تدفین اور جنازے میں جلدی کرے کہ مبادا لاش خراب ہو، ابو داود اس

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ۳۱۲۱؛ سنن ابن ماجہ: ۱۴۴۸. [2] مسند الفردوس: ۶۰۹۹. [3] صحیح مسلم: ۹۲۰؛ سنن ابن ماجہ: ۱۴۵۴. [4] صحیح البخاری: ۵۸۱۴؛ صحیح مسلم: ۹۴۲. [5] مسند ابی داود للطیالسی: ۱۶۴۹.

حدیث کے حکم کے بارے ساکت رہے اور حصین بن وَحْوَح سے روایت نقل کی کہ سیدنا طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لیے تشریف لائے اور لوگوں کو بتلایا: ''میرا خیال ہے کہ یہ بچیں گے نہیں، جب فوت ہو جائیں تو مجھے اطلاع کرنا اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا، کیونکہ مناسب نہیں کہ مسلمان کی نعش گھر والوں کے درمیان زیادہ دیر پڑی رہے۔''[1] سوائے میت کے ولی کے کسی کے آنے کا انتظار نہ کیا جائے، اس کا بھی ایک حد تک انتظار کیا جائے جب تک کہ لاش متغیر اور خراب ہونے کا خدشہ نہ ہو، احمد اور ترمذی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''اے علی! تین امور میں تاخیر نہ کیا کرنا: نماز میں جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ میں جب حاضر ہو اور عورت کا نکاح کرانے میں جب کفو مل جائے۔''[2]

⑦ میت کے قرض کی ادائیگی کرنا

احمد، ابن ماجہ جبکہ ترمذی نے حسن کہا اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کی جان اس کے ذمہ قرض کے ساتھ معلق رہتی ہے، حتی کہ اسے چکا دیا جائے۔''[3] یعنی اس کا معاملہ موقوف رہتا ہے اور اس کی نجات یا غیر نجات یا جنت سے محبوس کیے جانے کا معاملہ معرضِ التوا میں رکھا جاتا ہے، یہ ایسے شخص کے بارے میں ہے جو اس حال میں مرا کہ ادائیگی قرض کے لیے مال چھوڑا ہے، لیکن جس نے کوئی مال نہیں چھوڑا اور اس کے ذمہ قرض تھا جس کی ادائیگی پر عازم تھا تو ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے چکا دیں گے، اسی کا مثل وہ جو فوت ہوا اور مال چھوڑا اور وہ خود قرض وقت پہ چکانے کا عادی تھا، مگر اس کے ورثا نے اب ادا نہ کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے ہاں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرض لیا اور اس کا ارادہ اسے چکانے کا تھا تو اللہ اس کی طرف سے مناسب بندوبست فرما دے گا اور جس نے اس نیت سے قرض لیا کہ اتلاف کرے (یعنی ضرورت نہ تھی بلکہ فضول خرچی اور عیاشی کے لیے لیا) تو اللہ اس کا اتلاف کرے گا۔''[4] احمد، ابونعیم، بزار اور طبرانی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا: ''روزِ قیامت قرضدار کو اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اللہ پوچھے گا: اے ابن آدم! تم نے یہ قرض کس غرض سے پکڑا اور کن راہوں میں خرچ کیا؟ وہ عرض کرے گا: یا اللہ! تو خوب جانتا ہے میں نے یہ قرض پکڑا تو نہ کھایا اور نہ پیا اور نہ ضائع کیا بلکہ چوری ہو گیا تھا یا آگ کی نذر ہوا تھا تو اللہ کہے گا میرے بندے نے سچ کہا اور میں زیادہ حقدار ہوں کہ تیری طرف سے اسے چکا دوں، پھر اللہ تعالیٰ کوئی چیز اس کے میزان میں رکھ دے گا تو اس کی نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور وہ اس کی رحمت کے طفیل جنت میں داخل ہو جائے گا۔''[5]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض کی نماز جنازہ پڑھنے سے احتراز کیا کرتے تھے، پھر جب اللہ نے فتوحات کیں اور کشائش ہو گئی تو آپ نمازِ جنازہ پڑھنے لگے اور اس کا قرض اپنے ذمہ لے لیتے، بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں اہلِ ایمان

---

① ضعيف، سنن أبي داود: ٣١٥٩. ② سنن ترمذي: ١٧١؛ مسند أحمد: ١/ ١٠٥. ③ صحيح، سنن ترمذي: ١٠٧٨؛ سنن ابن ماجه: ٢٤١٣. ④ صحيح البخاري: ٢٣٨٧. ⑤ ضعيف، مسند أحمد: ١/ ١٩٨.

کی جانوں سے بھی بڑھ کر ان پر حق رکھتا ہوں، (جیسا کہ قرآن نے کہا) تو جو فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور ایسا ترکہ نہیں چھوڑا کہ قرض ادا ہو تو ہمارے ذمہ اس کی ادائیگی ہے اور جو مرنے والا مال چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا ہے۔''[1]

اس سے دلالت ملی کہ جو مقروض حالت میں فوت ہو اور قرض چکانے کی سبیل نہیں تو بیت المال سے اس کا ادا کیا جانا اس کا استحقاق ہے تو زکاۃ کے ایک مصرف ''الغارمین'' کی مد سے اسے ادا کیا جائے اور یہ کہ کسی کے مرنے سے اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔

موت کے وقت دعا کرنے اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کا استحباب

مستحب ہے کہ مسلمان اپنے کسی رشتہ دار (یا کسی کی بھی) موت کے وقت انا للہ پڑھے اور دعا کرے، اس ضمن میں چند دعائیں درج ذیل ہیں:

① احمد اور مسلم نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی انسان پر کوئی مصیبت آئے اور وہ کہے: «إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ آجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَأَخْلِفْ لِيْ خَيْراً مِنْهَا» ''بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری مصیبت کا اجر عطا فرما اور اس کا نعم البدل دے۔'' تو اللہ ایسا ہی کرتا ہے'' کہتی ہیں: جب (میرے شوہر) سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو میں نے بحکمِ نبوی یہی دعا پڑھی تو اللہ نے ان سے بہتر ان کا خلف مجھے عطا کر دیا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (کیونکہ آپ نے عدت کے بعد ان سے شادی کر لی تھی)۔[2]

② ترمذی نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اللہ فرشتوں سے کہتا ہے: تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی؟ وہ کہتے ہیں: جی ہاں! اللہ کہتا ہے: تم نے اس کے دل کا ٹکڑا لے لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں! اللہ کہتا ہے: اس پر میرے بندے نے کیا کہا تھا؟ وہ کہتے ہیں: یا اللہ! اس نے تیری حمد کی اور انا للہ پڑھی تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے جنت میں ایک محل بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔''[3] بقول ترمذی یہ حدیث حسن ہے۔

③ بخاری نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے پاس میرے اس بندے کی جزا صرف جنت ہی ہے جس کا اہلِ دنیا میں سے کوئی پیارا میں نے فوت کر لیا تو اس نے (صبر کیا اور) ثواب کی امید کی۔''[4]

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۣ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾(البقرۃ:۱۵۶۔ ۱۵۷) ''وہ ایسے ہیں کہ جب کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں: تو یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی

---

① صحيح البخاري: ٦٧٣١. ② صحيح مسلم: ٩١٨؛ مسند أحمد: ٦/ ٨٨. ③ حسن، سنن ترمذی: ١٠٢١؛ مسند أحمد: ٤/ ٤١٥. ④ صحيح البخاري: ٦٤٢٤.

رحمت ہوتی ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' کی تفسیر میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب مومن اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور مصیبت کے وقت ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھتا ہے تو اس کے لیے تین خیر کی خصلتیں لکھ دی جاتی ہیں: اللہ کی طرف سے صلاۃ، اس کی رحمت اور ہدایت کے راستے پر اسے گامزن رکھنا۔

دوستوں اور رشتہ داروں کو موت کی اطلاع دینے کا استحباب

علماء نے میت کے احباب، اقارب اور اہلِ صلاح کو اس کی موت کی خبر دینا مستحب قرار دیا ہے، تاکہ ان سب کو اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کا اجر ملے، جماعت نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سیدنا نجاشی کی وفات کی خبر دی، اسی دن جس دن وہ فوت ہوئے تھے اور انہیں لے کر جنازہ گاہ میں گئے اور صفیں بنوا کر چار تکبیروں کے ساتھ (غائبانہ) نمازِ جنازہ پڑھی۔[1] احمد اور بخاری نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دی اور یہ ان کی اطلاع آنے سے قبل ہی دی تھی (یہ صحابہ کرام جنگِ مؤتہ میں یکے بعد دیگرے شہید ہوئے تھے) امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس امر میں حرج نہیں کہ قرابت داروں اور دوستوں وغیرہ کو موت کی اطلاع دی جائے، بقول امام بیہقی رحمہ اللہ مجھے امام مالک رحمہ اللہ کا قول پہنچا کہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ مساجد کے دروازوں پر کسی کی موت کا ڈھنڈورا پیٹا جائے، ہاں اگر مسجد میں موجود حلقوں کی صورت بیٹھے لوگوں کو اطلاع دے تو حرج نہیں، احمد اور ترمذی نے حسن قرار دیا اور سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے نقل کیا کہ انہوں نے وصیت کی: جب میں مر جاؤں تو کسی کو خبر نہ کرانا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ یہ نعی بن جائے (یعنی جاہلیت کی طرز کا بین اور موت کی اطلاع) اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نعی سے منع فرماتے تھے۔[2] تو یہ اس نعی پر محمول ہے جو زمانہ جاہلیت میں معروف تھی کہ ان کی عادت اور عرف تھا کہ کوئی بڑا مرتا تو قبائل کی طرف ایک سوار کو بھیجتے جو کہتا: '' نَعَاءِ فُلَانًا '' لفظی ترجمہ: فلاں کی موت کی خبر پہنچاؤ یعنی عرب ہلاک ہو گئے کہ فلاں بڑا مر گیا اور یہ اعلان وہ روتے ہوئے اور چیخ و پکار کے دوران کرتا۔

میت پر رونا

علماء کا اجماع ہے کہ میت پر بغیر نوحہ کیے اور چلائے رونا جائز ہے، صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے حزن کے باعث عذاب نہیں دیتا، لیکن اس کے باعث وہ یا تو عذاب دے گا یا چاہے گا تو رحم کر دے گا۔'' اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا، آپ خود اپنے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال پر روئے تھے اور یہ الفاظ کہے تھے: ''بے شک آنکھ رو رہی ہے اور دل حزین ہے، لیکن ہم وہی بات منہ سے نکالیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو اور اے ابراہیم!

---

[1] صحیح البخاري: ١٢٤٥؛ صحیح مسلم: ٩٥١؛ سنن أبي داود: ٣٢٠٤. [2] حسن، سنن ترمذي: ٩٨٦؛ سنن بن ماجه: ١٤٧٦.

تمہاری جدائی کی ہمیں اداسی ہے۔''① اسی طرح آپ سیدہ امیمہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کے لیے روئے تو سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: آپ روتے ہیں! کیا آپ نے زینب کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ تو فرمایا: ''یہ تو رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے اور اللہ اپنے رحم دل بندوں پر ہی رحم کرتا ہے۔''② طبرانی نے سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر بین کیے (یعنی منہ سے الٹے سیدھے الفاظ نکالنے سے) رونے کی رخصت دی ہے۔

اگر رونا آواز اور نوحہ کے ساتھ ہو تو یہ میت کے الم اور تعذیب کے اسباب میں سے ہوگا (اس صورت میں کہ اگر وہ اس سے روک کر نہیں گیا ہو) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو زخم لگے اور وہ بے ہوش ہو گئے تو ان پر رویا چلایا گیا، جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے: کیا جانتے نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''میت کو زندہ کے رونے کے سبب عذاب ہوتا ہے۔''③ سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو زخم لگے تو سیدنا صہیب (رومی) رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''وَا أَخَاهْ'' ہائے میرے بھیا! تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے صہیب! کیا جانتے نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میت کو زندہ کے رونے کے باعث عذاب ہوتا ہے۔'' سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''جس پر نوحہ کیا گیا وہ اس کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔''④ ان روایات کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

معنائے حدیث یہ ہے کہ میت متألم ہوتی ہے اور اہل کا نوحہ کرنا اسے برا لگتا ہے، کیونکہ وہ ان کی آہ و بکاء سنتی ہے اور ان کے اعمال اس پر پیش کیے جاتے ہیں، یہ مطلب نہیں کہ گھر والوں کی آہ و بکا کے سبب وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہوتا ہے، کیونکہ قرآن نے ضابطہ وضع کیا کہ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰی﴾(الأنعام:١٦٤) ''کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔'' ابن جریر نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ''بے شک تمہارے اعمال تمہارے اقارب مُردوں پر پیش کیے جاتے ہیں تو اگر وہ خیر دیکھیں تو خوش ہوتے ہیں اور اگر شر دیکھیں تو یہ انہیں ناگوار لگتا ہے۔''

احمد اور ترمذی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے اعمال تمہارے اقارب اور ہم قبیلہ مُردوں پر پیش کیے جاتے ہیں، اگر خیر ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر اس کا غیر ہوں تو کہتے ہیں: اے اللہ! انہیں موت نہ دینا حتی کہ انہیں ہدایت دے، جیسے تو نے ہمیں دی۔''⑤ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بے ہوش ہو گئے تو ان کی بہن عمرہ رونے چلانے لگی اور ''وَا جَبَلَاهُ'' (ہائے پہاڑ جیسے میرے بھائی) وغیرہ الفاظ منہ سے نکالے، پھر افاقہ ہوا تو کہنے لگے: جو جملہ بھی تم نے بولا تو مجھے کسی کہنے والے نے کہا: کیا واقعی تم یہی تھے۔⑥ اسے بخاری نے تخریج کیا۔

---

① صحيح البخاري: ١٣٠٣؛ صحيح مسلم: ٢٣١٥. ② صحيح البخاري: ١٢٨٤؛ صحيح مسلم: ٩٢٣.
③ صحيح البخاري: ١٢٩٠؛ صحيح مسلم: ٩٢٧. ④ صحيح البخاري: ١٢٩١؛ صحيح مسلم: ٩٣٣.
⑤ ضعيف، مسند أحمد: ١٦٥. ⑥ صحيح البخاري: ٤٢٦٧، ٤٢٦٨.

نیاحہ (بین کرنا)

یہ نَوح سے ماخوذ ہے جو بلند آواز سے رونے کو کہتے ہیں، کئی احادیث اس طرح کے رونے کی تحریم کی صراحت کرتی ہیں، چنانچہ سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت میں جاہلیت کے چار امور رہیں گے جن کا ترک نہ ہو سکے گا: ① حسب ونسب پر فخر ② انساب میں طعن (بقول محشی یعنی کسی کو اس کے غیر والد کی طرف منسوب کرنا) ③ ستاروں کے ساتھ بارش کی طلب (بقول محشی یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ بارشوں کے نزول میں کوئی خاص ستاروں کی تاثیر ہے) اور نوحہ کرنا۔'' پھر فرمایا: ''اگر نوحہ کرنے والی (کیونکہ عام طور پر خواتین ہی یہ ذمہ داری انجام دیتی ہیں، لیکن اگر مرد بھی کریں تو ان کے لیے بھی یہی حکم ہے) نے مرنے سے قبل توبہ نہ کی تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس نے قطران (یہ تارکول کی مثل ایک مادہ جو بعض درختوں سے بنایا جاتا ہے) کی قمیص اور زرہ پہنی ہوگی جو جلد کو تار تار کر دے گی۔''① اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے وعدہ لیا کہ نوحہ نہ کیا کریں گی، اسے شیخین نے نقل کیا، بزار نے ثقہ سند کے ساتھ روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو آوازیں ایسی ہیں جو دنیا و آخرت دونوں میں ملعون ہیں، ایک: خوشی کے وقت آلاتِ موسیقی کی (یعنی گانا بجانا وغیرہ) اور دوم: مصیبت کے وقت بین اور نوحہ کی۔''② صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہا میں بھی اسی چیز سے بری ہوں جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے براءت کی تھی، بے شک آپ نے صالقہ، حالقہ اور شاقہ سے اعلانِ براءت کیا تھا (صالقہ وہ جو نوحہ اور بین کے ساتھ آواز بلند کرے، حالقہ وہ عورت جو مصیبت کے وقت سر منڈوا دے اور شاقہ وہ جو بین کرتے وقت اپنا گریبان وغیرہ پھاڑے)۔③ احمد نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے انہیں پابند کیا کہ وہ نوحہ نہ کریں گی، وہ کہنے لگیں: یا رسول اللہ! جاہلیت میں کچھ عورتوں نے بین کرنے میں ہمارا ساتھ دیا، کیا اسلام میں یہ اجازت ہے کہ (بدلے میں) ہم ان کا ساتھ دے دیں؟ فرمایا: ''اسلام میں اس کی بھی اجازت نہیں۔''④

میت کا سوگ

عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنے کسی رشتہ دار میت کا تین دن تک سوگ منائے اگر اس کا شوہر منع نہ کرے، اس سے زائد حرام ہے، اِلّا یہ کہ مرنے والا اس کا شوہر ہو تب واجب ہے کہ پوری عدت کی مدت جو چار ماہ اور دس دن ہے، سوگ کی کیفیت میں رہے، کیونکہ سوائے ترمذی کے باقی جماعت نے سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① صحيح مسلم: ٩٣٤؛ مسند أحمد: ٥/ ٣٣٤. ② صحيح البخاري: ١٣٠٦؛ صحيح مسلم: ٩٣٦.
③ صحيح البخاري: ١٢٩٦؛ صحيح مسلم: ١٠٤. ④ صحيح، مسند أحمد: ٣/ ١٩٧.

''کوئی عورت کسی مرحوم کا تین دن سے زائد سوگ نہ منائے مگر اپنے شوہر کا کیونکہ اس کا وہ چار ماہ دس دن تک سوگ منائے گی اور اس دوران میں وہ سوائے ثوبِ عَصب (یہ یمانی چادروں سے بنا لباس تھا) کے رنگدار لباس نہ پہنے نہ سرمہ اور نہ خوشبو لگائے، نہ خضاب استعمال کرے اور نہ کنگھی کرے، البتہ حیض سے پاک ہوتے وقت قسط یا اظفار (یہ عربوں کی دو خوشبوئیں تھیں) لگی پٹی استعمال میں لائے (تاکہ حیض کے خون کی بو ختم ہو)۔''[1] (شرعی) سوگ یہ ہے کہ عورت اپنی زیب و زینت کا ترک کرے، مثلاً: زیورات نہ پہنے اور جن امور کا ذکر ہوا یہ اپنے شوہر کے لیے اس کی طرف سے حقِ وفا کے بطور ہے۔

مرحوم کے پسماندگان کو کھانا دینے کا استحباب

عبداللہ بن جعفر (بن ابی طالب) سے مروی ہے: نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ''آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ وہ اپنی مصیبت (یعنی سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی وفات) کے ساتھ مشغول ہیں۔''[2] اسے ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے تخریج کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے، شارع علیہ السلام نے ایسا کرنا مستحب قرار دیا، کیونکہ یہ ان کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں مرحوم کے اقارب کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ میت کے اہلِ خانہ کو (کم از کم) ایک دن و رات کا کھانا دیں کیونکہ یہ سنت اور اہلِ خیر کا فعل ہے، علماء نے مستحب قرار دیا ہے کہ انہیں زبردستی اور اصرار سے کھلایا جائے تاکہ اس غم وحزن کے عالم میں بھوکے رہ کر کمزور نہ پڑ جائیں، کہتے ہیں: لیکن اگر عورتیں بین اور نوحہ سے باز نہ آئیں تب انہیں کھانا دینا جائز نہیں، تاکہ یہ معصیت پر اعانت نہ باور ہو، آئمہ متفق ہیں کہ اہلِ میت کے لیے مکروہ ہے کہ وہ فوتگی پر لوگوں کی دعوت کریں (جیسے ہمارے ہاں رواج ہے) کیونکہ ان پر تو پہلے ہی مصیبت پڑی ہوئی ہے اور اس رواج سے ان پر مزید بوجھ پڑے گا اور یہ اہلِ جاہلیت سے تشبّہ ہے، کیونکہ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم جاہلیت میں نوحہ اور بین اور پھر تدفین کے بعد دعوت کا اہتمام کیا کرتے تھے، بعض علماء نے تو اسے حرام قرار دیا، ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر ضرورت ہو تو یہ جائز ہے، کیونکہ ایسے مواقع پر دور دراز سے رشتہ دار آتے اور رات رہتے ہیں، لہٰذا ان کی میزبانی تو کرنی ہے۔

زندگی ہی میں کفن تیار کر کے رکھنے کا جواز

بخاری نے ایک باب باندھا جس کا عنوان ہے: ''بَابُ مَنِ اسْتَعَدَّ الْكَفَنَ فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ يُنْكَرْ عَلَيْهِ'' یعنی جس نے عہدِ نبوی میں ہی اپنی زندگی میں ہی اپنا کفن تیار کیا اور اس کے اس فعل کی نکیر نہ کی گئی، اس کے تحت سیدنا سہل رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی: کہتے ہیں کہ ایک عورت آئی اور اس کے پاس حاشیہ والی ایک چادر تھی، کہنے لگی: یا رسول اللہ! یہ چادر میں نے اپنے ہاتھ سے بُنی ہے اور چاہتی ہوں کہ آپ پہنیں، آپ نے قبول کی اور اسے بطورِ تہبند باندھ کر نکلے تو ایک صحابی نے اس کی تعریف کی اور مانگ لی، آپ نے انہیں عطا کی، لوگوں نے ان سے کہا: آپ نے اچھا نہیں کیا کیونکہ

---

[1] صحيح البخاري: ٥٣٤٢؛ صحيح مسلم: ٩٣٨؛ سنن أبي داود: ٢٣٠٢. [2] حسن، سنن أبي داود: ٣١٣٢؛ سنن ترمذی: ٩٩٨؛ سنن ابن ماجہ: ١٦١٠.

نبی کریم ﷺ کو اس کی ضرورت تھی، اس کے باوجود آپ نے مانگ لی اور آپ کو پتہ تھا کہ آپ انکار نہیں کیا کرتے! وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! میں نے یہ پہننے کے لیے نہیں مانگی بلکہ میں تو اسے اپنا کفن بناؤں گا، سیدنا سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہی ان کا کفن بنی تھی۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ میں بطورِ خاص ''فَلَمْ يُنْكَرْ'' لکھا تا کہ توجہ مبذول کرائیں کہ صحابہ نے ان کے نبی کریم ﷺ سے اسے مانگ لینے پر تو انکار و اعتراض کیا مگر اس قصد و ارادہ پر نہیں (اور یقیناً نبی کریم ﷺ کو بھی ان کے اس قصد کی اطلاع ہوئی ہوگی اور آپ نے بھی انکار نہ فرمایا) تو اسی کے ساتھ کیا قبر کی کھدائی بھی ملتحق ہے؟ (یہ کہنا محلِ بحث ہے) علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کا قول نقل کیا کہ اس میں وقتِ حاجت سے قبل کوئی چیز تیار کرنے کا جواز ہے، صالحین کی ایک جماعت کے بارے منقول ہے کہ زندگی ہی میں اپنی قبریں تیار کروالی تھیں، مگر الزین ابن منیر نے اس کا تعاقب کیا اور کہا: کسی صحابی نے یہ نہ کیا اور اگر ایسا کرنا مستحب ہوتا تو کثیر سلف یہ کرتے، علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کسی صحابی سے اس کا عدم وقوع اس کے عدم جواز پر دال نہیں، کیونکہ جس معاملہ کو مسلمان مستحسن خیال کریں وہ اللہ کے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے، بالخصوص جب اخیار علماء کی ایک جماعت نے یہ کیا ہو، امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: کوئی حرج نہیں کہ آدمی زندگی ہی میں اپنی قبر کی جگہ خرید لے (یا پسند کر لے) اور وصیت کرے کہ اسے یہاں دفن کیا جائے، سیدنا عثمان، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے مروی ہے کہ ایسے ہی کیا تھا۔

حرمین شریفین میں موت کی تمنا کرنے کا استحباب

کیونکہ بخاری نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے اپنے رسول کے شہر میں شہادت کی موت عطا فرما! کہتی ہیں: میں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہنے لگے: دیکھنا اللہ اس کا بندوبست کر دے گا، ان شاء اللہ،[2] طبرانی نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو دونوں میں سے کسی ایک حرم (یعنی مکی یا مدنی) میں فوت ہوا وہ روزِ قیامت مامون ہوگا۔''[3] اس کی سند میں موسیٰ بن عبدالرحمن ہیں، انہیں ابن حبان نے الثقات میں ذکر کیا اور عبداللہ بن مؤمل ہیں، احمد نے انہیں ضعیف اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا۔

مرگِ ناگہانی

ابو داود نے سیدنا عبید بن خالد سُلمی رضی اللہ عنہ صحابی سے نقل کیا، جنہوں نے کبھی تو ''عن النبی'' کہا اور کبھی ''عن عبید'' کہا، بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مرگِ ناگہانی ((أَخْذَةُ آسِفٍ)) ہے۔''[4] (یعنی حسرت ناک موت اس لیے کہ آخری وصیتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا) لوگوں کو اچانک موت اس لیے ناپسند ہے، کیونکہ مرض کا ثواب رہ جاتا ہے جو مسلمان کے گناہوں کی تکفیر کرتا ہے، اس حدیث کو سیدنا ابن مسعود، انس، ابو ہریرہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے، ہر ایک کی

---

[1] صحيح البخاري: ١٢٧٧. [2] صحيح البخاري: ١٨٩٠. [3] ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ٥٨٧٩؛ المعجم الصغير للطبراني: ٨١٤. [4] صحيح، سنن أبي داود: ٣١١٠.

سند میں مقال (یعنی ضعف) ہے، بقول ازدی اس کے کئی طرق ہیں، لیکن کوئی بھی نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ ثابت نہیں، عبید کی یہ روایت ابوداود نے تخریج کی اور اس کی سند کے رجال ثقہ ہیں، اس کا موقوف ہونا مؤثر نہیں، کیونکہ اس قسم کی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی، پھر راوی نے کبھی نبی کریم ﷺ کی طرف بھی مسند کیا ہے۔

اس مسلمان کا ثواب جس کے نابالغ بچے فوت ہوجائیں

بخاری نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کے تین نابالغ بچے مر گئے، اللہ ان کے طفیل اسے جنت کا دخول عنایت کرے گا۔''[1] بخاری و مسلم نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ خواتین نے رسول کریم ﷺ سے گزارش کی کہ ہمارے لیے وعظ و درس کا کوئی دن مقرر کریں تو آپ نے ایسا ہی کیا اور وعظ کے اثنا میں فرمایا: ''جس عورت کے تین بچے مر جائیں وہ آگ سے اس کے لیے حجاب بن جائیں گے۔'' ایک عورت نے کہا: ''اگر دو ہوں؟'' فرمایا: ''دو بھی۔''[2] (اس سے ثابت ہوا کہ سب دینی احکام و مسائل میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی مخاطب ہوتی ہیں اگرچہ صیغۂ مذکر ہی مستعمل ہو)۔

امتِ محمدیہ کی عمریں

ترمذی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کی اوسط عمر ساٹھ تا ستر برس ہے، کم ہی ہوں گے جو ستر سے متجاوز ہوں۔''[3]

موت راحت ہے

شیخین نے سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو فرمایا:

«مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ» ''اسے بھی چھٹکارا ملا اور لوگوں کو بھی اس سے۔''

عرض کی گئی: یارسول اللہ! اس کا کیا مطلب؟ فرمایا: ''بندۂ مومن دنیا کی تھکاوٹوں سے آرام پا جاتا ہے، جبکہ بندۂ فاجر سے لوگ آرام پا جاتے ہیں اور شہر، درخت اور حیوانات بھی۔''[4]

میت کی تجہیز و تکفین

اس ضمن میں غسل، تکفین، نمازِ جنازہ اور تدفین ہے، درج ذیل اس کی تفصیل ہے:

---

[1] صحيح البخاري: ١٢٤٨؛ صحيح مسلم: ٣٦٣٤. [2] صحيح البخاري: ١٠١؛ صحيح مسلم: ٢٦٣٣
[3] حسن، سنن ترمذي: ٣٥٥٠؛ سنن ابن ماجه: ٢٦٣٣. [4] صحيح البخاري: ٦٥١٢؛ صحيح مسلم: ٩٥٠.

① غسلِ میت

جمہور علماء کی رائے میں مسلمان میت کو غسل دینا فرضِ کفایہ ہے، اگر چہ کوئی بھی اسے انجام دے دے تو بقیہ سب مکلفین سے یہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم دیا اور مسلمانوں نے اس پر محافظت کی ہے۔

② کن کا غسل واجب نہیں؟

جو میدانِ معرکہ میں لڑتے ہوئے کفار کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، انہیں غسل دینا ضروری نہیں۔

③ میت کے جسم کے ایک عضو کو غسل دینا

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے، امام شافعی، امام احمد اور امام ابن حزم رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اگر (پورے جسم کی بجائے) ایک عضو ملا تو اسے غسل دینا، اس کی تکفین اور نمازِ جنازہ پڑھنا ضروری ہے، امام شافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی کہ جنگِ جمل کے بعد مکہ میں ایک پرندے نے ہاتھ گرایا تو انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے یہ پہچان لیا گیا (بقول محشی یہ ہاتھ عبد الرحمن بن عتاب بن اسید کا تھا) تو اسے غسل دیا اور نمازِ جنازہ پڑھی اور یہ فعل کئی صحابہ کی موجودگی میں ہوا، احمد نے ذکر کیا کہ سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ نے ایک پاؤں کی نمازِ جنازہ پڑھائی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہڈیوں کی کرائی، بقول ابن حزم رحمہ اللہ مسلمان میت کا جو بھی عضو یا حصہ ملے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے اور غسل و تکفین بھی الاّ یہ کہ وہ شہید کا ہو، کہتے ہیں: نیت سارے جسم کی کی جائے، جسد کی بھی اور روح کی بھی، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اگر نصف جسم سے زیادہ ملے تب تو غسل اور نمازِ جنازہ ہوگا، وگرنہ نہ غسل اور نہ نمازِ جنازہ ہے۔

④ شہید کو غسل نہ دیا جائے گا

وہ شہید جو معرکہ میں کفار کے ہاتھوں مارا گیا، اسے غسل نہیں دیا جائے گا، خواہ وہ جنبی ہی تھا اور اسے انہی پہنے ہوئے کپڑوں میں دفن کیا جائے گا، اگر وہ سلامت ہیں اور اگر کوئی کمی ہے تو پوری کر دی جائے اور اگر یہ مسنون کفن سے زیادہ ہوں تو زائد اتار دیے جائیں، اسے اس کے خون سمیت دفن کیا جائے، کوئی چیز دھوئی نہ جائے، احمد نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''شہداء کو غسل نہ دو کیونکہ وہ زخم روزِ قیامت کستوری کی مانند مہک رہے ہوں گے۔''[1] آپ نے شہدائے احد کی غسل و جنازہ کے بغیر تدفین کا حکم دیا تھا، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ شاید اس لیے کہ وہ اللہ سے اپنے زخموں سمیت ملیں، کیونکہ مروی ہے کہ ان کے زخم کستوری جیسی خوشبو سے مہکتے ہوں گے اور اللہ کے اکرام کے طفیل وہ نمازِ جنازہ سے مستغنی ہو گئے، پھر اس میں دوسروں کی سہولت بھی ہے کہ معرکہ کی وجہ سے کئی ان کے زخمی ہوں گے اور دشمن کی واپسی کا خوف بھی لاحق ہوگا اور صورتحال کی اس نزاکت کی وجہ سے بھی یہ تخفیف ہونا محتمل ہے، بعض نے کہا: شہید کی نمازِ جنازہ نہ کرانے کی حکمت یہ

---

[1] صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٢٩٩.

ہے کہ جنازہ تو میت کا ہوتا ہے، جبکہ یہ (بموجب قرآن) زندہ ہیں یا نمازِ جنازہ دراصل شفاعت ہے اور شہداء اس سے مستغنی ہیں، وہ تو خود دوسروں کی شفاعت کریں گے۔

⑤ وہ شہداء جن کو غسل دیا جائے گا اور ان کی نمازِ جنازہ بھی کرائی جائے گی

معرکہ میں کفار کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کے علاوہ بھی کئی ایسے ہیں جن پر شارع علیہ السلام نے شہید کے لفظ کا اطلاق کیا ہے تو ان سب کو غسل بھی دیا جائے گا اور ان کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی جائے گی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں انہیں غسل دلوایا اور مسلمانوں نے سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کو غسل دیا تھا، ان شہداء کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

① سیدنا جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کے سوا بھی سات قسم کے شہداء ہیں، طاعون کے سبب مرنے والا، غرق ہونے والا، ذات الجنب کی بیماری سے (بقول محشی یہ زخم ہیں جو پہلو جنب کے اندرونی جانب میں ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بخار اور کھانسی لگتی ہے یعنی نمونیہ) اور پیٹ کی بیماری کی وجہ سے اور جو عورت زچگی کے دوران مرگئی، یہ سب شہید ہیں۔''[1] اسے احمد، ابو داود اور نسائی نے صحیح سند سے نقل کیا۔

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا: ''تم شہید کسے سمجھتے ہو؟'' عرض کی: جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے؟ فرمایا: ''تب تو میری امت کے شہداء کی تعداد بہت قلیل ہوئی۔'' عرض کی: تو وہ کون ہیں؟ فرمایا: ''جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا قتل ہوا، وہ شہید ہے اور جو اللہ کی راہ میں (بقول محشی یعنی اللہ کی طاعت میں) فوت ہوا وہ بھی شہید ہے، اسی طرح جو بوجہ طاعون، پیٹ کی بیماری اور غرق ہونے سے فوت ہوا وہ بھی شہید ہے۔''[2]

③ سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے مال، اپنی جان، اپنے دین اور اپنے اہل کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔''[3] اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا۔

⑥ کافر کی میت کو غسل نہ دیا جائے گا

مسلمانوں پر یہ واجب نہیں، بعض نے اسے جائز قرار دیا، مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے کسی کافر رشتہ دار کو غسل دے اور اس کی تکفین و تدفین میں شریک ہو الا یہ کہ کوئی اور یہ کرنے والا نہ ہو، تب اس کی تدفین اس پر واجب ہے، احمد، ابو داود، نسائی اور بیہقی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ کا گمراہ چچا (یعنی ابو طالب) فوت ہو چکا ہے تو آپ نے فرمایا: ''جاؤ اپنے والد کی تدفین کرو، پھر سیدھا میرے پاس آؤ۔'' کہتے ہیں: میں دفن کر کے آپ کے پاس آیا تو فرمایا: ''اب غسل کرلو'' پھر میرے لیے دعا کی۔[4]

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٣١١١؛ سنن نسائي: ٤/ ١٣. [2] صحيح مسلم: ١٩١٥. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٤٧٧٢؛ سنن ترمذي: ١٤٢١. [4] صحيح، سنن أبي داود: ٣٢١٤؛ سنن نسائي: ١/ ١١٠.

غسلِ میت کی صفت

اس سلسلہ میں واجب یہ ہے کہ سارے بدن کو (کم از کم) ایک مرتبہ پانی کے ساتھ دھویا جائے، چاہے میت جنبی تھی یا حائض، مستحب یہ ہے کہ میت کو ایک اونچی جگہ رکھا جائے اور کپڑے اتاریں جائیں (بقول محشی امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر قمیص پتلے کپڑے کی ہے کہ پانی نیچے جسم تک پہنچ سکتا ہے، تب افضل نہ اتارنا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قمیص سمیت غسل دیا گیا تھا، اظہر یہ ہے کہ یہ آپ ہی کے ساتھ خاص ہے، دیگر میں شرمگاہ کا حصہ چھوڑ کر باقی سب بدن ننگا کر لینا ہی مشہور ہے) اور شرمگاہ پر کوئی کپڑا رکھ دیا جائے اگر وہ بالغ ہو، غسل میں وہی لوگ موجود ہوں جن کا ہونا ضروری ہے۔ مناسب ہے کہ غسل دینے والا ثقہ، امین اور صالح آدمی ہو تاکہ جو خیر کے مظاہر دیکھے انہیں بیان کرے اور جو شر کا مظہر دیکھے اس کی پردہ پوشی کرے، امام ابن ماجہ رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے مُردوں کو قابلِ اعتماد افراد ہی غسل دیا کریں۔''[1] اس پر نیت کرنا واجب ہے، کیونکہ وہی غسل دینے کا مخاطب ہے، سب سے پہلے میت کے پیٹ کو آہستگی سے دبائے تاکہ ممکنہ طور سے جو اندر ہے باہر نکل آئے، بدن پر لگی نجاست دور کرے وہ اس طرح کہ ہاتھ پر کوئی کپڑا لپیٹ لے اور اس کے ساتھ شرمگاہ کو مس کرے کیونکہ عورۃ کا (بغیر حائل کے) لمس حرام ہے، پھر نماز کے وضو کی طرح کا وضو کرائے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میت کے داہنے اعضائے وضو سے شروع کرو۔''[2] تاکہ اہلِ ایمان کی علامت غرۃ وتحجیل (یعنی روزِ قیامت اعضائے وضو کا چمکنا) کی تجدید ہو، پھر تین دفعہ پانی اور صابن یا صرف پانی کے ساتھ غسل دے دائیں پہلو سے شروع کرتے ہوئے، اگر تین سے زائد مرتبہ کی ضرورت محسوس کرے تو پھر پانچ یا سات مرتبہ دھوئے، صحیح میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو غسل دینے والی خواتین سے) فرمایا: ''اسے طاق عدد میں غسل دو، تین، پانچ یا سات مرتبہ یا اس سے بھی اکثر اگر ضرورت محسوس کرو۔''[3] امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: معاملہ غسل دینے والے کے سپرد کر دیا بشرطیکہ ضرورت محسوس کرے، اگر میت عورت کی ہے تو اس کے سر کی مینڈھیاں (اگر بندھی ہیں تو) کھولی جائیں اور دھو کر دوبارہ مینڈھیاں بنا کر پیچھے کی طرف ڈال دی جائیں، سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے بنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تین مینڈھیاں بنائیں، دو سر کے دونوں کناروں کی اور ایک سامنے کے بالوں کی، بقول راوی پہلے انہیں کھولا، پھر دھو کر دوبارہ بنایا، صحیح ابن حبان میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مینڈھیاں بنانے کا حکم دیا تھا،[4] غسل سے فارغ ہو کر صاف کپڑے سے میت کا بدن خشک کیا جائے تاکہ کفن گیلا نہ ہو جائے اور اس پر خوشبو رکھی جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طاق عدد میں خوشبو رکھو'' (یعنی تین یا پانچ جگہ)[5] اسے بیہقی، حاکم اور ابن حبان نے نقل کیا اور آخری دونوں نے حکمِ صحت لگایا۔

---

[1] موضوع، سنن ابن ماجہ: ١٤٦١. [2] صحيح البخاري: ١٢٥٤؛ صحيح مسلم: ٩٣٩. [3] صحيح البخاري: ١٢٥٤؛ سنن أبي داود: ٣١٤٣؛ ابن ماجه: ١٤٥٨. [4] صحيح ابن حبان: ٣٠٣٣. [5] صحيح، المستدرك للحاكم: ١/ ٣٥٥؛ صحيح ابن حبان: ٣٠٣١.

ابو وائل کہتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ کستوری تھی اور انہوں نے وصیت کی ہوئی تھی کہ مرنے کے بعد یہ ان کے بدن پر لگائی جائے اور بتلایا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک پر ملی جانے والی کستوری کا بقیہ ہے،[1] جمہور علماء میت کے ناخن یا بال کاٹنے کی کراہت کے قائل ہیں، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اسے جائز کہا: اسی طرح بغلوں اور زیرِ ناف بالوں کی صفائی، اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر غسل کے بعد اور تکفین سے قبل پیٹ سے کچھ خارج ہو تو اس کا ازالہ کر دینا اور صرف اسی جگہ کو دھونا ضروری ہے دوبارہ وضو کرانے میں اختلاف ہے، جمہور نے کہا: یہ ضروری نہیں (یہ احناف، شوافع اور مالک کا مذہب ہے) بعض نے وضو جبکہ بعض نے غسل کا اعادہ واجب کہا۔

علماء کے کیفیتِ غسل کے ضمن میں اکثر اقوال کی بنیاد جماعت کی سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے نقل کردہ روایت ہے جو کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے، جب ان کی بیٹی فوت ہوئی اور فرمایا: ''اسے تین، پانچ یا ضرورت محسوس کرو تو اس سے بھی زائد دفعہ غسل دو پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ اور آخر میں کچھ کافور بھی شامل کر لینا اور فراغت کے بعد مجھے اطلاع کرنا۔'' کہتی ہیں: فراغت کے بعد اطلاع دی تو آپ نے اپنا تہہ بند دیا اور فرمایا: ''کفن سے پہلے اس کے ساتھ جسم کو لپیٹ دو۔''[2]

کافور رکھنے کی حکمت علماء نے یہ بیان کی کہ خوشبو مہکے گی، کیونکہ یہ فرشتوں کے حضور کا وقت ہے، پھر اس کی خاصیت تبرید (یعنی ٹھنڈا رکھنے) اور جسم سے حشرات کو دور رکھنے اور زیادہ مدت تک خراب نہ ہونے دینے کی ہے، اگر یہ نہ ملے تو اس کے متبادل کے طور پر کوئی اور چیز رکھی جائے، جس میں یہی سب یا بعض خصوصیات ہوں۔

پانی نہ ملنے کی صورت میں میت کو تیمم کرا دینا

اگر پانی نہ ہو تو میت کو تیمم کرا دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ﴾(المائدہ:٦) ''اگر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوْراً)) ''پوری زمین میرے لیے نماز گاہ اور آلۂ طہارت ہے۔''[3] اسی طرح اگر جسم کی حالت یہ ہو کہ پانی کے استعمال سے اسے نقصان ہوگا، اسی طرح اگر عورت کی میت ہو اور وہاں سب غیر محرم مرد ہوں یا مرد میت ہے اور سب ادھر غیر محرم عورتیں ہوں تو بھی، ابو داود نے مراسیل میں جبکہ بیہقی نے مکحول سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر عورت مردوں کے ہمراہ تھی اور اس کا انتقال ہو گیا اور کوئی اور خاتون موجود نہیں یا مرد عورتوں کے ہمراہ تھا (اور وہاں کوئی اور مرد موجود نہیں) تو دونوں کو تیمم کرا دیا جائے اور دفن کر دیا جائے، یہ غسل کے بمنزلہ ہے (گویا) جس کے غسل کو پانی نہ ملے۔''[4] عورت کو اس کا محرم رشتہ دار اپنے ہاتھ سے تیمم کرائے اور اگر محرم نہیں تو غیر محرم ہاتھ پر پٹی لپیٹ کر یہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، امام مالک اور

---

① حسن، السنن الکبری للبیهقی: ٦٧٠٧؛ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا۔ ② صحیح البخاری: ١٢٥٣؛ صحیح مسلم: ٩٣٩. ③ صحیح البخاری: ٣٣٥؛ صحیح مسلم: ٥١٢. ④ موضوع، مراسیل ابی داود: ٤١٤؛ السنن الکبری للبیهقی: ٣/ ٣٩٨.

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مردوں میں خاتون کا کوئی محرم رشتہ دار موجود ہے تو وہ اسے غسل کرادے، کیونکہ وہ اس کے لیے مرد کے بمنزلہ ہے، المروی میں امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اہلِ علم سے سنا کہ اگر عورت میت ہے اور ادھر کوئی اور خاتون یا اس کا شوہر یا کوئی محرم رشتہ دار موجود نہیں تو اسے تیمم کرا دیا جائے اس کے چہرہ اور ہاتھوں کو مٹی کے ساتھ مسح کرایا جائے، اسی طرح مرد کو بھی اگر اس کی نسبت بھی یہی صورتحال ہو۔

میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل کرانا

فقہاء بیوی کے شوہر کو غسل دینے کے جواز پر متفق ہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر میں پہلے سوچ لیتی جو بعد میں سوچا تو نبی کریم ﷺ کو آپ کی ازواج ہی غسل کراتیں۔[1] اسے احمد، ابو داود اور حاکم نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، البتہ شوہر کا بیوی کو غسل دینا اختلافی مسئلہ ہے تو جمہور کے ہاں یہ بھی جائز ہے، کیونکہ مروی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا،[2] اسے دارقطنی اور بیہقی نے نقل کیا، نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا: ''اگر تم مجھ سے پہلے فوت ہوگئی تو میں تمہیں غسل دوں گا اور کفن پہناؤں گا۔''[3] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا، احناف کے نزدیک شوہر کے لیے بیوی کی میت کو غسل دینا جائز نہیں، اگر کوئی اور غسل دینے والا نہیں سوائے شوہر کے تو وہ اسے تیمم کرائے، یہ احادیث ان کے خلاف حجت ہیں۔

عورت کا نابالغ کو غسل کرانا

بقول ابن منذر رحمہ اللہ تمام اہلِ علم جن سے دین محفوظ کیا گیا، کا اجماع ہے کہ عورت نابالغ بچے کو غسل دے سکتی ہے۔

کفن

① کفن کا حکم

میت کو مستور کیا جائے خواہ ایک ہی کپڑا ہو، یہ فرضِ کفایہ کے بطور، بخاری نے سیدنا خباب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ہم نے اللہ کی رضا کی طلب میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہجرت کی، ہم میں سے بعض (دنیا میں) اپنا اجر کھائے بغیر ہی فوت ہو گئے، انہی میں سے ایک سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے جو احد کے دن شہید ہوئے اور ان کے کفن کے لیے ہمارے پاس صرف ایک چادر تھی، اگر اس سے ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے رہ جاتے اور اگر پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا رہ جاتا تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا: ''سر ڈھانپ دو اور پاؤں پر اذخر گھاس رکھ دو۔''[4]

---

① حسن، سنن أبي داود: ٣١٤١؛ سنن ابن ماجه: ١٤٦٤. ② حسن، المستدرك للحاكم: ٣/ ١٦٣، ١٦٤.
③ حسن، سنن ابن ماجه: ١٤٦٥. ④ صحيح البخاري: ٤٠٤٧؛ صحيح مسلم: ٩٤٠؛ سنن أبي داود: ٣١٥٥.

② کفن کے مستحبات

کفن کے ذیل میں یہ امور مستحب ہیں:

① کفن اچھا، صاف ستھرا اور بدن کے لیے ساتر ہو، ابن ماجہ اور ترمذی نے حسن کہا اور سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی پر اپنے مردہ بھائی کی ذمہ داری آن پڑے تو اسے اچھا کفن دے۔''[1]

② کفن سفید ہو، کیونکہ احمد، ابوداود اور ترمذی نے صحیح کہا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(عموماً) سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہیں اور انہی میں اپنے مردوں کو کفن دیا کرو۔''[2]

③ کفن خوشبودار کیا جائے، احمد اور حاکم نے حکمِ صحت لگایا اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب میت کو خوشبو لگاؤ تو تین مقامات پر لگاؤ۔''[3] سیدنا ابوسعید، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے وصیت کی تھی کہ ان کے کفن عود (ایک خوشبو) کے ساتھ خوشبودار کیے جائیں۔

④ آدمی کے لیے تین چادریں اور عورت کے لیے پانچ چادریں ہوں، چنانچہ جماعت نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین نئے سفید سحولی کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا، ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔[4] بقول ترمذی رحمہ اللہ صحابہ وغیرہم کے اکثر اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے، کہتے ہیں کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: مرد کو تین کپڑوں میں کفن دیا جائے، اگر چاہو تو قمیص اور دو تھیلے اور چاہو تو تین تھیلے ہوں، اگر مزید نہیں تو ایک کپڑے کا کفن بھی کافی ہوگا، اسی طرح دو بھی، بہر حال بشرطِ کشائش تین مستحب ہیں اور یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے، کہتے ہیں کہ عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے، سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے کفن کے لیے) تہہ بند، قمیص، سر ڈھانپنے کا کپڑا اور دو مزید کپڑے دیے (تاکہ اوپر سے انہیں ان میں لپیٹا جائے) بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ اکثر اہلِ علم جن سے ہم نے علم حفظ کیا، کی رائے ہے کہ عورت کی تکفین پانچ کپڑوں میں ہونی چاہیے۔

③ مُحرِم کی تکفین

اگر کوئی حالتِ احرام میں فوت ہو جائے تو اسے بھی اسی مذکورہ نہج پر غسل دیا جائے، مگر کفن انہی احرام کی چادروں میں دیا جائے، سر نہ ڈھانپا جائے گا اور نہ خوشبو لگائی جائے گی اور یہ حکم احرام کی بقا کے لیے ہے، چنانچہ جماعت نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ وقوفِ عرفہ کے دوران ایک حاجی سواری سے گر کر وفات پا گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی تو فرمایا: ''اسے پانی میں بیری کے پتے ڈال کر غسل دو اور انہی احرام کے دونوں کپڑوں میں کفن دو، حنوط نہ لگاؤ

---

① صحيح، سنن ترمذى: ٩٩٥؛ سنن ابن ماجه: ١٤٧٤. ② صحيح، سنن أبى داود: ٣١٧٨؛ سنن ترمذى: ٩٩٤.
③ صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٣٣١. ④ صحيح البخارى: ١٢٧٣؛ صحيح مسلم: ٩٤١.

اور نہ سر کو ڈھانپو کیونکہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ تلبیہ زبان پر جاری ہوگا۔''[1] حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں اگر محرم مر گیا تو اس کا احرام منقطع ہوا، لہٰذا غیر محرم کی مثل ہی اسے کفن دیا جائے، چنانچہ کفن سیا جائے اور سر بھی ڈھانپا جائے اور خوشبو بھی لگائی جائے! کہتے ہیں: اس شخصِ مذکور کا یہ قصہ واقعہِ عین ہے جس کے لیے عموم نہیں، لہٰذا اسی کے ساتھ اس کا اختصاص ہے، بقول مؤلف لیکن نبی کریم ﷺ کی یہ تعلیل کہ روزِ قیامت تلبیہ پڑھتا ہوا اٹھایا جائے گا، اس امر میں ظاہر ہے کہ یہ ہر محرم میں عام ہے اور اصل یہ ہے کہ جو حکم افراد میں سے کسی ایک کے لیے ثابت ہو وہ دیگر کے لیے بھی ثابت ہوگا جب تک کوئی دلیلِ تخصیص نہ قائم ہو۔

④ کفن کے ضمن میں مغالات کی کراہت

کفن اچھا تو ہونا چاہیے مگر انتہائی قیمتی نہیں (یا کڑھائی وغیرہ کرائی جائے) یا یہ کہ انسان خلافِ معمول و عادت اس ضمن میں تکلف سے کام لے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے کفن میں مغالات نہ کی جائے کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''کفن میں مغالات نہ کرو، کیونکہ یہ تو جلد ہی سلب ہو جاتا ہے۔''[2] اسے ابوداود نے نقل کیا اور اس کی سند میں ابو مالک ہیں جن میں مقال ہے، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے لیے کفن میں مغالات نہ کرنا، بس دو صاف کپڑے کافی ہوں گے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے پہنے ہوئے اسی کپڑے کو دھو کر میرا کفن بنا دینا اور دو مزید کپڑے ہمراہ کر دینا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب کہا: یہ تو پرانا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا: نئے کپڑے کا مردے کی نسبت زندہ زیادہ حقدار ہے کیونکہ کفن تو میت سے خارج ہونے والے مواد کے لیے ہے۔[3]

⑤ ریشمی کفن

یہ مرد کے لیے حلال نہیں، البتہ عورت کے لیے جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ریشم اور سونے کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہیں۔''[4] البتہ کثیر اہلِ علم نے اسراف کے مدِنظر عورت کے لیے بھی ریشمی کفن ہونا مکروہ اور مال کا ضیاع قرار دیا ہے، پھر اس میں مغالات ہے جس سے مردہ کے لیے نہی مذکور ہوئی، امام احمد رحمہ اللہ قائل ہیں کہ مجھے پسند نہیں کہ عورت کے کفن میں ریشم کی کوئی چیز ہو، امام حسن، امام ابن مبارک اور امام اسحاق رحمہم اللہ نے بھی مکروہ سمجھا، بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ میں کسی دیگر سے اس کے برخلاف قول و رائے کا واقف نہیں۔

⑥ ذاتی مال سے کفن ہونا چاہیے

اگر میت کا ترکہ ہے تو اسی سے اس کا کفن خریدا جائے اگر اس کا کوئی ذاتی مال نہیں تب اس کے مال سے جس کے ذمہ اس

---

① صحيح البخاري: ١٢٦؛ صحيح مسلم: ١٢٠٦. ② ضعيف، سنن أبي داود: ١٣٣٧. ③ صحيح البخاري: ١٣٨٧. ④ صحيح، سنن ترمذي: ١٧٢٠؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٩٥.

کا نفقہ تھا اور اگر کوئی پرسانِ حال نہیں، تب بیت المال سے اس کی تکفین کی جائے وگرنہ اہلِ محلہ کے ذمہ ہوگا، عورت کا بھی یہی حکم ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: عورت کے کفن اور قبر کھدائی کا خرچہ اس کے ذاتی مال سے ہو، اس کے شوہر پر یہ لازم نہیں اس لیے کہ مسلمانوں کے اموال محظور ہیں (یعنی ان سے بچنا شرعی حکم ہے) مگر قرآن وسنت کی نص کی رو سے چونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک تمہارے خون اور اموال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔''[1] تو اللہ نے شوہر پر بیوی کا صرف خرچہ، لباس اور رہائش کی فراہمی ہی واجب کی ہے اور لغت میں کفن لباس نہیں کہلاتا اور نہ قبر رہائش (یہ امام ابن حزم رحمہ اللہ کی اپنی رائے ہے کیونکہ جب بیوی کی ضروریات پوری کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے تو اس کی تجہیز وتکفین اور تدفین اس کی ضروریات ہی میں شامل ہے)۔

نمازِ جنازہ

① نمازِ جنازہ کا حکم

آئمہٴ فقہ کے ہاں بالاتفاق نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم دیا اور اہلِ اسلام کی اس پر محافظت ہے۔ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ میت کے بارے میں پوچھا کرتے تھے کہ ''آیا اس پر قرض ہے؟ اور کیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے کہ قرض چکایا جا سکے؟'' اگر بتلایا جاتا کہ ادائیگی کا مال موجود ہے تب آپ نمازِ جنازہ پڑھاتے، وگرنہ مسلمانوں سے کہتے: ''تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔''[2]

② نمازِ جنازہ کی فضیلت

① جماعت نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو جنازہ کے ہمراہ گیا اور نمازِ جنازہ پڑھی تو اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور اگر تدفین تک ساتھ رہا تو اس کے لیے دو قیراط ہیں اور قیراط احد پہاڑ جتنے حجم کا ہے۔''[3]

② مسلم نے سیدنا خباب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: کیا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ مذکورہ حدیث نہیں سنی (جو اوپر ذکر ہوئی)؟ تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے بارے میں تحقیق کی خاطر بھیجا تو انہوں نے کہا: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بولے: ہم تو کثیر قراریط سے محروم رہ گئے۔[4]

③ نمازِ جنازہ کی شروط

میت پر پڑھی جانے والی کو چونکہ نماز کہتے ہیں، لہٰذا اس کے لیے وہ سب شروط ہیں جو دیگر فرض ونفل نمازوں کے لیے

---

[1] صحيح البخاري: ١٧٣٩؛ صحيح مسلم: ١٦٧٩. [2] صحيح البخاري: ٥٣٧١؛ صحيح مسلم: ١٦١٩.
[3] صحيح البخاري: ١٣٢٥؛ صحيح مسلم: ٩٤٥. [4] صحيح البخاري: ١٣٢٣، ١٣٢٤؛ صحيح مسلم: ٩٤٥.

ہیں، مثلاً: طہارت، حقیقی بھی اور حدثِ اکبر و اصغر سے بھی، اسی طرح قبلہ رو ہونا، سترِ عورۃ اور جگہ کا پاک ہونا وغیرہ، مالک نے نافع سے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: کوئی اس حال میں نمازِ جنازہ نہ پڑھے کہ غیر طاہر (یعنی جنبی) ہو دیگر فرض نمازوں سے یہ اس حیثیت سے مختلف ہے کہ اس میں وقت مشترط نہیں بلکہ جب بھی جنازہ حاضر ہو، تمام اوقات میں اسے ادا کیا جاسکتا ہے، ان میں بھی جن میں نماز پڑھنے سے نہی ہے (اوقاتِ کراہت، نمازِ فجر کے بعد سورج بلند ہونے تک، عین زوال کے وقت اور عصر کے بعد غروب تک) یہ احناف اور شوافع کے ہاں ہے لیکن امام احمد، امام ابن مبارک اور امام اسحاق رحمہم اللہ نے عین طلوعِ آفتاب اور عین غروب کے وقت اور عین دوپہر جب سورج وسط آسمان میں ہو نماز جنازہ پڑھنا مکروہ کہا ہے الا یہ کہ لاش خراب ہونے کا خدشہ ہو۔

④ نماز جنازہ کے ارکان

نمازِ جنازہ کے کئی ارکان ہیں، جن کے ساتھ اس کی حقیقت تشکیل پاتی ہے، اگر کوئی ایک رکن چھوٹ گیا تو وہ باطل ہو جائے گی اور شرعاً نمازِ جنازہ شمار نہ ہوگی، وہ ارکان درج ذیل ہیں:

① نیت

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (البينة:٥) ”انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے ہیں۔“ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» ”اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔“[1] پہلے ذکر گزرا کہ نیت کا محل دل ہے اور زبان سے بول کر نیت کرنا غیر مشروع ہے۔

② کھڑے ہو کر

یہ اس کے لیے جو اس پر قادر ہے اور یہ جمہور کے نزدیک رکن ہے، لہٰذا سوار ہو کر یا بغیر عذر بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا صحیح نہیں، المغنی میں ہے کہ سوار ہو کر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ اس طرح واجب قیام فوت ہوا، یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ابوثور رحمہم اللہ کا قول ہے، میں اس ضمن میں کوئی اختلاف نہیں جانتا اور مستحب ہے کہ اثنائے قیام دایاں بازو بائیں پر باندھا جائے: جیسے دیگر نمازوں میں ہے، بعض نے اس کی نفی کی مگر اول اولیٰ ہے۔

③ چار تکبیرات

بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے نجاشی رحمہ اللہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی تو چار تکبیریں کہیں۔[2] امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحابہ وغیرہم کے اکثر اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے اور یہی امام سفیان، امام مالک،

---

[1] صحيح البخاري: ١؛ صحيح مسلم: ١٩٠٧. [2] صحيح البخاري: ١٢٤٥؛ صحيح مسلم: ٩٥٢.

امام ابن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ نے کہا۔

تکبیریں کہتے ہوئے رفع الیدین کرنا

نمازِ جنازہ میں سنت عدم رفع الیدین ہے، ماسوائے پہلی تکبیر کے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں کہ پہلی تکبیر کے سوا دیگر تکبیرات میں رفع الیدین کیا ہو، امام شوکانی رحمہ اللہ اختلاف اور ہر فریق کی ادلہ کے مناقشہ کے بعد لکھتے ہیں: حاصل یہ ہے کہ سوائے پہلی تکبیر کے دیگر میں رفع الیدین کرنے کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے کوئی قابلِ احتجاج روایت ثابت نہیں، جہاں تک صحابہ کرام کے افعال واقوال تو ان میں حجت نہیں (حجت ہے) لہٰذا تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہی رفع الیدین پر اقتصار مناسب ہے، کیونکہ دیگر میں یہ مشروع نہیں، مگر ایک رکن سے دیگر رکن کی طرف انتقال کے وقت جیسے بقیہ نمازوں میں ہے اور نمازِ جنازہ میں کوئی انتقال نہیں (کیوں نہیں؟ اول تکبیر جس کے بعد ثنا پڑھنی ہے، سے دوسری تکبیر کی طرف انتقال ہے، جس میں درود پڑھنا ہے، پھر تیسری کی طرف جس میں ایک الگ عمل ہے، یعنی قراءت اور دعا، پھر چوتھی کی طرف جس میں ایک الگ عمل ہے یعنی سلام پھیرنا، جب عید کی تکبیرات میں ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین ہے جیسا کہ خود مولفِ ہذا نے عیدین کی بحث میں لکھا اور یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ثابت ہے تو کیوں نہ نمازِ جنازہ کی تکبیرات کو عید کی تکبیرات پر قیاس کیا جائے؟ جنازہ میں تو پھر بھی ہر تکبیر کے بعد ایک علیحدہ خاص عمل ہے عیدین میں تو فقط تکبیرات ہیں، لہٰذا نماز جنازہ رفع الیدین کی زیادہ حقدار ہے، رہی امام شوکانی رحمہ اللہ کی یہ بات کہ صحابہ کے افعال و اقوال حجت نہیں تو میں اسے ان کی غلطی خیال کرتا ہوں جبکہ کہا گیا ہے: "لِكُلِّ عَالِمٍ هَفْوَةٌ" اللہ معاف کرے، اگر صحابہ کے اقوال و افعال حجت نہیں تو پھر کس کے ہیں؟ اور کیا باور کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ ایسا فعل کریں یا کوئی ایسی بات کہیں جو نبی کریم ﷺ سے ثابت نہ ہو؟ نماز جنازہ کی تکبیرات کے وقت رفع الیدین بقول آپ کے صحابہ سے ثابت ہے تو آپ کسی سے اس کی نفی ثابت کر دیں، اگر نہیں کر سکتے تو صحابہ کی بات مان لیں)۔

④، ⑤ فاتحہ کی سری قراءت اور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا

(بقول محشی یہ دونوں امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک نمازِ جنازہ کے دو رکن ہیں۔ رکن قرار دینے سے بھی امام شوکانی رحمہ اللہ کو لازم ہوا کہ ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کے قائل ہوں کیونکہ خود کہا کہ رفع الیدین صرف ایک رکن سے دیگر رکن کی طرف انتقال کے وقت ہوتا ہے) امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں ابو امامہ بن سہل (ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے) سے نقل کیا کہ انہیں ایک صحابی نے خبر دی کہ نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام اللہ اکبر کہے، پھر سراً سورہ فاتحہ پڑھے، پھر درود شریف پڑھے، پھر تکبیرات میں مخلص ہو کر دعائیں کرے اور ان میں سے کسی میں قراءت نہ کرے، پھر سراً ہی سلام کہے۔[1]
(بقول محشی جمہور کی رائے یہ ہے کہ قراءت نبی کریم ﷺ پر درود، دعا اور سلام کے بارے میں سنت یہ ہے کہ یہ سراً پڑھے

---

① صحيح، مسند الشافعي: ٣٥٩.

جائیں، سوائے اس کے کہ امام کے لیے مسنون ہے کہ تکبیرات اور سلام جہراً کہے تا کہ لوگ مطلع ہو جائیں) فتح الباری میں لکھا کہ اس کی سند صحیح ہے، بخاری نے طلحہ بن عبداللہ سے نقل کیا: کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں ایک نمازِ جنازہ پڑھی تو انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور کہا: یہ سنت میں سے ہے۔[1] اسے ترمذی نے بھی نقل کیا اور کہا: صحابہ وغیرہم کے بعض اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے جو تکبیرِ اولیٰ کے بعد فاتحہ کی قراءت مختار کرتے ہیں اور یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہ اللہ کا قول ہے، بعض نے کہا: نمازِ جنازہ میں قراءت نہ کی جائے بلکہ اس میں صرف ثنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور پھر میت کے لیے دعا ہو، یہ ثوری وغیرہ اور اہلِ کوفہ کا مسلک ہے، فرضیتِ قراءت کے قائلین کی حجت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے لیے صلاۃ کا لفظ استعمال کرنا ہے جبکہ آپ نے فرمایا: «صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ»[2] اور ایک حدیث میں ہے: «لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ» ''فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز نہیں۔''[3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے الفاظ اور اس کا محل

اس ضمن میں کوئی بھی عبارت پڑھی جا سکتی ہے: اگر صرف ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' ہی کہہ دیا تو کافی ہے، مگر ماثور (یعنی قرآن یا سنت میں منقول) کی اتباع افضل ہے یعنی پورا درودِ ابراہیمی، اسے بظاہر دوسری تکبیر کے بعد پڑھا جائے، اگرچہ اس کی تعیینِ محل کے بارے میں کچھ وارد نہیں۔

⑥ دعائیں

فقہاء کے ہاں بالاتفاق دعائیں کرنا نمازِ جنازہ کا رکن ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی بھائی کی نماز جنازہ پڑھو تو اخلاص سے اس کے لیے دعا کرو۔''[4] اسے ابو داود، بیہقی اور ابن حبان نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا، یہ کسی بھی دعا کے ساتھ متحقق ہو جائے گا چاہے چھوٹی سی ہو، مستحب یہ ہے کہ درج ذیل ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا (یا سبھی) پڑھی جائیں۔

(الف) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ میں یہ دعا کی: «اَللّٰھُمَّ أَنْتَ رَبُّھَا وَأَنْتَ خَلَقْتَھَا وَأَنْتَ رَزَقْتَھَا وَأَنْتَ ھَدَیْتَھَا لِلْإِسْلَامِ وَأَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَھَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِسِرِّھَا وَعَلَانِیَتِھَا جِئْنَا شُفَعَاءَ لَهٗ فَاغْفِرْ لَهٗ ذَنْبَهٗ»[5] ''اے اللہ! تو اس کا رب ہے، تو نے اسے پیدا کیا، تو ہی اس کا رازق رہا، تو نے اسے اسلام کی ہدایت دی، اب تو نے اس کی روح قبض کی ہے اور تو اس کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے ہم اس کی سفارش کرنے آئے ہیں، پس ہماری سفارش قبول فرما۔''

---

① صحیح البخاری: ١٣٣٥؛ سنن أبی داود: ٣١٩٨. ② صحیح البخاری: ٢٢٩٥؛ صحیح مسلم: ١٦١٩ ③ صحیح مسلم: ٣٩٤. ④ حسن، سنن أبی داود: ٣١٩٩؛ سنن ابن ماجه: ١٤٩٧. ⑤ ضعیف، سنن أبی داود: ٣٢٠٠.

(ب) سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ ایک جنازہ میں یہ دعا پڑھ رہے تھے: (اَللّٰھُمَّ إِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ (فلاں بن فلاں کی بجائے مرحوم اور اس کے والد کا نام ذکر کرے)"فِيْ ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جَوَارِكَ فَقِهِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَأَنْتَ أَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ، اَللّٰهُمَّ فَاغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" "اے اللہ! فلاں بن فلاں اب تیری دسترس میں ہے اور تیرے پڑوس میں آ چکا ہے، پس اسے قبر کے فتنہ اور آگ کے عذاب سے بچا اور تو وعدے پورے کرنے کا اور حق کا اہل ہے، اے اللہ! اس کی مغفرت فرما اور اس پر رحم کر، بے شک تو غفور رحیم ہے۔"[1] ان دونوں روایتوں کو احمد اور ابوداود نے تخریج کیا۔

(ج) سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نمازِ جنازہ میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا (یہ روایتیں دال ہیں کہ آپ جنازہ کی نماز بآوازِ بلند پڑھاتے تھے تبھی تو صحابہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے سنا): «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَ وَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِمَاءٍ وَثَلْجٍ وَبَرَدٍ وَ نَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهٖ وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهٖ وَ زَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهٖ وَ قِهٖ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ» "اے اللہ! اسے معاف فرما، اس پر رحم کر، اس سے درگزر کر اور اسے عافیت بخش، اس کی عمدہ مہمانی کر، اسے کشادہ ٹھکانہ دے، اسے پانی، برف اور اولوں کے ساتھ دھو ڈال، اسے گناہوں سے اسطرح پاک وصاف کر جیسے سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے یہاں کے گھر سے بہتر گھر، ادھر کے اہل سے بہتر اہل اور یہاں کے ساتھیوں سے بہتر ساتھی عنایت کر اور اسے قبر کی آزمائش اور آگ کے عذاب سے بچالے۔"[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

(د) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نمازِ جنازہ میں یہ دعا پڑھی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَأَحْيِهٖ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْإِيْمَانِ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهٗ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهٗ» "اے اللہ! تو ہمارے زندوں اور مُردوں، چھوٹوں اور بڑوں، مردوں اور عورتوں اور حاضر وغائب کی مغفرت فرما، اے اللہ! جس کی زندگی ابھی باقی ہو اسے اسلام والی زندگی دے اور جس کی موت آ گئی ہو اسے ایمان پر موت عطا کر، اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کر اور نہ اس کے بعد ہمیں گمراہی کا شکار بننے دینا۔"[3] اسے احمد اور اصحابِ سنن نے تخریج کیا۔ اگر میت کسی (نابالغ) کی ہے تب نمازی کے لیے یہ دعا مستحب ہے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا أَجْراً وَفَرَطاً وَذُخْراً» "اے اللہ! اسے ہمارے لیے اجر کا باعث اور پیش رو اور توشۂ آخرت بنا۔"[4] اسے بخاری اور بیہقی نے حسن (بصری) رحمہ اللہ کی کلام کے

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٣٢٠٢. [2] صحیح مسلم: ٩٦٣؛ سنن نسائی: ٤/ ٧٣. [3] صحیح، سنن أبی داود: ٣٢٠١؛ سنن ترمذی: ١٠٢٤. [4] صحیح البخاری، قبل الرقم: ١٣٣٥؛ السنن الكبرى للبيهقی: ٤/ ٤١.

بطور نقل کیا، امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر میت کسی بچہ یا بچی کی ہے تو جو حدیث میں دعا مذکور ہوئی یعنی «اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا......» الخ، وہ بھی پڑھے اور ساتھ میں یہ ملالے: «اَللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطاً لِأَبَوَیْهِ وَسَلَفاً وَذُخْراً وَعِظَةً وَاعْتِبَاراً وَشَفِیْعاً وَ ثَقِّلْ بِهٖ مَوَازِیْنَهُمَا وَأَفْرِغِ الصَّبْرَ عَلٰى قُلُوْبِهِمَا وَلَا تَفْتِنْهُمَا بَعْدَهٗ وَلَا تَحْرِمْهُمَا أَجْرَهٗ» ''اے اللہ! اسے اس کے والدین کے لیے پیش رو، توشۂ آخرت، نصیحت اور عبرت کا سبب، سفارش کرنے والا بنا، ان کے نامۂ اعمال کو اس کے ساتھ بھاری کر اور انہیں صبر کی ہمت دے اور انہیں اس کے بعد کسی آزمائش میں نہ ڈالنا اور اسکے اجر سے انہیں محروم نہ کرنا۔''

ان دعاؤں کا محل

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ان دعاؤں کے محل کی تعین وارد نہیں، لہٰذا نمازِ جنازہ پڑھنے والے کو اختیار ہے کہ یہ سب یکبارگی جب چاہے پڑھ لے تو تکبیرات سے فارغ ہو کر یا پہلی، دوسری یا تیسری تکبیر کے بعد: (یا پھر دو تکبیروں میں انہیں پھیلالے یا ہر دو تکبیروں کے مابین ایک ایک دعا پڑھے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سب ماثورہ دعاؤں کا پڑھنے والا بن جائے) کہتے ہیں: بظاہر ان احادیث میں وارد الفاظ کے ساتھ دعا کرے چاہے میت مرد کی ہو یا عورت کی، اگر میت عورت کی ہو تو مذکر کے صیغے مؤنث میں نہ بدلے، کیونکہ ان کا مرجع میت ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں کی نعش کو کہہ سکتے ہیں۔

⑦ چوتھی تکبیر کے بعد دعا

یہ مستحب ہے، اگرچہ تیسری تکبیر کے بعد دعا کر لی ہو، کیونکہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ان کی ایک بیٹی فوت ہوگئی تو انہوں نے اس کی نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہیں، پھر چوتھی کے بعد دو تکبیروں کے درمیانی وقفہ کی مثل توقف کیا اور اس دوران میں دعا کی اور بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنازوں کی نماز میں یہی کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: چوتھی تکبیر کے بعد کہے: «اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ» ابن ابی ہریرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف چوتھی تکبیر کے بعد ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔

⑧ سلام

فقہاء اس کی فرضیت پر متفق ہیں، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ قائل ہیں کہ دائیں بائیں سلام پھیرنا رکن نہیں بلکہ واجب ہے، دیگر کا ان کی فرضیت پر اس امر سے استدلال ہے کہ یہ بھی ایک نماز ہے اور نماز تسلیم ہی سے ختم ہوتی ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جنازہ کی تسلیم نماز کی تسلیم کی مثل ہے اور اس کا اول یہ کہنا ہے: «اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ» یا «سَلَامٌ عَلَیْکُمْ» امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ ایک سلام پھیرنا سنت ہے جو دائیں طرف پھیرے اور حرج نہیں اگر منہ سیدھا رکھے ہی سلام کہہ دیا،

یہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے فعل سے استدلال کرتے ہوئے جو ایک سلام پھیرا کرتے تھے اوران کے زمانہ میں اس کے برخلاف کرنے یا کہنے والا معروف نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ نے دو سلاموں کو مستحب کہا: پہلا دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف منہ کر کے کہے، بقول ابن حزم رحمہ اللہ دوسرا سلام ذکر اور فعلِ خیر ہے۔

نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہونے کی کیفیت

عام نماز کی شروط پوری کرتے ہوئے نمازی حاضر میت پر نمازِ جنازہ کی نیت کرتے ہوئے کھڑا ہو اور تکبیرِ تحریمہ کہنے کے ساتھ ہی رفع الیدین کرے، پھر دایاں بازو بائیں پر باندھ کر قراءتِ فاتحہ شروع کرے، پھر تکبیر کہے اور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے، پھر تکبیر کہے اور میت کے لیے دعا کرے، پھر تکبیر کہے اور دعا کرے اور پھر سلام پھیر دے۔

امام کہاں کھڑا ہو؟

سنت یہ ہے کہ امام مرد کی میت کے سر کے سامنے اور عورت کی میت کے وسط میں اس کے محاذی کھڑا ہو، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے ایک مرد کی نماز جنازہ پڑھائی تو اس کے سر کے پاس کھڑے ہوئے، اس سے فارغ ہو کر عورت کا جنازہ لایا گیا تو اس کے درمیان کے پاس کھڑے ہوئے، کسی کے پوچھنے پر کہا: یہی نبی کریم ﷺ کا فعل ہے،[1] اسے احمد، ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن کہا، طحاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ ہمیں زیادہ پسند ہے، نبی کریم ﷺ سے ہمارے روایت کردہ آثار اسے تقویت دیتے ہیں۔

اجتماعی نمازِ جنازہ

اگر متعدد جنازے جمع ہوں چاہے مردوں کے ہوں یا عورتوں کے تو امام اور قبلہ کے مابین انہیں سامنے کی طرف قطار میں رکھ دیا جائے اور ان کا افضل امام سے قریب ہو تو سب پر ایک ہی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، اگر کچھ مردوں اور کچھ عورتوں کے ہیں تو جائز ہے کہ دونوں کے الگ الگ پڑھے یا سب کا یکبارگی ہی، مردوں کے جنازے امام کے آگے والی قطار میں ہوں اور عورتوں کے اس سے آگے قبلہ کی طرف، امام نافع رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نو میتوں کی نماز جنازہ اکٹھے پڑھائی، کچھ مرد اور کچھ عورتیں تھیں تو سب کو قبلہ کی سمت ایک قطار میں رکھا، مردوں کو پہلے اور عورتوں کو بعد میں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام کلثوم بنت علی کی اور ان کے زید نامی ایک بیٹے کی نماز جنازہ اکٹھے پڑھائی گئی، امام سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے جبکہ حاضرین میں سیدنا ابن عباس، ابوہریرہ، ابوسعید اور ابوقتادہ رضی اللہ عنہم بھی تھے، لڑکے کی میت کو امام کے آگے رکھا گیا، ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے استفہامی نظروں سے ان صحابہ کی طرف دیکھا تو ان سب نے کہا: یہی سنت ہے۔[2] اسے نسائی اور بیہقی نے نقل کیا، بقول حافظ اس کی سند صحیح ہے، اگر میتوں میں مردوں اور عورتوں کے ساتھ بچے بھی ہوں تو اولاً مردوں، پھر بچوں اور

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ٣١٩٤. [2] صحيح، سنن نسائي: ٤/ ٧١؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٣٣.

آخر میں قبلہ کی سمت میں عورتوں کو رکھا جائے۔

حاضرین کی تین صفیں بنانے اور انہیں سیدھی اور برابر رکھنے کا استحباب

سیدنا مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کی تین صفیں کسی مومن کی نمازِ جنازہ پڑھ لیں تو اسے مغفرت نصیب ہوگی۔'' سیدنا مالک رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ اگر نماز جنازہ پڑھنے والے کم بھی ہوتے تو ان کی تین صفیں بنواتے۔[1] اسے احمد، ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن کہا، حاکم نے اسے صحیح قرار دیا، امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: مجھے پسند ہے کہ اگر لوگ کم بھی ہوں تو ان کی تین صفیں بنیں، پوچھا گیا: اگر امام کے پیچھے صرف چار افراد ہوں؟ کہا: ان کی دو صفیں بنالے ہر صف میں دو آدمی ہوں، اس امر کو مکروہ سمجھا کہ تین صفیں بنوائے اس طرح کہ ہر صف میں ایک شخص ہو۔

جنازہ میں حاضرین کی کثرت ہونے کا استحباب

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس میت کی نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد سو تک پہنچے اور وہ سب اس کے لیے سفارش کریں تو ان کی سفارش قبول ہوگی۔''[2] اسے احمد، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جس کسی مومن کی نماز جنازہ چالیس ایسے افراد نے پڑھی جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تو اللہ اس کے بارے میں ان کی سفارش قبول فرمائے گا۔''[3] اسے احمد، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا۔

جو نمازِ جنازہ میں تاخیر سے ملے

اس سے اگر کوئی تکبیر رہ گئی تو مستحب ہے کہ متتابعاً (یعنی ایک ساتھ اکٹھی) اس کی قضا دے لے، اگر نہ بھی دی تو حرج نہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما، حسن، ایوب سختیانی، اور اوزاعی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ کسی فوت شدہ تکبیر کی قضا نہ دے، بلکہ امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دے، بقول امام احمد رحمہ اللہ اگر قضا نہ دے تو حرج نہیں۔ مؤلف المغنی نے اس مذہب کو قوی قرار دیا اور لکھا کہ ہماری دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور صحابہ میں کوئی اس میں ان کا مخالف معروف نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عرض کی: یارسول اللہ! اگر میں نمازِ جنازہ میں شریک ہوں اور بعض تکبیرات نہ سن پاؤں تو......؟ فرمایا: ''جو سنو تو (اس کی پیروی میں) تم بھی تکبیر کہو اور جو رہ جائے تو تم پر قضا نہیں۔'' یہ اس باب میں صریح ہے اور اس لیے کہ تکبیرات پے در پے ہوتی ہیں تو جس سے کچھ فوت ہو جائے تو عید کی تکبیرات کی طرح واجب نہیں کہ قضا دے۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٣١٦٦؛ سنن ترمذی: ١٠٢٨؛ سنن ابن ماجه: ١٤٩٠؛ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو محمد بن اسحاق کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف قرار دیا مگر مسندالرویانی: ١٥٣٧ میں سماع کی تصریح موجود ہے، اس لیے شعیب ارناؤط حفظہ اللہ اور حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے: سنن أبی داود: ٣١٦٦. [2] صحیح مسلم: ٩٤٧؛ سنن ترمذی: ١٠٢٩.
[3] صحیح مسلم: ٩٤٨؛ سنن أبی داود: ٣١٧٠.

کن کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور کن کی نہیں؟

فقہا متفق ہیں کہ ہر مسلمان کی چاہے وہ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا نماز جنازہ پڑھی جائے، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ علم کا اجماع ہے کہ جو نومولود زندہ حالت میں پیدا ہوا اور اس کی آواز نکلی (یعنی پتہ چلا کہ وہ زندہ ہے)، پھر اسی وقت مر جانے کی صورت میں) اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوار ہو کر جنازہ کے ہمراہ جانے والا اس کے پیچھے پیچھے چلے اور پیدل چلنے والا اس کے آگے اس سے قریب یا دائیں یا بائیں طرف اور سقط (یعنی دورانِ حمل فوت ہونے والے بچے) کی نماز جنازہ پڑھی جائے، جس میں اس کے والدین کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی جائے۔''[1] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا اور ان کی روایت کے الفاظ ہیں کہ ''پیدل چلنے والا میت کے قریب ہی اس کے آگے یا پیچھے یا دائیں اور بائیں چلے'' ایک روایت میں ہے: ''سوار جنازہ کے پیچھے اور پیدل جہاں چاہے چلے اور نومود بچے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔''[2] اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے تخریج کیا۔

سقط (رحم سے مردہ حالت میں مدتِ حمل مکمل ہونے سے قبل پیدا ہونے والے بچے) کی نمازِ جنازہ

ایسے بچے پر اگر ابھی چار ماہ نہیں گزرے تھے (یعنی رحمِ مادر میں) تو بالاتفاق اسے غسل نہ دیا جائے اور نہ اس کی نمازِ جنازہ ہے، بلکہ اسے کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے، اگر چار ماہ یا زائد ہو گئے تھے اور (باہر نکل کر) اس نے حرکت کی یا آواز نکالی تو بالاتفاق اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، اگر حرکت نہیں کی تب احناف، امام مالک، اوزاعی اور حسن رحمہم اللہ کے نزدیک نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے، کیونکہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر سقط کی حیات محسوس ہوئی (اور پھر مر گیا) تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور وراثت میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔''[3] تو اس حدیث میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی شرط حیات محسوس ہونا ہے، احمد، سعید، ابن سیرین اور اسحق رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اسے غسل بھی دیا جائے اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائے، ان کا استدلال (سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی) سابق الذکر روایت سے ہے، جس میں تھا کہ سقط کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے کیونکہ وہ نسمہ ہے جس میں روح پھونک دی گئی تھی، لہٰذا اس بچے کی طرح جس کی زندگی (رحم سے نکلنے کے بعد) محسوس کی گئی اس کی بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، کیونکہ حدیثِ نبوی کے مطابق چار ماہ مکمل ہونے پر روح ڈال دی جاتی ہے، اسلاف کے مستدَل بہ کا جواب یہ دیا کہ وہ حدیث مضطرب ہے، پھر وہ اپنے سے زیادہ قوی کی معارض ہے، لہٰذا قابلِ احتجاج نہیں۔

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۱۰۳۱؛ سنن ابن ماجہ: ۱۵۰۷. [2] صحیح، سنن ترمذی:۔ ۱۰۳۱. [3] ضعیف، سنن ترمذی: ۱۰۳۲؛ سنن ابن ماجہ: ۱۵۰۸.

شہید کی نمازِ جنازہ

شہید وہ ہے جو معرکہ میں کفار کے ہاتھوں مارا جائے، کئی صحیح وصریح احادیث میں وارد ہے کہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی:

① بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کو ان کے خون ہی میں بغیر غسل دیے اور بغیر نمازِ جنازہ پڑھے دفن کرنے کا حکم دیا۔[1]

② احمد، ابوداود اور ترمذی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ شہدائے احد کو نہ غسل دیا گیا اور نہ ان کی نمازِ جنازہ ہوئی۔[2]

کئی دیگر روایات میں نمازِ جنازہ پڑھی جانے کی تصریح بھی وارد ہے:

① بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احد کے آٹھ برس بعد ایک دن نکلے اور شہدائے احد کی نمازِ جنازہ پڑھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپ زندوں اور مُردوں کو الوداع کہہ رہے ہیں (یعنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دور میں یہ کیا، بظاہر یہ معروف نمازِ جنازہ نہ تھی بلکہ دعائے مغفرت تھی)۔

② ابو مالک غفاری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ شہدائے احد کو نو نو کر کے اس طرح کہ ہر نو کے ساتھ دسویں سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ ہوتے، لایا جاتا تو آپ ان کی نمازِ جنازہ پڑھتے تو بقیہ کو اٹھا لیا جاتا اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ ادھر ہی رہتے حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کی نمازِ جنازہ سے فارغ ہوئے،[3] اسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے نقل کیا اور لکھا کہ یہ اس باب کی صحیح ترین روایت ہے اور یہ مرسل ہے (اور مرسل قابلِ احتجاج نہیں) تو ان احادیث کے مدِنظر فقہاء کے ہاں اختلافِ آراء ہوا تو بعض نے ان سب کا اخذ کیا جبکہ بعض نے ترجیح کی راہ اختیار کی، اسلاف میں امام ابن حزم رحمہ اللہ بھی ہیں تو انہوں نے پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں کو جائز قرار دیا، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک قول بھی یہی ہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اسی کی تصویب کی اور لکھا: صواب یہ ہے کہ اس ضمن میں فعل وترک دونوں کا اختیار ہے، کیونکہ دونوں طرح کے آثار موجود ہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک قول بھی یہی ہے اور یہی ان کے مسلک کے اصول کے زیادہ لائق ہے، کہتے ہیں: بظاہر شہدائے احد کی تدفین کے وقت نمازِ جنازہ نہ پڑھی تھی، یہ ستر تھے لہٰذا اگر ان کے جنازوں کی نماز ہوئی ہوتی تو یہ امر مخفی نہ ہوتا اور ترک میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث صریح ہے اور ان کے والد بھی شہدائے احد میں شامل تھے تو انہیں جو معلومات ہو سکتی ہیں وہ ان کے غیر کو نہیں۔

امام ابوحنیفہ، ثوری، حسن اور ابن مسیب نے ان روایات کو راجح کہا جن میں نمازِ جنازہ کا اثبات مذکور ہے تو وہ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھا جانے کے قائل ہیں، امام مالک، امام شافعی اور امام اسحاق رحمہم اللہ نے اس کے عکس کو راجح کہا: امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے، شافعی ''الام'' میں اپنے مذہب کی ترجیح میں لکھتے ہیں: روایات متواتر طرق سے وارد ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحيح البخاري: ١٣٤٣. ② حسن، سنن أبي داود: ٣١٣٥؛ سنن ترمذي: ١٠١٦. ③ مراسيل ابى داود: ٤٢٧؛ مصنف ابن ابى شيبة: ٣/ ٣٠٤.

نے شہدائے احد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی اور جو مروی ہے کہ آپ نے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہی تھیں تو وہ صحیح نہیں، اس قسم کی روایات کے ساتھ صحیح احادیث کا معارضہ کرنے والوں کو حیا کرنی چاہیے! کہتے ہیں: جہاں تک (سابق الذکر) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے تو خود اسی میں ہے کہ یہ نمازِ جنازہ آٹھ برس بعد پڑھی تھی، کہتے ہیں: گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی اجل کا قرب محسوس فرمایا تو شہدائے احد کے لیے دعائے استغفار کی تھی انہیں الوداع کہتے ہوئے اور یہ حکم ثابت کے نسخ پر دال نہیں۔

جو معرکہ میں زخمی ہوا اور کچھ عرصہ زندہ رہا، پھر فوت ہوگیا

اسے غسل بھی دیا جائے اور اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے، اگرچہ (حکم کے اعتبار سے) یہ شہید شمار ہوگا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو غسل دلوایا اور ان کی نماز جنازہ بھی پڑھائی جو خندق کے معرکہ میں زخمی ہوئے اور کئی دن تک زندہ رہے تھے اور ان کے زخمی ہاتھ کا علاج ہوتا رہا، پھر ایک دن زخم کھل گیا اور ان کی وفات واقع ہوگئی، اگر کوئی زیادہ دیر زندہ نہ رہے بس کچھ دیر رہے اگرچہ باتیں کیں اور اکل وشرب بھی کیا پھر فوت ہوگیا تو اسے نہ غسل دیا جائے اور نہ اس کی نمازِ جنازہ ہو، المغنی میں ہے کہ فتوحِ شام میں مذکور ہوا: ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے سیدنا حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو زخمیوں میں پایا، انہیں پانی پلانا چاہا تو ساتھ پڑا ایک آدمی دیکھنے لگا تو انہوں نے اشارہ کیا کہ پہلے اسے پلا دو اس کے پاس گیا تو آگے ایک اور نے نظر اٹھائی اس شخص نے اشارہ کیا کہ اس کے پاس پانی لے جاؤ، اس کے پاس پہنچا تو ایک اور نے دیکھا، اس نے بھی اشارہ کیا کہ پہلے اسے پلا دو، کہتے ہیں: یہ سب جاں بحق ہوگئے (یعنی پانی پیئے بغیر) ان میں سے کسی کو نہ غسل دیا گیا اور نہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور یہ سب جنگ ختم ہونے کے بعد فوت ہوئے۔

کسی شرعی حد لگنے کے نتیجہ میں مرنے والے کی نمازِ جنازہ

اسے غسل بھی دیا جائے اور اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے، کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور زنا کا اعتراف کیا، آپ نے اعراض فرمایا حتی کہ چار مرتبہ یہی کیا، پھر آپ نے پوچھا: ''تم دیوانے تو نہیں؟'' کہا: نہیں! فرمایا: ''شادی شدہ ہو؟'' کہا: ہاں! تو آپ نے حکم دیا تو اسے عیدگاہ میں رجم کیا گیا، جب اسے پتھر پڑے تو بھاگا، لوگوں نے پکڑ کر پھر پتھر مارے حتی کہ وہ فوت ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہا اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔[1]

بقول امام احمد رحمہ اللہ ہمارے علم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی نماز جنازہ نہیں چھوڑی ماسوائے غالّ (یعنی مالِ غنیمت وغیرہ میں خیانت کا مرتکب) اور خودکشی کرنے والے کے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٦٨٢٠؛ سنن أبي داود: ٤٤٣٠؛ سنن ترمذي: ١٤٢٩.

خائن، خودکشی کرنے والے اور دیگر فجار وفساق کی نمازِ جنازہ

جمہور علماء قائل ہیں کہ ان سب کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قاضی کے بقول تمام علماء کا مذہب ہے کہ ہر مسلمان، حد لگنے سے مارے گئے، رجم کیے گئے، خودکشی کرنے والے اور ولدِ زنا کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور جو مروی ہے کہ آپ نے غالّ اور خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تو شاید یہ اس فعل سے زجر کی وجہ سے جیسے آپ قرضدار کی نمازِ جنازہ سے ممتنع ہوئے اور صحابہ کو حکم دیا کہ وہ پڑھ لیں، امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، خواہ کوئی نیک ہو یا فاجر یا کسی حد، حرابت (یعنی ڈاکہ زنی جیسے جرائم کا مرتکب) یا بغاوت میں مارا گیا ہو، اسی طرح بدعتی کی بھی جب تک کہ وہ کفر کی حد تک نہ پہنچا ہو اور خودکشی کرنے والے اور قاتل کی بھی، غرض کہ کوئی سب اہلِ زمین سے بدتر ہو، اگر وہ حالتِ اسلام میں مرا ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کے اس عمومی فرمان کے پیشِ نظر: «صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ» ''اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔''[1] اور ہر مسلمان ہمارا ساتھی ہے، قرآن میں ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (الحجرات:۱۰) ''مومن تو بھائی ہی ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبة:۷۱) ''مومن مرد اور مومن عورتیں ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔'' جو حضرات کسی بھی مسلمان کی نمازِ جنازہ سے منع کرتے ہیں وہ ایک بڑی بات منہ سے نکالتے ہیں فاسق وفاجر تو بنسبت کسی نیک صالح مرحوم کے اہلِ اسلام کی دعاؤں کا زیادہ محتاج ہے صحیحاً مروی ہے کہ معرکۂ خیبر کے دوران میں ایک شخص فوت ہوا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: ''تم اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ پڑھ لو (یعنی خود نہ پڑھی) کیونکہ اس نے مالِ غنیمت میں سے کچھ خیانت کی تھی۔'' راوی کہتے ہیں: ہم نے اس کے سامان کی تلاشی لی تو ایک منکا برآمد ہوا جو دو درہموں کے بھی مساوی نہ تھا۔[2] امام عطاء رحمہ اللہ سے بصحت منقول ہے کہ ولدِ زنا کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کی والدہ کی بھی، اسی طرح لعان کرنے والے میاں بیوی کی اور قصاصاً قتل کیے جانے والے کی اور رجم کیے جانے والے کی اور اس کی بھی جو میدانِ جہاد سے بھاگ جائے تو قتل کر دیا جائے، کہا کرتے تھے کہ جس نے بھی لا الہ الا اللہ پڑھا، میں اس کی نمازِ جنازہ چھوڑ نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ ''بعد اس کے کہ ان کا جہنمی ہونا ان کے لیے ظاہر ہوا۔'' (التوبة: ۱۱۳) براہیم نخعی رحمہ اللہ کا صحت کے ساتھ منقول ہے کہ وہ کسی بھی اہلِ قبلہ کی نمازِ جنازہ سے نہ روکتے تھے، خودکشی کرنے والے کی بھی نماز جنازہ پڑھی جائے، کہتے ہیں: سنت یہ ہے کہ رجم کیے جانے والے کی بھی پڑھی جائے، قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میں کسی اہلِ علم کو نہیں جانتا جو لا الہ الا اللہ کہنے والے کی نمازِ جنازہ سے اجتناب کرتا ہو، یہی بات ابن سیرین رحمہ اللہ سے بھی نقل کی گئی، ابو غالب کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا شرابی کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے؟ کہا: ہاں! حسن رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ہر لا الہ الا اللہ پڑھنے والے اور جس نے قبلہ سمت ہو کر نماز پڑھی، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے کیونکہ یہ ایک سفارش ہے (جو اللہ قبول کرے یا نہ کرے، ہمیں کرنے سے کیا نقصان!)۔

---

[1] صحيح البخاري: ۲۲۸۹؛ سنن ابن ماجه: ۲٤۰۷. [2] ضعيف، سنن أبي داود: ۲۷۱۰؛ سنن ابن ماجه: ۲۸٤۸.

کافر کی نمازِ جنازہ

مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کافر کی نمازِ جنازہ پڑھے، کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

''(اے پیغمبر!) ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے۔''

پھر فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَھُمْ اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَھَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ (التوبة:١١٣-١١٤)

''پیغمبر (ﷺ) اور مسلمانوں کو لائق نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں تو ان کے لیے بخشش مانگیں۔ گو وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے، لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے زار (یعنی بے تعلق) ہو گئے۔''

اسی طرح ان کے نابالغ بچوں کا بھی کیونکہ ان کے لیے بھی ان کے آباء کا حکم ہے اِلّا یہ کہ جس کے اسلام کا ہم حکم لگائیں اس طور پر کہ اس کے والدین میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا تھا یا اسے والدین یا ان میں سے ایک سے جدا کر کے قیدی بنا لیا گیا تھا یا مر گیا تھا تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

قبر پر نمازِ جنازہ

تدفین کے بعد کسی بھی وقت قبر پر آ کر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے، اگرچہ دفن سے قبل اس کی نمازِ جنازہ ہوئی ہو، پہلے گزرا کہ نبی کریم ﷺ نے شہدائے احد کی آٹھ برس بعد نمازِ جنازہ پڑھی، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نکلے، جب بقیع پہنچے تو آپ کی نظر ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر پڑی، پوچھا تو بتلایا گیا کہ یہ فلاں عورت کی ہے (یہ مسجد کی صفائی کرنے والی ایک بے سہارا خاتون تھی) آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کے مرنے کی خبر کیوں نہ دی تھی؟'' عرض کی: آپ روزے سے تھے اور قیلولہ فرما رہے تھے تو ہم نے برا جانا کہ آپ کو زحمت دیں، فرمایا: ''ایسا نہ کیا کرو، جب تک میں زندہ ہوں جو بھی فوت ہو مجھے آگاہ کیا کرو، کیونکہ میرا نمازِ جنازہ پڑھانا باعثِ رحمت ہے۔'' کہتے ہیں: پھر آپ قبر کے پاس آئے، ہم نے آپ کے پیچھے صفیں بنائیں تو آپ نے چار تکبیریں کہیں،[1] اسے احمد، نسائی، بیہقی، حاکم اور ابن حبان نے نقل کیا اور آخری دو نے صحیح کہا، بقول امام ترمذی رحمہ اللہ صحابہ وغیرہم کے اکثر اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے اور یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ١٥٢٨؛ صحیح ابن حبان: ٣٠٨٧.

کا قول ہے، اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبر پر نماز جنازہ پڑھی، حالانکہ تدفین سے قبل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی نمازِ جنازہ پڑھ چکے تھے، صحابہ کا بھی آپ کے ساتھ دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ صرف آپ کے ساتھ خاص نہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ان محکم روایات کو ایک متشابہ (یعنی جس کا معنی کئی احتمالات کا حامل ہے) حدیث کے ساتھ رد کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''قبور پر مت بیٹھو اور نہ ان کی طرف (منہ کر کے) نماز پڑھو۔''[1] یہ صحیح حدیث ہے تو جس رسول کریم ﷺ کا یہ قول ہے انہی کا یہ فعل ہے جو اوپر ذکر ہوا دونوں باہم متناقض نہیں، کیونکہ جس نماز سے آپ نے نہی کی یہ اس نماز سے دیگر ہے جو آپ نے پڑھی کیونکہ یہ جنازہ کی نماز ہے، جو کسی جگہ کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ غیر مسجد میں اسے ادا کرنا افضل ہے تو آپ کا ان صحابیہ کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے ان کی نعش پر پڑھی ہو، البتہ دیگر نمازیں قبور (یعنی قبرستان) میں مشروع نہیں اور نہ ان کی طرف رخ کر کے (یعنی قبلہ اور اپنے درمیان انہیں رکھتے ہوئے) کیونکہ یہ مساجد بنا لینے کا ذریعہ بن جائے گا اور ایسا کرنے والے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت کی ہے اور بتلایا کہ ایسا کرنے والے بدترین مخلوق میں سے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: ''بدترین لوگوں میں سے وہ ہے جو قیامت قائم ہوتے وقت زندہ ہوں گے اور وہ بھی جو قبور کو مساجد بنا لیں۔''

غائبانہ نمازِ جنازہ

یہ جائز ہے، چاہے قریب کے کسی شہر کی میت ہو یا دور کی، نمازی اپنا منہ قبلہ رخ کرے گا، چاہے وہ شہر اس کے قبلہ رخ نہ بھی ہو، جہاں کی میت ہے اور اس کے نام کی نیت کرے اور اسی طریقہ سے جیسے حاضر میت کی پڑھی جاتی ہے، جماعت نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے نجاشی رحمہ اللہ کی وفات کی اسی روز خبر دی جس دن ان کا (حبشہ میں) انتقال ہوا تھا اور صحابہ کی صفیں بنوائیں اور چار تکبیریں کہیں، بقول ابن حزم باجماعت غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، نبی کریم ﷺ نے نجاشی رحمہ اللہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی تھی اور یہ ان کی طرف سے اجماع ہے جس کی مخالفت جائز نہیں، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا فتویٰ اس کے برخلاف ہے، لیکن ان کے لیے کوئی ایسی حجت نہیں جو قابلِ غور ہو۔

مسجد میں نمازِ جنازہ

اگر مسجد کے آلودہ ہونے کا ڈر نہیں تو اس میں حرج نہیں، مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھائی تھی، اسی طرح سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی نماز جنازہ بھی مسجد میں پڑھائی گئی اور کسی طرف سے مخالفت نہ ہوئی، کیونکہ یہ بھی دیگر نمازوں کی طرح ایک نماز ہے۔[2] جہاں تک مالک اور ابوحنیفہ کا اسے مکروہ کہنا ہے جو نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہ «فَلَا شَيْءَ لَهُ» ''(جس نے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی) اس کے لیے کوئی چیز نہیں۔''[3] تو یہ فعلِ نبوی اور فعلِ صحابہ کے معارض ہے، پھر یہ روایت ضعیف ہے، امام احمد رحمہ اللہ

---

[1] صحيح مسلم: ٩٧٢؛ سنن أبي داود: ٣٢٢٩. [2] المصنف لابن ابى شيبة: ٣/ ٣٦٤. [3] حسن، سنن أبي داود: ٣١٩١.

نے اسے ضعیف قرار دیا، صالح مولی التوامۃ اس کے ساتھ متفرد ہیں اور وہ ضعیف ہیں، علماء نے کہا: سنن ابو داود کے صحیح ومشہور نسخوں میں اس کی بجائے یہ لفظ مذکور ہے: «فلا شیء عَلَیْهِ» ''اس پر کوئی دوش نہیں۔'' امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ثابت نہیں کہ باقاعدگی کے ساتھ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھائی ہو، آپ ہمیشہ خارج از مسجد ہی نمازِ جنازہ پڑھاتے رہے، مگر کسی عذر کی وجہ سے کبھی مسجد میں بھی پڑھا دیتے تھے، جیسے سیدنا سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ کی پڑھائی تو یہ دونوں طرح جائز ہے، افضل یہی ہے کہ خارج از مسجد ہو۔

قبرستان کے اندر نمازِ جنازہ پڑھانا

جمہور کے ہاں یہ مکروہ ہے، یہ سیدنا علی، عبداللہ بن عمرو اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی امام عطاء، امام نخعی، امام شافعی، امام اسحاق اور امام ابن منذر رحمہم اللہ کا اختیار ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ ''سوائے قبرستان اور حمام کے ہر جگہ نماز ادا ہو سکتی ہے۔''[1] امام احمد رحمہ اللہ سے ایک قول منقول ہے کہ اس میں حرج نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان کے اندر ایک قبر کے پاس نمازِ جنازہ پڑھی، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ بقیع کے وسط میں پڑھائی اور حاضرین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی ایسا کیا۔

عورتوں کا نمازِ جنازہ پڑھنے کا جواز

مردوں کی طرح ان کے لیے بھی یہ جائز ہے، چاہے اکیلی پڑھے یا جماعت کے ساتھ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عتبہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ پر انتظار کیا، حتی کہ سیدہ ام عبداللہ آئیں اور ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی میت منگوا کر ان کی نمازِ جنازہ پڑھی، امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان کے لیے بھی جماعت کا اہتمام کر لینا مسنون ہے، جیسے دیگر نمازوں کے ضمن میں ہے، یہی حسن بن صالح، سفیان ثوری، احمد اور احناف کا مسلک ہے، مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: اکیلی اکیلی پڑھ لیں۔

نمازِ جنازہ کا امام بننے کا زیادہ حقدار

اس بارے میں اختلافِ اقوال ہے، بعض نے کہا: سب سے زیادہ استحقاق وصی کا ہے (یعنی جسے امام بنانے کی مرحوم نے وصیت کی) پھر حاکمِ شہر، پھر والد، اگر وہ زندہ نہیں تو دادا اور اس سے اوپر، پھر بیٹا اور پوتا اور ما بعد، پھر قریب ترین رشتہ دار، یہی مالکیہ اور حنابلہ کا رجحان ہے، بعض نے کہا: پہلا حق والد، پھر دادا، پھر بیٹا، پھر پوتا، پھر بھائی، پھر بھتیجا، پھر چچا، پھر چچا زاد، اسی ترتیب سے مختلف اقارب اور یہ امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مذہب ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ سب سے مقدم حق والیِ شہر کا ہے، اگر وہ حاضر ہو، پھر قاضی، پھر امامِ جبہہ (یعنی جہادی شخصیت، لیکن خیال رہے کہ

[1] صحیح، سنن أبی داود: ٤٩٢.

کوئی جعلی اور صرف چندہ اکٹھا کرنے والا مجاہد نہ ہو) پھر عورت کی میت کا ولی، پھر ترتیبِ رشتہ کے لحاظ سے اقرب فاقرب البتہ اگر والد اور اس کا بیٹا جمع ہوں تو والد کا حق مقدم ہے۔

جنازہ اٹھانا اور لے جانا

اس ضمن میں درج ذیل امور کا خیال رکھنا مشروع ہے:

① جنازہ کے ہمراہ چلنا اور اسے اٹھانا مشروع ہے۔

سنت یہ ہے کہ چارپائی ہر طرف سے باری باری اٹھائی جائے، ابن ماجہ، بیہقی اور ابو داود طیالسی نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جو جنازہ کے ہمراہ چلے، وہ چارپائی کی ہر جانب سے سہارا دے کیونکہ یہی سنت ہے، پھر (ایک دفعہ کے بعد) چاہے تو پھر پکڑے اور چاہے تو اسی پر اکتفا کرے۔[1]

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مریض کی عیادت کرو اور جنازہ کے ساتھ چلو، یہ تمہیں آخرت کی یاد دلائے گی۔''[2] اسے احمد نے ثقہ سند سے نقل کیا۔

② جنازہ لے کر ذرا تیز چلنا

جماعت نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنازہ لے جانے میں سرعت کرو کیونکہ اگر وہ نیک تھا تو خیر کی طرف اسے لے جا رہے ہو اور اگر ایسا نہ تھا تو ایک شر تھا جسے جتنی جلدی ہو اپنی گردنوں سے اتار دو۔''[3] احمد اور نسائی وغیرہما نے سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنازوں کو اس طرح لے جاتے دیکھا، گویا ہلکے ہلکے دوڑتے ہوں، امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ میں نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا جنازہ لے جاتے ہوئے اس قدر سرعت کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے جوتے کچلے گئے،[4] ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں رقمطراز ہیں: حاصل یہ کہ جنازوں کو لے کر سرعت سے چلنا مستحب ہے، لیکن اتنی تیزی نہ ہو کہ میت گر جائے یا اٹھانے والوں یا ہمراہ چلنے والوں کو مشقت ہو، کیونکہ یہ اسلام میں مطلوب نظم وضبط کے منافی ہے اور اس میں مسلمانوں (بالخصوص بوڑھوں) کے لیے مشقت ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ میت کی تدفین میں بے جا تاخیر نہ کی جائے، کیونکہ ایسا کرنا کئی دفعہ فخر ومباہات کا سبب بن سکتا ہے۔

③ میت کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں اس کے قریب چلنا

علماء نے اس امر میں اختلاف کیا کہ افضل کیا ہے؟ تو جمہور اور اکثر اہلِ علم نے میت کے آگے چلنے کو اختیار کیا اور کہا کہ یہ

---

① ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٤٧٨؛ سنن الکبری للبیهقی: ٤/ ٢٠. ② صحیح، صحیح ابن حبان: ٢٩٥٥؛ مسند البزار: ٨٢٢. ③ صحیح البخاری: ١٣١٥؛ صحیح مسلم: ٩٤٤. ④ التاریخ الکبیر للبخاری: ٤/ ١/ ٢٠٤.

افضل ہے، کیونکہ رسول کریم ﷺ اور شیخین جنازوں کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔[1] اسے احمد اور اصحاب سنن نے نقل کیا ہے، احناف کے خیال میں پیچھے چلنا افضل ہے اور تبع وہی ہوتا ہے جو (متبوع کے) پیچھے چلے (توجہ دلائی کہ حدیث میں اتباعِ جنائز کا لفظ مستعمل ہے) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ یہ سب برابر ہے کیونکہ اوپر نبی کریم ﷺ کا فرمان گزرا کہ ''سوار پیچھے چلے جبکہ پیدل آگے اور دائیں، بائیں اس کے قریب ہی۔''[2] بظاہر یہ سب ٹھیک اور یہ مباح اختلاف میں سے ہے جس میں تساہل مناسب ہے، سیدنا عبدالرحمن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما جنازوں کے آگے آگے چلا کرتے تھے، جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے چلتے تھے، ان سے کہا گیا کہ سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما تو آگے چلتے تھے تو کہا: مگر وہ جانتے تھے کہ جنازوں کے پیچھے چلنا بنسبت آگے چلنے کے افضل ہے، اتنا کہ جیسے باجماعت نماز ادا کرنے کی اکیلے کی نماز پر فضیلت ہے، لیکن انہوں نے ایسا اس لیے کیا تاکہ لوگوں کے لیے سہولت پیدا کریں، اسے بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے نقل کیا۔[3] بقول ابن حجر دونوں کی سند حسن ہے۔

سوار ہو کر جنازوں کے ہمراہ چلنا جمہور نے مکروہ کہا ہے، اِلّا یہ کہ کوئی عذر ہو، البتہ واپس سوار ہو کر جانا بلا کراہت جائز ہے اور یہ حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ کے مدنظر جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک جنازہ کے ساتھ جانے کے لیے سواری پیش کی گئی، مگر آپ نے سوار ہونے سے انکار کیا، پھر واپسی پر بھی پیش کی گئی تو سوار ہو گئے، اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''جاتے وقت فرشتے بھی پیدل چل رہے تھے تو میں نے بھی سوار نہ ہونا پسند کیا، جب وہ چلے گئے تو میں سوار ہوا۔''[4] اسے ابوداود، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا، بقول حاکم یہ شیخین (یعنی بخاری ومسلم) کی شرط پر صحیح ہے، نبی کریم ﷺ سیدنا ابن دحداح رضی اللہ عنہ کے جنازہ کے موقع پہ پیدل چلے اور واپسی کے وقت گھوڑے پر سوار ہوئے۔[5] اسے ترمذی نے حسن صحیح قرار دے کر نقل کیا، احناف کی رائے میں سوار ہو کر جانے میں حرج نہیں، اگرچہ افضل یہی ہے کہ پیدل چلے اِلّا یہ کہ عذر ہو، سوار کے لیے سنت یہ ہے کہ جنازے کے پیچھے چلے، جیسا کہ حدیث میں گزرا، بقول امام خطابی رحمہ اللہ اس بارے میں کسی اختلاف سے میں واقف نہیں۔

جنازہ کے ساتھ درج ذیل امور مکروہ ہیں:

① بلند آواز سے ذکر یا تلاوت کرتے جانا یا کچھ اور (مثلاً نعتیں پڑھنا یا محض کلمۂ شہادت پکارنا)

بقول ابن منذر قیس بن عباد سے مروی ہے کہ اصحابِ رسول تین امور میں آواز بلند کرنا مکروہ گردانتے تھے: جنازوں کے وقت، ذکر واذکار میں اور قتال کے وقت، امام سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، نخعی، احمد، اور اسحاق رحمہم اللہ نے جنازوں کے پیچھے یہ کہتے جانا کہ اس کے لیے استغفار کرو (یا کہنا: کلمہِ شہادت) مکروہ قرار دیا ہے، بقول امام اوزاعی یہ بدعت ہے،

---

① صحیح، سنن أبی داود: ٣١٧٩؛ سنن ترمذی: ١٠٠٧. ② صحیح، سنن أبی داود: ٣١٨٠؛ سنن ابن ماجه: ١٤٨١. ③ حسن، المصنف ابن ابی شیبة: ٣/ ٢٧٨؛ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ٢٥. ④ صحیح، سنن أبی داود: ٣١٧٧؛ السنن الکبری للبیهقی: ٤/ ٢٥. ⑤ صحیح مسلم: ٩٦٥؛ سنن ترمذی: ١٠٢٤.

فضیل بن عمرو سے منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک جنازہ کے ہمراہ تھے کہ کسی کو کہتے سنا: اس کے لیے استغفار کرو، اللہ تمہاری مغفرت کرے تو قائل سے کہا: اللہ تیری مغفرت نہ کرے، بقول امام نووی رحمہ اللہ صواب جو سلف کی روش تھی وہ یہ کہ جنازے کو لے جاتے ہوئے مکمل سکوت اختیار کیا جائے، کسی قسم کی آواز بلند نہ کی جائے، نہ تلاوت کرنے کے ساتھ اور نہ ذکر وغیرہ کے ساتھ بلکہ خاموشی کے ساتھ اس صورتحال کے بارے تأمل کیا جائے اور عبرت پکڑی جائے اور یہی اس حال میں مطلوب ہے اور یہی حق ہے، تم مخالفوں کی کثرت سے دھوکہ نہ کھانا، جہاں تک یہ رواج ہے کہ قاریوں سے قراءت (اور نعت خوانوں سے نعتیں) پڑھاتے ہیں تو یہ بالاجماع حرام ہے (مفتیِ مصر) الشیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے جنازوں میں بلند آواز سے ذکر اذکار کرنے کے بارے میں ایک فتویٰ نشر کیا تھا، جس میں لکھا کہ بآوازِ بلند ذکر اذکار کرنا، فتح الباری میں مکروہ قرار دیا ہے، اگر کوئی ذکر کرنا چاہے تو اپنے دل میں کرے، بلند آواز سے ذکر ایک محدَث امر ہے جو عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین اور عہدِ تبع تابعین میں موجود نہ تھا، لہٰذا اس سے منع کرنا لازم ہے۔

② جنازہ کے ہمراہ آگ لے جانا

کیونکہ یہ جاہلیت کے افعال میں سے ہے، امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہر صاحبِ علم نے جس سے دین کا حفظ ونقل ہوا اسے مکروہ قرار دیا ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا عبادہ بن صامت، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، سیدہ عائشہ اور اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم نے بطورِ خاص وصیت کی تھی کہ ان کے جنازوں کے ہمراہ آگ نہ لے جائی جائے، ابن ماجہ نے نقل کیا کہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ ان کے جنازہ کے ہمراہ کوئی انگیٹھی نہ لے جائی جائے، لوگوں نے کہا: کیا اس بابت کوئی حدیث سنی؟ کہا ہاں! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سنا۔[1] (اسی پر قیاس کرتے ہوئے جنازہ کے ہمراہ پھلوں اور سبزیوں وغیرہ کے تھال لے جانا بھی مکروہ ہے) اگر تدفین رات کے وقت ہو رہی تھی تو روشنی کے لیے شمعیں وغیرہ لے جانے میں حرج نہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت قبر میں داخل ہوئے تو آپ کے لیے چراغ جلایا گیا۔[2] بقول ترمذی یہ حدیث حسن ہے۔

③ جنازہ زمین پر رکھے جانے سے قبل ہمراہیوں کا بیٹھ جانا

امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جو جنازہ کے ہمراہ چلے وہ اس کے کندھوں سے اترنے تک مت بیٹھے، اگر کوئی بیٹھ جائے تو اسے کھڑا ہونے کا حکم دیا جائے، پھر سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور جو اس کے ہمراہ جائے وہ رکھے جانے سے قبل مت بیٹھے۔''[3] سعید مقبری عن ابیہ سے نقل کیا کہ ہم ایک جنازہ میں تھے تو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مروان کا ہاتھ پکڑا اور جنازہ رکھے جانے سے قبل بیٹھ گئے تو سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ

---

[1] حسن، سنن ابن ماجہ: ١٤٨٧. [2] ضعیف، سنن ترمذی: ١٠٥٧. [3] صحیح البخاری: ١٣١٠؛ صحیح مسلم: ٩٥٩.

آئے اور مروان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اٹھ جاؤ، اللہ کی قسم! یہ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: انہوں نے ٹھیک کہا، اسے حاکم نے تخریج کیا اور مزید یہ بھی کہ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروان کہنے لگے: مجھے کیوں اٹھا دیا تو یہ حدیث ذکر کی وہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف مڑے اور کہا: آپ کو کس امر نے روکا کہ مجھے اس حدیث کی خبر دیں؟ وہ بولے: آپ آج کے امام تھے اور بیٹھ گئے تو میں بھی بیٹھ گیا۔[1] تو یہ اکثر صحابہ، تابعین، احناف، حنابلہ، اوزاعی اور اسحاق رحمہ اللہ کا مذہب ہے، شافعیہ کہتے ہیں کہ اس سے قبل بیٹھ جانا مکروہ نہیں، اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر جناز آنے سے پہلے ہی جنازگاہ پہنچ گیا ہے، تب بیٹھ جانے میں حرج نہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے صحابہ اور بعض دیگر اہلِ علم سے منقول ہے کہ وہ جنازوں سے پہلے پہنچ کر بیٹھ جاتے تھے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے تو اس حال میں اگر جنازہ آئے، تو کھڑا ہونے کی ضرورت نہیں (یعنی صفیں بنانے سے قبل) امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر کھڑا ہو بھی جائے تو میں اسے عیب کی بات نہیں سمجھتا اور اگر بیٹھا رہے تب بھی حرج نہیں۔

④ جنازہ گزرتے وقت کھڑے ہو جانا

احمد نے واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ سے نقل کیا کہ میں بنی سلمہ کے محلہ میں ایک جنازہ کو میں حاضر ہوا اور کھڑا رہا تو نافع بن جبیر نے مجھے کہا: بیٹھ جاؤ! میں اس کے بارے میں تمہیں ایک ثقہ خبر سناتا ہوں، مجھے مسعود بن حاکم زرقی نے بیان کیا کہ انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں جنازوں میں کھڑے رہنے کا حکم دیا، پھر بعد ازاں آپ بیٹھ جانے لگے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔[2] اسے مسلم نے ان الفاظ سے نقل کیا کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو کھڑے دیکھا تو ہم بھی کھڑے ہوئے، پھر آپ بیٹھ جانے لگے تو ہم بھی بیٹھے،[3] بقول ترمذی حدیثِ علی رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اس کی سند میں چار تابعی ہیں جو ایک دوسرے سے اس کے راوی ہیں، بعض اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، بقول شافعی یہ اس باب کی اصح حدیث ہے اور یہ سابق الذکر حدیث کی ناسخ ہے جس میں تھا کہ جب جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ، امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: چاہے تو کھڑا ہو جائے، اس امر سے احتجاج کیا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ کھڑے ہوتے تھے، پھر بیٹھ جاتے رہے، یہی امام اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: مالکیہ کے ابن حبیب اور ابن ماجشون نے بھی ان کی موافقت کی، بقول امام نووی رحمہ اللہ مختار یہ ہے کہ کھڑے ہو جانا مستحب ہے، یہی متولی اور صاحب المذہب نے کہا، امام ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کھڑے ہو جانا مستحب ہے، اگرچہ کافر کا جنازہ ہو حتی کہ وہ رکھ دیا جائے یا آگے گزر جائے، اگر کھڑا نہ ہو تو بھی کوئی حرج نہیں، استحباب کے قائلین نے جماعت کی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما عن عامر بن ربیعہ عن النبی ﷺ کی روایت سے احتجاج کیا کہ آپ نے فرمایا: "جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ، حتی کہ آگے گزر جائے یا زمین پر رکھ دیا جائے۔"[4] احمد ذکر کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کھڑے

---

① صحیح، المستدرك للحاكم: ١/ ٣٥٦، ٣٥٧. ② صحيح، سنن أبي داود: ٣١٧٥؛ سنن ابن ماجه: ١٥٤٤.
③ صحيح مسلم: ٩٦٢. ④ صحيح البخاري: ١٣٠٧؛ صحيح مسلم: ٩٥٨.

رہتے، حتی کہ جنازہ آگے چلا جاتا۔[1] بخاری اور مسلم نے سیدنا سہل بن حنیف اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے بارے نقل کیا کہ وہ قادسیہ میں بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ گزرا جس پر دونوں کھڑے ہو گئے، کہا گیا: یہ تو ذمی تھا، کہنے لگے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے تو کہا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، فرمایا: ''کیا وہ انسان نہیں؟''[2] بخاری کی ابو لیلیٰ سے روایت میں ہے کہ سیدنا ابن مسعود اور قیس رضی اللہ عنہما جنازہ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، اس میں حکمت جو احمد، ابن حبان اور حاکم کی سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں مذکور ہے کہ ''تم تو اس کے اِعظام کی خاطر کھڑے ہوتے ہو جو روحیں قبض کرتا ہے۔''[3] صحیح ابن حبان میں الفاظ ہیں: «إِعْظَاماً لِلَّهِ تَعَالیٰ اَلَّذِیْ یَقْبِضُ الْأَرْوَاحَ»

خلاصۃ القول

خلاصہ یہ ہے کہ علماء اس مسئلہ میں باہم مختلف ہیں، بعض جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کی کراہت کے قائل ہیں، جبکہ بعض نے اسے مستحب قرار دیا، جبکہ بعض کے مطابق اختیار ہے، ہر ایک کے پاس حجت و دلیل ہے، لہٰذا ہم معاملہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ جس رائے اور دلیل پر ان کا دل مطمئن ہے اس پر عمل کر لیں۔

⑤ خواتین کا جنازہ کے ہمراہ جانا

سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ہمیں جنازوں کے ہمراہ چلنے سے منع کیا گیا، البتہ اس پر سختی نہیں کی۔[4] (بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ دیگر مناہی کی طرح تاکید نہیں کی گویا یہ مکروہِ غیر تحریمی ہے، بقول قرطبی رحمہ اللہ بظاہر یہ نہی تنزیہی ہے، یہی جمہور اہلِ علم کا قول ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ جواز کی طرف مائل ہیں اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے، جواز پر دال جو ابن ابی شیبہ نے محمد بن عمرو بن عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت ساتھ چلتی دیکھی تو بآوازِ بلند اسے منع کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھوڑو اے عمر!''[5] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ (ایک جنازہ میں) چل رہے تھے کہ آپ نے ایک عورت دیکھی، ہمارا خیال ہوا کہ آپ پہچان نہیں پائے، جب ہم راستہ کی طرف ہوئے تو آپ ٹھہر گئے، حتی کہ وہ خاتون آپ تک پہنچی تو وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں، فرمایا: ''اے فاطمہ کیوں آئی؟'' کہنے لگیں: میں اس میت کے گھر والوں کے پاس تعزیت کے لیے گئی تھی، فرمایا: ''شاید ان کے ہمراہ قبروں تک بھی گئی ہو؟'' کہا: معاذ اللہ! کہ میں ان کے ہمراہ وہاں تک جاتی بعد اس کے کہ اس ضمن میں جو آپ سے سنا، پھر آپ نے فرمایا: ''اگر چلی جاتی تو تب تک جنت نہ دیکھتی حتی کہ تمہارے والد کا دادا

---

① صحیح، مسند أحمد: ١٥٦٧٤، شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے شیخین کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔ ② صحیح البخاري: ١٣١٢؛ صحیح مسلم: ٩٦١. ③ صحیح لغیرہ، صحیح ابن حبان: ٣٠٥٨؛ المستدرك للحاکم: ١/ ٣٥٧. ④ صحیح البخاري: ١٢٧٨؛ صحیح مسلم: ٩٣٨. ⑤ ضعیف، سنن ابن ماجه: ١٥٨٧؛ مسند أحمد: ٩٧٣١.

جنت دیکھتا۔''[1] اسے احمد حاکم، نسائی اور بیہقی نے تخریج کیا، علماء نے اس حدیث کو غیر صحیح قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں ربیعہ بن سیف ہے جو ضعیف الحدیث ہے، ان کے پاس مناکیر تھیں، ابن ماجہ اور حاکم نے محمد بن حنفیہ عن علی سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نکلے، دیکھا کہ خواتین بیٹھی ہوئی ہیں تو آپ نے پوچھا: ''کیوں بیٹھی ہو؟'' عرض کی: ہم جنازہ کی منتظر ہیں، فرمایا: ''کیا اسے غسل دو گی؟'' کہا: نہیں! فرمایا: ''کیا اسے اٹھاؤ گی۔'' کہا: نہیں! فرمایا: ''کیا اسے دیگر کے ہمراہ قبر میں اتارو گی؟'' کہا: نہیں! فرمایا: ''تب تو گناہ لے کر اور بغیر اجر وثواب کے واپس آؤ گی۔''[2] اس کی سند میں دینار بن عمر ہے، بقول ابو حاتم رحمہ اللہ یہ مشہور نہیں، ازدی نے انہیں متروک قرار دیا، خلیلی ارشاد میں لکھتے ہیں: یہ کذاب ہے۔ سیدنا ابن مسعود، ابن عمر، ابو امامہ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم، مسروق، حسن، نخعی، اوزاعی، اسحاق رحمہم اللہ، حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا یہی مذہب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بوڑھی عورتوں کا جنازہ میں نکلنا مکروہ نہیں اور نہ اس جوان عورت کا جسے (میت کی موت سے) بڑا رنج ہوا (یعنی اس کی بیوی یا بہن وغیرہ) بشرطیکہ پردہ میں ہو اور اس کا نکلنا کسی فتنہ کا سبب نہ بنے، امام ابن حزم رحمہ اللہ کی رائے میں جس کے ساتھ جمہور نے استدلال کیا وہ غیر صحیح ہے اور عورتوں کے لیے جنازوں کے ساتھ جانا صحیح ہے، کہتے ہیں: ہم اسے مکروہ نہیں کہہ سکتے اور نہ انہیں منع کرنے کے مجاز ہیں، نہی میں کئی روایات ہیں مگر کوئی بھی صحیح الاسناد نہیں کیونکہ یا تو وہ مرسل ہیں یا سند میں مجہول یا ضعیف راوی ہے، پھر سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی سابقہ حدیث کا ذکر کیا اور کہا: اگر یہ سنداً صحیح ہے، تب بھی اس میں منع کی حجت نہیں، زیادہ سے زیادہ کراہت ہے بلکہ کبھی اس کا برخلاف صحیح ہوگا، جیسا کہ ہم نے شعبہ عن وکیع عن ہشام بن عروہ اسی طرح وہب بن کیسان عن محمد بن عمرو بن عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ ایک جنازہ میں تھے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نظر ایک عورت پر پڑی تو وہ چیخے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو اے عمر! کیونکہ آنکھ رو رہی ہے اور دل مصیبت زدہ ہے اور غم تازہ ہے۔''[3] کہتے ہیں: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بصحت منقول ہے کہ اسے مکروہ نہ سمجھتے تھے۔

کسی منکر امر (یعنی بدعت) کی وجہ سے جنازہ چھوڑ دینا

مؤلف المغنی لکھتے ہیں: اگر جنازے کے ساتھ کوئی نظر آنے والا یا سُنا جانے والا غلط کام ہو تو اگر اس کے ازالہ کی قدرت رکھتا ہے تو کرے اور اگر نہیں رکھتا تو اس میں دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ اس کا (زبانی) انکار کرتے ہوئے ہمراہ چلتا رہے، اس انکار کے ساتھ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا اور باطل کے لیے ترکِ حق نہ کرے، دوسری یہ کہ واپس لوٹ آئے، کیونکہ نظر آنے والے یا سُنے جانے والے غلط کام کو قدرت کے باوجود نہ روکنا اس پر رضا مندی کو ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٣١٢٣؛ مسند أحمد: ٢/ ١٦٩. [2] ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٥٧٨. [3] ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٥٨٧؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٣٨١.

تدفین

① تدفین کا حکم

اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ میت کی تدفین فرضِ کفایہ ہے، قرآن میں ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ○ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴾(والمرسلات: ٢٥-٢٦)

''کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا زندوں کو اور مردوں کو!''

② رات کو دفن کرنا

جمہور علماء کی رائے میں رات کو تدفین دن کے وقت تدفین ایک برابر ہے، نبی کریم ﷺ نے اس صحابی کی تدفین رات میں کی تھی جو ذکر بالجہر کرتا رہتا تھا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تدفین بھی رات میں کی اسی طرح سیدنا ابوبکر، عثمان، عائشہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی تدفین بھی رات کو عمل میں آئی، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کے وقت ایک صحابی کی تدفین کے لیے خود قبر میں داخل ہوئے چراغ کی روشنی میں، مرحوم کو قبلہ کی جانب سے تھاما اور کہا: ''اللہ تجھ پر رحم کرے، تم اواہ (یعنی اللہ کے لیے آہ وبکا کرنے والے) اور کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے'' ان کی نمازِ جنازہ میں چار تکبیریں کہیں۔[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن ہے، کہتے ہیں: اکثر اہلِ علم کے ہاں رات میں تدفین کی اجازت ہے، اس کا جواز تب ہوگا اگر رات کو تدفین کی صورت میں میت کے تمام حقوق کا خیال رکھنا ممکن ہو، بصورتِ دیگر شارع علیہ السلام نے اس سے نہی کی اور اسے مکروہ کہا ہے۔ مسلم نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن خطبہ دیا تو اپنے صحابہ میں سے ایک آدمی کا ذکر کیا جو فوت ہوا اور اسے سادہ سا کفن پہنایا گیا اور رات کو دفن کیا گیا تو آپ نے رات کو دفن کرنے سے منع کیا اِلاّ یہ کہ مجبوری ہو۔ ابن ماجہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے مُردوں کو رات کو دفن نہ کرو اِلاّ یہ کہ مجبوری ہو۔''[2]

③ سورج کے طلوع ہونے، وسط آسمان میں ہونے اور غروب ہونے کے وقت تدفین

علماء متفق ہیں کہ اگر نعش خراب ہونے کا خدشہ ہو تو ان تینوں اوقات میں بلا کراہت تدفین کی جاسکتی ہے، لیکن اگر ایسا کوئی خدشہ نہیں تب بھی جمہور کے نزدیک ان میں تدفین جائز ہے بشرطیکہ بطورِ خاص ان اوقات کا تعمّد نہ کیا ہو، تب یہ مکروہ ہوگا، کیونکہ احمد، مسلم اور اصحابِ سنن نے سیدنا عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نماز پڑھنے اور میت قبر میں اتارنے سے منع فرماتے تھے: جب سورج طلوع ہو رہا ہو حتی کہ ذرا بلند ہو جائے، جب دوپہر کے

---

① ضعیف، سنن ترمذی: ١٠٥٧. ② صحیح مسلم: ٩٤٣؛ سنن ابن ماجہ: ١٥٢١.

وقت سورج عین سر پر ہو حتی کہ ڈھل جائے اور جب غروب کے لیے جھک رہا ہو حتی کہ غروب ہو جائے۔“[1] حنابلہ قائل ہیں کہ ان تین اوقات میں تدفین مطلقاً ہی مکروہ ہے۔

④ قبر گہری کھودنے کا استحباب

دفن کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میت کو ایک گڑھے میں چھپا دیا جائے جو نعش کی بدبو سے حاجب ہو اور پرندے اور درندے اس تک نہ پہنچ سکیں تو جس طور پر بھی یہ مقصد پورا ہو فرض ادا اور واجب پورا ہو جائے گا، البتہ ایک قامت کے برابر قبر گہری ضرور ہو، کیونکہ نسائی جبکہ ترمذی نے صحیح قرار دیا اور سیدنا ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ کہتے ہیں: ہم نے نبی کریم ﷺ سے احد کے روز شکایت کی کہ ہر شہید کے لیے قبر کی کھدائی ہم پر دشوار ہو رہی ہے (کیونکہ زمین پتھریلی تھی) تو آپ نے فرمایا: ”گہرا گڑھا عمدگی سے کھودو اور ہر گڑھے میں دو دو یا تین تین شہداء کو دفن کرتے رہو۔“ عرض کی: یا رسول اللہ! کسے مقدم کریں؟ فرمایا: ”جس کے پاس قرآن زیادہ مقدار میں تھا۔“ کہتے ہیں: میرے والد مع دو دیگر شہداء کے ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے۔[2] ابن ابی شیبہ اور ابن منذر نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بابت نقل کیا کہ انسانی قد کے برابر اور اس کے پھیلاؤ کے مطابق قبر کھودا کرو، امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کم از کم نصف قامت کے برابر ہو، زیادہ ہو تو اور اچھا ہے۔

⑤ لحد کی شق پر فضیلت

لحد سے مراد ایک گڑھا کھود کر اس کے اندر قبلہ کی جانب مزید گہرا ایک اور جانبی گڑھا کھودنا جو چھت والا ہو گا (اور اس کے روشندان نما خانے کو سلوں وغیرہ کے ساتھ بند کیا جائے گا) جبکہ شق ایک ہی گڑھا ہوتا ہے، جس کی چاروں جانب اینٹوں کی (یعنی زمین کے اندر ہی) دیوار بنا دی جاتی ہے اور اس میں میت رکھ کر کسی چیز (پتھر کی سلیں وغیرہ) کے ساتھ چھت بنا کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی ہے، دونوں جائز ہیں، البتہ لحد اولیٰ ہے، کیونکہ احمد اور ابن ماجہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی تو کوئی لحد اور کوئی شق بنانے کو کہہ رہا تھا، صحابہ نے باہم کہا: ہم اللہ سے استخارہ کریں گے اور دونوں کی طرف بلاوا بھیجیں گے تو جو پہلے آ گیا اسے ہی اختیار کر لیں گے تو دونوں کی طرف بلاوا بھیجا تو اتفاق سے لحد بنانے والا پہلے آ گیا، اس پر آپ کے لیے لحد تیار کی گئی،[3] تو یہ دونوں کے جواز پر دلیل ہے البتہ لحد کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور اصحاب سنن نے ترمذی نے حسن قرار دیا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لحد ہمارے لیے اور شق ہمارے غیر کے لیے ہے۔“[4]

---

① صحيح مسلم: ٩٣١؛ سنن أبي داود: ٣١٩٢. ② صحيح، سنن ترمذي: ١٠٣٦؛ سنن نسائي: ٤/٨٠، ٨١.
③ صحيح، سنن ابن ماجه: ١٥٥٧؛ مسند أحمد: ١/ ٨. ④ صحيح، سنن أبي داود: ٣٢٠٨؛ سنن ترمذي: ١٠٤٥.

⑥ میت کو قبر میں داخل کرنے کی صفت

سنت یہ ہے کہ نعش کو اس کے قدموں کی جانب سے قبر میں اتارا جائے، اگر ایسا کرنا آسان ہو، کیونکہ ابوداود، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے ایک میت کو اس کے قدموں کی جانب سے قبر میں اتارا اور کہا: یہ سنت ہے۔[1] اگر ایسا کرنا سہل و میسر نہ ہو تو کسی بھی طرح جائز ہے، بقول امام ابن حزم رحمہ اللہ میت کو کسی بھی طور پر قبر میں اتارا جائے، قبلہ کی جانب سے یا دیگر جہت سے، رہا یہ سوال کہ سر کی جانب سے یا قدموں کی؟ تو دونوں جائز ہیں، اس ضمن میں کوئی نص منقول نہیں۔

⑦ میت کو قبر میں قبلہ کے رخ کرنے، اس کے لیے دعا کرنے اور کفن کی گرہیں کھول دینے کا استحباب

سنت یہ ہے کہ میت قبر میں دائیں پہلو کے بل رکھی جائے اور اس کا چہرہ قبلہ رو ہو اور رکھنے والا کہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ یا ﴿وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ اور کفن کی گرہیں کھول دے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب میت قبر میں رکھی جاتی تو کہا کرتے تھے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰه﴾ یا ﴿وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾[2] اسے احمد، ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، نسائی نے اسے مسنداً اور موقوفاً دونوں طرح تخریج کیا۔

⑧ قبر میں کپڑا بچھانے یا تکیہ رکھنے کی کراہت

جمہور نے مکروہ قرار دیا کہ قبر کے اندر چادر یا تکیہ وغیرہ رکھا جائے، امام ابن حزم رحمہ اللہ کے نزدیک میت کے نیچے کپڑا بچھا دینے میں حرج نہیں (مگر اس کا کیا فائدہ؟) مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں ایک سرخ چادر بچھائی گئی تھی۔[3]

کہتے ہیں: اللہ نے اپنے معصوم رسول کی قبر میں یہ کام ہونے دیا اور ان کے ہاتھوں جو اپنے وقت کے سب اہلِ زمین کے بہترین لوگ تھے اور کسی نے اس کا انکار نہ کیا، علماء نے پسند کیا ہے کہ میت کے سر تلے کوئی اینٹ، پتھر یا مٹی کی ڈھیری کر دی جائے اور دایاں رخسار اس اینٹ وغیرہ کی طرف جاتا ہو بعد اس کے کہ کفن کھول دیا جائے اور وہ مٹی پر رکھ دیا جائے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: جب مجھے قبر میں اتارو تو میرا رخسار مٹی کے ساتھ لگا دینا، سیدنا ضحاک رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ ان سے کفن کی گرہیں کھول دی جائیں اور کفن سے ان کا رخسار ننگا کر دیا جائے، مستحب سمجھا گیا ہے کہ اس کے پیچھے (یعنی دائیں کروٹ دینے کے بعد) سہارا دینے کے لیے اینٹ یا مٹی رکھی جائے، گدی کے بل نہ لٹایا جائے، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ نے مستحب قرار دیا کہ عورت کی میت قبر میں اتارتے وقت پردے کی غرض سے اس پر چادر تانی جائے، شوافع نے یہی مرد کے لیے بھی مستحب کہا۔

---

① صحيح، سنن أبی داود: ٣٢١١. ② صحيح، سنن أبی داود: ٣٢١٣. ③ صحيح مسلم: ٩٦٧.

⑨ حاضر ہونے والے ہر شخص کے لیے (کم از کم) تین چلو مٹی قبر پر ڈالنے کا استحباب

یہ میت کے سر کی جانب سے ہو، چنانچہ ابن ماجہ نے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک نمازِ جنازہ پڑھائی، پھر قبر پر آ کر اس کے سر کی جانب سے تین چلو مٹی کے ڈالے۔[1] آئمہ ثلاثہ نے مستحب قرار دیا کہ پہلا چلو ڈالتے وقت کہے: ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ ''اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا'' اور دوسرا ڈالتے ہوئے کہے: ﴿ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ﴾ ''اسی میں تمہیں لوٹا دیں گے۔'' اور جب تیسرا ڈالے تو پڑھے: ﴿ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾ (طٰہٰ: ۵۵) ''اسی سے پھر تمہیں اٹھائیں گے۔'' کیونکہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی نعش قبر میں اتارے جانے کے موقع پر یہ آیت اس طریقہ سے پڑھی تھی،[2] امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: مٹی ڈالتے وقت کوئی چیز اور کچھ پڑھنا مطلوب نہیں کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

⑩ دفن سے فراغت کے بعد قبر پر دعا کرنے کا استحباب

یہ مستحب ہے، بالخصوص منکر نکیر کے سوالوں کے وقت اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کیونکہ یہ وہ وقت ہے جب منکر نکیر آ کر سوال کرتے ہیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ میت کی تدفین سے فراغت کے بعد ادھر ہی ٹھہرتے اور فرماتے: ''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس کا یہ مرحلہ شروع ہے۔''[3] اسے ابوداود اور حاکم نے صحیح قرار دے کر نقل کیا، بزار نے بھی کہ یہ نبی کریم ﷺ سے اسی سند کے ساتھ ہی مروی ہے، رزین نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ جب وہ تدفین سے فارغ ہوتے تو کہتے: ''اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ نَزَلَ بِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ مَنْزُوْلٍ بِهٖ فَاغْفِرْ لَهٗ وَ وَسِّعْ مُدْخَلَهٗ'' اے اللہ! یہ تیرا بندہ تیرے ہاں پہنچ چکا ہے اور تو بہترین مہمان نواز ہے پس اسے معاف کر اور اسے کھلا ٹھکانہ دے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مستحب سمجھا کہ قبر پر دفن کے بعد سورۃ البقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات کی قراءت کی جائے۔[4] اسے بیہقی نے حسن سند سے نقل کیا۔

⑪ میت کو تلقین

بعض اہلِ علم اور امام شافعی رحمہ اللہ نے مستحب قرار دیا کہ دفن کے بعد میت کو تلقین کی جائے (یعنی منکر نکیر کے سوالوں کے جواب قبر پر کھڑے ہو کر کہے جائیں) کیونکہ سعید بن منصور نے راشد بن سعد، ضمرہ بن حبیب اور حکیم بن عمیر (یہ تینوں تابعین) سے نقل کیا کہ جب قبر پر مٹی ڈال دی جائے اور لوگ واپس چلے جائیں تو (سلف) پسند کرتے تھے کہ میت کو مخاطب کر کے کہا جائے: اے فلاں کہو: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' تین مرتبہ اور اے فلاں! کہو: ''رَبِّيَ اللّٰهُ وَدِيْنِيَ الْإِسْلَامُ وَنَبِيِّيْ مُحَمَّدٌ ﷺ'' پھر واپس چل دے، اس اثر کو ابن حجر نے تلخیص میں ذکر کیا اور سکوت کیا،[5]

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ١٥٦٥. [2] ضعيف جدًا، مسند أحمد: ٢٢١٨٧. [3] صحيح، سنن أبي داود: ٣٢٢١؛ المستدرك للحاكم: ٣٧٠. [4] ضعيف، السنن الكبرى للبيهقي: ٧٠٦٨. [5] التلخيص الحبير: ٢/ ١٣٦.

طبرانی نے سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ''جب تمہارے اخوان میں سے کوئی فوت ہوجائے اور قبر پر مٹی ڈال دو تو تمہارا کوئی اس کے سر کے پاس کھڑا ہو اور کہے: اے فلاں بن فلاں، وہ اب سن رہا ہے، البتہ جواب نہیں دے سکتا، پھر اسے مخاطب کرے کہ اب وہ بیٹھ رہا ہے، پھر اسے مخاطب کرے کیونکہ وہ کہتا ہے: اللہ تم پر رحم کرے! میری رہنمائی کرو، البتہ تمہیں اس کی بات کا شعور نہیں، کہو: یاد کرو وہ حالت جس پہ تم دنیا سے نکلے ہو! تم گواہی دیتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، تم اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبی ہونے پر راضی تھے اور قرآن کو دستورِ حیات ماننے پر، فرمایا: تو یہ سن کر منکر اور نکیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں: چلو چلیں: ''مَا يُقْعِدُنَا عِنْدَ مَنْ لُقِّنَ حُجَّتَهُ'' اسے جواب سجھائے جا رہے ہیں، اب ہمارا یہاں کیا کام؟'' کہتے ہیں: ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! اگر یہ تلقین کرنے والا اس کی والدہ کے نام سے ناواقف ہو؟ فرمایا: ''تب اماں حواء کی نسبت سے مخاطب کرے۔''[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص میں لکھتے ہیں: اس کی سند ٹھیک ہے، الضیاء نے احکام میں اسے قوی لکھا ہے، اس کی سند میں عاصم بن عبداللہ ہے جو ضعیف ہے، ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے نقل کر کے لکھا: اس کی سند میں کئی راوی ہیں جنہیں میں نہیں پہچانتا، امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے، لیکن اس کے ساتھ مستأنس ہوا جائے (یعنی عمل کرلیا جائے کیونکہ عمومی طور پر اس کا حکم وارد ہے) علمائے محدثین متفق ہیں کہ فضائل اور ترغیب وترہیب کے بارے مذکور روایات کے ضمن میں مساحمت سے کام لیا جائے، پھر یہ کئی شواہد کے ساتھ متقوی ہے، جیسے یہ حدیث: «وَاسْأَلُوْا لَهُ التَّثْبِيْتَ» ''مرحوم کے لیے ثابت رہنے کی دعا کرو۔'' اور سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی وصیت اور یہ دونوں صحیح ہیں، اہلِ شام کا صحابہ کے زمانہ سے اب تک اس پر عمل ہے، مالکیہ سے مشہور یہ ہے۔ اسی طرح بعض حنابلہ سے۔ کہ تلقینِ مذکور مکروہ ہے، امام اثرم رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے احمد سے کہا: تدفین کے بعد جو ایک شخص ادھر کھڑا ہو جاتا اور فلاں بن فلاں کہہ کر تلقین کرتا ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کہا: سوائے اہلِ شام کے کسی کو یہ کرتے نہیں دیکھا، یہ تب جب ابوالمغیرہ فوت ہوئے، اس ضمن میں ابوبکر بن ابی مریم کی ان کے اشیاخ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ یہ کیا کرتے تھے اور اسماعیل بن عیاش اس کے راوی ہیں، ان کا اشارہ مذکورہ بالا حدیثِ ابی امامہ رضی اللہ عنہ کی طرف ہے۔

قبر بنانے کا مسنون طریقہ

سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے ایک بالشت بھر ہی اونچی ہو، بس اتنی کہ پتہ چلے کہ قبر ہے، اس سے زیادہ اونچی کرنا حرام ہے، کیونکہ مسلم وغیرہ نے ہارون سے نقل کیا کہ ثمامہ بن شُفَیّ نے انہیں بیان کیا کہ ہم سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ارضِ روم کے علاقہ بردس میں تھے کہ ہمارا ایک ساتھی فوت ہوگیا تو سیدنا فضالہ رضی اللہ عنہ نے اس کی قبر کے تسویہ کا حکم دیا، پھر کہا: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ قبروں کے تسویہ (یعنی زمین کے برابر کردینے) کا حکم دیتے تھے۔[2] ابوہیاج اسدی سے مروی ہے کہ مجھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیجوں جس کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ کہ کسی مورتی کو

---

[1] مجمع الزوائد: ٢/ ٣٢٤. [2] صحيح مسلم: ٩٦٨؛ سنن أبي داود: ٣٢١٩.

نہ چھوڑو مگر اسے مٹا ڈالو اور کسی اونچی قبر کو نہ چھوڑو مگر اسے برابر کر ڈالو۔[1] بقول امام ترمذی رحمہ اللہ بعض اہل علم کے ہاں اسی پر عمل ہے، وہ مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر زمین سے زیادہ بلند ہو، بس اتنی ہو کہ پتہ چل سکے کہ قبر ہے، تاکہ لوگ احتیاط کریں اور امراء سنتِ صحیحہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے زیادہ اونچی قبور کو منہدم کر دیا کرتے تھے، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں پسند کرتا ہوں کہ قبر پر بس اتنی مٹی ڈالی جائے جو اس سے نکلے اور پسند کرتا ہوں کہ زمین سے بالشت بھر ہی اونچی رکھی جائے اور پسند ہے کہ نہ اس پر کوئی عمارت (یعنی گنبد وغیرہ) بنایا جائے اور نہ مجصّص (یعنی چونا گچ) کیا جائے کہ یہ زینت بن جائے گی اور متکبروں سے مشابہت ہوگی اور مرنے کے بعد اس کی کوئی گنجائش نہیں، میں نے مہاجرین وانصار میں سے کسی کی قبر مجصص نہیں دیکھی اور امراء کو دیکھا کہ قبور پر بنی عمارات منہدم کر دیتے تھے اور فقہاء اس پر معترض نہ ہوتے تھے، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بظاہر ماذون بہ مقدار سے زیادہ اونچی قبر بنانا حرام ہے، اصحابِ احمد، امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب کی ایک جماعت اور امام مالک رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے، یہ کہنا کہ ایسا کرنا غیر محظور ہے کیونکہ کئی سلف اور خلف سے بلانکیر اس کا وقوع ہوا جیسا کہ امام یحییٰ اور مہدی نے الغیث میں لکھا، صحیح نہیں، کیونکہ اس ضمن میں غایت یہ ہے کہ وہ اس سے ساکت رہے ہیں اور سکوت دلیل نہیں ہوتا جب وہ ظنی امور میں ہو، اونچی قبور بنانے کی تحریم ظنی ہے تو اس حدیث کے تحت وہ مقبرے آتے ہیں جن پر گنبد نما عمارتیں بنائی گئیں، پھر یہ قبور کو مساجد بنا لینے کے مترادف ہے (کہ لوگ یہاں مسجدوں کی مثل جمع ہوتے ہیں) اور نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے، قبریں پکی بنانے اور ان پر گنبد تعمیر کرنے سے کتنے ہی مفاسد پیدا ہوئے جن کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ مثلاً: ان میں جاہلوں کا وہی اعتقاد جو کفار کو بتوں میں تھا (کہ یہ کرنی والے ہیں) ایسی تعظیم کی اور خیال کر لیا کہ یہ نفع دینے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہیں تو اپنی حاجات پوری کرنے کی طلب اور اپنے مطالب کے کامیابی پانے کے لیے ان کا قصد کرنے لگے اور ان سے اسی نہج پر مانگنے لگے جو (مواحد) لوگ اللہ سے مانگتے ہیں، سفر کر کے ان تک پہنچتے ہیں اور ان پر ہاتھ پھیرتے اور چھوتے ہیں (اور چادریں چڑھاتے اور عرقِ گلاب سے غسل دیتے ہیں) اور ان سے مدد کے طالب بنتے ہیں، بالجملہ وہ سب کام کرتے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں مشرکینِ عرب کیا کرتے تھے۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" پھر زیادہ افسوس کی بات ہے کہ اس شنیع منکر اور فظیع کفر کے باوجود کوئی نہ پاؤ گے جو اللہ اور دین حنیف کی خاطر غیرت وغضب میں آئے، نہ کوئی عالم، نہ متعلم، نہ امیر، نہ وزیر اور نہ بادشاہ (یہ انہوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے کہا، بحمد اللہ اب ایسے علمائے حق موجود ہیں جو اس کے خلاف شمشیرِ براں بنے ہیں اور بادشاہوں میں سے سلطان ابن سعود اور سلطان عبدالعزیز رحمہ اللہ جنہوں نے سرزمینِ نجد وحجاز کو بزورِ طاقت ان خرافات سے پاک کیا) لکھتے ہیں: بے شمار واقعات ایسے ہوئے اور ہم تک پہنچے ہیں کہ ان قبوریوں میں سے کثیر بلکہ اکثر نے جب ان سے اللہ کے نام کی قسم اٹھوائی گئی تو اسے توڑنے اور اس کے برخلاف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی لیکن جب فریقِ ثانی نے کہا: اپنے پیر کے نام کی قسم کھاؤ تب وہ جھجکا، رکا اور ایسا کرنے سے باز ہوا تو اس

---

[1] صحيح مسلم: ٩٦٩؛ سنن أبي داود: ٣٢١٨.

سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عہدِ حاضر کے ان قبوریوں کا شرک ان لوگوں کے شرک سے بھی بڑھ گیا ہے جو اللہ کو دو میں سے ایک یا تین میں سے ایک الہ مانتے ہیں (یعنی عقیدۂ تثلیث) تو اے علمائے دین! اے بادشاہانِ اسلام! اسلام پر اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی کہ غیر اللہ سے وہی اعتقاد ہو جو اللہ سے ہونا چاہئے اور اس سے بڑا منکر امر اور کیا ہوگا جس کا انکار ورد تمہاری ذمہ داری ہے:

لَقَدْ أَسْمَعْتَ لَوْ نَادَيْتَ حَيّاً وَلٰكِنْ لَا حَيَاةَ لِمَنْ تُنَادِيْ

وَلَوْ نَاراً نَفَخْتَ بِهَا أَضَاءَ تْ وَلٰكِنْ أَنْتَ تَنْفُخُ فِيْ رَمَادِ

یعنی تمہاری یہ آواز صدا بصحرا ہے، تم مردہ لوگوں کو صدا دے رہے ہو، کاش! زندوں کو دیتے جبکہ تم راکھ میں پھونکیں مار رہے ہو۔

علماء نے قبرستان میں بنی مساجد اور گنبدوں کے گرا دینے کا فتویٰ دیا ہے، ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الزواجر'' میں لکھا: قبرستانوں میں بنی مساجد اور گنبدوں کے گرانے کی طرف مبادرت ضروری ہے، کیونکہ یہ مسجدِ ضرار سے بڑھ کر ضرر رساں ہیں، کیونکہ ان کی تاسیس ہی معصیتِ نبوی پر ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ نے اس سے نہی صادر کی تھی اور اونچی قبریں برابر کر دینے کا حکم دیا تھا، اسی طرح قبروں پر روشن قندیلیں اور چراغ ہٹا دینا واجب ہے، ان کا وقف و نذر صحیح نہیں۔

قبر کی تسنیم (یعنی کوہان نما بنانا) اور تسطیح (یعنی ہموار کرنا)

فقہاء قبر کی تسنیم و تسطیح کے جواز پر متفق ہیں، امام طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے پسند نہیں کہ قبروں کے ضمن میں ان دو امور کو نظر انداز کیا جائے: یا تو انہیں بالکل زمین کی سطح کے برابر رکھا جائے یا پھر ایک بالشت بھر ہی زمین سے اونچا رکھا جائے اور اسی پر آج مسلمانوں کا عمل ہے، قبور کا تسویہ (یعنی زمین کے برابر کر دینا) تسطیح نہیں۔ فقہاء کا اس بارے میں باہم اختلاف ہے کہ ان میں سے افضل کیا ہے؟ تو قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اکثر اہلِ علم سے نقل کیا کہ قبور کی تسنیم افضل ہے، کیونکہ سفیان تمار نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی قبر مسنم حالت میں دیکھی ہے،[1] اسے بخاری نے نقل کیا، یہ ابوحنیفہ، مالک، احمد، مزنی رحمہم اللہ اور کثیر شوافع کی رائے ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے میں تسطیح افضل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کے تسویہ کا حکم دیا ہے۔

قبر پر کوئی نشانی رکھنا

جائز ہے کہ بطورِ نشانی قبر پر کوئی پتھر یا لکڑی نصب کر دی جائے جس سے اس کی معرفت ہو، ابن ماجہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر ایک چٹان بطورِ نشانی رکھی،[2] بقول مؤلفِ الزوائد اس کی سند حسن ہے، اسے ابو داود نے سیدنا مطلب بن وداعہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، اس میں ہے کہ وہ ایک چٹان لائے اور اسے قبر کے

---

[1] صحيح البخاري: ١٣٩٠. [2] صحيح، سنن ابن ماجه: ١٥٦١.

سرہانے رکھ دیا اور کہا اس سے مجھے اپنے بھائی کی قبر کی پہچان ہوتی رہے گی، اور میرے اہل میں سے جو فوت ہوا اس کی قبر بھی انہی کے ساتھ بناؤں گا۔[1] اس سے اقارب کی قبریں ساتھ ساتھ بنانے کے استحباب کا ثبوت ملا تا کہ زیارت و دعا کے لیے آنے میں آسانی ہو۔

قبرستان میں جوتے اتار کر جانا

اکثر اہلِ علم کا خیال ہے کہ جوتوں سمیت قبرستان میں چلنے پھرنے میں حرج نہیں، جریر بن حازم کہتے ہیں: میں نے امام حسن اور امام ابن سیرین رحمہ اللہ کو دیکھا کہ جوتے پہنے ہوئے قبور کے درمیان چل رہے ہیں، بخاری، مسلم، ابو داود اور نسائی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا: ''جب میت کی تدفین کر کے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی چاپ سنتی ہے۔''[2] علماء نے اس حدیث سے جوتے پہن کر قبرستان میں داخل ہونے کے جواز پر استدلال کیا، احمد نے سبتی جوتے (یہ جن کی جلد قرظ سلم نامی ایک کانٹے دار درخت کے پتوں سے رنگی ہوئی ہو) پہن کر جانے کو مکروہ کہا، کیونکہ ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سیدنا بشیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جوتے پہنے ہوئے ایک شخص پر پڑی جو قبرستان میں چل رہا تھا، فرمایا: ''اے سبتی جوتے والے! اسے اتار دو۔''[3] بقول خطابی رحمہ اللہ ممکن ہے اس کی وجہ کراہت اس میں موجود تکبر کا شائبہ ہو، کیونکہ یہ مالداروں کے جوتے تھے، لکھتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا کہ قبرستان میں اہلِ خشوع کے لباس اور تواضع کے ساتھ جایا جائے، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کراہت عدم عذر کے وقت ہے، اگر کوئی عذر ہے، مثلاً نجاست یا کانٹوں کا ڈر ہے تب کراہت نہیں۔

قبروں پر چادریں چڑھانے سے ممانعت

یہ حلال نہیں، کیونکہ یہ غرضِ شرعی کے غیر میں مال کا صرف کرنا اور بلا فائدہ فعل ہے، پھر اس میں عوام کی گمراہی کا سامان ہے، بخاری اور مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں نکلے ہوئے تھے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دروازے پر ایک پردہ تان دیا، آپ واپس آئے اور اسے دیکھا تو اسے کھینچ کر اتار دیا اور فرمایا: ''اللہ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ پتھروں اور مٹی کو لباس پہنائیں۔''[4]

قبور پر چراغ رکھنے اور مساجد بنانے کی نہی

اس بارے میں متعدد صریح و صحیح احادیث وارد ہیں:

① بخاری و مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود کو ہلاک کرے، جنھوں نے اپنے

---

① حسن، سنن أبي داود: ٣٢٠٦. ② صحيح البخاري: ١٣٣٨؛ صحيح مسلم: ٢٨٧٠. ③ حسن، سنن أبي داود: ٣٢٣٠. ④ صحيح مسلم: ٢١٠٧؛ سنن أبي داود: ٤١٥٣.

انبیاء کی قبور کو مسجد بنا لیا تھا۔''[1]

④ احمد اور سوائے ابن ماجہ کے اصحابِ سنن نے جبکہ ترمذی نے حسن قرار دے کر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور ان پر مساجد بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت کی۔[2]

③ مسلم میں سیدنا عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے آپ کی وفات سے پانچ دن قبل سنا، آپ فرماتے تھے: ''میں اللہ کے سامنے اظہارِ براءت کرتا ہوں، اس امر سے کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو کہ بے شک اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے، جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بنایا تھا، اگر میں نے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو ابو بکر کو بناتا۔'' پھر فرمایا: ''سابقہ امتیں اپنے انبیاء اور صالحین کی قبور کو مساجد بنا لیتی تھیں، تم ایسا نہ کرنا میں تمہیں اس سے منع کر رہا ہوں۔''[3]

④ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسلم نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو مساجد بنا لیا۔''[4]

⑤ بخاری و مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ سیدہ ام حبیبہ و ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کے سامنے حبشہ کے ایک کنیسہ کا ذکر کیا، جسے انہوں نے دیکھا تھا اور اس میں تصاویر بنی ہوئی تھیں تو آپ نے فرمایا: ''یہ لوگ جب ان کا کوئی مردِ صالح فوت ہوتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں بھی بناتے، یہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہوں گے۔''[5]

مؤلف المغنی لکھتے ہیں: قبروں پر مساجد بنانا جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے: ((لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذَاتَ عَلَيْهِنَّ الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ)) ''اللہ قبور کی طرف بکثرت جانے والیوں اور ادھر نمازیں پڑھنے اور ان پر چراغ جلانے والیوں پر لعنت کرے۔''[6] اسے ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، نسائی کی روایت میں: ''لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' الخ ہے، اگر مباح ہوتا تو آپ اس کے فاعل پر لعنت نہ کرتے، پھر اس میں بلا فائدہ مال کا ضیاع ہے اور قبروں کی تعظیم میں افراط ہے جو بتوں کی تعظیم کے مشابہ ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر کو اس لیے نمایاں نہیں کیا گیا کہ کہیں لوگ اسے مسجد نہ بنا لیں (یعنی اس کے آس پاس نمازیں پڑھنا شروع کریں) اور اس لیے کہ قبروں کی نماز کے ساتھ تخصیص بتوں کی تعظیم اور ان کے تقرب سے مشابہت ہوگی اور ذکر ہوا کہ بت پرستی کی ابتدا قبور کے پاس نمازیں پڑھنے اور ان کو برکت کے لیے چھونے سے ہوئی تھی۔ (بقول محشی ان کا اشارہ بخاری کی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا کہ وَدّ، سواع، یغوث یعوق اور نسر قومِ نوح علیہ السلام کے صالح افراد تھے، جس کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کی تصاویر اور مجسمے بنا لیے، پھر مرورِ ایام سے شیطان کے بہکاوے میں آ کر آنے والی نسلیں انہیں بت سمجھ کر پوجنے اور ہاتھ پھیر کر تقرب حاصل کرنے لگیں اور ان کا وسیلہ پکڑنے لگیں، آج کل بھی کثیر لوگ

---

① صحیح البخاری: ٤٣٧؛ صحیح مسلم: ٥٣٠. ② ضعیف، سنن ابی داد: ٣٢٣٦؛ سنن ترمذی: ٣٢٠.
③ صحیح مسلم: ٥٣٢. ④ صحیح البخاری: ١٣٤١؛ صحیح مسلم: ٥٢٨. ⑤ صحیح البخاری: ١٣٤١؛ صحیح مسلم: ٥٢٨. ⑥ ضعیف، سنن أبی داود: ٣٢٣٦.

یہی بعض قبور کے ساتھ کرتے ہیں)۔

قبر کے پاس ذبح کرنے کی کراہت

شارع علیہ السلام نے قبروں کے پاس جانور ذبح کرنے سے منع کیا ہے، جاہلیت میں ہونے والے اس فعل سے تحذیر اور تفاخر و مباہات سے تنفُّر دلاتے ہوئے، ابوداود نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا عَقْرَ فِي الْإِسْلَامِ» [1] بقول عبدالرزاق اہلِ جاہلیت قبر کے پاس گائے یا بکری عقر (یعنی ذبح) کرتے (گویا چڑھاوا چڑھاتے) تھے، امام خطابی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ جاہلیت کسی سخی کی قبر کے پاس اونٹ قربان کرتے اور کہتے: ہم اس کی سخاوت کی اسے مجازات دیتے (یعنی خراجِ تحسین پیش کرتے) ہیں، کیونکہ وہ زندگی میں از راہِ سخاوت اونٹ ذبح کیا کرتا تھا، جسے مہمان کھاتے تھے تو ہمارا ذبح کردہ یہ اونٹ درندوں اور پرندوں کی ضیافت ہے، تاکہ مرحوم کا درمرنے کے بعد بھی مطعم ہو، جیسے اس کی زندگی میں تھا، ایک شاعر کہتا ہے:

عَقَرْتُ عَلىٰ قَبْرِ النَّجَاشِيِّ نَاقَتِيْ ... بِأَبْيَضَ عَضْبٍ أَخْلَصَتْهُ صَيَاقِلُهْ

عَلىٰ قَبْرِ مَنْ لَوْ أَنَّنِيْ مِتُّ قَبْلَهٗ ... لَهَانَتْ عَلَيْهِ عِنْدَ قَبْرِيْ رَوَاحِلُهْ

میں نے نجاشی کی قبر پر اپنی سفید، تیز رفتار اور چمکدار اونٹنی قربان کر دی اور اگر میری موت اس سے قبل واقع ہوتی تو وہ بھی یہی کرتا۔

ان کے بعض کا اعتقاد تھا کہ ایسا کرنے سے فوت شدہ روزِ قیامت سواری پر اٹھے گا اور جس کی قبر پر یہ نہ کیا وہ پیدل ہوگا، یہ ان لوگوں کے حسبِ عقیدہ جو بعث بعد الموت پر یقین کے حامل تھے۔

قبر پر بیٹھنے، اس کے ساتھ ٹیک لگانے اور اس کے اوپر چلنے سے نہی

یہ سب حلال نہیں کیونکہ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبر کے ساتھ ٹیک لگائے دیکھا تو فرمایا: ''صاحبِ قبر کو ایذا مت دو۔'' [2] اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''تمہارا کوئی انگارے پر بیٹھ جائے جو اس کے لباس کو جلا دے اور بدن تک اس کا اثر پہنچے، قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔'' [3] اسے احمد، مسلم، ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، حرمت کا قول امام ابن حزم رحمہ اللہ کا مذہب ہے، کیونکہ اس میں وعید وارد ہوئی ہے، کہتے ہیں: یہی سلف کی ایک جماعت کا مؤقف تھا، ان میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے، بقول نووی رحمہ اللہ الأم میں امام شافعی رحمہ اللہ کی نص ہے اور سب طرق میں یہی ان کے جمہور اصحاب نے نقل کیا کہ یہ مکروہ ہے اور مراد تنزیہی کراہت ہے، یہ مشہور فقہی اصطلاح ہے، ان کے کثیر نے اس کی تصریح کی ہے، کہتے ہیں: یہی جمہور

---

[1] صحيح، سنن أبى داود: ٣٢٢٢. [2] صحيح، اطراف المسند: ٦٧٩٠. [3] صحيح مسلم: ٩٧١؛ سنن أبى داود: ٣٢٢٨.

علماء کا قول ہے، ان میں نخعی، لیث، احمد اور داود ﷭ ہیں، کہتے ہیں: کراہت میں اس کا مثل قبر پر ٹیک لگانا ہے، سیدنا ابن عمر ﷠، امام ابو حنیفہ اور امام مالک ﷫ قبر کے اوپر بیٹھ جانے کے جواز کے قائل ہیں، مؤطا میں ہے، ہمارا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر پر بیٹھنے سے نہی سے مراد آدمی کا قضائے حاجت کے لیے بیٹھنا تھا، اس میں ایک ضعیف حدیث بھی نقل کی، امام احمد ﷫ نے اس تاویل کو ضعیف قرار دیا، بقول نووی یہ تاویل ضعیف یا باطل ہے، امام ابن حزم ﷫ نے بھی کئی وجوہ سے اس کا ابطال کیا، یہ اختلاف غیر قضائے حاجت کے لیے بیٹھنے کے بارے میں ہے، جہاں تک اس غرض کے لیے ہے تو فقہاء اس کی حرمت پر متفق ہیں، جیسے ضرورت کے تحت قبروں پر چلنے کا جواز متفق علیہ ہے، مثلاً: اگر کسی اور قبر تک پہنچنے کا یہی راستہ ہو۔

قبور کو پکا بنانے اور کتبے لگانے سے ممانعت

سیدنا جابر ﷜ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ قبر کو پکا بنایا جائے اور اس پر بیٹھا جائے (یعنی مجاور بن کر) اور اس پر گنبد وغیرہ بنایا جائے۔[1] اسے احمد، مسلم، نسائی، ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا، ان کی روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ اسے روندنے سے بھی منع فرمایا، نسائی کی روایت میں ہے: اس امر سے کہ قبر پر کوئی عمارت بنائی جائے، اس میں اضافہ کیا جائے، اسے مجصص کیا جائے یا اس پر کتبہ لگایا جائے، تجصیص کا معنی ہے: "اَلطَّلَاءُ بِالْجَصِّ" یعنی اسے گچ وچونے کے ساتھ لیپانا۔ جمہور نے اس نہی کو کراہت اور امام ابن حزم ﷫ نے تحریم پر محمول کیا ہے، کہا گیا اس کی حکمت یہ ہے کہ قبر تو بوسیدگی کے لیے ہے، نہ کہ اسے نمایاں کیا جائے اور اس کی تجصیص دنیا کی عمارات کی روش ومتاع سے ہے اور میت کو اس کی کیا ضرورت؟ بعض نے کہا تجصیصِ قبور سے نہی کی حکمت جص کا آگ میں پکا ہوا ہونا ہے، اس کی تائید سیدنا زید بن ارقم ﷜ سے مروی اثر سے ہوتی ہے، جس میں ہے کہ ایک آدمی سے کہا جس نے اپنے بیٹے کی قبر کو مجصص کرنا چاہا، کہ "جَفَوْتَ وَ لَغَوْتَ"، یعنی یہ جفا اور فضول کام ہے اس کے قریب کوئی ایسی چیز نہیں ہونی چاہیے جسے آگ نے چھوا ہو، قبر کی تطیین (یعنی مٹی کے ساتھ لپائی میں) حرج نہیں، بقول ترمذی بعض اہل علم نے جن میں حسن بصری بھی ہیں، قبور کی تطیین کی رخصت دی ہے، بقول امام شافعی ﷫ اس میں حرج نہیں، جعفر بن محمد اپنے والد سے راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک زمین سے ایک بالشت اونچی کی گئی اور سرخ مٹی کا اس پر لیپ کیا گیا اور اس پر چھوٹی بجری ڈالی گئی، اسے ابو بکر نجاد نے نقل کیا اور حافظ ﷫ نے تلخیص میں اس پر سکوت کیا۔

جس طرح علماء نے تجصیصِ قبور کو مکروہ کہا، اسی طرح پکی اینٹوں یا لکڑی سے کوئی عمارت بنا لینا بھی ہے اور یہ کہ میت کو تابوت میں ڈال کر دفن کریں، اگر زمین نرم یا نم آلود نہیں، اگر ایسی ہے تب قبر کو پکی اینٹوں اور ان کے مثل سے بنا لینا اور تابوت میں ڈال کر دفن کرنا بلا کراہت جائز ہے، مغیرہ عن ابراہیم سے منقول ہے کہ سلف کچی اینٹیں پسند اور پکی کو ناپسند کرتے تھے، اسی طرح قصب (یعنی بانس اور ہر وہ جس میں پورے ہوں) کا استعمال پسند اور لکڑی کا ناپسند کرتے تھے،

---

[1] صحيح مسلم: ٩٧٠؛ سنن أبي داود: ٣٢٢٥؛ سنن ترمذي: ١٠٥٢.

حدیث سے کتبے لگانے سے نہی بھی ثابت ہوئی اور اس کا ظاہر یہ کہ چاہے کتبہ میں فوت شدہ کا نام ہو یا کوئی اور چیز (مثلاً: آیات اور اشعار وغیرہ)، حاکم نے اس حدیث کی تخریج کے بعد کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، لیکن اس پر عمل نہیں ہوا کہ شرق وغرب کے آئمۃ المسلمین کی قبور پر کتبے لگے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جسے خلف نے سلف سے اخذ کیا، امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے کہا: یہ بدعت ہے اور انہیں یہ نہی پہنچ نہ سکی تھی، حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ کتبے لگانے سے یہ نہی برائے کراہت ہے، چاہے ان میں قرآن کی آیات لکھی جائیں یا فوت شدہ کا نام، امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی ان کی موافقت کی البتہ کہا: اگر قبر کسی عالم کی یا صالح کی ہے تب کتبہ لگا دینا مندوب ہے، تاکہ اس کے نام اور تاریخِ وفات وغیرہ کی معرفت ہو، مالکیہ کی رائے میں قرآنی آیات لکھنا تو حرام ہے، البتہ نام وتاریخ لکھنا مکروہ ہے، احناف کے نزدیک نام لکھنا بھی مکروہِ تحریمی ہے، اِلّا یہ کہ قبر کا نشان و پتہ مٹ جانے کا خدشہ ہو تب مکروہ نہیں، بقول امام ابن حزم رحمہ اللہ اگر پتھر (کی تختی) میں نام کھدوا کر نصب کریں تو ہم اسے مکروہ نہ کہیں گے۔

حدیث سے اسی قبر کی نکلی مٹی سے زائد ڈالنے کی نہی ثابت ہوئی، بیہقی نے اس پر اس عنوان سے ترجمہ باندھا: ''باب لا يُزَادُ علَى القَبْرِ أَكْثَرَ مِنْ تُرَابِهِ لِئَلَّا يَرْتَفِعَ'' یعنی قبر پر وہی مٹی ڈالی جائے جو وہاں سے نکلی ہے تاکہ وہ زیادہ بلند نہ ہو۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس کا ظاہر یہ ہے کہ کسی کی قبر پر ایک اور قبر بنا دینا، امام شافعی رحمہ اللہ نے اول معنی کو راجح کہا اور لکھا: مستحب یہی ہے کہ وہی مٹی ڈالی جائے جو اس کی کھدائی سے نکلی ہے، تاکہ وہ زیادہ اونچی نہ ہو جائے، کہتے ہیں: اگر اور مٹی بھی ڈال دیں تو حرج نہیں۔

اجتماعی قبر (ایک قبر میں ایک سے زائد میتوں کی تدفین)

سلف کی روش جس پر عمل جاری ہوا، یہ ہے کہ ایک قبر میں ایک ہی میت دفنائی جائے، ایک سے زائد کا دفنانا مکروہ ہے، اِلّا یہ کہ جگہ کی تنگی یا کوئی اور مجبوری ہو، مثلاً: دفن کرنے والوں کی قلت یا ان کا ضعف ہے تب اس کا جواز ہے احمد جبکہ ترمذی نے صحیح کہا اور نقل کیا کہ احد کے روز انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہمیں زخم لگے ہیں اور تھکاوٹ غالب ہے تو (تدفینِ شہداء کی بابت) آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: ''گڑھا کھودو اور اسے وسیع اور گہرا کرو پھر دو دو یا تین تین شہداء کی میتیں دفنادو۔'' عرض کی: کسے مقدم کریں؟ فرمایا: ''جس کے پاس قرآن اکثر تھا۔''[1] عبدالرزاق نے حسن سند کے ساتھ سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ (کئی دفعہ) مرد اور عورت کی میتیں بھی اکٹھی دفنائی جاتی تھیں، مرد کو آگے اور عورت کو اس کے پیچھے رکھتے۔

اگر سمندر میں موت آ جائے تو؟

المغنی میں ہے: اگر کوئی سمندر میں کشتی پر فوت ہو جائے تو امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی بابت کہا کہ اگر تو کشتی والوں کو امید ہے

---

[1] صحيح، سنن ترمذي: ١٠٣٦؛ مسند أحمد: ٤/ ١٩، ٢٠.

کہ ایک یا دو دن بعد خشکی تک پہنچ جائیں گے، تب انتظار کریں بشرطیکہ میت خراب ہونے کا خدشہ نہ ہو، وگرنہ غسل وکفن دے کر، حنوط لگا کر اور نمازِ جنازہ پڑھ کر اس کے جسم کے ساتھ کوئی بھاری چیز باندھ کر سپردِ سمندر کر دی جائے، یہی امام عطاء اور امام حسن رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بقول حسن کسی بوری میں ڈال کر سمندر میں اتار دی جائے، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اسے دو تختوں کے درمیان باندھ کر سمندر میں ڈال دیا جائے، تاکہ لہریں کسی ساحل تک پہنچا دیں، شاید ادھر موجود لوگ اسے دفن کر دیں، اگر ان تک پہنچ جائے، لیکن اگر سمندر کے سپرد بھی کر دیا تو وہ آثم نہ ہوں گے، اول اولیٰ ہے، کیونکہ اس کے ساتھ بھی دفن سے جو مقصود ستر ہے وہ حاصل ہے، جبکہ تختوں کے درمیان باندھ کر روانہ کر دینے سے خطرہ ہے کہ کہیں ہتک وتغیر کا شکار نہ بن جائے، پھر لازماً نہیں کہ کسی ایسے ساحل پر پہنچ پائے جہاں آبادی یا لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہو یا ممکن ہے کہ کافروں یا مشرکوں کے ہاتھ لگ جائے لہٰذا اول ہی اولیٰ ہے۔

قبر پر شاخ کا رکھنا

قبر کے اوپر شاخ یا پھول (یا پھولوں کی پتیاں) رکھنا مشروع نہیں، بخاری وغیرہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں سے ہوا تو فرمایا: ''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور وجہ بھی معمولی ہے کہ ان میں سے ایک تو پیشاب کی چھینٹوں کی پروا نہ کیا کرتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا۔'' پھر ایک تازہ شاخ منگوا کر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا اور ہر قبر پر ایک ایک حصہ گاڑ دیا اور فرمایا: ''شاید جب تک یہ خشک نہ ہوں ان سے تخفیفِ عذاب کی جائے۔''[1] امام خطابی رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں کہا: آپ کا یہ فعل اور قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے ساتھ تبرک کی جہت سے تھا گویا آپ نے شاخ کی مدتِ طراوت کو ان سے تخفیفِ عذاب کی حد بنایا اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ سرسبز شاخ میں کوئی ایسا معنی موجود ہے جو خشک میں نہیں (بلکہ اصل میں یہ آپ کی برکت تھی) کثیر علاقوں میں عام لوگ قبروں میں پتے بچھاتے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ اسی حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں، خطابی رحمہ اللہ کی بات درست ہے، یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس واقعہ کی فہم تھی کہ کسی سے منقول نہیں کہ (اس فعلِ نبوی کی اقتدا کرتے ہوئے) قبر پر شاخ یا پھول رکھے ہوں، ماسوائے سیدنا بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے تو انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر دو شاخیں رکھی جائیں، اسے بخاری نے نقل کیا اور بعید ہے کہ شاخ رکھنا مشروع ہو اور سوائے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کے تمام جملہ صحابہ اس سے بے خبر رہے ہوں، حافظ رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: گویا سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کو اس کے عموم پر محمول کیا اور انہی دو کے ساتھ اسے خاص نہ کیا، بقول ابن رشید: بخاری رحمہ اللہ کے تصرف سے ظاہر ہے کہ وہ انہی دو کے ساتھ اسے خاص سمجھتے ہیں: اسی لیے اس کے عقب میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ جب سیدنا عبدالرحمن (بن ابی بکر) رضی اللہ عنہما کی قبر پر ایک خیمہ تنا ہوا دیکھا تو کہا: اے غلام! اسے ہٹا دو کیونکہ ان کا عمل ہی ان پر سایہ فگن ہوگا تو ان کی کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ قبر پر رکھی جانے والی چیز کی کوئی تاثیر نہیں بلکہ اصل تاثیر عملِ صالح کی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ١٣٧٨؛ صحيح مسلم: ٢٩٢.

اگر عورت مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو؟

تب اس کا پیٹ چاک کرنا ضروری ہے، تاکہ اس بچے کو نکالا جائے اگر اس کی زندگی کی امید ہو، اس کا پتہ حاذق اطباء سے چلے گا، کسی مسلمان کی حاملہ غیر مسلم بیوی اگر مر جائے تو اس کی قبر علیحدہ بنائی جائے گی، بیہقی نے سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کے بارے نقل کیا کہ انہوں نے ایک ایسی عورت کو جس کے پیٹ میں مسلمان کا حمل تھا (یعنی وہ مسلمان کی منکوحہ یا مملوکہ تھی) اور وہ مر گئی تھی ایک الگ جگہ دفن کیا نہ مسلمانوں اور نہ عیسائیوں کے قبرستان میں، یہی امام احمد رحمہ اللہ نے مختار کیا کیونکہ وہ کافر ہے، مسلمانوں کے قبرستان میں اس کی تدفین نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کے عذاب کے ساتھ اذیت میں مبتلا ہوں اور نہ کفار کے قبرستان میں کیونکہ اس کے پیٹ میں مسلم کا نطفہ تھا اور وہ ان کے عذاب کے ساتھ اذیت میں مبتلا ہوگا۔

قبرستان میں تدفین کی تفصیل

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ابو عبداللہ (یعنی امام احمد رحمہ اللہ) کو مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین زیادہ پسند تھی بنسبت گھر میں دفنا دینے کے، کیونکہ اس طرح اس کے زندہ ورثا پر ضرر کم ہوگا اور اہل اسلام کی دعاؤں میں شمولیت ممکن ہوگی جو قبرستان میں جاتے اور دعا کرتے ہیں، صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے سلف ہمیشہ سے قبرستانوں میں ہی دفن کیے جاتے رہے ہے، اگر کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں مدفون کیے گئے اور آپ کے ساتھ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تو ہم کہیں گے: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ یہ اس وجہ سے کیا تا کہ آپ کی قبر مبارک کو نماز گاہ نہ بنا لیا جائے۔[1] پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے صحابہ کی تدفین بقیع میں کرتے رہے اور آپ کا فعل آپ کے غیر کے فعل سے اولی ہے، آپ کے صحابہ نے اسے آپ کی تخصیص سمجھا، کیونکہ مروی ہے کہ ''انبیاء وہیں دفن کیے جاتے ہیں، جہاں ان کی وفات ہوئی ہو۔''[2] کثرتِ ورود سے آپ کی صیانت اور دیگر سے آپ کی تمیز کے لیے، امام احمد رحمہ اللہ سے اس شخص کی بابت پوچھا جو وصیت کرے کہ اس کی قبر اس کے گھر میں بنائی جائے تو کہا: اس وصیت کو پورا نہ کیا جائے، بلکہ اسے عام قبرستان میں دفن کیا جائے۔

مُردوں کو برا کہنے اور ان پر تنقید کرنے سے نہی

مسلمانوں کے مُردوں کو برا کہنا اور ان کے نقائص کا ذکر کرنا جائز نہیں، چنانچہ بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مُردوں کو برا مت کہو کیونکہ وہ آگے اپنے اعمال کی طرف گزر گئے۔''[3] ابو داود اور ترمذی نے ضعیف سند کے ساتھ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مرے ہوؤں کے محاسن کا ہی ذکر کیا کرو اور ان کے مَساوی کے ذکر سے اجتناب کرو۔''[4] البتہ وہ مسلمان جو علی الاعلان فسق و فجور اور بدعت کے داعی و عامل تھے یا کسی اور عملِ فاسد کے تو ان کی مَساوی کا ذکر مباح ہے۔ اگر اس میں کوئی مصلحتِ عامہ ہو، مثلاً: ان کے حال سے تحذیر، ان کے

[1] صحيح البخاري: ١٣٩٠. [2] ضعيف، سنن ابن ماجه: ١٦٢٨. [3] صحيح البخاري: ١٣٩٣.
[4] سنن أبي داود: ٤٩٠٠؛ سنن ترمذي: ١٠١٩.

اقوال سے تنفیر اوران کی اتباع سے روکنا، اگر کوئی مصلحت نہیں تب یہ جائز نہیں، شیخین نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ایک جنازہ گزرا اورلوگوں نے فوت شدہ کے بارے میں کلمۂ خیر کہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''واجب ہوگئی۔'' پھر ایک اور گزرا اوراب لوگوں نے اس کا برے الفاظ میں ذکر کیا تو فرمایا: ''واجب ہوگئی۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے استفسار کیا کہ کیا واجب ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا: ''جس کا تم نے ذکرِ خیر کیا اس کے لیے جنت اور دوسرے کے لیے جہنم واجب ہوئی، کیونکہ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔''[1] کفار کے مُردوں کو برا کہنا اور لعنت بھیجنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾(المائدة: ۷۸) ''وہ لوگ جنہوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داود اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔'' اورکہا: ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ﴾ (اللهب: ۱) ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ (خود بھی) ہلاک ہوگیا۔'' اسی طرح فرعون اوراس جیسے لوگوں پر لعنت فرمائی، ایک جگہ کہا: ﴿ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾(هود: ۱۷) ''سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

قبر کے پاس تلاوتِ قرآن

فقہاء نے قبر کے پاس قراءتِ قرآن کے بارے میں باہم اختلاف کیا تو اس کے استحباب کی رائے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ نے اختیار کی، تاکہ میت کے لیے مجاورت کی برکت حاصل ہو، قاضی عیاض اور مالکیہ کے قرانی رحمہ اللہ بھی ان کے موافق ہیں، امام احمد رحمہ اللہ بھی اس میں حرج نہیں سمجھتے البتہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسے مکروہ کہا کیونکہ سنت اس کے ساتھ وارد نہیں۔

قبر کا اکھیڑنا

علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس جگہ کسی مسلمان کی تدفین ہو وہ اب اس کے لیے وقف بنی، جب تک اس کے جسم کی کوئی بھی چیز باقی ہے، اگر سب کچھ مٹی ہوا گیا تو اس جگہ کسی اور کی تدفین جائز ہے اور یہ بھی کہ اب (ضرورت ہو تو) اس زمین کو کاشتکاری یا باغبانی میں استعمال کرلیا جائے یا تعمیرات میں یا کسی بھی دیگر انتفاع میں، اگر کوئی قبر کھودی گئی اور مردے کی ہڈیاں ملیں تو کھودنے والا رک جائے اور کھدائی مکمل نہ کرے، اگر پوری کھدائی کرلی تھی پھر کوئی ہڈی وغیرہ ملی تو اسے وہیں ایک طرف دفن کر دیا جائے اس کے ہمراہ کوئی اور میت بھی دفنانا جائز ہے، چاہے جو جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دی گئی ہو تو اگر ابھی قبر پر مٹی نہیں ڈالی گئی تو نکال لیا جائے اور نمازِ جنازہ کرا کے دوبارہ دفن کیا جائے، اگر مٹی ڈال دی گئی تھی تب احناف اور شوافع کے نزدیک اس کا نکالنا حرام ہے، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے کہ اس صورت میں نکالے بغیر ہی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، امام احمد رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ تب بھی قبر کھول لی جائے۔

---

[1] صحیح البخاري: ۱۳٦۷؛ صحیح مسلم: ۹٤۹.

آئمہ ثلاثہ نے کسی غرضِ صحیح کے لیے قبر کشائی کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً یہ کہ قبر میں مال رہ گیا ہے یا میت کو غیر قبلہ جہت لٹا دیا تھا یا بغیر غسل کے تدفین کردی تھی یا کفن مناسب نہ تھا لیکن اگر ڈر ہو کہ نعش خراب ہوچکی ہوگی تب قبر کشائی نہ کی جائے، احناف نے ان مذکورہ وجوہ سے قبر کشائی کی مخالفت کی اور اسے مثلہ قرار دیا اور مثلہ سے نہی ہے، بقول ابن قدامہ مثلہ اس نعش کے حق میں ہوگا جو خراب ہوچکی ہو تو اس کی قبر نہ کھولی جائے، کہتے ہیں: اگر بغیر کفن کے دفن کردیا گیا تھا تو اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کفن دینے کا مقصد میت کا ستر ہوتا ہے اور یہ اب مٹی ڈال کر حاصل ہوچکا، دوم یہ کہ قبر کھول لی جائے اور کفن پہنا کر دوبارہ دفن کیا جائے، کیونکہ تکفین واجب ہے اور یہ غسل دینے سے مشابہ ہے.
امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر قبر کھودنے والا اپنا بیلچہ قبر میں بھول گیا تو جائز ہے کہ وہ قبر کشائی کرلے، اسی طرح درہم ودینار وغیرہ رہ گئے تو تب بھی، کہتے ہیں: بشرطیکہ معقول قیمت کا سامان اندر رہ گیا ہو، پوچھا گیا: اگر میت کے وارث اس کا نقصان پورا کر دیں تو......؟ کہا: پھر اور کیا چاہیے! اس بارے میں بخاری کے ہاں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے جنازہ کے موقع پر تب پہنچے جب اسے قبر میں ڈالا جاچکا تھا تو آپ کے حکم سے اس کی نعش نکالی گئی اور آپ نے اپنی گود میں اس کا سر رکھا، اس کے منہ میں اپنا لعابِ دہن ڈالا اور اپنی قمیص اسے پہنائی، انہی سے مروی ہے کہ میرے والد کے ہمراہ (جو شہدائے احد میں سے تھے اور ذکر ہوا کہ انہیں دو دو اور تین تین کرکے دفن کیا گیا تھا) ایک ایسا شخص بھی دفن کیا گیا کہ میرا جی راضی نہ تھا، حتی کہ میں نے ان کی میت نکال کر علیحدہ ایک قبر میں دفنا دی۔[1] (بقول محشی یہ احد سے چھ ماہ بعد کیا تھا) بخاری رحمہ اللہ نے ان دونوں حدیثوں پر اس عنوان سے باب باندھا: ”هَلْ يُخْرَجُ الْمَيِّتُ مِنَ الْقَبْرِ وَاللَّحْدِ لِعِلَّةٍ“ یعنی کیا کسی عذر کی وجہ سے قبر سے میت نکالی جاسکتی ہے؟۔ ابوداود نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا جب ہم طائف جارہے تھے (یہ غزوہ حنین کے بعد جب اسلامی لشکر نے طائف کا محاصرہ کیا) تو ایک قبر سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: ”یہ ابورغال کی قبر ہے، یہ حرم میں تھا، وہاں سے نکلا تو اس جگہ اسے اس عذاب نے آن لیا جو اس کی قوم کو پہنچ چکا تھا تو یہاں دفن کیا گیا، اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ہمراہ سونے کی ایک شاخ دفن کی گئی تھی، اگر تم اس کی قبر کھولو تو یہ تمہیں ملے گی۔“ کہتے ہیں: لوگوں نے جلدی سے قبر کشائی کی تو انہیں یہ شاخ مل گئی،[2] امام خطابی رحمہ اللہ کے بقول اس میں مشرکین کی قبور کشائی کا جواز ہے، اگر اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی نفع یا فائدہ ہو اور اس ضمن میں ان کی وہ حرمت نہیں جو مسلمانوں کی ہے۔

میت کو منتقل کرنا

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک سے دوسرے شہر کی طرف میت منتقل کرنا حرام ہے اِلّا یہ کہ وہ حرمین شریفین یا بیت المقدس کے قرب میں ہو، تب ان کے شرف وفضل کے مدنظر (وہاں تدفین کے لیے) منتقل کرنا جائز ہے، اگر کسی نے ان

---

[1] صحيح البخاري: ١٣٥٢. [2] ضعيف، سنن أبي داود: ٣٠٨٨.

کے سوا کسی اور جگہ میں تدفین کی وصیت کی ہو تو اسے پورا نہ کیا جائے کیونکہ اس میں تدفین کی تاخیر اور نعش خراب ہو جانے کا خدشہ ہے، اسی طرح قبر سے اس کا نقل کرنا بھی حرام ہے مگر کسی غرض صحیح کے لیے کہ مثلاً: بغیر غسل کے دفن کر دیا تھا یا غیر قبلہ سمت میں لٹا یا گیا تھا یا یہ کہ قبر سیلابی ہوگئی ہو یا کسی غصب شدہ زمین یا کفن میں تھا یا قبر میں مال رہ گیا یا غیرِ قبلہ لٹایا گیا، مالکیہ کے نزدیک میت کا ایک سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے دفن سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اگر اس میں کوئی مصلحت ہو کہ مثلاً: ڈر ہو کہ سمندر بہالے جائے گا یا درندے کھائیں گے یا لواحقین وہاں جا نہیں سکتے تا کہ ان کے ہاں اس کی تدفین ہو یا کسی برکت والی جگہ تدفین مقصود ہو تو اس کا تب منتقل کرنا جائز ہے، اگر اس دوران میں اس کی حرمت پامال نہ ہوتی ہو، مثلاً: جسم پھٹے یا متغیر ہو یا ہڈی ٹوٹے۔

احناف کے ہاں میت کا منتقل کرنا مکروہ ہے اور مستحب یہ ہے کہ اسی شہر کے قبرستان میں دفن کیا جائے جہاں انتقال ہوا ہو، البتہ دفن سے قبل ایک یا دو میل منتقل کرنے میں حرج نہیں، کیونکہ اتنی مسافت تو شہر کے قبرستان کی ہوتی ہے، دفن کے بعد منتقل کرنا حرام ہے، مگر کسی عذر کی بنا پر جیسا کہ پیچھے گزرا، اگر کسی عورت کا بیٹا فوت ہوا اور دوسرے شہر میں دفن کر دیا گیا اور وہ غائب تھی تو وہ صبر نہ کرے اور اسے اپنے شہر منتقل کرنا چاہے تو اس کی بات نہ مانی جائے۔

حنابلہ کہتے ہیں: شہید کو اسی جگہ دفن کرنا مستحب ہے جہاں وہ قتل ہوا، امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: جہاں تک مقتولین کا تعلق ہے تو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان روایت کیا کہ ''انہیں ان کی قتل گاہوں میں دفن کرو۔''[1] ابن ماجہ میں ہے کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے روایت بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کے بارے میں حکم دیا تھا کہ ان کی میتیں ان کی قتل گاہوں ہی میں دفن کی جائیں۔[2] دیگر کی میت ایک سے دوسرے شہر تبھی منتقل کی جائے گی جب کوئی ضرورت و مصلحت ہو، یہی امام اوزاعی اور امام ابن منذر رحمہ اللہ کا مسلک ہے، عبداللہ بن ملیکہ کہتے ہیں: سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر حُبشی رضی اللہ عنہ (مکہ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ایک مقام) میں فوت ہوئے تھے اور ان کی میت مکہ لاکر دفنائی گئی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب مکہ آئیں تو ان کی قبر پر آئیں اور کہا: واللہ! اگر میں موجود ہوتی تو وہیں دفن کرتی جہاں فوت ہوئے تھے اور اگر میں موقع پر حاضر ہوتی تو اب قبر کی زیارت کو نہ آتی،[3] ہاں! اگر کوئی غرضِ صحیح ہو تب جائز ہے، امام احمد رحمہ اللہ کے بقول میں آدمی کی میت دوسرے شہر منتقل کرنے میں حرج نہیں سمجھتا، زہری سے اس کے بارے میں سوال ہوا تو کہا: سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما کی میتیں عقیق سے مدینہ لائی گئی تھیں۔

تعزیت

یہ عزاء سے ہے جو صبر کے معنی میں ہے تو تعزیت کا مطلب تصبیر ہے، یعنی صبر کی تلقین، ترغیب دلانا اور تسلی دینا، اس انداز سے کہ لواحقین کا حزن و غم کم ہو اور ان کی مصیبت ان پر آسان ہو۔

---

[1] صحیح، سنن نسائی: ۲۰۰۵. [2] صحیح، سنن ابن ماجہ: ۱۵۱٦. [3] سنن ترمذی: ۱۰۵۵.

تعزیت کا حکم

تعزیت کرنا مستحب ہے اگر چہ ذمی ہو، ابن ماجہ اور بیہقی نے حسن سند کے ساتھ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی مومن اپنے بھائی سے اس کی مصیبت پر تعزیت کرے گا تو اللہ اسے قیامت کے دن کرامت (یعنی عزت وشان) کی خلعت پہنائے گا۔''[1] یہ (کم ازکم) ایک دفعہ کرنا مستحب ہے اور مناسب ہے کہ میت کے سب اہلِ خانہ سے ہو اور اس کے اقارب سے، چھوٹے بڑے اور مرد وعورت سب سے (بقول محشی علماء نے نوجوان خاتون کا استثناء کیا اور کہا: اس سے صرف اس کے محارم ہی تعزیت کریں) چاہے یہ تدفین سے قبل ہو یا بعد میں تین ایام تک، اِلّا یہ کہ تعزیت کرنے والا یا جس سے کرنی ہے وہ غائب ہو تب تین دن کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔

تعزیت کے الفاظ

اس ضمن میں کوئی سے بھی الفاظ کہے جا سکتے ہیں جن سے مصیبت ہلکی ہو اور جو صبر وتسلی کرنے پر ابھاریں، اگر وارد (یعنی ماثور) لفظ پر اقتصار کرے تو یہ افضل ہے، بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی نے آپ کو پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا فوت ہوا ہے، آپ ہمارے ہاں آئیں، آپ نے ایلچی سے کہا: ''اسے میرا سلام کہو اور کہو'' ((اِنَّا لِلّٰهِ مَا أَخَذَ مَا أَعْطَى وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ)) ''بے شک اللہ کے لیے ہے، جو اس نے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دیا اور ہر چیز کا اس کے ہاں وقت مقرر ہے پس صبر کرو اور اجر کی امید رکھو۔''[2] طبرانی، حاکم اور ابن مردویہ نے اس سند کے ساتھ جس میں ایک راوی ضعیف ہے، سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ان کا بیٹا فوت ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعزیت میں انہیں خط لکھا (کیونکہ وہ تب یمن میں آپ کی طرف سے حاکم تھے) ''بسم اللہ کے بعد: محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے معاذ بن جبل کی طرف، سلامٌ علیک، میں سب سے پہلے اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اما بعد! پس اللہ تمہیں اجر عظیم عطا کرے اور تمہیں صبر کی توفیق دے اور ہمیں اور تمہیں شکر ادا کرنے کی ہمت دے، بے شک ہمارے نفوس، اموال اور ہمارے اہل اللہ کے خوشگوار تحفے اور ہمیں سونپی گئیں اس کی امانتیں ہیں، اللہ نے تمہیں اس (بیٹے) کے ساتھ رشک وسرور کا موقع دیا، پھر اجرِ کثیر کے عوض اسے تم سے واپس لے لیا، سلامتی، رحمت اور ہدایت ہے اگر تم نے ثواب کی امید رکھی اور صبر کیا، تمہارا جزع فزع کرنا کہیں تمہارا اجر ضائع نہ کر دے کہ پھر تم نادم ہوگے اور جان لو کہ جزع فزع کرنے سے مرنے والا تو واپس نہیں آ سکتا اور نہ یہ دافعِ غم ہے اور جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہتا ہے، والسلام''[3] (بقول محشی یہ روایت ضعیف ہے، دراصل سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا بیٹا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو برس بعد فوت ہوا تھا) امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ سے بیان کیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو تعزیت ہو رہی تھی

---

[1] حسن، سنن ابن ماجہ: ١٦٠١. [2] صحیح البخاری: ٧٣٧٣؛ صحیح مسلم: ٩٢٣. [3] موضوع، المعجم الکبیر للطبرانی: ٢٠/ ١٥٥؛ رقم: ٣٢٤؛ المستدرك للحاکم: ٣/ ٢٧٣.

کہ ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا: بے شک اللہ (کے ہاتھ) میں ہر مصیبت کی تسلی اور ہر مرنے والے کا نعم البدل ہے اور ہر فائت (جو حاصل نہ ہوسکا) کا عوض و بدل ہے تو اسی پر بھروسہ کرو اور اسی سے امید باندھو، اصل مصیبت وہ زندہ ہے جو ثواب سے محروم ہوا۔ اس کی سند ضعیف ہے۔[1]

علماء کہتے ہیں: اگر مسلمان مسلمان میت کی تعزیت کرے تو یہ کہے: اللہ تمہارا اجر زیادہ کرے اور تمہارا صبر اچھا کرے، تمہاری میت کی مغفرت کرے، اگر مسلمان سے اس کے کافر مرنے والے کی تعزیت کرے تو کہے: اللہ تمہارا اجر زیادہ اور تمہارا صبر عمدہ کرے، اگر کافر سے مسلمان مرنے والے کی تعزیت کرے تو کہے: اللہ تمہیں تسلی دے اور تمہاری میت کی مغفرت کرے، اگر کافر سے کافر کی تعزیت کرے تو کہے: یعنی اللہ تمہیں اس کا بدل دے، تعزیت کے جواب میں کچھ کہنا ہو تو اولاً اس کی دعاؤں پر آمین کہے، پھر کہے: اللہ تمہیں اجر دے، امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: چاہے تو تعزیت کرنے والے سے مصافحہ (یا معانقہ) کر لے، اگر لواحقین (غیر شرعی طریقہ سے جزع فزع کر رہے ہوں اور) گریبان پھاڑتے (اور الٹے سیدھے الفاظ منہ سے نکالتے) ہوں تب بھی ان سے تعزیت کرے اور ان سے صادر اس باطل کی وجہ سے حق کا ترک نہ کرے، اگر اس سے منع کرے تو اچھا ہے۔

تعزیت کے لیے بیٹھنا

سنت یہ ہے کہ میت کے اہل و اقارب سے تعزیت کر کے واپس ہو جائے بجائے اس کے کہ بیٹھے، چاہے وہ تعزیت کرنے والا ہو یا جس سے کی جا رہی ہو، یہی سلف صالحین کی روش و عادت تھی، امام شافعی رحمہ اللہ الأم میں لکھتے ہیں: میں ماتم کو مکروہ سمجھتا ہوں اور یہ اکٹھے ہونا بھی، چاہے رو پیٹ نہ بھی رہے ہوں کیونکہ یہ غم کو تازہ رکھے گا اور دکھ کو بھولنے نہ دے گا (یعنی بہتر ہے کہ کام کاج میں لگ کر غم بھلایا جائے) امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک تعزیت کے لیے بیٹھنا (یعنی باقاعدہ مجلس جما کر، جیسے رواج ہے) مکروہ ہے، کہتے ہیں: بیٹھنے سے مراد یہ ہے کہ لواحقین گھر میں جمع ہو کر بیٹھ رہیں تاکہ تعزیت کرنے والے آئیں، بلکہ مناسب یہ ہے کہ اپنے کام کاج میں لگ جائیں، عورتیں بھی جم کر نہ بیٹھیں، یہ تنزیہی کراہت ہے، اگر اس طرح کوئی اور بدعت امر وقوع پذیر نہیں ہوتا، لیکن اگر اس طرح بیٹھنے کے ساتھ ساتھ محرم بدعات میں کسی کا صدور ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، تب یہ حرام بلکہ قبیح محرمات میں سے ہے کیونکہ یہ محدث امر ہے اور حدیثِ نبوی ہے: ((كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''بے شک دین میں گھڑ لی جانے والی ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[2] احمد اور کثیر علمائے احناف یہی رائے رکھتے ہیں، احناف کے متقدمین کا میلان یہ تھا کہ تعزیت کی غرض سے تین دن تک غیرِ مسجد میں بیٹھے رہنا باعثِ حرج نہیں مگر کوئی محظور (یعنی غیر شرعی) حرکت نہیں ہونی چاہیے، آج کل جو رواج ہے کہ دریاں بچھا کر اور قناتیں تان کر لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس دوران (کھلانے پلانے پر) مباہات اور مفاخرت کی خاطر بھاری

---

[1] الأم لشافعي: ١/ ٣١٧. [2] سنن أبي داود: ٤٦٠٧؛ سنن ترمذي: ٢٦٧٦.

رقوم خرچ کی جاتی ہیں تو یہ محدث امور اور منکر بدعات میں سے ہے، ضروری ہے کہ مسلمان اس سے اجتناب کریں، ایسا کرنا ان پر حرام ہے، بالخصوص اس طرح پھر کتاب وسنت کے منافی کئی افعال سرزد ہوتے ہیں مثلاً: گا گا کر قرآن کی قراءت کرائی جاتی ہے، آدابِ تلاوت کا التزام کیے بغیر اور پھر اس کے لیے ترکِ انصات اور لوگوں کا فضولیات اور سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہونا وغیرہ، پھر معاملہ اسی حد تک نہیں رہتا کہ چند شروع کے ایام جمع ہوں بلکہ ہم دیکھتے ہیں چالیسویں دن پھر اسی طرح کی مجلس برپا کی جاتی ہے اور دوبارہ ان خرافات و بدعات کا صدور ہوتا ہے اور پھر لوگ آکر بیٹھتے ہیں، اس کے علاوہ ہر سال برسی (اور عرس) منانا تو ایسے کام ہیں کہ نہ نقل (یعنی کتاب وسنت) کے موافق ہیں اور نہ عقل کے (یعنی ان کا کوئی فائدہ نہیں، میت کے لیے جو ہونا تھا وہ ہو چکا)۔

زیارتِ قبور

یہ مردوں کے لیے مستحب ہے۔ چنانچہ احمد، مسلم اور اصحابِ سنن نے عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، لیکن اب حکم دیتا ہوں کہ قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔''[1] نہی ان کے جاہلیت سے قربِ عہد کی وجہ سے تھی جب خدشہ تھا کہ زبانوں پر جاہلیت کے الفاظ جاری ہو سکتے ہیں جب اسلام کی تعلیمات کی بخوبی معرفت ہوگئی اور یہ خدشہ جاتا رہا، تب شارع علیہ السلام نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی تو رو پڑے، وہاں موجود ہمراہی صحابہ بھی رونے لگے، فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اذن مانگی کہ والدہ کے لیے استغفار کروں، مگر مجھے یہ اذن نہ ملی، پھر میں نے والدہ کی قبر کی زیارت کی اذن مانگی جو مل گئی تو تم بھی قبور کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ موت یاد دلاتی ہیں۔''[2] اسے امام احمد رحمہ اللہ نے اور سوائے ترمذی کے اصحابِ سنن نے نقل کیا، جب زیارتِ قبور سے مقصود حصولِ عبرت اور آخرت کی یاد ہے تو کفار کی قبور کی زیارت سے بھی یہ مقصود پورا ہو سکتا ہے، ان کی قبور سے گزرتے وقت مستحب ہے کہ اللہ کے عذاب کو ذہن میں حاضر کر کے رویا جائے اور اللہ کی طرف توجہ کا اظہار کیا جائے، بخاری نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا جب وہ دیارِ ثمود وادیِ حجر سے گزر رہے تھے: ''روتے ہوئے ان سے گزرو۔ اگر رونا نہیں آتا تب ان کے علاقہ میں داخل نہ ہونا کہ کہیں ان جیسا عذاب تمہیں نہ پہنچ جائے۔''[3]

کیفیتِ زیارت

جب زائر قبر تک پہنچے تو میت کے چہرہ کے سامنے ہو کر اسے سلام کہے اور اس کے لیے دعا کرے۔

---

[1] صحيح مسلم:٩٧٧؛ سنن أبی داود: ٣٢٣٥. [2] صحيح مسلم: ٩٧٦؛ سنن أبی داود: ٣٢٣٤.
[3] صحيح البخاری: ٤٣٣، ٣٣٨١؛ صحيح مسلم: ٢٩٨٠.

① سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تعلیم دی کہ جب قبرستان جائیں تو کہیں: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ أَنْتُمْ فَرَطُنَا وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ» ''اے اہلِ ایمان واسلام! تمہیں ہمارا سلام ہو، ہم بھی تم سے آن ملنے والے ہیں، تم ہمارے پیش رو اور ہم تمہارے پیچھے پیچھے ہیں، ہم اللہ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت مانگتے ہیں۔''① اسے احمد اور مسلم وغیرہما نے نقل کیا۔

② سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قبرستان سے گزرے تو چہرہ مبارک ان کی طرف کیا اور فرمایا: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ» ''تم پر سلامتی ہو اے قبر والو! اللہ ہمیں اور تم کو معاف کرے، تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم بھی تمہارے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔''② اسے ترمذی نے نقل کیا۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (کئی دفعہ) ان کی باری کی رات کے آخر میں بقیع کی طرف نکلتے اور فرماتے: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ وَآتَاكُمْ مَا تُوْعَدُوْنَ غَداً مُؤَجَّلُوْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ» ''سلام ہے تم پر اے گھر والے مومنو! آچکا تمہارے پاس جس کا تم سے وعدہ تھا کہ کل پاؤ گے ایک مدت کے بعد اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ملنے والے ہیں۔'' اے اللہ بقیع (یہ مدینہ کا قبرستان ہے) کے مدفونوں کی مغفرت فرما۔''③ اسے مسلم نے نقل کیا۔

④ انہی سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی: قبرستان میں جا کر کیا کہا کروں؟ فرمایا: «قُوْلِي: اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ» ④ بعض بے علم جو قبروں کو چھوتے، انہیں بوسہ دیتے اور ان کے گرد طواف کرتے ہیں، تو یہ منکر و بدعات ہیں۔ ان سے اجتناب واجب ہے اور ایسا کرنا حرام ہے، یہ صرف کعبہ کے ساتھ مختص ہے، اس پر کسی نبی یا ولی کی قبر کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، تمام خیر اتباعِ نبوی میں ہے، جبکہ شر سب کا سب ابتداع (یعنی بدعت ایجاد کرنے) میں ہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی قبور کی زیارت کرتے تو اسی غرض کے لیے کہ ان کے لیے دعائے رحم و مغفرت کریں، جبکہ مشرکین میت سے دعا کرتے اور اللہ پر اس کے واسطہ کے ساتھ قسم ڈالتے ہیں اور میت سے اپنی حاجات طلبی کرتے اور اس کے ساتھ استعانت کرتے ہیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی اور سیرت کے برعکس ہے، آپ کی ہدی میت کی طرف احسان کی تھی (کہ اس کے حق میں دعا کریں) جبکہ ان کی ہدی شرک اور اساءت کی ہے، اپنے ساتھ بھی اور فوت شدگان کے ساتھ بھی۔ نیز قبروں کی طرف آنے والے تین قسم کے لوگ ہیں:

① صحيح، مسند أحمد: ٢٢٩٨٥؛ صحيح مسلم: ٩٧٥. ② ضعيف، سنن ترمذي: ١٠٥٣. ③ صحيح مسلم: ٩٧٤. ④ صحيح مسلم: ٩٧٤.

① وہ جو میت کے لیے دعا کریں۔
② وہ جو اس کے ساتھ (یعنی اس کے توسط سے) دعا کریں۔
③ وہ جو اس کے پاس دعا کرنا مساجد میں دعا کرنے سے افضل اور اولی سمجھتے ہیں، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی روش اور ہدیٔ وسیرت میں تامل کرنے والے کے لیے دونوں امور کے مابین فرق واضح ہے۔

عورتوں کا قبروں کی زیارت کو جانا

امام مالک رحمہ اللہ، بعض احناف اور اکثر علماء نے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے۔ سابق الذکر حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مدِ نظر عورتوں کو قبرستان کی زیارت کو جانے کی رخصت دی ہے، ابن ابی ملیکہ راوی ہیں کہ ایک دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو قبرستان سے آتے دیکھا تو عرض کی: اے ام المومنین! آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ فرمایا: اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر کی زیارت کر کے، میں نے کہا: کیا نبی کریم ﷺ نے زیارتِ قبور سے منع نہیں کیا تھا؟ کہا: پہلے کیا تھا، پھر اجازت دے دی تھی۔[1] اسے حاکم اور بیہقی نے نقل کیا اور کہا: بسطام بن مسلم بصری اس کے ساتھ متفرد ہیں، بقول ذہبی یہ صحیح ہے، صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ایک عورت سے گزر ہوا جو ایک قبر کے پاس رو رہی تھی جو اس کے بیٹے کی تھی، تو آپ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔'' وہ کہنے لگی: اے گزرنے والے! آپ کو میری مصیبت اور دکھ کا کیا پتہ؟ آپ ﷺ آگے چلے گئے تو اس سے کہا گیا: یہ رسول اللہ ﷺ تھے، (یہ سن کر) اس پر تو گویا موت چھا گئی، وہ درِ نبوی پہ آئی، آپ سے ملی اور عرض کی: میں آپ کو پہچان نہ پائی تھی، آپ نے فرمایا: ''صبر وہی ہے جو شروع میں ہو۔''[2] اس سے وجہِ استدلال یہ ہے کہ آپ نے قبرستان آنے پر اس کا انکار نہیں کیا تھا، پھر قبور کی زیارت سے مقصود فکرِ آخرت اور موت کو یاد کرنا ہے اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ مرد اور عورت اس میں مشترک ہیں، مردوں کو عورتوں کی نسبت اس کی زیادہ ضرورت نہیں، بعض حضرات نے اس وجہ سے خواتین کی زیارتِ قبور کو مکروہ قرار دیا ہے کہ ان میں صبر کا مادہ کم ہوتا ہے اور وہ بکثرت جزع فزع کرتی ہیں، ایک حدیث ہے: «لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ» ''اللہ قبور کی زیارت کے لیے بکثرت جانے والیوں پہ لعنت کرے۔''[3] اسے احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ صحیح ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حدیثِ مذکور میں لعنت کثرت سے جانے والیوں کے لیے ہے کیونکہ مبالغہ کا صیغہ استعمال کیا ہے اور اس کا یہی اقتضا ہے اور شاید اس کا سبب کہ جو اس وجہ سے شوہر (واولاد) کے حقوق کی تلفی اور تبرُّج (یعنی بناؤ سنگھار کا اظہار اور بے پردگی) کا مظاہرہ ہے اور جو دیگر مفاسد از قسم نوحہ وصیاح ہو سکتے ہیں، کہا گیا: اگر ان سب سے امن ہے تب حرج نہیں کیونکہ موت یاد کرنے کی ضرورت مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی ہے، امام شوکانی رحمہ اللہ (قرطبی کی کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے) کہتے ہیں: یہی معتمد ہے تا کہ احادیث کے مابین جمع وتطبیق ہو۔

---

[1] صحیح، المستدرك للحاكم: ١٣٩٢. [2] صحیح البخاری: ٧١٥٤؛ صحيح مسلم: ٩٢٦. [3] صحیح، سنن ترمذی: ١٠٥٦؛ سنن ابن ماجه: ١٥٧٦.

وہ اعمال جو میت کے لیے نافع ہیں اور کیا نبی کریم ﷺ کی طرف ثواب ہدیہ کرنا جائز ہے؟

متفق علیہ مسئلہ یہ ہے کہ میت کو ان نیکی کے اعمال سے نفع ہوتا ہے جو وہ زندگی میں کر گیا، کیونکہ مسلم اور اصحاب سنن نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل بھی منقطع ہو جاتا ہے مگر تین جہت سے:

① صدقۂ جاریہ۔

② علم (پھیلایا) جس کے ساتھ لوگوں کو استفادہ اور نفع ہو رہا ہے۔

③ صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''[1]

ابن ماجہ نے انہی سے روایت نقل کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کی وفات کے بعد اس کے عمل اور حسنات میں سے اس کے درج ذیل اعمال (کا ثواب) اسے پہنچتا ہے: ایسا علم جو وہ سکھلا گیا اور نشر کر گیا، یا ولد صالح جو وہ چھوڑ گیا یا مصحف جو اس کے ترکہ میں ہو یا مسجد اس نے تعمیر کی یا گھر (یعنی سرائے) اس نے مسافروں کے لیے بنایا تھا یا نہر کھدوائی تھی (اور کنواں) یا صدقہ جو اس نے صحت و حیات میں کیا تھا تو ان سب کا فائدہ اسے موت کے بعد بھی ملتا رہے گا۔''[2] مسلم نے سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اسلام میں کوئی سنت حسنہ (یعنی نیکی کے کام) کا اجراء کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا اجر بھی بغیر اس کے کہ ان کے اجور میں کوئی کمی ہو، اسی طرح اس کے برعکس جس نے کوئی برا کام جاری کیا تو اس کے لیے اس کا گناہ ہے اور اس کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا گناہ بھی بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔'' میت کے غیر سے صادر ہونے والے نیکی کے اعمال جن کے ساتھ میت کو نفع ہوتا ہے، ان کا بیان حسب ذیل ہے:

① **میت کے لیے دعا و استغفار**

اس پر اجماع واقع ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾(الحشر:۱۰)

''(ان کے لیے بھی) جو اُن (مہاجرین) کے بعد آئے، وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما اور مومنوں کی نسبت ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے رب! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

---

① صحيح مسلم:١٦٣١؛سنن أبى داود: ٢٨٨٠. ② حسن، سنن ابن ماجه: ٢٤٢؛ شعب الايمان للبيهقى: ٣٤٤٨.

اور پہلے نبی کریم ﷺ کی حدیث گزری کہ ''جب میت کی نمازِ جنازہ پڑھو تو اخلاص سے اس کے لیے دعا کرو۔''[1] اور رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا بھی موجود ہے۔ «أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا» ''اے اللہ! ہمارے زندوں اور مردوں کو بخش دے۔''[2] نماز جنازہ کی دعائیں پیچھے گزری ہیں اور ہمیشہ سے سلف وخلف گزرے ہوئے، لوگوں کے لیے دعائیں اور ان کے لیے رحمت ومغفرت کی طلب کرتے ہیں، کسی کو بھی اس کا انکار نہیں۔

② صدقہ

امام نووی رحمہ اللہ نے اس امر پر اجماع نقل کیا کہ مرحوم کی طرف سے صدقہ واقع ہو جاتا ہے اور اس کا ثواب اسے پہنچتا ہے چاہے اس کی اولاد کی طرف سے ہو یا دیگر سے، کیونکہ احمد اور مسلم وغیرہما نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ میرا والد فوت ہو گیا اور اس نے مال چھوڑا ہے اور وہ وصیت بھی نہ کر سکا تھا تو کیا اگر میں اس کی طرف سے تصدُّق کر دوں تو انہیں فائدہ ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں!۔''[3] حسن عن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کی والدہ فوت ہوئیں تو انہوں نے آپ ﷺ سے ان کی طرف سے صدقہ کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ہاں میں جواب دیا، کہتے ہیں: میں نے کہا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: «سَقْيُ الْمَاءِ» ''پانی پلانے کا کوئی بندوبست۔'' حسن کہتے ہیں: تو اسی وجہ سے مدینہ میں آلِ سعد کی سبیل ہے۔[4] اسے احمد اور نسائی وغیرہما نے نقل کیا، قبرستان میں جا کر صدقہ دینا مشروع نہیں اسی طرح جنازہ کے موقع پر اس کے ساتھ بھی مکروہ ہے۔

③ روزے رکھنا

کیونکہ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہوگئی ہے اور اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے ہیں، کیا میں اس کی طرف سے رکھ لوں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر والدہ پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتے؟'' کہا: جی ضرور! آپ نے فرمایا: ''تو اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔''[5]

④ حج کرنا

کیونکہ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ جہینہ کی ایک خاتون نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی، مگر پورا کرنے سے قبل ہی فوت ہوگئی ہیں، کیا میں ان کی طرف سے کر لوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں!۔''[6]

---

[1] حسن، سنن أبي داود: ٣١٩٩. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٣٢٠١. [3] صحيح مسلم: ١٦٣٠؛ سنن نسائي: ٦/ ٢٥٢. [4] حسن، مسند أحمد: ٥/ ٨٥؛ سنن نسائي: ٦/ ٢٥٥. [5] صحيح البخاري: ١٨٥٢؛ صحيح مسلم: ١١٤٨. [6] صحيح البخاري: ٧٣١٥.

⑤ نماز

دار قطنی نے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں اپنے والدین سے ان کی زندگی میں حسنِ سلوک کرتا تھا، اب وہ مر چکے ہیں تو کیسے ان سے نیکی کروں؟ فرمایا: ''موت کے بعد ان کے ساتھ نیکی میں سے ہے کہ اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھو اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لیے بھی روزے رکھو (یعنی اپنی عبادات کا ثواب انہیں بھی ملنے کی نیت کرو۔)''[1]

(٦) تلاوتِ قرآن پاک

یہ جمہور اہلِ سنت کی رائے ہے، بقول امام نووی امام شافعی رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تلاوت کسی کی طرف سے کرنے پر اس کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا، احمد اور اصحابِ شافعی کی ایک جماعت کی رائے میں پہنچتا ہے تو ان کے ہاں مختار یہ ہے کہ تلاوت کر کے کہے: اے اللہ! میں نے جو پڑھا اس کے ثواب کا مثل فلان کو بھی پہنچا دے، المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ احمد نے کہا: میت کو خیر کے ہر عمل کا ثواب پہنچتا ہے، اس کے بارے میں وارد نصوص کے مدنظر اور اس لیے کہ مسلمان ہر شہر میں جمع ہوتے اور بلا نکیر اپنے مرے ہوؤں کے لیے قرآن پڑھتے اور اسے ان کی طرف اہدا کرتے ہیں تو یہ اجماع ہے۔

میت کی طرف ایصالِ ثواب کے قائلین شرط عائد کرتے ہیں کہ قاری قراءت کی اجرت نہ لے، اگر اجرت لی تو یہ دینے والے اور لینے والے پر حرام ہوگی اور اس قراءت کا کوئی ثواب نہ ہوگا، کیونکہ احمد، طبرانی اور بیہقی نے سیدنا عبد الرحمن بن شبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن پڑھو اور عمل کرو، اس سے جفا اور غفلت نہ کرو اور اس کے ذریعے سے روزی نہ کماؤ اور نہ لالچ رکھو۔''[2] بقول ابن قیم رحمہ اللہ عبادات کی دو قسمیں ہیں: مالی اور بدنی، شارع علیہ السلام نے صدقہ کا ثواب (میت کو) پہنچنے کا اشارہ دیا ہے کہ تمام مالی عبادات (کسی کی طرف سے کرنے پر) کا ثواب اس تک پہنچتا ہے، اسی طرح روزہ کے ثواب کے وصول کا اثبات کر کے تمام بدنی عبادات کے وصول کا اشارہ دیا (مگر یہ تو فرض روزے تھے جو اس کی طرف سے چھوٹ گئے تھے) اور یہ کہہ کر کہ حج کا ثواب پہنچے گا اشارہ دیا کہ ایسی عبادت کا ثواب بھی پہنچے گا جو (بیک وقت) مالی بھی ہے اور بدنی بھی تو یہ تینوں انواع نص و اعتبار کے ساتھ ثابت ہیں۔

نیت کی شرط

اس سلسلہ میں میت کو ایصالِ ثواب کی نیت کرنا ضروری ہے، ابن عقیل رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر نماز، روزہ اور تلاوت وغیرہ کوئی فعلِ طاعت کیا اور کسی مسلمان میت کو اس کا ایصالِ ثواب کرنا چاہا تو وہ اس تک پہنچتا اور اسے نفع دیتا ہے بشرطیکہ فعلِ مذکور سے قبل اس کی نیت کی ہو اور اثنائے فعل بھی وہ نیت ساتھ رہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اسے راجح کہا۔

---

① ضعیف، المصنف لابن ابی شیبة: ٣/ ٣٨٧. ② صحیح، مسند أحمد: ٣/ ٤٢٨؛ مجمع الزوائد: ٧٣.

ایصالِ ثواب کے لیے افضل عمل

امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہا گیا ہے کہ اس ضمن میں سب سے افضل عمل اس کی طرف سے کسی غلام ولونڈی کو آزاد کرنا ہے، صدقہ بنسبت روزے رکھنے کے افضل ہے اور سب سے افضل صدقہ وہ جو متصدَق علیہ کی ضرورت کو پورا کرے اور دائمی اور جاری ہو، اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''افضل صدقہ پینے کے پانی کی فراہمی ہے۔''[1] یہ اس جگہ ہے جہاں پانی قلیل اور عطش کثیر ہو وگرنہ نہروں اور ندی نالوں کے علاقے میں اس کی نسبت ضرورت مندوں کو طعام کی فراہمی افضل ہوگی، اسی طرح فوت شدہ کے لیے دعا اور استغفار کرنا اگر یہ صدق، اخلاص اور تضرُّع کے ساتھ ہو تو یہ (کئی دفعہ) اس کی طرف سے صدقہ کرنے سے افضل ہوسکتا ہے، نمازِ جنازہ اور قبر پر کھڑے دعا کرنے کی مثل، بالجملہ ایصالِ ثواب کے ضمن میں افضل اعمال: آزاد کرانا، صدقہ، استغفار، دعا اور اس کی طرف سے حج کرنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایصالِ ثواب

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بعض متاخرین فقہاء نے اسے مستحب کہا ہے، جبکہ بعض کے نزدیک ایسا کرنا بدعت ہے، کیونکہ صحابہ ایسا نہ کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ویسے ہی امت کے ہر فرد کے نیک عمل کا اجر ہے، بغیر اس کے کہ عامل کے اجر سے کچھ کمی ہو، کیونکہ آپ ہی کے واسطہ سے امت کو ہدایت ملی ہے اور آپ کا فرمان ہے: ''جو کسی کے نیک عمل کا سبب بنا اس کے لیے بھی عامل کے مثل اجر ہوتا ہے۔'' تو کوئی ایصالِ ثواب کرے یا نہ کرے آپ تمام افرادِ امت کے نیک اعمال کے اجر میں شریک ہیں۔

مسلمانوں اور مشرکین کے فوت ہوئے نابالغ بچوں کا حکم

مسلمانوں کے جو بچے حالتِ نابالغی میں مرجائیں وہ جنتی ہیں، کیونکہ بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عدی بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ انہوں نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے سنا کہ جب ابن رسول سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو آپ نے فرمایا: ''اس کے لیے جنت میں مرضعہ (یعنی دودھ پلانے والی) کا بندوبست کیا گیا ہے۔''[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: بخاری کا اس باب میں اسے وارد کرنا یہ رائے اختیار کرنے کا مشعر ہے کہ مسلمانوں کی اولاد جنت میں ہوگی، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی مسلمان کے تین نابالغ بچے فوت ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کے صدقے اسے جنت میں داخل کرے گا۔''[3] اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ جو کسی کے دخولِ جنت کا سبب ہو خود اس

---

[1] حسن، سنن ابن ماجه: ٣٦٨٤؛ مسند أحمد: ٥/ ٢٨٥. [2] صحيح البخاري: ١٣٨٢؛ سنن ابن ماجه: ١٥١١.
[3] صحيح البخاري: ١٢٤٨؛ صحيح مسلم: ٣٦٣٤.

کا جنتی ہونا تو اولیٰ ہوا، جہاں تک مشرکین کی اولاد ہے تو ان کے لیے یہی حکم ہے، بقول امام نووی ؒ یہی صحیح و مختار مذہب ہے جو محققین نے اس آیت کے مدنظر اختیار کیا: ﴿وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾(الإسراء:١٥) ''ہم عذاب دینے والے نہیں حتی کہ ہم (پہلے) رسول بھیجیں۔'' تو اگر عاقل کافر جس تک دعوت نہ پہنچ سکی اسے عذاب نہ دیا جائے گا تو غیر عاقل (اور غیر مکلف) کا یہی حکم ہونا اولیٰ ہوا، پھر امام احمد ؒ نے خنساء بنت معاویہ بن صریم کے حوالے سے ان کی پھوپھی سے روایت نقل کی کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کون جنتی ہے؟ فرمایا: ''نبی، شہید اور مولود (یعنی جو نابالغی کی عمر میں مرا)''[1] بقول حافظ ؒ اس کی سند حسن ہے۔

قبر میں سوال

اہل سنت والجماعت متفق ہیں کہ ہر انسان سے مرنے کے بعد سوال ہوں گے، چاہے اسے قبر میں دفن کیا جائے یا نہیں اور چاہے اسے درندے کھالیں یا نعش کو جلا دیا جائے حتی کہ راکھ بن جائے یا ہوا میں تحلیل ہو جائے یا غرق ہو جائے، اس سے ضرور سوال ہوں گے اور اگر عامل خیر تھا تو جزائے خیر و گرنہ جزائے شر پائے گا اور یہ کہ عذاب روح و بدن دونوں پر اکٹھے ہوگا، امام ابن قیم ؒ نے لکھا: امت کے سلف اور اس کے آئمہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے تو نعمتوں میں یا عذاب میں ہوتا ہے اور یہ اس کی روح و بدن دونوں کو حاصل ہے اور روح بدن کی مفارقت کے بعد منعم یا معذب حالت میں باقی رہتی ہے اور کبھی اس کا بدن سے اتصال ہوتا رہتا ہے اور بدن کے لیے اس کے ساتھ نعیم یا عذاب کا حصول ہوتا ہے، پھر جب قیامتِ کبری قائم ہوگی تو روحیں اپنے اجساد کی طرف لوٹا دی جائیں گی اور سب اپنی قبور سے رب العالمین کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے، ابدان کا اٹھایا جانا مسلمانوں، یہود اور نصاریٰ کے مابین متفق علیہ امر ہے، بقول امام مروزی امام احمد ؒ نے کہا: عذابِ قبر حق ہے، گمراہوں کے سوا کوئی اس کا منکر نہیں۔ بقول حنبل میں نے امام احمد ؒ سے عذابِ قبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: اس بارے میں صحیح احادیث ہیں، ہمارا ان پر ایمان و اقرار ہے اور نبی کریم ﷺ سے جو بھی جید سند سے منقول ہے ہم اس کا اقرار کریں گے اگر رد کیا تو گویا اللہ کے اس فرمان کا رد کیا: ﴿وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾ (الحشر:٧) ''رسول (ﷺ) جو تمہیں دیں وہ لے لو۔'' میں نے ان سے کہا: اور کیا عذاب قبر حق ہے؟ فرمایا: حق ہے، انہیں قبروں میں عذاب دیا جائے گا، میں نے ابو عبداللہ کو فرماتے سنا: ہم ایمان لاتے ہیں عذاب قبر پر، منکر و نکیر کے وجود پر اور یہ کہ ہر بندے سے قبر میں سوال ہوگا، پس ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (إبراهيم:٢٧) ''اللہ دنیا و آخرت میں اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھے گا۔'' اسی طرح قبر کے بارے میں ہے، احمد بن قاسم ؒ کہتے ہیں: میں نے امام احمد ؒ سے پوچھا: کیا آپ منکر و نکیر اور جو عذابِ قبر کے بارے میں مروی ہے، کا اقرار کرتے ہیں؟ کہا: سبحان اللہ!

[1] صحیح، سنن أبي داود: ٢٥٢١.

بالکل اقرار ہے، پوچھا: منکر ونکیر کہیں یا فرشتے کہیں؟ کہا: منکر ونکیر کہو، میں نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں منکر ونکیر کا ذکر تو نہیں؟ کہنے لگے: وہ دونوں فرشتے یہی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: احمد بن حزم اور ابن ہبیرہ رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ یہ سوال صرف روح سے ہوں گے بغیر اس کے کہ اسے بدن کی طرف لوٹایا جائے، جمہور نے ان کی مخالفت کی اور کہا: روح جسم یا اس کے بعض (حصہ) کی طرف لوٹائی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ثابت ہے، اگر فقط روح سے ہوتے تب بدن کے لیے کوئی اختصاص نہ ہوتا اور یہ امر اس کا مانع نہیں کہ کسی بدن کے اجزاء متفرق ہو جائیں، کیونکہ اللہ قادر ہے کہ اس کے کسی بھی ایک جزو کی طرف حیات لوٹا دے اور اس پر ان سوالوں کا وقوع ہو جیسے اس کی قدرت میں ہے کہ اس کے تمام منتشر اجزا کو جمع کر لے، فقط روح پر وقوعِ سوال کے قائلین کے لیے اس کا باعث یہ بنا کہ کبھی اثنائے سوال (یعنی جب حدیث کے مطابق میت سے سوال ہوتے ہیں) میت کا جسد مشاہدہ کیا گیا تو اس کا کوئی اثر ملحوظ نہیں ہوا، مثلاً کہ بٹھایا گیا ہو اور نہ قبر کی تنگی اور فراخی وغیرہ، اسی طرح جو مقبور نہ ہوا، مثلاً: مصلوب (یا جو جلا دیا گیا) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قدرتِ الٰہی میں محال نہیں بلکہ اس عالم میں بھی اس کے لیے نظیر ہے، مثلاً: سویا ہوا شخص جو (عالم خواب میں) کئی دفعہ لذت پاتا یا الم کا شکار ہوتا ہے مگر ساتھ لیٹے ہوئے کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ کئی دفعہ بیدار شخص کو (اندرونی طور پر) کوئی الم یا لذت محسوس ہو رہی ہوتی ہے، اس کی کسی سوچ یا تفکیر کی بدولت مگر اس کا ساتھی اس کی اس حالت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے، یہ غلطی دراصل غائب کو شاہد پر اور مابعد الموت کے احوال کو قبل از موت کے احوال پر قیاس کرنے سے ہوئی اور بظاہر اللہ تعالیٰ بندوں کی ابصار اور اسماع اس کے مشاہدہ سے پھیر لیتا ہے اور اسے ان سے مستور کرتا ہے، تاکہ یہ نہ ہو کہ وہ مردے دفن کرنا ہی چھوڑ دیں (ایک حدیث میں بھی یہ بیان ہوا) ان دنیوی اعضا و جوارح میں ملکوتی امور کے ادراک کی صلاحیت نہیں، مگر جسے اللہ چاہے۔ جمہور کی رائے کی موافقت احادیث سے ملتی ہے، جیسے آپ کا فرمان ہے کہ ''مردہ ان کے قدموں کی چاپ سنتا ہے'' اور فرمایا: ''بداعمال شخص کی قبر اسے بھینچتی ہے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں کھب جاتی ہیں۔'' ایک روایت میں ہے کہ ''جب اس پر ہتھوڑا برسایا جاتا ہے تو اس کی آواز سنی جاتی ہے'' اور فرمایا: ''اس کے کانوں کے درمیان مارا جاتا ہے اور دونوں فرشتے اسے آکر بٹھاتے ہیں'' تو یہ سب اجساد کی صفات میں سے ہیں۔

ذیل میں ان صحیح احادیث میں سے بعض پیش کی جاتی ہیں:

① مسلم نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی نجار کے ایک باغ میں اپنے خچر پر بیٹھے تھے اور ہم آپ کے ہمراہ تھے کہ خچر بدکا اور قریب تھا کہ آپ کو گرا دے، وہاں چھ، پانچ یا چار قبور تھیں، فرمایا: ''ان قبر والوں کو کون جانتا ہے؟'' ایک شخص نے کہا: میں، فرمایا: ''یہ کب فوت ہوئے؟'' کہا: اَشراط میں، فرمایا: ''یہ امت اپنی قبور میں ابتلاء میں ڈالی جاتی ہے، اگر یہ خدشہ نہ ہو کہ تم دفن کرنا چھوڑ دو تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تمہیں عذابِ قبر سنائے، جو میں سنتا ہوں'' پھر چہرۂ اقدس ہماری

طرف کر کے فرمایا: ''عذابِ نار سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے یہی کیا: تو فرمایا: ''اب عذابِ قبر سے تعوذ کرو۔'' لوگوں نے تعوُّذ کیا تو فرمایا: ''اللہ سے ہر ظاہر و باطن فتنوں سے تعوذ کرو۔'' لوگوں نے کیا تو فرمایا: ''اب دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے یہ بھی کیا۔[1]

② بخاری اور مسلم نے قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بندہ اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی چلے جاتے ہیں اور وہ ان کے جوتوں کی ٹپ ٹپ سنتا ہوتا ہے تو دو فرشتے آ کر اسے بٹھاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں: اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو جو مومن ہے وہ کہتا ہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس پر وہ کہیں گے: ادھر دیکھو وہ آگ میں رہا تمہارا ٹھکانہ، جسے اللہ نے بدل کر جنت میں تمہارا مقام بنا دیا ہے، اس کی جھلک بھی اسے دکھلائیں گے اور جو کافر اور منافق ہے تو اس سے جب یہی سوال کریں گے تو وہ کہے گا: میں نہیں جانتا، میں تو وہی کہتا رہا جو (میرے جیسے) لوگ کہا کرتے تھے تو فرشتے کہیں گے: افسوس! نہ خود جانا اور نہ کسی عالم سے ہی پوچھا، پھر لوہے کے ہتھوڑوں سے اسے ایسی ضربیں لگائیں گے جس سے اس کی ایسی چیخ نکلے گی کہ سوائے جن و انس کے سب آس پاس کی مخلوق سنے گی۔''[2]

③ بخاری، مسلم اور اصحابِ سنن نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں سے جب سوالِ قبر ہوتا ہے تو وہ کلمہ پڑھ کر سناتا ہے تو اسی طرف اللہ کا یہ فرمان اشارت کناں ہے: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا . . .﴾ الخ (ابراھیم: ٢٧) ''اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، پختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔'' ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت عذابِ قبر کے بارے نازل ہوئی ہے، صاحبِ قبر سے کہا جاتا ہے: تمہارا رب کون ہے؟ تو وہ (یعنی مومن) کہتا ہے: اللہ میرا رب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے نبی تو یہی ہے جو اللہ نے فرمایا: ﴿يُثَبِّتُ . . .﴾ الخ''[3]

④ مسند احمد اور صحیح ابو حاتم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میت جب قبر میں ڈال دی جاتی ہے تو وہ اہلِ جنازہ کے قدموں کی چاپ سنتی ہے جب واپس جاتے ہیں، اگر مومن (باعمل) تھی تو نماز اس کے سر کے پاس، روزہ اس کے دائیں طرف، زکاۃ اس کے بائیں طرف اور دیگر اعمالِ خیر مثلاً: صدقہ، صلہ رحمی، حسنِ سلوک اور حسنِ خلق وغیرہ اس کے قدموں کے پاس جمع ہو جاتے ہیں، سر کی طرف سے آیا جائے تو نماز کہتی ہے: میری طرف سے مدخل نہیں، اسی طرح باقی جہات کے اعمالِ صالحہ بھی تو اسے کہا جاتا ہے، بیٹھ جاؤ، وہ میت بیٹھ جاتی ہے، اس کے لیے ایسا منظر کر دیا جاتا ہے کہ گویا سورج غروب ہونے کو ہے، تو پوچھا جاتا ہے، تم میں جو ایک صاحب تھے تم ان کی بابت کیا کہتے ہو اور کس امر کی گواہی دیتے ہو؟ وہ کہتا ہے: پہلے مجھے نماز (عصر) پڑھ لینے دو! وہ کہتے ہیں: کوئی بات نہیں، پڑھ لو گے پہلے ہمارے سوال کا جواب دے دو تو وہ کہے گا: وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے تو اس سے کہا جائے گا:

---

① صحیح مسلم: ٢٨٦٧. ② صحیح البخاری: ١٣٣٨؛ صحیح مسلم: ٢٨٧٠. ③ صحیح البخاری: ٤٦٩٩؛ صحیح مسلم: ٢٨٧١.

اسی پر تم نے زندگی گزاری، اسی پر موت واقع ہوئی اور اسی پر ان شاء اللہ اٹھائے جاؤ گے، پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: یہ تمہارا جنت کا ٹھکانہ ہے اور جو اللہ نے تمہارے لیے اس میں تیار کیا ہے تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، پھر اس کی قبر ستر گز وسیع اور منور کر دی جاتی ہے اور جسم اسی حالت میں کر دیا جاتا جیسے تھا اور اس کی روح نسیمِ طیب میں کر دی جاتی ہے جو جنت کے درخت میں معلق ایک پرندہ تو یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُثَبِّتُ . . . ﴾ الخ" کافر کے بارے اس کا عکس ذکر کیا حتی کہ فرمایا: "اس کی قبر اتنی تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں کھب جاتی ہیں" تو یہ ہے وہ معیشتِ ضنک جس کا ذکر اس آیت میں ہوا: ﴿ فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَّنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى ﴾ (طٰہٰ: ۱۲٤) "اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔"[1]

⑤ صحیح بخاری میں سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اکثر نماز (صبح) کے بعد چہرۂ اقدس ہماری طرف کرتے اور پوچھتے: "کیا آج رات کسی کو کوئی خواب آیا؟" اگر کسی کو آیا ہوتا تو وہ بیان کرتا حتی کہ آپ جو اللہ چاہتا اس کی تعبیر بیان کرتے، ایک دن حسبِ معمول یہی پوچھا، صحابہ نے کہا: جی نہیں! آپ نے فرمایا: "مگر میں نے آج شب دو اشخاص کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ایک مقدس زمین میں لے گئے، یکا یک میں وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی بیٹھا ہے اور دوسرا آدمی ہاتھ میں لوہے کا ایک آنکڑا لیے کھڑا ہے، وہ اسے اس بیٹھے ہوئے آدمی کے منہ میں داخل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گدی تک پہنچ جاتا ہے تو اس سے ایک طرف کا جبڑا اپھاڑ دیتا ہے، اس کے بعد دوسرے جبڑے کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتا ہے اور اس کا پہلا جبڑا صحیح ہو جاتا ہے، پھر دوبارہ وہ ایسا ہی کرتا ہے، میں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو ان دونوں نے مجھے جواب دیا کہ آگے چلیے۔ یہاں تک کہ ہم ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے کہ وہ چت لیٹا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے سرہانے ایک چھوٹا یا بڑا پتھر لیے ہوئے کھڑا تھا پس وہ اس پتھر سے اس لیٹے ہوئے آدمی کے سر کو پھوڑتا تھا۔ جب اسے مارتا اور پتھر لڑھک جاتا تو جا کر اس کو اٹھا لیتا اور جب تک اس لیٹے ہوئے آدمی کے پاس واپس آتا اُس وقت تک اُس کا سر ٹھیک ہو چکا ہوتا اور جو حالت اس کی پہلے تھی وہی ہو جاتی تھی پس وہ دوبارہ اسے مارتا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ آگے چلیے! چنانچہ ہم چلے تو ایک گڑھے کے پاس سے ہمارا گزر ہوا وہ مثل تنور کے تھا منہ اس کا تنگ تھا اور پیندا چوڑا، اس گڑھے میں آگ جل رہی تھی اس کے اندر کچھ برہنہ مرد اور عورتیں تھیں جب آگ بہت بھڑک اٹھتی تو وہ لوگ اٹھ جاتے یہاں تک کہ نکلنے کے قریب ہو جاتے، میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ آگے چلیے! چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ خون کی ایک نہر پر پہنچے جس کے درمیان ایک آدمی تھا اور نہر کے کنارے پر بھی ایک آدمی تھا جس کے سامنے کچھ پتھر تھے اور وہ نہر والے شخص کے سامنے کھڑا ہوا تھا، پس جب وہ اس نہر سے باہر نکلنا چاہتا تو یہ شخص ایک پتھر اس کے منہ پر کھینچ کے مارتا تو وہ جہاں تھا وہیں واپس ہو جاتا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو ان

---

[1] حسن، صحيح ابن حبان: ۳۱۱۳؛ مصنف عبدالرزاق: ٦٧٠٣.

دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلیے! چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ ایک نہایت شاداب اور سرسبز باغیچہ میں پہنچے، اس میں ایک بڑا سا درخت لگا ہوا تھا اس کی جڑ کے پاس ایک بوڑھا آدمی اور کچھ بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک میں کیا دیکھتا ہوں کہ درخت کے قریب ایک آدمی ہے، جس کے سامنے کچھ آگ ہے، وہ اسے روشن کر رہا ہے، پھر وہ دونوں مجھے اس درخت پر چڑھا لے گئے۔ اس درخت کے اندر ایک گھر تھا، اس میں مجھے داخل کیا میں نے کبھی اس سے عمدہ اور شاندار مکان نہیں دیکھا، اس گھر میں کچھ بوڑھے، کچھ جوان، کچھ عورتیں اور کچھ بچے تھے، پھر وہ دونوں آدمی مجھے اس گھر سے نکال لائے اور درخت کی دوسری شاخ پر مجھے چڑھایا۔ اس میں بھی ایک گھر تھا، اس میں مجھے داخل کیا گیا یہ گھر بھی نہایت عمدہ اور شاندار تھا اس میں بھی کچھ بوڑھے اور جوان مرد تھے۔

جب میں یہ سب کچھ دیکھ چکا تو میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ تم نے مجھے رات بھر گشت کرایا، اب بتاؤ کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بتاتے ہیں: وہ شخص جس کو آپ نے دیکھا کہ اس کا جبڑا پھاڑا جا رہا ہے تو وہ جھوٹا ہے دنیا میں جھوٹی باتیں کیا کرتا تھا جو اس سے نقل کی جاتی تھیں، یہاں تک کہ تمام اطراف عالم میں پہنچ جاتی تھیں، لہٰذا اس کیساتھ روزِ قیامت تک ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا اور وہ شخص جس کو آپ نے دیکھا کہ اس کا سر پھوڑا جا رہا ہے تو یہ وہ شخص ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا تھا، مگر وہ رات کو بھی اس سے غافل ہو کر سو جاتا اور دن میں بھی اس پر عمل نہ کرتا، لہٰذا روزِ قیامت تک اس کے ساتھ اسی طرح کیا جائے گا۔ اور وہ لوگ جنہیں آپ نے گڑھے میں دیکھا تو وہ زنا کار لوگ ہیں اور وہ شخص جس کو آپ نے نہر میں دیکھا سود خور ہے اور وہ بوڑھے صاحب جو درخت کی جڑ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تھے اور چھوٹے بچے جو اُن کے گرد تھے، وہ بچے ہیں جو قبل از بلوغت فوت ہو گئے تھے اور وہ شخص جو آگ روشن کر رہا تھا، مالک فرشتہ تھا جو دوزخ کا داروغہ ہے۔ اور وہ پہلا مکان جس میں آپ تشریف لے گئے تھے، عام مسلمانوں کا گھر ہے اور دوسرا گھر شہیدوں کا ہے اور میں جبرائیل ہوں اور یہ میکائیل ہے، اب آپ اپنا سر اٹھایئے! میں نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے اوپر بادل کی مانند کوئی چیز ہے، انہوں نے بتایا کہ یہ آپ کا مقام ہے، میں نے کہا کہ مجھے اپنے مقام میں داخل ہونے دو تو ان دونوں نے کہا کہ ابھی کچھ عمر آپ کی باقی ہے، جسے آپ نے پورا نہیں کیا: اگر آپ اسے پورا کر چکے ہوتے تو اپنے مقام میں جا سکتے تھے۔''[1] امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ عذابِ قبر کے بارے نص ہے، بے شک انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے اور نفس امر کے مطابق ہوتا ہے۔

⑥ طحاوی نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی کے بارے حکم ہوا کہ اسے قبر میں سو کوڑے مارے جائیں، وہ اللہ سے دعا کرنا اور معافی مانگنا شروع ہوا، حتی کہ سو کی بجائے ایک مارنے کا حکم ہوا تو اس کی قبر آگ سے بھر گئی، جب یہ حالت ختم ہوئی اور وہ ہوش میں آیا تو پوچھا: مجھے کیوں کوڑا مارا؟ جواب ملا: کیونکہ تم نے ایک نماز بغیر وضو کے پڑھی تھی اور ایک مظلوم سے تمہارا گزر ہوا مگر تم نے اس کی مدد نہ کی تھی۔''[2]

---

[1] صحیح البخاری: ١٣٨٦۔ [2] صحیح، الترغیب الترھیب: ٣٣٠٣۔

⑦ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبر سے آواز سنی تو پوچھا: ''یہ کب فوت ہوا؟'' کہا: جاہلیت میں، اس پر آپ کو خوشی ہوئی، فرمایا: ''اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم دفن کرنا چھوڑ دو تو اللہ سے دعا کرتا کہ تمہیں عذابِ قبر سنوایا کرے۔''[1] اسے نسائی اور مسلم نے روایت کیا۔

⑧ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ جس کے لیے عرش ہل گیا (یعنی سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ) اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور اس کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے، اسے قبر نے ایک دفعہ بھینچا، پھر وہ اس کیفیت سے نکلا۔''[2] اسے بخاری، مسلم اور نسائی نے تخریج کیا۔

ارواح کا ٹھکانہ

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایک فصل باندھی ہے، جس میں ارواح کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: کہا گیا ہے کہ عالمِ برزخ میں ارواح کے ٹھکانے باہم بہت متفاوت ہیں، کچھ روحیں اعلیٰ عِلّیین ملاء الاعلیٰ میں ہوتی ہیں اور یہ انبیاء کی ارواح مبارکہ ہیں، پھر ان کے لیے بھی مزید ذیلی تفاوت ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شبِ اسراء میں دیکھا تھا، بعض ارواح سبز رنگ کے پرندوں کے قوالب میں ہیں جو جنت میں جہاں چاہیں کھاتے پھرتے ہیں (بقول محشی یہ ایک حدیث کا مفہوم ہے)، (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے بدر کے بارے میں یہ خبر دی تھی، مترجم) اور یہ بعض شہداء کی ارواح ہیں نہ کہ سب کی بلکہ کئی شہداء تو ایسے ہو سکتے ہیں جن کی ارواح کو جنت میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے، مثلاً کہ اس کے ذمہ قرض ہو، مسند میں سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو میرے لیے کیا ہے؟ فرمایا: ''جنت۔'' جب وہ پھرا تو آپ نے فرمایا: ''لیکن اگر قرض ہے تب نہیں، یہ بات ابھی مجھے جبریل نے سرگوشی کرتے ہوئے بتلائی ہے۔''[3] بعض ان میں سے جنت کے دروازے پر روک دیے جائیں گے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ نے (کسی صحابی کے بارے) فرمایا تھا: ''میں نے تمہارے ساتھی کو بابِ جنت کے پاس روکا ہوا دیکھا ہے۔''[4] ان میں سے بعض اپنی قبر ہی میں روک دیے جاتے ہیں، جیسے بغیر اجازت (مالِ غنیمت میں سے) شملہ اٹھانے والے کے بارے حدیث میں ہے جو بعد ازاں شہید ہو گیا تھا تو لوگوں نے کہا: اسے جنت مبارک ہو! مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو شملہ اس نے بغیر اجازت اٹھا لیا تھا، وہ اس کی قبر میں اس پر آگ روشن کر رہا ہے۔''[5] ان میں سے کچھ کا ٹھکانہ (یعنی عالمِ برزخ میں) بابِ جنت ہے، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ ''(بعض) شہداء جنت کے دروازے پر ایک نہر کے کنارے ہیں اور وہیں جنت سے صبح و شام ان کا رزق انہیں دیا

---

① صحیح مسلم: ۲۸۶۸؛ سنن نسائی: ٤/ ۱۰۲. ② سنن نسائی: ٤/ ۱۰۰، ۱۰۱. ③ صحیح، صحیح ابن حبان: ٤٦٥٤. ④ صحیح، مسند الطیالسی: ۹۳۲؛ مسند أحمد: ۲۰۲۲۲. ⑤ صحیح مسلم: ۱۱٥.

جاتا ہے۔''[1] اسے احمد نے نقل کیا اور یہ بخلاف سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے (جن کے جنگ مؤتہ میں دونوں بازو کٹ گئے تھے اور وہ شہید ہوئے) کہ اللہ'' نے ان کے بازوؤں کے بدلے انہیں دو پر لگادیے جن کے ساتھ وہ جنت میں جہاں چاہیں اڑتے پھرتے ہیں'' (یہ بھی ایک حدیث میں بیان ہوا)۔

بعض زمین ہی روک لیے جاتے ہیں اور ان کی ارواح ملا الاعلی کی طرف نہیں اٹھتیں تو یہ سفلی ارضی روحیں ہوتی ہیں تو ارضی نفوس سماوی نفوس کے ہمسر اور ساتھی نہیں بن سکتے، جیسے دنیا میں بھی نہ تھے، جس نفس نے دنیا میں اپنے رب کی معرفت، محبت، اس کے ساتھ اُنس اور اس کی طرف تقرّب کا اکتساب نہ کیا وہ ارضی سفلی ہے، وہ بدن سے مفارقت کے بعد بھی زمین میں ہی رہتی ہیں، جیسا کہ نفسِ علویہ جو دنیا میں اللہ کی محبت اور اس کی یاد پر قائم رہی اور اس کے ساتھ انس اور اس کی طرف تقرب اس کی کوششوں کا محور رہا، وہ مفارقت کے بعد علوی ارواح کے ساتھ ہوگی، کیونکہ برزخ میں اور قیامت میں آدمی انہی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ برزخ میں اور معاد کے دن نفوس کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے گا اور مومن کی روح کو پاکیزہ ارواح والوں کے ساتھ کرے گا یعنی ارواحِ طیبہ جو اسی جیسی تھیں تو بدن سے جدا ہونے کے بعد روح اپنے جیسی روحوں کے ساتھ ہوگی جن کا عمل اسی جیسا تھا۔ پھر کئی ارواح آگ بھرے تنور میں ہوں گی، یہ زانی مرد و خواتین، کچھ خون کی نہر میں تیرتی رہیں گی اور ان کے منہ میں پتھر ٹھونسے جائیں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں سعید و شقی ارواح کا مقام و مستقر ایک نہیں، اگر اس باب کی روایات و آثار میں تأمل کرو تو سب مذکور کی حجت جان لو گے، انہیں پڑھ کر باہم متعارض نہ سمجھو، بلکہ یہ تفاوتِ درجات ہے تو یہ سب حق ہیں اور ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں، یہ بات واضح ہے کہ ارواح کی وہ حالت نہیں ہوتی جو ابدان کی ہوتی ہے تو یہ جنت میں ہونے کے باوجود آسمان میں بھی ہیں، پھر (بارہا) قبر میں ان کا بدن کے ساتھ اتصال ہوتا ہے، ان کا آنا جانا لمحہ بھر میں طے ہوتا ہے اور یہ مرسل (یعنی آزاد چھوڑی گئی کہ جدھر چاہیں رخ کریں) محبوس، علوی اور سفلی ارواح میں منقسم ہیں، مفارقت کے بعد ان کے لیے صحت و مرض بھی ہے اور اسی طرح لذت، نعیم اور الم کے احوال بھی، تو ادھر حبس، الم، عذاب، مرض اور حسرت بھی ہے اور اسی طرح لذت، راحت، نعیم اور آزادی سے گھومنا پھرنا بھی، اِس بدن میں موجودگی میں ان کا حال والدہ کے پیٹ میں بدن کی موجودگی کے حال سے مشابہ ہے اور مفارقت کے بعد ان کا حال بچے کے رحم سے عالمِ دنیا میں جنم لینے کے حال سے مشابہ ہے تو یوں ان انفس کے لیے چار ادوار ہیں اور ہر دور سابقہ دور کی نسبت اعظم ہے۔

پہلا دور

یہ والدہ کا بطن ہے (میرے خیال میں پہلا دور یہ نہیں بلکہ عالمِ ارواح ہے یعنی والدہ کے پیٹ میں ہونے سے پہلے کا دور، کیونکہ اللہ نے تمام ارواح کو پہلے ہی سے تخلیق کر رکھا ہے) اور یہ محصوری، تنگی، غم اور تہہ در تہہ تین اندھیرے ہیں۔

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ١/ ٢٦٦؛ صحیح ابن حبان: ٤٦٣٩.

دوسرا دور

یہ دار (یعنی دارِ دنیا) جس میں اس کی نشوونما ہوئی، اس سے الفت و انسیت ہوئی اور اس میں خیر و شر کا اکتساب کیا، اسی طرح اسبابِ سعادت اور شقاوت کا۔

تیسرا دور

یہ عالمِ برزخ کا دور ہے جو دارِ دنیا سے اوسع اور اعظم ہے بلکہ یہ اس کی نسبت سے ایسے ہے جیسے وہ اول (یعنی مؤلف کی رائے میں والدہ کا رحم) کی نسبت ہے۔

چوتھا دور

یہ دار القرار ہے جو یا تو جنت ہے اور یا جہنم، اس کے بعد کوئی دار اور دَور نہیں، اللہ ہر ایک کو طبق در طبق ان ادوار میں منتقل کرتا ہے، حتی کہ وہ اس آخری ٹھکانہ تک جا پہنچتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہے اور اس کے سوا کچھ اور اس کے لائق نہیں، وہ اسی کے لیے تخلیق ہوا اور اس تک موصل اعمال اس کے لیے میسر کیے گئے، روح کے لیے ان میں سے ہر دار و دَور میں ایک حکم و حالت ہے جو دیگر دار و دَور میں نہیں، پس بابرکت ہے اللہ کی ذات جو ان (ارواح) کا فاطر، منشئ، محیی و مُمیت ہے اور سعید و شقی بنانے والا ہے، پھر سعادت و شقاوت کے بھی مراتب ہیں، جو باہم متفاوت ہیں، جیسے دنیا میں بھی انسان علوم، اعمال، قویٰ اور اخلاق کے لحاظ سے باہم متفاوت تھے تو جو ان کی حقِ معرفت رکھتا ہے وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے، سب کچھ اس کی مِلک ہے، سب حمد اسی کے لیے ہے، ساری خیر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہی ہر امر کا مرجع ہے، سب قوت اسی کی، قدرت اور عزت بھی سب اسی کی، اسی طرح حکمت، تمام وجوہ سے مطلق کمال بھی اسی کے ہی شایانِ شان ہے، سعید انسان معرفتِ نفس سے اللہ کے انبیاء و رسل کے صدق کی پہچان کرتا ہے اور یہ کہ جو (احکام و تعلیمات) وہ لائے وہ سب برحق ہیں، فطرتِ سلیمہ اس کے برحق ہونے پر گواہ ہے اور اس کا برخلاف باطل ہے۔

ذِکر کے مسائل

ذکر کی شرعی تعریف

وہ جو زبان و دل پر اللہ کی تسبیح، تقدیس و تنزیہہ، حمد، ثنا اور صفاتِ کمال اور نعوتِ جلال و جمال کے ساتھ موصوف کرنے والے کلمات جاری ہوں۔

① اللہ نے کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیا چنانچہ فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ○ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴾(الأحزاب:٤١، ٤٢)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو۔''

② ایک آیت میں خبر دی کہ جو اس کا ذکر کرتا ہے تو اللہ اس کا ذکر کرتا ہے: ﴿ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ ﴾(البقرة: ١٥٢) ''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔'' بخاری اور مسلم کی تخریج کردہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ ''میں اپنے ساتھ اپنے بندے کے ظن و گمان کے مطابق ہوتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر دل میں میرا ذکر کرے تو میں بھی اپنے دل میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر برسرِ مجلس یہ کرے تو میں اس کی مجلس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر میری طرف ایک بالشت بڑھے تو میں ایک گز اس کی جانب بڑھتا ہوں، اگر ایک گز بڑھے تو میں ایک باع (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار) پیش قدمی کرتا ہوں، اگر کوئی میری طرف عام رفتار سے چلتا آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔''[①]

③ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ذکر کو تفرُّد اور سبقیت کے ساتھ مختص کیا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ» ''مفردین بازی لے گئے۔'' عرض کی: یہ مفردین کون ہیں؟ فرمایا: ''کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد و خواتین۔''[②] اسے مسلم نے نقل کیا۔

④ ذکر کرنے والے ہی حقیقۃً زندہ ہیں، سیدنا ابوموسی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص کی مثال جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا زندہ اور مردہ کی سی ہے۔''[③] اسے بخاری نے نقل کیا۔

⑤ ذکر صالح اعمال میں سرِ فہرست ہے جسے اس کی توفیق ملی وہ ولایت کا منشور دیا گیا، اسی لیے نبی کریم ﷺ اپنے تمام اوقات و احوال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے، ایک صحابی نے عرض کی: اسلام کی شرائع تو بہت سی ہیں مجھے کوئی ایسی چیز/عمل بتائیں

---

① صحيح البخاري: ٧٤٠٥؛ صحيح مسلم: ٢٦٧٥. ② صحيح مسلم: ٢٦٧٦. ③ صحيح البخاري: ٦٤٠٧.

جسے اپنا وظیفہ اور معمول بنالوں، فرمایا: ''تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔''[1] آپ صحابہ سے فرمایا کرتے تھے: ''کیا تمہیں بہترین عمل کی بابت نہ بتلاؤں؟ جو تمہارے مالک کے نزدیک اَز کی (نہایت طیب) اور درجات کی رفعت میں مؤثر ترین ہے اور تمہارے لیے سونا چاندی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے سے بھی بہتر اور اس امر سے بھی کہ دشمنوں سے تمہاری مڈ بھیڑ ہو کہ تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری؟'' عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: ''اللہ کا ذکر۔''[2] اسے ترمذی، احمد اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔

⑥ ذکر نجات کی سبیل ہے، چنانچہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے ذکر سے بڑھ کر اس کے عذاب سے نجات دینے والا عمل کوئی نہیں۔''[3] اسے احمد نے نقل کیا۔

⑦ انہی کے ہاں ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تم جو تکبیر، تہلیل اور تحمید وغیرہ اللہ کا ذکر کرتے ہو، وہ عرشِ الٰہی کے گرد ناز سے چلتا ہے اور اس کی شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناہٹ ہوتی ہے، اہلِ ذکر کی یاد کراتی ہیں، کیا تمہیں پسند نہیں کہ کوئی تمہاری یاد تازہ کرنے والا ہو؟''[4]

ذکرِ کثیر کی حد

اللہ تعالیٰ نے (قرآن میں) حکم دیا ہے کہ اس کا ذکرِ کثیر کیا جائے، چنانچہ کہا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ عقل والوں کا وصف یہ بیان کیا کہ جو اس کی آیات میں تأمل کے ساتھ منتفع ہوتے ہیں اور وہ ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

''جو قیام، قعود اور پہلو کے بل (غرض ہر کیفیت و حالت میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔''

اور کہا: ﴿ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (الأحزاب:۳۵)

''کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد و خواتین کے لیے اس نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

بقول امام مجاہد رحمہ اللہ کوئی اس صفت پر پورا نہ اترے گا، مگر جب کھڑا، بیٹھا اور لیٹا ہوا (غرض ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرے، ابن صلاح رحمہ اللہ سے اس مقدار کے بارے پوچھا گیا کہ جب وہ حاصل ہو تو وہ اللہ کا ذکرِ کثیر کرنے والا شمار ہو تو کہا: جب ثابت منقول و مأثور اذکار پر ہمیشگی کرے، صبح و شام اور رات و دن کے مختلف اوقات و احوال میں۔ علی بن ابوطلحہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیات کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر کوئی فریضہ مقرر نہیں کیا مگر اس کے لیے ایک معلوم حد مقرر کی ہے، جس تک وہ منتہی ہے اور اس کے ترک کی کسی کو رخصت نہیں دی، ماسوائے اس کے جو اس کے ترک پر

---

① صحیح، سنن ابن ماجہ: ۳۷۹۳. ② صحیح، سنن ترمذی: ۳۳۷۷؛ سنن ابن ماجہ: ۳۷۹۰. ③ صحیح، مسند أحمد: ۵/ ۲۳۲؛ المعجم الصغیر للطبرانی: ۱/ ۷۴. ④ صحیح، سنن ابن ماجہ: ۳۸۰۹؛ مسند أحمد: ۴/ ۲۷۱.

مغلوب ہو تو فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ (النساء: ۱۰۳) رات ہو یا دن، برّ و بحر، سفر و حضر، غنیٰ و فقر، صحت و مرض، سراً اور علانیۃً اور ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو۔

ہر اطاعت ذکر ہے

سیدنا سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کوئی بھی عملِ اطاعت کرنے والا (گویا) اللہ کا ذکر کر رہا، بعض سلف نے اس عام کو مخصص کرنا چاہا، تو ذکر کو اس کی بعض انواع پر مقصور کیا، ان میں عطاء رحمہ اللہ ہیں جو کہتے ہیں مجالسِ ذکر یہ مجالسِ حلال و حرام ہیں خرید و فروخت اور نماز و روزہ، نکاح و طلاق اور حج اور ان جیسے اعمال (ان کی تعلیم و تعلم)، قرطبی نے کہا: مجلسِ ذکر یعنی مجلسِ علم و تذکیر اور یہ وہ مجالس جن میں اللہ کی کلام اور اس کے رسول کی سنت ذکر کی جاتی ہے اور سلف صالحین اور زاہدوں کے واقعات سنائے جاتے ہیں اور جو تصنّع اور بدعات سے مبرا اور طمع اور سطحی مقاصد سے پاک ہوں۔

ذکر کے آداب

ذکر سے مقصود نفوس کا تزکیہ، قلوب کی تطہیر اور ضمیر کا ایقاظ (جگانا، روحانی ترقی) ہے، اسی طرف یہ آیت اشارت کناں ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (العنکبوت: ۴۵)

''اور نماز قائم کر، بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔''

یعنی بے حیائی اور برے کاموں سے بچانے اور روکنے میں اللہ کا ذکر نماز سے اکبر ہے (یعنی اس کا کردار نماز سے بھی بڑا ہے) یہ اس لیے کہ جب ذاکر اللہ کے ذکر سے اپنی زبان تر رکھتا ہے، تو اللہ اپنے نور کے ساتھ اسے نوازتا ہے، تو اس کے ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کا دل حق کا مسکن اور اس کے ساتھ مطمئن ہوتا ہے، فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد: ۲۸)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں، سن لو! اللہ کے ذکر سے دلوں میں اطمینان آتا ہے۔''

جب دل حق کے لیے ہوتا ہے تو وہ مثلِ اعلیٰ کی جانب پیش قدمی کرتا اور اس کی راہ کا سالک بنتا ہے اور خواہشات وشہوات اسے اس راہ سے ہٹا نہیں سکتیں، اسی وجہ سے ذکر و اذکار کرنے کا بڑا مقام اور انسانی زندگی میں اس کا اہم کردار ہے! یہ باور کرنا غیر معقول ہوگا کہ یہ نتائج مجرد نوکِ زبان پر سطحی طور سے کوئی سے الفاظ جاری کرنے سے حاصل ہو جائیں! جب تک دل کی موافقت اور توجہ حاصل نہ ہو، فقط زبان کی حرکت زیادہ مفید نہیں (بقولِ شاعر: زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں) اللہ تعالیٰ نے اثنائے ذکر ذاکر کی حالت کیا ہو، اس کے بارے ایک ادب یہ بتلایا:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾
(الأعراف:٢٠٥)

''اور اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے صبح وشام یاد کرتے رہو اور غافل نہ ہونا۔''

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ذکر کا سراً ہونا زیادہ مستحب ہے کہ آوازیں اس کے ساتھ زیادہ بلند نہ ہوں، نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو سنا کہ ایک سفر میں بآوازِ بلند دعائیں کر رہے ہیں، تو فرمایا: اے لوگو: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اِرْبِعُوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ» اے لوگو! اپنے آپ پر قابو رکھو۔ کہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، وہ تو قریب ہے اور سنتا ہے، وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی تم سے اقرب ہے۔''[1] اسی طرح حالتِ رغبت ورہبت کا اشارہ دیتی ہیں، جو انسان کی ذکر کرتے وقت حالت ہونی چاہیے۔

ذکر کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ ذاکر کا لباس صاف، بدن پاک اور پاکیزہ خوشبو والا ہونا چاہیے، اس سے نفس میں چستی پیدا ہوتی ہے پھر ہر ممکن حد تک قبلہ رو ہونے کی کوشش کرے کہ بہترین مجالس وہ ہیں جو قبلہ رخ ہوں۔

مجالسِ ذکر میں اکٹھے بیٹھنے کا استحباب

ذکر کے حلقوں میں بیٹھنا مستحب ہے، اس بارے میں درج ذیل روایات وارد ہیں:

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارا جنت کے باغیچوں سے گزر ہو، تو تم بھی مستفید ہوا کرو، عرض کی: ریاضِ جنت کیا ہیں؟ فرمایا: ''ذکر کے حلقے۔''[2] فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں بعض اس امر پر مقرر ہیں کہ وہ ذکر کے حلقوں کی تلاش وجستجو میں زمین بھر میں چلتے پھرتے ہیں، جب کسی جگہ اسے پاتے ہیں تو وہاں بیٹھنے والوں کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں۔''[3]

② مسلم نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کے ایک حلقہ کی طرف آئے اور پوچھا: ''کس چیز نے تمہیں یہاں بٹھائے رکھا ہے؟'' عرض کی: اسلام کی ہدایت دینے اور اس احسان پر اللہ کا ذکر کرنے اور اس کی حمد کرنے بیٹھے ہیں، فرمایا: ''قسم اٹھاؤ کہ اسی غرض نے تمہیں یہاں بٹھائے رکھا ہے؟'' پھر فرمایا: ''میں تم پر شک کی وجہ سے قسم نہیں اٹھوا رہا، بلکہ مجھے ایک آنے والے (فرشتہ) نے خبر دی ہے کہ اوپر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے تمہارا فخریہ ذکر کر رہا ہے۔''[4]

③ سیدنا ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی قوم اللہ کا ذکر کرنے نہیں بیٹھتی مگر فرشتے ان پر اپنے پر پھیلا دیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی اور سکینت ان پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ہاں ان کا تذکرہ کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري: ٦٣٨٤؛ صحيح مسلم: ٢٧٠٤. [2] حسن، سنن ترمذي: ٣٥١٠. [3] صحيح مسلم: ٢٦٨٩.
[4] صحيح مسلم: ٢٧٠٠؛ سنن ترمذي: ٣٣٧٥. [5] صحيح مسلم: ٢٧٠٠؛ سنن ترمذي: ٣٣٧٥.

اخلاص سے لا إله إلا الله کا ذکر کرنے والے کی فضیلت

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی نے اخلاص کے ساتھ کبھی لا اله الا اللہ نہیں کہا مگر اس (ذکر) کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ عرش تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے، اگر یہ ذکر کرنے والا کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔''[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن غریب ہے۔

② انہی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو۔'' کہا گیا: یا رسول اللہ! یہ کس طرح ہو؟ فرمایا: ''لا اله الا اللہ کا کثرت سے ورد کرو۔''[2] اسے احمد نے حسن سند سے نقل کیا۔

③ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''افضل ذکر لا اله الا اللہ اور افضل دعا الحمد للہ ہے۔''[3] اسے نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: صحیح الاسناد ہے۔

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر وغیرہ اذکار کی فضیلت

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو جملے ہیں جو زبان پر ہلکے، میزان میں بھاری اور رحمن کو پیارے ہیں۔'' یہ ہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ»[4] اسے شیخین اور ترمذی نے نقل کیا،

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتے ہیں: ''میرا سبحان اللہ، الحمد للہ، لا اله الا اللہ اور اللہ اکبر کہنا ان سب سے بہتر ہے، جن پر سورج طلوع ہوا۔''[5] اسے مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تمہیں اللہ کو محبوب ترین کلام کی خبر نہ دوں؟'' عرض کی: بتلائیں، فرمایا: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ»[6] اسے مسلم اور ترمذی نے نقل کیا، ان کے ہاں مذکور ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کے (ذکر کے) لیے یہ کلمات منتخب کیے ہیں: «سُبْحَانَ رَبِّيْ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيْ وَبِحَمْدِهٖ»

④ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے «سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ» کہا، اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دیا گیا۔''[7] اسے ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا۔

⑤ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''باقیات صالحات کا استکثار کیا کرو۔'' عرض کی گئی: وہ کیا ہیں؟ فرمایا: ''تکبیر، تہلیل، تسبیح، الحمد للہ اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔''[8] اسے نسائی اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: سند صحیح ہے۔

---

[1] حسن، سنن ترمذی: ۳۵۹۰. [2] ضعیف، مسند أحمد: ۲/ ۳۵۹. [3] حسن، سنن ترمذی: ۳۳۸۰؛ سنن ابن ماجه: ۳۸۰۰. [4] صحیح البخاری: ۷۵۶۳. [5] صحیح مسلم: ۲۶۹۵؛ سنن ترمذی: ۳۵۹۱. [6] صحیح مسلم: ۲۷۳۱؛ سنن ترمذی: ۳۵۸۷. [7] صحیح، سنن ترمذی: ۳٤٦۰؛ صحیح ابن حبان: ۲۳۳۵. [8] ضعیف، مسند أبی یعلی: ۱۳۸٤؛ صحیح ابن حبان: ۸٤۰.

⑥ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ''شب اسراء سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی، کہنے لگے: اے محمد! اپنی امت کو میرا سلام کہنا اور انہیں کہنا کہ جنت ایک پاکیزہ مٹی اور میٹھے پانی والا میدان ہے اور اس کا سبزہ سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ اور اللّٰہ اکبر ہے۔''[1] اسے ترمذی اور طبرانی نے نقل کیا۔

⑦ ان کے ہاں یہ بھی مذکور ہے: (وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ)[2] مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کو یہ چار اذکار محبوب ترین ہیں اور جس کے ساتھ بھی آغاز کرو فرق نہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) اور (اَللّٰهُ أَكْبَرُ »[3]

⑧ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے ہر رات سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھیں وہ اسے کافی ہوگئیں۔''[4] اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا، اس رات کے قیام سے اسے مجزیٰ (تہجد کی قائم مقام) ہوئیں، بعض نے کہا: یعنی اس رات کی آفات سے اسے کافی ہوئیں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس عنوان سے ایک باب باندھا: ''باب ذِكْرُ أَقَلِّ مَا يُجْزِءُ مِنَ الْقِرَاءَةِ فِيْ قِيَامِ اللَّيْلِ'' تہجد میں کم از کم کتنی قراءت کافی رہے گی۔ پھر اسے ذکر کیا۔

⑨ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''کیا تمہارا کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں ایک تہائی قرآن کی تلاوت کرے؟'' یہ بات صحابہ پر شاق ہوئی اور کہا: ایسا کون کرسکتا ہے؟ فرمایا: ''سورۂ اخلاص کی قراءت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔''[5] اسے بخاری، مسلم اور نسائی نے نقل کیا۔

⑩ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے روزانہ سو مرتبہ یہ ورد کیا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ » یہ (ثواب کے لحاظ سے) دس گردنیں آزاد کرانے کے برابر ہے، اور اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور سو گناہ مٹائے جائیں گے اور شام تک پورا دن شیطان سے یہ اس کے لیے بچاؤ کا وسیلہ بنے گا اور اس سے افضل کوئی پیش نہیں کرسکتا، مگر وہ شخص جو اس سے زیادہ اس کا وِرد کرے۔''[6] اسے شیخین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا نیز مسلم، نسائی اور ترمذی نے یہ اضافہ بھی کیا کہ ''جس نے ہر روز سو مرتبہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ) کا ورد کیا، اس کی خطائیں مٹا دی جاتی ہیں، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔''[7]

استغفار کی فضیلت

سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اے ابن آدم! تم نے جب

---

① حسن، سنن ترمذی: ٣٤٦٢. ② الفتوحات الربانية: ١/ ٢٧٠، ٢٧١. ③ صحيح مسلم: ٢١٣٧؛ سنن ابن ماجه: ٣٨١١. ④ صحيح البخاری: ٥٠٠٩؛ صحيح مسلم: ٨٠٧، ٨٠٨. ⑤ صحيح البخاری: ٥٠١٣؛ سنن أبی داود: ١٤٦١. ⑥ صحيح البخاری: ٣٢٩٣؛ صحيح مسلم: ٢٦٩١. ⑦ صحيح، سنن ترمذی: ٣٤٦٦.

بجی مجھ سے امید و یقین کے ساتھ دعا کی میں نے تمہیں معاف کر دیا، اگرچہ تمہارے گناہ آسمان کے کناروں تک پہنچے ہوئے ہوں، پھر مجھ سے استغفار کرو، تو میں مغفرت سے نوازوں گا، چاہے زمین بھر کر گناہ لاؤ اگر ان میں شرک نہ ہوا، تو میں اسی قدر مغفرت عطا کر دوں گا۔''[1] اسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل کیا اور کہا: حسن غریب ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے استغفار کو لازم کیا اللہ تعالیٰ اسے ہر پریشانی سے نجات عطا کرتا ہے، ہر تنگی سے نکالتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔''[2] اسے ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا: اور کہا سند صحیح ہے۔

عظیم اجر والا جامع ذکر

① ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہتی ہیں نبی کریم ﷺ میرے ہاں سے نکلے (نمازِ صبح کے لیے) پھر چاشت کے بعد تشریف لائے اور میں اسی جگہ (جہاں صبح چھوڑ کر گئے تھے) ذکر واذکار میں مصروف تھی، تو فرمایا: ''کیا تم اسی حال پر ہو جس پر جب میں تم سے گیا تھا؟'' عرض کی: جی ہاں فرمایا: ''میں نے یہاں سے جانے کے بعد چار کلمات صرف تین مرتبہ کہے ہیں، لیکن اگر ان کا ان اذکار کے ساتھ وزن کیا جائے، جو تم نے صبح سے اب تک کیے ہیں، تو وہ ان سے بھاری ہو جائیں، یہ ہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَاءَ نَفْسِهِ وَ زِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ»[3] اسے مسلم اور ابو داود نے نقل کیا۔

② نبی کریم ﷺ ایک ام المومنین کے ہاں آئے تو دیکھا ان کے آگے بہت سی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی ہیں اور وہ ان پر شمار کرتی ہوئیں اللہ کی تسبیح کر رہی ہیں، فرمایا: ''میں تمہیں اس سے آسان، یا فرمایا: افضل طریقہ نہ بتلاؤں؟'' تو یہ کلمات سکھلائے: «سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي الْأَرْضِ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ بَيْنَ ذٰلِكَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ» ''اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ارض و سماء اور ان کے مابین اس کی مخلوق کی تعداد کے بقدر اور جسے وہ ابھی پیدا کرے گا۔'' اسی طرح (سبحان اللہ کی جگہ) (اَللّٰهُ أَكْبَرُ) (اور باقی وہی) پھر (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) اور پھر (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) اور (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ) کہو۔[4] اسے اصحابِ سنن اور حاکم نے نقل کیا اور حاکم نے کہا: یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے۔

③ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیان کیا کہ ایک اللہ کے بندے نے کہا: «يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَلِعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ» ''اے اللہ! تیری عظمت اور بادشاہی کے شایان شان میں تیری

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۳۵۴۰؛ سنن الدارمی: ۲۷۹۱. [2] ضعیف، سنن أبی داود: ۱۵۱۸. [3] صحیح مسلم: ۲۷۲٦؛ سنن أبی داود: ۱۵۰۳. [4] ضعیف، سنن أبی داود: ۱۵۰۰؛ سنن ترمذی: ۳۵٦۸.

تعریف کرتا ہوں۔'' تو فرشتے مشکل میں پڑ گئے اور انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ اسے کیسے لکھیں (اس کے ثواب کے خانے میں کیا درج کریں) تو آسمان کی طرف پرواز کی اور عرض کی: اے ہمارے رب! تیرے بندے نے ایک کلمہ کہا ہے، تو ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ اسے کیسے احاطۂ تحریر میں لائیں، اللہ نے پوچھا حالانکہ وہ خوب جانتا تھا جو اس بندے نے کہا، میرے بندے نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے یہ کلمہ پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے کہا: تم بس یہ کلمہ لکھ لو جیسے اس نے پڑھا ہے اور اس کا ثواب میں خود دوں گا جب وہ میرے پاس آئے گا۔''[1] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

انگلیوں پر اذکار کرنا اور یہ تسبیح (استعمال کرنے) سے افضل ہے

① سیدہ یسیرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم تسبیح تہلیل اور تقدیس کو لازم پکڑو اور ان سے غفلت نہ کرو کہ مبادا رحمت کو بھول جاؤ اور (انگلیوں کے) پوروں پر شمار کرو کہ انہیں قوتِ گویائی دی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا۔''[2] اسے اصحابِ سنن اور حاکم نے بسندِ صحیح نقل کیا۔

② سیدنا عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دائیں ہاتھ (کی انگلیوں) کے ساتھ تسبیح کرتے تھے،[3] اسے اصحابِ سنن نے نقل کیا۔

اس امر سے ترہیب کہ کسی مجلس میں (ایک دفعہ بھی) اللہ کا ذکر نہیں ہوا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا گیا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھی جہاں اللہ کا ذکر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہیں پڑھا، مگر وہ مجلس روزِ قیامت ان کے لیے حسرت بن جائے گی۔''[4] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن ہے، احمد نے یہ الفاظ ذکر کیے کہ وہ مجلس تِرَۃً بنا دی جائے گی (بقول محشی یعنی حسرت، نقص یا بوجھ) اسی طرح کوئی آدمی کسی راستہ میں گیا اور اللہ کا ذکر نہیں کیا، یا اپنے بستر پر گیا اور اللہ کا ذکر نہیں کیا تو اسے اس پر روزِ قیامت حسرت ہوگی، ایک روایت میں اضافہ ہے کہ ''اگرچہ یہ جنتی ہی ہوں۔''[5] فتح العلام میں ہے حدیثِ ہذا مجلس میں ذکر اور درود کرنے کے وجوب پر دلیل ہے، بالخصوص اگر (تِرَۃٌ) کی تفسیر آگ یا عذاب کے ساتھ کریں اور یہ تفسیر کی گئی ہے، کیونکہ تعذیب کسی واجب کے ترک اور محظور کے فعل کی صورت ہی ہوتی ہے، اس کا ظاہر یہ کہ ضروری ہے کہ ذکر کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھی پڑھا جائے۔

(بقول شاعر:

خدا کا ذکر کرے اور ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے
منہ میں ہو ایسی زبان! خدا نہ کرے)

---

[1] ضعیف، سنن ابن ماجہ: ۳۸۰۱، اس کی سند ضعیف ہے۔ [2] حسن، سنن ترمذی: ۳۵۸۳. [3] صحیح، سنن أبی داود: ۱۵۰۲. [4] صحیح، سنن ترمذی: ۳۳۷۷. [5] صحیح، مسند أحمد: ۲/ ۴۵۳.

مجلس کا کفارہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی مجلس میں بیٹھا جس میں کثرتِ قیل وقال (بہت بحث وتمحیص) ہوئی تو اس نے مجلس سے کھڑا ہونے سے قبل یہ کہا: «سُبْحَانَكَ اللّٰهُ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ» تو اس مجلس میں اس سے سرزد ہوئیں سب کوتائیوں کا یہ کلمہ کفارہ بن جائے گا۔''[1]

غیبت کا کفارہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی چغلی کی اس کے لیے استغفار کرو اور یہ کہو: (اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ) ''اے اللہ! اسے اور مجھے بھی معاف فرما دے۔''[2] مختار مذہب یہ ہے کہ غیبت زدہ کے لیے استغفار اور اس کی اچھائیوں کا ذکر غیبت کا کفارہ بن جائے گا، اس ضمن میں اسے بتلانے یا معاف کرانے کی ضرورت نہیں (بلکہ آئندہ کے لیے باز آجائے اور استغفار کرے)۔

دُعا

دُعا کا حکم

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اس سے دعائیں کریں اور گڑگڑائیں اور اس پر ان سے وعدہ کیا کہ ان کی دعائیں قبول کرے گا اور ان کی تمنائیں برلائے گا۔

① احمد اور اصحابِ سنن نے سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک دعا عبادت ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾

''اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''[3] (المؤمن: ٦٠)

② عبد الرزاق نے حسن سے نقل کیا کہ صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہمارا رب کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

---

[1] حسن، صحيح، سنن أبي داود: ٤٨٥٩؛ سنن ترمذي: ٣٤٣٣؛ مسند أحمد: ٢/ ٤٩٤. [2] تذكرة الموضوعات: ١٩٦. [3] صحيح، سنن ترمذي: ٣٢٤٧.

﴿ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾(البقرۃ:۱۸۶)

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں میں جواب دیتا ہوں جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے۔''[1]

③ ترمذی اور ابن ماجہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر شرف والی کوئی چیز نہیں۔''[2]

④ ترمذی نے انہی سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے یہ بات اچھی لگی کہ اللہ تعالیٰ کرب و بلا کے وقت اس کی دعا قبول کرے، وہ رَخاء (اچھے حالات) میں بکثرت دعائیں کیا کرے۔''[3]

⑤ ابویعلی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''چار خصلتیں ہیں ان میں سے ایک میرے لیے، ایک آپ کے لیے، ایک میرے اور آپ کے درمیان مشترک اور ایک آپ کے اور میرے بندوں کے درمیان مشترک ہے تو وہ خصلت جو میرے لیے ہے یہ کہ آپ میرا کسی کو شریک نہ بنائیں اور جو آپ کے لیے ہے وہ یہ کہ جو بھی آپ کوئی عملِ خیر کریں گے، میں آپ کو اس کی جزا دوں گا، میرے اور آپ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ آپ کے ذمہ دعا اور میرے ذمہ اس کی قبولیت ہے، رہی جو آپ کے اور میرے بندوں کے درمیان مشترک تو وہ یہ کہ آپ ان کے لیے بھی وہی کچھ پسند کریں، جو اپنے لیے کرتے ہیں۔''[4]

⑥ ایک روایت میں آپ نے فرمایا: ''جو اللہ سے نہیں مانگتا (دعائیں نہیں کرتا) اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔''[5]

⑦ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حذر (احتیاطی تدبیر) تقدیر سے کفایت نہیں کرسکتا اور دعا اس (مصیبت وغیرہ) میں بھی مفید ہے، جو نازل ہو چکی اور اس میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور بلا نازل ہوتی (یا ہونے لگتی) ہے تو دعا اس کے مقابل آ جاتی ہے، تو روزِ قیامت تک دونوں کی باہم مقابلہ بازی ہوتی رہے گی۔''[6] اسے بزار، طبرانی اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: صحیح الاسناد ہے۔

⑧ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قضاء (امرِ مقدر) کو صرف دعا ہی ٹال سکتی ہے اور عمر میں اضافہ (اگر ہونا ہو تو) صرف حسنِ سلوک ہی کرتا ہے۔''[7] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن غریب ہے۔

⑨ ابوعوانہ اور ابن حبان نے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی دعا کرے تو اِعظام رغبت کرے (مثلاً جنت مانگے تو فردوس مانگے، یہ نہ خیال کرے کہ میں اس قابل کہاں یا مثلاً اللہ سے بجائے پانچ مرلہ کے گھر کے مانگنے کے کنال کا

---

① تفسیر ابن جریر الطبری: ۳/ ۴۸۱. ② حسن، سنن ترمذی: ۳۳۱۰؛ سنن ابن ماجہ: ۳۸۲۹. ③ حسن، سنن ترمذی: ۳۳۷۹؛ المستدرك للحاكم: ۱/ ۵۴۴. ④ ضعیف، مسند البزار: ۲۷۵۷. ⑤ حسن، سنن ترمذی: ۳۳۷۳. ⑥ حسن، المستدرك للحاكم: ۱/ ۴۹۲؛ مجمع الزوائد: ۱۰/ ۱۴۶. ⑦ حسن، سنن ترمذی: ۲۱۳۹.

⑫ دعائیہ الفاظ تین مرتبہ دہرانے کا استحباب

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا کہ تین تین مرتبہ (ہر) دعا دہرائیں، اسی طرح استغفار بھی۔"[1] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

⑬ اگر کسی کے لیے دعا کر رہا ہے، تو ابتدا اپنے آپ سے کرے

قرآن میں ہے:

﴿ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ ﴾(الحشر: ۱۰)

"کہتے ہیں اے رب تو ہمیں اور ہمارے پیش رو مومن بھائیوں کو معاف فرما۔"

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لیے دعا کرتے تو (وہی دعا) پہلے اپنے آپ کے لیے کرتے۔"[2] اسے ترمذی نے بسند صحیح نقل کیا۔

⑭ دعا مانگ کر ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا اور (دعا کے آخر میں) اللہ کی حمد و تمجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا

آخر میں ہاتھ چہرے پر پھیرنے بارے روایت متعدد طرق سے مروی ہے، مگر سب ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ من حیث المجموع یہ حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے (پھر امت کا تعامل بھی شروع سے چلتا آرہا ہے اور قواعدِ تشریع میں اسے ایک اہم دلیل باور کیا جاتا ہے)۔

والد، روزہ دار، مسافر اور مظلوم کی دعا

احمد، ابوداود، اور ترمذی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین افراد کی دعا کے قبول ہونے میں شک ہی نہیں: والد کی (اولاد کے حق میں) دعا، مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا۔"[3] ایک اور روایت میں ہے: "تین آدمیوں کی دعا رد نہیں کی جاتی: روزہ دار یہاں تک کہ افطاری کر لے، عادل حکمران اور مظلوم کی دعا اللہ ان کی دعا بادلوں کے اوپر اٹھا لیتا اور اس (مظلوم کی دعا اور بد دعا) کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ فرماتا ہے: میری عزت کی قسم میں تمہاری ضرور مدد کروں گا اگرچہ کچھ عرصہ بعد ہی ہو۔"[4]

کسی کے حق میں غائبانہ دعا کرنا

① مسلم اور ابوداود نے سیدنا صفوان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی، کہتے ہیں: میں شام آیا اور سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کے گھر

---

[1] ضعیف، سنن أبی داود: ۱۵۲٤. [2] صحیح، سنن ترمذی: ۳۳۸۵؛ سنن ابن ماجه: ۱۷۵۲. [3] حسن، سنن أبی داود: ۱۵۳٦. [4] ضعیف، وصح منه شطره الاول لکن بلفظ المسافر وفی روایة الوالدمکان الامام، سنن ترمذی: ۳۵۹۸؛ سنن ابن ماجه: ۱۷۵۲.

③ اوقاتِ فاضلہ اور حالاتِ شریفہ کو دعا کرنے کے ضمن میں ملحوظ رکھنا

مثلاً یوم عرفہ، ماہِ رمضان، روزِ جمعہ، رات کا آخری پہر، سحری کا وقت، سجدوں میں، بارش جب ہو رہی ہو، اذان اور اقامت (اور اقامت اور امام کے اللہ اکبر کہنے) کے درمیان اسی طرح جب اسلامی لشکر کی کفار کے لشکر سے مڈبھیڑ شروع ہو چکی ہو، خوف و اضطراب اور پریشانی کے وقت اور جب دل پر رقت کا عالم طاری ہو، سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ (یعنی قبولیت کا زیادہ امکان ہوتا ہے) فرمایا: ''رات کے آخری پہر اور فرض نمازوں کے بعد۔''[1] اسے ترمذی نے صحیح سند سے نقل کیا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''بندہ حالتِ سجدہ میں اللہ سے قریب ترین ہوتا ہے (دیگر احوال کی نسبت سے) تو اس دوران کثرت سے دعا کیا کرو کہ قرینِ قیاس ہے کہ وہ قبولیت سے نوازی جائے۔''[2] اسے مسلم نے نقل کیا، اس بارے میں کثیر روایات وارد ہیں۔

④ دعا کرتے ہوئے کندھوں تک ہاتھ اٹھانا

کیونکہ ابو داود نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ کہا: دعا یہ ہے کہ تم اپنے ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاؤ (اور پھر مانگو جو مانگنا ہے) اور جب استغفار کرو تو انگلی سے اشارہ کرو اور ابتہال (تضرع) یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اکٹھے (اللہ کی طرف) پھیلاؤ،[3] سیدنا مالک بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ سے دعا کرو، تو ہتھیلیاں اللہ کی طرف اٹھاؤ ہاتھوں کی پشت نہیں۔''[4] سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک تمہارا رب حیا دار اور نفیس ہے، اسے اپنے بندے سے حیا آتی ہے جب وہ اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف اٹھائے کہ انہیں خالی لوٹا دے۔''[5]

⑤ دعا کا آغاز اللہ کی حمد، تمجید اور ثنا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سے کرے

ابو داود نسائی نے جبکہ ترمذی نے صحیح قرار دے کر سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سنا کہ نماز میں دعا کر رہا ہے، مگر اللہ کی تمجید نہیں کی اور نہ درود پڑھا تو فرمایا: ''اس نے جلدی کی۔'' پھر اسے بلایا اور سمجھایا، یا اس کے غیر کو کہ ''جب تمہارا کوئی نماز پڑھے تو دعائیں کرنے سے پہلے اللہ کی حمد و تمجید اور اس کی ثنا بیان کرے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے پھر جو چاہے دعا کرے۔''[6]

⑥ حضورِ قلبی، محتاجگی کا اظہار کرنا، اللہ کی طرف گڑگڑانا اور آواز درمیانی رکھنا

قرآن میں ہے:

---

① حسن، سنن ترمذی: ٣٤٩٩؛ عمل الیوم واللیلة: ١٠٨. ② صحیح مسلم: ٤٨٢. ③ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٨٩. ④ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٨٦. ⑤ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٨٨؛ سنن ترمذی: ٣٥٦٩؛ سنن ابن ماجه: ٣٨٦٥. ⑥ صحیح، سنن أبی داود: ١٤٨١؛ سنن ترمذی: ٣٤٧٣؛ سنن نسائی: ٣/ ٤٤.

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴾ (الإسراء: ۱۱۰)

''نماز (یعنی قیامِ شب) میں نہ آواز کو زیادہ بلند رکھو اور نہ بالکل پست بلکہ درمیان کی راہ اختیار کرو۔''

اور کہا:

﴿ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴾ (الأعراف: ۵۵)

''دعائیں کرتے ہوئے خوب گڑگڑاؤ اور خلوت میں یہ کرو بے شک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ابن جریر کہتے ہیں (تَضَرُّعًا) یعنی اس کی اطاعت کا دم بھرتے اور عاجزی اختیار کرتے ہوئے اور (خُفْيَةً) سے مراد دلوں کے خشوع اور اس کی وحدانیت و ربوبیت پر صحتِ یقین کے ساتھ اور اس کا اعتقاد رکھتے ہوئے نہ کہ لوگوں کے دکھلاوے کو جہراً، صحیحین میں سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں ایک دفعہ (دورانِ سفر) لوگ بآوازِ بلند طلب وگریہ زاری میں لگے ہوئے تھے کہ آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! اپنے آپ پر قابو رکھو کہ تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے، بلکہ تم سمیع وبصیر سے دعائیں کر رہے ہو، جسے تم پکار رہے ہو وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے (پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا) اے عبداللہ بن قیس! کیا تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک کلمہ نہ بتلاؤں؟ وہ ہے: «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» [1] احمد نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قلوب مخزن ہیں اور بعض بعض سے حافظہ میں قوی ہیں، جب اللہ سے مانگو، تو اس یقین کے ساتھ مانگو کہ دعا قبول ہوگی، اللہ اس بندے کی دعا قبول نہیں کرتا جو غافل دل سے کرے۔'' [2]

⑦ کسی گناہ کے کام یا قطع رحمی کی دعا نہیں کرنا چاہیے

کیونکہ احمد نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی مسلمان ایسی دعا نہیں کرتا جس میں اثم اور قطع تعلقی و رحمی کی بات نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ اسے تین میں سے ایک چیز عطا کرتا ہے: اس دعا کو بعینہٖ قبول کرے اور اسے وہ عطا کرے جو وہ مانگ رہا ہے، آخرت میں اسے ذخیر کرلے (اور اس دعا کے عوض آخرت میں اسے ثواب عطا کرے، گویا دعا بذاتِ خود ایک عبادت ہے) یا پھر اس کے عوض اس سے کوئی مصیبت یا مشکل ٹال دے۔'' صحابہ کہنے لگے اگر یہ بات ہے تو پھر تو ہمیں کثرت سے دعائیں کرنی چاہئیں، فرمایا: ''اللہ اور زیادہ عطا کرنے والا ہے۔'' [3]

⑨ ناامیدی کا اظہار نہ کرے کہ کہے شاید میری دعائیں قبول نہیں ہوں گی

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری دعائیں درجۂ قبولیت

---

[1] صحیح البخاری: ٦٣٨٤؛ صحیح مسلم: ٢٧٠٤. [2] صحیح، مسند أحمد: ٢/ ١٧٧؛ مجمع الزوائد: ١٠/ ١٤٨. [3] صحیح، مسند أحمد: ٣/ ١٨؛ مسند البزار: ٣١٤٣، ٣١٤٤؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٩٣.

پر فائز ہوں گی، جب تک کوئی تعجیل نہ کرے کہ کہے میں نے دعا کی مگر وہ قبول نہ ہوئی۔"[1]

⑨ قبولیت پر پختہ یقین رکھتے ہوئے دعا کرنا

ابو داود نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: "کوئی یہ نہ کہے اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف فرمادے، چاہے تو مجھ پر رحم فرما، بلکہ عزمِ طلب کرو (یوں کہو): اے اللہ! مجھے معاف کر، اے اللہ! مجھ پر رحم کر کہ اللہ کو کوئی مجبوری نہیں۔"[2]

⑩ جوامع الکلم (جامع مانع الفاظ) استعمال کرنا

مثلاً: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(البقرۃ: ۲۰۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دعاؤں کے جوامع الکلم پسند فرماتے تھے اور اس کے ماسوا کو ترک فرماتے (آپ سے ماثور سب دعائیں جامع، مانع اور شامل الفاظ پر مشتمل ہیں، یعنی تھوڑے کلمات مگر مطالب و مفاہیم کثیر، سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! کون سی دعا افضل ہے؟ فرمایا: "اپنے رب سے دنیا اور آخرت میں عافیت اور عفو مانگو" وہ دوسرے اور تیسرے روز آکر یہی سوال کرتا رہا اور آپ یہی جواب دیتے رہے پھر آپ نے فرمایا: "اگر تمہیں دنیا اور آخرت میں عفو مل گئی تو (گویا) تم فلاح پا گئے (اور کیا چاہیے)"[3] انہی کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: "اس سے افضل کسی نے دعا نہیں مانگی:

(اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ الْمُعَافَاةَ فِی الدُّنْيَا وَالآخِرَہِ)

"اے اللہ! میں تجھ سے دنیا و آخرت میں عافیت ملنے کی دعا کرتا ہوں۔"[4]

⑪ اپنے اور اپنے اہل و مال کے خلاف بددعا کرنے سے تحذیر

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے، اپنی اولاد، اپنے خدام اور اپنے اموال کے خلاف بددعا نہ کیا کرو (کسی کو فت یا پریشانی میں کئی دفعہ الٹے سیدھے الفاظ نکل جاتے ہیں اور اگر وہ قبولیت کی گھڑی ہو تو ایسا ہو جاتا ہے، لہٰذا منع فرمایا کہ ایسے الفاظ منہ سے نکالیں، خصوصا خواتین کو سخت احتیاط کی ضرورت ہے، وہ اکثر اپنے بچوں کو مثلاً: اللہ کرے تو مر جائے وغیرہ کہتی رہتی ہیں اور بہانہ یہ بناتی ہیں کہ اولاد کے بارے اگر غلط لفظ بھی منہ سے نکلے، تو اللہ قبول نہیں کرتا، مجھے ابھی تک یہ بات کتاب وسنت سے نہیں ملی بلکہ حدیثِ ہذا سے تو اس کی نفی ہو رہی ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی جانب سے مقررہ قبولیت کی گھڑی میں کوئی الٹی دعا منہ سے نکلے اور وہ قبول ہو جائے۔"[5]

---

① صحيح البخاري: ٦٣٤٠؛ صحيح مسلم: ٢٧٣٥. ② صحيح البخاري: ٦٣٣٩؛ صحيح مسلم: ٢٦٧٩؛ سنن أبي داود: ١٤٨٣. ③ ضعيف، سنن ترمذي: ٣٥١٢؛ سنن ابن ماجه: ٣٨٤٨. ④ صحيح، سنن ابن ماجه: ٣٨٥١. ⑤ صحيح مسلم: ٣٠٠٩؛ سنن أبي داود: ١٥٣٢؛ صحيح ابن حبان: ٥٧٤٢.

⑫ دعائیہ الفاظ تین مرتبہ دہرانے کا استحباب

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا کہ تین تین مرتبہ (ہر) دعا دہرائیں، اسی طرح استغفار بھی۔''[1] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

⑬ اگر کسی کے لیے دعا کر رہا ہے، تو ابتدا اپنے آپ سے کرے

قرآن میں ہے:

﴿ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ ﴾(الحشر: ۱۰)

''کہتے ہیں اے رب تو ہمیں اور ہمارے پیش رو مومن بھائیوں کو معاف فرما۔''

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لیے دعا کرتے تو (وہی دعا) پہلے اپنے آپ کے لیے کرتے۔''[2] اسے ترمذی نے بسندِ صحیح نقل کیا۔

⑭ دعا مانگ کر ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا اور (دعا کے آخر میں) اللہ کی حمد وتمجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا

آخر میں ہاتھ چہرے پر پھیرنے بارے روایت متعدد طرق سے مروی ہے، مگر سب ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ من حیث المجموع یہ حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے (پھر امت کا تعامل بھی شروع سے چلتا آرہا ہے اور قواعدِ تشریع میں اسے ایک اہم دلیل باور کیا جاتا ہے)۔

والد، روزہ دار، مسافر اور مظلوم کی دعا

احمد، ابوداود، اور ترمذی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین افراد کی دعا کے قبول ہونے میں شک ہی نہیں: والد کی (اولاد کے حق میں) دعا، مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا۔''[3] ایک اور روایت میں ہے: ''تین آدمیوں کی دعا رد نہیں کی جاتی: روزہ دار یہاں تک کہ افطاری کر لے، عادل حکمران اور مظلوم کی دعا اللہ ان کی دعا بادلوں کے اوپر اٹھا لیتا اور اس (مظلوم کی دعا اور بد دعا) کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ فرماتا ہے: میری عزت کی قسم میں تمہاری ضرور مدد کروں گا اگرچہ کچھ عرصہ بعد ہی ہو۔''[4]

کسی کے حق میں غائبانہ دعا کرنا

① مسلم اور ابوداود نے سیدنا صفوان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی، کہتے ہیں: میں شام آیا اور سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کے گھر

---

① ضعیف، سنن أبی داود: ۱۵۲٤. ② صحیح، سنن ترمذی: ۳۳۸۵؛ سنن ابن ماجه: ۱۷۵۲. ③ حسن، سنن أبی داود: ۱۵۳٦. ④ ضعیف، وصح منه شطره الاول لکن بلفظ المسافر وفی روایة الوالدمکان الامام، سنن ترمذی: ۳۵۹۸؛ سنن ابن ماجه: ۱۷۵۲.

گیا مگر انہیں نہ پایا، ام درداء سے بات ہوئی پوچھنے لگیں کیا اس سال حج کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، کہنے لگیں ہمارے لیے (ادھر جا کر) دعائے خیر کرنا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''غائب کے حق میں دعا مقبول ہوتی ہے، اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہے جب بھی وہ کسی بھائی کے لیے (غائبانہ) دعائے خیر کرتا ہے، وہ آمین کہتا اور ساتھ میں یہ بھی کہ تمہارے لیے بھی اس کا مثل ہو۔'' کہتے ہیں: میں بازار کی طرف نکلا تو سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ مل گئے، انہوں نے بھی مجھ سے یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے حوالے سے بیان کی۔ [1]

② ابو داود اور ترمذی کے ہاں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''غائب کی غائب کے حق میں کی گئی دعا سب سے جلدی قبول ہوتی ہے۔'' [2]

③ دونوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ سے عمرہ پر جانے کی اجازت مانگی، تو آپ نے اجازت دیتے ہوئے کہا: ''پیارے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولنا۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یہ ایسا کلمہ تھا کہ مجھے پسند نہیں کہ اس کے بدلے ساری دنیا مجھے مل جائے۔ [3]

ان الفاظ بارے وارد بعض روایات کا تذکرہ جو دعاؤں کے آغاز میں کہنا مستحب ہیں ان کی قبولیت کی امید کرتے ہوئے

① سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا یوں دعا کر رہا تھا: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِأَنِّيْ أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ لَاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُواً أَحَدٌ'' ''اے اللہ! میں تجھ سے تجھے ایک معبود ماننے کے باوصف کہ تو الاحد الصمد ہے جس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ تو کسی سے جنا گیا ہے اور نہ تیرا کوئی ہمسر ہے، سوال کرتا ہوں۔ تو آپ نے اس سے کہا: ''تم نے اللہ سے اس کے اسمِ اعظم کے ساتھ (اس کا حوالہ دے کر اور اس کے توسّل سے) دعا کی ہے کہ جب اس کے ساتھ اس سے مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے اور اگر اس کے ساتھ اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔'' [4] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن کہا، امام منذری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارے استاذ ابوحسن مقدسی نے کہا: اس کی اسناد طعن سے خالی ہے اور اس باب میں سند کے لحاظ سے اس سے بہتر روایت موجود نہیں۔

② سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا (دعا کرتے ہوئے) یوں کہہ رہا تھا: ''يَاذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ'' فرمایا: ''تمہاری دعا قبول ہوئی، مانگو جو مانگنا ہے۔'' [5] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: حسن ہے۔

③ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا سیدنا ابوعیاش زید بن صامت زرقی رضی اللہ عنہ سے گزر ہوا، وہ نماز میں تھے اور ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے: (اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِأَنَّ لَكَ الْحَمْدَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ يَا حَنَّانُ يَامَنَّانُ

---

① صحیح مسلم: ۲۷۳۲؛ سنن ابی داود: ۱۵۳۴. ② ضعیف، سنن أبی داود: ۱۵۳۵؛ سنن ترمذی: ۱۹۸۱.
③ ضعیف، سنن ابی داود: ۱۴۹۸. ④ صحیح، سنن أبی داود: ۱۴۹۵؛ سنن ترمذی: ۳۴۷۵. ⑤ ضعیف، سنن ترمذی: ۳۵۲۷.

يَا بَدِيْعَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ) تو آپ نے فرمایا: ''تم نے اللہ کے اسمِ اعظم کے ساتھ اس سے دعا کی ہے کہ جس کے ساتھ اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے،[1] نوٹ: روایت میں ''یاحنان'' کا ذکر نہیں، اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا، بقول امام حاکم یہ شرطِ مسلم پر صحیح ہے۔

④ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے ان پانچ کلمات کے ساتھ دعا کی تو جو کچھ وہ اللہ سے مانگے گا اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے گا وہ ہیں: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»[2] اسے طبرانی نے حسن سند سے نقل کیا۔

صبح وشام کے اذکار

صبح کے اذکار کا وقت فجر طلوع ہونے سے لے کر طلوعِ آفتاب تک جبکہ شام کے اذکار کا وقت عصر سے مغرب تک ہے۔

① مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح وشام «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ» کا سو مرتبہ ورد کیا، قیامت کے دن کوئی اس سے افضل عمل والا نہ ہوگا مگر وہ شخص جو اس کا مثل یا زائد یہی عمل لائے۔''[3]

② سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ شام کو یہ کلمات پڑھتے:

«أَمْسَيْنَا وَ أَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، رَبِّ أَسْأَلُكَ خَيْرَ مَا فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهَا وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا، رَبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَسُوْءِ الْكِبْرِ، رَبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ»

''ہم نے اور سب اہلِ جہاں نے اس حال میں شام کی ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے وہ وحدہ لاشریک ہے، بادشاہی اسی کو زیبا ہے اور وہی ہر قسم کی حمد کا حقدار ہے اور وہ ہر چیز پہ قادر ہے، اے رب! میں تجھ سے اس رات اور اس کے بعد کی خیر کا طالب ہوں اور اس رات اور اس کے بعد کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ! میں سستی اور تکبر سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور آگ اور قبر کے عذاب سے۔''

اسی طرح صبح کے وقت بھی یہی کلمات کہتے (اور بجائے ''أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى کے أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمُلْكُ...... الخ کہتے (اس حال میں صبح کی ہے کہ...... باقی وہی ترجمہ جو گزرا)[4]

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٤٩٥؛ سنن ترمذي: ٣٤٧٥. [2] ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ١٢٥.
[3] صحيح مسلم: ٢٦٩٢؛ سنن أبي داود: ٥٠٩١. [4] صحيح مسلم: ٢٧٢٣؛ سنن أبي داود: ٥٠٧١.

③ ابو داود نے سیدنا عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''کہو۔'' عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کہوں؟ فرمایا: ''قل ھو اللہ احد اور معوذتین کہو، تین تین مرتبہ جب صبح اور شام ہو، یہ تمہیں ہر چیز سے کافی ہوں گے۔''[1] بقول ترمذی یہ حسن صحیح حدیث ہے۔

④ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تعلیم دی کہ جب صبح ہو تو کہو: «اَللّٰهُمَّ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ» اسی طرح شام کو یہ کہو: «اَللّٰهُمَّ بِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ»[2] بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔

⑤ صحیح بخاری میں سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سید الاستغفار یہ ہے کہ تو کہے: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ» آپ نے فرمایا: ''جس نے شام کو یہ کلمات کہے، اگر اس رات فوت ہو گیا، تو جنت میں داخل ہو گا اور جس نے صبح یہی کلمات کہے، تو اگر دن میں اس کا انتقال ہو گیا، تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔''[3]

⑥ ترمذی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: مجھے کوئی کلمات سکھلایئے، جنہیں میں صبح وشام کہا کروں، فرمایا کہو:

«اَللّٰهُمَّ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ وَمَلِيْكَهُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَشَرِّ الشَّيْطَانِ وَشَرَكِهِ وَأَنْ نَقْتَرِفَ سُوْءًا عَلٰى أَنْفُسِنَا أَوْ نَجُرَّهُ إِلٰى مُسْلِمٍ»

''اے غیب وحاضر کے عالم! اے ارض وسماء کے بنانے والے! اور ہر چیز کے خالق اور مالک! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، میں تجھ سے اپنے نفس کے شر سے اور شیطان کے شر اور اس کے جال سے پناہ مانگتا ہوں اور اپنے اور کسی مسلمان کے ساتھ برائی کرنے سے بھی۔''

تو انہیں صبح وشام کہو اور جب بستر پر جاؤ،[4] بقول ترمذی حسن صحیح ہے۔

⑦ ترمذی نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بندہ روزانہ صبح وشام یہ کلمات تین مرتبہ کہے، تو کوئی چیز اسے نقصان نہ دے گی: «بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْئٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ»[5]

---

① حسن، سنن أبی داود: ٥٠٨٢؛ سنن ترمذی: ٣٥٧٥. ② صحیح، سنن ترمذی: ٣٣٩١. ③ صحیح البخاری: ٦٣٠٦. ④ ضعیف، سنن أبی داود: ٥٠٨٣، وشر الشیطان وشرکه تک کے الفاظ صحیح ہیں سنن ترمذی: ٣٣٩٢.
⑤ صحیح، سنن ترمذی: ٣٣٨.

⑧ انہی کے ہاں سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے صبح وشام کہا: «رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبّاً وَبِالإِسْلَامِ دِيْناً وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيّاً» تو اللہ پر حق ہے کہ اسے اپنی رضا سے نوازے۔''① کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

⑨ انہی کی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ فرمایا: ''جس نے صبح یا شام یہ کہا: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَصْبَحْتُ أُشْهِدُكَ وَأُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِكَ وَمَلَائِكَتَكَ وَجَمِيْعَ خَلْقِكَ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ» تو اللہ اس کا چوتھائی حصہ آگ سے آزاد کر دے گا اور جس نے دو مرتبہ یہ کلمات کہے اس کا نصف اور جس نے تین مرتبہ کہے، اس کا تین بٹا چار اور جس چار مرتبہ یہ کہے اس (کے پورے وجود) کو اللہ آگ سے آزادی دے گا۔''②

⑩ سنن ابوداود میں سیدنا عبداللہ بن غنام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے صبح کو کہا: «اَللّٰهُمَّ مَا أَصْبَحَ بِيْ مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ» اس نے اس دن کے شکر کا حق ادا کیا اور جس نے شام کو یہ کلمات کہے اس نے اپنی رات کے شکر کا حق ادا کر دیا۔''③

⑪ سنن میں اور صحیح حاکم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح اور شام کے وقت یہ کلمات کہنا ترک نہ کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَآمِنْ رَوْعَاتِيْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَأَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ» ''اے اللہ! میں تجھ سے دنیا و آخرت میں عافیت کا طالب ہوں اور اپنے دین و دنیا اور اہل و مال کی حفاظت کا سوالی ہوں، اے اللہ! میرے عیوب کی پردہ پوشی کر اور نفس کی ذلتوں سے بچا اور آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف سے میری حفاظت فرما۔'' بقول وکیع (أَنْ أُغْتَالَ سے مراد) یعنی زمین میں دھنسنا ہے۔④

⑫ سیدنا عبدالرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے کہا: ابا جان میں سنتا ہوں کہ آپ ہر صبح یہ کلمات کہتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَدَنِيْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ سَمْعِيْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَصَرِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ'' اور شام کو بھی، کہنے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح وشام یہ کہتے سنا تو مجھے پسند ہے کہ آپ کی اقتدا کروں۔⑤ اسے ابوداود نے نقل کیا۔

---

① ضعيف، سنن أبي داود: ٥٠٧٢؛ سنن ترمذي: ٣٣٨٩. ② ضعيف، سنن أبي داود: ٥٠٦٩؛ سنن ترمذي: ٣٤٩٥. ③ ضعيف، سنن أبي داود: ٥٠٧٣، صحيح ابن حبان: ٣٦١. ④ صحيح، سنن أبي داود: ٥٠٧٤، صحيح ابن حبان: ٣٨٧١. ⑤ حسن، سنن أبي داود: ٥٠٩٠، مسند أحمد: ٢/ ٤٥.

⑬ ابن سنی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح وشام یہ کلمات کہے، اللہ پر حق ہے کہ اس کی یہ دعا پوری کرے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَصْبَحْتُ مِنْكَ فِيْ نِعْمَةٍ وَعَافِيَةٍ وَيُسْرٍ فَأَتِمَّ نِعْمَتَكَ عَلَيَّ وَعَافِيَتَكَ وَسِتْرَكَ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ» تین مرتبہ۔①

⑭ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم عاجز ہو کہ ابو ضمضم کی طرح ہو جاؤ؟'' عرض کی: ابو ضمضم کون ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ''وہ جب صبح ہوتی تو کہتا تھا: «اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ قَدْ صَدَّقْتُ بِعِرْضِيْ عَلٰى عِبَادِكَ» ''اے اللہ! میں نے اپنا آپ اور عزت سب کچھ تیرے حوالے کر دیا۔'' پھر سارا دن نہ کسی کو گالی دیتا، نہ کسی پر زیادتی کرتا اور نہ مار پیٹ کرتا تھا۔②

⑮ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح وشام سات مرتبہ کہا: «حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ» اللہ اسے دنیا وآخرت کی پریشانی میں کافی ہوگا۔''③

⑯ طلق بن حبیب سے مروی ہے کہ ایک شخص سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: آپ کے گھر میں آگ لگ گئی ہے... بولے یہ نہیں ہوسکتا، اللہ ایسا نہیں کر سکتا کہ میں وہ کلمات صبح دم پڑھ لیتا ہوں، جن کی بابت نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''جو دن کے شروع میں انہیں پڑھ لے اسے شام تک کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی اور اگر دن کے آخر میں پڑھے تو اسے صبح تک کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، وہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ أَنْتَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَ أَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْئٍ عِلْماً اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ»

''اے اللہ! تو ہی میرا رب، تجھی پہ میرا بھروسہ ہے اور تو عرشِ عظیم کا مالک ہے وہی ہوتا ہے جو تو چاہے ہر قوت اور طاقت تیرے ہی ہاتھ میں ہے تو ہر چیز پہ قادر ہے اور تجھے ہر چیز کا علم ہے، اے اللہ! میں اپنے سمیت ہر مخلوق کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''

بعض روایات میں ہے پھر کہا چلو آؤ دیکھتے ہیں، گھر پہنچ کر کیا دیکھا کہ آس پاس کے گھر جل چکے ہیں اور ان کے گھر کو ذرا سی بھی آگ نہیں پہنچی (اللہ اللہ کیا دولتِ یقین تھی جس کے وہ حامل تھے)۔④

---

① ضعيف، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٥٥. ② صحيح مسلم: ٢٧١٥؛ سنن أبي داود: ٥٠٥٣.
③ حسن، سنن أبي داود: ٥٠٨١؛عمل اليوم والليلة: ٧٢. ④ ضعيف، عمل اليوم والليلة: ٥٨، شیخ سلیم بن عبد الہلالی حفظہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

سوتے وقت کے اذکار

صحیح بخاری نے سیدنا حذیفہ اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ جب سونے کے لیے بستر پر جاتے تو کہتے: «بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ أَحْيَا وَأَمُوْتُ» اور جب بیدار ہوتے تو کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ» ①

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ سونے کا آغاز اس طرح کرتے کہ داہنا ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھتے اور تین مرتبہ کہتے: «اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ» ''اے اللہ! حشر کے دن اپنے عذاب سے مجھے بچانا۔''②

اور یہ بھی:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْئٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوىٰ مُنَزِّلَ التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ أَنْتَ الأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْئٌ اِقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ»

''یا اللہ! اے آسمانوں اور زمین کے رب اور ہر چیز کے رب! اے دانے اور گٹھلی کو اگانے (پھاڑنے) والے! تورات، انجیل اور قرآن عظیم کو نازل کرنے والے! میں ہر اس جانور کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، جس کی پیشانی تیرے قبضے میں ہے، تو ہی اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی نہیں اور تو ہی آخر ہے، تیرے بعد کچھ نہیں، ہمیں قرض سے نجات دے اور فقر سے محفوظ رکھ۔''③

اور کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَآوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ وَلَا مُؤْوِيَ» ''اللہ نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمارے لیے کافی ہوا اور ہمیں ٹھکانہ دیا، کتنے ہی لوگ دنیا میں موجود ہیں جن کو وہ کافی نہیں اور نہ ان کا کوئی ٹھکانہ ہے۔''④

نیز بستر پر بیٹھ کر ہتھیلیوں کو اکٹھا کرتے اور سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر ان پر پھونک مارتے پھر پورے جسم پر جہاں تک ممکن ہوتا انہیں پھیرتے سر، چہرہ مبارک اور سامنے والے حصہ سے شروع کر کے، تین مرتبہ یہ کرتے۔⑤

اور نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ لیٹ کر کہا جائے: «بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَ بِكَ أَرْفَعُهُ إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ» ''اپنے رب کا

---

① صحيح البخاری: ٦٣١٢؛ سنن أبی داود: ٥٠٤١. ② صحيح، سنن أبی داود: ٥٠٤٥. ③ صحيح مسلم: ٢٧١٣؛ سنن أبی داود: ٥٠٥١؛ سنن ترمذی: ٣٣٩٧. ④ صحيح مسلم: ٢٧١٥؛ سنن أبی داود: ٥٠٥٣. ⑤ صحيح البخاری: ٦٣١٩.

نام لے کر میں سونے کے لیے اپنا پہلو رکھ رہا ہوں اور اسی کے نام پہ اسے اٹھاؤں گا، اگر تو نے سوتے میں روح قبض کر لی تو رحم کا معاملہ کر اور اگر ابھی عمر باقی ہے تو حفاظت فرما، جیسے تو اپنے صالح بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔[1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا کہ (سوتے وقت) ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہا کریں،[2] اسی طرح سابق الذکر دعا: «اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ» الخ اور آیت الکرسی پڑھنے کی نصیحت فرمائی اور فرمایا: ''جو اسے پڑھے گا اللہ کی طرف سے اس کا ایک محافظ مقرر ہو جائے گا۔''

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: جب بستر پر جاؤ تو نماز والا وضو کرو پھر دائیں پہلو کے بل لیٹ جائے اور کہو:

«اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِيْ إِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ»

''اے اللہ! میں نے اپنا آپ تیرے حوالے کر دیا، اپنا رخ تیری طرف کیا اپنا سب معاملہ تجھے سونپ دیا شوق سے اور تیرے ڈر سے تیری طرف چلا، آیا بس تیرا ہی آسرا ہے، تیری نازل کردہ کتاب اور تیرے بھیجے رسول پر میرا ایمان ہے۔''

پھر فرمایا: ''اگر اس رات فوت ہو گئے تو فطرت پر ہو گے۔'' نیز فرمایا: ''اس کے بعد کوئی بات نہ کرو (اور سو جاؤ)۔''[3]

نیند سے بیدار ہونے کے اذکار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند سے اٹھنے والے کو حکم دیا کہ کہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ عَلَيَّ رُوْحِيْ وَعَافَانِيْ فِيْ جَسَدِيْ وَأَذِنَ لِيْ بِذِكْرِهٖ» ''اللہ کا شکر ہے جس نے میرے جسد میں روح واپس کر دی اور صحیح و سلامت مجھے اٹھایا اور اپنا ذکر کرنے کی ہمت دی۔''[4]

آپ بیدار ہو کر یہ کلمات کہتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ أَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِيْ وَ أَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ اَللّٰهُمَّ زِدْنِيْ عِلْماً وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنِيْ وَهَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ»

''اے اللہ! تو پاک ہے، تیرے سوا کوئی الہ نہیں میں گناہوں کی تجھ سے معافی مانگتا ہوں اور تیری رحمت کا متلاشی ہوں، اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما اور ہدایت دی ہے تو اس پہ قائم رکھ اور اپنی جناب سے مجھے رحمت عنایت کر بے شک تو بہت عطا کرنے والا ہے۔''[5]

---

① صحيح البخاري: ٦٣٢٠؛ صحيح مسلم: ٢٧١٤. ② صحيح، مسند أحمد: ١/ ١٠٦. ③ صحيح البخاري: ٦٣١١؛ صحيح مسلم: ٢٧١٠. ④ حسن، سنن أبي داود: ٥٠٦١. ⑤ ضعيف، سنن أبي داود: ٥٠٦١.

ایک صحیح حدیث میں ہے جس کی رات کو آنکھ کھلے تو کہے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» پھر طلبِ مغفرت کرے یا کوئی اور دعا اسے قبولیت سے نوازا جائے گا، اگر وضو کرے اور نماز (نوافل) پڑھے تو اسے شرفِ قبولیت عطا ہوگا۔[1]

نیند میں اگر ڈر جائے اور پریشانی اور وحشت کے دفع کا ذکر

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی رات کو نیند میں ڈر جائے تو کہے: «أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ» تو اسے کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی بالغ اولاد کو ان کلمات کی تعلیم دیتے تھے اور جو نابالغ ہوتے، ان کے گلے میں اس کا تعویذ بنا کر باندھ دیتے۔[2] اس کی سند حسن ہے۔ (لیکن گلے میں تعویذ لٹکانے والی بات ثابت نہیں ہے)

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بارے مروی ہے کہ انہیں بے خوابی کی شکایت ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب سونے لگو تو یہ کلمات کہا کرو: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظَلَّتْ وَرَبَّ الْأَرْضِيْنَ وَمَا أَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا أَضَلَّتْ كُنْ لِيْ جَاراً مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعاً أَنْ يَفْرُطَ عَلَيَّ أَحَدٌ مِنْهُمْ أَوْ أَنْ يَبْغِيَ عَلَيَّ، عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ» یا کہا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»[3] اسے طبرانی نے کبیر اور اوسط میں نقل کیا اور اس کی سند جید ہے، البتہ عبدالرحمن بن سابط کا سیدنا خالد سے سماع ثابت نہیں، یہ بات منذری رحمہ اللہ نے کہی۔

طبرانی اور ابن سنی نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے وحشت کی شکایت کی تو فرمایا: ''یہ ورد کیا کرو: «سُبْحَانَ اللّٰهِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبِّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ جُلِّلَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ بِالْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ» کہتے ہیں: اس شخص نے یہی کہا تو اللہ اس کی وحشت لے گیا۔[4]

پریشان کن خواب دیکھنے والا کیا کرے اور کیا کہے؟

① سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی پریشان کن اور برا خواب دیکھے تو اپنے (سینہ کی) بائیں طرف تین مرتبہ «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» پڑھ کر پھونک مارے اور پہلو بدل لے۔''[5] اسے مسلم، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

---

① صحيح البخاري: ١١٥٤؛ سنن أبي داود: ٥٠٦٠. ② حسن دون قوله وكان عبدالله......، سنن أبي داود: ٣٨٩٣؛ سنن ترمذي: ٣٥٢٨. ③ ضعيف، سنن ترمذي: ٣٥٢٣؛ المعجم الصغير للطبراني: ٩٨٤. ④ منكر، عمل اليوم والليلة: ٦٣٩. ⑤ صحيح مسلم: ٢٢٦٢؛ سنن أبي داود: ٥٠٢٢؛ سنن ابن ماجه: ٣٩٠٨.

④ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے۔ ''جب کوئی اچھا خواب دیکھے تو یہ اللہ کی طرف سے (بشارت) ہے، تو اس پر اللہ کی حمد کرے اور (احباب سے یہ) خواب بیان کرے اور اگر برا یا پریشان کن خواب دیکھے، تو یہ شیطان کی طرف سے ہے، تب اس خواب کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، اسے نقصان نہ ہوگا۔''[1] اسے ترمذی نے حسن صحیح قرار دے کر نقل کیا۔

لباس پہنتے وقت کا ذکر

① ابن سنی نے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی کپڑا، قمیص، چادر یا عمامہ پہنتے تو کہتے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِهٖ وَخَيْرِ مَا هُوَ لَهٗ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا هُوَ لَهٗ» ''اے اللہ! میں اس کی خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''[2]

④ سیدنا معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نیا کپڑا (سوٹ، جرسی، ٹوپی، پگڑی یا چادر وغیرہ) پہنا تو کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ» اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہ پہنایا اور یہ عطا کیا، ہمارا اس پہ کوئی زور نہیں۔ تو اللہ اس کے سب گزشتہ گناہ معاف فرما دے گا۔''[3] پہنتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھی مستحب ہے، کیونکہ جس کام کی بھی ابتدا بسم اللہ سے نہ کی جائے وہ ناقص ہے۔

نیا کپڑا پہنتے وقت کا ذکر

① ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا نام لیتے، وہ عمامہ ہو یا قمیص یا چادر، پھر کہتے: «اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ كَسَوْتَنِيْهِ أَسْأَلُكَ خَيْرَهٗ وَخَيْرَ مَا صُنِعَ لَهٗ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ»[4] اسے ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا نیز ترمذی نے حسن قرار دیا۔

④ ترمذی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرمایا: ''جس نے نیا کپڑا پہنا تو کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا أُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَأَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ» اللہ کی حمد کہ اس کپڑے کے ساتھ میری پردہ پوشی کی اور اس کے ذریعے سے مجھے زندگی میں خوبصورتی عطا کی۔ پھر پرانے کپڑے کو صدقہ کر دیا تو وہ اللہ کی حفظ وامان اور اس کے راستہ میں رہے گا، زندہ بھی اور مر کر بھی۔''[5]

---

① صحيح البخاري: ٦٩٨٥؛ سنن ترمذي: ٣٤٤٩؛ سنن نسائي: ٨٩٣. ② صحيح، سنن أبي داود: ٤٠٢٠؛ سنن ترمذي: ١٧٦٧. ③ حسن، سنن أبي داود: ٤٠٢٣. ④ صحيح، سنن أبي داود: ٤٠٢٠؛ سنن ترمذي: ١٧٦٧.
⑤ سنن ترمذي: ٣٥٥٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٥٥٧.

کسی پر نیا کپڑا دیکھ کر کیا کہے؟

① صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام خالد (جو ایک بچی تھی) کو ایک چادر پہنائی اور یوں دعا دی: «أَبْلِيْ وَ أَخْلِقِيْ» ''اسے پہن پہن کر پرانا کرو۔''① صحابہ کو (لباس کے بارے دعا دیتے ہوئے یہ) کہا کرتے تھے: (تَبْلِيْ وَ يُخْلِفُ اللّٰهُ) ''تا دیر پہننا نصیب ہو اور اللہ اس کا پھر بدل عطا کرے۔''②

② سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر نیا کپڑا دیکھا تو یہ دعا دی: «اِلْبَسْ جَدِيْداً وَعِشْ حَمِيْداً وَمُتْ شَهِيْداً سَعِيْداً» ''نیا پہنو، قابلِ تعریف زندگی گزارو اور جامِ شہادت نوش کرو۔''③ اسے ابن ماجہ اور ابن سنی نے نقل کیا۔

لباس اتارتے وقت کی دعا

ابن سنی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر کسی مسلمان نے لباس اتارتے وقت کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ» تو یہ جنوں کی آنکھوں اور اس کی عورہ (جسم کا وہ حصہ جسے ڈھانپنا شرعاً فرض ہے) کے مابین ستر بن جائے گا (وہ دیکھ نہ سکیں گے)۔''④

گھر سے نکلتے وقت کے اذکار

① ابوداود نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے گھر سے نکلتے وقت کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» اسے (اللہ کی طرف سے) کہلوایا جاتا ہے: «كُفِيْتَ وَوُقِيْتَ وَهُدِيْتَ» شیطان اس سے الگ ہو جاتا اور دوسرے سے کہتا ہے، اس شخص کو کیا نقصان پہنچایا جا سکتا ہے جسے (اللہ کی طرف سے) ہدایت اور حفاظت ملی۔''⑤

② مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہے: «بِسْمِ اللّٰهِ آمَنْتُ بِاللّٰهِ اِعْتَصَمْتُ بِاللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» ⑥ یہ حسن ہے۔

③ اہلِ سنن نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ جب بھی ان کے گھر سے باہر گئے آسمان کی طرف نظر کی اور کہا: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ» ''اے اللہ! میں گمراہ کرنے اور ہونے، کجرو ہونے اور کسی کو کرنے، ظالم اور مظلوم بننے اور طیش و جہالت کا

---

① صحیح البخاری: ۳۰۷۱؛ سنن أبی داود: ٤٠٢٤. ② صحیح، سنن أبی داود: ٤٥٢٠. ③ صحیح، سنن ابن ماجه: ٣٥٥٨. ④ صحیح، عمل الیوم واللیلة لابن السنی: ٢٧٤. ⑤ صحیح، سنن أبی داود: ٥٠٩٥؛ سنن ترمذی: ٣٤٢٢. ⑥ ضعیف، مسند أحمد: ٤٧١.

مظاہرہ کرنے اور کسی کے طیش کا نشانہ بننے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''[1] بقول ترمذی یہ حسن صحیح حدیث ہے۔

گھر میں داخل ہوتے وقت کے اذکار

① مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ فرمایا: ''جب کوئی گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور کھانا کھاتے ہوئے اللہ کا ذکر کرے، تو شیطان (اپنے ساتھیوں سے) کہتا ہے (اس گھر میں) نہ تمہارے لیے سونے کا ٹھکانہ ہے اور نہ رات کا کھانا (کوئی اور گھر ڈھونڈھو) اگر داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا، تب کہتا ہے تمہیں ٹھکانہ میسر ہوا، اسی طرح اگر کھانے کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو کہتا ہے لو کھانا بھی ملا۔''[2]

② ابوداود نے سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی گھر میں داخل ہونے لگے تو کہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا» پھر گھر والوں کو سلام کہے۔''[3]

③ ترمذی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ مجھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بیٹے! جب گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کہو یہ تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔''[4] بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔

گھر یا مال کی طرف سے خوشی ملنے پر مشروع ذکر

آدمی کو چاہیے کہ وہ اہل و مال کی کوئی خوشی دیکھے تو کہے: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا اور اگر کوئی پریشانی والا معاملہ دیکھے تو کہے: ''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلىٰ كُلِّ حَالٍ'' ہر حال میں اللہ کی حمد ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلَوْلَآ إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (الكهف: ٣٩)

''اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہ کہا جو اللہ نے چاہا، کچھ قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے۔''

ابن سنی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کسی کو اہل، مال یا اولاد کی کوئی خوشی دکھلائے تو کہے: «مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» تو موت کے سوا کوئی آفت نہ دیکھے گا۔''[5] (اگر موت مقدر ہے تو ٹھیک وگرنہ کوئی پریشانی لاحق نہ ہوگی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے مروی ہے کہ آپ جب کوئی خوشی دیکھتے تو فرماتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ» ''اللہ کی حمد ہے کہ جس کے فضل و کرم سے ہی اچھے کام کرنا نصیب ہوتا ہے۔'' اگر کوئی پریشانی دیکھتے تو کہتے:

---

① صحيح، سنن أبی داود: ٥٠٩٤؛ سنن ترمذی: ٣٤٢٢. ② صحيح مسلم: ٢٠١٨. ③ ضعيف، سنن أبی داود: ٥٠٩٦. ④ ضعيف، سنن ترمذی: ٢٦٩٨. ⑤ ضعيف، عمل اليوم والليلة: ٣٥٧.

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ» [1] اسے ابن ماجہ نے تخریج کیا، بقول حاکم یہ صحیح الاسناد ہے۔

آئینہ دیکھتے وقت کا ذکر

ابن سنی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آئینہ میں دیکھتے تو کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ» ''اے اللہ! جیسے تو نے میری خلقت اچھی بنائی ہے اسی طرح میرا اخُلق بھی اچھا بنا۔'' [2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آئینہ میں اپنا چہرہ مبارک دیکھتے تو کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَوّٰى خَلْقِيْ فَعَدَلَهٗ وَكَرَّمَ صُوْرَةَ وَجْهِيْ فَحَسَّنَهَا وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ» ''اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے متناسب جسم دیا میرے چہرے کو اچھا بنایا اور مجھے مسلمان بنایا۔'' [3]

مصیبت زدہ یا معذور کو دیکھ کر

ترمذی نے حسن کا حکم لگا کر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر کہا:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانِيْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِيْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلاً»

''اللہ کی حمد کہ اس نے مجھے تیرے جیسی ابتلاء سے محفوظ رکھا اور کثیر انسانوں سے میری حالت بہتر کی۔ تو اسے وہ مصیبت نہ پہنچے گی۔'' [4]

نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، علماء نے کہا: واجب ہے کہ یہ آہستگی سے کہے تاکہ وہ مصیبت زدہ نہ سنے کہ اسے دکھ نہ ہو (کہ مجھے مصیبت پڑی ہے اور یہ اللہ کا شکر کر رہا ہے) اِلّا یہ کہ یہ مصیبت کوئی معصیت (کی وجہ سے) ہو تب حرج نہیں کہ اسے سنا کر پڑھے (تاکہ عبرت ہو) بشرطیکہ کسی مفسدت کا ڈر نہ ہو۔

مرغ کے بانگ دینے، گدھے کے رینکنے اور کتے کے بھونکنے پر

شیخین نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا: ''جب گدھے کا رینکنا سنو تو تعوذ کرو، کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے اور مرغ کی بانگ سنو، تو اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو (مثلاً کہو: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ کہ اسے فرشتہ نظر آیا ہے۔'' [5] ابوداود کی ایک روایت میں ہے: ''جب رات کے وقت کتوں کا بھونکنا اور گدھوں کا

---

[1] حسن، سنن ابن ماجه: ٣٨٠٣؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٩٩. [2] صحيح، شعب الايمان: ٨١٨٤. [3] ضعيف، عمل اليوم والليلة لابن السنى: ١٦٥. [4] صحيح، سنن ترمذى: ٣٤٣٢. [5] صحيح البخارى: ٣٣٠٣؛ صحيح مسلم: ٢٧٢٩.

رینکنا سنو تو اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ یہ وہ کچھ دیکھتے ہیں جو تم نہیں دیکھتے۔‘‘[1]

آندھی چلنے پر

ابوداود نے حسن سند کے ساتھ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ہوا اللہ کی روح (رحمت) سے ہے، جو رحمت بھی لاتی ہے اور عذاب بھی، اگر یہ چلے تو اسے برا بھلا کہنے کی بجائے اللہ سے اس کی خیر اور اس کے شر سے اس کی پناہ کے طالب بنو۔‘‘[2]

مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آندھی چلنے پر یہ دعا پڑھتے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ خَیْرَهَا وَخَیْرَ مَا فِیْهَا وَخَیْرَ مَا أُرْسِلَتْ بِهٖ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا أُرْسِلَتْ بِهٖ»[3]

رعد و برق کی کڑک سننے پر

ترمذی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رعد اور بجلیوں کی کڑک سنتے تو کہتے: «اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ» ’’اے اللہ! ہمیں اپنے غضب کا شکار نہ بنانا اور اپنے عذاب سے ہمیں ہلاک نہ کرنا اور اس سے قبل ہی ہمیں بچا لینا۔‘‘[4]

رؤیتِ ہلال پر

طبرانی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہلال دیکھتے تو کہتے: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ أَهِلَّهٗ عَلَیْنَا بِالأَمْنِ وَالْإِیْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالإِسْلَامِ وَالتَّوْفِیْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی رَبُّنَا وَ رَبُّكَ اللّٰهُ» ’’اے اللہ! اسے امن و سلامتی کی نشانی بنا کر ہم پر اسے طلوع کر اور اس ماہ ایسے افعال کرنے کی توفیق دے جن سے تو خوش ہو جائے۔‘‘[5] ابوداود کے ہاں قتادہ سے مرسل روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہلال (نئے قمری مہینہ کا چاند پہلی دفعہ جب) دیکھتے تو تین مرتبہ کہتے: «هِلَالُ خَیْرٍ وَ رُشْدٍ آمَنْتُ بِاللّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَكَ» ’’خیر و رشد کا ہلال بن کر آنا میرا اس اللہ پر ایمان ہے۔ جس نے تجھے تخلیق کیا ہے۔‘‘ پھر کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا» ’’اللہ کا شکر ہے کہ فلاں مہینہ (بخیر و عافیت) گزر گیا اور فلاں مہینہ آ گیا۔‘‘[6]

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۵۱۰۳؛ الأدب المفرد للبخاری: ۱۲۲۳، ۱۲۲۴. [2] صحیح، سنن أبی داود: ۵۰۹۷؛ الأدب المفرد: ۹۰۶. [3] صحیح مسلم: ۸۹۹؛ سنن ترمذی: ۳۴۴۹. [4] ضعیف، الأدب المفرد: ۷۲۱؛ سنن ترمذی: ۳۴۵۰. [5] ضعیف، سنن الدارقطنی: ۱۶۹۴؛ صحیح ابن حبان: ۲۳۷۴. [6] ضعیف، سنن أبی داود: ۵۰۹۲، ۵۰۹۳.

کرب وحزن کے وقت کے اذکار (دعائے کرب)

① بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کرب کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے: ((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ)) [1]

② ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو کہتے: ((يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ)) [2]

③ انہیں کے ہاں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک آسمان کی طرف کرتے اور کہتے: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ)) اور نہایت توجہ اور خشوع سے دعا کرتے تو کہتے: ((يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ)) [3]

④ ابوداود نے سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مکروب (کسی کرب میں مبتلا) کی دعا یہ ہے: ((اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ فَلَاتَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ لَاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ)) [4]

⑤ انہی کی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت میں ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کرب کے وقت یہ کلمات پڑھا کرو: ((اَللّٰهُ اَللّٰهُ رَبِّيْ لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا)) ایک روایت میں ہے کہ سات مرتبہ یہ کہا کرو۔ [5]

⑥ ترمذی نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا: سیدنا یونس علیہ السلام کی مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا تھی: ((لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ)) کسی مسئلہ میں کوئی مسلمان اس کے ساتھ دعا نہ کرے گا، مگر اس کی طلب پوری ہوگی۔'' [6] ان کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ''میں ایک کلمہ جانتا ہوں، جو مکروب کہے گا تو اللہ اس سے اس کا کرب دور کر دے گا، وہ میرے بھائی یونس علیہ السلام کا کلمہ۔'' [7]

⑦ احمد اور ابن حبان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی کو کوئی غم یا پریشانی لاحق ہو تو وہ کہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ اِبْنُ عَبْدِكَ اِبْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ

---

① صحيح البخاري: ٦٣٤٥؛ صحيح مسلم: ٢٧٣٠. ② صحيح، سنن ترمذي: ٣٥٢٤؛ عمل اليوم والليلة: ٣٣٨.
③ ضعيف جدًا، سنن ترمذي: ٣٤٣٦؛ عمل اليوم والليلة لابن السني: ٣٣٧. ④ حسن، سنن أبي داود: ٥٠٩٠؛ الأدب المفرد للبخاري: ٧٠١. ⑤ صحيح، سنن ا بي داود: ١٥٢٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٨٨٢. ⑥ سنن ترمذي: ٣٥٠٠. ⑦ ضعيف، عمل اليوم والليلة للنسائي: ٦٥٥.

أَحداً مِنْ خَلْقِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجَلاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ»

''اے اللہ! میں تیرا عبد ہوں، تیرے عبد کا بیٹا ہوں، میری والدہ بھی تیری بندی ہے، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا حکم مجھ پہ چلتا ہے، تیری قدر و قضا کے میں تابع ہوں، تیرے سب اسمائے حسنی کے ساتھ جو تونے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتلائے ہیں یا وہ صرف تیرے علمِ غیب میں ہیں، تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا سرور، میرے غم کا مداوا اور پریشانی کا علاج بنا دے۔ تو اللہ اس کا حزن اور پریشانی دور کر دے گا اور اسے فرحت میں بدل دے گا۔''①

دشمن سے سامنا ہونے اور حاکم کا خوف لاحق ہونے پر ذکر

ابو داود اور نسائی نے سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی دشمن کا خوف ہوتا (کہ حملہ آور ہو جائیں گے) تو یہ دعا پڑھتے: «اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ» ''اے اللہ! ہم دشمنوں کے سامنے تجھے کر رہے ہیں (تو انہیں ملیامیٹ کر) اور ان کے شرور سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔''②

ابن سنی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جہادی مہم پر تھے کہ یہ دعا کی: «يَا مَالِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ» سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، تو میں نے (دشمنوں کے) کئی آدمیوں کو دیکھا کہ فرشتے انہیں آگے اور پیچھے سے پچھاڑ رہے ہیں۔③

① سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سلطان وغیرہ سے خوف محسوس ہو تو کہو: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمِ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّيْ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ» یعنی اے جس کے سوا کوئی الہ نہیں تو حلیم، کریم، پاک، ساتوں آسمانوں، زمین اور عرشِ عظیم کا رب ہے، تیری طاقت کا کیا مقابلہ جو تیری پناہ میں آیا اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔''④

بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ «حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» وہ کلمہ ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکوایا گیا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا جب آپ سے کہا گیا: ''إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ'' لوگ آپ کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔⑤

---

① صحيح، مسند أبي يعلى: ٥٢٩٧؛ صحيح ابن حبان: ١٨٧٢. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٥٣٧؛ عمل اليوم والليلة للنسائي: ٦٠١. ③ ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ٥١٠٥. ④ ضعيف جدًا، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٣٣٥. ⑤ صحيح البخاري: ٤٥٦٣، ٤٥٦٤.

سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے مقدمہ کا فیصلہ کیا، جس آدمی کے خلاف یہ فیصلہ ہوا وہ واپس جاتے ہوئے کہنے لگا: «حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ عجز پر ملامت کرتا ہے، لیکن دانائی کی روش اختیار کرو! جب کسی معاملہ میں تم مغلوب ہوجاؤ تو کہو: «حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ»'' [1]

جب کوئی مشکل مرحلہ درپیش ہو (مثلاً امتحانات وغیرہ)

ابن سنی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا (بھی) کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ لَا سَهْلَ إِلَّا مَا جَعَلْتَهُ سَهْلًا وَأَنْتَ تَجْعَلُ الْحَزْنَ إِذَا شِئْتَ سَهْلًا» ''اے اللہ! سہل وہی ہے جو تو سہل بنائے اور تو چاہے تو مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔'' [2]

تنگی معاش کے وقت

ابن سنی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے لیے کیا مانع ہے کہ جب معاش کی تنگی ہو رہی ہو، تو گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھو:

«بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِيْ وَمَالِيْ وَدِيْنِيْ اَللّٰهُمَّ رَضِّنِيْ بِقَضَائِكَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا قُدِّرَ حَتّٰى لَا أُحِبَّ تَعْجِيْلَ مَا أَخَّرْتَ وَلَا تَأْخِيْرَ مَا عَجَّلْتَ»

''اے اللہ! میری جان، مال اور دین کی نگہداشت فرما، مجھے اپنی قضا وقدر پر راضی کر اور جو میرے لیے مقدر کیا گیا ہے اس میں برکت فرما یہاں تک کہ میں یہ بات پسند نہیں کہ وہ مجھے جلدی ملے جس میں تو نے تاخیر کی اور اس میں تاخیر ہو جو تو میرے لیے جلدی کرے۔'' [3]

مقروض ہونے پر

① ترمذی نے حسن قرار دیتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک مکاتب (یہ وہ غلام جس سے مالک نے معاہدہ کیا ہے کہ اتنے ایام میں اتنے پیسے جمع کر کے دے دو تو تم آزاد) ان کے پاس آیا اور کہا میں کتابت (کے مال کے جمع) سے عاجز ہوا ہوں میری امداد کیجیے تو کہنے لگے: تمہیں وہ کلمات نہ سکھلا دوں جو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلائے تھے اور کہا تھا: ''اگر تجھ پر صبر پہاڑ (یہ قبیلہ طے کے علاقہ کا ایک پہاڑ ہے) جتنا بھی قرض چڑھ گیا ہو تو اللہ تعالیٰ چکانے کی سبیل بنا دے گا؟''

---

① ضعيف، سنن أبي داود: ٣٦٢٧. ② صحيح، صحيح ابن حبان: ٩٧٤. ③ ضعيف جدًا، عمل اليوم والليلة: ٣٥٠.

وہ یہ ہیں: ((اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَأَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ)) ''اے اللہ! مجھے حلال کے ساتھ حرام سے کفایت دے اور اپنے فضل کے ساتھ اپنے غیر سے مجھے مستغنی کر۔''[1]

② سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے، تو سیدنا ابوامامہ انصاری رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو پوچھا: ''اے ابوامامہ! کیا بات ہے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہو، حالانکہ ابھی نماز کا وقت نہیں؟ عرض کی: یا رسول اللہ! کئی پریشانیوں اور قرضوں نے گھیرا ہوا ہے، فرمایا: ''تمہیں ایک دعا نہ سکھلا دوں، جو اگر پڑھو تو اللہ تعالیٰ تمہاری پریشانی دور کرے گا اور قرض چکا دے گا؟'' عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: ''صبح وشام یہ کلمات کہا کرو: ((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعِجْزِ وَالْكَسَلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ)) ''اے اللہ! میں عجز، کسل، بزدلی اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں نیز قرض کے غلبہ سے اور لوگوں کے قہر سے۔'' کہتے ہیں: میں نے ان الفاظ کا ورد شروع کیا تو اللہ تعالیٰ جلد ہی میری پریشانیوں کو لے گیا اور سارا قرض ادا ہو گیا۔[2]

کوئی ناگوار صورتحال پیدا ہونے اور مغلوب الامر ہونے پر

ابن سنی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر چیز میں انا للہ پڑھا کرو حتی کہ جوتے کے تسمہ میں بھی کہ یہ بھی (اس کا نہ ہونا یا ٹوٹ جانا) مصائب میں سے ہے۔''[3] مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قوی مومن بہتر اور اللہ کو زیادہ پسند ہے، بنسبت ضعیف مومن کے البتہ خیر دونوں میں ہے، اس چیز کی حرص کرو، جو تمہیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو اور عاجز ہو کر نہ بیٹھو، اگر کوئی نقصان اور مصیبت وغیرہ پہنچے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں یہ کر لیتا تو یہ ہوتا یا یہ ہوتا لیکن کہو: ((قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ)) وہی ہوتا ہے جو منظورِ الٰہی ہوتا ہے۔ کیونکہ (لَوْ) (اگر/کاش) شیطان کا راستہ کھولتا ہے۔''[4]

دل میں شک لاحق ہونے پر

① بخاری ومسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان دل میں وسواس ڈالتا اور کہتا ہے اس کا خالق کون؟ اس کا خالق کون؟ حتی کہ آخر کار کہتا ہے، اللہ کا خالق کون ہے؟ جب معاملہ اس حد تک پہنچے تو ((أَعُوْذُ بِاللّٰهِ)) پڑھو اور رک جاؤ۔''[5]

② نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(کئی) لوگ مسلسل پوچھتے رہیں گے، حتی کہ کہا جائے گا، اللہ نے یہ ساری مخلوق پیدا کی ہے، لیکن اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ تو جس کے دل میں اس طرح کا خیال آئے وہ کہے: ((آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ))[6]

---

[1] حسن، سنن ترمذی: ٣٥٥٨؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٥٣٨. [2] ضعيف، سنن أبي داود: ١٥٥٥. [3] ضعيف، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٣٥٢. [4] صحيح مسلم: ٢٦٦٤؛ سنن ابن ماجه: ٧٩. [5] صحيح البخاري: ٣٢٧٦؛ صحيح مسلم: ١٣٤. [6] صحيح، سنن أبي داود: ٤٧٢١، ٤٧٢٢.

غصہ طاری ہونے پر

بخاری و مسلم نے سیدنا سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ دو آدمی باہم تو تکار کرنے لگے، ایک کا چہرہ سرخ اور رگیں پھول گئی تھیں، آپ نے فرمایا: ''میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کہہ لے تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے، وہ ہے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» ـ''[1]

نبی کریم ﷺ کی چند جامع دعائیں

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دعائیں کرتے ہوئے جامع و مانع قسم کے الفاظ استعمال فرماتے تھے، درج ذیل آپ کی چند ضروری دعائیں ذکر کی جاتی ہیں:

① سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ»[2]

② مسلم نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ ایک بیمار مسلمان کی عیادت کو تشریف لائے جو اتنا کمزور ہو چکا تھا گویا پوٹ ہو، فرمایا: ''کیا تم کوئی خاص دعا کرتے رہے یا اللہ سے کوئی خاص چیز مانگتے رہے؟'' کہنے لگا: جی ہاں میں اکثر یہ دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! جو تو آخرت میں میری معاقبت کرنا چاہتا ہے، وہ دنیا ہی میں کر لے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! تجھ میں یہ سہنے کی طاقت ہے؟ کیوں نہ یہ دعا کی: «اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ»[3]

③ احمد اور نسائی نے نقل کیا کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کو یہ دعا کرتے سنا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں، جس کے اتنے اتنے اور ایسے ایسے دالان ہوں اور محلات ہوں اور آگ سے پناہ مانگتا ہوں اور اس کی اَغلال و سلاسل سے، سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے تم نے تو اللہ سے خیرِ کثیر مانگی اور شرِ کثیر سے اس کی پناہ چاہی، میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا فرماتے تھے: ''عنقریب ایسے لوگ ہوں گے جو دعا کرنے میں حد سے تجاوز کیا کریں گے (بے تکی اور بے جا طویل دعائیں کریں گے) یہی کہنا تمہیں کافی ہے کہ اے اللہ! میں تجھ سے ہر طرح کی خیر مانگتا ہوں جو تیرے علم میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا اور ہر شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو تیرے علم میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔''[4]

انہی کی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی منجملہ دعاؤں کے یہ دعا بھی ہے:

«رَبِّ أَعِنِّيْ وَلَا تُعِنْ عَلَيَّ وَانْصُرْنِيْ وَلَا تَنْصُرْ عَلَيَّ وَأَمْكُرْ لِيْ وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ وَاهْدِنِيْ

---

[1] صحيح بخاري: ٣٢٨٢. [2] صحيح البخاري: ٤٥٢٢؛ صحيح مسلم: ٢٦٩٠. [3] صحيح مسلم: ٢٦٨٨؛ مسند أحمد: ٣/ ١٠٧؛ سنن ترمذي: ٣٤٨٧. [4] حسن، سنن أبي داود: ٩٦؛ سنن ابن ماجه: ٣٨٦٤.

وَيَسِّرِ الْهُدٰى لِيْ وَانْصُرْنِيْ عَلٰى مَنْ بَغٰى عَلَيَّ رَبِّ اجْعَلْنِيْ لَكَ شَكَّاراً لَكَ ذَكَّاراً لَكَ رَهَّاباً لَكَ مِطْوَاعاً لَكَ مُخْبِتاً أَوَّاهاً إِلَيْكَ مُنِيْباً، رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِيْ وَاغْسِلْ حَوْبَتِيْ وَأَجِبْ دَعْوَتِيْ وَثَبِّتْ حُجَّتِيْ وَسَدِّدْ لِسَانِيْ وَاهْدِ قَلْبِيْ وَاسْلُلْ سَخِيْمَةَ صَدْرِيْ »

''اے اللہ! میری مدد اور نصرت کر، میرے خلاف نہیں، میرے کام سنوار، بگاڑ نہیں، مجھے ہدایت دے اور اسے میرے لیے آسان بنا، مجھے اپنا بہت شکر کرنے والا، بہت ذکر کرنے والا، تجھ سے بہت ڈرنے والا اور بہت اطاعت گزار اور تضرع کرنے والا بنا، اے رب میری توبہ قبول کر، میرے گناہ دھو ڈال، میری حجت قائم رکھ، راست گو اور ہدایت یافتہ دل والا بنا اور میرے سینے کو کینے و بغض سے صاف فرما۔''①

مسلم نے سیدہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی کیا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا زَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا إِنَّكَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا »

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں عاجزی اور کاہلی سے، بخیلی، بزدلی اور بڑھاپے سے اور قبر کے عذاب سے اے اللہ! میرے نفس کو تقوی کی دولت عطا فرما اور نفس کی پاکیزگی، غیر نافع علم، نہ ڈرنے والے دل، لالچی طبیعت اور نہ قبول ہونے والی دعا سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔''②

مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''کیا تم اجتہاد فی الدعا (دعا کرتے ہوئے پوری توجہ اور خشوع) کے طالب ہو؟'' عرض کی: جی ہاں فرمایا: ''تو کہا کرو:

«اَللّٰهُمَّ أَعِنَّا عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ »

اے اللہ! اپنا ذکر کرنے، شکر کرنے اور عمدگی سے اپنی عبادت کرنے میں ہماری اعانت فرما۔''③

احمد کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: « يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ » کو باقاعدگی سے (دعاؤں میں) کہا کرو۔''④

انہی کے ہاں ایک روایت میں ہے کہ آپ کہا کرتے تھے: « يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ » ''اے دلوں کے پھیرنے والے تو اپنے دین پر میرا دل ثابت رکھ۔'' فرمایا: ''میزان رحمن کے ہاتھ میں ہے وہ بعض کو رفعت عطا کرے گا اور بعض کو گرا دے گا۔''⑤ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی کیا کرتے تھے:

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٥٠١، سنن ترمذي: ٣٥٤٦،سنن ابن ماجه: ٣٨٣٠. ② صحيح مسلم: ٢٧٢٢، سنن ترمذي: ٣٥٦٧. ③ صحيح، المستدرك للحاكم: ١/ ٤٩٩. ④ صحيح، سنن ترمذي: ٣٥٢٥، المستدرك للحاكم: ١/ ٤٩٩. ⑤ صحيح، سنن ترمذي: ٣٥١٧.

«اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفَجْأَةِ نَقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ»

''اے اللہ! میں نعمت کے زوال، عافیت ختم ہونے، اچانک تیرا عذاب آ جانے اور تیری ناراضی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''[1]

ترمذی نے آپ سے یہ دعا نقل کی:

«اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا يَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْماً وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلیٰ كُلِّ حَالٍ وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ»

''اے اللہ! جو بات تو نے مجھے سکھائی ہے اس سے تو مجھے فائدہ دے، اور فائدہ دینے والی بات مجھے سکھا دے اور میرے علم کو بڑھا دے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں البتہ اہلِ نار کے حال سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔''[2]

لیکن الحمدللہ سے آخر تک حصہ ضعیف ہے۔ مسلم نقل کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس آئیں اور عرض کی: کام کاج کے لیے کوئی خادم عطا کریں، فرمایا: یہ کلمات کہا کرو:

«اَللّٰهُمَّ رَبُّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْأَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْئٍ مُنَزِّلَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوىٰ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْئٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْئٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْئٌ اِقْضِ عَنِّی الدَّيْنَ وَأَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ»

''اے اللہ! اے آسمانوں اور زمین کے رب! اور ہر چیز کے رب! اے دالے اور گٹھلی کو اگانے (پھاڑنے) والے! تورات، انجیل اور قرآن عظیم کو نازل کرنے والے، میں ہر جانور کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جس کی پیشانی تیرے قبضے میں ہے: اے اللہ تو اول بھی ہے آخر بھی تو ہی ظاہر اور تو ہی باطن ہے کوئی تجھ سے فائق نہیں اور کوئی چیز تجھ سے چھپی ہوئی نہیں مجھے فقر سے بچا اور قرض کی ادائیگی کا سامان کر۔''[3]

آپ سے یہ دعا بھی مروی ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ الْهُدیٰ وَالتُّقیٰ وَالْعَفَافَ وَالْغِنیٰ» ''اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقوی، حلال وحرام کی تمیز اور تونگری مانگتا ہوں۔''[4] ترمذی نے اسے حسن کہا۔

اور حاکم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس سے اٹھتے تو اکثر اپنے صحابہ کے لیے یہ دعا کر کے اٹھتے:

«اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعْصِيَتِكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا

---

[1] صحيح مسلم: ٢٧٣٩، سنن أبي داود: ١٥٤٥. [2] صحيح، سنن ترمذي: ٣٥٩٩. [3] صحيح مسلم: ٢٧١٣، سنن أبي داود: ٥٠٥١. [4] صحيح مسلم: ٢٧٢١، سنن ترمذي: ٣٤٨٩.

بِهِ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تَهُوْنُ بِهِ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا ﴾

''اے اللہ! ایسی خشیت دے، جو ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے، ایسی اطاعت دے جو تیری جنت کا حقدار بنا دے، ایسا یقین دے کہ اس کے سامنے دنیا کے مصائب ہیچ ہوں، جب تک زندگی قائم ہے تو ہماری تمام جسمانی قوتوں کو برقرار رکھ، ہمارا وارث ہمی سے بنا، ہم پہ ظلم ڈھانے والوں سے ہمارا بدلہ لے اور دشمنوں کے خلاف ہماری مدد فرما، ہمیں دین کے فتنہ و مصیبت سے محفوظ رکھ، ہم صرف دنیا کے ہی نہ ہو کے رہ جائیں اور ہم پر ایسے حکمران نہ مسلط کر جنہیں ہم پہ کوئی ترس نہ آئے۔''[1]

نبی کریم ﷺ پر درود وسلام

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

''بے شک اللہ نبی کریم ﷺ پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے آپ پر درود وسلام، اے ایمان والو تم بھی (نبی کریم ﷺ پر) درود وسلام بھیجا کرو۔''(الأحزاب:٥٦)

نبی کریم ﷺ پر صلاۃ کا معنی

بخاری نے نقل کیا کہ ابو عالیہ نے کہا: اس سے مراد (آیت میں) فرشتوں کے پاس اللہ کا آپ کی تعریف وتوصیف کرنا، اور فرشتوں کی آپ پر صلاۃ دعا ہے، ترمذی نے ذکر کیا کہ سفیان ثوری اور متعدد اہلِ علم سے منقول ہے کہ اللہ کی صلاۃ رحمت اور فرشتوں کی صلاۃ استغفار ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے بندوں کو ملاءِ اعلیٰ میں اپنے ہاں آپ کے رتبہ اور قدر کی خبر دی ہے کہ وہ مقرب فرشتوں کے سامنے آپ کی ثنا وتوصیف کرتا ہے اور فرشتے بھی آپ پر درود بھیجتے ہیں پھر اللہ نے اس عالمِ سفلی کے ساکنین کو حکم دیا کہ وہ بھی آپ پر درود وسلام بھیجا کریں تاکہ سب علوی اور سفلی عالمین کی ثنا آپ کے لیے جمع ہو، اس ضمن میں کثیر احادیث ہیں چند کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

① مسلم نے سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ایک دفعہ مجھ پر درود پڑھا، اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا۔''[2]

---

[1] حسن، سنن ترمذی: ٣٥٠٢. [2] صحیح مسلم: ٣٨٤؛ سنن أبی داود: ١٥٣٠.

② ترمذی نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز میرے قریب شخص وہ ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود پڑھنے والا ہوگا۔''[1] ترمذی کے بقول یہ حسن ہے مراد یہ کہ مجلس کے لحاظ سے مجھ سے اقرب اور شفاعت کا زیادہ حقدار۔

③ ابوداود نے بسند صحیح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر کو عید نہ بنالینا اور مجھ پر درود پڑھا کرو کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔''[2]

④ ابوداود اور نسائی نے سیدنا اوس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے دنوں میں سے سب سے افضل دن جمعہ ہے، پس تم اس دن کثرت سے مجھ پر درود بھیجو، بے شک تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' صحابہ نے عرض کی: آپ پر وہ کیسے پیش کیا جائے گا، جبکہ آپ تو خاک میں پنہاں ہو جائیں گے؟ فرمایا: ''اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ وہ انبیا کے اجساد کو کھائے (وہ مٹی نہیں بنتے)۔''[3]

⑤ سنن ابوداود میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مجھ پر سلام نہیں بھیجتا مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹاتا ہے، حتی کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''[4]

⑥ احمد نے سیدنا ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے نہایت خوش وخرم انداز میں صبح کی اور آپ کے چہرہ مبارک سے خوشی پھوٹ تھی، صحابہ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ''میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اور کہا: آپ کی امت میں سے جس نے ایک دفعہ آپ پر درود پڑھا، اللہ اس کے عوض دس نیکیاں لکھ دے گا، اس سے دس گناہ مٹا کرے گا اور اس کے دس درجے بلند کرے گا اور اس کا مثل اس پر واپس کرے گا۔''[5] بقول ابن کثیر رحمہ اللہ اس کی سند جید ہے۔

⑦ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ فرمایا: ''جسے یہ بات اچھی لگے کہ اس کے لیے پیمانہ بھر کر تولا جائے تو وہ جب ہم اہل بیت پر درود پڑھے تو کہے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ اَلنَّبِيِّ وَأَزْوَاجِهِ أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَتِهِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ» [6] اسے ابوداود اور نسائی نے نقل کیا۔

⑧ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دو تہائی رات گزرنے پر اٹھتے اور فرماتے: ''اے لوگو! اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، پہلا نفخہ آنے والا ہے جس کے بعد ایک اور آئے گا اور پھر ہر طرف موت کا راج ہوگا۔ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: میں کثرت سے آپ پر درود پڑھتا ہوں، تو اپنے منجملہ وظائف کا کتنا حصہ آپ پر درود کے لیے خاص کروں؟ فرمایا: ''جو تم چاہو۔'' عرض کی: چوتھا حصہ؟ فرمایا: ''جو چاہو اگر زیادہ کرلو تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا: نصف؟ فرمایا: ''جو چاہو اگر اضافہ کرلو تو بہتر ہے۔'' عرض کی: دو تہائی؟ فرمایا: ''جو چاہو اور اگر زیادہ کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔'' میں نے کہا: پھر ہمہ

---

① حسن لغیرہ، سنن ترمذی: ٤٨٤؛ صحیح ابن حبان: ٢٢٣٨٩. ② صحیح، سنن أبی داود: ٢٠٤٢؛ مسند أحمد: ٢/ ٢٣٧. ③ صحیح، سنن أبی داود: ١٠٤٧؛ سنن ابن ماجه: ١٠٥٨. ④ حسن، سنن أبی داود: ٢٠٤١.
⑤ حسن، مسند أحمد: ٤/ ٢٩، ٣٠؛ عمل الیوم واللیلة للنسائی: ٦٠. ⑥ ضعیف، سنن أبی داود: ٩٨٢.

وقت میں درود ہی پڑھتا رہوں گا، فرمایا: ''تب پریشانیوں میں یہ تمہارے لیے کافی ہوگا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت ہوگی۔''[1] اسے ترمذی نے نقل کیا۔

کیا جب بھی آپ کا نامِ نامی ذکر ہو آپ پر درود پڑھنا واجب ہے؟

علماء کی ایک جماعت اسے واجب سمجھتی ہے، ان میں طحاوی اور حلیمی بھی ہیں، ان کی بنائے استدلال ترمذی کی حسن قرار دی ہوئی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس شخص کا ناک خاک آلود ہو، جس کے پاس میرا ذکر ہوا اور اس نے درود نہ پڑھا، اس کا بھی جسے رمضان کا مہینہ ملا اور پھر ختم بھی ہو گیا اور وہ اپنے گناہوں کی بخشش نہ کروا سکا، اور اس کا بھی جس کے والدین اس کے پاس بوڑھے ہوئے مگر پھر بھی وہ (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہو سکا۔''[2]
اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مدِنظر جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''سب سے بڑھ کر بخیل وہ ہے، جس کے پاس میرا ذکر ہوا تو اس نے درود نہ پڑھا۔''[3]

دیگر کی رائے یہ ہے کہ ایک مجلس میں ایک دفعہ پڑھنا واجب ہے، پھر بقیہ اس مجلس میں (اگر بار بار آپ کا نام ذکر ہو تو) واجب نہیں بلکہ مستحب ہے کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی اہلِ مجلس نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور مجھ پر درود نہ پڑھا تو روزِ قیامت یہ اہلِ مجلس بڑے نقصان میں ہوں گے اور ان کا معاملہ اللہ کی مشیت پر متوقف ہوگا چاہے تو انہیں عذاب دے اور چاہے تو مغفرت کر دے۔''[4] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن ہے۔

آپ کا نام لکھنے پر صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا استحباب

علماء نے مستحب قرار دیا ہے کہ جب بھی آپ کا نام نامی لکھا جائے تو ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا جائے البتہ اس کے بارے میں کوئی حدیث وارد نہیں جو قابلِ احتجاج ہو، خطیب بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: میں نے امام احمد رحمہ اللہ کی تحریر دیکھی کہ کثیر دفعہ وہ نام نامی لکھتے مگر ساتھ درود نہ لکھتے اور مجھے یہ بات پہنچی کہ وہ زبانی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ لیتے تھے۔

صلاۃ اور تسلیم کے مابین جمع کرنا

علامہ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں جب کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے تو اسے چاہیے کہ صلاۃ اور تسلیم دونوں کے مابین جمع کرے مثلاً فقط: (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ) یا صرف (عَلَيْهِ السَّلَامُ) نہ کہے (بلکہ دونوں لفظ کہے)۔

دیگر انبیا پر درود

دوسرے انبیاء اور فرشتوں پر بھی مستقلاً درود پڑھنا (جب ان کا نام ذکر کرے) مستحب ہے، جہاں تک غیر انبیاء تو علماء کا

---

[1] حسن، سنن ترمذی: ٢٤٥٧؛ المستدرك للحاكم: ٢/ ٤٢١، ٥١٣. [2] صحيح، سنن ترمذی: ٣٥٤٥؛ مسند أحمد: ١/ ٢٠١. [3] ضعيف، سنن ترمذی: ٣٥٤٠. [4] صحيح، سنن ترمذی: ٣٣٧٠.

اتفاق ہے کہ ان پر تبعاً (اصلاً کسی نبی پر درود پڑھا اور آگے ساتھ میں انہیں بھی ذکر کر دیا جیسے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ توصرف صَلِّ عَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ پڑھنا جائز نہیں) درود پڑھا جا سکتا ہے، جیسے درودِ ابراہیمی میں گزرا: (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ اَلنَّبِیِّ وَأَزْوَاجِہٖ أُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ)الخ لیکن استقلالاً ان پر درود پڑھنا مکروہ ہے لہٰذا مثلاً سیدنا ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہا جائے۔

نبی کریم ﷺ پر صلاۃ وسلام کے الفاظ

مسلم نے ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ بشیر بن سعد نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اللہ نے ہمیں آپ پر صلاۃ کا حکم دیا ہے، تو ہم کن الفاظ کے ساتھ یہ کریں؟ نبی کریم ﷺ اس پر دیر تک خاموش رہے حتی کہ ہماری خواہش ہوئی کہ کاش وہ یہ نہ پوچھتے پھر فرمایا کہو: «اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍکَمَا صَلَّیْتَ عَلیٰ آلِ إِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلیٰ آلِ إِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ» اور سلام تو تم جانتے ہی ہو۔"[1]

ابن ماجہ نے ابن سعد سے نقل کیا کہ کہا جب تم نبی کریم ﷺ پر صلاۃ بھیجو تو عمدگی سے کرو کہ تم نہیں جانتے شاید یہ آپ پر پیش کیا جاتا ہو، لوگوں نے کہا: تب ہمیں سکھلایئے، کہا یہ الفاظ کہا کرو:

«اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ وَبَرَکَاتِكَ عَلیٰ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَإِمَامِ الْمُتَقَدِّمِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ إِمَامِ الْخَیْرِ وَقَائِدِ الْخَیْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَةِ اَللّٰھُمَّ ابْعَثْهُ مَقَاماً یَغْبِطُهُ بِهِ الْأَوَّلُوْنَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍکَمَا صَلَّیْتَ عَلیٰ إِبْرَاھِیْمَ وَآلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلیٰ إِبْرَاھِیْمَ وَ آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ»

"یا اللہ! تو اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما، رسولوں کے سردار، متقین کے امام اور آخری نبی محمد ﷺ پر جو تیرے بندے، رسول، نیکی کے امام ورہبر اور رسول رحمت ہیں، یا اللہ! اپنی مقام محمد پر فائز فرما، جس کی وجہ سے سب اگلے پچھلے لوگ ان پر رشک کریں، یا اللہ! محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہم پر رحمت نازل فرمائی، بے شک تو ہی تعریفوں کے لائق اور بزرگی والا ہے، یا اللہ! محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر اسی طرح برکت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر برکت نازل فرمائی، بے شک تو ہی تعریفوں کے لائق اور بزرگی والا ہے۔"[2]

---

[1] صحیح مسلم:٤٠٥؛سنن ترمذی:٣٢١٨. [2] ضعیف، سنن ابن ماجہ: ٩٠٦؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ٨٦١٣.

سفر کے بارے وارد روایات

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سفر کیا کرو تم تندرست رہو گے (آب و ہوا کی تبدیلی کے صحت پر خوشگوار اثرات ہوں گے) اور جہاد تمہیں غنی بنا دے گا۔''[1] اسے احمد نے نقل کیا اور مناوی نے صحیح قرار دیا۔

اللہ کے ہاں محبوب امر کی خاطر نکلنا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بھی کوئی اپنے گھر سے باہر جاتا ہے، تو اس کے دروازے پر دو جھنڈے ہوتے ہیں، ایک فرشتہ کے ہاتھ میں اور دوسرا شیطان کے ہاتھ میں، اگر وہ اللہ کو پسند کسی امر کے لیے جائے تو فرشتہ اپنے جھنڈے سمیت اس کے پیچھے جاتا ہے اور وہ واپس ہونے تک فرشتہ کے جھنڈے تلے رہتا ہے اور جو اللہ کو ناراض کرنے والے کام میں نکلتا ہے تو شیطان اپنے جھنڈے کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تو وہ واپس آنے تک شیطان کے جھنڈے تلے رہتا ہے۔''[2] اسے احمد اور طبرانی نے نقل کیا اور اس کی سند جید ہے۔

سفر پر جانے سے قبل مشورہ اور استخارہ کرنا

مناسب ہے کہ سفر پر نکلنے سے پہلے اہلِ خیر و صلاح سے مشورہ کرے، کیونکہ حکمِ خداوندی ہے: ﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آل عمران:۱۵۹) ''اہلِ اسلام سے مشورہ کیا کریں۔'' اور اہل ایمان کے وصف میں اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوری:۳۸) ''مسلمانوں کو اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کرنے چاہئیں۔'' قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کسی قوم نے اللہ کی رضا جوئی طلب کرتے ہوئے باہم مشورہ نہیں کیا مگر وہ اپنے بہتر تر معاملہ کی طرف رہنمائی دیے جاتے ہیں۔

اللہ سے استخارہ (طلبِ خیر) کرنا بھی مناسب ہے، مسند احمد میں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کی خوش بختی سے ہے کہ اللہ سے خیر کی طلب کرے اور اس کی خوش بختی سے ہے کہ وہ راضی برضا ہو اور اس کی بدبختی سے ہے کہ استخارہ کا ترک کرے اور اس کی بدبختی کی علامت ہے کہ وہ قضا پر ناراضی کا اظہار کرے۔''[3] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وہ شخص نادم نہ ہوگا جس نے اللہ سے طلب خیر کی اور اس کی مخلوق سے مشاورت کی۔

استخارہ کا طریقہ

دو رکعت نفل پڑھے، یہ فرائض کی سنتیں یا تحیۃ المسجد بھی ہوسکتی ہیں، رات یا دن کے کسی بھی وقت، ان میں فاتحہ کے بعد جو چاہے (سورت یا آیات) پڑھے پھر اللہ کی حمد کرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے پھر وہ دعائیہ الفاظ پڑھے، جو بخاری کی

---

[1] ضعیف، مسند أحمد: ۲/ ۳۸۰. [2] حسن، مسند أحمد: ۲/ ۳۲۳؛ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا۔
[3] ضعیف، مسند أحمد: ۱/ ۶۸؛ مجمع الزوائد: ۲/ ۲۷۹.

ایک روایت میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مذکور ہیں، کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تمام امور میں استخارہ کی دعا اسی طرح سکھلائی جیسے کوئی قرآنی سورت کی تعلیم دے رہے ہوں، فرمایا: جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہو تو غیر فرض دو رکعت پڑھو پھر (بعد ازاں) دعا کرتے ہوئے یہ کلمات کہو:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ

(فرمایا: یہاں الامر کی جگہ اپنا کام اور حاجت ذکر کرے)

خَيْرٌ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ (یا کہا: عَاجِلِ أَمْرِيْ وَآجِلِهِ) فَاقْدِرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ (یا کہا: عَاجِلِ أَمْرِيْ وَآجِلِهِ) فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَاقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ أَرْضِنِيْ بِهِ»

''اے اللہ! میں تیرے علم اور تیری قدرت کے باوصف تجھ سے خیر کا اور تیرے عظیم فضل کا تجھ سے طالب ہوں، بے شک تجھے کامل قدرت حاصل ہے اور مجھے حاصل نہیں اور تو جانتا ہے میں نہیں جانتا اور تو علام الغیوب ہے، اے اللہ! اگر تیرے علم میں میرا یہ معاملہ۔ اپنے کام اور حاجت کا نام ذکر کرے۔ دین، معاش اور انجام کار کے لحاظ سے میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرے مقدر میں کر دے اور اسے میرے لیے آسان بنا دے اور اگر یہ میرے دین، معاش اور انجام کار کے لحاظ سے میرے لیے شر ہے تو اسے مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور جہاں میرے لیے خیر ہے اسے میرے نصیب میں کر اور مجھے اس پہ راضی کر دے۔''[1]

ان رکعتوں میں کوئی مخصوص سورت یا آیات قراءت کرنے کے بارے کچھ وارد نہیں، جیسا کہ اس کے استحباب تکرار کے بارے بھی کچھ وارد نہیں بقول امام نووی رحمہ اللہ استخارہ کرنے کے بعد پھر وہ کام کرے جس کے لیے اس کے ہاں شرح صدر ہو، البتہ استخارہ سے پہلے کے شرح صدر (اور میلان) پر اعتماد نہ کرے اور جس پر اس کی خواہش تھی بلکہ استخارہ کرنے والے کے لیے مناسب ہے کہ اپنا ذہن کھلا چھوڑ دے اور کسی خاص کام کی طرف اپنا میلان نہ رکھے، وگرنہ تو وہ اللہ سے استخارہ کرنے والا نہ ہوا، بلکہ صادق الطلب ہی نہ ہوا اور نہ اللہ پر اپنا معاملہ چھوڑنے والا بنا۔

جمعرات کے دن سفر شروع کرنے کا استحباب

بخاری نے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر جب سفر کا ارادہ بناتے تو جمعرات کو اس کا آغاز کرتے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري: ١١٦٢؛ سنن أبي داود: ١٥٣٨. [2] صحيح البخاري: ٢٩٤٩.

روانگی سے قبل نماز کا استحباب

سیدنا مُطعم بن مقداد رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کسی نے سفر پر جاتے ہوئے اپنے اہل خانہ کے پاس دو رکعتوں سے افضل چیز نہیں چھوڑی جو وہ جانے سے پہلے پڑھے۔''[1] اسے طبرانی اور ابن عساکر نے نقل کیا اور اس کی سند معضل یا مرسل ہے۔

ساتھیوں اور دوستوں کے ہمراہ جانے کا استحباب

① احمد نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے تنہائی سے منع فرمایا اور یہ کہ آدمی اکیلا رات گزارے یا اکیلا سفر کرے۔[2]

② عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اکیلا سفر کرنے والا شیطان ہے اور دو بھی، قافلہ تو تین افراد سے بنے گا۔''[3]

جاتے وقت اہل و اقارب سے الوداع اور ان سے دعا کا خواہاں ہونے اور ان کے لیے دعا کرنے کا استحباب

① ابن سنی اور احمد نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو سفر کا ارادہ کرے، وہ گھر والوں وغیرہ سے کہے: «أَسْتَوْدِعُكُمُ اللَّهَ الَّذِيْ لَا تَضِيْعُ وَدَائِعُهُ» ''میں تمہیں اس اللہ کے حوالے کرتا ہوں جس کے پاس رکھی گئی امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔''[4]

② احمد نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی چیز اللہ کے حوالے کی جائے تو وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔''[5]

③ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی سفر پر روانہ ہو تو وہ عزیز و اقارب کو الوداع کر کے (مل کر) جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائے خیر کو قبول کرتا ہے۔''[6]

④ سنت یہ ہے کہ الوداع اس دعائے ماثور کے ساتھ کیا جائے جو سالم سے منقول روایت میں ہے، کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی سفر پر جاتے شخص کو دیکھتے تو کہتے قریب آجاؤ، میں تمہیں اس طرح الوداع کروں، جیسے نبی کریم ﷺ ہمیں کرتے تھے، آپ فرماتے تھے: «أَسْتَوْدِعُ اللَّهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ» ''میں تمہارا دین، امانت اور خاتمہِ عمل اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔''[7] (بقول خطابی یہاں امانت سے مراد اس کا اہل وعیال اور مال اور دین کا ذکر اس لیے ہوا کہ سفر کی تکالیف کی بنا پر احتمال ہوتا ہے کہ دینی فرائض کی بجا آوری میں کچھ کوتاہی ہو جائے) ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ

---

① سلسلة الاحاديث الضعيفة: ۳۷۲. ② صحيح، مسند أحمد: ۲/ ۹۲. ③ حسن، سنن أبي داود: ۲۶۰۷؛ سنن ترمذي: ۱٦٧٤. ④ سنن ابن ماجه: ۲۸۲۵؛ مسند أحمد: ۲/ ۳۵۸. ⑤ صحيح، مسند أحمد: ۲/ ۸۷؛ صحيح ابن حبان: ۳۳۷٦. ⑥ ضعيف، مسند أبي يعلى: ٦٦٨٦. ⑦ صحيح، سنن ترمذي: ۳۴۳۹؛ صحيح ابن حبان: ۲۳۷٦.

جب کسی کو الوداع کرتے تو اس کا ہاتھ پکڑتے اور اس وقت نہ چھوڑتے جب تک وہ خود چھڑا کر روانہ نہ ہو جاتا اور ساتھ یہ مذکورہ کلمات کہتے۔[1] بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے۔

⑤ سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں سفر پر نکل رہا ہوں، تو مجھے زادِ راہ کے بطور کوئی دعا دیں، فرمایا: ﴿زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰى﴾ ''اللہ تقوی کو تمہارا زاد بنائے۔'' اس نے کہا: کچھ مزید، فرمایا: ﴿وَغَفَرَ ذَنْبَكَ﴾ ''اور گناہ معاف کرے۔'' وہ مزید کا خواہاں ہوا تو فرمایا: ﴿وَيَسَّرَ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ﴾ ''اور جہاں بھی جاؤ خیر تمہارے لیے میسر کرے۔''[2] بقول ترمذی یہ حسن حدیث ہے۔

⑥ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرا سفر پر جانے کا پروگرام ہے، مجھے کچھ وصیت کریں، فرمایا: ''اللہ کا تقوی لازم پکڑو اور ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے اللہ کی تکبیر کرنا۔'' جب وہ واپس مڑا تو دعا کی: ''اے اللہ! اس کے لیے مسافت کی دوری کم کردے اور سفر اس پر آسان کردے۔''[3] بقول ترمذی یہ حسن ہے۔

مسافر سے مقامِ خیر میں جا کر دعا کرنے کی درخواست

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ پر جانے کی اجازت طلب کی جو آپ نے دے دی اور فرمایا: ''میرے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں نہ بھولنا۔''[4] اسے ابو داود نے جبکہ ترمذی حسن صحیح کہہ کر نقل کیا۔

سفر کی دعائیں

مستحب ہے کہ مسافر گھر سے نکلتے وقت پڑھے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ﴾ ''اللہ کے نام سے، میں اللہ پر بھروسا کرتا ہوں، اے اللہ! ہم تیری پناہ میں آتے ہیں اس بات سے کہ ہم گمراہ جائیں یا کسی کو گمراہ کریں یا کسی پر ظلم کریں یا ہم پر ظلم ہو، یا ہم نادانی کی بات کریں، یا ہم پر ہر کوئی نادانی کرے۔''[5] پھر ماثور دعاؤں میں سے (اگر سب نہ پڑھ سکے تو) کچھ پڑھ لے، ذیل میں بعض ذکر کی جاتی ہیں:

① سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ بناتے تو یہ کہتے: ﴿اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الضَّبْنَةِ فِي السَّفَرِ وَالْكَآبَةِ فِي الْمُنْقَلَبِ اَللّٰهُمَّ اطْوِ لَنَا الْأَرْضَ وَهَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ﴾ ''اے اللہ! تو ہی سفر میں میرا ساتھی اور اہل عیال میں میرا جانشین

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ٣٤٤٢. [2] صحیح، سنن ترمذی: ٣٤٤. [3] صحیح، سنن ترمذی: ٣٤٤٥؛ سنن ابن ماجہ: ٢٧٧١. [4] ضعیف، سنن أبی داود: ١٤٩٨؛ سنن ترمذی: ٣٥٥٧. [5] صحیح، سنن أبی داود: ٥٠٩٥؛ سنن ترمذی: ٣٤٢٣.

ہے، اے اللہ! میں سفر میں ناتجربہ کار ساتھیوں اور برے انجام سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! زمین ہمارے لیے سمیٹ دے اور سفر آسان بنا۔'' جب واپسی کا ارادہ فرماتے تو کہتے: «آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ» جب گھر میں داخل ہوتے تو کہتے: «تَوْباً تَوْباً لِرَبِّنَا أَوْباً لَا يُغَادِرُ عَلَيْنَا حَوْباً» ''توبہ کرتے ہوئے، اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے، امید ہے وہ ہمارے سب گناہ ختم کردے گا۔''① اسے احمد، طبرانی اور بزار نے رجالِ صحیح والی سند سے تخریج کیا۔

④ سیدنا عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر نکلتے تو کہتے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبَ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ» ''اے اللہ! میں سفر کی مشقتوں، برے مناظر، درستگی کے بعد خرابی، مظلوم کی بد دعا اور اہل و مال میں برے منظر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔'' واپسی پر بھی یہ کلمات کہتے البتہ «وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ» أهل کا لفظ پہلے کہتے۔ اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔②

سوار ہوتے وقت کیا کہے؟

علی بن ربیعہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے پاس سواری لائی گئی تاکہ سوار ہوں تو جب رکاب میں پاؤں رکھا تو کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ» جب ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، پھر کہا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ○ وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ پھر تین تین مرتبہ الحمد للّٰہ اور اللّٰہ اکبر کہا پھر یہ: «سُبْحَانَكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ إِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ» پھر ہنس پڑے، میں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ ایسے موقع پر یہی کچھ پڑھا جو میں نے پڑھا پھر آپ ہنس پڑے تھے، میں نے بھی اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ''اللہ اپنے بندے سے خوش ہوتا ہے، جب وہ کہتا ہے: «رَبِّ اغْفِرْ لِيْ» اور کہتا ہے میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہ معاف کرنے والا نہیں۔''③ اسے احمد، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: شرطِ مسلم پر یہ صحیح ہے۔

ازدی سے منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سفر پر جاتے ہوئے تشریف فرما ہو جاتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے پھر

«سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ»

---

① حسن لغيره، مسند أحمد: ١/ ٢٥٦؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ٢٥٠. ② صحيح مسلم: ١٣٤٣؛ سنن ترمذي: ٣٤٣٥. ③ صحيح، مسند أحمد: ١/ ٩٧، ١١٥؛ المستدرك للحاكم: ٢/ ٩٩، سنن أبي داود: ٢٦٠٢.

''اس کی ذات پاک ہے جس نے اس (سواری) کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے، ورنہ ہم میں یہ طاقت کہاں تھی (کہ اسے اپنے بس میں کر لیتے) اور یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم پر ہمارا یہ سفر آسان فرما دے اور اس کی مسافت گھٹا دے، اے اللہ! تو ہی رفیق سفر ہے اور تو ہی گھر بار کی خبر گیری کرنے والا ہے، اے اللہ! میں سفر کی تکلیفوں سے اور بُرے منظر اور اہل وعیال اور مال کی بری حالت دیکھنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

پڑھتے، واپسی پر بھی یہی اور مزید یہ الفاظ بھی: ((آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ)) ''ہم لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے اور اپنے رب کی تعریف کرنے والے۔''[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔

دورانِ سفر رات پڑنے پر

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ جب سفر یا غزوہ میں رات ہوتی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

((يَا أَرْضُ رَبِّيْ وَرَبُّكِ اللّٰهُ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِيْكِ وَشَرِّ مَا خُلِقَ فِيْكِ وَشَرِّ مَا يَدِبُّ عَلَيْكِ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ كُلِّ أَسَدٍ وَأَسْوَدٍ وَحَيَّةٍ وَعَقْرَبٍ وَمِنْ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ شَرِّ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ))

''اے زمین! میرا اور تمہارا رب اللہ ہے میں اس کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں، تیرے شر سے اور اس کے شر سے جو تجھ میں ہے اور اس کے جو تجھ میں مخلوق ہے اور ہر درندے، اژدہے، سانپ، بچھو اور تمام موجودات کے شر سے اور ہر والد اور اس کے ولد کے شر سے۔''[2] اسے احمد وابوداود نے نقل کیا۔

جب مسافر کسی جگہ پڑاؤ کرے تو کیا کہے؟

سیدہ خولہ بنت حکیم سلمیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص کسی جگہ پڑاؤ کرے تو کہے: ((أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ كُلِّهَا مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ)) اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اس کے شر سے اللہ کے پورے پورے کلموں کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں، تو وہاں سے کوچ کرنے تک کوئی چیز اسے نقصان نہیں پہنچائے گی۔''[3] اسے بخاری کے علاوہ جماعت نے اور ابوداود نے روایت کیا۔

جب کسی شہر یا آبادی کے آثار نظر آئیں اور مسافر کا ارادہ ہو کہ اس میں داخل ہو

عطاء بن ابو مروان اپنے والد سے راوی ہیں کہ کعب (احبار) نے قسم اٹھا کر انہیں بتلایا کہ سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بستی کو دیکھ کر جس میں داخل ہونے کا ارادہ ہوتا یہ کلمات کہتے:

---

[1] صحيح مسلم: ١٣٤٣. [2] ضعيف، سنن أبی داود: ٢٦٠٣؛ عمل اليوم والليلة للنسائی: ٥٦٣. [3] صحيح مسلم: ٢٧٠٨؛ سنن ترمذی: ٣٤٣٣؛ مسند أحمد: ٦/ ٣٧٧.

«اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْأَرْضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنَ وَمَا أَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ أَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ أَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ أَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا»

''اے ساتوں آسمانوں اور جو ان میں ہے کے رب! اور اے ساتوں زمینوں کے ان کی موجودات سمیت سب کے رب! اور اے شیاطین اور ان کے چیلوں چانٹوں کے رب! اور اے ہواؤں اور جو وہ اڑاتی ہیں، کے رب! میں تجھ سے اس جگہ کی اور اس کی موجودات کی خیر کا طالب ہوں اور اس کے اور اس کی موجودات کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔''[1]

اسے نسائی، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا اور دونوں (ابن حبان اور حاکم) نے صحیح قرار دیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر پر ہوتے تو جب کسی آبادی کو دیکھتے جہاں داخل ہونے کا پروگرام ہوتا تو یہ دعا کرتے: «اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهَا (تین مرتبہ) اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا جُنَاهَا وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا»

''اے اللہ! ہمیں اس کا ثمرہ عطا فرما اور اس کے اہل کا ہمیں اور اس کے صالح اہل کو ہمارا محبوب بنا۔''[2] اسے طبرانی نے اوسط میں جید سند سے نقل کیا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ جہاں جانے کا ارادہ ہوتا، کے آثار دیکھتے تو کہتے:

«اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ وَخَيْرِ مَا جُمِعْتْ فِيْهَا وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَمِنْ شَرِّ مَاجُمِعَتْ فِيْهَا اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا جُنَاهَا وَأَعِذْنَا مِنْ وَبَاهَا وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا»

''اے اللہ! ہم اس (سرزمین) کی خیر اور جو خیر تو نے اس میں اکٹھی کر رکھی ہے اس کے طلب گار ہیں، اور ہم اس (سرزمین) کے شر اور جو شر تو نے اس پر اکٹھا کر رکھا ہے اس سے پناہ مانگتے ہیں، اے اللہ! ہمیں اس کے پھولوں میں سے رزق عطا فرما، اس کی وبا سے ہم تیری پناہ مانگتے ہیں۔ ہمیں اس کے رہنے والوں کی طرف محبوب بنا اور اس کے نیک رہنے والوں کی محبت ہماری طرف ڈال۔''[3] اسے ابن سنی نے نقل کیا۔

مسافر کی بوقتِ سحر دعا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ سفر میں جب سحر کرتے (اگر سحری تک سفر جاری رہتا) تو یہ دعا کرتے: «سَمَّعَ سَامِعٌ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَحُسْنِ بَلَائِهِ عَلَيْنَا رَبَّنَا صَاحِبْنَا وَأَفْضِلْ عَلَيْنَا عَائِذاً بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ» ''کوئی ہماری اللہ کی حمد اور اس کی ہم پہ کی گئیں نعمتوں کا گواہ بنے، اے ہمارے رب! تو ہمارا ساتھی بن اور ہم پہ فضل کر، جہنم کی آگ سے اللہ کی پناہ چاہتے ہوئے۔''[4] اسے مسلم نے نقل کیا۔

---

[1] حسن، صحيح ابن حبان: ٢٧٠٩. [2] ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ٤٧٥٥. [3] موضوع، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٥٢٧. [4] صحيح مسلم: ٢٧١٨؛ سنن أبي داود: ٥٠٨٦.

مسافر جب بلندی پر چڑھے یا وادی (نشیب) میں اترے یا واپس ہو تو کیا کہے؟

① بخاری نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ ہم بلندی پر جاتے وقت اللہ اکبر اور نشیب کی طرف اترتے ہوئے سبحان اللہ کہتے تھے۔[1]

② بخاری نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حج، عمرہ اور غزوہ سے واپسی کا سفر شروع کرتے تو جب بھی کسی گھاٹی یا بلندی پر چڑھتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے پھر یہ کلمات کہتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

''اللہ وحدہ لاشریک ہے اسی کے لیے یہ بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پہ قادر ہے ہماری توبہ، عبادت اور سجدے اسی کے لیے ہیں اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور اکیلے ہی لشکروں کو شکست دی۔''[2]

کشتی پر سوار ہوتے ہوئے

ابن سنی نے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی غرق ہونے سے بچت جب وہ سمندر میں سوار ہوں یہ دعا پڑھنے سے ہوگی: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (هود: ٤١)

''اللہ کے نام کے ساتھ اس کا چلنا اور لنگر ڈالنا ہے بے شک میرا رب غفور رحیم ہے۔''

﴿وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (الزمر: ٦٧)

''لوگوں نے اللہ کی کما حقہ قدر نہیں کی روزِ قیامت سب زمین اس کے قبضہ میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹ رکھے ہوں گے وہ ان کے شرک سے پاک اور منزہ ہے۔''[3]

بپھرے ہوئے سمندر میں سفر کا عدم جواز

ابو عمران جونی کہتے ہیں: مجھے بعض صحابہ نے بیان کیا کہ جو ایسی چھت پر رات کو سویا جس کے پردے بنے ہوئے نہیں پھر گر کر مر گیا، تو اس سے ذمہ (اللہ کی نگہبانی، اللہ اس کی حفاظت سے متخلی ہے) بری ہے، اسی طرح اس شخص سے بھی جو بپھرے ہوئے طوفان آلود سمندر میں سوار ہوا۔[4] اسے احمد نے بسند صحیح نقل کیا۔

---

① صحيح البخاري: ٢٩٩٣، مسند أحمد: ٣/ ٣٣٣. ② صحيح البخاري: ١٧٩٧، صحيح مسلم: ١٣٤٤.
③ موضوع، عمل اليوم والليلة لابن السني: ٥٠٠، مجمع الزوائد: ١٠/ ١٣٢. ④ حسن، مسند أحمد: ٥/ ٧٩.

حج کے مسائل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ﴾(آل عمران:۹٦۔ ۹۷)

''بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور جہان والوں کے لیے موجبِ ہدایت ہے، اس میں کھلی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک مقامِ ابراہیم ہے جو شخص اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا اور لوگوں پر اللہ کا حق (فرض) ہے جو استطاعت رکھے، وہ اس کا حج کرے اور جو نہ مانے تو اللہ بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔''

حج کی تعریف

یہ طواف، سعی، وقوفِ عرفہ اور دیگر مناسک کے ارادہ سے مکہ کا قصد کرنا ہے اللہ کے حکم کی بجا آوری کرتے اور اس کی رضا کی طلب کرتے ہوئے، یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اور ان دینی فرائض میں سے ایک فرض ہے جو سب کو معلوم ہونا ضروری ہے، آدمی اس کے وجوب کے انکار سے کافر اور اسلام سے مرتد ہوگا۔ جمہور علماء کا مختار قول یہ ہے کہ سن چھ ہجری میں اس کا وجوب ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ ''اللہ کے لیے حج اور عمرہ ادا کرو۔'' یہ اس امر پر مبنی ہے کہ اتمام سے مراد ابتدائے فرض ہے، اس کی تائید امام علقمہ، مسروق اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کی قراءت سے ہوتی ہے جنہوں نے بجائے "وَأَتِمُّوْا" کے "وَأَقِیْمُوا الْحَجَّ" پڑھا، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اس رائے کو ترجیح دی کہ حج کی فرضیت سن نو یا دس ہجری کو ہوئی۔

حج کی فضیلت

شارع علیہ السلام نے ادائیگی حج کی ترغیب دی، اس ضمن کی بعض احادیث پیش خدمت ہیں:

حج کے افضل الاعمال میں سے ہونے کے بارے میں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول پر

ایمان۔'' کہا گیا: پھر کون سا؟ فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ۔'' کہا: کون سا؟ فرمایا گیا: پھر ''حج مبرور۔''① (حج مبرور کے متعلق حسن رحمہ اللہ) کا قول ہے کہ دنیا سے بے رغبتی کرتے ہوئے اور آخرت کے لیے راغب بن کر آئے، حسن سند کے ساتھ مرفوعاً مروی ہے کہ ''حج کا برّ کھانا کھلانا اور نرمی سے بات کرنا ہے۔''② حجِ مبرور یہ ہے کہ ایسا حج جس میں کسی اثم کا خلط نہ ہو۔

حج کے جہاد ہونے کے بارے میں

① سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! میں بزدل و کمزور ہوں (جہاد نہیں کرسکتا) فرمایا: ''تب ایسے جہاد کی طرف آؤ جو شان وشوکت کے بغیر ہے یعنی حج!''③ اسے طبرانی اور عبدالرزاق نے تخریج کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حج بوڑھے، کمزور اور عورت کا جہاد ہے۔''④ اسے نسائی نے حسن سند سے نقل کیا۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ جہاد کو افضل عمل سمجھتے ہیں تو کیا پھر ہم (یعنی خواتین) جہاد نہ کیا کریں؟ فرمایا: ''تمہارے لیے افضل جہاد حجِ مبرور ہے۔''⑤ اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

④ شیخین کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں ہے کہ میں نے عرض کی: کیا ہم آپ کے ہمراہ جہاد نہ کیا کریں؟ فرمایا: ''تمہارے لیے احسن واجمل جہاد حجِ مبرور ہے۔'' کہتی ہیں: آپ کی یہ بات سننے کے بعد میں کبھی حج نہ چھوڑوں گی (یعنی ہر سال کروں گی)۔⑥

حج گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور دورانِ حج نہ جماع کیا اور نہ کوئی فسق کام تو وہ اس طرح (گناہوں سے پاک) واپس آئے گا، جیسے آج ہی اسے اس کی والدہ نے جنا ہو۔''⑦ اسے شیخین نے نقل کیا۔

② سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب اللہ نے میرے دل میں ڈالا کہ اسلام قبول کروں تو میں (مدینہ ہجرت کر کے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: ہاتھ بڑھایے تاکہ میں بیعت کروں! آپ نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا، آپ نے فرمایا: ''کیا ہوا؟'' عرض کی: ایک شرط ہے، فرمایا: ''وہ کیا؟'' کہا کہ میرے سب گناہ معاف ہوجائیں! فرمایا: ''کیا جانتے نہیں کہ اسلام تمام سابقہ گناہوں کو ختم کر ڈالتا ہے اسی طرح ہجرت بھی اور حج بھی۔''⑧ اسے مسلم نے نقل کیا۔

---

① صحيح البخاري: ٢٦؛ صحيح مسلم: ٨٣. ② صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٣٢٥؛ صحيح ابن خزيمة: ٣٠٧٢.
③ صحيح، المعجم الاوسط للطبراني: ٤٢٩٩؛ مصنف عبدالرزاق: ٥/ ٧، ٨. ④ حسن، سنن نسائي: ٦/ ١١٤.
⑤ صحيح البخاري: ١٥٢٠؛ مسند أحمد: ٦/ ٧١، ٧٩. ⑥ صحيح البخاري: ١٥٢٠؛ سنن نسائي: ٥/ ١١٥.
⑦ صحيح البخاري: ١٥٢١؛ صحيح مسلم: ١٣٥٠. ⑧ صحيح مسلم: ١٢١؛ صحيح ابن خزيمة: ٢٥١٥.

③ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یکے بعد دیگرے حج اور عمرہ کرتے رہو کیونکہ یہ فقر اور گناہوں کو دور کرتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے اور سونے و چاندی کی میل کچیل دور کرتی ہے اور حجِ مبرور کا ثواب بجز جنت کے کچھ نہیں۔''[1] اسے نسائی اور ترمذی نے نقل کیا جبکہ ترمذی نے صحیح قرار دیا۔

حجاج اللہ کے مہمان ہیں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حجاج اور عمرہ کو آنے والے اللہ کے مہمان ہیں، اگر اس سے دعا کریں تو وہ قبول کرے گا اور اگر استغفار کریں تو مغفرت سے نوازے گا۔''[2] اسے نسائی، ابنِ ماجہ، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے نقل کیا آخری دو کے الفاظ ہیں: ''تین قسم کے لوگ اللہ کے مہمان ہیں: حاجی، عمرہ کو آنے والے اور غازی۔''[3]

حج کا ثواب بجز جنت کے کچھ نہیں

بخاری اور مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمرہ تا عمرہ درمیان کے سب گناہوں کی تکفیر ہے اور حجِ مبرور کا ثواب بجز جنت کے کچھ نہیں۔''[4] ابن جریج رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کعبہ اسلام کا ستون ہے جو حج یا عمرہ کی نیت سے اس کا قصد کرے، اسے اللہ کی ضمانت ہے کہ اگر اس کی جان قبض کرے تو اسے جنت میں داخل کرے گا اور اگر اسے واپس کر دے تو اجر و غنیمت کے ساتھ کرے گا۔''[5]

حج میں خرچ کرنے کی فضیلت

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حج میں خرچ کرنا (یعنی حج کے اخراجات) اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی مثل ہے، ایک درہم کے بدلے سات سو گنا تک (اجر مل سکتا) ہے۔''[6] اسے ابن ابی شیبہ، احمد، طبرانی اور بیہقی نے نقل کیا جبکہ اس کی اسناد حسن ہیں۔

حج (زندگی بھر میں) یکبارگی واجب ہے

علماء کا اجماع ہے کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ ہی ادائیگی حج واجب ہے، اِلّا یہ کہ کسی نے نذر مان لی تب ایفائے نذر (کے بطور اس کی ادائیگی) واجب ہوگی، ایک سے زائد بار تطوع ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا: ''اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج کرو۔'' ایک شخص بولا: کیا ہر سال یا رسول اللہ؟ آپ چپ رہے

---

① صحیح، سنن ترمذی: ۸۱۰؛ سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۷. ② ضعیف، سنن ابن ماجہ: ۲۸۹۲. ③ صحیح، سنن ترمذی: ۸۱۰؛ سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۷. ④ صحیح البخاری: ۱۷۷۳؛ صحیح مسلم: ۱۳۴۹. ⑤ ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ۹۰۲۹. ⑥ ضعیف، مسند أحمد: ۵/ ۳۳۵؛ المعجم الأوسط للطبرانی: ۵۲۷۰.

حتی کہ اس نے تین مرتبہ یہی کہا تو آپ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ایسا ہی واجب ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہ رکھتے! تم سے پہلی امتوں کو ان کے کثرت سے سوال کرنے اور انبیاء پر ان کے اختلاف نے ہلاک کر ڈالا، جب تمہیں کوئی حکم دوں تو حسبِ استطاعت بجالاؤ اور اگر کسی چیز سے منع کروں تو تعمیل کرو'' پھر فرمایا: ''جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں مجھے چھوڑے رکھو (یعنی زیادہ سوالات نہ کرو)''[1] اسے شیخین نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا: ''اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے'' تو سیدنا اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: کیا ہر سال یا رسول اللہ؟ فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دوں تو یہی واجب ہو اور اگر یہ واجب ہو جائے تو تم عمل نہ کر سکو، حج ایک مرتبہ (واجب) ہے، جس نے اس سے زائد کیا وہ نفلی ہے۔''[2] اسے احمد، ابوداود، نسائی اور حاکم نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا۔

کیا یہ (استطاعت ہونے پر) فوری واجب ہے یا تاخیر کرنا جائز ہے؟

امام شافعی، امام ثوری، امام اوزاعی اور امام محمد بن حسن رحمہم اللہ کا مؤقف ہے کہ حج استطاعت ہونے پر فوراً ادا کرنا واجب نہیں ہوتا بلکہ عمر کے کسی بھی حصے میں یہ کیا جا سکتا ہے اور وفات سے قبل کسی بھی وقت اگر کر لیا تو وہ گناہگار نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن دس ہجری تک حج کو مؤخر کیا اور آپ کے ہمراہ آپ کی ازواج اور کثیر صحابہ تھے، حالانکہ اس کا ایجاب سن چھ ہجری میں ہوا تھا اور اگر فی الفور ادائیگی واجب ہوتی تو آپ اسے مؤخر نہ کرتے، بقول امام شافعی رحمہ اللہ اس سے ہم نے استدلال کیا کہ حج عمر بھر میں ایک مرتبہ ہی واجب ہے، اس کا آغاز بلوغت سے اور آخر موت سے قبل ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد، امام ابو یوسف رحمہم اللہ اور بعض اصحابِ شافعی قائل ہیں کہ حج کی ادائیگی (استطاعت ہونے پر) فی الفور واجب ہے، ان کے مدِ نظر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کا ارادہ کیا وہ جلدی کرے کیونکہ بیمار ہو سکتا ہے، سواری گم ہو سکتی ہے یا کوئی اور رکاوٹ پیش آسکتی ہے۔''[3] اسے احمد، بیہقی، طحاوی اور ابن ماجہ نے نقل کیا، انہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''فریضۂ حج کی ادائیگی میں جلدی کرو کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہو جائے۔''[4] اسے احمد اور بیہقی نے تخریج کیا، بیہقی نے بیماری اور مصروفیات کے الفاظ ذکر کیے، پہلوں نے ان احادیث کو استحباب پر محمول کیا ہے کہ استطاعت ہونے پر اس کی تعجیل اور مبادرت مستحب ہے۔

وجوبِ حج کی شروط

فقہاء متفق ہیں کہ وجوبِ حج کے لیے درج ذیل شروط ہونا ضروری ہیں:

① مسلمان ہو ② عاقل ہو ③ بالغ ہو ④ آزاد ہو ⑤ استطاعت موجود ہو۔

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ۱۷۲۱؛ سنن ابن ماجه: ۲۸۸٦. [2] صحیح مسلم: ۱۳۳۷؛ سنن نسائی: ٥/ ۱۱۰.
[3] حسن، سنن ابن ماجه: ۲۸۸۳؛ مسند أحمد: ۱/ ۲۱٤. [4] صحیح، مسند أحمد: ۱/ ۳۱٤.

اس لیے کہ تمام عبادات کے ضمن میں مسلمان، بالغ اور عاقل ہونا مکلف ہونے کی شرط ہے، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تین (قسم کے افراد) سے قلم مرفوع ہے (یعنی ابھی ان کے اعمال لکھے نہیں جاتے) سوئے ہوئے سے حتی کہ بیدار ہو، بچے سے حتی کہ بالغ ہو اور مجنون سے حتی کہ حواس قائم ہوں۔''[1] آزاد ہونا بھی حج کے وجوب کی شرط ہے (کیوکہ یہ ایسی عبادت ہے جو خاصے وقت کی متقاضی ہے) اسی طرح استطاعت بھی مشروط ہے اور غلام اپنے آقا کے حقوق کے ساتھ مشغول ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾(آل عمران: ۹۷) ''سفر کے اخراجات برداشت کرنے والے لوگوں پر اللہ نے بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے۔'' استطاعت سے کیا مراد ہے؟

یہ درج ذیل امور کے ساتھ متحقق ہوگی:

① وہ صحیح البدن ہو، اگر بوجہ بڑھاپے اور چلنے پھرنے سے معذور کرنے والی معذوری یا ایسا مرض جس سے شفا یابی کی امید نہیں اور وہ خود حج ادا کرنے سے عاجز ہے تو اسے لازم ہے کہ اگر مال موجود ہے تو کسی کو اپنی جگہ حج پر بھیج کر حجِ بدل کرائے، اس بارے میں آگے بحث آئے گی۔

② راستے پر امن ہوں، اس طرح کہ اس کی جان و مال کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، اگر ڈاکوؤں یا راستہ میں وبا کا خوف ہے، تب وہ استطاعت سبیل والوں میں شامل نہیں، علماء کا اس بارے میں باہم اختلاف ہے کہ راستے میں چونگی اور ٹیکس وغیرہ اگر وصول کیا جاتا ہو تو آیا یہ حج ساقط کرنے والے اَعذار میں شامل ہے؟ اگرچہ وصول کی جانے والی رقم قلیل ہو، مالکیہ کے ہاں یہ عذر شمار نہ ہوگا، اِلاّ یہ کہ اس کا سب مال ختم ہو جاتا ہو یا وہ بار بار وصول کی جاتی ہو۔

③، ④ اس کے پاس زادِ راہ اور سواری ہو، زاد میں معتبر یہ ہے کہ اتنی رقم پاس ہو جو اس کے اپنے لیے اور اس کے اہل وعیال کے لیے کافی ہو اور بنیادی ضروریات (مثلاً: لباس، طعام، مسکن و سواری اور آلۂ حرفت) سے فاضل ہو حتی کہ ادائیگی فرض کے بعد واپس آسکے، سواری کے ضمن میں معتبر یہ ہے کہ آمد و رفت اس پر ممکن ہو چاہے بری، بحری اور فضائی کسی بھی راستہ سے اور یہ ان کی نسبت سے جو مکہ سے اتنے دور ہیں کہ پیدل چل کر جانا ممکن نہیں، لیکن جو قریب ہیں تو ان کی استطاعت میں سواری کا ہونا شامل نہیں، بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے (قرآن میں مذکور) سبیل کے لفظ کو زاد اور سواری کے ساتھ مفسر کیا ہے، چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہا گیا: یا رسول اللہ! سبیل سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''زاد اور سواری۔''[2] اسے دارقطنی نے صحیح قرار دے کر نقل کیا بقول حافظ رحمہ اللہ راجح اس کا مرسل ہونا ہے، اسے ترمذی نے بھی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ بقول عبد الحق رحمہ اللہ اس کے سب طرق ضعیف ہیں، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس ضمن میں مسنداً کوئی روایت ثابت نہیں، صحیح صرف حسن کی مرسل روایت ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو زاد مالک ہے جو اسے بیت اللہ تک پہنچا دے لیکن پھر بھی اس نے حج نہ کیا تو کوئی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر،''

---

① صحیح، سنن أبی داود: ۴۳۹۸؛ سنن ابن ماجہ: ۲۰۴۱. ② ضعیف، سنن دارقطنی: ۲/ ۲۱۸.

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ ......﴾ الخ[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور اس کی سند میں ہلال نامی راوی ہے جو مجہول الحال ہے، اسی طرح حارث ہے جسے شعبی وغیرہ نے کذاب قرار دیا، یہ روایات اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن اکثر علماء ایجابِ حج کے لیے زاد و سواری کا ہونا مشروط کرتے ہیں، ان کے لیے جن کا گھر مکہ سے دور ہے، جو زاد اور سواری نہیں پاتا اس پر حج فرض نہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، یہ روایات جو حسان طرق سے مروی ہیں، اسی طرح کئی مرسل و موقوف بھی ہیں، جو دلیل ہیں کہ وجوب کا مناط (یعنی اساس) زاد اور سواری کا ہونا ہے، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں تھا کہ کثیر لوگ پیدل چل کر مکہ جانے کی بھی سکت رکھتے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ......﴾ یا تو اس سے مراد قدرتِ معتبرہ ہے جو دیگر تمام عبادات میں بھی مطلوب ہے اور وہ مطلق استطاعت یا اس سے سوا کوئی قدرِ زائد ہے تو اگر معتبر اول ہے تب اس تقیید کی ضرورت نہ تھی، جیسا کہ روزہ اور نماز کے حکم والی آیات میں اس کا ذکر نہیں کیا، اس سے علم ہوا کہ معتبر اس ضمن میں کوئی قدرِ زائد ہے اور وہ بجز مال کے کچھ اور نہیں، نیز حج ایسی عبادت ہے جو مسافت کی محتاج ہے، لہٰذا اس کا وجوب جہاد کی مانند زاد و سواری کا محتاج ہے، اصل (یعنی جہاد) جس پر اسے قیاس کیا، کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (التوبة: ۹۱، ۹۲) ''ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جن کے پاس (جہاد پر) خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں بشرطیکہ وہ (خلوص نیت کے ساتھ) اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں۔ ایسے نیک لوگوں پر (الزام کی) کوئی راہ نہیں۔ اللہ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ جہاد ان پر فرض نہیں جن کے پاس سواریاں نہیں اور وہ آپ کے پاس سواریاں طلب کرنے آتے ہیں اور آپ جب کہتے ہیں کہ میرے پاس بھی نہیں تو وہ غمزدگی کی حالت میں روتے ہوئے واپس ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس زادِ راہ نہیں۔''

مہذب میں ہے: اگر اتنی رقم پاس ہے کہ زاد اور سواری خرید سکے لیکن اتنا ہی اس پر قرض ہے تب اس پر حج لازم نہیں چاہے قرض چکانے کا وقت فوری ہو یا موخر ہو، کیونکہ فوری چکانے والا قرض فی الفور ہے، جبکہ حج فی الفور واجب نہیں، لہٰذا قرض مقدم ہے، لکھتے ہیں: اگر گھر کی ضرورت ہے تو اس کا معاملہ بھی قرض جیسا ہے، اسی طرح خادم کا بھی اگر اس کی ضرورت ہے، اگر شادی کا محتاج ہے کہ بصورتِ دیگر حرام کاری کا خوف ہے، تب اسے بھی حج پر مقدم کرے گا، اگر اس رقم کو سامانِ تجارت خریدنے کے لیے صرف کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس سے اپنے اور اہل و عیال کے اخراجات پورا کرے تو ابو عباس بن صریح نے کہا: اس صورت میں اسے حج کرنا لازم نہیں، کیونکہ یہ بھی گھر اور خادم کی مثل ہے۔

المغنی میں ہے: اگر قرضدار کی مالی حالت اچھی ہے کہ حج کے اخراجات برداشت کر کے بھی قرض چکا سکتا ہے، تب حج کے

[1] ضعيف جدًا، سنن ترمذی: ۸۱۲؛ شعب الايمان: ۳۹۸۷.

لیے جانا اس پر لازم ہے، لیکن اگر تنگدست ہے یا حج پر گیا تو قرض چکا نہ سکے گا یا اس کا کچھ حصہ تب لازم نہیں، شوافع کے نزدیک اگر کسی کو کسی نے بلا قیمت سواری مہیا کرنے کی پیشکش کی تو اسے قبول کرنا اس کے لیے لازم نہیں کیونکہ قبول کرنا اس کا احسان اٹھانے کے مترادف ہے اور اس میں مشقت ہے، الا یہ کہ پیشکش کرنے والا اس کا بیٹا ہو، تب اسے قبول کرنا لازم ہوگا کیونکہ اس میں احسان جتلانے والی کوئی بات نہیں، حنابلہ کے ہاں کسی غیر کے اخراجات برداشت کرنے کی صورت میں حج لازم نہ ہوگا اور وہ صاحبِ استطاعت نہ بنے گا چاہے وہ قریبی ہو یا اجنبی اور چاہے وہ سواری اور زادِ کی پیشکش کرے یا مال کی۔

⑤ حج کے سفر پر روانہ ہونے میں کوئی مانع نہ ہو، از قسم قید اور ظالم حکمران کا خوف جو لوگوں کو حج پر جانے سے روکتا ہے۔

نابالغ اور غلام کا حج

ان دونوں پر حج واجب نہیں، لیکن اگر کر لیا تو وہ ان سے صحیح الوقوع ہوا، البتہ حجۃ الاسلام (یعنی جو اسلام کی رو سے ایک دفعہ حج کرنا سب پہ فرض ہے) سے یہ کافی نہ ہوگا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نابالغ نے حج کیا تو بالغ ہونے پر اس کے ذمہ ایک اور حج ہے اور جس غلام نے حج کیا، پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس کے ذمہ ہے کہ اور حج کرے۔''[1] اسے طبرانی نے صحیح سند سے نقل کیا، سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرے والد نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حجِ وداع میں شریک ہوئے اور میں اس وقت سات برس کا تھا (یعنی یہ بھی ہمراہ تھے) اسے احمد، بخاری اور ترمذی نے نقل کیا، بقول ترمذی اہلِ علم کا اجماع ہے کہ اگر بلوغت سے قبل کسی نے حج کر لیا، اسی طرح غلام نے تو بالغ ہونے اور غلام کے آزاد ہونے پر دونوں کے ذمہ حج واجب ہوگا، جب اس کی استطاعت پائیں گے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ کے سامنے بچہ بلند کر کے پوچھا: کیا اس کے لیے حج ہے؟ فرمایا: ''ہاں! اور اجر تمہیں ملے گا۔''[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حج کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے اور بچوں کی طرف سے ہم نے تلبیہ کہا اور کنکریاں ماریں۔[3] اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا، اگر بچہ سمجھ دار ہے تو خود ہی احرام باندھ کر مناسکِ حج ادا کر سکتا ہے، وگرنہ اس کا سرپرست اس کی طرف سے تلبیہ کہے اور طواف وسعی کرے، اسی طرح وقوفِ عرفہ اور کنکریاں مارنا بھی، اگر وقوفِ عرفہ سے قبل یا اس کے دوران میں وہ بالغ ہو گیا تو یہ حج اس کے ذمہ عائد حجِ اسلام شمار ہوا، اسی طرح غلام کی نسبت بھی جسے اس دوران میں آزاد کر دیا گیا، امام مالک اور امام ابن منذر رحمہ اللہ کے نزدیک ایسا نہیں، کیونکہ احرام جب باندھا تو وہ تطوع تھا تو وہ فرض میں تبدیل نہ ہوگا۔

---

① صحیح، المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۷۵۲. ② صحیح مسلم: ۱۳۳۶، ابو داود: ۱۷۳۶. ③ ضعیف، سنن ابن ماجه: ۳۰۳۸.

عورت کا حج

مرد کی طرح عورت پر بھی حج فرض ہے، جب وہ سابق الذکر شروط پر پورا اترتی ہو، اس کی نسبت سے ایک زائد شرط یہ بھی ہے کہ شوہر یا کوئی اور محرم اس کے ہمراہ ہو، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''کوئی کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ ہو، مگر اس صورت میں کہ اس کے ہمراہ اس کا محرم ہو اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' اس پر ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! میری بیوی حج کے لیے نکلی ہے، جبکہ میرا فلاں غزوہ میں نام لکھا گیا ہے، فرمایا: ''تم اپنی بیوی کے ہمراہ حج پر جاؤ۔''[1] اسے بخاری ومسلم نے نقل کیا، امام یحییٰ بن عباد رحمہ اللہ کہتے ہیں: رے شہر کی ایک خاتون نے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے بذریعہ خط پوچھا کہ میں نے ابھی تک فرض حج ادا نہیں کیا اور میں مالدار ہوں، مگر میرا کوئی محرم نہیں، انہوں نے جواب میں لکھوایا: تم ان میں سے ہو جن کے لیے اللہ نے سبیل نہیں بنائی (یعنی تم پر حج فرض نہیں) اسے شرط اور منجملہ استطاعت سمجھنے والوں میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب، نخعی، حسن، ثوری، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: شوافع کے ہاں مشہور شوہر، محرم یا قابل اعتماد خواتین کا ہمراہ ہونا ہے، ایک قول ہے کہ ایک ثقہ عورت کی موجودگی بھی کافی ہے، ایک قول جسے کرابیسی رحمہ اللہ نے نقل کیا اور المهذب میں اسے صحیح قرار دیا، یہ ہے کہ اکیلی بھی سفر کر سکتی ہے، اگر راستہ امن والا ہے، یہ سب واجب حج وعمرہ میں ہے۔ سبل السلام (شرح بلوغ المرام) میں ہے کہ آئمہ کی ایک جماعت نے کہا: بوڑھی عورت بغیر محرم کے سفر کر سکتی ہے، عورت بغیر محرم یا شوہر کے سفر کے جواز کے قائلین نے بخاری کی سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے منقول اس روایت سے استدلال کیا جبکہ بھروسہ کے قابل خواتین ہمراہی ہوں یا راستے میں امن ہو، کہتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ ایک شخص نے آ کر فقر و فاقہ کی شکایت کی، پھر ایک اور آیا اور راستے میں لوٹ لیے جانے کی شکایت کی، آپ نے مجھ سے پوچھا: ''اے عدی! کیا تم نے حیرہ شہر دیکھا ہے؟'' عرض کی: دیکھا تو نہیں، البتہ اس کی بابت بہت کچھ سنا ہے، فرمایا: ''اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک تن تنہا عورت اونٹنی پر سوار حیرہ سے چلے گی حتی کہ کعبہ کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا اسے خوف نہ ہوگا۔''[2] اس امر سے بھی استدلال کیا کہ امہات المومنین نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے آخری حج کے موقع پر ان کی اجازت سے ان کے ہمراہ حج کیا، انہوں نے سیدنا عثمان اور ابن عوف رضی اللہ عنہما کو بھیجا تھا۔[3] امہات المؤمنین اونٹوں پر ہوادج میں سوار تھیں اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ منادی کرتے جاتے تھے کہ خبردار! کوئی قریب نہ آئے اور نہ ان کی طرف نظر کرے، اگر کسی عورت نے خلاف ورزی کی اور بغیر شوہر یا محرم کے حج کر لیا تو اس کا حج صحیح الوقوع ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: عورت کا بغیر محرم کے بھی حج صحیح ہے، اسی طرح عدم استطاعت والے کا بھی۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جس پر عدم استطاعت کی وجہ سے حج واجب نہ تھا، مثلاً: مریض، فقیر، لنجا، جس کا راستہ مقطوع ہو اور عورت بغیر محرم کے وغیرہ، انہوں نے اگر بتکلف حج کر لیا تو یہ مجزئ ہوگا، پھر ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جو اس ضمن میں

---

[1] صحيح البخاري: ٣٠٠٦؛ صحيح مسلم: ١٣٤١. [2] صحيح البخاري: ٣٥٩٥. [3] صحيح البخاري: ١٨٦٠.

محسن ہوں گے، مثلاً: جو پیدل حج کرے اور بعض اساءت کرنے والے، مثلاً: جو دستِ سوال دراز کرتا ہوا حج مکمل کرے اور عورت جو بغیر محرم کے حج کرے، حج ان کے لیے مجزیٔ اس لیے ہوگا کیونکہ اہلیت مکمل ہے اور معصیت اگر واقع ہوئی ہے تو وہ طریقہ کار میں ہے نہ کہ اصل مقصود میں، المغنی میں ہے کہ اگر غیر مستطیع نے مشقت برداشت کی اور بغیر زاد و سواری کے ہی حج کے لیے چل پڑا اور حج ادا کرلیا تو اس کا حج صحیح و مجزیٔ ہے۔

بیوی کا اپنے شوہر سے اجازت لینا

یہ مستحب ہے، فرض حج کے لیے جانے کی اگر وہ اجازت نہ دے تو بغیر اجازت کے بھی جا سکتی ہے۔ فرض حج سے اسے منع کرنے کا اختیار نہیں، کیونکہ یہ اس پر واجب عبادت ہے اور خالق کی معصیت میں مخلوق کی طاعت نہیں کی جاتی (یہ ایک حدیث میں ہے) اور اسے چاہیے کہ جلد از جلد ادائیگی کر کے بری الذمہ ہو، جیسے اس کا حق ہے کہ اول وقت میں نماز ادا کرے اور شوہر کو اس سے منع کرنے کا اختیار حاصل نہیں، یہی حکم حجِ نذر کا ہے کیونکہ وہ بھی حجِ اسلام کی طرح واجب ہے، البتہ نفلی حج میں شوہر کو حق ہے کہ چاہے تو منع کر دے کیونکہ دارقطنی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے اس خاتون کی بابت فرمایا جس کے پاس مال ہے مگر شوہر حج پر جانے کی اجازت نہیں دیتا کہ ''اسے حق نہیں کہ جائے مگر اپنے شوہر کی اذن سے۔''[1]

جو بغیر (فرض) حج کیے مر گیا

جس کے ذمہ حجِ اسلام یا حجِ نذر تھا اور وہ بغیر ادا کیے مر گیا تو اس کے ولی (وارث اور سر پرست) کے ذمہ ہے کہ اس کی طرف سے حج کرے یا کسی سے کرائے، جیسے اس کے ذمہ اس کے قرضوں کی ادائیگی بھی ہے، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ جہینہ قبیلے کی ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور کہا: میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی مگر بغیر پوری کیے مر گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ فرمایا: ''ہاں! کیا اگر اس کے ذمہ قرض ہوتا تو تم ادا نہ کرتی؟ تو اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ ادا کیا جائے۔''[2] اسے بخاری نے نقل کیا، اس سے میت کی طرف سے حج کرنے کے وجوب کی دلیل ملی، چاہے اس نے وصیت کی ہو یا نہیں کیونکہ اس کے ذمہ قرضوں کا چکانا بھی مطلقاً واجب ہے، اس طرح دیگر سب مالی حقوق بھی مثلاً: کفارہ، زکاۃ اور نذر، یہی رائے سیدنا ابن عباس، زید بن ثابت، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور امام شافعی رحمہ اللہ کی ہے، ان کے نزدیک راس المال سے حجِ بدل کے اخراجات نکالنا واجب ہے، بظاہر اگر مرحوم کا ترکہ اتنا نہیں کہ اس کے قرض بھی ادا ہوسکیں اور حج بھی تو حج کو مقدم رکھا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: «فَاللّٰهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ» ''اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔'' (یہ بظاہر درست نہیں کیونکہ اس صورت میں مرحوم صاحبِ استطاعت نہیں تھا، لہٰذا اس پہ تو حج فرض ہی نہ تھا) امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی طرف سے حجِ بدل تبھی کیا جائے اگر اس نے اس کی وصیت کی تھی، اگر نہیں کی تو تب نہیں، کیونکہ

---

[1] سنن دارقطنی: ٢/ ٢٢٣. [2] صحیح البخاری: ١٨٥٢.

حج وہ عبادت ہے جس پر بدنی جانب غالب ہے، لہٰذا یہ نیابت کے قابل نہیں (یعنی ان کے ہاں بدنی عبادتوں کا ایصالِ ثواب نہیں ہوسکتا) اگر وصیت کی ہے، تب بھی ثلث ترکہ سے اگر ہوسکتا ہو تو کیا جائے۔

حج بدل

جس کے پاس حج کی استطاعت تھی لیکن پھر بوجہ مرض یا بڑھاپے کے عاجز ہوا تو لازم ہے کہ کسی سے اپنا حج کرائے، کیونکہ وہ بوجہ عجز حج سے مایوس ہے، لہٰذا میت کی مثل ہے تو اس کا غیر اس کی نیابت کرسکتا ہے، اس ضمن میں سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ خثعم قبیلے کی ایک خاتون نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کا یہ فریضہ حج میرے والد پر تب عائد ہوا ہے جب وہ بوڑھے ہوچکے اور سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ فرمایا: ''ہاں!'' یہ حج وداع کا واقعہ ہے۔[1] اسے جماعت نے تخریج کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے، ترمذی نے مزید کہا کہ اس باب میں کئی دیگر روایات بھی صحت کے ساتھ ثابت ہیں اور صحابہ وغیرہم اور ان کے بعد کے اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے، جن کی رائے میں میت کی طرف سے حج کرلیا جائے، یہی امام ثوری، امام ابن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر وصیت کی تھی تب کیا جائے، بعض نے زندہ کی طرف سے بھی حج بدل کی رخصت دی ہے، اگر وہ بڑی عمر کا ہے اور اس حال میں ہے کہ حج کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، یہی ابن مبارک اور شافعی رحمہما اللہ (بقول محشی اور امام احمد رحمہ اللہ واحناف) کا قول ہے، حدیث میں دلیل ہے کہ عورت مرد اور عورت دونوں کا حجِ بدل کرسکتی ہے، اسی طرح مرد بھی دونوں کا کرسکتا ہے اس کے مخالف کوئی نص نہیں۔

اگر معذور کو حجِ بدل کیے جانے کے بعد افاقہ ہوجائے تو؟

حجِ بدل کے بعد مفلوج یا کومہ میں گیا ہوا معذور ہوش میں آگیا اور تندرست ہوگیا تو اب اس سے فرض ساقط ہوچکا ہے، اسے اعادہ لازم نہیں تا کہ دو حجوں کا ایجاب لازم نہ آئے، یہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے، جمہور قائل ہیں کہ وہ حجِ بدل اب مجزئ نہ ہوگا، کیونکہ ظاہر ہوگیا کہ وہ مکمل مایوس نہ تھا اور اعتبار انتہا کا ہے، ابن حزم نے اول رائے کو راجح قرار دیا اور لکھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے جو استطاعت نہیں رکھتا، حج بدل کرنے کا حکم دیا ہے اور بتلایا کہ اللہ کا قرض اس کی طرف سے چکایا جائے تو بلاشک یہ قرض اب ادا ہوچکا اور اس سے یہ مجزئ ہوا، لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور یہ کسی نص کے ساتھ ہی ممکن تھا جو یہاں موجود نہیں، وگرنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ایضاح فرمادیتے۔

حجِ بدل کی شرط

حج بدل کرنے والے کی نسبت سے شرط یہ ہے کہ وہ اپنا فرض حج ادا کرچکا ہو، کیونکہ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں:

[1] صحیح البخاری: ١٥١٣؛ صحیح مسلم: ٣٣٣٤؛ سنن أبی داود: ١٨٠٩.

نبی کریم ﷺ نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے: شبرمہ کی طرف سے لبیک! فرمایا: ''کیا تم نے اپنا حج کرلیا ہے؟'' کہا: نہیں، فرمایا: ''تب پہلے اپنا حج کرو، پھر شبرمہ کا (اگلے سال) کرنا۔''[1] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، بقول بیہقی اس کی سند صحیح ہے اور اس باب میں اس سے اصح حدیث موجود نہیں، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام احمد رحمہ اللہ نے اسے حکماً مرفوع قرار دیا ہے، جیسا کہ ان کے بیٹے صالح نے نقل کیا کیونکہ یہ اگرچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے، مگر اس میں ان کا کوئی مخالف نہیں، یہی اکثر اہل علم کا قول ہے کہ جس نے ابھی اپنا حج نہیں کیا، وہ کسی کا حجِ بدل نہیں کرسکتا، چاہے وہ مستطیع تھا یا نہیں، اس لیے کہ استفصال اور حکایتِ احوال میں تفریق کا عدم موجود ہونا عموم پر دال ہے۔

جس نے حج کی نذر مانی اور ابھی اس کے ذمہ حجِ اسلام باقی ہے

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمہ اللہ کا فتویٰ تھا کہ جس نے ابھی فریضۂ حج ادا نہیں کیا اور اپنی نذر پوری کرنے کے لیے حج کیا تو یہ نذر کا بھی ہوا اور فریضہ بھی ادا ہوگیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور امام عطاء رحمہ اللہ کا فتویٰ یہ تھا کہ پہلے اپنا فرض حج کرے، پھر نذر کا۔

اسلام میں صرورت نہیں

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسلام میں صرورت نہیں۔''[2] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا، امام خطابی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صرورت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک ایسا شخص جس نے شادی نہ کی اور نصاریٰ کے راہبوں کی طرز پر تبتّل اختیار کیا، اسی سے نابغہ کے یہ اشعار ہیں:

لَوْ أَنَّهَا عَرَضَتْ لأَشْمَطَ راهِبٍ عَبْدَ الإلٰهِ صَرُوْرَةٍ مُتَعَبِّدِ
لَرَنَا لِبَهْجَتِهَا و حُسْنِ حَدِيْثِها وَلَخَالَهُ رُشْداً وإِنْ لَمْ يَرْشُدِ

یعنی اگر یہ حسینہ کسی ایسے راہب کے سامنے آجائے جو عبادت میں مست اور زاہدانہ زندگی گزار رہا ہے تو وہ اس کا حسن وجمال دیکھ کر اپنی یہ روش ترک کرنا دانائی خیال کرے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ایسا شخص جس نے حج نہیں کیا، اس پر اس کا مفہوم یہ بنا کہ کوئی ایسا شخص نہ رہے جس کے پاس استطاعت ہے لیکن وہ حج نہیں کرتا، اس کے ساتھ ان حضرات نے استدلال کیا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا شخص کسی کی طرف سے حجِ بدل نہیں کرسکتا، ان کے نزدیک تقدیرِ کلام یہ ہے کہ ایسے شخص نے اگر کسی کا حجِ بدل کیا تو وہ خود اس کا اپنا حج ہوجائے گا اور وہ اس فرض سے سبکدوش ہوا تو اس کی نسبت اب یہ صرورت نہیں، یہ اوزاعی، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا مذہب ہے، جبکہ امام مالک اور امام ثوری رحمہما اللہ کا کہنا ہے کہ اس کا حج اس کی نیت کے بحسب ہے، یہی امام حسن بصری، امام عطاء اور امام نخعی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

---

[1] سنن أبي داود: ١٨١١؛ سنن ابن ماجه: ٢٩٠٣. [2] ضعيف، سنن أبي داود: ١٧٢٩؛ مسند أحمد: ٣١٢.

حج کے لیے قرض لینا

سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا حج کے لیے وہ شخص جس نے ابھی حج نہیں کیا قرض لے سکتا ہے؟ فرمایا: ''نہیں۔''[1] اسے بیہقی نے نقل کیا۔

مالِ حرام سے حج کرنا

اکثر علماء کے نزدیک حرام مال سے حج ہو جائے گا، البتہ وہ شخص آثم ہوا، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں ہوگا اور یہی اصح ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ طیب ہے اور صرف طیب کو ہی قبول کرتا ہے۔''[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حج کے لیے پاکیزہ نفقہ لے کر نکلے اور رکاب میں قدم رکھے پھر «لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ» پکارے تو آسمان سے ایک منادی ندا دیتا ہے: «لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ» تمہارا زاد حلال ہے، سواری حلال کی ہے اور تمہارا حج مبرور ہے نہ کہ مازور (یعنی گناہ آلود) جبکہ حرام مال والے کو کہتا ہے: «لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ» تمہارا زاد اور سواری حرام کی ہے اور تمہارا حج مازور غیر ماجور ہے۔''[3] بقول امام منذری رحمہ اللہ اسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا، اصفہانی نے بھی اسے اسلم مولیٰ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مرسلاً مختصراً نقل کیا۔

حج میں کیا افضل ہے سوار ہو کر جانا یا پیدل؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا: اس بابت اختلاف ہے کہ کون سا حج افضل ہے؟ جمہور قائل ہیں کہ سوار ہو کر جانا افضل ہے، کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے اور دعا و گریہ زاری سواری پر ہونا امکن ہے (یعنی اسے چست رکھنے میں زیادہ معاون ہے)، پھر اس میں منفعت ہے، امام ابن راہویہ رحمہ اللہ پیدل جانے کے افضل ہونے کے قائل ہیں، اس لیے کہ اس میں تھکاوٹ ہے، یہ کہنا بھی محتمل ہے کہ یہ احوال و اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے، بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جسے اپنے دو بیٹوں کے درمیان سہارا دے کر چلایا جا رہا تھا تو آپ نے فرمایا: ''اسے کیا ہوا؟'' کہا گیا: اس نے نذر مانی تھی کہ پیدل چل کر حج کرے گا، فرمایا: ''بے شک اللہ اسے اپنے آپ کو تعذیب دینے سے غنی ہے۔'' اور اسے سوار ہونے کا حکم دیا۔[4]

دورانِ حج تجارت کرنا اور (سامان وغیرہ) کرایہ پر دینا

اس میں کوئی حرج نہیں کہ حج اور عمرہ کے افعال ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مزدوری اور تجارت بھی کر لے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] لااصل له مرفوعًا، مسند الشافعي: ٧٥٥؛ معرفة السنن والاثار: ٩١٧٢؛ سلسلة الاحاديث الضعيفة: ٦١٤٢.

[2] صحيح مسلم: ١٠١٥. [3] ضعيف جدًا، المعجم الاوسط للطبراني: ٥٢٢٤. [4] صحيح البخاري: ١٨٦٥؛ صحيح مسلم: ١٦٤٢.

کہتے ہیں: شروع اسلام میں حج کے دوران میں لوگ منیٰ، عرفہ اور ذی المجاز (جو عرفہ کے پڑوس میں ایک بازار لگتا تھا) میں خرید وفروخت کے معاملات کر لیتے تھے تو انہیں حالتِ احرام میں یہ سب کرنے میں تحفظ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (البقرہ: ۱۹۸)

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل (رزق) تلاش کرو۔''[1]

اسے بخاری، مسلم اور نسائی نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ لوگ منیٰ میں تجارت کر لیتے تھے تو انہیں حکم ہوا کہ یہ کام تب کریں جب عرفات سے واپسی ہو جائے۔[2] اسے ابو داود نے نقل کیا، ابو امامہ تیمی کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں (اثنائے حج) سواریاں کرایہ پر دینے کا کاروبار بھی کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں: تمہارا حج نہیں ہوا تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم احرام نہیں باندھتے اور تلبیہ نہیں کہتے؟ اسی طرح طواف، عرفات سے واپسی اور کنکریاں مارنا، میں نے کہا: کیوں نہیں! یہ سب کام کرتا ہوں، کہنے لگے: تو تمہارا حج ہے، ایک شخص نے یہی سوال جو تم نے مجھ سے کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا تو آپ نے سکوت کیا حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (البقرہ: ۱۹۸) ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل (رزق) تلاش کرو۔'' آپ نے اسے پیغام بھیج کر بلوایا اور یہ آیت سنائی اور فرمایا: ''تمہارا حج ہے۔''[3] اسے ابو داود اور سعید بن منصور نے نقل کیا، امام منذری رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام ابو امامہ رحمہ اللہ ہذا معروف نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ایک شخص نے ان سے کہا: میں حاجیوں کی مزدوری کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ مناسک بھی ادا کرتا ہوں تو کیا میرے لیے حج کا اجر ہے؟ کہا: ہاں! اور یہ آیت پڑھی:

﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ (البقرہ: ۲۰۲)[4]

''یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''[5] اسے بیہقی اور دارقطنی نے نقل کیا۔

حجِ نبوی

مسلم نے جعفر بن محمد عن ابیہ سے روایت نقل کی کہ ہم سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے پاس گئے، وہ لوگوں سے تعارف کر رہے تھے حتی کہ میری باری آئی تو میں نے کہا: میں محمد بن علی بن حسین (بن علی بن ابی طالب) ہوں تو ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھایا اور میری (قمیص کا) اوپر والا اور نیچے والا بٹن کھولا اور ہتھیلی میرے سینے پر رکھی اور کہا: خوش آمدید اے بھتیجے! جو چاہو پوچھو، کہتے ہیں: وہ اس وقت نابینا ہو چکے تھے تو میں علمی سوال کرتا رہا، حتی کہ نماز کا وقت ہوا تو ایک چھوٹی چادر اوڑھ کر نماز ادا

---

① صحیح البخاري: ٤٥١٩؛ سنن أبی داود: ١٧٣٤. ② صحیح، سنن أبی داود: ١٧٣١. ③ صحیح، سنن أبی داود: ١٧٣٣. ④ سنن الکبری للبیهقی: ٤/ ٣٣٣. ⑤ السنن الکبری للبیهقی: ٨٦٥٥؛ مسند الشافعی: ٩٣٥.

کی، ہم نے بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھی، پھر میں نے کہا: نبی کریم ﷺ کے حج کے بارے میں بتلائیں تو انگلیوں سے نو کا اشارہ دیا اور کہا: نبی کریم ﷺ نو برس ٹھہرے رہے (یعنی مدینہ میں) حج نہ کیا، پھر دسویں برس حج پر جانے کی منادی کرائی تو مدینہ میں کثیر لوگ آ گئے جو سب چاہتے تھے کہ آپ کی معیت میں حج ادا کریں اور آپ سے اس کا طریقہ عملاً جان لیں، ہم آپ کے ہمراہ چلے حتیٰ کہ ذوالحلیفہ آئے، وہاں سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا (جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں) نے محمد بن ابی بکر کو جنم دیا (اس سے بعض کا یہ کہنا غلط ثابت ہوا کہ اس محمد کی پیدائش سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی تھی) تو نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ میں اب کیا کروں؟ فرمایا: ''غسل کرو اور خون (نفاس) کی جگہ پر کوئی کپڑا باندھ لو، پھر احرام باندھ لو۔'' نبی کریم ﷺ نے مسجد میں نماز ادا کی، پھر (اپنی اونٹنی) قصواء پر سوار ہوئے، صحرا میں جب اس پر متمکن ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر جانب تا حد نظر لوگ ہی لوگ تھے، کچھ سوار اور کچھ پیدل اور نبی کریم ﷺ سب کے وسط میں تھے اور جو آپ نے (حج کے سلسلہ میں) کام کیا وہ ہم نے بھی کیا، آپ نے بآوازِ بلند ان الفاظ کے ساتھ تلبیہ کہا: «لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ» اور لوگوں نے بھی، نبی کریم ﷺ ان کے جواب میں کچھ ارشاد نہ کرتے، بس اپنا تلبیہ پڑھتے رہے، کہتے ہیں: ہماری نیت حج کی تھی، عمرہ کسی کے ذہن میں نہ تھا، حتیٰ کہ مکہ پہنچ گئے تو آپ نے استلامِ رکن کیا (یعنی حجرِ اسود کو بوسہ دیا)، پھر تین چکر رمل کیا (یعنی تیز قدموں سے چلے) اور چار چکر عام رفتار سے چل کر پھر مقامِ ابراہیم کی طرف گئے اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ ''تم ابراہیم کی جائے قیام کو نماز کی جگہ بناؤ۔'' (البقرة: ١٢٥) آپ نے کعبہ اور اپنے مابین مقام ابراہیم کو کر کے دو رکعتیں ادا کیں اور ان میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اور ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ کی قراءت کی، پھر حجر اسود کا رخ کیا اور اس کا استلام کیا، پھر صفا کی طرف گئے، اس سے قریب ہوئے تو یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' (البقرة: ١٥٨) اور فرمایا: ''میں اسی سے ابتدا کرتا ہوں، اللہ نے (آیت میں) جس کے ساتھ ابتدا کی۔'' صفا پر چڑھے حتیٰ کہ کعبہ کو دیکھا، اس کی طرف رخِ انور کیا اور اللہ کی توحید و کبریائی کا اظہار ان کلمات سے کیا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ» پھر اس دوران میں دعا کی اور یہی کلمات تین مرتبہ کہے، پھر مروہ کی جانب چلے، جب وادی کے درمیان پہنچے تو دوڑے اور جب چڑھائی آئی تو عام رفتار سے چلے حتیٰ کہ مروہ پہنچے، یہاں بھی وہ کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا، آخری چکر میں جب مروہ پر پہنچے تو فرمایا: ''اگر شروع ہی میں اس معاملہ کا پتہ چل جاتا جو بعد ازاں ہوا تو میں قربانی ہمراہ نہ لاتا اور میں اسے عمرہ بنا لیتا تو تم میں سے جس کے ساتھ قربانی نہیں وہ احرام کھول دے اور اسے عمرہ بنا لے۔'' اس پر سیدنا سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: کیا یہ صرف اسی برس کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے؟ تو نبی کریم ﷺ نے انگلیاں مبارک ایک دوسری میں داخل کیں اور دو دفعہ فرمایا: ''حج میں عمرہ داخل ہوا اور ایسا کرنا

ہمیشہ جائز رہے گا۔‘‘ کہتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ یمن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اونٹ لے کر آئے تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو احرام کھولے دیکھا اور یہ کہ انہوں نے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سرمہ بھی لگایا ہے تو برا منایا مگر انہوں نے کہا: میرے والد نے مجھے اس کا حکم دیا ہے، کہتے ہیں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب عراق میں تھے تو کہا کرتے تھے: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شکایت کرنے اور آپ سے مسئلہ دریافت کرنے گیا تو آپ نے فرمایا: ’’فاطمہ نے ٹھیک کہا۔‘‘ پھر مجھ سے پوچھا: ’’تم نے احرام باندھتے وقت کیا نیت کی تھی؟‘‘ عرض کی: میں نے کہا تھا: اے اللہ! میں وہی نیت کرتا ہوں جو تیرے رسول نے کی ہے، فرمایا: ’’میرے ہمراہ قربانیاں ہیں، لہٰذا ہم دونوں احرام نہ کھولیں گے۔‘‘ (یعنی حج قران کریں گے) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لائے ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ موجود اونٹوں کی مجموعی تعداد سو تھی، کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے احرام کھول دیا اور بال کٹوائے ماسوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جن کے ہمراہ حج کی قربانیاں تھیں۔

ترویہ کے دن (یعنی ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو جب حاجی منیٰ کا رخ کرتے ہیں) سب لوگوں نے حج کا احرام باندھا اور منیٰ روانہ ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوکر گئے اور وہاں جا کر ظہر اور مابعد کی نمازیں ادا کیں، اگلے دن فجر کے بعد تک آپ ٹھہرے رہے، حتی کہ سورج طلوع ہوا تو (مسجد) نمرہ کے مقام پر اپنے لیے خیمہ گاڑنے کا حکم دیا جو بالوں سے بنا ہوا تھا، پھر آپ چلے اور قریش کو کوئی شک نہ تھا کہ آپ مشعرِ حرام کے پاس وقوف کریں گے، جہاں زمانۂ جاہلیت میں قریش کرتے تھے (یہ مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے، جسے قزح کہا جاتا ہے، بعض نے کہا سارا مزدلفہ ہی مشعر حرام ہے، دیگر عرب مزدلفہ میں ٹھہرنے کی بجائے گزر کر آگے عرفات میں وقوف کرتے تھے، قریش نے یہی سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مزدلفہ ہی میں رہیں گے اور آگے نہ جائیں گے، ان کے معمول کے مطابق لیکن آپ آگے عرفات گئے کیونکہ اللہ نے یہی حکم دیا تھا: ﴿ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ:۱۹۹) ’’پھر اس جگہ سے واپس آؤ جہاں سے سب لوگ واپس آئے۔‘‘ قریش اس وجہ سے عرفات نہ جاتے کہ وہ حدودِ حرم سے باہر ہے، وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم والے ہیں تو ہم اس سے باہر نہ نکلیں گے) لیکن آپ اس سے گزر کر آگے عرفات پہنچے، وہاں حسبِ حکم آپ کے لیے خیمہ نصب تھا، آپ نے وہاں قیام کیا حتی کہ جب سورج ڈھلا تو آپ قصواء اونٹنی کو حرکت دے کر بطنِ وادی میں آئے اور وہاں خطبۂ (حجۃ الوداع) ارشاد فرمایا: ’’بے شک تمہارے خون اور اموال ایک دوسرے پر حرام ہیں، تمہارے اس دن کی حرمت کی طرح تمہارے اس ماہ میں تمہارے اس شہر میں، سن لو! امرِ جاہلیت کی ہر چیز آج میرے قدموں تلے روند ڈالی گئی ہے اور جاہلیت کے سب انتقام اب ختم ہوگئے اور اس ضمن میں سب سے قبل میں اپنے خاندان کا خون معاف کرتا ہوں، جو ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے، یہ بنی سعد میں شیر خواری کے لیے بھیجا گیا تھا تو ہذیل نے اسے قتل کر ڈالا اور جاہلیت کے تمام سودی معاملات آج ختم اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے فرد عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا جملہ سودی معاملہ کالعدم قرار دیتا ہوں، عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، تم نے ان سے اللہ کی امان کے ساتھ عقد کیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے ساتھ ان سے نکاح کیا ہے ان کا فرض ہے کہ تمہارے گھر میں تمہاری مرضی کے بغیر کسی کو نہ

آنے دیں اگر ایسا کریں تو ضرورت پڑنے پر ہلکی سی مار کی اجازت ہے ایسی جس کا نشان نہ پڑے اور تمہارا فرض ان کا عرف کے مطابق نان ونفقہ ہے۔ میں تم میں ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر مضبوطی سے اسے تھام لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ اللہ کی کتاب ہے، تم سے میرے بعد سوال ہوگا تو تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کیا اور خیر خواہی کی، اس پر آپ نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا: ''اے اللہ! گواہ ہو جا۔'' تین مرتبہ یہی فرمایا۔

پھر اذان ہوئی تو آپ نے نمازِ ظہر پڑھائی، پھر اسی وقت تکبیر کہلوا کر نمازِ عصر پڑھائی اور ان کے مابین کوئی نوافل وغیرہ نہ پڑھے (بقول محشی اس میں دلیل ہے کہ اس دن ظہر وعصر کو جمع کر کے پڑھنا مشروع ہے، امت کا اس پر اجماع ہے البتہ اس کے سبب میں اختلافِ آراء ہوا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض اصحابِ شافعی کے نزدیک یہ بوجہِ نسک یعنی حج کے اعمال میں سے ایک عمل کے بطور) تھا، اکثر اصحابِ شافعی نے قرار دیا کہ یہ بوجہِ سفر تھا) پھر آپ سوار ہوئے حتی کہ وقوف کی جگہ پر آئے، تو قصواء کا پیٹ چٹانوں کی طرف اور جبل المشاۃ اپنے سامنے کے رخ کر کے قبلہ رو ہوئے اور غروب آفتاب تک مسلسل وقوف کیا، پھر سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنا ردیف بنا کر واپسی کا سفر شروع کیا، اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ اشارہ کرتے جاتے اور کہتے: اے لوگو! ''سکون و اطمینان رکھو۔'' مزدلفہ پہنچ کر ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں اور درمیان میں نوافل وغیرہ نہیں پڑھے پھر آپ نے طلوعِ فجر تک مسلسل آرام فرمایا اور فجر طلوع ہوتے ہی ایک اذان و اقامت کے ساتھ نمازِ فجر کرائی پھر قصواء پر سوار ہو کر مشعرِ حرام آئے اور قبلہ رو ہو کر دعائیں، تکبیرات اور تہلیلات کے کلمات کا ورد کیا اور روشنی ہونے تک ادھر ہی رہے، پھر سورج طلوع ہونے سے قبل چل پڑھے، اب سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے، جو نہایت خوبصورت اور اچھے بالوں والے تھے، آپ انہیں ادھر ادھر دیکھنے سے منع کرتے رہے، بطنِ محسر پہنچ کر راستہ سے ذرا ہٹے اور درمیان کے اس راستہ کو اختیار کیا جو بڑے جمرہ تک جا نکلتا ہے، حتی کہ اس جمرہ پر آئے جو درخت کے پاس ہے اور اسے سات کنکریاں ماریں، ہر کنکری مارنے کے ساتھ اللہ اکبر کہتے، آپ نے بطنِ وادی سے اس کی طرف یہ کنکریاں اچھالیں (بقول محشی اس طور پر کہ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ آپ کے داہنی جانب اور مکہ آپ کے بائیں جانب تھا) پھر قربان گاہ گئے اور دستِ مبارک سے تریسٹھ جانور ذبح کیے (سو میں سے) بقیہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری لگائی، ہر ذبح شدہ اونٹ کا ایک ایک حصہ لے کر ہانڈی پکانے کا حکم دیا اور پکنے پر اس کا گوشت تناول کیا اور شوربہ نوش فرمایا، پھر آپ سوار ہو کر کعبہ آئے اور ظہر کی نماز مکہ میں ادا فرمائی، زمزم کے کنویں پر آئے تو بنی عبد المطلب پانی نکال نکال کر حاجیوں کو پلا رہے تھے، فرمایا: ''اے بنی عبد المطلب! پانی نکالتے رہو اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ اس کام کو تم سے چھین لیں گے تو میں بھی تمہارے ہمراہ پانی نکالتا۔'' آپ کو ایک ڈول پکڑایا گیا اور آپ نے زمزم نوش فرمایا۔[1]

علماء اس حدیث کی بابت کہتے ہیں کہ یہ بہت عظیم اور کئی فوائد پر مشتمل ہے اور اس سے کئی اہم اور نفیس قواعد اور نکات

---

[1] صحیح مسلم: ۱۲۱۳؛ سنن أبي داود: ۱۹۰۸؛ سنن ابن ماجه: ۳۰۷٤.

ماخوذ ہیں، بقول امام قاضی عیاض رحمہ اللہ لوگوں نے کثرت سے اس حدیث سے فقہ کے مسائل مستنبط کیے، امام ابوبکر بن منذر رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک رسالہ لکھا جس میں ایک سو انسٹھ سے زائد انواع ذکر کیں اور کہا: مزید جستجو کرنے پر اتنے ہی اور مسائل کا استنباط ہو سکتا ہے۔ علماء کا کہنا ہے: اس میں دلالت ہے کہ غسلِ احرام نفاس اور حیض والی خواتین اور ان کے غیر سب کے لیے مسنون ہے، اسی طرح حیض اور نفاس والی کے لباس کو خون صاف کر کے احرام پہننے کی صحت پر اور یہ کہ احرام باندھنے سے قبل نماز پڑھنی چاہیے، چاہے یہ فرض ہو یا نفل، محرم تلبیہ کہتے ہوئے آواز بلند رکھے، اس ضمن میں مستحب یہ ہے کہ وہی کلمات کہیں جو نبی کریم ﷺ نے ادا فرمائے کیے تھے، اگر زائد بھی کہہ لیں تو حرج نہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مزید یہ الفاظ منقول ہیں: "لَبَّيْكَ ذَا النَّعْمَاءِ وَالْفَضْلِ الْحَسَنِ لَبَّيْكَ مَرْهُوْباً مِنْكَ وَمَرْغُوْباً إِلَيْكَ" اے نعمت وفضل کرنے والے! میں تیری جناب میں حاضر ہوں، تجھ سے ڈرتے ہوئے اور تیری طرف رغبت کرتے ہوئے۔ مناسب یہ ہے کہ حاجی مکہ پہنچتے ہی طوافِ قدوم کرے اور حجرِ اسود کا استلام کرے، طواف شروع کرنے سے قبل، پہلے تین چکروں میں رفتار ذرا تیز رکھے، یہ انداز دونوں یمانی رکنوں والی سمت (یعنی بابِ بلال کی جہت) کے ماسوا میں اپنائے، پھر بقیہ چار چکر عام رفتار سے مکمل کرے، طواف مکمل کر کے مقامِ ابراہیم پر آ کر وہ کچھ کرے جو آپ نے کیا، حجرِ اسود کا استلام وہاں سے جاتے ہوئے بھی مشروع ہے، کیونکہ آپ نے یہی کیا، علماء متفق ہیں کہ استلام سنت ہے، سعی کے ساتھ ہی اس کا عمرہ مکمل ہو جائے گا، سعی کے دوران میں بطنِ وادی میں ہر دفعہ رمل کرے (آجکل اس مقام پہ لائٹ لگی ہے جہاں سے رفتار تیز رکھنی ہے) جیسے طواف کے پہلے تین چکروں میں کیا تھا، اس کے بعد سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر وہ حلال ہو جائے گا (یعنی احرام کھول دے گا)۔

یہی صحابہ کا فعل تھا جنہوں نے بامرِ نبوی حج کا احرام فسخ کر کے عمرہ میں بدلا، جو حجِ قِران کر رہا ہو (یعنی عمرہ اور حج کا اکٹھے احرام باندھنا بغیر درمیان میں احرام کھولے) تو وہ نہ سر منڈوائے اور نہ بال چھوٹے کرائے بلکہ وہ اپنا احرام برقرار رکھے، ترویہ یعنی آٹھویں ذوالحجہ کو منیٰ جانے سے قبل وہ سب احرام باندھیں گے جنہوں نے قِران نہیں کیا، سنت یہ ہے کہ (عرفات جانے سے قبل) پانچ نمازیں منیٰ میں ادا کی جائیں اور آمدہ یعنی نویں تاریخ کی رات ادھر منیٰ میں ہی گزارے۔ یہ بھی سنت ہے کہ عرفہ کے دن منیٰ سے طلوعِ آفتاب کے بعد روانہ ہو اور عرفات میں اس کا داخلہ زوال کے بعد ہو، نبی کریم ﷺ عرفات میں ظہر وعصر اکٹھی ادا کر کے نمرہ (جہاں اس وقت مسجد ہے جو اسی نام سے منسوب ہے اس کا آدھا حصہ عرفات اور باقی عرفات سے باہر ہے) میں آ گئے تھے جو عرفات کا حصہ نہیں، آپ موقف میں دونوں نمازیں ادا کر کے داخل ہوئے تھے، یہ بھی سنت ہے کہ ان دونوں نمازوں کے مابین کچھ نماز (یعنی از قسم نوافل) پڑھے (شائد یہاں سہو ہوا ہے جبکہ پڑھے سے قبل لفظ "نہ" رہ گیا کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں دونوں کے مابین کچھ نہ پڑھنے کا ذکر ہے) اور نماز سے قبل امام خطبہ دے اور یہ ایامِ حج کے دوران مسنون خطبوں میں سے ایک ہے۔ مسنون خطبوں میں سے دوسرا ساتویں ذی الحجہ کو ہے کعبہ کے پاس ظہر کی نماز کے بعد اور تیسرا خطبہ قربانی کے روز اور چوتھا پہلے کوچ کے روز ہے (یعنی بارہ ذوالحجہ کو)۔

اس حدیث سے کئی سنن اور آداب اخذ ہوئے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

وقوفِ عرفہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے ادا کر کے۔

وقوفِ عرفات سوار ہو کر کرنا افضل ہے۔

دورانِ وقوف میں (حاجی) صخرات (یعنی چٹانوں) کے پاس ہو، جہاں نبی کریم ﷺ نے وقوف کیا تھا یا اس سے قریب۔

وقوف کے دوران میں قبلہ رخ رہے۔

غروبِ آفتاب تک وقوف کی جگہ میں رہے اور اس دوران میں دعائیں کرتا رہے، ہاتھ سینے کی طرف اٹھائے اور غروب کے بعد سکون واطمینان کے ساتھ واپس ہو اور اگر ذمہ دار ہے تو یہی حکم لوگوں کو دے۔

مزدلفہ میں آ کر ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشا آگے پیچھے پڑھے بغیر اس کے کہ درمیان میں نفل وغیرہ پڑھے، اس پر تو علماء کا اجماع ہے، البتہ اس کے سبب کے بارے ان کے مابین اختلاف ہے تو کہا گیا: اس لیے کہ یہی نسک ہے، بعض نے کہا: اس لیے کہ وہ مسافر تھے یعنی سفر نمازوں کے جمع کی مشروعیت کی علت ہے۔

سنن میں سے یہ بھی ہے کہ رات (یعنی نو اور دس ذوالحجہ کی درمیانی) مزدلفہ میں رہے، اس کے نسک ہونے پر اجماع ہے، البتہ واجب ہے یا سنت؟ اس بارے میں اختلاف ہے، فجر روشن ہونے پر وادی محصر میں آئے تو تیز رفتاری سے گزر جائے، کیونکہ یہ اللہ کے غضب کا محل ہے کہ یہاں اصحابِ فیل اس کے عذاب کا شکار بنے تھے، لہٰذا اس میں ٹھہرنا اور سست روی سے چلنا مناسب نہیں۔

جمرہ عقبہ کے پاس آ کر بطنِ وادی میں اترے اور وہاں سے جمرہ کو سات کنکریاں مارے اور ہر کنکری لوبیا کے دانے جتنی ہو، نیز ہر کنکری مارتے ہوئے تکبیر کہے، پھر قربانی کرے، اگر قربانی کا بندوبست ہے پھر حجامت کرائے (اور احرام کھول دے) بعد ازاں مکہ جائے اور طوافِ افاضہ کرے، یہ وہی ہے جسے طوافِ زیارت بھی کہتے ہیں، اس کے بعد احرام کی وجہ سے جو اس پر بندشیں تھیں وہ سب ختم ہوئیں حتی کہ بیوی سے جماع بھی، ہاں اگر جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد ابھی طوافِ زیارت نہیں کیا (جو عموماً دس تاریخ کو کیا جاتا ہے) تو سوائے جماع کے ہر چیز حلال ہوگی جو بوجہ احرام حرام تھی، یہ نبی کریم ﷺ کا طریقۂ حج تھا جو آپ نے کہا اور ارشاد فرمایا کہ ''مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو۔''[1]

اس کی سند صحیح ہے۔

مواقیت

یہ میقات کی جمع ہے جیسے مواعید میعاد کی جمع ہے، یہ مواقیت زمانی بھی ہیں اور مکانی بھی۔

---

[1] صحیح، مسند أحمد: ٣/ ٣٦٦.

زمانی مواقیت

یہ وہ اوقات ہیں کہ ان سے دیگر اوقات میں مناسکِ حج میں سے کچھ ادا کرنا درست نہیں، اس کی تبیین اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کی:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾(البقرۃ: ۱۸۹)

''لوگ آپ سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟) فرما دیجیے! وہ لوگوں کے لیے (تاریخوں کی تعیین) اور حج کے اوقات معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔''

اور فرمایا:﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾(البقرۃ: ۱۹۷) ''مناسکِ حج کا وقت چند معلوم مہینے ہیں۔''

علماء کا اجماع ہے کہ حج کے ان مہینوں سے مراد شوال اور ذوالقعدہ ہے، ذوالحجہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ پورا مہینہ اشہرِ حج میں سے ہے یا اس کا پہلا عشرہ تو سیدنا ابن عمر، ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم، احناف، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ ثانی کے قائل ہیں، جبکہ مالک رحمہ اللہ اول کا میلان رکھتے ہیں، ابن حزم نے اسے راجح قرار دیا اور کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ تو (یہ جمع کے صیغے ہیں) اس کا اطلاق دو مہینے اور تیسرے کے بعض پر نہیں ہوسکتا، نیز رمیِ جمار جو حج کے ارکان میں سے ہے، ذوالحجہ کی تیرہ تاریخ تک جاری رہتا ہے، اسی طرح طوافِ زیارت بلا اختلاف پورے ذوالحجہ میں کیا جا سکتا ہے، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ یہ پورے تین ماہ ہیں، اس اختلاف کا اثر نحر کے بعد واقع حج کے اعمال میں ظاہر ہوگا تو جس نے کہا: پورا ذوالحجہ موسمِ حج سے ہے، ان کے ہاں (حج کے کسی عمل کی تاخیر کی صورت میں) دمِ تاخیر (یعنی جانور قربان کرنا) لازم نہیں، جبکہ دوسروں کے نزدیک لازم ہے۔

ان مہینوں سے قبل حج کا احرام باندھ لینا

سیدنا ابن عمر، ابن عباس، جابر رضی اللہ عنہم اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسا کرنا صحیح نہیں، بقول امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اشہرِ حج شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے (پہلے) دس دن ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سنت یہ ہے کہ حج کا احرام نہ باندھے مگر حج کے ان اشہر ہی میں، ابن جریر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ اشہرِ حج سے قبل حج کا احرام باندھ لینا صحیح مع الکراہت ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اول رائے کو ترجیح دی اور لکھا: البتہ اشہرِ حج سے قبل احرام باندھنے سے منع کے لیے یہ امر مقوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مناسکِ حج کے لیے معلوم مہینے بنائے ہیں اور احرام اعمالِ حج کا ایک عمل ہے تو جس نے ان سے قبل اس کی صحت کا ادعاء کیا اس کے ذمہ دلیل ہے۔

مکانی مواقیت

یہ وہ جگہیں ہیں جہاں سے حج یا عمرہ کو جانے والا احرام کے بغیر آگے نہ جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نشاندہی فرمائی

ہے، اہلِ مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ (جو مدینہ سے دس اور مکہ سے تقریباً ۴۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر مکہ کی شاہراہ پر ہے) اہلِ شام کے لیے جُحفہ (جو مکہ سے شمال مغرب میں ۱۸۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے) یہ ضلع رابغ کا ایک قصبہ ہے، یہ اہلِ مصر و شام اور اس طرف کے لوگوں کا میقات ہے، اہلِ نجد کا میقات قرن المنازل ہے جو مکہ کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے، جو عرفات پر جانکلتا ہے، اس کے اور مکہ کے مابین ۹۴ کلومیٹر کی مسافت ہے، اہلِ یمن کے لیے یلملم کو میقات بنایا، یہ مکہ کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے، اس کے اور مکہ کے مابین چون کلومیٹر کی مسافت ہے (اہلِ برصغیر کے لیے یہی میقات ہے) اہلِ عراق کا میقات ذات عرق ہے، جو مکہ کے شمال مشرق میں (چورانوے کلومیٹر دور) واقع ایک موضع ہے۔ یہ وہ مواقیت ہیں جن کی نشاندہی نبی کریم ﷺ نے فرمائی اور یہ اس طرف کے رہنے والے سب باشندوں کے میقات ہیں، نبی کریم ﷺ کی کلامِ مبارک میں ان مواقیت کے رہنے والوں اور دیگر مقامات والوں کے لیے جو یہاں سے حج وعمرہ کے قصد سے گزریں، کے لیے تہنیت و مبارکبادی کے الفاظ وارد ہیں، اہلِ مکہ حج وعمرہ کرنا چاہیں تو اپنے گھر سے ہی احرام باندھیں گے اسی طرح وہ سب جو ان مواقیت سے آگے مکہ کی طرف رہائش پذیر ہیں، بقول ابن حزم ایسا شخص جس کا مکہ آنے کا راستہ چاہے۔ وہ بحری، بری (یا فضائی) ہو ان مواقیت سے نہیں گزرتا وہ جہاں سے چاہے (یعنی ان سے پیچھے) احرام باندھ لے۔

میقات سے پہلے احرام باندھ لینا

امام ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اجماع ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، البتہ ایک قول کے مطابق یہ مکروہ ہے، کیونکہ صحابہ کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہلِ مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ اور......الخ، ان مواقیت پر آکر احرام باندھنے کو مقتضی ہے، اگر پہلے باندھ لینا حرام نہیں تو کم از کم خلافِ افضل ضرور ہے (یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ بالخصوص فضائی سفر میں چونکہ لمحہ بھر میں ان مواقیت سے جہاز گزر جائے گا، لہٰذا ضرورۃً ائر پورٹ یا گھر ہی سے احرام باندھنا زیادہ مناسب ہے، دیگر کے لیے خاص ان مواقیت پر آکر، اگر وہ ان کے راستہ میں واقع ہوں یا ان کے برابر ہو کر باندھنا افضل ہے)۔

احرام

احرام کی تعریف

یہ حج وعمرہ دونوں میں سے ایک کی یا دونوں کی نیت کرنا اور یہ رکن ہے اس آیت کے مدنظر:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (البينة:٥)

اور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے پیشِ نظر: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوىٰ» نیت کی حقیقت کے بارے کلام گزر چکی ہے کہ اس کا محل دل ہے، کمال بن ہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے حج وعمرہ کی

بابت روایت کرنے والوں میں سے کسی کو نہیں جانتے کہ کسی ایک نے بھی یہ کہا ہو کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا: میں نے عمرہ کی یا حج کی نیت کی (اس سلسلہ میں جمہور کا موقف ہے کہ اگرچہ سب عبادات کی نیت کا محل دل ہے، مگر بطورِ خاص عمرہ و حج کی نیت زبان سے کی جائے گی، کیونکہ اس نیت کے الفاظ مروی ہیں، راقم کے نزدیک الفاظ مروی ہونے کے باوجود جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں گزرا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا تھا کہ تم نے کیا نیت کی؟ تو انہوں نے کہا: میں نے کہا کہ میں اس چیز کی نیت سے احرام باندھ رہا ہوں جس کی نیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھا ہے، مگر یہ واضح نہیں کہ آیا زبان سے یہ کلمات کہتے تھے یا فقط دل میں سوچے تھے)۔

احرام کے آداب

احرام کے چند درج ذیل آداب ہیں جن کا خیال رکھنا چاہیے

① نظافت

یعنی ناخن تراشے ہوں، مونچھیں چھوٹی کی ہوں، بغل کے اور زیرِ ناف بال صاف کیے ہوں، اسی طرح وضو یا غسل کر کے احرام پہنے، اسی طرح داڑھی سنوارے اور سر کے بالوں کی تراش خراش کرے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: سنت یہ ہے کہ احرام کا ارادہ کرتے وقت (غسلِ احرام کی نیت سے) غسل کرلے جب مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ (اور وقت) ہو،[1] اسے بزار، دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا بقول حاکم یہ صحیح ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''حائضہ اور نفاس والی غسل کر کے احرام پہنے اور سب مناسک ادا کرے، ماسوائے طواف کے کہ اسے وہ طہر تک مؤخر کرلے۔''[2] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے حسن قرار دے کر نقل کیا۔

② کوئی سلا ہوا کپڑا نہ پہنے

بس احرام کی دو چادریں ہوں، ایک بالائی دھڑ اور دوسری نچلے دھڑ کے لیے، سر ننگا رکھے گا، مناسب ہے کہ یہ چادریں سفید ہوں کیونکہ سفید رنگ اللہ کو زیادہ پسند ہے (مگر یہ واجب نہیں) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مدینہ سے تیل کنگھی کر کے چلے اور دو چادریں زیبِ تن کیں اور آپ کے صحابہ نے بھی، اسے بخاری نے تخریج کیا۔

③ خوشبو لگانا

جسم میں اور کپڑوں میں اگرچہ احرام کے بعد تک خوشبو کا اثر قائم رہے (یعنی خوشبو احرام سے قبل لگائی جائے گی، البتہ آگے جو حدیث ذکر کی اس میں کپڑوں کو خوشبو لگانے کا ذکر موجود نہیں، پھر کن کپڑوں کو؟ اگر مراد احرام کی چادریں ہیں تو حالتِ احرام میں تو خوشبو لگانا حرام ہے) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ گویا میں خوشبو کی چمک نبی کریم ﷺ کے سر مبارک میں دیکھ

---

① صحیح، مسند البزار: ۱۰۸۴. ② صحیح، سنن أبی داود: ۱۷۴٤؛ سنن ترمذی: ۹٤٥.

رہی ہوں جبکہ آپ محرم تھے۔[1] (سر مبارک میں یہ خوشبو آپ نے احرام باندھنے سے قبل لگائی تھی، کیونکہ اس کے بعد طویل عرصہ اس سے پرہیز کرنا تھا) اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، دونوں کی ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ میں احرام باندھنے سے قبل آپ کو خوشبو لگایا کرتی تھی اسی طرح حلال ہونے پر بھی طواف کرنے سے قبل،[2] اور کہا: ہم آپ کے ہمراہ مکہ کی طرف نکلتیں تو احرام باندھتے وقت اپنی پیشانیاں کستوری کے ساتھ تربتر کر لیتیں، پسینہ جب آتا تو کستوری چہرے پر بہہ پڑتی، نبی کریم ﷺ دیکھتے مگر منع نہ فرماتے،[3] اسے احمد اور ابوداود نے نقل کیا۔

④ دو رکعت پڑھنا

ان کے ساتھ احرام کی سنت کی نیت کرے اور فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھے، بقول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ نے ذوالحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں۔[4] اور اگر فرض نماز کا وقت تھا تو وہ ان سے کفایت کر لیں گی، جیسا کہ وہ تحیۃ المسجد سے بھی کفایت کرتی ہیں۔

احرام کی اقسام

احرام کی تین اقسام ہیں:

① قِران ② تمتع ③ اِفراد

علماء کا اجماع ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک کی نیت کے ساتھ احرام باندھنا جائز ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہم حَجِّ وداع کے سال نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نکلے، ہم میں سے بعض نے صرف عمرہ، بعض نے حج و عمرہ دونوں اور بعض نے صرف حج کی نیت سے احرام باندھا، نبی کریم ﷺ نے حج کی نیت سے احرام باندھا تھا تو جس نے صرف عمرہ کا باندھا تھا وہ مکہ پہنچ کر (عمرہ کرتے ہی) حلال ہو گیا، دوسرے دونوں حلال نہ ہوئے حتی کہ یومِ نحر ہوا،[5] اسے احمد،، بخاری، مسلم اور مالک نے تخریج کیا۔

قِران سے مراد

قِران کا معنی یہ ہے کہ میقات سے حج و عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھے اور تلبیہ کے وقت کہے: "لَبَّيْكَ بِحَجٍّ وَ عُمْرَةٍ" (حج اور عمرہ دونوں کے لیے میں حاضر ہوں، اسے اِہلال کہا جاتا ہے) اس کا اقتضاء یہ ہے کہ عمرہ اور حج کے اعمال پورے ہونے تک وہ احرام میں برقرار رہے۔

---

① صحيح البخاري: ١٠٣٨؛ صحيح مسلم: ١١٩٠. ② صحيح البخاري: ١٥٣٩؛ صحيح مسلم: ١١٨٩.
③ صحيح البخاري: ١٥٤١؛ صحيح مسلم: ١١٨٨. ④ صحيح البخاري: ١٥٤١؛ صحيح مسلم: ١١٨٨.
⑤ صحيح البخاري: ١٥٦٢؛ صحيح مسلم: ١٢١١.

تمتع سے مراد

تمتع کا معنی یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا، پھر حلال ہوجانا اور اسی برس (اور اسی سفر میں) حج کرنا، اسے تمتع کا نام اس لیے دیا، کیونکہ حج کے اشہر میں دو نسک کی ادائیگی کے ساتھ متمتع (یعنی مستفید) ہوا، بغیر اس کے کہ عمرہ کر کے اپنے وطن واپس ہو، پھر اس لیے کہ احرام سے تحلّل کے بعد (اس کی سب بندشیں ختم ہوجاتی ہیں اور) وہ ان سب امور سے متمتع ہوتا ہے جن کے ساتھ غیر محرم ہوتا ہے، مثلاً: سلا ہوا لباس پہننا اور خوشبو لگانا وغیرہ، تمتع کی صفت یہ ہے کہ میقات سے صرف عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھے اور تلبیہ کے وقت کہے: ''لَبَّيْكَ بِعُمْرَةٍ'' تو (بعد ازاں حج شروع ہونے پر) یہ مکہ سے حج کا احرام باندھے گا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: جمہور کی رائے میں تمتع سے مراد یہ ہے کہ کوئی اشہرِ حج میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ جمع کرے، ایک ہی برس اور یہ کہ اولاً وہ عمرہ کرے اور یہ کہ اگر وہ مکی ہے تو ان شروط میں سے کوئی ایک بھی شرط پوری نہ کی تو وہ متمتع نہ ہوگا۔

افراد سے مراد

میقات سے صرف حج کی نیت سے احرام باندھے اور تلبیہ میں ''لَبَّيْكَ بِحَجٍّ'' کہے اور اعمالِ حج سے فارغ ہونے تک وہ مُحرِم ہی رہے، پھر بعد میں جب چاہے عمرہ کرے (یعنی حج کرنے سے پہلے وہ عمرہ نہ کرے)۔

کون سی نوع افضل ہے؟

فقہاء کا اس بارے میں باہم اختلاف ہے، شوافع کے نزدیک اِفراد اور تمتع قران سے افضل ہیں، کیونکہ افراد یا تمتع کرنے والا دونوں میں سے ہر نسک کو اس کے کمال افعال کے ساتھ ادا کرتا ہے، جبکہ قارن اکیلے حج کے اعمال ادا کرنے پر اقتصار کرتا ہے، تمتع اور افراد کے بارے میں ان کے ہاں دو اقوال ہیں، ایک یہ کہ تمتع افضل ہے اور دوم یہ کہ افراد افضل ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: تمتع اور افراد سے قران افضل ہے اور تمتع افراد سے افضل ہے۔ مالکیہ کے ہاں افراد باقی دونوں سے افضل ہے جبکہ حنابلہ تمتع کو باقی دونوں سے افضل قرار دیتے ہیں اور یہی لوگوں کے لیے ایسر و اسہل ہے (بقول محشی بالخصوص اس تناظر میں کہ ہم یعنی دوسرے ممالک سے آنے والے قربانیاں اپنے ہمراہ نہیں لاتے، ہاں اگر کوئی قربانی اپنے ہمراہ لا سکے تو اس کے لیے قران افضل ہے) اور اسی کی آنحضرت نے اپنے لیے تمنا کی تھی اور اپنے صحابہ کو اسی کا حکم دیا تھا (یعنی حجِ وداع کے موقع پر) مسلم نے عطاء سے روایت کیا کہ میں نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سنا: ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خالصۃً اکیلے حج کا احرام باندھا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحجہ کی چار تاریخ کی صبح کو مکہ پہنچے اور ہمیں حکم دیا کہ احرام کھول دیں اور فرمایا: ''(عمرہ کر کے) حلال ہو جاؤ اور (چاہو تو) بیویوں سے قربت بھی کرلو۔'' البتہ اسے ان کے لیے واجب نہ کیا تھا، بلکہ اس کا اختیار دیا اور ایسا کرنا حلال قرار دیا تھا، ہم نے آپس میں کہا: اب عرفہ اور ہمارے درمیان صرف پانچ دن رہ گئے ہیں تو آپ بیویوں سے متمتع ہونے کا کہہ

رہے ہیں تو عرفہ اس حالت میں جائیں گے کہ ہماری شرمگاہوں سے منی ٹپکتی ہوگی (یہ باتیں آپ کو پہنچیں) تو آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ میں تم سے بڑھ کر اللہ کا متقی، نیک اور سب سے سچا ہوں، اگر میرے ساتھ میری حج کی قربانیاں نہ ہوتیں تو میں بھی تمہاری طرح حلال ہو جاتا اور اگر پہلے یہ خیال آ جاتا جو بعد میں آیا تو میں قربانیاں اپنے ساتھ نہ لاتا (بلکہ یہیں سے خریدتا) لہٰذا حلال ہو جاؤ۔'' کہتے ہیں کہ ہم حلال ہو گئے اور سمع و طاعت کی۔[1]

مطلقاً ہی احرام باندھنے کا جواز

(یعنی بغیر افراد، قران یا تمتع کی تخصیص کیے) جس نے اللہ کے اپنے پہ عائد کردہ فرض کی ادائیگی کا قصد کر کے مطلقاً احرام باندھا بغیر اس کے کہ ان اقسام میں سے کسی قسم کی تخصیص کرے، اس تفصیل سے اپنی عدم معرفت کی وجہ سے تو یہ جائز اور اس کا احرام صحیح ہے، علماء کہتے ہیں اگر نسک کا قصد کرتے ہوئے اہلال و تلبیہ کیا، جیسے لوگ کر رہے تھے اور لفظاً کسی چیز (یعنی ان مذکورہ اقسام میں کسی ایک قسم) کی تعیین نہ کی اور نہ دل میں کوئی تخصیص مقصود تھی نہ تمتع، نہ افراد اور نہ قران کی تو اس کا حج صحیح ہے، اب وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نوع اختیار کر سکتا ہے۔

قارن اور متمتع کا طواف وسعی اور یہ کہ اہلِ حرم (جو حرم کی حدود کے اندر رہتے ہیں) کے لیے صرف حج افراد ہے

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حجِ تمتع کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا: مہاجرین وانصار اور ازواجِ مطہرات نے حجِ وداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی تو جب ہم مکہ پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنا اہلال عمرے کا بنا لو، مگر وہ جس کے ہمراہ قربانی ہے۔'' (گویا میقات سے ایک خاص نیت کا احرام باندھ کر آگے جا کر اس میں ترمیم کر لینا جائز ہے) تو ہم نے طواف کیا اور صفا و مروہ کے مابین سعی کی، پھر (حلال ہو گئے یعنی احرام کھول دیا اور) بیویوں سے قربت کی اور سلے ہوئے کپڑے پہن لیے، مزید فرمایا: ''جس کے ہمراہ حج کی قربانی ہو وہ احرام برقرار رکھے، حتی کہ قربانی ٹھکانے لگ جائے۔'' (یعنی دسویں ذوالحجہ تک) پھر یومِ ترویہ (یعنی آٹھ ذوالحجہ) کی دوپہر کو ہمیں (حج کا) احرام باندھنے کا حکم دیا تو جب (حج کے) مناسک سے فارغ ہوئے تو کعبہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کی سعی کی (یعنی دس ذوالحجہ کو) اس پر ہمارا حج پورا ہوا، اب ہمارے ذمہ قربانی کرنا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾(البقرة: ١٩٦)

''تو تم میں سے جو حج تک عمرے سے فائدہ اٹھائے تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرے) اگر وہ نہ پائے تو تین دن کے روزے حج کے دوران اور سات دن کے اس وقت رکھے جب تم واپس ہو جاؤ۔''

---

[1] صحیح مسلم: ١٢١٦.

رجوع سے مراد اپنے وطن لوٹ کر، یوں ایک سال میں دونوں نسک ادا کیے، بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب وسنت میں نازل کیا اور سوائے اہلِ مکہ کے سب لوگوں کے لیے اسے مباح کیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ (البقرة: ۱۹۶)

''یہ (حکم) اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔''

اشہرِ حج جن کا اللہ نے ذکر کیا: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج ہیں تو جس نے ان اشہر میں تمتع کیا تو اس کے ذمہ قربانی ہے یا اس کے بدلے میں روزے رکھے،[1] اسے بخاری نے ذکر کیا۔

① اس حدیث میں دلیل ہے کہ اہلِ حرم کے لیے نہ تمتع ہے اور نہ قران (بقول محشی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ مکی تمتع اور قران کر سکتا ہے، بغیر کراہت کے اور اس پر کوئی چیز نہیں) اور وہ حجِ افراد کریں گے اور عمرہ (اگر کرنا ہو تو) الگ سے کریں گے، یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، ان کے پیش نظر یہ آیت ہے: ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ حاضری المسجد الحرام کون ہیں؟ اس بارے میں اختلافِ آراء ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: یہ بطورِ خاص اہلِ مکہ کے لیے ہے اور یہی اعرج کا قول ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی یہی اختیار کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام طاوس رحمہ اللہ اور ایک گروہ نے کہا: یہ حدودِ حرم میں رہنے والے کے لیے ہے، بقول حافظ رحمہ اللہ یہی ظاہر ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: مسجد الحرام سے کم از کم اتنی مسافت والے کہ جہاں جا کر نماز قصر کرنا جائز ہو، امام ابن جریر رحمہ اللہ کا بھی یہی مختار ہے، احناف نے کہا: جو میقات میں یا اس سے پہلے (یعنی مکہ کی جانب) رہائش پذیر ہوں اور اعتبار رہائش کا ہے نہ کہ پیدائش کا۔

② یہ بھی ثابت ہوا کہ تمتع کرنے والا اولاً طواف وسعی کرے (یعنی عمرہ کرے) اور یہ طوافِ عمرہ طوافِ قدوم سے مستغنی کرے گا (یعنی اس کی اب ضرورت نہ ہوگی کہ یہی اس کا قائم مقام بنا) پھر طوافِ افاضہ وہ عرفہ کے وقوف کے بعد کرے گا اور اس کے بعد سعی بھی (یعنی حج کے نسک کے بطور کہ سابقہ سعی عمرہ کے لیے تھی) جہاں تک قارن کا تعلق ہے تو جمہور علماء کا مؤقف ہے کہ اس کے لیے عملِ حج ہی کافی ہے اور وہ ایک طواف ہی کرے گا (یعنی طوافِ افاضہ وقوفِ عرفہ کے بعد) اور حج و عمرہ دونوں کے لیے (اسی موقع پر) ایک سعی کر لے گا مفرد کی مثل۔

① سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کیا تھا اور حج وعمرہ کے لیے ایک ہی طواف کیا تھا،[2] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن ہے۔

② سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج وعمرہ دونوں کا احرام باندھا، اسے ایک ہی طواف و سعی کافی ہے،[3] اسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح غریب ہے، اسے دارقطنی نے بھی تخریج کیا اور یہ اضافہ بھی

---

[1] صحيح البخاري: ١٥٧٢. [2] صحيح، سنن ترمذي: ٩٤٧. [3] صحيح، سنن ترمذي: ٩٤٨.

کیا: "وَلَا يَحِلُّ مِنْهُمَا حَتّٰى يَحِلَّ مِنْهُمَا جَمِيْعاً" یعنی دونوں سے اکٹھے حلال ہو۔[1]

③ مسلم نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا: تمہارا طواف اور صفا ومرہ کی سعی تمہارے حج اور عمرہ دونوں کے لیے کافی ہے۔[2] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: دو طواف اور دو سعی ضروری ہیں، لیکن اول قوتِ ادلہ کے مد نظر اقوی ہے۔

④ حدیث سے ثابت ہوا کہ متمتع اور قارن کے ذمہ قربانی ہے اور یہ کم از کم ایک بکری ہے، جو نہ پائے وہ دورانِ حج میں تین اور وطن جا کر مزید سات روزے رکھے، اولیٰ یہ ہے کہ تین روزے وہ یوم عرفہ سے قبل عشرۂ ذی الحجہ میں رکھ لے، بعض علماء نے تو شوال کے شروع میں بھی اسے مجوز کیا ہے، ان میں امام طاوس اور امام مجاہد رحمہما اللہ بھی ہیں، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے تھی کہ ایک دن یوم ترویہ سے قبل، ایک یوم ترویہ کا اور ایک یوم عرفہ کا روزہ رکھے، اگر یہ روزے نہ رکھے یا ان میں سے بعض عید سے قبل رکھ لے تو جائز ہے کہ ایام تشریق میں رکھ لے، کیونکہ سیدہ عائشہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ ایامِ تشریق میں یہ روزے رکھنے کی رخصت اسی کو ہے جو قربانی کی سکت نہیں پاتا،[3] اسے بخاری نے نقل کیا، اگر حج کے دوران میں یہ تین روزے اس سے رہ گئے تو ان کی قضا دینا لازم ہے، باقی سات کے متعلق کہا گیا کہ وہ وطن واپسی پر رکھے اور بعض نے کہا: جب منیٰ سے اپنے ٹھکانے (یعنی مکہ میں) واپس ہو، آخری اسی قول کی رو سے (واپسی کے دوران میں) راستہ میں بھی رکھ سکتا ہے، یہ امام مجاہد اور امام عطاء رحمہما اللہ کا مذہب ہے، ان دس روزوں کو پے در پے رکھنا واجب نہیں، جب نیت کی اور احرام باندھ لیا تو اس کے لیے تلبیہ کرنا مشروع ہے۔

تلبیہ

تلبیہ کا حکم

علماء کا اجماع ہے کہ تلبیہ مشروع ہے، چنانچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت میں ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "اے آلِ محمد! جو تم میں سے حج کرے وہ اس دوران میں تلبیہ کے ساتھ آواز بلند کرے۔[4] اسے احمد اور ابن حبان نے نقل کیا، اس کے حکم، وقت اور تاخیر کرنے والے کی بابت اختلاف ہے تو امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا: یہ سنت ہے اور احرام باندھنے کے ساتھ ہی متصلاً اس کا کہنا مستحب ہے، اگر نیت کی مگر تلبیہ نہ کہا تو (کوئی حرج نہیں) اس کا نسک صحیح ہے اور اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں کیونکہ ان کے نزدیک احرام مجرد نیت سے ہی منعقد ہو جاتا ہے، احناف کا موقف ہے کہ تلبیہ یا جو الفاظ اس کے قائم مقام ہوں ان میں سے جو اس کے ہم معنی ہوں، مثلاً: تسبیح اور قربانی ہمراہ لانا احرام کی شروط میں سے ایک

---

① سنن الدارقطني: ٢/ ٢٥٥. ② صحيح مسلم: ١٢١١. ③ صحيح البخاري: ١٩٩٧، ١٩٩٨.

④ صحيح، مسند أحمد: ٦/ ٣١٧.

شرط ہے تو اگر احرام باندھا مگر تلبیہ یا تسبیح نہ کہی یا قربانی ہمراہ نہ رکھی تو اس کا احرام نہیں، یہ اس امر پر مبنی ہے کہ ان کے نزدیک احرام نیت اور اعمالِ حج میں سے کسی عمل کے ساتھ مرکب ہے، اگر نیت کی اور اعمالِ نسک میں سے کوئی عمل کیا یعنی تسبیح کہی یا تلبیہ پڑھا یا قربانی روانہ کی اور تلبیہ نہ پڑھا تو اس کا احرام منعقد ہے، ترکِ تلبیہ کی وجہ سے اسے دم لازم نہیں، امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ واجب ہے، اس کے ترک یا احرام کے ساتھ ترک سے اگر طویل وقفہ گزرا تو دم لازم آئے گا۔

تلبیہ کے الفاظ

امام مالک رحمہ اللہ نے نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ کہے: «لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لاَ شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ لَكَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لاَ شَرِيْكَ لَكَ» بقول نافع: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اس میں ان الفاظ کا اضافہ کرتے تھے: ”لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ بِيَدَيْكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ“[1] علماء نے نبی کریم ﷺ کے کہے تلبیہ پر اقتصار کو مستحب کہا ہے اور ان پر اضافہ کے بارے باہم اختلاف کیا تو جمہور کی رائے میں کوئی حرج نہیں، جیسے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا اور کئی صحابہ نے نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں اور آپ نے سکوت کیا،[2] اسے ابو داود اور بیہقی نے نقل کیا، مالک اور ابو یوسف نے تلبیۂ نبوی پر اضافہ مکروہ کہا ہے۔

تلبیہ کی فضیلت

① ابن ماجہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کوئی محرم سارا دن غروب آفتاب تک تلبیہ نہیں کہتا، مگر اس کے گناہ اس طرح مٹ جاتے ہیں جیسے آج ہی اس کی والدہ نے اسے جنا ہو۔“

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کسی اہلال کرنے والے نے کبھی تلبیہ نہیں کہا، مگر اسے بشارت اور نوید دی گئی، اسی طرح ہر مکبر کو بھی۔“ عرض کی گئی: یا نبی اللہ! جنت کی؟ فرمایا: ”ہاں۔“ اسے طبرانی اور سعید بن منصور نے نقل کیا۔

③ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کوئی مسلمان تلبیہ نہیں کہتا، مگر اس کے دائیں بائیں زمین کے آخری کنارے تک ہر پتھر، درخت اور کنکریاں بھی اس کی ہمنوائی کرتی ہیں۔“[3] اسے ابن ماجہ، ترمذی، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا، بقول حاکم یہ صحیح ہے۔

تلبیہ بالجہر کہنے کا استحباب

① سیدنا زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اپنے صحابہ کو حکم

---

[1] صحیح البخاری: ١٥٤٩؛ صحیح مسلم: ١١٨٤. [2] صحیح، سنن أبی داود: ١٨١٢. [3] صحیح، سنن ترمذی: ٨٢٨؛ سنن ابن ماجہ: ٢٩٢١.

دیں کہ تلبیہ کے ساتھ اپنی آوازوں کو بلند کریں کہ یہ حج کے شعائر میں سے ہے۔'' اسے ابن ماجہ، احمد، ابن خزیمہ اور حاکم نے نقل کیا اور کہا: یہ صحیح الاسناد ہے۔

② سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ کون سا حج افضل ہے؟ فرمایا: «اَلْعَجُّ وَالثَّجُّ» ''بآوازِ بلند تلبیہ کہا جانے والا اور قربانی والا۔''[1] اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

③ ابو حازم کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب احرام باندھتے تو روحاء تک نہ پہنچتے مگر (تلبیہ کے ساتھ) ان کی آوازیں (تلبیہ کہتے کہتے) بھاری ہوجاتیں، جمہور نے ان احادیث کے مدِنظر تلبیہ کے ساتھ رفعِ صوت کو مستحب کہا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے بقول مسجدِ جماعات میں ملبی آواز بلند نہ کرے، بلکہ صرف خود کو اور آس پاس والوں کو سنائے، البتہ مسجدِ حرام اور مسجدِ منیٰ میں آواز بلند کرے، یہ مردوں کے لیے ہے، عورتیں اتنی آواز ہی بلند کریں کہ صرف ساتھ والے سن پائیں، اس سے زیادہ آواز بلند کرنا ان کے لیے مکروہ ہے، امام عطاء رحمہ اللہ کے بقول مرد (ہر جگہ) آواز بلند رکھیں اور عورتیں زیرِ لب۔

وہ مواطن جن میں تلبیہ مستحب ہے

یہ متعدد مقامات ہیں، سوار ہوتے ہوئے، سواری سے اترتے وقت اور جب چڑھائی چڑھے یا نشیب میں اترے یا سامنے قافلہ آئے اور ہر نماز کے بعد اور سحری کے وقت، بقول امام شافعی رحمہ اللہ ہم ہر حال اور وقت میں اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

تلبیہ کہنے کا وقت

احرام پہننے سے لے کر دسویں ذوالحجہ جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک اس کا وقت ہے، جماعت نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تلبیہ کہتے رہے، حتی کہ جمرہ پہنچے، یہ امام ثوری، احناف، امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور علماء کا مذہب ہے، احمد اور اسحاق کہتے ہیں: سب جمرات کی رمی تک اس کا وقت ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے بقول یومِ عرفہ کے زوال تک، اس کے بعد ختم کر دے، یہ حج کرنے والے کی نسبت سے ہے، عمرہ کرنے والا حجر اسود کے استلام تک کہتا رہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ میں جب حجر اسود کا استلام کر لیتے تو تلبیہ کہنے سے رک جاتے،[2] (لیکن یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً ثابت ہے) اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا: یہ حسن صحیح ہے اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تلبیہ ختم کرتے تو اللہ سے مغفرت اور اس کی رضوان کی دعا وطلب کرتے اور تعوذ کرتے۔[3] اسے طبرانی وغیرہ نے نقل کیا۔

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۸۲۷؛ سنن ابن ماجہ: ۲۹۲۴. [2] ضعیف، سنن ترمذی: ۹۱۹. [3] ضعیف، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۷۲۱.

محرم کے لیے مباح امور

① نہانا اور احرام کی چادریں تبدیل کر لینا

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہمارے اصحاب جب بئرِ میمون پر آتے تو نہاتے اور اپنے احسن کپڑے پہنتے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے منقول ہے کہ جحفہ کے حمام میں داخل ہوئے جبکہ وہ محرم تھے تو ان سے کہا گیا کہ آپ حالتِ احرام میں حمام میں داخل ہوتے ہیں؟ کہا: اللہ کو ہمارے میلے رہنے سے غرض نہیں، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ محرم نہا سکتا ہے اور (احرام کے) کپڑے بھی دھو سکتا ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: محرم اپنا سر دھو سکتا ہے، عبداللہ بن حنین رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا ابن عباس اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم کا ابواء جگہ میں باہم اختلاف ہوا، سیدنا مسور رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ محرم سر نہیں دھو سکتا، کہتے ہیں: مجھے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا تو میں نے انہیں پایا کہ ایک کنویں پر ایک کپڑے کی اوٹ لیے نہا رہے ہیں، میں نے سلام کہا، کہنے لگے: کون؟ عرض کی: میں عبداللہ بن حنین ہوں! مجھے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ سے یہ پوچھنے بھیجا ہے کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ احرام میں نہا لیتے تھے؟ سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ نے کپڑے پر ہاتھ رکھ کر اوپر سے جھانکا حتی کہ ان کا سر ظاہر ہوا تو ایک آدمی سے کہا: اس پر پانی ڈالو، پھر ہاتھ سے سر ملا، آگے پیچھے دھویا اور کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا تھا۔[1] اسے سوائے ترمذی کے سب نے نقل کیا، بخاری کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ میں نے لوٹ کر دونوں کو اس کی خبر دی تو سیدنا مسور رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: آج کے بعد میں کبھی آپ سے اختلاف نہیں کروں گا،[2] امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث محرم کے لیے جوازِ غسل پر دال ہے اور اس دوران میں ہاتھ دھونے کی غرض سے سر پر رکھ لینے کے جواز پر بھی، امام ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس امر پر اجماع ہے کہ محرم غسلِ جنابت تو کرے گا لیکن (بغرضِ صفائی یا گرمی کی سبب) نہانے میں اختلاف ہے۔ مالک نے مؤطا میں نافع سے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب محرم ہوتے تو اپنا سر نہ دھوتے تھے مگر اس صورت میں کہ محتلم ہوتے۔[3] امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ محرم کے لیے مکروہ قرار دیا کہ اپنا سر پانی میں چھپائے (یعنی پانی میں غوطہ لگائے) البتہ میل کچیل دور کرنے کے لیے صابن وغیرہ کا استعمال کرنا جائز ہے، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک خوشبودار صابن کا استعمال بھی جائز ہے، کنگھی کرنا اور بال کھولنا بھی جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دونوں کاموں کا حکم دیا تھا۔[4] اسے مسلم نے روایت کیا، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ہمارے (یعنی شوافع) کے نزدیک حالتِ احرام میں بال کھولنا اور کنگھی کرنا جائز ہے، اس طور پر کہ بال نوچے یا اکھیڑے نہیں، البتہ کنگھی کسی عذر کی بنا پر ہی کرے، سر پر سامان اٹھانے میں حرج نہیں۔

---

① صحیح البخاری: ۱۸٤۰؛ صحیح مسلم: ۱۲۰۵. ② صحیح مسلم: ۱۲۰۵ (۹۲) ③ صحیح، المؤطا امام مالک: ۱/ ۳۲٤. ④ صحیح مسلم: ۱۲٤.

② تبان (چھوٹی شلوار یعنی گھٹنوں سے ذرا آگے تک جو ہو وہ) پہننا

بخاری اور سعید بن منصور نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ وہ محرم کے لیے تبان پہننے میں حرج نہ سمجھتی تھیں۔ ①

③ چہرہ ڈھانپنا

امام شافعی اور سعید بن منصور نے قاسم سے نقل کیا کہ سیدنا عثمان، زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور مروان بن حکم حالتِ احرام میں چہرہ ڈھانپ لیتے تھے، طاوس سے مروی ہے کہ غبار یا دھویں سے بچنے کے لیے محرم چہرہ ڈھانپ سکتا ہے، امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب آندھی چلتی تو سلف احرام میں ہوتے ہوئے بھی چہرے ڈھانپ لیتے تھے۔

④ عورت کے لیے موزے پہننا

یہ جائز ہے کیونکہ ابو داود اور شافعی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے موزے پہن لینے کی رخصت دی ہے۔ ②

⑤ بھول کر سر ڈھانپ لینا

شافعیہ کہتے ہیں: اگر بھول کر سر ڈھانپ لیا یا قمیص پہن لی تو اس پر کچھ لازم نہیں، امام عطاء رحمہ اللہ نے بھی یہ کہا اور یہ کہ وہ اللہ سے استغفار کرے، احناف کے نزدیک اس کے ذمہ فدیہ ہوگا، یہ اختلاف رائے بھول کر یا حکم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے خوشبو لگا لینے میں ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ حکم سے ناواقفی اور نسیان ہر محظور (یعنی از روئے شرع جس سے احتراز کرنا ہے) میں وجوبِ فدیہ کا مانع ہے بشرطیکہ اتلاف نہ ہو، مثلاً: شکار کرنا، سر منڈوانا اور ناخن کاٹنا ان کے ہاں اصح قول پر، اس کی بحث آگے آئے گی۔

⑥ سینگی لگوانا، داڑھ نکلوانا اور فصد کرانا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ثابت ہے کہ احرام کی حالت میں آپ نے سر کے وسط میں سینگی لگوائی تھی، (بقول محشی ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کے لیے لازماً کچھ حصہ کے بال صاف کرائے ہونگے) امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: محرم کے لیے حرج نہیں کہ پھنسی چھیلے اور زخم (پر پٹی) باندھے اور بوقت ضرورت فصد کرائے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: محرم داڑھ نکلوا سکتا اور پھوڑا چھیل سکتا ہے، امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر ضرورت کے بغیر محرم نے سینگی لگوانا چاہی جبکہ یہ مقتضی ہے کہ کچھ بال صاف کیے جائیں تو یہ حرام ہے، اگر بال حلق کیے بغیر یہ ہو سکے تب جمہور کے نزدیک جائز ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے مکروہ کہا، حسن کے ہاں اس پر فدیہ عائد ہوگا، اگرچہ بال حلق نہ کیے ہوں، اگر ضرورت و مجبوری ہے، تب بال کاٹنا جائز ہے، مگر فدیہ دینا پڑے گا، اہلِ ظاہر نے فدیہ کو سر کے بالوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔

---

① صحیح البخاری: ٣/ ٣٦٩. ② حسن، سنن أبی داود: ١٨٣١.

⑦ سر یا جسم کا کوئی اور حصہ کھجانا

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ کھجایا جا سکتا ہے، اسے بخاری، مسلم اور ابو داود نے تخریج کیا اور مزید یہ بھی کہ اگر (بالفرض) میرے ہاتھ بندھے ہوں اور کھجانے کی کوئی صورت نہ ہو مگر پاؤں کے ساتھ تو بھی کھجاؤں،[1] اسی جیسا قول سیدنا ابن عباس، جابر رضی اللہ عنہم، سعید بن جبیر، عطاء اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔

⑧، ⑨ آئینہ دیکھنا اور پھول سونگھنا

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ محرم پھول سونگھ سکتا اور آئینہ دیکھ سکتا ہے، زیتون اور گھی کھانے کے ساتھ تداوی کر سکتا ہے، عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ احرام کی حالت میں آئینہ دیکھ لیتے اور مسواک کرتے۔ بقول امام ابن منذر رحمہ اللہ علماء کا اجماع ہے کہ محرم زیتون، چربی اور گھی کھا سکتا ہے، اس پر بھی اجماع ہے کہ جسم میں کسی جگہ خوشبو لگانا اس کے لیے حرام ہے، احناف اور مالکیہ نے ایسی جگہ اس کا ٹھہرنا مکروہ قرار دیا جہاں عطریات کی خوشبو ہو، چاہے انہیں سونگھنے کا وہ قصد کرے یا نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جائز ہے کہ عطار کے پاس بیٹھے، کیونکہ اس سے بچنے میں مشقت ہے اور اس لیے کہ یہ مقصودِ خوشبو نہیں ہے اور مستحب یہ ہے کہ اس سے بچے اِلاّ یہ کہ موضعِ قربت میں ہو (یعنی جہاں بیٹھنے سے نیکی کا حصول ہوتا ہو) مثلاً: کعبہ کے پاس جبکہ اس سے خوشبو مہک رہی ہو، لہٰذا یہ مکروہ نہیں کیونکہ اس کے پاس بیٹھنا قربت ہے تو امرِ مباح کی وجہ سے اس کا ترک نہیں کیا جا سکتا، خوشبو دار پٹی، رومال یا عطر والی شیشی اٹھا سکتا ہے اس پر کوئی ہرجانہ نہ ہوگا۔

⑩، ⑪ محرم کا اپنی کمر پر ہمیان وغیرہ باندھنا، جس میں رقم (اور کاغذات وغیرہ) ہو اور انگشتری پہننا

بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس میں حرج نہیں۔

⑫ سرمہ ڈالنا

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اگر آشوبِ چشم کا شکار ہو تو کسی بھی قسم کا سرمہ استعمال کر سکتا ہے، اسی طرح بغیر آشوب کے بھی، ہاں خوشبودار سرمہ سے بچے، علماء کا تداوی کے بطور اس کے جوازِ استعمال پر اجماع ہے، لیکن زینت کے لیے استعمال نہ کرے۔

⑬ محرم خیمہ، سایہ دار جگہ یا چھت کے نیچے ہو سکتا ہے

عبداللہ بن عامر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نکلا تو وہ حالتِ احرام میں درخت کی شاخوں پر کپڑا وغیرہ تان

---

[1] صحيح البخاری معلقاً: ٤/ ٥٥، مؤطا امام مالك: ١/ ٣٥٨.

کر اس کے سایہ تلے آرام کرتے۔① اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، سیدہ ام حصین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع کیا تو میں نے سیدنا اسامہ بن زید اور بلال رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ ان میں سے ایک ناقۂ نبوی کی لگام تھامے تھا اور دوسرا آپ پر کوئی کپڑا تانے ہوئے تھا، تاکہ گرمی سے بچاؤ ہو حتی کہ آپ نے جمرۂ عقبہ کو کنکریاں ماریں۔② اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا۔ امام عطاء رحمہ اللہ کے بقول محرم دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ دار جگہ میں ہو سکتا ہے، اسی طرح بارش اور آندھی سے بچنے کے لیے بھی، ابراہیم نخعی کے بقول اسود بن یزید رحمہ اللہ نے اپنے سر پر کوئی چادر ڈالی اور یہ بارش سے محفوظ رہنے کے لیے جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے تھے۔

⑭ مہندی یا خضاب لگانا

حنابلہ کے نزدیک محرم پر یہ حرام نہیں چاہیے مرد ہو یا عورت، لیکن سر کے سوا باقی بدن کے لیے، شافعیہ نے کہا: مرد کے لیے ہاتھوں اور پاؤں کے سوا باقی سب جسم کی نسبت حلال ہے، البتہ بغیر ضرورت کے نہیں، اسی طرح سر پر خضاب اور مہندی کی موٹی تہہ نہ جمائے، عورت کے لیے حالتِ احرام میں خضاب لگانا مکروہ سمجھا ہے، اِلّا یہ کہ وہ وفات کی عدت گزار رہی ہو، تب یہ (مکروہ نہیں بلکہ) حرام ہے، اسی طرح وہ خضاب بھی حرام ہے، جو نقش ہو چاہے وہ عدت میں ہو، احناف اور مالکیہ نے کہا: مرد اور عورت سب کے لیے حالتِ احرام میں مہندی کا خضاب لگانا حرام ہے، کیونکہ یہ طیب (یعنی خوشبو) ہے اور محرم کو اس سے ممانعت ہے، خولہ بنت حکیم اپنی والدہ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''احرام کی حالت میں خوشبو مت لگانا اور مہندی بھی نہ چھونا کیونکہ یہ خوشبو ہے۔''③ اسے طبرانی نے کبیر میں، امام بیہقی رحمہ اللہ نے المعرفہ میں اور ابن عبد البر رحمہ اللہ نے التمہید میں نقل کیا۔

⑮ نوکر اور خادم کو تادیباً مارنا

سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج پر نکلے تو عرج کے مقام پر قافلہ نے پڑاؤ ڈالا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھی تھیں اور میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سامانِ سفر اکٹھا تھا، جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کے حوالے کیا ہوا تھا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ منتظر رہے کہ غلام ابھی آتا ہے، ابھی آتا ہے، جب آیا تو اس کا اونٹ اس کے ہمراہ نہ تھا پوچھا: تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ کہا: وہ رات کو گم ہو گیا ہے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: تم سے ایک اونٹ نہ سنبھالا گیا؟ تو اسے مارنے لگے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے رہے اور فرماتے جاتے تھے، ''اس محرم کو دیکھو کیا کر رہا ہے؟'' اس سے زیادہ کچھ نہ کہا، بس مسکراتے رہے۔④ اسے احمد، ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

---

① المصنف لابن ابی شیبة: ١٤٥٤؛ السنن الکبری للبیهقی: ٥/ ٧١. ② صحیح مسلم: ١٢٨٩؛ مسند أحمد: ٦/ ٤٠٢. ③ ضعیف، المعجم الکبیر للطبرانی: ٢٣/ ٤١٨ رقم: ١٠١٢؛ امام بیہقی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ④ حسن، سنن ابن ماجه: ٢٩٣٣؛ مسند أحمد: ٦/ ٣٤٤.

⑯ مکھی، جوں، چچڑی اور چیونٹی مارنا

امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایک آدمی نے ان سے حالتِ احرام میں جوں اور چیونٹی مارنے کے بارے میں پوچھا کہ جو اس کے جسم پر چڑھ جائے، کہنے لگے: اپنے جسم سے ایسی چیزوں کو ہٹا دو، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کوئی حرج نہیں کہ محرم چچڑی اور پسو وغیرہ مار ڈالے، محرم کے لیے اونٹ کے جسم سے بھی پسو نکالنا جائز ہے، چنانچہ عکرمہ رحمہ اللہ راوی ہیں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں حکم دیا کہ اونٹ سے پسو نکالوں جبکہ وہ محرم تھے، عکرمہ رحمہ اللہ نے اسے برا جانا تو کہنے لگے: اٹھو اور اسے ذبح کر ڈالو تو ذبح کر دیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہنے لگے: تمہاری ماں مرے! اب تم نے کتنے ہی پسوؤں کو مار ڈالا؟

⑰ پانچ فواسق اور ہر موذی کو مار ڈالنے کا جواز

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ دوابّ ایسے ہیں جو سب فواسق ہیں (بقول محشی انہیں فاسق اس لیے کہا کہ یہ دیگر چرند و پرند کے حکم سے خارج ہیں، فسق کا معنی خروج ہے، بعض نے کہا: ان کی حلتِ اکل میں دیگر کے حکم سے ان کے خروج کی وجہ سے جبکہ بعض نے ایذا، افساد اور عدم انتفاع کے لحاظ سے، دیگر کے حکم سے ان کے خروج کو وجہِ تسمیہ قرار دیا) یہ حرم میں بھی مار ڈالے جائیں، وہ یہ ہیں: کوا، چیل، بچھو، چوہیا اور کلبِ عقور۔''[1] اسے مسلم اور بخاری نے نقل کیا، بخاری رحمہ اللہ نے سانپ کا بھی ذکر کیا، علماء غراب الزرع (یعنی عام کھیتوں اور گھروں میں پائے جانے والے) کے (اس حکم سے) اخراج پر متفق ہیں، یہ چھوٹا کوا ہوتا ہے جو دانے کھاتا ہے۔

کاٹنے والا کتا جو لوگوں کو کاٹے اور خوفزدہ کرے اور ان پر شیر، چیتے اور بھیڑیے کی مانند حملہ کرے، کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ﴾(المائدۃ:٤)

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال ہے؟ کہہ دیجیے! سب پاکیزہ اشیا اور جس کا اپنے سدھائے ہوئے کتوں/پرندوں کے ذریعے شکار کیا۔''

تو کلب سے اس کا اشتقاق کیا، امام احناف رحمہ اللہ کہتے ہیں: کلب کا لفظ خود اسی پر مقصور ہے، سوائے بھیڑیے کے کوئی اور (درندہ) اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: محرم کے لیے جائز ہے کہ ہر ایسے چرند پرند کو قتل کرے جن کا معمول لوگوں کی ایذا رسانی ہے، مثلاً: سانپ، بچھو، چوہیا، کوا اور کلبِ عقور اور اس کے لیے جائز ہے کہ ایذا رسانی پر کمربستہ انسان اور دیگر جانور و حیوان سے بھی اپنا دفاع کرے، حتی کہ اگر اس میں قتال کی بھی ضرورت پیش آئے تو کرے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے مال، جان، دین اور عزت کا دفاع کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے۔''[2] لکھتے ہیں: اگر

---

[1] صحيح البخاري: ١٨٢٩؛ صحيح مسلم: ١١٩٨. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٤٧٧٢.

اسے پسو اور جوئیں تنگ کریں تو انہیں جسم سے نکال دے، مار بھی سکتا ہے اور اس پر کوئی ہرجانہ نہ ہوگا، بہرحال نکال دینا قتل سے اہون ہے، شیر اور چیتے وغیرہ سے بھی دفاع کرتا ہوا انہیں مار دے تو علماء کے دو میں سے اظہر قول کے مطابق اس پر کوئی فدیہ نہیں، لیکن اگر ایک آدھ جوں ہے اور اسے تنگی نہیں تب ایسا کرنا فضول ہے، اگر کرے تو کوئی ہرجانہ نہیں۔

احرام کے محظورات (یعنی وہ اشیا وافعال جن سے بچا جائے)

وہ حسب ذیل ہیں۔

① جماع اور اس کے مقدمات مثلاً: بوسہ بازی، شہوت سے لمس اور شہوت انگیز گفتگو۔

② برائیوں اور معاصی کا ارتکاب جو آدمی کو اللہ کی طاعت سے نکال دے۔

③ ساتھیوں، نوکروں اور دیگر سے لڑنا جھگڑنا، ان اشیا کی تحریم میں اصل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ﴾ (البقرة: ١٩٧) ''پھر جو ان میں حج فرض کر لے تو حج کے دوران میں نہ کوئی شہوانی فعل ہو اور نہ کوئی نافرمانی۔'' بخاری اور مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور اس دوران میں کوئی رفث وفسق نہ کیا تو وہ گناہوں سے پاک ایسے واپس ہوگا گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنا ہو۔''[1]

④ سلا ہوا کپڑا پہننا مثلاً: قمیص، ٹوپی، واسکٹ، جبہ، شلوار، پگڑی، طربوش اور اس طرح کی چیزیں بھی جو سر پر رکھی جاتی ہیں یہ سب منع ہیں، ایسا رنگا ہوا کپڑا جس سے خوشبو آ رہی ہو، کا استعمال بھی حرام، اسی طرح موزے اور جوتے پہننا بھی، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''محرم قمیص، عمامہ، ٹوپی اور شلوار نہ پہنے اور ایسا کپڑا جو ورس میں رنگا ہوا ہو (یہ زرد رنگ کی ایک خوشبودار بوٹی ہے جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں) اور زعفران میں، نہ موزے پہنے اِلّا یہ کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوں تب موزوں کو اوپر سے کاٹ دے اتنے کہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہو جائیں۔''[2] اسے شیخین نے نقل کیا، علماء کا اتفاق ہے کہ یہ مردوں کے ساتھ مختص ہے۔

عورت اس میں ان کے ساتھ ملحق نہیں وہ یہ مذکورہ سب پہن اور استعمال کر سکتی ہے، اس کے لیے کوئی بھی کپڑا احرام نہیں ماسوائے اس کپڑے کے جس پر خوشبو لگی ہو، البتہ نقاب کرنا اور دستانے پہننا عورت کے لیے حرام ہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حالتِ احرام میں دستانوں اور نقاب سے منع کیا اور جسے ورس (تل کی مانند ایک قسم کی گھاس ہے جس سے رنگتے ہیں) اور زعفران نے چھوا ہو (نقاب استعمال نہیں کرنا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ چہرہ ننگا رکھنا ہے جیسے عام خیال ہے، مؤطا ''كتاب الحج، باب تخمير المحرم وجهه'' میں فاطمہ بنت منذر کی روایت ہے کہ دورانِ حج سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا خواتین کو چہرے ڈھانپنے کا حکم دیتی تھیں، اسی طرح ابو داود اور ابن ماجہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري: ١٥٢١؛ صحيح مسلم: ١٣٥٠. [2] صحيح البخاري: ٣٦٦؛ صحيح مسلم: ١١٧٧.

نبی کریم ﷺ کے ہمراہ دورانِ حج ہم خواتین اپنے چہرے ننگے رکھتیں، لیکن مردوں کی آمد ورفت کے وقت انہیں فوراً چادروں کی اوٹ میں کرلیتیں) اس کے علاوہ دیگر ہر طرح اور ہر رنگ کے کپڑے پہن سکتی ہے، ریشمی بھی اور زیورات، شلوار، قمیص اور موزے بھی پہن سکتی ہے، اسے ابوداود، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا اور اس کے راوی صحیح کے رواۃ میں سے ہیں، بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے احرام کی حالت میں عصفر کے ساتھ رنگے ہوئے کپڑے پہنے اور انہوں نے کہا: محرم خاتون نہ چہرے پر کپڑا باندھے اور نہ وہ نقاب کرے اور ورس و زعفران سے رنگا ہوا کپڑا نہ پہنے، سیاہ اور سرخ زردی مائل کپڑے اور موزوں کے استعمال میں عورتوں کے لیے حرج نہیں سمجھا، بخاری اور احمد کے ہاں ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''محرم عورت نقاب اور دستانے استعمال نہ کرے۔''[1] اس میں دلیل ہے کہ عورت کا احرام اس کے چہرے اور ہاتھوں میں ہے، علماء کے بقول حرج نہیں کہ اپنے چہرے کو کسی چیز (مثلاً: چادر اور رومال) کے ساتھ مستور کرے (بقول محشی اس ضمن میں یہ شرط لگانا کہ یہ چادر وغیرہ اس کے چہرے سے مس نہ ہو، ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ افادہ دیا، اسی طرح یہ حدیث بھی ضعیف ہے کہ مرد کا احرام اس کے سر میں اور عورت کا اس کے چہرے میں ہے یعنی دونوں کو ننگا رکھنا ہے)۔

کسی چھتری وغیرہ کے ساتھ مردوں سے چہرے کا مستور رکھنا بھی جائز ہے، اگر نظر پڑنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو، تب چہرے کا مستور کرنا واجب ہے (یہ مؤلف کی ذاتی رائے ہے، چہرے کا مردوں کی نگاہوں سے مستور رکھنا، مطلقاً ہی واجب ہے اس سلسلہ میں موطا میں دو روایات موجود ہیں) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ احرام میں تھیں کہ سوار ہمارے قریب سے گزرتے تو ہم اپنی چادروں کو چہروں پر جھکا لیتیں جب وہ آگے چلے جاتے تو ہم چہرے ننگے کر دیتیں۔[2] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سدلِ ثوب (یعنی کپڑا لٹکا لینا، ساتھ نہ لگنے دینا) کے قائلین میں عطاء، امام مالک، امام ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ ہیں۔

جو آدمی تہہ بند، بالائی دھڑ کی چادر اور جوتے نہ پائے

اس صورت میں جو پاس ہے وہی پہن لے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: ''اگر کسی محرم کے پاس تہہ بند نہیں تو وہ شلوار پہن لے اور اگر جوتے نہیں تو وہ موزے پہن لے۔''[3] اسے احمد، بخاری اور مسلم نے نقل کیا، احمد کی عمرو بن دینار رحمہ اللہ سے روایت میں ہے کہ ابوشعثاء نے انہیں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خبر دی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اثنائے خطبہ سنا: ''جو تہہ بند نہیں پاتا لیکن شلوار ہے تو وہ اسے پہن لے اور جو جوتے نہیں پاتا تو وہ موزے پہن لے۔'' کہتے ہیں: میں نے کہا: کیا یہ نہیں کہا کہ انہیں (اوپر سے) کاٹ لے؟ کہا: نہیں! یہی امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے تو محرم کے لیے موزے (بغیر کاٹے) اور شلوار پہننا جائز قرار دیا، اس صورت میں کہ وہ جوتے اور تہہ بند

---

[1] صحيح البخاري: ١٨٣٨؛ مسند أحمد: ٢/ ١٩٩. [2] ضعيف، سنن أبي داود: ١٨٣٣؛ سنن ابن ماجه: ٢٩٣٥. [3] صحيح البخاري: ٥٨٠٤؛ صحيح مسلم: ١١٧٨.

نہیں پاتا، یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہ اس پر کوئی فدیہ عائد نہ ہوگا، جمہور علماء کی رائے ہے کہ جو جوتے نہ ہونے کی وجہ سے موزے پہنے، وہ انہیں اوپر سے ٹخنے تک کاٹ لے، تب یہ جوتوں کی مثل ہی ہو جائیں گے اور یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سابق الذکر حدیث کے مدِنظر ہے، احناف کی رائے میں جو تہہ بند نہیں پاتا وہ شلوار کو ادھیڑ کر (اسے چادر کی شکل میں کر کے) پہنے، وگرنہ اسی حال میں پہننے پر فدیہ عائد ہوگا، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کہتے ہیں: اس کی ضرورت نہیں، وہ اسی حال میں پہن لے اور اس پر کوئی فدیہ نہیں، کیونکہ جابر بن زید نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو تہہ بند نہیں پاتا وہ شلوار پہن لے (یعنی یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ اسے ادھیڑ کر تہہ بند جیسا بنا لے) اور جو جوتے نہیں پاتا وہ موزے پہن لے اور انہیں ٹخنوں تک کاٹ لے۔''[1] اسے نسائی نے بسندِ صحیح نقل کیا، اگر شلوار پہن لی تو پھر تہہ بند میسر ہو گیا تو لازم ہے کہ فوراً شلوار اتار دے اور تہہ بند باندھ لے۔

⑤ اپنا یا (بطورِ ولی یا وکیل) کسی کا عقدِ نکاح کرنا

یہ عقد باطل ہوگا اور اس کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہوگی، کیونکہ مسلم وغیرہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''محرم نہ اپنا نکاح کرے اور نہ کسی کا کرائے اور نہ ہی شادی کا پیغام بھیجے۔''[2] اسے ترمذی نے بھی نقل کیا، مگر ان کے ہاں شادی کا پیغام نہ بھیجنے کا ذکر نہیں، انہوں نے اسے حسن صحیح قرار دیا اور لکھا کہ بعض صحابہ کے نزدیک اسی پر عمل ہے اور یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحق رحمہم اللہ نے بھی کہا: ان کے نزدیک اگر حالتِ احرام میں نکاح کیا تو وہ باطل ہے اور جو وارد ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور آپ محرم تھے تو یہ مسلم کی نقل کردہ اس روایت کے معارض ہے کہ (احرام نہیں بلکہ) احلال کی حالت میں ان سے آپ نے شادی کی تھی۔[3] امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے بارے میں اختلاف ہوا کیونکہ آپ کی ان کے ساتھ شادی مکہ کے راستہ میں ہوئی تھی تو بعض نے کہا: آپ اس وقت حلال تھے اور ان سے شادی کا معاملہ جب عام ہوا تب آپ حالتِ احرام میں تھے، پھر جب ان کی رخصتی کر کے مکہ کے راستہ میں سرف کے مقام پر لائے تب بھی آپ حلال تھے، احناف محرم کے لیے عقدِ نکاح کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ حالتِ احرام صرف جماع کرنے سے مانع ہے، فقط عقدِ نکاح اس کے منافی نہیں۔

⑥، ⑦ ناخن کاٹنا اور کسی بھی طریقے سے بالوں کا بذریعہ حلق یا قص ازالہ کرنا

چاہے یہ سر کے بال ہوں یا جسم کے کسی اور حصے کے، کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ (البقرۃ:۱۹۶)

''قربانی ہونے تک سر نہ منڈواؤ۔''

---

[1] صحيح البخاري: ٥٨٠٤؛ صحيح مسلم: ١٧٨. [2] سنن ترمذي: ٨٤٠. [3] صحيح مسلم: ١٤١٠؛ صحيح البخاري: ٤٢٥٨.

علماء کا محرم کے لیے ناخن کاٹنے کی بلا عذر حرمت پر اجماع ہے، اگر کسی انگلی کا ناخن ٹوٹ گیا ہے، تب اس کا ازالہ کر دینا جائز ہے اور اس پر کوئی فدیہ عائد نہ ہوگا، ان بالوں کا ازالہ کر دینا بھی جائز ہے جن کے ساتھ محرم متاذی ہوتا ہو اور اس میں فدیہ ہے البتہ آنکھ میں پڑا بال نکال دینے میں فدیہ عائد نہیں ہوگا، اگر محرم اس کی وجہ سے تکلیف میں ہے (بقول محشی مالکیہ کے ہاں اس میں بھی فدیہ ہے) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾(البقرۃ:۱۹۶)

''جو تم میں مریض ہوا یا سر میں اذی (یعنی جوں وغیرہ کی) وجہ سے سر منڈوا لیا تو وہ اب اس کا فدیہ دے، روزے رکھے، صدقہ کرے یا جانور کی قربانی دے۔'' اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

⑧ کپڑے یا بدن میں خوشبو لگا لینا

یہ مرد و عورت دونوں کے لیے (منع ہے) چنانچہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے خوشبو محسوس کی جبکہ وہ محرم تھے تو حکم دیا کہ جاؤ اور اسے دھو ڈالو کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْحَاجُّ الشَّعِثُ التَّفِلِ)) ''حاجی پراگندہ اور بے تیل بالوں والا ہو۔''[1] اسے بزار نے بسند صحیح نقل کیا، ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمایا: ''اپنے ساتھ لگی خوشبو کو دھو ڈالو۔''[2] محرم اگر فوت ہو تو بھی اس کے غسل کے پانی اور اس کے کفن میں خوشبو استعمال نہ کی جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محرم کے انتقال پر فرمایا تھا: ''اس کے سر کو نہ ڈھانپو اور نہ اسے خوشبو لگاؤ کیونکہ یہ روزِ قیامت تلبیہ پڑھتا ہوا اٹھایا جائے گا۔''[3] احرام باندھنے سے قبل لگی خوشبو چاہے اس کے بدن میں ہو یا کپڑے میں تو حرج نہیں، ایسی چیزوں کے سونگھ لینے میں حرج نہیں جنہیں برائے خوشبو استعمال نہیں کیا جاتا، مثلاً: سیب (آم) اور سفر جل (یعنی بہی، یہ ناشپاتی کی مانند ایک پھل ہے) کیونکہ اس قسم کے پھل اور نباتات نہ برائے خوشبو ہیں اور نہ ان سے خوشبو اخذ کی جاتی ہے، جہاں تک کعبہ کو لگی خوشبوؤں سے کچھ محرم کو لگ جانا ہے تو سعید بن منصور نے صالح بن کیسان سے نقل کیا کہ میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حالتِ احرام میں ان کے کپڑے کو کعبہ سے خوشبو لگ گئی مگر اسے نہ دھویا، امام عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اسے نہ دھوئے اور اس پر کچھ عائد نہیں، شوافع کے نزدیک جس نے تعمداً ایسا کیا یا اسے (بغیر تعمد کے) لگی مگر دھونا ممکن ہے مگر اس نے مبادرت نہ کی تو اس نے اِساءت کی اور اس کے ذمہ فدیہ ہے۔

⑨ اس کپڑے کا پہننا جو خوشبو دار چیز سے رنگا ہوا ہو

علماء کا ایسے کپڑے پہننے کی حرمت پر اتفاق ہے، ہاں اگر دھو لیا جائے اور دھونے کے بعد کوئی خوشبو نہ آئے تب جائز ہے،

---

① حسن، مسند أحمد: ٦/ ٣٢٥، مسند البزار: ١٠٩٩. ② صحيح، مسند أحمد: ٤/ ٢٢، سنن نسائی: ٥/ ١٣١.
③ صحيح البخاري: ١٢٦٧؛ صحيح مسلم: ١٢٠٦.

نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایسا کپڑا مت پہنو جسے ورس یا زعفران لگا ہو، اِلّا یہ کہ اسے (یعنی احرام کو) دھولیا جائے۔''[1] اسے امام ابن عبد البر اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے نقل کیا (دھونے کے بعد بھی) نمایاں حیثیت والوں اور قدوہ افراد کے لیے اس کا پہننا مکروہ ہے، تاکہ عوام (محرم) خوشبودار چادریں پہننے میں اسے وسیلہ نہ بنالیں، امام مالک رحمہ اللہ نے نافع سے روایت کیا کہ انہوں نے اسلم مولیٰ عمر رضی اللہ عنہ کو سنا وہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو بیان کر رہے تھے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ پر رنگا ہوا کپڑا دیکھا اور وہ محرم تھے تو کہا: اے طلحہ! یہ رنگا ہوا کپڑا کیسا ہے؟ وہ بولے: امیر المومنین یہ مدر (یعنی مغرہ نامی بوٹی، جو خوشبو دار نہیں ہوتی) کے ساتھ رنگا ہوا ہے، کہنے لگے: تم صحابہ کی جماعت لوگوں کے لیے قدوہ ہو، اگر کسی جاہل و عامی نے یہ دیکھا تو کہے گا: سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے احرام میں رنگے ہوئے کپڑے پہنے (یعنی وہ یہ تفریق نہ کر پائے گا کہ خوشبودار بوٹی سے رنگا تھا یا غیر خوشبودار سے) لہٰذا آپ حضرات (ہر قسم کے) رنگے کپڑوں سے بچیں۔[2] البتہ پکتے ہوئے کھانے میں یا مشروب میں خوشبو ڈال دینا، اس طرح کہ اس کا رنگ اور خوشبو باقی نہ رہے تو محرم کے اسے تناول کرنے کی صورت میں اس پر کوئی فدیہ عائد نہیں لیکن اگر خوشبو باقی تھی، تب اگر تناول کیا تو شوافع کے نزدیک اس کے ذمہ فدیہ ہے، احناف نے کہا کہ کوئی فدیہ نہیں، کیونکہ اس خوشبو کے ساتھ اس کا قصد ترفُّہ (یعنی زیب و زینت) کا نہ تھا۔

⑩ شکار سے تعرُّض

محرم کے لیے سمندری شکار کرنا اور اس کے لیے متعرض ہونا جائز ہے، اسی طرح اس کی رہنمائی کرنا اور اس کا کھانا بھی لیکن خشکی کا شکار کرنا یا رہنمائی کرنا یا کسی بھی طریقہ سے آگاہی دینا اگر وہ (دیگر کے لیے) غیر مرئی ہے، نیز اس کے لیے اسے گھیرنا بھی حرام ہے اگر وہ مرئی ہے، خشکی کے حیوان کے انڈوں کا اِفساد بھی اس پر حرام ہے، جیسا کہ اس کی خرید و فروخت اور دودھ دوہنا بھی، اس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا﴾

''حالتِ احرام میں تمہارے لیے سمندر کا شکار اور طعام حلال ہے مگر خشکی کا حرام۔'' (المائدۃ:۹۶)

⑪ محرم کا شکار کا گوشت کھانا

محرم کا اس بری شکار کا گوشت کھانا جو اس کے لیے یا اس کی رہنمائی سے یا اس کی اعانت سے شکار کیا گیا جائز ہے، کیونکہ بخاری اور مسلم نے سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ حج پر نکلے، وہ بھی آپ کے ہمراہ تھے ایک گروہ کو اور سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں تھے، آپ نے (از رہِ احتیاط) حکم دیا کہ آپ سب ساحل کے راستہ سے چلو، آگے جا کر ہم سب

---

[1] صحيح، مسند أحمد: ٥٠٠٣؛ شرح معاني الآثار: ١/ ١٣٦؛ شعیب ارناؤط رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا۔ [2] صحيح، الموطأ امام مالك: ١/ ٣٢٦.

جمع ہوں گے، اس گروہ کے سب اصحاب ماسوائے سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے محرم تھے، اثنائے سفر چند زیبرے نظر آئے سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کو شکار کر لیا، سب اترے اور اسے پکایا اور تناول کیا، پھر کہنے لگے: یہ ہم نے کیا کیا؟ حالت احرام میں شکار کا گوشت کھا لیا، کچھ گوشت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی بچا رکھا تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو اسے آپ کی خدمت میں پیش کیا اور واقعہ بتلایا اور اپنا تحفظ بھی، آپ نے پوچھا: ''کیا تم میں سے کسی نے ابوقتادہ کو کہا تھا کہ شکار کرو یا شکار کی طرف رہنمائی کی تھی؟'' کہا: نہیں! تو فرمایا: ''تب کوئی حرج نہیں۔''① اس سے ثابت ہوا کہ محرم کے لیے اس شکار کا گوشت کھانا جائز ہے، جسے نہ اس نے شکار کیا ہو اور نہ (بطورِ خاص) اس کے لیے وہ شکار کیا گیا ہو، اسی طرح اس شکار کو بھی جسے شکار کرنے میں اس کا کوئی تعاون یا مشورہ شامل نہ ہو، مطلب عن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حالتِ احرام میں برّی شکار تمہارے لیے اس صورت جائز ہوگا، جب تم نے خود وہ شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لیے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔''② اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ مفسر ہے اور مطلب کا سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سماع ہمارے ہاں معروف نہیں، بعض اہلِ علم کے ہاں اسی پر عمل ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے بقول یہ اس باب میں مروی احسن واقیس روایت ہے اور یہی امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے، اسی کے مقتضا کا امام مالک رحمہ اللہ اور جمہور نے فتویٰ دیا، اگر غیر محرم نے اپنے لیے شکار کیا کسی محرم کے قصد سے نہیں، پھر اس سے اسے بھی کچھ دے دیا یا اسے فروخت کر دیا تو یہ اس پر حرام نہیں، عبد الرحمن بن عثمان تیمی راوی ہیں کہ ہم سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حالتِ احرام میں تھے کہ کوئی شخص بطورِ تحفہ پرندے کا گوشت لایا وہ تب سوئے ہوئے تھے، ہم میں سے بعض نے اسے تناول کیا اور بعض نے احتراز کیا، جب وہ بیدار ہوئے تو کھانے والوں کی تائید کی اور کہا: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح کا گوشت کھایا ہے۔③ اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، شکار کا گوشت کھانے سے مانع جو روایات وارد ہیں، مثلاً: سیدنا صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ عنہ کی روایت، کہتے ہیں: انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیبرا پیش کیا اور آپ تب ابواء یا ودّان جگہ میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا، پھر ان کی خاطر جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''صرف اس لیے اسے واپس کیا ہے کہ ہم محرم ہیں۔''④ تو یہ اس امر پر محمول ہے کہ جو شکار محرم کے لیے کیا گیا ہو وہ اس کے لیے حرام ہوگا، تاکہ روایات کے مابین تطبیق ہو، بقول ابن عبدالبر رحمہ اللہ: یہ مذہب اختیار کرنے والوں کی حجت یہ ہے کہ اس بارے میں صحیح احادیث موجود ہیں اور اگر مذکورہ جیسی روایات کو اس پر محمول کریں تب کوئی تضاد و تعارض نہ رہے گا، امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اس مذہب کو قوی قرار دیا، اس بارے میں وارد آثارِ صحابہ اسی تفصیل پر دال ہیں۔

اس شخص کا حکم جس نے احرام کے محظورات میں سے کسی محظور کا ارتکاب کیا

جسے کوئی عذر لاحق تھا اور اس نے سوائے جماع کے کسی محظور کا ارتکاب کر لیا مثلاً: سر منڈوانا یا گرمی یا سردی کی شدت سے

① صحيح البخاری: ١٨٢٤؛ صحيح مسلم: ١١٩٦. ② ضعيف، سنن أبی داود: ١٨٥١؛ سنن ترمذی: ٨٤٦.
③ صحيح مسلم: ١١٩٧؛ سنن نسائی: ٥/ ١٨٢. ④ صحيح البخاری: ١٨٢٥؛ صحيح مسلم: ١١٩٣.

بچنے کے لیے سلا ہوا کپڑا پہن لینا وغیرہ تو اسے لازم ہے کہ (تلافی کے بطور) ایک بکری ذبح کرے یا چھ مساکین کو کھانا کھلائے، ہر مسکین کے لیے نصف صاع (تقریباً سوا سیر) ہو یا پھر تین ایام کے روزے رکھے، اسے ان تینوں میں سے کوئی ایک کرنے کا اختیار ہے، سوائے جماع کے کسی بھی محظور کے ارتکاب کی صورت میں حج اور عمرہ باطل نہ ہوگا، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ عن کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیبیہ کے موقع پر ان پر نظر پڑی تو فرمایا: ''کیا تمہیں سر کی جوئیں ایذا دے رہی ہیں؟'' عرض کی: جی ہاں! فرمایا: ''سر منڈوا دو، پھر نسک کے بطور ایک بکری ذبح کر دو۔''[1] اسے بخاری، مسلم اور ابوداود نے نقل کیا، انہی سے ایک اور روایت میں ہے کہ میرے سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں اور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، حدیبیہ کے برس حتی کہ اپنی نظر کی فکر پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ (البقرۃ:۱۹۶) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے طلب فرمایا اور کہا: ''اپنا سر منڈوا دو اور (بطورِ فدیہ) تین دن کے روزے رکھو یا چھ مساکین کو ایک ٹوکرا خشک کھجوریں دے دو یا پھر ایک بکری اللہ کی راہ میں ذبح کر دو'' کہتے ہیں: تو میں نے سر منڈوایا اور روزے رکھے۔''[2] امام شافعی رحمہ اللہ نے وجوبِ فدیہ میں غیر معذور کو معذور پر قیاس کیا ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے غیر معذور پر دم (یعنی فدیہ میں قربانی کرنا) واجب قرار دیا، اگر اس کی استطاعت ہے، دیگر کے وہ قائل نہیں جیسا کہ پیچھے گزرا۔

کچھ بال کٹوا لینا

امام عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر محرم نے تین یا اس سے زائد بال کٹوا لیے تو اس کے ذمہ دم واجب ہے، امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا، شافعی نے ان سے نقل کیا کہ ایک بال نوچنے کی صورت میں وہ ایک مُد صدقہ کرے اور دو بال اکھیڑنے پر دو مد اور تین اور اس لیے زائد بال اکھیڑنے کی صورت میں قربانی واجب ہے۔

حالت احرام میں تیل لگانے کا حکم؟

المسویٰ (شرح مؤطا مؤلفہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ) میں ہے کہ اگر خالص زیتون یا خالص سرکہ کی مالش کی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دم واجب ہوگا چاہے کسی بھی عضو میں ہو، شوافع کے ہاں سر اور داڑھی کو غیر خوشبودار تیل لگانے پر فدیہ دینا واجب ہوگا اور بدن کے کسی اور عضو پر مالش کرنے پر کوئی فدیہ نہیں۔

بھول کر یا لاعلمی کی بنا پر سلے کپڑے پہننے یا خوشبو لگا لینے میں کوئی حرج نہیں

اس میں کوئی حرج نہیں، فدیہ لازم نہ ہوگا، چنانچہ سیدنا یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص جعرانہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے اپنے سر اور داڑھی کو زرد خضاب لگایا ہوا تھا، عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے

---

[1] صحیح البخاری: ۷۸۱٦؛ صحیح مسلم: ۱۲۰۱۔ [2] صحیح، ابوداود: ۱۸۵۸۔

عمرہ کا احرام باندھا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ خضاب لگا ہے، فرمایا: ''اسے دھو ڈالو اور یہ جبہ بھی اتار دو اور جو حج میں کرتے ہیں وہ سب عمرہ میں کرو۔''[1] امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر بھول کر یا حکم سے ناواقفیت کی وجہ سے خوشبو لگا لی یا لباس پہن لیا تب اس پر کوئی کفارہ نہیں، اسے بخاری نے نقل کیا اور یہ برخلاف اس امر کے کہ بھولے سے یا حکم سے لاعلمی کی وجہ سے اگر شکار کر لیا تو واجب ہے کہ ہرجانہ ادا کرے، کیونکہ یہ ہرجانہ مالی ہے اور مالی ہرجانوں میں علم اور لاعلمی اور سہو و تعمد ایک برابر ہیں، انسانوں کے اموال کے ہرجانوں کی مانند۔

جماع کے ساتھ حج کا بطلان

سیدنا علی، عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے ایسے شخص کی بابت فتویٰ دیا کہ جس نے حج کے احرام کی حالت میں جماع کر لیا تو دونوں (میاں بیوی) یہ حج جاری رکھیں، البتہ ان کے ذمہ ہے کہ آمدہ برس بھی آ کر حج ادا کریں اور قربانی دیں، ابو عباس طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر محرم نے پہلے تحلّل سے قبل جماع کیا تو اس کا حج فاسد ہوا چاہے یہ وقوفِ عرفہ سے قبل ہو یا اس کے بعد اور اس پر واجب ہے کہ اس فاسد حج کو بھی مکمل کرے اور اس پر قربانی واجب ہے اور اگلے برس اس حج کی قضا بھی دے اور اس میں بھی قربانی دے، امام عطاء رحمہ اللہ کا یہی قول تھا، امام بغوی رحمہ اللہ شرح السنہ میں لکھتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ کا دو میں سے اشہر قول بھی یہی ہے کہ ایسے آدمی کے لیے ضروری ہوگا کہ جب قضائے حج کو (اگلے برس) آئیں تو میاں بیوی ساتھ نہ رہیں تاکہ دوبارہ اس امر کا خدشہ نہ رہے، اگر اونٹ قربان کرنے کی سکت نہیں تو گائے کی قربانی کرے، اگر اس کی بھی استطاعت نہیں تو بکری کی دے، اگر جانور نہیں ملتا تو اس کی قیمت سے طعام خرید کر صدقہ کر دے اور ہر مسکین کو ایک مد دے، اگر اس کی استطاعت نہیں تب ہر مد کے بدلے ایک روزہ رکھے، اہل رائے نے اس بابت کہا: اگر وقوفِ عرفہ سے قبل جماع کیا تب اس کا حج فاسد ہوا اور اس کے ذمہ بکری ہے یا اونٹ کا ساتواں حصہ اور اگر اس کے بعد کیا تب حج تو فاسد نہ ہوا، البتہ اونٹ قربان کرنا واجب ہوگا، قران کرنے والا اگر اپنا حج فاسد کر لے تو اس پر بھی وہ کچھ واجب ہوگا جو حجِ مفرد پر ہے اور وہ قضا بھی حجِ قران کی صورت میں دے گا اور اس سے حجِ قران کی قربانی ساقط نہ ہوگی، کہتے ہیں: پہلے تحلل کے بعد اگر جماع کیا تو یہ حج فاسد نہ کرے گا اور نہ اکثر اہلِ علم کی نزدیک اس کے ذمہ قضا ہے، ان کے بعض وجوبِ قضا کے قائل ہیں اور یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن اور ابراہیم رحمہ اللہ کا قول ہے، البتہ اس کی وجہ سے فدیہ واجب ہوگا اور یہ فدیہ اونٹ کی قربانی ہو یا بکری کی؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عطاء رحمہ اللہ اونٹ کے وجوب کے قائل تھے، یہی عکرمہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا دو میں سے ایک قول ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ بکری واجب ہے اور یہی امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اگر محرم کو احتلام ہو گیا یا (جماع بارے) سوچنے یا نظر پڑنے سے انزال ہو گیا تو شوافع کے نزدیک اس پر کوئی چیز واجب نہیں، شہوت کے ساتھ لمس کرنے والے یا بوس و کنار کرنے والے کی نسبت کہا کہ اسے بکری قربان کرنا لازم ہے، چاہے انزال ہوا یا نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ

---

[1] صحیح مسلم: ۱۱۸۰؛ سنن نسائی: ۲۷۱۰.

کے نزدیک ایسے پر دم واجب ہوا، امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایک شخص سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا: میں احرام میں تھا کہ میری بیوی بن ٹھن کے میرے پاس آکر بیٹھ گئی تو میں قابو نہ رکھ سکا اور میری شہوت مجھ سے سبقت لے گئی (تو اب کیا ہو؟) کہتے ہیں: یہ سن کر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما خوب ہنسے اور کہا: تم بیوی کے بہت دلدادہ ہو، کوئی حرج نہیں دم (یعنی قربانی) دے دو، تمہارا حج ہو چکا ہے، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا۔

شکار کرنے کا ہرجانہ

قرآن میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَ بَالَ اَمْرِهٖ ﴾(المائدۃ: ۹۵)

''مومنو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ کرو اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو اس کا بدلہ (دے اور وہ یہ ہے کہ) اسی طرح کا چوپایہ جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں، قربانی (کرے اور یہ قربانی) کعبے پہنچائی جائے یا کفارہ (دے اور وہ) مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا چکھے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وجوبِ ہرجانہ میں عامد وناسی کا حکم ایک برابر ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: کتاب اللہ تو عامد پر دال ہے، جبکہ سنت ناسی پر بھی جاری ہوئی، اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن میں عمداً شکار کرنے والے کے ہرجانہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی تاثیم کی کہ: ﴿ لِّيَذُوْقَ وَ بَالَ اَمْرِهٖ ﴾(المائدہ: ۹۵)''تاکہ اپنی غلطی کا مزہ چکھے۔'' اور سنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے احکام سے خطا (اور بھولے) سے شکار کرنے والے کے ذمہ بھی ہرجانہ عائد ہوا ہے، نیز شکار مارنا اتلاف ہے اور اتلاف پر جانہ ہے چاہے وہ عمداً ہو یا نسیاناً ہر، البتہ دونوں کا باہمی فرق یہ ہے کہ عمداً شکار کرنے والا گناہگار ہے جبکہ بھول کر کرنے والا گناہگار نہ ہوگا، المسوی میں ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ﴾(المائدہ: ۹۵) کا (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک) مفہوم یہ ہے کہ شکار کرنے والے کے ذمہ اس کی قیمت کے مماثل کا جانور ہے، جس کا فیصلہ دو پابندِ صوم وصلاۃ شخص کریں گے یا تو وہ حرم کے اندر جانور ذبح کرے یا پھر اس قیمت کا طعام مساکین میں تقسیم کر دے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ شکار مارنے والے پر بدلہ چکانا واجب ہے یا تو یہ بدلہ صورت وشکل میں اسی کی مثل جانور کی قربانی کی شکل میں ہوگا جس کا فیصلہ دو شخص کریں گے اور یہ فدیہ اس کے ہدی (یعنی وہیں مکہ میں قربانی) ہونے کی یا مساکین کو کھانا دینے کی صورت میں ہوگا (یعنی اس جانور کی قیمت سے جتنوں کے لیے ایک دن کا کھانا آ سکے) اور یا اس کے برابر روزے رکھنا (یعنی ایک مسکین کے کھانے کے بدلے میں ایک روزہ)۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر سلف کا اس ضمن میں فیصلہ

امام ابن سیرین رحمہ اللہ راوی ہیں کہ ایک شخص سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: میں نے اور میرے ایک دوست نے اپنے گھوڑے دوڑائے اور ایک ہرن کو شکار کر لیا اور ہم احرام کی حالت میں تھے، اب آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ انہوں نے پاس بیٹھے ایک شخص سے کہا: آؤ ہم دونوں مل کر اس کا فیصلہ کریں! کہتے ہیں: تو دونوں نے بکری کی قربانی کرنے کا فیصلہ دیا، وہ آدمی یہ کہتے ہوئے پلٹا کہ اچھے امیر المومنین ہیں جو (تنہا) ایک ہرن کے شکار کے بارے میں فیصلہ نہ کر پائے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے واپس آنے کو کہا اور پوچھا: کیا تم نے سورۃ المائدۃ نہیں پڑھی؟ کہا: نہیں! کہا: کیا اس شخص کو جانتے ہو جس سے میں نے تعاون لیا؟ کہا: نہیں! کہنے لگے: اگر تم کہتے کہ سورۃ المائدہ پڑھی ہے تو تمہیں ضرور سزا دیتا، پھر کہا: بے شک اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں کہتا ہے:

﴿ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾(المائدہ: ۹۵) ''جس کا فیصلہ تم میں سے دو انصاف والے کریں۔'' میں عمر اور یہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں،[1] سلف نے شتر مرغ کا شکار کرنے کی صورت میں اونٹ قربان کرنے اور زیبرا، نیل گائے، بارسنگھے اور ہرنی میں گائے ذبح کرنے اور وبر (یہ بلی سے چھوٹا ایک جانور جس کی دم اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں) کبوتر، قمری، جنگلی مرغ، دبسی (یہ ایک پرندہ ہے) کا شکار کرنے کی صورت میں بکری کی قربانی دینے کا فتویٰ دیا ہے، اسی طرح بجو شکار کرنے میں مینڈھا، ہرنی شکار کرنے میں جوان بکری، خرگوش شکار کرنے میں عناق (وہ بکری/بکرا جو چار ماہ سے زائد عمر کی ہو) لومڑی شکار کرنے میں جدی (پہلے سال میں بکری) اور یربوع شکار کرنے میں جفرہ قربان کرنے کا (یہ وہ بکری جو چار ماہ کی ہوگئی)۔

بدلہ نہ دینے کی صورت میں

سعید بن منصور نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قولہ تعالیٰ: ﴿ فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ﴾(المائدہ: ۹۵) کی تفسیر میں نقل کیا کہ اگر محرم نے شکار کر لیا تو اس کے ذمہ بدلہ دینا ہے، اگر ہے تو اسے ذبح کر کے اس کا گوشت صدقہ کر دے اور اگر بدلہ کا جانور نہیں تو اس کی قیمت لگائی جائے، پھر اس سے طعام خریدے اور تقسیم کر دے اور اگر ہرنی یا اس جیسا کوئی جانور شکار کیا تو اس کے ذمہ بکری ہے جو مکہ میں ذبح کی جائے اور اگر نہ پائے تو چھ مساکین کو کھانا کھلائے، اگر (اس کی استطاعت) نہ پائے تو تین روزے رکھے، اگر بارہ سنگھے یا اس جیسا شکار کیا تو اس کے ذمہ گائے کی قربانی ہے، اگر نہ پائے تو دس مساکین کو کھانا دے، اگر یہ نہ پائے تو بیس روزے رکھے، اگر نعامہ یا زیبرے کا شکار کیا تو اس کے ذمہ اونٹ کی قربانی ہے، اگر نہ پائے تو تیس مساکین کو کھانا کھلائے، اسے ابن ابو حاتم اور ابن جریر نے نقل کیا۔ مزید یہ بھی کہ ہر ایک کو ایک مد طعام دے۔[2]

---

[1] المؤطا امام مالک: ۱/ ٤١٤، ٤١٥. [2] تفسیر ابن جریر: ۱۱/ ۳۱.

طعام کھلانے اور روزوں کی کیفیت

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: محرم کے شکار کرنے کے ہرجانہ کی بابت سب سے احسن بات میں نے سنی ہے کہ اس کے شکار کی قیمت لگائی جائے، پھر دیکھے کہ اتنی قیمت سے کس قدر کھانا ملے گا تو اتنا کھانا مساکین کو دے، ہر مسکین کو ایک مد دے یا پھر ہر مد کے بدلے ایک روزہ رکھے، اگر دس مد بنتے ہیں تو دس اور اگر بیس مد بنتے ہیں تو بیس روزے رکھے، چاہے وہ ساٹھ مساکین بنیں تو ساٹھ روزے رکھنا ہوں گے۔

اگر کئی آدمیوں نے مل کر شکار کیا تو؟

اگر ایک جماعت نے مل کر عمداً شکار کیا تو پوری اس جماعت کے ذمہ ایک ہی بدلہ ہے (یعنی سب مل کر ایک جانور لیں اور قربان کریں) کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال ہوا کہ اگر ایک جماعت نے مل کر بجو کا شکار کیا جبکہ وہ محرم تھے تو......؟ کہا: وہ سب ایک مینڈھا ذبح کریں، سائل نے کہا کہ ہر شخص مینڈھا ذبح کرے؟ کہا: نہیں! بلکہ سب کی طرف سے ایک ہی۔[1]

حرم میں شکار کرنا اور حدودِ حرم سے درخت کاٹنا

حدودِ حرم کے اندر محرم اور حلال دونوں پر شکار کرنا حرام ہے، اسی طرح اسے بھگانا بھی اور ایسا درخت کاٹنا جسے عموماً لوگ نہیں لگاتے (یعنی جو خود بخود اُگا ہے) اور تر نباتات کا قطع کرنا بھی حتی کہ کانٹا تک بھی نہ کاٹے (اور نہ پھول توڑے) ماسوائے اذخر (گھاس) اور سنا کے (یہ دونوں خوشبو دار نباتات ہیں) بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''بے شک یہ شہر حرمت والا ہے، نہ اس کا کانٹا کاٹا جائے، نہ کوئی تر نباتات قطع کی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے اور نہ گری پڑی چیز کوئی اٹھائے، البتہ اس قصد سے جائز ہے کہ اس کی تشہیر کر کے اس کے مالک کو لوٹا دے۔'' (یا کسی محفوظ جگہ رکھ دے تا کہ اصل مالک تک پہنچ جائے) اس پر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اذخر کی اجازت دیدیں کیونکہ یہ لوگوں کے لیے ضروری ہے، لوہاروں کو بھی اور گھروں میں (جلانے کے لیے) اس کی ضرورت ہے تو آپ نے فرمایا: ''سوائے اذخر کے''[2] امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قرطبی نے کہا: فقہاء نے اس نہی کو اس درخت کے ساتھ خاص کیا ہے جو خودرو ہو یعنی جسے کسی نے نہ لگایا ہو، اگر انسان نے لگایا ہے تو اس بارے میں اختلافِ آراء ہیں، جمہور کے ہاں اسے کاٹنا جائز ہے، جبکہ شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اسے کاٹنے پر بھی ہرجانہ دینا پڑے گا، ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ان کے قول کو راجح کہا، اول نوع سے کاٹ لینے کی صورت میں کیا بدلہ ہو؟ اس بارے میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: اس میں کوئی ہرجانہ اس کے ذمہ نہیں البتہ وہ آثم ہوا، عطاء کے بقول استغفار کرے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اس کی قیمت لگا کر

---

[1] سنن دارقطني: ۲/ ۲۵۰. [2] صحيح البخاري: ۱۸۳٤.

جانور خریدے اور اس کی قربانی دے، امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: اگر درخت بڑا ہے تو گائے قربان کرے وگرنہ بکری۔

علماء نے گری پڑی ٹہنیوں اور شاخوں نیز خود سے گر جانے والے درختوں اور پتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا ہے، امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: حرم میں لوگوں کی لگائی ہوئی سبزیوں، کھیتوں اور ککڑی کے اخذ کی اباحت پر اجماع ہے اور یہ کہ اس کی کاشت، نگہداشت اور کٹائی میں حرج نہیں، الروضۃ الندیہ میں ہے کہ حلال انسان کے حرمِ مکی کی حدود کے اندر سے شکار کرنے اور درخت وغیرہ کاٹ لینے کی صورت میں صرف گناہ لازم آئے گا، مگر کوئی زرِ تلافی یا ہرجانہ عائد نہیں لیکن جو محرم ہے تو اس کے ذمہ فدیہ ہے، جس کا ذکر قرآن میں ہوا، مکہ کے درخت کے ضمن میں محرم پر بھی کچھ عائد نہیں، قابلِ حجت دلیل کے عدم ورود کی وجہ سے، آپ سے جو مروی ہے کہ بڑا اور گھنا درخت کاٹنے پر گائے قربان کرنا ہوگی۔ صحیح نہیں اسی طرح بعض سلف سے جو اس ضمن میں منقول ہے اس میں حجت نہیں، مزید لکھا: حاصل یہ ہے کہ شکار مارنے اور شجر کاٹنے سے نہی کے اور وجوبِ جزا یا قیمت کے مابین کوئی تلازم نہیں، بلکہ نہی اپنی حقیقت کے ساتھ تحریم کا افادہ دیتی ہے اور جزا اور قیمت کسی دلیل کے ساتھ ہی واجب ہوں گے اور یہاں کوئی دلیل وارد نہیں صرف اتنا ہی ارشاد ہوا: ﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (المائدہ: ۹۵) اور اس میں فقط جزا کا ذکر ہے، لہٰذا اس سے دیگر کچھ واجب نہیں۔

حرمِ مکی کی حدود

مکہ کے گرد پانچ جہات میں اس غرض سے راستے کے دونوں جانب ایک میٹر بلند چٹانوں کی نشانیاں نصب کی گئی ہیں تو شمال کی جانب سے اس کی حد تنعیم ہے اس کے اور مکہ کے مابین چھ کلومیٹر کی مسافت ہے، جنوب میں اس کی حد اَضاہ ہے جو مکہ سے سولہ کلومیٹر کی مسافت پر ہے، جبکہ شمال مشرق میں اس کی حد نخلہ ہے جس کے اور مکہ کے درمیان چودہ کلومیٹر اور مغرب میں اس کی حد شمیسی کا مقام ہے (یہ جسے عہدِ نبوی میں حدیبیہ کہا جاتا تھا جہاں بیعتِ رضوان واقع ہوئی) اور یہ مکہ سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، محب طبری زہری عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے ناقل ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام کی رہنمائی سے حرم کی علامات نصب کی تھیں جو قصی کے زمانہ تک قائم رہیں، انہوں نے تجدید کی، پھر عہد نبوی تک انہیں چھیڑا نہیں گیا، آپ نے فتح مکہ کے سال سیدنا تمیم بن اسد خزاعی رضی اللہ عنہ کو ان کی تجدید پر مقرر کیا، تا آنکہ عہدِ فاروقی میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قریش کے چار افراد کو ان کی تعمیرِ نو کی ذمہ داری سونپی اور وہ یہ تھے: مخرمہ بن نوفل، سعید بن یربوع، حویطب بن عبد العزیٰ اور ازہر بن عبد عوف، اس کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور پھر عبد الملک (بن مروان) کے ادوار میں تجدید کی گئی۔

حرمِ مدنی

جس طرح مکی حرم میں شکار کرنے اور درخت کاٹنے کی حرمت ہے اسی طرح مدنی حرم کی نسبت بھی یہی حکم ہے۔ چنانچہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور میں لابتین

کے مابین واقع مدینہ کو بھی حرم قرار دیتا ہوں، نہ اس کا درخت کاٹا جائے اور نہ اس کے اندر شکار کیا جائے۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا، احمد اور ابو داود نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے بارے میں فرمایا: ''نہ اس کا درخت کاٹا جائے اور نہ اس کا شکار مارا جائے اور نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے مگر اس کے لیے جو اس کی تشہیر کا قصد کرے، البتہ کوئی اپنے اونٹ کے چارہ کے لیے (پتے اور شاخیں وغیرہ) لے سکتا ہے۔''[2] ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ مدینہ عَیر تا ثور حرم ہے۔[3] انہی کی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے دونوں میدانوں کے مابین کو حرم قرار دیا اور مدینہ کے چہار اطراف بارہ میل تک چراہ گاہ قرار دیں، لابتین لابۃ کی تثنیہ ہے اور یہ حرَّہ ہے جو سیاہ پتھر ہے، مدینہ لابتین (یعنی دو پتھریلے میدانوں) کے مابین واقع ہے، ایک شرقی اور دوسرا غربی اس حرم کی مقدار بارہ میل ہے جو عَیر تا ثور ہے، عَیر میقات کے پاس ایک پہاڑ ہے، جبکہ ثور شمالی جہت میں احد کے نزدیک ایک پہاڑ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ کو رخصت دی تھی کہ ہل بنانے اور سواری وغیرہ میں استعمال ہونے والی اشیا تیار کرنے کی غرض سے مدینہ کے درخت کاٹ سکتے ہیں اور دیگر ضروری امور جن کے بغیر چارہ نہیں جیسے چارہ کے لیے گھاس بھی، احمد نے سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مدینہ کے دونوں میدانوں کے درمیان کی جگہ حرم ہے اور اس کی چراہ گاہ بھی، اس کے درخت نہ کاٹے جائیں البتہ چارہ لینے کی اجازت ہے۔''[4] یہ برخلاف ہے اہلِ مکہ کے بارے حکم کے کیونکہ اہل مکہ اپنی ضرورت پوری کرنے میں ان سے مستغنی تھے، جبکہ اہلِ مدینہ کا معاملہ یہ نہ تھا، حرمِ مدینہ کے اندر شکار کرنے اور درخت کاٹنے کی صورت میں کوئی ہرجانہ نہیں، بس ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا، بخاری نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مدینہ یہاں سے وہاں تک حرم ہے۔ نہ اس کا درخت کاٹا جائے اور نہ اس میں کوئی خرابی کی جائے جس نے کوئی فساد برپا کیا اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور سب کی لعنت ہو۔''[5]

جس نے درخت سے گری کوئی چیز (پتے اور شاخ) پائی تو اس کا اخذ جائز ہے، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ سوار ہو کر عقیق میں اپنے محل جا رہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ ایک غلام درخت کاٹ یا جھاڑ رہا ہے تو اس کے پاس موجود سامان چھین لیا، جب واپس آئے تو اس کے گھر والے آئے اور عرض کی: اس کا سامان واپس کر دیں تو انکار کیا اور کہا: معاذ اللہ! وہ واپس کروں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور انعام مجھے لینا حلال قرار دیا۔[6] اسے مسلم، ابو داود اور حاکم نے نقل کیا اور صحیح کہا اور روایت ذکر کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے پاؤ تو تمہارے لیے اس کا سامان چھین لینا جائز ہے۔''[7]

---

[1] صحيح مسلم: ١٣٦٢. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٢٠٣٥. [3] صحيح البخاري: ٦٩٥٥؛ صحيح مسلم: ١٣٧٠. [4] صحيح، مسند أحمد: ٣/ ٣٣٦. [5] صحيح البخاري: ٨٦٤. [6] صحيح مسلم: ١٣٦٤. [7] صحيح، سنن أبي داود: ٢٠٣٨؛ مسند أحمد: ١/ ١٦٨.

کیا کوئی تیسرا حرم بھی ہے

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: دنیا میں ان حرمین شریفین کے سوا کوئی اور تیسرا حرم نہیں، نہ بیت المقدس اور نہ اس کا غیر اوران دو کے سوا کسی اور کو حرم کا نام نہ دیا جائے، جیسے بعض لوگ حرم المقدس یا حرم الخلیل کہہ دیتے ہیں، بالا تفاق یہ دونوں یا کوئی اور حرم نہیں ہے، مکہ کے حرم ہونے پر اجماع ہے، جبکہ مدینہ جمہور کے نزدیک حرم ہے، جیسا کہ اس بابت روایات کثیر ہیں، بعض علماء تیسرا حرم وجاء کو کہتے ہیں جو طائف کی ایک وادی ہے (بقول محشی امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے بھی حرم کہا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کی رائے کو راجح کہا لیکن جمہور کے نزدیک یہ حرم نہیں)۔

مکہ کا مدینہ سے افضل ہونا

جمہور علماء قائل ہیں کہ مکہ مدینہ سے افضل ہے، کیونکہ احمد، ابن ماجہ جبکہ ترمذی نے صحیح کہا اور سیدنا عبداللہ بن عدی بن حمراء رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا (مکہ سے مخاطب ہوکر) آپ فرماتے تھے: ''اللہ کی قسم! تم اللہ کی زمین میں سب سے بہتر اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہو، اگر مجھے یہاں سے نکالا نہ جاتا تو میں کبھی نہ جاتا۔''[1]

ترمذی نے صحیح قرار دیا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے فرمایا: ''تو کتنا پاکیزہ اور مجھے پیارا ہے، اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں ہرگز تیرے سوا کہیں اور نہ بستا۔''[2]

مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہونا

یہ جائز ہے اس شخص کے لیے جو حج یا عمرہ کے ارادہ سے نہیں جا رہا، چاہے یہ جانا مسلسل ہو جیسے لکڑ ہارے، ماشکی، شکاری اور مزدور جاتے ہیں یا مسلسل نہ ہو، جیسے (باہر کا کوئی) تاجر یا کسی کا ملاقاتی وغیرہ، چاہے آنے والا آمن ہو یا خائف، یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا دو میں سے اصح قول ہے، ان کے اصحاب کا فتویٰ اسی پر ہے، مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہوئے اور آپ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔[3] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ وہ کچھ راستہ سے مڑ آئے اور بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہوئے، بقول امام زہری رحمہ اللہ کوئی حرج نہیں کہ بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق الذکر مواقیت سے ان حضرات کا بغیر احرام کے آگے جانا منع قرار دیا تھا جو حج یا عمرہ کی غرض سے آرہے ہوں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے کبھی حکم نہیں دیا کہ مکہ میں بغیر احرام کے داخل نہ ہوا جائے، لہٰذا ایسی قدغن لگانا ایسے امر کا لزوم ہے شرع نے جسے لازم نہیں کیا۔

---

① صحیح، سنن ترمذی: ۳۹۲۵؛ سنن ابن ماجہ: ۳۱۰۸. ② صحیح، سنن ترمذی: ۳۹۲۶. ③ صحیح مسلم: ۱۳۵۸.

مکہ اور بیت اللہ میں دخول کے لیے مستحبات

یہ درج ذیل امور ہیں:

① غسل کرنا، چنانچہ منقول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ میں داخل ہونا چاہتے تو غسل کرتے تھے۔

② زاہر کی جہت ذی طویٰ میں رات گزارنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں رات گزاری تھی، بقول نافع سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی یہی کرتے تھے، [1] اسے شیخین نے نقل کیا۔

③ بالائی گھاٹی کی طرف سے داخل ہونا، یہ کداء نامی گھاٹی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف سے داخل ہوئے تھے تو جس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہو وہ کرلے اور جو نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

④ اپنی رہائش گاہ یا کسی بھروسہ کی جگہ سامان رکھتے ہی کعبہ جانے میں مبادرت کرے اور باب بنی شیبہ یعنی باب السلام سے داخل ہو اور نہایت خشوع وخضوع سے یہ پڑھے:

”أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَسَلِّمْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ“

”میں شیطان کی برائیوں سے اللہ عظیم اور اس کے چہرے کریم اور سلطنت قدیم کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں، میں اللہ کے نام سے داخل ہوتا ہوں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم درود وسلام بھیجتا ہوں، اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔“ [2]

⑤ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرے: اے اللہ! اس گھر کے شرف، عزت، تکریم اور جلال میں اضافہ فرما اور حج وعمرہ کرنے والوں کے شرف وعزت اور نیکی میں بھی۔ [3] یہ دعا بھی کرے:

اے اللہ! تو سلام ہے اور تیری طرف سے سلامتی ہے، اے ہمارے رب ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھنا۔ [4]

⑥ حجرِ اسود کو بغیر آواز کے بوسہ دے اگر یہ (ازدحام کی وجہ سے) ممکن نہ ہو تو ہاتھ مس کرے اور اسے چوم لے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کی طرف اشارہ کرے۔

⑦ پھر اس کی سیدھ میں کھڑے ہو کر طواف کرنا شروع کرے۔

⑧ تحیۃ المسجد سے آغاز نہ کرے، کیونکہ بیت اللہ کا تحیہ طواف ہے، اِلّا یہ کہ جب داخل ہو تو کوئی فرض جماعت کھڑی ہو، تب پہلے وہ ادا کرے، اسی طرح اگر کسی نماز کا وقت جا رہا ہو تب پہلے وہ ادا کرے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”جب اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوگی۔“ [5]

---

[1] صحيح البخاري: ١٥٧٤؛ صحيح مسلم: ١٢٥٩. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٤٦٦؛ صحيح، سنن ابن ماجه: ٧٧١. [3] مسند الشافعي: ١/ ٣٣٩. [4] السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ٧٣. [5] مسلم: ٧١٠؛ ابوداود: ١٢٦٦.

طواف

طواف کی فضیلت

امام بیہقی رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر روز بیت الحرام میں حجاج کرام پر ایک سو بیس ۱۲۰ رحمتیں نازل کرتا ہے، ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے، چالیس نمازیوں کے لیے اور بیس (کعبہ کی طرف) دیکھنے والوں کے لیے۔''①

طواف کی کیفیت

① طواف کا آغاز حجرِ اسود کو بوسہ دینے یا چھونے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کرے: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكبَرُ، اَللّٰهُمَّ إِيْمَاناً بِكَ وَتَصْدِيْقاً بِكِتَابِكَ وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ وَاتِّبَاعاً لِسُنَّةِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم'' اللہ کا نام لے کر کیونکہ اللہ سب سے بڑا ہے، اے اللہ! تجھ پہ ایمان رکھتے ہوئے اور تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے اور تیرے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے اور تیرے نبی کی اتباع کرتے ہوئے۔''②

② طواف کرتے وقت کعبہ اس کی بائیں جانب ہوگا، طواف میں مستحب ہے کہ پہلے تین چکروں میں ذرا تیز چلے، البتہ قدم چھوٹے چھوٹے رکھے اور کوشش کرے کہ کعبہ کے قریب قریب رہے، باقی چار چکروں میں عام انداز سے چلے، اگر ابتدائی تین میں تیز چلنا یا (بوجہ ہجوم) کعبہ کے قریب ہو کر طواف کرنا ناممکن ہو تو جیسے بھی ممکن و میسر ہو کرے، رکنِ یمانی (یعنی جو حجرِ اسود کی جہت اس سے پہلے کعبہ کا دوسرا کونہ ہے) کو چھونا بھی مستحب ہے اور ہر چکر میں حجر اسود کو بوسہ دینا یا چھونا بھی مستحب ہے۔

③ طواف کے دوران میں ذکر اور دعائیں کرتا رہے، مگر اس ضمن میں کوئی خاص دعا یا ذکر مروی نہیں، شارع علیہ السلام کی طرف سے کسی خاص ذکر و دعا کی تلقین نہیں اور لوگوں میں جو پہلے چکر، پھر دوسرے اور اسی طرح سب چکروں کی دعا و ذکر رائج ہے اس کی کوئی اصل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کچھ بھی ثابت نہیں، طواف کرنے والا اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کی جو دعا چاہے کرے۔ اس ضمن کی بعض دعائیں (اور اذکار) حسبِ ذیل ہیں:

(الف) حجر اسود کے سامنے ہو کر یہ کلمات کہے: ''اَللّٰهُمَّ إِيْمَاناً بِكَ وَتَصْدِيْقاً بِكِتَابِكَ وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ وَاتِّبَاعاً لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكبَرُ ''③

(ب) طواف شروع کر کے کہے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ''④ اسے ابن ماجہ نے نقل کیا۔

---

① ضعيف، المعجم الاوسط للطبراني: ٦٣١٤. ② موقوف ضعيف، سلسلة الضعيفة: ١٠٤٩؛ التلخيص الحبير: ٢٤٧/٢. ③ موقوف ضعيف، سلسلة الضعيفة: ١٠٤٩. ④ ضعيف، سنن ابن ماجه: ٢٩٥٧.

(ج) جب رکن یمانی تک پہنچے تو کہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾[1] اسے ابوداود اور امام شافعی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا۔

④ امام شافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ جب بھی کوئی حجر اسود سے گزرے تو اللہ اکبر کہے اور پہلے تین چکروں میں کہے: اے اللہ! میرے حج کو مبرور بنا، میرے گناہ معاف فرما اور میری سعی کو مشکور بنا، باقی ہر چکر میں یہ دعا کرے: "رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاعْفُ عَمَّا تَعْلَمُ وَأَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ، اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ رکن یمانی اور حجر اسود کے رکن کے درمیان میں یہ دعا کیا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ بِخَيْرٍ" اے اللہ! مجھے اپنے عطا کردہ پہ قانع بنا، اس میں برکت دے اور مجھ سے چھن جانے والی چیز کا اچھا بدل عنائت فرما۔[3] اسے سعید بن منصور اور حاکم نے نقل کیا۔

دورانِ طواف تلاوت کرنا

اس میں حرج نہیں کیونکہ طواف اللہ کے ذکر کی خاطر ہی مشروع ہے اور قرآن بھی ذکر ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "بیت اللہ کا طواف اور صفا ومروہ کے مابین سعی اور جمرات کی رمی اللہ کے ذکر کی اقامت کے لیے ہے۔"[4] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور یہ حسن صحیح ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہر روز بیت اللہ کے حجاج پر ایک سوبیس رحمتیں نازل کرتا ہے، ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے، چالیس (وہاں) نماز پڑھنے والوں اور بیس کعبہ پر نظریں جمائے رکھنے والوں کے لیے ہیں۔"

⑤ طواف سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعتیں پڑھے اور یہ آیت پڑھے:

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (البقرة:۱۲۵)

"مقامِ ابراہیم میں نماز پڑھا کرو۔"

اس کے ساتھ ہی طواف ختم ہوا، پھر اگر طواف کرنے والا حج افراد کر رہا ہے تو یہ پہلا طواف طوافِ قدوم، طوافِ تحیہ (جیسے تحیۃ المسجد ہے) اور طوافِ دخول کہلاتا ہے اور یہ رکن یا واجب نہیں اور اگر وہ حجِ قران یا حجِ تمتع والا ہے تو یہ طواف عمرہ کا طواف شمار ہوگا اور یہ طوافِ تحیہ وقدوم سے مجزئ ہوا (یعنی اس کی اب ضرورت نہیں) یہ اب صفا ومروہ کے درمیان سعی کر کے اپنا عمرہ مکمل کر لے۔

---

① حسن، سنن أبي داود: ۱۸۹۲. ② كتاب الدعاء للطبراني: ۸۷۰؛ المصنف لابن ابی شيبة: ٤/ ٦٨، ٨٩.
③ المستدرك للحاكم: ۱/ ۵۰۹. ④ ضعيف، سنن أبي داود: ۱۸۸۸؛ سنن ترمذي: ۹۰۲.

طواف کی اقسام

① طوافِ قدوم ② طوافِ افاضہ

③ طوافِ وداع ④ طوافِ تطوع (یعنی وہ طواف جو حج یا عمرہ کا حصہ نہیں)

اول تینوں کے بارے میں آگے بات ہوگی، لوگوں کو چاہیے کہ مکہ میں اپنی آمد کو غنیمت سمجھیں اور زیادہ سے زیادہ طواف کریں اور مسجد حرام میں نماز باجماعت ادا کریں، کیونکہ یہاں کی ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے، نفلی طواف میں رمل (یعنی پہلے تین چکروں میں تیز چلنا) اور اضطباع (یعنی دایاں کندھا ننگا کرنا) نہیں، سنت یہ ہے کہ جب بھی حرم میں آئے تو سب سے قبل طواف کرے بخلاف دیگر مساجد کے کہ وہاں آغاز دو رکعت ادا کرنے سے ہوگا۔

طواف کی شروط

① اصغر اور اکبر حدث اور نجاست سے پاک ہونا (یعنی جنبی نہ ہو، باوضو ہو اور جسم اور احرام پر نجاست نہ لگی ہو) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طواف نماز ہے، البتہ (فرق یہ ہے کہ) اللہ نے اس میں کلام کر لینا حلال کیا ہے تو کوئی اگر بولے تو خیر کی بات ہی کرے۔''[1] اسے ترمذی اور دارقطنی نے تخریج کیا اور حاکم، ابن خزیمہ اور ابن سکن نے حکمِ صحت لگایا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور وہ رو رہی تھیں، پوچھا: ''کیا حیض آ گیا ہے؟'' عرض کی: جی ہاں! فرمایا: ''یہ ایسی چیز ہے جسے اللہ نے بناتِ آدم پر لکھ رکھا ہے تو سوائے طواف کے باقی مناسک حج ادا کرتی رہو اور طواف غسلِ طہارت کے بعد کر لینا۔''[2] اسے مسلم نے نقل کیا، انہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں آئے تو سب سے قبل وضو کر کے طواف کیا، اسے شیخین نے تخریج کیا، جسے کوئی ایسی نجاست لاحق ہو جس کا ازالہ ممکن نہیں، مثلاً: سلسل البول کی بیماری ہو یا عورت کو استحاضہ کی مرض ہو، جس میں خون رستا رہتا ہے تو یہ طواف کریں گے اور بالاتفاق ان پر کوئی چیز عائد نہیں، امام مالک رحمہ اللہ نے روایت نقل کی کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک خاتون نے مسئلہ پوچھا کہ میں طواف کرنے آئی ابھی دروازے پر تھی کہ خون بہہ پڑا، میں واپس ہوئی حتی کہ یہ کیفیت ختم ہوئی، پھر آئی اور دوبارہ بابِ مسجد کے پاس خون بہہ پڑا، میں پھر واپس ہوئی حتی کہ یہ کیفیت ختم ہوگئی، سہ بار آئی اور پھر وہی ہوا کہ خون آ گیا تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ شیطان کی طرف سے رگ کا بہہ پڑنا ہے، تم غسل کرو، پھر کپڑے جھاڑو، پھر آ کر طواف کر لو۔

② عورۃ (یعنی جسم کا جو حصہ شرعاً ڈھانپنا فرض ہے) کی پردہ پوشی ہو (بقول محشی یہ احناف کے ہاں واجب ہے، اگر ننگے طواف کیا تو طواف تو ہو گیا مگر اعادہ واجب ہے، اِلّا یہ کہ مکہ سے نکل چکا ہو اور اس پر دم واجب ہوگا) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ٩٦٠؛ المستدرك للحاكم: ٢/ ٢٦٧. [2] صحیح مسلم: ١٢١١.

ہیں: مجھے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حجِ وداع سے قبل اس حج کے دوران میں جس میں وہ امیر الحج بنا کر بھیجے گئے تھے (یعنی سن نو ہجری میں) ایک جماعت کے ہمراہ یومِ نحر کو منادی کرنے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کرنے نہ آئے اور نہ کوئی حالتِ عریانی میں طواف کعبہ کرے۔[1] (جاہلیت میں مشرک یہ سوچ کر کہ ان کے لباس کعبہ کے شایانِ شان نہیں، ایسا کر لیتے تھے) اسے شیخین نے نقل کیا۔

③ سات چکر پورے کرے، اگر کسی چکر میں ایک قدم بھی ناقص ہوا تو یہ اس کا طواف شمار نہ ہوگا، اگر طواف کر لینے کے بعد اس طرح کا شک ہوا تو اسے کوئی چیز لازم نہیں۔

④ حجرِ اسود سے (اسے بوسہ دے کر، یا ہاتھ لگا کر یا اس کے متوازی ہو کر اس کی طرف اشارہ کر کے اور انگلیاں چوم کر) طواف شروع کرے اور اسی پر ختم کرے۔

⑤ اثنائے طواف کعبہ اس کے بائیں جانب رہے، وگرنہ طواف صحیح نہ ہوگا، کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ آئے تو حجر اسود کے پاس آ کر اسے بوسہ دیا، پھر اپنی داہنی جانب پہلے تین چکروں میں رمل کرتے ہوئے طواف شروع کیا اور آخری چار چکروں میں عام انداز میں چلے۔[2] اسے مسلم نے نقل کیا۔

⑥ طواف کعبہ کے باہر ہو (یعنی صحنِ حرم میں) اگر حطیم کے اندر سے ہو کر گزرے تو اس کا طواف صحیح نہ ہوگا، کیونکہ حطیم اور (کعبہ کی) بنیاد (جہاں غلاف کعبہ نیچے لٹکتا ہے) کعبہ کا حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے طواف کا حکم دیا ہے، نہ کہ کعبہ کے اندر، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ (الحج:۲۹) ''اللہ کے اس قدیمی گھر کا طواف کرو۔'' اگر آسانی ہو تو کعبہ کے جتنا قریب ہو بہتر ہے۔

⑦ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک پے در پے سات چکر لگائے، البتہ مختصر وقفہ میں حرج نہیں بغیر عذر کے اور اگر عذر ہو (مثلاً: بڑھاپا، تھک جانا یا شوگر وغیرہ کی وجہ سے پیشاب کا زور) تو طویل وقفہ بھی نقصان دہ نہیں، حنفیہ اور شافعیہ کی رائے میں پے در پے کرنا سنت ہے (واجب نہیں) اگر بغیر عذر بھی چکروں کے درمیان طویل وقفہ کیا تو اس وجہ سے طواف باطل نہ ہوگا، وقفہ کے بعد وہیں سے آگے شروع کرے، سعید بن منصور نے حمید بن زید سے روایت کیا کہ میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ طواف کے تین یا چار چکر لگا کر آرام کرنے بیٹھ گئے اور ان کا غلام انہیں ہوا دیتا رہا، پھر وہیں سے آگے کے چکر شروع کیے، شافعیہ اور حنفیہ کے نزدیک اگر طواف کے دوران میں وضو ٹوٹ گیا تو وضو کر کے وہیں سے آگے شروع کرے نئے سرے سے طواف کرنا واجب نہیں، اگرچہ طویل وقفہ ہو جائے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے منقول ہے کہ وہ طواف شروع کرتے اور اس دوران جماعت کھڑی ہو جاتی تو وہ نماز میں شریک ہوتے، پھر وہیں سے آگے شروع کر دیتے، عطاء نے اس شخص کی بابت کہا جو طواف کے چھ چکر لگائے، پھر جنازہ حاضر ہو گیا تو وہ نکل کر نماز جنازہ میں شریک ہو، پھر واپس آ کر باقی ماندہ طواف پورا کر لے۔

---

[1] صحیح البخاری: ۴۳۶۳؛ صحیح مسلم: ۱۳۴۷. [2] صحیح مسلم: ۱۲۱۸.

طواف کی سنن

طواف کی سنن درج ذیل ہیں:

① حجر اسود کی طرف منہ کرنا

یہ تب ہے جب طواف کا آغاز کرے اور ساتھ تکبیر وتہلیل کرے اور ہاتھ اوپر اٹھائے نماز کے رفع الیدین کے انداز میں اور دونوں ہاتھ حجر اسود پر رکھ کر اس کا استلام کرے اور بغیر آواز کے بوسہ دے اور اپنا رخسار اس پر رکھے، اگر یہ ممکن ہے، وگرنہ صرف چھو لے اور بوسہ دے یا اپنے پاس موجود کسی چیز (مثلاً: چھڑی یا رومال) کے ساتھ چھوئے اور اسے بوسہ دے یا چھڑی وغیرہ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرے (یعنی اگر ہجوم کی وجہ سے قریب جانا ممکن نہیں) اس بارے میں کئی احادیث ہیں، بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کی طرف رخ کیا اور اس کا استلام کیا، پھر لب مبارک اس پر رکھ دیے اور طویل عرصہ روتے رہے، پھر مڑ کر دیکھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی رو رہے ہیں تو فرمایا: ''اے عمر! یہاں آنسو نکل ہی پڑتے ہیں۔''[1] اسے حاکم نے صحیح الاسناد قرار دے کر نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حجر اسود پر جھکے اور کہا: میں جانتا ہوں کہ تم ایک پتھر ہو، اگر میں نے اپنے حبیب کو نہ دیکھا ہوتا کہ تمہیں بوسہ دیا اور استلام کیا ہے تو میں بھی یہ نہ کرتا اور پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الأحزاب:٢١)[2] اسے احمد وغیرہ نے نقل کیا، امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے حجر کو چھوا، پھر ہاتھ کو چوم لیا اور کہا: جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے، میں نے کبھی یہ ترک نہیں کیا۔[3] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، سوید بن غفلہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر اس سے معانقہ کیا اور کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ تجھ سے بڑی چاہت کا اظہار کیا تھا۔[4] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کعبہ تشریف لاتے تو حجر اسود کا استلام فرماتے اور کہتے: «بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ»[5] اسے احمد نے نقل کیا، مسلم نے سیدنا ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ طواف کرتے ہوئے ایک چھڑی کے ساتھ حجر اسود کو چھوا اور پھر اس چھڑی کو چوم لیا،[6] بخاری، مسلم اور ابو داود نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بابت نقل کیا کہ وہ حجر اسود کے پاس آئے اور اسے بوسہ دیا اور کہا: میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو کوئی نفع اور نقصان نہیں دے سکتا، اگر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔[7]

امام خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس سے علم ہوا کہ سنت کی متابعت ضروری ہے، خواہ ان کی علت معلوم نہ ہو اور اسباب سمجھ میں

---

① ضعيف جدًا، سنن ابن ماجه: ٢٩٤٥؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٥٤. ② صحيح البخاري: ١٦١٠؛ مسند البزار: ١٩١. ③ صحيح البخاري: ١٦٠٦؛ صحيح مسلم: ١٢٦٨. ④ صحيح مسلم: ١٢٧١.
⑤ صحيح، مسند أحمد: ٢/ ٤١٢؛ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے صحیح قرار دیا۔ ⑥ صحيح مسلم: ١٢٧٥؛ سنن أبي داود: ١٨٧٩.
⑦ صحيح البخاري: ١٥٩٧؛ صحيح مسلم: ١٢٧٠.

نہ آئیں اور بعینہ یہی کرنا اس شخص پر حجت ہے جس تک ان کا علم پہنچے، وہ اگرچہ ان کے معانی کو سمجھ نہ پائے البتہ فی الجملہ معلوم امر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حجر اسود کو بوسہ دینا اس کے اکرام، اس کے حق کے اعظام اور اس کے ساتھ تبرک (کے حصول) کی وجہ سے تھا اور اللہ نے بعض پتھروں کو بعض پر فضیلت دی ہے، جیسے اس نے بعض علاقوں اور شہروں کو فضیلت بخشی ہے اور جس طرح بعض راتوں، دنوں اور مہینوں کو فضیلت عطا کی گئی ہے اور اس سب کا باب سرِ تسلیم خم کرنا ہے، بعض احادیث میں حجر اسود کی تقبیل کی ایک معقول حکمت و وجہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: «اَلْحَجَرُ يَمِيْنُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ» [1] لفظی ترجمہ ہے: ''حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے۔''

معنی یہ ہوا کہ جس نے زمین میں اس سے مصافحہ کیا اس کے لیے اللہ کے ہاں عہد ہوا، یہ اس عہد کی مثل ہے جیسے بادشاہ مصافحہ کے ساتھ باندھتے تھے ان کے لیے جن سے دوستی کا وہ ارادہ بنائیں اور جیسے بادشاہوں (اور امراء اور مشائخ) کی بیعت کی جاتی ہے اور جیسے خدام (اور مریدین) سادات و کبراء کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں تو یہ صرف بطورِ تشبیہہ و تمثیل ہے، مہلب رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ مذکورہ بات ان حضرات کا رد کرتی ہے جو کہتے ہیں: حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے، وہ اس کے ذریعہ اپنے بندوں سے مصافحہ کرتا ہے اور معاذ اللہ کہ اللہ کے لیے کوئی عضو ہو، دراصل اس کی تقبیل بطورِ امتحان (و آزمائش) مشروع ہے، تاکہ مشاہدہ کے ساتھ وہ معلوم کرا دے کہ کون اس کی اطاعت کرتا ہے اور یہ ابلیس کے قصہ سے مشابہ ہے، جب اسے سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ (تعظیمی) کرنے کا حکم دیا تھا، پھر بالیقین معلوم نہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے کعبہ تعمیر کرتے ہوئے استعمال کردہ پتھروں میں سے کوئی پتھر باقی بھی ہے یا نہیں ماسوائے حجر اسود کے (اور مقام ابراہیم والے پتھر کے)۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے مزاحمت کرنا

اس قدر مزاحمت اور دھکم پیل میں حرج نہیں جس سے کسی کو ایذا نہ پہنچے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما دھکم پیل کر کے اسے بوسہ دیتے حتی کہ کئی دفعہ ان کی ناک سے خون بہہ پڑتا تھا، نبی کریم ﷺ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے ابو حفص! تم ایک قوی ہیکل آدمی ہو، تم حجر اسود کے پاس دھکم پیل مت کرنا کہ کسی ضعیف کو ایذا دو، لیکن اگر گنجائش پاؤ تو اسے چھو لو وگرنہ اللہ اکبر کہہ کر گزر جاؤ۔'' [2] اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں تخریج کیا۔

② اضطباع (کندھا ننگا کرنا)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جعرانہ سے عمرہ کرنے آئے تو اپنی چادروں کو دائیں بغل کے نیچے سے گزار کر ان کے پلو بائیں کندھوں پر رکھے۔ [3] اسے احمد اور ابو داود نے نقل کیا، یہ جمہور کا مذہب ہے اس کی حکمت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس سے اثنائے طواف رمل کرنے میں آسانی رہے گی، امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مستحب

---

① ضعيف، فردوس الأخبار للديلمي: ٢٨٠٨. ② صحيح، مسند أحمد: ١/ ٢٨؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ٨٠.
③ صحيح، سنن أبي داود: ١٨٩٠؛ مسند أحمد: ١/ ٣٠٦.

نہیں کیونکہ انہوں نے کسی کو (اپنے زمانہ میں) یہ کرتے نہیں دیکھا اور نہ اس کی بابت طواف کی دو رکعتوں میں تو بالاتفاق کندھا ننگا نہیں کرے گا۔

③ رمل (یعنی کندھے ہلاتے ہوئے قریب قریب قدم اٹھاتے ہوئے تیز تیز چلنا)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چکروں میں رمل کیا اور باقی چار میں عام چال چلے۔[1] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، اگر کسی سے پہلے تین میں رمل چھوٹ گیا تو وہ باقی چار میں اس کی قضا نہ دے، اضطباع اور رمل طوافِ عمرہ میں صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے، اسی طرح حج کے ہر اس طواف میں جس کے بعد سعی کرنا ہوتی ہے، شافعیہ کے نزدیک اگر طوافِ قدوم میں اضطباع اور رمل کیا، پھر اس کے بعد (صفا اور مروہ کی) سعی کی تو اب طوافِ افاضہ میں وہ اضطباع اور رمل نہ کرے اور اگر اس طواف کے بعد وہ سعی نہیں کر سکا اور اسے اس نے طوافِ زیارت کے بعد تک موخر کیا ہے تو طوافِ زیارت میں وہ اضطباع اور رمل کرے، عورتیں (جیسا کہ پہلے بھی کہا) اضطباع اور رمل نہیں کریں گی کیونکہ (ان کا سارا جسم عورۃ ہے اور) سترِ عورۃ واجب ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا تھا کہ عورتوں پر رمل نہیں ہے اور نہ صفا و مروہ کے مابین تیز چلنا یا دوڑنا۔[2] اسے بیہقی نے نقل کیا۔

رمل کا پسِ منظر

اس بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں عمرہ کرنے آئے اور یثرب کے بخار نے صحابہ کرام کو کمزور کر رکھا تھا تو مشرکین آپس میں کہنے لگے: یہ ایسے لوگ آرہے ہیں جنہیں یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے تو اللہ نے اپنے نبی کو ان کی اس بات سے مطلع کیا تو آپ نے حکم دیا کہ وہ تین چکروں میں (پہلوانوں کے انداز میں کندھے ہلا ہلا کر) رمل کریں، مشرکین نے جب صحابہ کرام کو اس انداز میں دیکھا تو کہا: ان کے بارے میں ہمارا گمان غلط ثابت ہوا، یہ تو ہم سے بھی قوی ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: آپ نے ازراہِ شفقت سب چکروں میں رمل کرنے کا نہیں کہا۔[3] اسے بخاری، مسلم اور ابوداود نے تخریج کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بنی تھی (یعنی اپنے دورِ خلافت میں) کہ اب رمل کی ضرورت نہیں، کیونکہ جس حکمت و علت کے پیشِ نظر یہ کیا تھا وہ اب ختم ہوگئی، پھر ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ عہدِ نبوی کے اس انداز کو جاری رہنے دیا جائے تا کہ آنے والی نسلوں کے سامنے یہ منظر تازہ رہے، محب الدین طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کئی دفعہ دین کا کوئی کام کسی خاص سبب کی وجہ سے مشروع کیا جاتا ہے، پھر وہ سبب ختم ہو جاتا ہے مگر وہ کام جاری اور باقی رہتا ہے، زید بن اسلم اپنے والد سے راوی ہیں کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا: آج ہم کیوں رمل کریں اور کندھے ننگے رکھیں؟ جبکہ اللہ نے اسلام کے قدم جما دیے اور کفر اور اہل کفر کی بیخ کنی کر دی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم اس چیز کا ترک نہ کریں گے، جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کیا کرتے تھے۔[4]

---

[1] صحيح مسلم: ١٢٦١؛ مسند أحمد: ٢/ ٩٨. [2] السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ٤٨. [3] صحيح البخاري: ١٦٠٢؛ صحيح مسلم: ١٢٦٦. [4] صحيح، سنن أبي داود: ١٨٨٧.

④ رکنِ یمانی کو چھونا

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سوائے یمانی دونوں رکنوں (یعنی کونوں) کے کسی کو چھوتے نہیں دیکھا[1] اور کہا: جب سے نبی کریم ﷺ کو انہیں چھوتے دیکھا ہے میں نے کبھی ان کا چھونا ترک نہیں کیا، چاہے آسانی ہو یا مشکل،[2] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، طواف کرنے والا (باقی دو کونوں کو چھوڑ کر) صرف ان کا استلام ان کی فضیلت کے پیش نظر کرے گا، چنانچہ حجرِ اسود والے کونے کی دو خصوصیات ہیں: ایک کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام والی بنیادوں پر قائم ہے اور دوم کہ اس میں حجرِ اسود نصب ہے، جسے طواف کی ابتدا اور انتہا بنایا گیا ہے اور جو اس کے ساتھ والا دوسرا کونہ ہے اس کی ایک خصوصیت ہے، وہ یہ کہ وہ بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام والی بنیاد پر قائم ہے، ابوداود نے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بتلایا گیا کہ حطیم کا کچھ حصہ کعبہ میں سے ہے تو کہنے لگے: اللہ کی قسم! میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے سنی ہوگی اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا استلام اسی وجہ سے ترک کیا ہوگا کہ وہ بیت اللہ کی اصل بنیادوں پر تعمیر نہیں کیے گئے، دراصل اہلِ مکہ نے جب کعبہ کی تعمیرِ نو کی جبکہ نبی کریم ﷺ لڑکپن کے عالم میں تھے اور سیلاب کی وجہ سے کعبہ کو نقصان پہنچا تھا، چنانچہ ان کی رائے بنی کہ اس کی تعمیرِ نو کی جائے تو حطیم والا حصہ بوجہ مالِ حلال کی قلت کے کعبہ سے باہر کر دیا تھا، لہٰذا اس طرف کے دونوں کونے گویا کعبہ کی اصل بنیادوں پر ایستادہ نہیں اور لوگ اسی وجہ سے طواف میں حطیم کے پرے سے (نہ کہ اس کے اندر سے) گزرتے ہیں،[3] امت کا دونوں یمانی رکنوں (کونوں) کے استلام پر اتفاق ہے اور اس امر پر بھی کہ طائف دیگر دونوں کونوں کا استلام نہیں کرے گا، ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''حجرِ اسود والا کونہ اور یمانی کونہ گناہوں کو مٹا ڈالتے ہیں۔''[4]

⑤ طواف کے بعد دو رکعتیں ادا کرنا

ہر طواف کے بعد مسنون ہے (بقول محشی ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ واجب ہیں) کہ مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعتیں ادا کی جائیں یا مسجد کی کسی بھی جگہ (اگر ہجوم کی وجہ سے ممکن نہیں) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں آئے تو بیت اللہ کے گرد سات چکر لگائے، پھر مقام کے پاس آئے اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ (البقرہ: ۱۲۵) ''مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ مقرر کر لو۔'' اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھیں، پھر حجرِ اسود کے پاس آئے اور اسے بوسہ دیا۔[5] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن صحیح ہے، یہ بھی مسنون ہے کہ ان میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی قراءت کرے، مسلم وغیرہ کے ہاں نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے، یہ تمام اوقات حتی کہ اوقاتِ کراہت میں بھی ادا کی جاسکتی ہیں، چنانچہ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے بنی عبدِ مناف! کسی کو نہ روکو کہ

---

① صحيح البخاري: ١٦٠٩؛ صحيح مسلم: ١٨٧. ② صحيح البخاري: ١٦٠٦؛ صحيح مسلم: ١٢٦٨.
③ صحيح، سنن أبي داود: ١٨٥٧. ④ صحيح ابن حبان: ٣٦٩٨. ⑤ صحيح، سنن ترمذي: ٨٦٢.

کسی بھی وقت طواف کرے اور نماز پڑھے رات ہو یا دن۔"[1] اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا، یہ امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے (دیگر کے ہاں اوقاتِ کراہت میں نہ پڑھے) طواف کے بعد والی رکعتوں کی ادائیگی جس طرح مسجد میں مسنون ہے، اسی طرح خارج از مسجد بھی اس کا جواز ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ انہوں نے سواری پر طواف کیا تو (بعد والی) رکعتیں ادا نہ کیں، حتی کہ (مسجد سے) باہر آئیں، امام مالک رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بابت نقل کیا کہ انہیں ذی طویٰ میں ادا کیا،[2] امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حدودِ حرم سے باہر یہ رکعتیں پڑھیں،[3] اگر طواف کے بعد فرض نماز پڑھی تو یہ ان دونوں رکعتوں سے کفایت کرے گی، یہی شوافع کے ہاں صحیح اور امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب ہے، امام مالک رحمہ اللہ اور احناف کے نزدیک کوئی اور نماز ان کی قائم مقام نہیں بن سکتی۔

حرم میں نمازی کے آگے سے گزرنا

حرم میں عورتیں اور مرد نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں، بلا کراہت یہ جائز ہے اور یہ مسجدِ حرام کی خصوصیات میں سے ہے، چنانچہ کثیر بن کثیر بن مطلب بن وداعہ سے مروی ہے جو اپنے بعض اہل سے اور وہ عن جدہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ بنی سہم (کے دروازہ/محلہ) کے جہت والے حصہ میں (یعنی کعبہ کے اندر) نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے آگے سے گزر رہے تھے اور آپ کے سامنے سترہ بھی نہ تھا۔[4] اسے ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

عورتوں اور مردوں کا اکٹھے طواف کرنا

بخاری نے ابن جریج سے نقل کیا کہ جب ابن ہشام نے عورتوں کو منع کیا کہ وہ مردوں کے ساتھ طواف نہ کیا کریں تو عطاء نے ان سے کہا: تم کیسے انہیں منع کر سکتے ہو، جبکہ عہدِ نبوی میں مرد اور عورتیں اکٹھے ہی طواف کیا کرتے تھے، کہتے ہیں: میں نے کہا: پردے کا حکم نازل ہونے سے قبل یا بعد؟ کہنے لگے: میں نے انہیں پردے کے حکم کے بعد ہی تو دیکھا ہے، میں نے کہا: کیا مرد و زن باہم مختلط ہو جاتے تھے؟ کہا: نہیں! سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر (خواتین) مردوں سے الگ ہو کر طواف کرتی تھیں، مردان سے مختلط نہ ہوتے تھے، ایک دفعہ ایک خاتون نے ان سے کہا: چلیں اے ام المومنین! حجر کا استلام کریں تو کہنے لگیں: تم چلی جاؤ اور خود جانے سے انکار کیا (یعنی وہاں مردوں کے ہجوم کی وجہ سے) عام طور پر خواتین رات کو طواف کے لیے نکلا کرتی تھیں، وہ حرم میں داخل ہو کر کھڑی ہو جاتیں اور اس وقت مرد نکال دیے جاتے تھے۔[5] اگر حجر اسود کے پاس مردوں کا ہجوم نہ ہو تو عورت اسے بوسہ بھی دے سکتی ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت سے کہا: حجر کے پاس دھکم پیل نہ کرنا، اگر خلوت دیکھو تو اسے بوسہ دو اور اگر ازدحام ہو تو تکبیر و تہلیل کہہ دو جب اس کے سامنے سے گزرو اور کسی کو ایذا مت دو۔

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٨٩٤؛ سنن ترمذي: ٨٦٨. [2] صحيح البخاري كتاب الحج تعليقاً، باب: ٧٣.
[3] صحيح البخاري، كتاب الحج تعليقاً، باب: ٧١. [4] ضعيف، سنن أبي داود: ٢٠١٦؛ سنن ابن ماجه: ٢٩٥٨. [5] صحيح البخاري: ١٦١٨.

سوار ہو کر (یا کرسی پر بیٹھ کر) طواف کرنا

یہ جائز ہے، اگر چہ وہ چلنے پر (یعنی مشقت کے ساتھ) قادر بھی ہو، اگر اس کا کوئی عذر ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا اور چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کرتے تھے، [1] اسے شیخین نے نقل کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سواری پر طواف کیا، اسی طرح صفا اور مروہ کی سعی بھی، یہ اس لیے کہ لوگ آپ کو دیکھیں اور آپ سے حج کے اور دیگر مسائل کے بارے میں پوچھیں اور سیکھیں اور لوگوں کا آپ کے گرد ہجوم تھا۔ [2]

کوڑھ زدہ کا لوگوں کے ساتھ طواف کرنے کی کراہت

امام مالک رحمہ اللہ نے ابن ابی ملیکہ سے روایت نقل کی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک کوڑھ زدہ خاتون کو دیکھا جو طواف کر رہی تھی تو اسے کہا: اے اللہ کی بندی! لوگوں کو ایذا مت دو، کیا ہے اگر گھر میں ہی بیٹھی رہو؟ تو اس نے ایسا ہی کیا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک شخص کا اس سے گزر ہوا تو اس سے کہنے لگا: جس نے تمہیں طواف سے روکا تھا وہ فوت ہو گیا ہے، اب طواف کے لیے چلی جایا کرو، وہ بولی: یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی زندگی میں تو ان کی اطاعت کروں اور ان کے مرنے کے بعد نافرمانی کروں۔ [3]

آبِ زمزم پینے کا استحباب

طواف اور مقام ابراہیم پر دو رکعتوں سے فارغ ہو کر مستحب ہے کہ آبِ زمزم پیے، صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آبِ زمزم نوش کیا اور فرمایا: ''یہ مبارک ہے، یہ کھانے کا کھانا اور مرض سے شفا ہے۔'' [4] سیدنا جبریل علیہ السلام نے شبِ معراج قلبِ مصطفیٰ کو زمزم کے پانی سے دھویا تھا۔ [5] طبرانی نے کبیر میں اور ابن حبان نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سطحِ زمین پر سب سے بہتر اور عمدہ پانی زمزم کا ہے (اور آج جدید ترین لیبارٹری نے ٹیسٹ کر کے یہ ثابت کیا ہے) یہ کھانے کا قائم مقام ہے اور یہ شفا ہے۔'' [6] بقول منذری اس کے راوی ثقہ ہیں۔

زمزم پینے کے آداب

مسنون یہ ہے کہ پینے والا شفا و صحت اور دین و دنیا کی خیر کی نیت کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آبِ زمزم اس مقصد کو پورا کرتا ہے جس کے لیے پیا جائے۔'' [7] سوید بن سعید راوی ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ زمزم کے کنویں کے پاس آئے اور پانی طلب کیا، پھر کعبہ کی طرف رخ کیا اور کہا: ہمیں ابن ابو الموالی نے محمد بن منکدر عن جابر رضی اللہ عنہ

---

[1] صحیح البخاری: ١٦٠٧، صحیح مسلم: ١٢٧٢۔ [2] صحیح مسلم: ١٢٧٣۔ [3] ضعیف، المؤطا امام مالك: ١/ ٤٢٤، جامع الاصول کے محقق نے انقطاع کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ [4] صحیح مسلم: ٢٤٧٣۔ [5] صحیح البخاری: ١٦٣٦، صحیح مسلم: ١٦٣۔ [6] صحیح، مجمع الزوائد: ٣/ ٢٨٦۔ [7] صحیح، سنن ابن ماجه: ٣٠٦٢۔

سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''زمزم کا پانی اس غرض کو پورا کرتا ہے جس کے لیے یہ پیا جائے اور میں اسے روزِ قیامت کی پیاس بجھانے کی غرض سے پی رہا ہوں،''[1] اسے احمد نے بسندِ صحیح نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''آبِ زمزم اسی غرض کے لیے ہے جس کے لیے نوش کیا جائے، اگر شفا کی نیت سے پیو تو اللہ شفا دے گا اور اگر بھوک مٹانے کی غرض سے پیو تو اللہ تمہیں سیر کر دے گا، اگر پیاس بجھانے کی غرض سے پیو تو اللہ اسے بجھا دے گا اور یہ جبریل علیہ السلام کا کھودا ہوا کنواں ہے جسے اللہ نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو پلانے کے لیے بنایا تھا۔''[2] اسے دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا، حاکم نے یہ اضافہ کیا کہ اگر اسے استعاذہ کی نیت سے پیو تو اللہ پناہ عطا فرمائے گا۔[3]

مستحب ہے کہ تین سانسوں میں پیے اور پیتے وقت منہ قبلہ رو ہو اور سیر ہو کر پیے اور (آخر میں) الحمد للہ کہے اور وہ دعا کرے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کی تھی، چنانچہ ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ ایک شخص سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو اس سے پوچھا: کہاں سے آ رہے ہو؟ کہا: زمزم پی کر، کہا: ایسے پیا ہے جیسے اس کے پینے کا حق ہے؟ کہا: وہ کیسے اے ابن عباس؟ کہا: جب پیو تو کعبہ کی طرف منہ ہو، اللہ کا ذکر کرو، تین سانس میں اور خوب پیٹ بھر کر پیو اور فارغ ہو کر الحمد للہ کہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اور منافقین کے مابین علامت یہ ہے کہ وہ پیٹ بھر کر آبِ زمزم نہیں پیتے۔''[4] اسے ابن ماجہ، دارقطنی اور حاکم نے تخریج کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما آب زمزم نوش کر کے یہ دعا مانگتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ عِلْماً نَافِعاً وَ رِزْقاً وَاسِعاً وَشِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ'' اے اللہ! میں تجھ سے علمِ نافع، رزقِ واسع اور ہر بیماری سے شفا مانگتا ہوں۔

زمزم کے کنویں کا پس منظر

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ سیدہ ہاجر علیہا السلام جب مروہ پر چڑھیں، اور ان کے (شیر خوار) بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو پیاس لگی تو ایک آواز سنی تو اپنے آپ سے کہا: ''صَهْ'' (یعنی خاموشی اختیار کی) کان لگائے تو کچھ آہٹ سنائی دی، دیکھا کہ زمزم کا کنواں جہاں آج ہے، وہاں ایک فرشتہ کھڑا ہے جس نے اپنی ایڑی یا اپنے پر سے زمین کریدی تو پانی ظاہر ہوا، تو پھر سیدہ ہاجر علیہا السلام نے اسے حوض کی شکل دیدی، اگر وہ زمزم کو چھوڑ دیتیں (یعنی اس کے گرد حوض نہ بناتیں) تو وہ ایک بہتا ہوا چشمہ بن جاتا، فرمایا کہ انہوں نے خود بھی پیا اور بیٹے کو بھی پلایا، فرشتے نے کہا: ہلاک ہونے کا خدشہ وخوف نہ کرو کیونکہ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ لڑکا اور اس کا والد (ایک دن) تعمیر کریں گے اور اللہ اپنے اہل کو ضائع نہیں کرے گا، بیت اللہ اس وقت ٹیلہ کی مثل تھا اور سیلاب کی وجہ سے اسے نقصان پہنچتا رہتا تھا۔[5]

---

[1] شعب الایمان: ۳۸۳۳؛ مسند أحمد: ۳/ ۳۵. [2] ضعیف، سنن الدارقطنی: ۲/ ۲۸۹. [3] ضعیف، المستدرك للحاكم: ۱/ ٤٧۳. [4] ضعیف، سنن ابن ماجه: ۳۰٦۱؛ سنن الدارقطنی: ۲/ ۲۸۸. [5] صحيح البخاري: ۳۳٦٤.

ملتزم کے پاس دعا کرنے کا استحباب

آب زمزم پینے کے بعد مستحب ہے کہ ملتزم کے پاس دعا کرے، بیہقی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کیا کہ وہ (حطیم والے) کونۂ کعبہ اور بابِ کعبہ کے درمیان والے حصہ کو پکڑتے اور کہتے: یہ والا حصہ ملتزم کہلاتا ہے، یہاں جو دعا بھی کی جائے، اللہ قبول کرتا ہے۔[1] عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اپنا چہرہ مبارک اور سینہ ملتزم کے ساتھ لگا رہے ہیں، بعض نے کہا: حطیم ملتزم ہے،[2] بخاری کی رائے یہ ہے کہ حطیم حجر کا مقام ہے، اس پر ان کا احتجاج حدیثِ معراج کے ساتھ ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مذکور ہے کہ ''میں حطیم میں سویا ہوا تھا'' اور کئی دفعہ فرمایا: ''میں حجر میں سویا ہوا تھا'' کہتے ہیں: حطیم بمعنی محطوم ہے، جیسے قتیل بمعنی مقتول ہے۔

کعبہ کے اندر اور حجرِ اسماعیل میں داخل ہونے کا استحباب

بخاری اور مسلم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے اندر داخل ہوئے (فتح مکہ کے موقع پر) آپ کے ساتھ سیدنا اسامہ بن زید، عثمان بن طلحہ اور بلال رضی اللہ عنہم تھے تو کعبہ کا دروازہ بند کر لیا، جب کھلا تو مجھے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے درمیان میں دونوں یمانی ستونوں کے مابین نوافل ادا کیے ہیں۔[3] علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ کعبہ کے اندر داخل ہونا اور وہاں نوافل پڑھنا سنت ہے، کہتے ہیں: لیکن یہ مناسکِ حج میں شامل نہیں، کیونکہ حاکم نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: اے لوگو! کعبہ کے اندر داخل ہونا حج میں شامل نہیں، جو کعبہ کے اندر نہ جا سکے اس کے لیے مستحب ہے کہ حجرِ اسماعیل (یعنی حطیم) میں داخل ہو اور وہاں نوافل پڑھے، کیونکہ اس کا ایک حصہ کعبہ کا حصہ ہے، احمد نے جید سند کے ساتھ سعید بن جبیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! سوائے میرے باقی آپ کے سب اہلِ خانہ کعبہ میں داخل ہو چکے، آپ نے فرمایا: ''شیبہ (یعنی ابن عثمان بن طلحہ، کلید بردارِ کعبہ) کو پیغام بھیجو کہ وہ تمہارے لیے دروازہ کھول دے۔'' تو انہوں نے پیغام بھیجا، شیبہ نے کہا: ہم نے جاہلیت میں اور اسلام میں کبھی رات کے وقت کعبہ کھولنے کی سکت نہ کی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''حطیم میں نوافل پڑھ لو (کیونکہ یہ کعبہ کا حصہ ہے) تمہاری قوم نے جب کعبہ کی تجدیدِ تعمیر کی تو اسے چھوٹا کر دیا اور یہ حصہ اس سے خارج کر دیا تھا۔''[4]

صفا اور مروہ کے درمیان سعی

مشروعیتِ صفا و مروہ کی اصل

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدہ ہاجر اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کو یہاں لائے اور وہ

---

① السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٦٤. ② حسن، سنن الدارقطني: ٢/ ٢٨٨؛ السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٦٤.
③ صحيح البخاري: ٥٠٤؛ صحيح مسلم: ١٣٢٩. ④ ضعيف، مسند أحمد: ٦/ ٦٧.

تب شیر خوار تھے تو کعبہ کی جگہ کے پاس انہیں اتارا، زمزم (یعنی جہاں آج اس کا کنواں ہے) کے اوپر ایک درخت کے پاس، مکہ میں تب کوئی ذی نفس نہ تھا اور نہ یہاں پانی تھا، ان کے پاس کھجوروں سے بھرا ایک تھیلا اور پانی کا ایک مشکیزہ چھوڑا، پھر وہ واپسی کے لیے چل پڑے، امِ اسماعیل ان کے پیچھے دوڑیں، کہنے لگیں: اے ابراہیم! ہمیں اس وادیِ بے آب و گیاہ میں کہاں چھوڑے جا رہے ہو؟ کئی دفعہ یہ کہا: وہ مطلقاً ان کی طرف التفات نہ کرتے، آخر کہنے لگیں: کیا اللہ نے یہ حکم دیا ہے؟ بولے ہاں! تو کہا: تب وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا، ایک روایت میں ہے کہ ہمیں کس کے حوالے کر رہے ہو؟ بولے! اللہ کے، کہنے لگیں: میں خوش ہوں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام آگے جا کر جہاں سیدہ ہاجر علیہا السلام انہیں دیکھ نہ سکیں، ایک گھاٹی کے پاس رکے، منہ کعبہ کی جانب کیا اور ہاتھ اٹھا کر وہ دعا کی جو قرآن نے ذکر کی ہے:

﴿ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾(إبراهيم:٣٧)

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد ایک وادی میں جہاں کھیتی نہیں، تیرے عزت والے گھر کے پاس لا بسائی ہے، تا کہ اے ہمارے رب! یہ نماز کی اقامت کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو پھلوں سے روزی دے تا کہ (تیرا) شکر کریں۔''

امِ اسماعیل درخت کے نیچے بیٹھ رہیں، سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لٹا لیا اور مشکیزہ اس (درخت) کے ساتھ لٹکا دیا، جب اس کا پانی ختم ہوا اور (بوجہ پیاس) ان کا دودھ بھی منقطع ہوا اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام مارے بھوک اور پیاس کے بلبلانے لگے تو وہ اس منظر کی تاب نہ لا کر وہاں سے اٹھ گئیں اور قریبی پہاڑی صفا پر جا کھڑی ہوئیں اور وادی پر نظر ڈالی کہ شاید پانی کا کوئی سراغ ملے یا کوئی نظر آئے، مگر نظر بے نیلِ مرام واپس آئی، پھر صفا سے اتر کر وادی میں دوڑیں اور اسے قطع کر کے دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھیں اور ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ شاید پانی کا سراغ ملے یا کوئی انسان نظر آئے، سات مرتبہ صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگایا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسی کی یادگار کے بطور (حج و عمرہ میں) لوگ صفا و مروہ کے مابین سات چکر لگاتے ہیں۔''[1]

سعی کا حکم

علماء کے ہاں صفا و مروہ کی سعی کے بارے میں تین آراء ہیں:

(الف) سیدنا ابن عمر، جابر، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم اور آئمہ میں سے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ سے ایک قول یہ ہے کہ سعی یکے از ارکانِ حج ہے اور اگر اس کا ترک کیا تو حج باطل ہو جائے گا اور اس کی تلافی قربانی دینے سے (بھی) نہ ہوگی اور نہ کسی اور طریق سے، اس کے لیے درج ذیل ادلہ سے استدلال کیا:

---

[1] صحيح البخاري: ٣٣٦٤.

① بخاری نے زہری عن عروہ سے نقل کیا کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: آپ کا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بابت کیا خیال ہے:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾(البقرۃ: ۱۵۸)

''بیشک (کوہ) صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے، اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔''

(عروہ رحمہ اللہ نے کہا) میرے ذہن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے مابین سعی نہ کرے تو اس پر کوئی دوش نہیں، کہنے لگیں: اے بھانجے! تمہاری یہ تاویل درست نہیں، یہ دراصل انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو اسلام لانے سے قبل مناۃ الطاغیہ کے لیے تہلیل کرتے تھے، جس کی وہ مشلل کے پاس عبادت کیا کرتے تھے، جب وہ مسلمان ہوئے تو ان میں سے جو حج یا عمرہ کے لیے جاتا تو وہ صفا و مروہ کی سعی کرنے میں حرج محسوس کرتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے: یا رسول اللہ! ہم صفا و مروہ کی سعی کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی (کہ اس کی سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں یعنی اس کا مفہومِ عکسی یہ اخذ کرنا درست نہیں کہ نہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کے مابین چکر لگانا مشروع کیا ہے تو جائز نہیں کہ اس کا ترک کیا جائے۔[1]

② مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ اسلام نے صفا و مروہ کے مابین سعی کی ہے تو یہی سنت ہے اور اللہ کی قسم! جس نے یہ نہ کیا اس کا حج نہ ہوگا۔[2]

③ سیدہ حبیبہ بنت ابی تجراہ رضی اللہ عنہا جو بنی عبد الدار کی ایک خاتون ہیں، سے روایت ہے کہ ہم قریش کی چند خواتین آلِ ابو حسین کے ڈیرے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں اور آپ تب صفا اور مروہ کے مابین سعی میں مشغول تھے اور شدت سے دوڑنے کے سبب آپ کا تہہ بند وسط میں سے ہل رہا تھا حتی کہ کئی دفعہ گھٹنے نظر آجاتے، آپ ساتھ فرماتے جاتے تھے: ''دوڑو کیونکہ اللہ نے تم پر سعی فرض کی ہے۔''[3] اسے ابن ماجہ، احمد اور شافعی نے نقل کیا۔

④ اس لیے کہ یہ حج اور عمرہ میں نسک ہے، لہٰذا دونوں میں طواف کی مثل یہ رکن ہے۔

(ب) سیدنا ابن عباس، انس، ابن زبیر رضی اللہ عنہم، امام ابن سیرین اور امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ سعی سنت ہے، اس کے ترک سے کوئی دم و فدیہ وغیرہ واجب نہیں۔ ان حضرات نے درج ذیل ادلہ سے استدلال کیا۔

① قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ کہ اس کے فاعل سے حرج کی نفی اس کے عدم وجوب پر دلیل ہے تو یہ مباح کا رتبہ ہے اس کا سنت ہونا اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ﴾ سے ثابت ہے، سیدنا ابی بن کعب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصاحف میں یہ آیت اس طرح ہے: '' فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا '' اس پہ حرج نہیں کہ ان کا طواف نہ

---

[1] صحيح البخاري: ۱٦٤٣؛ صحيح مسلم: ۱۲۷۷. [2] صحيح مسلم: ۱۲۷۷. [3] صحيح، مسند أحمد: ٦/ ٤٢١؛ المستدرك للحاكم: ٤/ ۷۰.

کرے۔ اور یہ اگرچہ قرآن نہیں، مگر خبر کے رتبہ سے کم نہیں تو تفسیر (کی حیثیت میں) ہے۔

② اس لیے کہ یہ ذو عدد نسک ہے جو کعبہ سے متعلق نہیں، لہٰذا رمی کی طرح رکن نہیں۔

(ج) امام ابوحنیفہ، امام ثوری اور امام حسن رحمہم اللہ کے نزدیک یہ واجب ہے رکن نہیں اور اس کے ترک سے حج وعمرہ باطل نہ ہوں گے، البتہ دم واجب ہوگا، صاحب المغنی نے اس رائے کو راجح قرار دیا اور لکھا:

① یہ اولیٰ ہے، کیونکہ اس کے موجبین کی دلیل مطلق وجوب پر دلیل ہے، نہ کہ اس کے اس حیثیت میں ہونے پر کہ واجب اس کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔

② اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول صحابہ کے کئی اس ضمن میں اقوال کے ساتھ معارض ہے۔

③ جبکہ سیدہ حبیبہ بنت ابی تجراہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے بارے میں ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسے عبداللہ بن مؤمل نے روایت کیا اور وہ متکلم فیہ ہیں، یہ دال ہے کہ یہ (اللہ کی طرف سے) مکتوب ہے جو واجب کے معنی میں ہے۔

④ آیت مذکور (جیسا کہ پیچھے گزرا) اس وقت نازل ہوئی جب کچھ لوگوں (یعنی انصار) نے اسلام لانے کے بعد سعی میں حرج سمجھا یہ سوچ کر کہ یہ زمانۂ جاہلیت کی رسم و معمول تھا، ان دو بتوں کی وجہ سے جو صفا اور مروہ پر نصب تھے۔

سعی کی شرائط

سعی کی صحت کے لیے درج ذیل امور شرط ہیں:

① طواف کے بعد ہو۔ ② سات چکر ہوں۔ ③ صفا سے شروع اور مروہ پر ختم ہو۔

④ سعی (نشان زد) حصہ میں ہو (نہ کہ سارے مسعیٰ میں) کیونکہ یہی فعلِ نبوی تھا اور آپ کا فرمان ہے: ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ)) ''مجھ سے مناسکِ حج سیکھ لو۔''[1] اگر طواف سے قبل سعی کی یا مروہ سے اس کا آغاز کیا یا غیر مسعیٰ میں سعی کی تو اس کی سعی باطل ہوگی۔

صفا پر چڑھنا

صحتِ سعی کے لیے صفا و مروہ کے اوپر چڑھنا شرط نہیں، واجب یہ ہے کہ دونوں کے درمیانی فاصلہ کو طے کرے اور ہر چکر میں اپنا قدم ان کی ابتدائی حد کے ساتھ ملائے وگرنہ یہ کافی نہ ہوگا۔

درمیان میں انقطاع نہ آنے دینا

یہ شرط نہیں (بقول محشی مالک رحمہ اللہ کے نزدیک درمیان میں طویل انقطاع نہ آنے دینا شرط ہے) اگر کوئی ایسی رکاوٹ پیش آگئی کہ تسلسل نہ رہے، مثلاً: نماز کی اقامت ہونے لگی تو وہ سعی روک سکتا ہے، پھر فراغت کے بعد وہیں سے آگے شروع

[1] صحیح، سنن نسائی: ۳۰۶۲.

کرے، المغنی میں ہے: امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: کوئی حرج نہیں کہ (ضرورت پڑے تو) آرام کر لے یا درمیان میں روک کر کچھ چکر شام کو لگا لے، عطاء اور حسن اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے کہ طواف صبح کو کرے اور سعی کو شام تک موخر کر لے، امام قاسم اور امام سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے بالفعل یہ کیا، کیونکہ خود سعی میں تسلسل جب واجب نہیں تو طواف کے فوری بعد اس کا نہ کرنا تو اولیٰ ہوا، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ عروہ بن زبیر کی زوجہ سودہ نے جو کہ بھاری بھر کم خاتون تھیں، اپنی سعی کو تین دن میں پورا کیا۔

سعی کے لیے طہارت کا ہونا

اکثر اہل علم کی رائے میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کے لیے طہارت شرط نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: جب وہ حائضہ ہوئیں: ''سوائے طوافِ کعبہ کے باقی وہ سب امور انجام دو جو حج کرنے والا ادا کرتا ہے اور طواف کو طہارت کے بعد تک مؤخر کر لو۔''[1] اسے مسلم نے نقل کیا، سیدہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے کہا: جب خاتون طواف کر لے اور دو رکعت پڑھ لے، پھر اسے حیض آ جائے تو وہ صفا اور مروہ کی سعی کر لے، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا اگرچہ مستحب یہی ہے کہ سعی طہارت پر ہو، دیگر سب مناسک بھی اور یہی شرعاً مرغوب امر ہے۔

سوار ہو کر (یا کرسی پر بیٹھ کر) سعی کرنا

یہ جائز ہے، البتہ پیدل سعی کرنا افضل ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے افادہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پیدل سعی شروع کی تھی، لیکن جب آپ کے گرد مسائل پوچھنے والوں کا ہجوم ہوا اور ہر طرف سے رش پڑ گیا تو آپ سوار ہو گئے تھے، تاکہ سب کو آپ نظر آئیں اور مسائل پوچھنے (اور سننے) میں آسانی ہو، ابوطفیل نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا: کیا سعی سوار ہو کر کرنا سنت ہے؟ کیونکہ آپ کی قوم کا یہی ادعا ہے، اس پر وہ بولے: انہوں نے سچ کہا اور جھوٹ بھی، کہتے ہیں: اس کی وضاحت چاہی تو کہا: نبی کریم ﷺ کو دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم ہوا کہ یہ محمد ہیں، یہ محمد ہیں، حتیٰ کہ کنواریاں گھروں سے دیدارِ مصطفیٰ کرنے کے لیے نکل آئیں تو اس صورتحال میں آپ نے مناسب جانا کہ سوار ہو جائیں (تاکہ دیدار کرنے میں آسانی ہو) البتہ پیدل چلنا اور (مخصوص حصہ میں) دوڑنا افضل ہے،[2] اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا، سوار ہونا اگرچہ جائز ہے مگر (بغیر ضرورت کے) مکروہ ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بعض اہلِ علم نے بغیر عذر سوار ہو کر طواف اور سعی کرنا مکروہ قرار دیا ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے، مالکیہ کے ہاں جو بغیر عذر کے سوار ہو کر سعی کرے وہ دوبارہ سعی کرے اگر وقت فوت نہیں ہوا اور اگر وقت نکل گیا ہو تو اس کے ذمہ دم ہے کیونکہ بشرطِ قدرت پیدل چلنا واجب تھا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی یہی فتویٰ دیتے تھے، نبی کریم ﷺ کے سوار ہونے کی ان حضرات نے یہ تعلیل کی کہ لوگوں کا آپ کے گرد ہجوم ہو گیا تھا، لہٰذا آپ ضرورت کے تحت سوار ہوئے تھے۔

---

[1] صحیح مسلم: ١٢١١. [2] صحیح مسلم: ١٢٦٤؛ مسند أحمد: ١/ ٢٩٧.

نشان زدہ حصے میں دوڑنے کا استحباب

اس نشان زدہ حصے کے ماسوا میں عام چال چلنا مندوب ہے اور اس حصہ میں رمل (یعنی تیز) چلنا مندوب ہے۔ اس بابت سیدہ حبیبہ بنت ابی تجراہ رضی اللہ عنہا کی روایت گزری ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سعی کر رہے تھے حتی کہ تیز سعی کرنے کی وجہ سے آپ کا تہبند ہل رہا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت میں بھی تھا کہ چلنا اور دوڑنا افضل ہے تو دوڑنا بطنِ وادی نشان زدہ حصے میں ہے، جبکہ عام طور پر چلنا اس کے ماسوا میں، اگر دوڑنے کی بجائے وہاں بھی چل دیا تو یہ جائز ہے، سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے: میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ صفا و مروہ کے درمیان عام چال چل رہے تھے، پھر کہا: اگر اس طرح چلوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چلتے بھی دیکھا ہے اور دوڑوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوڑتے بھی دیکھا ہے لیکن میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔[1] اسے ابو داود اور ترمذی نے نقل کیا، یہ استحباب مردوں کی نسبت ہے عورتوں کے لیے دوڑنا مندوب نہیں بلکہ وہ تمام مسعیٰ میں عام چال ہی چلیں گی، امام شافعی رحمہ اللہ نے نقل کیا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی نظر بعض دوڑتی ہوئی عورتوں پر پڑی تو کہا: کیا تمہارے لیے ہم اسوہ نہیں؟ تم پر دوڑنا ضروری نہیں ہے۔[2]

صفا اور مروہ کے اوپر چڑھنا اور وہاں قبلہ رخ ہو کر دعا کرنا

یہ مستحب ہے اور جو چاہے دین و دنیا کی خیر کی دعا کرے، فعلِ نبوی سے معروف ہے کہ آپ بابِ صفا سے نکلے، جب صفا کے قریب ہوئے تو یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ ''یقیناً صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' اور فرمایا: ''میں اسی سے ابتدا کرتا ہوں جس کے ذکر کے ساتھ اللہ نے ابتدا کی ہے (یعنی صفا سے)۔'' تو آپ اس پر چڑھے اور کعبہ پر نظر ڈالی، پھر اللہ کی توحید اور تکبیر کے کلمات تین مرتبہ کہے، حمد بیان کی اور فرمایا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِ وَيُمِيْتُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ» پھر دیگر دعائیں کیں، پھر یہی کلمات تین مرتبہ کہے، پھر مروہ کی طرف چل پڑے اور وہاں پہنچ کر اس کے اوپر چڑھے، کعبہ پر نظر ڈالی اور وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا، نافع سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا جبکہ وہ صفا پر دعا گو تھے اور کہہ رہے تھے: اے اللہ! تو نے کہا ہے: ﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (الغافر: ٦٠) ''مجھ سے دعائیں کرو میں قبول کروں گا۔'' اور تو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ میرا خاتمہ ایمان و اسلام پر کرنا۔[3]

صفا اور مروہ کے درمیان دعا کرنا

یہ مستحب ہے، اسی طرح ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا بھی، مروی ہے کہ آپ دورانِ سعی میں یہ دعا بھی کرتے رہے:

---

① صحیح، سنن أبی داود: ١٩٠٤؛ سنن ترمذی: ٨٦٤. ② السنن الکبری للبیھقی: ٥/ ٨٤. ③ صحیح مسلم: ١٢١٨.

«رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاهْدِنِي السَّبِيْلَ الْأَقْوَمَ» ''اے میرے رب! میری مغفرت کر، رحم کر اور نہایت سیدھی راہ کی ہدایت دے۔''[1] یہ بھی مروی ہے: «رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ» سعی اور قبل ازیں کے طواف کے ساتھ ہی عمرہ کے افعال ختم ہوئے اور اب وہ بال منڈوا کر یا چھوٹے کرا کر حلال ہو جائے گا اگر وہ حجِ تمتع کر رہا ہے، لیکن اگر قارن ہے تو احرام میں باقی رہے، قارن قربانی کے روز حلال ہوگا اور یہ سعی اسے طوافِ فرض (یعنی افاضہ جو دسویں ذوالحجہ کو کیا جاتا ہے، بوجہ عذر اسے مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے) کی سعی سے کافی ہوگی، لیکن اگر تمتع کر رہا ہے تب طوافِ افاضہ کے بعد سعی کرے گا اور یومِ ترویہ تک مکہ میں ہی رہے گا۔

منیٰ جانا

ترویہ (یعنی آٹھ ذوالحجہ) کے دن منیٰ کا رخ کرنا سنت ہے، اگر حاجی قارن ہے یا مفرد ہے تو اپنے اسی احرام کے ساتھ ہی منیٰ جائے اور اگر متمتع ہے تو وہ اب حج (کی نیت کا) احرام باندھے اور وہی کچھ کرے جو میقات پر کیا تھا (یعنی غسل کرنا اور کم از کم دو رکعت نماز کی ادائیگی اور تلبیہ پڑھنا) سنت یہ ہے کہ اسی جگہ سے احرام باندھے جہاں اس کا قیام ہے اگر مکہ کے اندر ہے تو وہیں سے اور اگر باہر ہے تو وہیں سے، حدیث میں ہے: جس کا ٹھکانہ مکہ سے دور ہے تو وہ وہیں سے احرام باندھے، جبکہ اہلِ مکہ شہر سے باندھیں گے۔[2] منیٰ جاتے وقت بکثرت دعائیں کرنا اور تلبیہ کے الفاظ پڑھنا سنت ہے اور یہ کہ وہیں جا کر ظہر اور بعد والی نمازیں پڑھے اور وہیں رات گزارے اور نویں تاریخ کو نبی کریم ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے سورج کے طلوع ہونے کے بعد (آگے عرفات کو) روانہ ہو، اگر اس کا یا اس سے کسی چیز کا ترک کیا تو اس نے سنت کا ترک کیا، مگر اس پر اس ترک کے سبب کچھ (یعنی ہرجانہ اور دم) واجب نہ ہوگا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا یومِ ترویہ رات کو مکہ سے چلی تھیں، بلکہ اس کا ثلث گزر جانے پر، یہ بات ابن منذر رحمہ اللہ نے نقل کی۔

یومِ ترویہ سے قبل منیٰ جانے کا جواز

سعید بن منصور نے حسن (بصری) رحمہ اللہ کے بارے نقل کیا کہ وہ ترویہ سے ایک یا دو دن قبل ہی منیٰ چلے جایا کرتے تھے (شاید اس وجہ سے کہ ہجوم سے بچ سکیں) امام مالک رحمہ اللہ نے اسے مکروہ کہا ہے اور یہ بھی کہ ترویہ کے دن شام تک مکہ ہی میں ٹھہرا رہے، اِلّا یہ کہ جمعہ کا دن ہو اور اسے جمعہ کا وقت وہیں پا لے تب وہ جمعہ ادا کر کے جائے۔

عرفات کی طرف روانگی

عرفات کی طرف روانگی نویں ذوالحج کو طلوعِ آفتاب کے بعد مسنون ہے، تکبیرات، تہلیلات اور تلبیہ پڑھتے ہوئے محمد بن ابوبکر ثقفی کہتے ہیں: میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منیٰ سے عرفات جاتے ہوئے پوچھا: آپ لوگ نبی کریم ﷺ کے

---

[1] ضعيف، مسند أحمد: ٢٦٦٨٥. [2] صحيح البخاري: ١٥٢٤.

ہمراہ کس کیفیت میں ہوتے تھے؟ کہا: کوئی تلبیہ پڑھ رہا ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا اور کوئی اللہ اکبر کی صدا لگا رہا ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا اور کوئی تہلیل کہہ رہا ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا۔[1] اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا (عرفات جا کر) نمرہ (جہاں آجکل ایک بڑی مسجد بنا دی گئی ہے) میں ٹھہرنا مستحب ہے اور وہیں وقوفِ عرفہ کے لیے غسل کرنا اور مستحب ہے کہ عرفات کی حدود میں وقوف کے وقت داخل ہو یعنی بعد از زوال (پہلے چلے جانا بھی جائز ہے، بالخصوص آجکل کے حالات میں کہ بے پناہ ہجوم ہوتا ہے)۔

وقوفِ عرفہ

یومِ عرفہ کی فضیلت

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک ذوالحجہ کے (پہلے) عشرہ سے افضل ایام کوئی نہیں۔'' ایک شخص نے کہا: کیا یہ افضل ہیں یا جو ایام جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوں؟ فرمایا: ''یہ افضل ہیں اور پھر سب سے افضل دن یومِ عرفہ ہے، اللہ تعالیٰ اس روز آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے (آدھی رات کے بعد تو روایات میں مذکور ہے کہ اللہ آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، لیکن یومِ عرفہ کے سوا کسی اور دن کی بابت یہ مذکور نہیں، اسی سے اس کی فضیلت آشکار ہوئی) تو اہلِ زمین کے ساتھ اہلِ آسمان سے مباہات کرتا اور کہتا ہے: دیکھو میرے بندوں کو یہ غبار آلود بال بکھرائے ہر نشیب و فراز سے امڈ پڑے ہیں، انہیں میری رحمت کی امید لگی ہے، حالانکہ انہوں نے میرا عذاب نہیں دیکھا اور عرفہ سے بڑھ کر نارِ جہنم سے خلاصی دلانے والا دن نہیں دیکھا گیا۔''[2] بقول امام منذری رحمہ اللہ اسے ابویعلیٰ، بزار، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے تخریج کیا، ابن مبارک رحمہ اللہ نے ثوری عن زبیر بن علی عن انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں وقوف کیا اور یہ تب جب سورج زوال پذیر ہونے کے قریب تھا، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ لوگوں کو میرے لیے خاموش کراؤ، انہوں نے ندا دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاموشی سے سنو، آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! ابھی جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے، مجھے میرے رب کا سلام پہنچایا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرفات اور اہلِ مشعرِ حرام کی مغفرت فرما دی اور ان کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کیا ہے، اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: کیا یہ صرف ہمارے لیے خاص ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ''تمہارے لیے بھی اور قیامت تک آنے والے سب کے لیے۔'' اس پر وہ بولے: اللہ کی خیر کثیر اور عمدہ ہوئی۔[3] مسلم وغیرہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یومِ عرفہ سے بڑھ کر کسی دن بندوں کو آگ سے آزادی کا پروانہ نہیں دیتا، وہ قرب عطا فرماتا اور ان کے ساتھ فرشتوں سے مباہات کرتا ہے اور کہتا ہے: یہ کیا چاہتے ہیں؟''[4]

---

[1] صحيح ألبخاري: ١٦٥٩؛ صحيح مسلم: ١٢٨٥. [2] ضعيف، صحيح ابن حبان: ٣٨٥٣.
[3] صحيح، الترغيب الترهيب: ١٧٣٧. [4] صحيح مسلم: ١٣٤٨؛ سنن ابن ماجه: ٣٠١٤.

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان یومِ عرفہ سے زیادہ ذلیل وخوار اور غیظ کا شکار نہیں ہوتا اور اس کی وجہ جو وہ رحمتوں کا نزول اور اللہ کا بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دینا ملاحظہ کرتا ہے، البتہ بدر کا دن اس سے مستثنیٰ ہے، جب وہ اس سے بڑھ کر اسی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔'' عرض کی گئی: بدر کے دن اس نے کیا ملاحظہ کیا تھا؟ فرمایا: ''اس نے جبریل علیہ السلام کی قیادت میں فرشتوں کا جمِ غفیر آتے دیکھا تھا۔''[1] اسے مالک رحمہ اللہ نے مرسلاً اور حاکم رحمہ اللہ نے موصولاً نقل کیا۔

وقوفِ عرفہ کا حکم

علماء کا اجماع ہے کہ یہ حج کا رکنِ اعظم ہے، کیونکہ احمد اور اصحاب سنن نے سیدنا عبدالرحمن بن یعمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی کرائی: ''حج عرفہ ہے، جس نے مزدلفہ کی رات طلوعِ فجر سے قبل پا لی اس نے حج کو پالیا۔''[2]

وقوف کا وقت

جمہور علماء رائے رکھتے ہیں کہ وقوف کا وقت نویں ذوالحج کے زوالِ آفتاب سے شروع ہو کر دسویں کی طلوعِ فجر تک ہے اور اس دوران میں رات و دن کی کسی بھی ساعت کا وقوف کافی ہوگا، لیکن اگر دن کے وقت وقوف شروع کیا تو واجب ہے کہ اسے مابعد غروب تک پھیلائے، اگر صرف رات کو وقوف کیا تو (یہ جائز ہے اور اس پر کوئی چیز یعنی دم یا فدیہ) واجب نہیں ہوگا، امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ رات تک وقوف کو طویل کرنا سنت ہے۔

وقوف سے مراد

اس سے مراد عرفہ کے کسی بھی حصہ میں اپنے وجود کے ساتھ حاضر ہونا، اگرچہ آ کر سو جائے، جاگتا رہے، سوار رہے، بیٹھ جائے، لیٹ جائے یا ادھر ادھر چلتا رہے اور چاہے طہارت پر ہو یا نہ ہو، مثلاً: حائضہ، نفساء اور جنبی، اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو بے ہوش ہو جائے اور عرفات سے نکلنے تک ہوش میں نہ آئے، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اس کا بھی وقوف ہوا، جبکہ امام شافعی، امام احمد، امام حسن، امام ابوثور، امام اسحاق اور امام ابن منذر رحمہم اللہ کہتے ہیں: اس کا وقوف نہیں ہوا، کیونکہ یہ ارکانِ حج میں سے ایک ہے، لہٰذا دیگر ارکان کی طرح بے ہوش کا وقوف بھی نہ ہوگا، ترمذی سیدنا ابن یعمر رضی اللہ عنہ کی سابق الذکر روایت نقل کر کے لکھتے ہیں: سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ صحابہ وغیرہم کے اہلِ علم کا سیدنا عبدالرحمن بن یعمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر عمل ہے کہ جس نے دسویں تاریخ کی فجر سے قبل عرفہ کا وقوف نہ کیا اس کا حج نہ ہوا اور فجر کے بعد اس کا عرفات میں آنا مجزئ نہ ہوگا بلکہ وہ اب اسے عمرہ بنا لے اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے آئندہ برس آئے، یہی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ وغیرہما کا قول ہے۔

---

[1] ضعیف، المؤطا امام مالك: ١/ ٤٢٢؛ شعب الایمان: ٤٠٦٩. [2] صحیح، ابوداود: ١٩٤٩؛ سنن ترمذی: ٨٨٩.

چٹانوں کے نزدیک وقوف کا استحباب

عرفہ کے کسی بھی حصے میں وقوف کافی ہے، کیونکہ سارا عرفہ موقف ہے ماسوائے بطنِ عرفہ کے (بقول محشی یعنی وہ وادی جو عرفہ کی مغربی جہت واقع ہے) البتہ اگر ممکن ہو تو صخرات کے پاس یا اس سے قریب وقوف مستحب ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسی مقام پر وقوف کیا تھا اور فرمایا تھا: میں نے یہاں وقوف کیا اور عرفہ سارا ہی وقوف کا محل ہے، [1] اسے احمد، مسلم اور ابو داود نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، جبلِ رحمت پر چڑھنا اور یہ اعتقاد رکھنا کہ اس پر وقوف افضل ہے یہ خطا ہے سنت نہیں۔

غسل کرنے کا استحباب

وقوفِ عرفہ کے لیے غسل کر لینا مندوب ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرفہ کی شام وقوفِ عرفہ کی نیت سے غسل کیا، اسے امام مالک رحمہ اللہ نے روایت کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عرفات میں غسل کیا تھا۔

وقوف و دعا کے آداب

مناسب ہے کہ کامل طہارت پر محافظت ہو (یعنی سارا وقت پاک اور باوضو رہے)، رخ قبلہ جانب ہو اور کثرت سے استغفار، ذکر، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ہر قسم کی دین و دنیا کی بھلائی کی حضورِ قلبی اور خشیت کے ساتھ ہاتھ اٹھائے دعائیں کرے، سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں عرفات میں نبی کریم ﷺ کا ردیف تھا تو آپ ہاتھ اٹھائے دعائیں کرتے رہے۔ [2] اسے نسائی نے نقل کیا، عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا (سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ عرفہ میں نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک پر اکثر وقت یہ کلمات جاری رہے: ((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ)) اسے احمد اور ترمذی نے نقل کیا، ان کی روایت کے الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بہترین دعا یومِ عرفہ کی دعا ہے اور بہترین الفاظ جو میں نے اور سابقہ انبیاء نے کہے وہ یہ ہیں۔'' ((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) الخ [3] حسین بن حسن مروزی سے مروی ہے کہ میں نے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے یومِ عرفہ کی افضل دعا کے بارے میں پوچھا تو کہا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ'' میں نے کہا: یہ ثنا ہے دعا تو نہیں، انہوں نے کہا: کیا تم نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث نہیں سنی؟ وہ اس کی تفسیر ہے۔ میں نے کہا: آپ مجھے وہ حدیث بیان کریں تو انہوں نے کہا: مجھے منصور نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میرے بندے کو اس کا میری ثنا و حمد کرنا مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھے تو میں اسے مانگنے والوں سے بہتر عطا کرتا ہوں۔'' [4] (اس حدیث کے راوی سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ ہیں) پھر سفیان بولے: کیا تم نے امیہ بن ابوصلت (ایک جاہلی شاعر) کے اشعار نہیں سنے جب وہ عبداللہ بن جدعان کے پاس انعام و اکرام کی طمع لیے آیا اور یوں اس سے مخاطب ہوا:

---

[1] صحيح مسلم: ١٢١٨؛ سنن أبي داود: ١٠٣٦. [2] صحيح، سنن نسائي: ٥/ ٢٥٤. [3] حسن، سنن ترمذي: ٣٥٨٥؛ مسند أحمد: ٢/ ٢١٠. [4] ضعيف، سنن ترمذي: ٢٩٢٦.

ءَ أَذْكُرُ حَاجَتِيْ أَمْ قَدْ كَفَانِي حَيَاؤُكَ إِنَّ شِيْمَتَكَ الْحَيَاءُ
وَعِلْمُكَ بِالْحُقُوْقِ وَأَنْتَ فرع لَكَ الْحَسَبُ الْمُهَذَّبُ وَالسَّنَاءُ
إِذَا أَثْنىٰ عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْماً كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

کیا میں اپنی حاجت بیان کروں یا بن مانگے ہی آپ کی عطا کی امید رکھوں؟ کہ عطا کرنا آپ کی طبیعت ہے، آپ ایسے عالی نسب ہیں کہ تعریف کے محتاج نہیں اور بغیر بیان کیے سب ضرورتوں کو جانتے ہیں

پھر کہنے لگے: اے حسین! یہ تو مخلوق کی حالت ہے کہ صراحت کے ساتھ ان سے مانگے جانے کی بجائے اپنی تعریف سن کر ہی عطا کر دیتے ہیں وہ تو خالق ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سابقہ انبیاء کی اور میری عرفہ کے روز دعا یہ ہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ بَصَرِيْ نُوْراً، وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْراً، وَفِيْ قَلْبِيْ نُوْراً، اَللّٰهُمَّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ، وَيَسِّرْلِيْ أَمْرِيْ،اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَسْوَاسِ الصُّدُرْ، وَشَتَاتِ الْأَمْرِ وَشَرِّ فِتْنَةِ الْقَبْرِ، وَشَرِّ مَايَلِجُ فِي اللَّيْلِ، وَشَرِّ مَا يَلِجُ فِي النَّهَارِ، وَشَرِّمَاتَهُبُّ بِهِ الرِّيَاحُ، وَشَرِّ بَوَائِقِ الدَّهْرِ»

''اے اللہ! میری آنکھوں، کانوں اور دل میں نور بنا، میرا سینہ کھول دے، میرے معاملہ میں آسانی کر اور میں سینے کے وسوسوں، معاملہ خراب ہونے، قبر کے فتنہ کے شر، رات اور دن میں وقوع پذیر ہونے والے شر سے اور آندھیوں اور زمانے کے مصائب کے شر سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔''[1]

ترمذی نے ان سے نقل کیا کہ عرفہ کے روز وقوف کے دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ کلمات تھے:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِيْ نَقُوْلُ، وَخَيْراً مِمَّا نَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ لَكَ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ وَإِلَيْكَ مَآبِيْ وَلَكَ رَبِّ تُرَاثِيْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَوَسْوَسَةِ الصَّدْرِ وَشَتَاتِ الْأَمْرِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَهُبُّ بِهِ الرِّيْحُ»

''اے اللہ! تیرے لیے حمد ہے جو ہم بیان کر پائیں اور جس کی ہمیں تاب نہیں، تیرے ہی لیے میری سب عبادت ہے اور تیری طرف ہی میرا ٹھکانہ ہے اور میرا سب کچھ تیرا ہے، اے اللہ! میں عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور سینے کے وسوسوں اور معاملہ خراب ہونے سے پناہ مانگتا ہوں اور آندھیوں سے پیدا ہونے والے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔''[2]

---

[1] ضعیف، السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١١٧؛ بقول محشی اس کی سند ضعیف ہے۔ [2] ضعیف، سنن ترمذی: ٣٥٢٠.

وقوف سنتِ ابراہیمی ہے

سیدنا مربع انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے مشاعر (یعنی مناسکِ حج کی جگہوں) پر رہو، کیونکہ تم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی وراثت کے امین ہو۔''[1] اسے ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن حدیث ہے۔

یومِ عرفہ کا روزہ

ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجِ وداع کے موقع پر) یومِ عرفہ کا روزہ نہیں رکھا اور فرمایا: ''عرفہ کا دن، نحر کا دن اور یہ ایامِ تشریق (یعنی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ) ہم اہلِ اسلام کی عید کے ایام ہیں اور یہ اکل وشرب کے دن ہیں۔''[2] آپ سے عرفات میں (یعنی حاجیوں کے لیے) عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے کی نہی ثابت ہے، اکثر اہلِ علم نے ان احادیث کے ساتھ حجاج کے لیے روزہ نہ رکھنے کے استحباب پر استدلال کیا ہے، تاکہ مناسکِ حج کی ادائیگی کی ان میں قوت ہو اور جو یومِ عرفہ کا روزہ رکھنے کی ترغیب وارد ہے وہ غیر حجاج کے لیے ہے۔

عرفہ میں ظہر وعصر کو جمع کر کے ادا کرنا

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ میں ظہر وعصر کی نمازیں جمع کر کے ادا کیں، اذان دلوائی، پھر اقامت کے بعد ظہر پڑھائی، پھر اقامت کہلوائی اور نمازِ عصر پڑھائی۔[3] اسود اور علقمہ کہتے ہیں: حج کی تمامیت سے ہے کہ عرفہ میں ظہر وعصر اکٹھی ادا کی جائیں، بقول ابن منذر رحمہ اللہ اہلِ علم کا اجماع ہے کہ امام عرفہ میں ظہر وعصر کو جمع کر کے پڑھائے گا، اکیلا پڑھنے والا بھی انہیں جمع کر کے ادا کرے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ مکہ میں مقیم ہوتے (یعنی پوری نماز پڑھتے) اور جب منیٰ جاتے تو قصر کر کے نمازیں ادا کرتے، عمرو بن دینار کہتے ہیں: مجھے جابر بن زید نے کہا کہ میں عرفہ میں نماز قصر کروں گا، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا۔

عرفہ سے واپسی

عرفہ سے بعد از غروب واپسی مسنون ہے سکون و وقار کے ساتھ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اطمینان کے ساتھ عرفات سے واپس ہوئے اور فرماتے جاتے تھے: ''اے لوگو! سکون کو لازم پکڑو کیونکہ نیکی جلد بازی میں نہیں ہے۔''[4] اسے شیخین نے نقل کیا، آپ آرام سے سواری چلاتے رہے جب کہیں گنجائش دیکھی تو اسے تیز بھی دوڑایا۔[5] اسے بھی شیخین نے تخریج کیا، اس

---

[1] صحیح، سنن أبی داود: ١٩١٩؛ سنن ترمذی: ٨٨٣. [2] صحیح، سنن أبی داود: ٢٤١٩؛ سنن ترمذی: ٧٧٣. [3] صحیح البخاری: ١٦٦٢. [4] صحیح البخاری: ١٦٧١؛ صحیح مسلم: ١٢١٨. [5] صحیح البخاری: ١٦٦٦؛ صحیح مسلم: ١٢٨٦.

دوران میں تلبیہ و ذکر مستحب ہے، نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ پڑھتے رہے تھے، اشعث بن سلیم اپنے والد سے راوی ہیں کہ میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ عرفہ سے مزدلفہ واپس ہوا تو مزدلفہ آنے تک وہ مسلسل تکبیر وتہلیل کرتے رہے۔[1] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

مزدلفہ میں مغرب اور عشا کو جمع کر کے ادا کرنا

مزدلفہ پہنچ کر ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشا اکٹھی ادا کی جائیں درمیان میں سنتیں وغیرہ پڑھے بغیر، مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ مزدلفہ میں آئے تو مغرب اور عشا کو ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ ادا فرمایا اور درمیان میں کوئی سنن ونوافل نہیں پڑھے،[2] علماء کا اجماع ہے کہ ایسا کرنا مسنون ہے، اس بارے میں اختلاف کیا گیا کہ اگر ہر نماز اس کے وقت میں ادا کی تو اکثر علماء نے اسے بھی جائز قرار دیا اور نبی کریم ﷺ کے فعل کو اولویت پر محمول کیا، امام ثوری رحمہ اللہ اور اصحابِ رائے (یعنی احناف) کے نزدیک اگر مغرب مزدلفہ آنے سے پہلے پڑھ لی تو اس کے ذمہ اعادہ ہے، البتہ ظہر وعصر کے بارے میں جائز قرار دیا کہ ہر ایک کو اس کے وقت میں پڑھ لیا جائے، لیکن یہ مکروہ ہے۔

مزدلفہ میں شب گزارنا اور وہاں وقوف کرنا

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مزدلفہ میں آئے تو مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں، پھر آپ لیٹ گئے، حتی کہ فجر طلوع ہوئی تو فجر ادا کی، پھر قصواء (اونٹنی) پر سوار ہوئے، حتی کہ مشعرِ حرام آئے تو روشنی ہونے تک وہیں وقوف کیا، پھر سورج طلوع ہونے سے قبل وہاں سے چل پڑے، ثابت نہیں کہ اس رات آپ نے تہجد پڑھی ہو اور یہی مزدلفہ میں رات گزارنے اور وقوف کے بارے سنت ہے (کہ مکمل آرام کیا جائے کیونکہ اگلا دن بہت مصروفیت کا دن ہے) امام احمد رحمہ اللہ نے ماسوائے حج کی ذمہ داریاں ادا کرنے والوں مثلاً: حاجیوں کے میز بانوں اور آبِ زمزم پلانے والوں کے سب پر مزدلفہ میں یہ رات گزارنا واجب قرار دیا ہے، دیگر آئمہ نے رات یہاں گزارنا تو مشروط نہیں کیا، البتہ وقوف کرے اور اس وقوف سے مراد کسی بھی صورت حاجی کی وہاں موجودگی ہے، چاہے کھڑا ہو، بیٹھا یا سویا ہو، احناف کہتے ہیں: واجب یہ ہے کہ فجر سے قبل مزدلفہ (ایک دفعہ) آجائے، اگر نہ آیا تو اسے دم لازم ہوگا اِلّا یہ کہ اس کے لیے کوئی عذر ہو تب وہاں موجودگی لازم نہیں اور اس پر کوئی چیز عائد نہیں، مالکیہ کہتے ہیں: واجب یہ ہے کہ رات کے وقت عرفہ سے منیٰ واپس آتے ہوئے فجر سے قبل مزدلفہ میں آن اترے اور (کم از کم) اتنی مدت کے لیے کہ جتنی دیر میں سواری سے سامان اتارا جاتا ہے، اگر اس کے لیے کوئی عذر نہ ہو، اگر ہے تب یہاں اترنا اس کے لیے واجب نہیں۔

شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ دسویں ذوالحجہ کی رات وقوفِ عرفہ کے بعد رات کے دوسرے نصف میں مزدلفہ اترنا واجب ہے،

---

[1] صحيح، سنن أبي داود: ١٨١٦. [2] صحيح مسلم: ١٢١٨.

لیکن یہاں ٹھہرنا شرط نہیں اور نہ اس کا یہ جاننا کہ یہ مزدلفہ ہے، بلکہ یہاں سے گزرنا ہی کافی ہے (یعنی عرفہ سے منیٰ واپسی کے راستے مزدلفہ سے گزرنا چاہیے) سنت یہ ہے کہ اس روز نمازِ فجر اول وقت پڑھے، پھر مشعر حرام میں روشنی پھیلنے تک رہے (یہاں آج کل ایک بڑی مسجد بنی ہوئی ہے) اور سورج طلوع ہونے سے قبل آگے (کنکریاں مارنے کے لیے) روانہ ہو اور اس دوران میں کثرت سے ذکر و دعا کرے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (البقرة: ٢٠٠)

''جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو یوں اللہ کا ذکر کرو جیسے تم اپنے آباء و اجداد کے کارنامے فخر و مباہات سے بیان کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔''

طلوعِ آفتاب سے کچھ قبل وہاں سے کنکریاں مارنے کی جگہ کی طرف چل دے، وادئ محسر سے گزرے تو قدرے تیز رفتاری سے چلے (یہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ہے اور یہاں ابرہہ کا لشکر تباہی کا شکار ہوا تھا)۔

وقوف کی جگہ

سوائے وادی محسر کے مزدلفہ کی ساری جگہ محلِ وقوف ہے، چنانچہ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مزدلفہ سارا محلِ وقوف ہے، البتہ وادئ محسر سے دور رہو۔''[1] اسے احمد نے ثقہ سند کے ساتھ تخریج کیا، البتہ قزح کے پاس وقوف اولیٰ ہے! سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ میں رات گزار کر صبح دم قزح کے پاس آئے اور یہاں وقوف کیا (یہ مزدلفہ کی ایک جگہ ہے، جاہلیت میں قریش عرفہ جانے کی بجائے ادھر ہی وقوف کر لیتے تھے بقول جوہری یہ ایک پہاڑ ہے، کثیر فقہاء کے نزدیک یہی مشعر حرام ہے) اور فرمایا: ''یہ قزح ہے اور یہ وقوف کا محل ہے اور مزدلفہ سارا ہی موقف ہے۔''[2] اسے ابوداود اور ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حسن صحیح ہے۔

یومِ نحر (یعنی دسویں ذوالحجہ) کے اعمالِ حج

ان کی ادائیگی درجِ ذیل ترتیب سے ہوگی:

① جمرہ کو کنکریاں مارے۔

② قربانی کرے۔

③ سر منڈوائے یا بال چھوٹے کرائے۔

④ مسجدِ حرام میں جا کر طواف (وسعی) کرے۔

---

① مسند أحمد: ٤/ ٨٢. ② صحيح، سنن أبي داود: ١٩٣٥؛ سنن ابن ماجه: ٣٠١٠.

یہ ترتیب مسنون ہے، لیکن اگر تقدیم و تاخیر کر لی تو بھی ٹھیک ہے اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک اس پر کوئی چیز عائد نہیں، یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے، ان کے مدنظر سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں حجِ وداع کے موقع پر خطبہ دے رہے تھے اور لوگ مسائل دریافت کرنے میں لگے تھے، ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے پتہ نہ تھا کہ قربانی سے قبل سر منڈوا لیا تو آپ نے فرمایا: ''کوئی حرج نہیں، اب ذبح کر لو۔'' پھر ایک اور آیا اور کہا: مجھے (مسئلہ کا) علم نہ تھا تو میں نے رمی سے قبل قربانی کر لی ہے، فرمایا: ''اب رمی کر لو اور کوئی حرج نہیں۔'' کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کی تقدیم و تاخیر کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ ''کوئی حرج نہیں اب کر لو۔''[1] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ اگر ترتیب ملحوظ نہ رکھی اور تقدیم و تاخیر کر لی تو اس پر دم ہے انہوں نے آپ کے فرمان: «وَلَا حَرَجَ» ''کوئی حرج نہیں'' کی تاویل یہ کی کہ مراد رفعِ اثم ہے (یعنی اس سے گناہ لازم نہیں ہوا) نہ کہ فدیہ کا عائد نہ ہونا۔

پہلا اور دوسرا تحلُّل

نحر کے دن کنکریاں مارنے اور بال منڈوانے یا چھوٹے کرانے کے ساتھ ہی احرام کی وجہ سے جو پابندیاں عائد تھیں وہ اب ختم ہوئیں، اب وہ خوشبو لگا سکتا اور لباس پہن سکتا ہے، البتہ ابھی جماع نہیں کر سکتا، یہ پہلا تحلُّل ہے، پھر جب مکہ جا کر طوافِ افاضہ کر لے اور یہ طواف حج کا رکن ہے تو جماع بھی اس کے لیے حلال ہو جائے گا، یہ دوسرا تحلُّل ہے (یعنی اب مکمل حلال ہوا)۔

جمرات کو کنکریاں مارنا

(بقول محشی: تین جمرات ہیں، جو سب منیٰ میں ہیں:

① جمرۂ عقبہ، یہ (مکہ سے) منیٰ میں داخل ہونے والے کے بائیں طرف واقع ہے (یعنی مکہ سے آئیں تو پہلا)۔
② جمرۂ وسطیٰ، یہ اس سے آگے (منیٰ کی طرف) اس سے تقریباً ۱۱۶ میٹر کے فاصلہ پر ہے۔
③ جمرۂ صغریٰ، یہ اس سے آگے مسجدِ خیف کے پاس واقع ہے، (اس کے اور جمرہ وسطی کے مابین ۱۵۶ میٹر کا فاصلہ ہے)۔

کنکریاں مارنے کی مشروعیت کی اصل

بیہقی نے سالم بن ابو جعد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام مناسک کو آئے تو شیطان جمرہ عقبہ کے پاس ان کے آڑے آیا تو انہوں نے اسے سات کنکریاں ماریں حتی کہ وہ زمین میں دھنس گیا، پھر اگلے جمرہ کے پاس ظاہر ہوا تو دوبارہ اسے سات کنکریاں دے ماریں، حتی کہ وہ دھنس گیا، پھر تیسرے جمرہ کے پاس بھی آڑے آیا

[1] صحيح البخاري: ١٧٣٦؛ صحيح مسلم: ١٣٠٦.

تو پھر اسے سات کنکریں ماریں حتی کہ دھنس گیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم (سات سات کنکریاں مار کر گویا) شیطان کو رجم کرتے اور اپنے جدامجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کرتے ہو۔[1] یہ بات امام منذری رحمہ اللہ نے نقل کی، اسے ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا اور حاکم نے بھی اور کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

کنکریاں مارنے کی حکمت

ابو حامد غزالی رحمہ اللہ احیاء علوم الدین میں لکھتے ہیں: کنکریاں مارنے کا مقصد حکمِ نبوی کی اتباع اور عبودیت کا اظہار ہونا چاہیے اور یہ امتثالِ امر ہے (یعنی بس حکم ماننا، چاہے حکمت کی سمجھ نہ آئے) اس میں نفس وعقل کے لیے کوئی حظ نہیں، اصل مقصد سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے تشبّہ ہے کہ اس جگہ ابلیس ان کے آڑے آیا تو اللہ کے حکم سے کنکریاں مار کر اسے بھگایا تھا تا کہ اس کے وساوس سے محفوظ رہیں، اگر کسی کے دل میں آئے کہ ان کے تو شیطان آڑے آیا اور وہ اسے دیکھ رہے تھے، لہٰذا کنکریاں مار کر اسے دفعان کیا میرے لیے تو وہ آڑے نہیں ہوا تو جان لو کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے، اسی نے دل میں یہ خیال ڈالا ہے، تا کہ کنکریاں مارنے کا عزم کمزور کرے (اور اس کی اہمیت نظر انداز کرائے) اور خیال پیدا کرے کہ یہ بے فائدہ عمل اور محض کھیل تماشہ ہے (العیاذ باللہ) تو کوشش کے ساتھ اس وسوسہ کو اپنے سے دور کرو اور اس کا طریق یہی ہے کہ کنکریاں مارو، اس سے شیطان کی ناک خاک آلود ہوگی اور اس کا داؤ خالی جائے گا، یہ حقیقت مدِ نظر رکھو کہ تم بظاہر تو اس (علامت) جمرہ کو کنکریاں مار رہے ہو، مگر فی الحقیقت تم انہیں شیطان کے چہرے پر مارتے ہو، تم اسے اللہ کے حکم کے امتثال کے ذریعے ہی پسپا کر سکتے ہو، اس ضمن میں بے جا خیالات کو گھر نہ کرنے دو۔

کنکریاں مارنے کا حکم

جمہور علماء قائل ہیں کہ کنکریاں مارنا واجب ہے (حج کا) رکن نہیں اور اس کے ترک کی تلافی کوئی جانور قربان کر کے ہوسکتی ہے کیونکہ احمد، مسلم اور نسائی نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ میں نے یوم نحر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سواری پر بیٹھے بیٹھے جمرہ کو کنکریاں مار رہے اور کہہ رہے ہیں: ''مجھ سے اپنے مناسک کا اخذ کرلو کیونکہ میں نہیں جانتا شاید اس کے بعد کوئی اور حج نہ کرسکوں۔''[2] سیدنا عبدالرحمن تیمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ وداع میں حکم دیا کہ دانے کے برابر کنکریاں ماریں،[3] اسے طبرانی نے کبیر میں صحیح سند کے ساتھ نقل کیا۔

کتنے حجم اور کسی جنس کی کنکریاں ہونی چاہییں؟

سابق الذکر حدیث سے معلوم ہوا کہ کنکریوں کا حجم دانوں کے برابر ہونا چاہیے، اسی لیے علماء اس کے استحباب کے قائل

---

[1] صحیح، ابن خزیمة: ٢٩٦٧؛ المستدرك للحاكم: ١/ ٤٦٦. [2] صحیح مسلم: ١٢٩٧؛ سنن أبی داود: ١٩٧٠. [3] صحیح، سنن الدارقطنی: ١٩٣٩؛ حسین سلیم اسد نے صحیح قرار دیا ہے۔

ہیں، اگر بڑے حجم کے پتھر مارے تو جمہور کے نزدیک مجزیٔ ہے، البتہ مکروہ ہے، امام احمد رحمہ اللہ ان کے مجزیٔ نہ ہونے کے قائل ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ چنانچہ سلیمان بن عمرو بن احوص ازدی عن امہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جبکہ آپ تب بطنِ وادی میں تھے اور فرما رہے تھے: ''اے لوگو! یہ نہ ہو کہ ایک دوسرے کو مار ڈالو، حصی الخذف کی مثل کنکریاں لو۔''[1] (حصی الخذف یعنی جو ہتھیلی پر دانے کے برابر کنکری رکھ کر عرب کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مارتے تھے) اسے ابو داود نے نقل کیا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: میرے لیے کنکریاں لاؤ۔'' تو میں حصی الخذف کی مثل کنکریاں لایا، جب انہیں آپ کے ہاتھ پر رکھا تو فرمایا: ''ہاں اسی حجم کی، خبردار دین میں غلو سے بچو کیونکہ سابقہ امتوں کو غلو نے ہلاک کر ڈالا تھا۔''[2] اسے احمد اور نسائی نے نقل کیا اور اس کی سند حسن ہے۔ جمہور نے ان احادیث کو ندب اور اولویت پر محمول کیا ہے، اس امر پر وہ متفق ہیں کہ اس ضمن میں صرف پتھر ہی استعمال ہوں گے۔ لوہا، سیسہ یا کوئی اور اس طرح کی چیز مارنا جائز نہیں، احناف نے ان کی مخالفت کی اور ہر اس چیز کے ساتھ مارنا جائز قرار دیا جو زمین کی جنس سے ہے، مثلاً: ڈھیلے، اینٹ کے ٹکڑے اور مٹی وغیرہ کیونکہ رمی کے بارے میں وارد احادیث مطلق ہیں اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کا فعل افضلیت پر محمول ہے نہ کہ تخصیص پر (کہ صرف پتھر کی کنکریاں ہی مارنا ہیں) اول رائے کی ترجیح اس امر سے ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود انہیں استعمال کیا اور حصی الخذف کی مثل کنکریاں مارنے کا حکم دیا، لہٰذا یہ غیر حصی (یعنی غیر پتھریلی کنکریاں) کو متناول نہیں، البتہ اسی کی دیگر سب انواع کو متناول ہے۔

کنکریاں کہاں سے اکٹھی کی جائیں؟

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما مزدلفہ سے انہیں اکٹھی کرتے تھے، سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی یہی کیا اور کہا کہ سلف یہیں سے کنکریاں لے جاتے تھے، امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے مستحب کہا، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک جہاں سے چاہے لے جائے اور یہی عطاء اور ابن منذر رحمہ اللہ کا قول ہے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابق الذکر حدیث کے مدنظر جس میں ہے کہ آپ نے انہیں فرمایا: میرے لیے کنکریاں اکٹھی کرو۔'' اور جگہ کی تعیین نہ کی تھی، وہیں لوگوں کی ماری ہوئی کنکریاں لے کر (دوبارہ دے) مارنے کا بھی جواز ہے، البتہ حنفیہ، شافعیہ اور امام احمد کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ بغیر کراہت کے اس کے جواز کے قائل ہیں اور فرماتے ہیں: لوگوں کی ماری ہوئی کنکریاں دوبارہ مارنا جائز ہے اور اسی طرح سوار ہو کر کنکریاں مارنا بھی جائز ہے۔ لوگوں کی ماری ہوئی کنکریاں استعمال کرنا اس لیے جائز ہے کہ قرآن وسنت میں اس سے منع نہیں کیا گیا۔ پھر کہا: اگر کہا جائے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جمرات کی کنکریاں جو قبول کر لی جاتی ہیں وہ اٹھا لی جاتی ہیں اور جو قبول نہیں کی جاتی وہ پڑی رہ جاتی ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو وہاں پہاڑ بن جائے اور راستہ رُک جائے۔ تو ہم کہیں گے: بات درست ہے مگر پھر کیا ہوا، اگر عمرو سے پھینکی ہوئی کنکری قبول نہیں ہوئی تو عنقریب زید

---

[1] حسن، سنن أبی داود: ١٩٦٦. [2] صحیح، سنن نسائی: ٥/ ٢٦٨؛ مسند أحمد: ١/ ٣٤٧.

سے قبول کر لی جائے گی، بسا اوقات ایک آدمی صدقہ کرتا ہے جسے اللہ قبول نہیں کرتا مگر وہی صدقہ اگر کوئی دوسرا آدمی کرتا ہے تو قبول کر لیتا ہے۔

رہا سوار ہو کر رمی کرنا تو اس کی دلیل سیدنا قدامہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی کے دن جمرہ عقبہ کو رمی کرتے دیکھا، آپ اپنی سرخ وسفید رنگ کی اونٹنی پر سوار تھے۔ (آپ کے لیے) نہ کسی کو مارا جاتا نہ دور کیا جاتا اور نہ ادھر ادھر ہونے کی صدا لگائی جاتی۔[1]

کنکریوں کی تعداد

ان کی مجموعی تعداد ستر یا انچاس ہے، سات یوم نحر جمرہ عقبہ کو ماری جائیں گی اور اکیس گیارہ ذوالحجہ کو، تینوں جمرات کو سات سات اور اسی طرح اکیس تینوں کو بارہ تاریخ میں اور اکیس ہی تیرہ تاریخ میں تو اس حساب سے ان کی کل تعداد ستر بنی، اگر تیرہ تاریخ کو نہ مارے تو یہ جائز ہے، تب ان کی کل تعداد انچاس بنے گی، امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ اگر پانچ کنکریاں ماریں تو یہ مجزیٔ ہے، امام عطاء رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا، امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اگر چھ ماریں تو یہ بھی مجزیٔ ہے، امام سعید بن مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ (سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج ادا کر کے جب واپس ہوئے تو کسی نے کہا: میں نے چھ کنکریاں ماریں، بعض نے سات کہا تو کسی نے کسی پر اعتراض نہ کیا۔[2]

رمی کے ایام

یہ تین یا چار ایام ہیں: یوم نحر (یعنی دسویں ذوالحجہ) اور دو یا تین دن اس کے بعد، قرآن میں ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى﴾(البقرۃ: ۲۰۳)

''اللہ کا ان گنتی کے دنوں میں ذکر کرو، اگر کوئی جلدی کرے اور دو ہی دن میں (تینوں ایام کی کنکریاں مار کر چل دے) تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو بعد تک (یعنی تیرہ تاریخ تک) ٹھہرا رہے تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔''

یوم نحر میں کنکریاں مارنا

اس کا مختار وقت چاشت کا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز چاشت کے وقت کنکریاں ماری تھیں۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل کے کمزوروں (یعنی خواتین اور بچوں) کو پہلے (یعنی رات کے پچھلے پہر) آگے بھیجا اور فرمایا: ''تم جمرہ عقبہ کو کنکریاں نہ مارنا، مگر طلوع آفتاب کے بعد۔''[4] اسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دے کر نقل کیا،

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ۳۰۳۵؛ سنن نسائی: ۳۰۶۳. [2] السنن الكبرى للنسائی: ۴۰۶۹. [3] صحیح مسلم: ۱۲۹۹؛ سنن أبی داود: ۱۹۷۱. [4] صحیح، سنن ترمذی: ۸۹۳.

اگر دن کے آخر تک مؤخر کیا تو یہ جائز ہے۔ بقول امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ اہلِ علم کا اجماع ہے کہ جس نے نحر کے روز غروبِ آفتاب سے قبل (کسی بھی وقت) کنکریاں مارلیں تو اس نے وقت کے اندر ہی ماریں، اگر چہ (مؤخر کرنا) مستحب نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ میں یوم نحر میں کسی نے کہا: میں نے شام ہو جانے کے بعد کنکریاں ماری ہیں تو آپ نے فرمایا: ''کوئی حرج نہیں۔''[1] اسے بخاری نے نقل کیا۔

کیا رات تک اسے مؤخر کرنا جائز ہے؟

اگر کوئی عذر ہے تو رات تک اسے مؤخر کرنا جائز ہے، کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے نافع سے روایت کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی زوجہ صفیہ (بنت ابو عبید ثقفی رحمہا اللہ) کی ایک بیٹی مزدلفہ میں حائضہ ہوگئی تو وہ اور صفیہ وہیں رکی رہیں اور یوم نحر کو غروب کے بعد منیٰ میں آئیں تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں اسی وقت کنکریاں مارنے کا کہا اور کچھ فدیہ وغیرہ عائد نہ کیا، اگر عذر نہیں تب امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تاخیر مکروہ ہے اور اگر رات ہوگئی اور ابھی تک کنکریاں نہیں مار سکا تو بجائے رات کے اگلے دن زوال کے بعد مارے (یعنی دو دنوں کی اکٹھی)۔

خواتین، بوڑھوں، کمزور لوگوں اور عذر والوں کو یوم نحر کی رات کے پچھلے پہر کنکریاں مار لینے کی رخصت

بالاجماع کسی کو جائز نہیں کہ رات (یعنی نویں اور دسویں کی درمیانی) کے دوسرے پہر سے قبل کنکریاں مارے۔ عورتوں، بچوں، کمزوروں، اصحابِ اعذار اور اونٹوں کے چرواہوں (یعنی جن کی کوئی ذمہ داری ہے، جو لازماً انجام دینی ہے) کو رخصت ہے کہ وہ جمرہ عقبہ کو رات کے دوسرے نصف سے کنکریاں مارنا شروع کر دیں، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو شبِ نحر بھیجا، جنہوں نے فجر سے قبل کنکریاں ماریں، پھر طوافِ افاضہ کرنے چلی گئیں۔[2] اسے ابو داود اور بیہقی نے نقل کیا اور کہا: اس کی سند صحیح ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے چرواہوں کو اجازت دی کہ وہ رات کو ہی کنکریاں مارلیں۔[3] اسے بزار نے نقل کیا اور اس میں مسلم بن خالد زنجی ہے جو ضعیف ہے، عروہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوم نحر کو سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ مزدلفہ سے طوافِ افاضہ کے لیے جلد چل پڑیں تا کہ وہ (رات کو ہی کنکریاں مار کر) صبح کی نماز مکہ میں پڑھیں، یہ ان کی باری کا دن تھا تو آپ نے پسند کیا کہ وہ آپ کے ہمراہ رہیں۔[4] اسے امام شافعی اور امام بیہقی رحمہما اللہ نے نقل کیا۔ عطاء سے منقول ہے کہ مجھے ایک شخص نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے خبر دی کہ انہوں نے رات کو کنکریاں ماریں جس پر اس نے اعتراض کیا تو بولیں کہ ہم عہدِ نبوی میں یہی کیا کرتی تھیں۔[5] اسے ابو داود نے نقل کیا، امام طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: شافعی نے سیدہ ام سلمہ اور اسماء رضی اللہ عنہما کی حدیثوں سے آدھی رات کے بعد طوافِ افاضہ کر لینے کے جواز پر استدلال کیا ہے، ابن حزم رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ رات کو کنکریاں مارنے کی اجازت

---

[1] صحیح البخاری: ۱۷۳۵. [2] ضعیف، سنن أبی داود: ۱۹۴۲؛ السنن الکبری للبیهقی: ۵/ ۱۲۳. [3] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۳۷۹. [4] السنن الکبری للبیهقی: ۵/ ۱۳۳. [5] صحیح، سنن أبی داود: ۱۹۴۳.

خواتین کے ساتھ مخصوص ہے، مردوں کے لیے یہ رخصت نہیں، ان کے بوڑھے بھی رات کو نہیں ماریں گے، لیکن حدیث سے دلالت ملتی ہے کہ صاحبِ عذر کے لیے رات کو ہی کنکریاں مار لینے کا جواز موجود ہے، ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سنت یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب کے بعد ہی کنکریاں مارے جیسے نبی کریم ﷺ نے کیا، فجر سے قبل رمی کا جواز نہیں، کیونکہ ایسا کرنے والا سنت کا مخالف ہوگا، لیکن جس نے رات کے وقت کنکریاں مارلیں، اس پر اعادہ نہیں کیونکہ کسی کو نہیں جانتا جو اسے غیر مجزیٔ کہتا ہو۔

جمرہ کو بلندی سے کنکریاں مارنا

اسود کہتے ہیں: میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ عقبہ کے جمرہ کو بلندی سے کنکریاں مار رہے ہیں، عطاء سے اس بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا: اس میں حرج نہیں، ان دونوں روایتوں کو سعید بن منصور نے نقل کیا۔

نحر کے بعد اگلے تین ایام میں رمی کا وقت

ان ایام میں رمی کا مختار وقت زوال تا غروبِ آفتاب ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زوال کے قریب یا اس کے (فوری) بعد کنکریاں ماریں۔ [1] اسے احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا اور حسن قرار دیا، بیہقی نے نافع سے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے تھے: ہم ان دنوں میں زوال کے بعد ہی رمی کریں گے، اگر رات تک اسے موخر کرلیا تو یہ مکروہ سمجھا گیا ہے، رات کو اگر ماریں تو یہ اگلے دن کے طلوع آفتاب سے قبل تک ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تیرہ تاریخ کی رمی قبل از زوال کرنا بھی جائز قرار دیا ہے، ان کے پیشِ نظر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک ضعیف حدیث ہے، کہتے ہیں کہ جب نفر (یعنی منیٰ سے روانگی) کا آخری دن آجائے تو رمی اور (منیٰ سے) جانا حلال ہوجاتا ہے۔

ایامِ تشریق میں رمی کے بعد وقوف اور دعا

مستحب ہے کہ رمی کے بعد قبلہ رخ ہوکر دعا کرے اور اپنے اور مومن بھائیوں کے لیے استغفار کرے، چنانچہ احمد اور بخاری نے سالم عن عبداللہ بن عمر عن ابیہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ جب پہلے جمرہ کو کنکریاں مارتے جو مسجد کے ساتھ ہے تو ہر کنکری مارنے کے ساتھ اللہ اکبر کہتے، پھر بطنِ وادی میں بائیں طرف ہوتے اور قبلہ رو ہوکر ٹھہر جاتے اور ہاتھ اٹھائے دعا فرماتے اور لمبا عرصہ اسی حالت میں رہتے، پھر دوسرے جمرہ کو سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے، پھر بطنِ وادی کی جانب بائیں طرف آتے اور قبلہ رو ہوکر ہاتھ اٹھائے وقوف کرتے اور دعا کرتے، پھر اس جمرہ کو جو گھاٹی کے پاس ہے آئے اور ہر دفعہ تکبیر کہہ کر سات کنکریاں ماریں، پھر واپس لوٹ آئے اور اس مرتبہ وقوف نہ فرمایا۔ [2] گویا دو جمروں کو کنکریاں مارنے کے بعد وقوف کیا، جمرہ عقبہ کے بعد نہیں، علماء نے اس کے لیے ضابطہ یہ وضع کیا ہے کہ ہر ایسی رمی جو کسی دن کی آخری رمی ہے، کے بعد وقوف نہیں دیگر کے بعد ہے، ابن ماجہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ جب

---

[1] صحیح، سنن ترمذی: ۸۹۸؛ سنن ابن ماجہ: ۳۰۵۴. [2] صحیح البخاری: ۱۷۵۱، ۱۷۵۳.

جمرہ عقبہ کو کنکریاں مار لیتے تو اس کے بعد ٹھہرتے نہ تھے، بلکہ واپس آجاتے۔[1]

رمی جمرات میں ترتیب

نبی کریم ﷺ کے بارے میں ثابت یہ ہے کہ اس جمرہ سے ابتدا کی جو منیٰ کی طرف ہے، پھر (مکہ کی طرف) اس سے اگلا، پھر (تیسرا) جو گھاٹی کے پاس ہے اور آپ کی عمومی ہدایت تھی: ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ)) ''مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو۔'' اس کے ساتھ آئمہ ثلاثہ نے اس مذکورہ ترتیب کے شرط ہونے پر استدلال کیا، جیسے نبی کریم ﷺ کا فعل رہا، احناف کے نزدیک ترتیب کی رعایت سنت ہے (شرط نہیں)۔

ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہنے اور دعا کا کرنے استحباب اور اسے اپنی انگلیوں کے درمیان رکھنا

سیدنا ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم جمرہ عقبہ کی رمی کے وقت یہ دعا مانگا کرتے تھے: ''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ حَجًّا مَبْرُوْرًا وَذَنْبًا مَغْفُوْرًا'' اے اللہ! اسے حجِ مبرور بنا اور سب گناہ معاف فرما۔ ابراہیم (نخعی) رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سلف جمرہ عقبہ کی رمی کے وقت یہ مذکورہ دعا کرنا پسند کرتے تھے، ان سے کہا: آپ ہر جمرہ کی رمی کے وقت یہ دعا مانگتے ہیں؟ کہا: ہاں! امام عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب کنکری مارو تو اللہ اکبر کہو اور تکبیر کنکری مارنے کے بعد ہو، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے، فتح الباری میں ہے کہ اس امر پر اجماع ہوا کہ جس نے تکبیر نہ کہی اس پر کوئی فدیہ وغیرہ عائد نہیں، سلمان بن احوص رحمہ اللہ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو جمرہ عقبہ کے پاس سوار دیکھا اور آپ کی انگلیوں کے درمیان کنکری دیکھی اور لوگ بھی آپ کے ہمراہ کنکریاں مار رہے تھے۔[2] اسے ابوداود نے نقل کیا۔

کنکریاں مارنے میں نیابت

جسے کوئی عذر لاحق ہے جو بذات خود کنکریاں مارنے سے اس کے لیے مانع ہے، مثلاً: مرض وغیرہ تو وہ کسی کو اپنا قائم مقام بنا سکتا ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حج ادا کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے تو بچوں کی طرف سے ہم نے تلبیہ کہا اور کنکریاں ماریں۔[3] اسے ابن ماجہ نے نقل کیا۔

منیٰ میں رات گزارنا

آئمہ ثلاثہ کے نزدیک تینوں راتوں یا (کم از کم) گیارہ اور بارہ تاریخ کی راتیں منیٰ میں گزارنا واجب ہے، احناف اسے

---

[1] صحیح، سنن ابن ماجه: ٣٠٣٣. [2] صحیح، سنن أبي داود: ١٩٦٧. [3] ضعیف، سنن ترمذي: ٩٢٧؛ سنن ابن ماجه: ٣٠٣٨.

سنت قرار دیتے ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب کنکریاں مار لو تو جہاں چاہے رات گزارو۔[1] اسے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا، مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے: حرج نہیں کہ رات کے اول حصہ میں مکہ میں ہو اور آخری حصہ میں منیٰ آجائے یا اول شب منیٰ میں رہے، پھر مکہ میں آجائے، امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس نے منیٰ میں راتیں نہ گزاریں اس نے برا کیا، مگر اس پر کوئی چیز عائد نہیں، اصحاب اعذار مثلاً: اونٹوں کے چرواہوں اور ماشکیوں وغیرہم سے منیٰ میں شب باشی ساقط ہونے پر اتفاق ہے اور اس ضمن میں ان پر کچھ عائد نہیں، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حجاج کو زمزم پلانے کی ذمہ داری کی وجہ سے رات مکہ میں گزارنے کی اجازت لی تھی، جو آپ نے مرحمت فرمائی،[2] اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا، سیدنا عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی کہ وہ راتیں منیٰ میں نہ گزاریں۔[3] اسے اصحابِ سنن نے تخریج کیا اور ترمذی نے حکمِ صحت لگایا۔

منیٰ سے کب واپسی ہو؟

آئمہ ثلاثہ کے نزدیک حاجی بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مار کر غروبِ آفتاب سے قبل منیٰ سے واپس جا سکتا ہے، لیکن غروب کے (فوری) بعد واپسی مکروہ ہے، سنت کی مخالفت کی وجہ سے لیکن اس پر کوئی فدیہ وغیرہ عائد نہ ہوگا۔

حج میں قربانی کرنا

یہ چوپاؤں میں سے حرم کی طرف اہداء کیا جائے اللہ کے تقرب کی نیت سے، قرآن میں ہے:

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾(الحج: ٣٦، ٣٧)

”قربانی کے بڑے جانور ہم نے انہیں تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے، تمہارے لیے ان میں بڑی خیر ہے، سو ان پر اللہ کا نام لو، اس حال میں کہ گھٹنا بندھے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان سے کچھ کھاؤ اور قناعت کرنے والے کو کھلاؤ اور مانگنے والے کو بھی، اسی طرح ہم نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ تم شکر کرو، اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون اور لیکن اسے تمہاری طرف سے تقوی پہنچے گا۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: قربانیاں اہداء کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ

---

① مصنف ابن ابی شیبہ: ٤/ ٣٨٤. ② صحیح البخاری: ١٧٤٥؛ صحیح مسلم: ١٣١٥. ③ صحیح، سنن أبی داود: ١٩٧٥؛ سنن ترمذی: ٩٥٥؛ سنن ابن ماجہ: ٣٠٣٦.

قربان کیے تھے۔[1] اور آپ کی ہدی تطوع تھی (یعنی رضا کارانہ) اس ضمن میں افضل کی بابت علماء کا اجماع ہے کہ ہدی جانور میں سے ہی ہوگی جو یہ ہیں: اونٹ، گائے اور بکریاں (نر اور مادہ) ان کا اجماع ہے کہ افضل اونٹ ہے، پھر گائے، پھر بکرا، البتہ اونٹ فقراء کی نسبت انفع ہے، اسی طرح گائے بکری سے، ایک شخص کی نسبت سے افضل کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ اونٹ کا ساتواں حصہ قربان کرے (یعنی اونٹ میں حصہ ڈال لے) یا گائے میں یا پھر بکری ذبح کرے بظاہر اس میں اعتبار اس چیز کا ہے جو فقرا کے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔

کم از کم مجزئ ہدی

آدمی کو اختیار ہے کہ حرم کی طرف جو جانور چاہے اِہداء کرے، نبی کریم ﷺ نے سو اونٹ اہداء کیے تھے اور آپ کا یہ اہداء تطوع تھا، ایک فرد سے کم از کم جائز ایک بکرا/ بکری ہے یا اونٹ اور گائے کا ساتواں حصہ، اونٹ اور گائے سات افراد کی طرف سے کفایت کریں گے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حج ادا کیا تو اونٹ اور گائے سات سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کیے،[2] اسے احمد اور مسلم نے نقل کیا، ان شرکاء کے بارے میں شرط نہیں کہ سب کی نیت وغرض تقرب کی ہی ہو، بلکہ اگر بعض کا ارادہ وغرض گوشت کے حصول کی ہو تو بھی جائز ہے، البتہ حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے، ان کی رائے میں سب کی نیت تقرب الی اللہ کی ہی ہونی چاہیے۔

اونٹ کی ہدی کب واجب ہوگی؟

اونٹ کی قربانی واجب نہ ہوگی، مگر جب طوافِ زیارت حالتِ جنابت میں یا حیض ونفاس کی حالت میں کیا ہو یا وقوفِ عرفہ سے اور حجامت سے پہلے جماع کر لیا ہو یا اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی ہو جو اونٹ نہ پائے وہ سات بکریاں قربان کر دے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: میرے ذمہ اونٹ کی قربانی ہے اور قیمت بھی پاس ہے، مگر مل نہیں رہا، فرمایا: ''تم سات بکریاں خرید کر ذبح کرو۔''[3] اسے احمد، اور ابن ماجہ نے بسند صحیح نقل کیا۔

ہدی کی اقسام

ہدی مستحب اور واجب کی طرف منقسم ہے، مستحب ہدی حجِ افراد اور عمرۂ افراد کرنے والے کے لیے ہے جبکہ واجب ہدی درج ذیل کے لیے ہے:

①، ② حجِ تمتع اور حجِ قران کرنے والوں پر ہدی واجب ہے۔

③ اس پر بھی جو حج کے واجب امور میں سے کسی کا ترک کر دے، مثلاً: رمیِ جمار کا ترک، میقات سے احرام باندھنے کا ترک اور وقوفِ عرفہ کے ضمن میں دن اور رات کو جمع کر دیا یا مزدلفہ یا منیٰ میں رات نہ گزاری یا طوافِ وداع نہ کیا۔

---

① صحیح البخاری: ۱۷۱۸؛ صحیح مسلم: ۱۲۱۸. ② صحیح مسلم: ۱۳۱۸. ③ ضعیف، سنن ابن ماجہ: ۳۱۳۶.

④ ہر اس پر بھی جس سے احرام کی بندشوں کے منافی کوئی کام سرزد ہو گیا، ماسوائے جماع کے مثلاً: خوشبو لگالی یا بال کٹوا لیے۔
⑤ جس نے حرم کی حرمت کے منافی کوئی کام کیا، جیسے: درخت کاٹ لیا یا شکار سے متعرض ہوا، جیسا کہ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ ہوا۔

ہدی کی شروط

اس ضمن میں درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:
① قربانی کا جانور دو دانتا ہو اگر وہ بھیڑ نہیں، اگر بھیڑ ہے تب جذع بھی جائز ہے، جذع جو چھ ماہ کا ہے مگر خوب موٹا تازہ ہے، دو دانتا اونٹ وہ جو پانچ برس کا ہو چکا ہو اور گائے جو دو برس کی ہو گئی ہو جبکہ بکری/بکرا دو دانتا وہ ہو گا جو کامل ایک برس کا ہو چکا ہے۔
② صحیح و سالم ہو، کانا، لنگڑا یا خارش زدہ اور دبلا و کمزور نہ ہو، حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سلف نے کہا: اگر کسی نے اونٹ یا کوئی اور قربانی جب خریدی تو وہ صحیح و سالم تھی، بعد ازاں اس طرح کا کوئی سقم پیدا ہو گیا تب حرج نہیں وہ قربان کر دے، جائز ہو گی، اسے سعید بن منصور نے نقل کیا۔

ہدی کے لیے عمدہ جانور پسند کرنے کا استحباب

امام مالک رحمہ اللہ نے ہشام بن عروہ سے نقل کیا کہ ان کے والد اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے: تم میں سے کوئی اللہ کی طرف ایسے جانور کا اِہداء نہ کرے جسے وہ اپنے عزیز دوست کو دینے میں شرم محسوس کرے، اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اسے عمدہ ہدیہ پیش کیا جائے، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ کی طرف ایک اونٹنی پر سوار ہو کر جا رہے تھے، انہیں وہ اچھی لگی تو اس سے اتر آئے اور اسے حج کے لیے ہدی بنا لیا۔

ہدی کا اِشعار اور تقلید

اِشعار یہ ہے کہ اونٹ یا گائے کی کوہان کی ایک جانب پر چیرا لگا دے، حتی کہ خون بہے اور اسے وہ اس کے حج کی ہدی ہونے کی علامت بنائے تاکہ کوئی اس سے متعرض نہ ہو، جبکہ تقلید سے مراد اس کے گلے میں چمڑے وغیرہ کا پٹہ ڈال دینا اس کے حج کی قربانی کی علامت ہونے کے بطور ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن نو ہجری کے حج کے موقع پر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک ریوڑ بطورِ ہدی روانہ کیا تھا اور ان کے گلے میں پٹے باندھے تھے۔[1]
اسی طرح حدیبیہ کے عمرہ کی قربانیوں کو پٹے بھی باندھے اور اشعار بھی کیا تھا،[2] ماسوائے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے عام علماء نے اشعار مستحب قرار دیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: ١٧٠١؛ صحیح مسلم: ١٣٢١. [2] صحیح البخاری: ١٦٩٤، ١٦٩٥.

ہدی کے اِشعار اور تقلید کی حکمت

اس کی حکمت اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم، ان کا اظہار اور لوگوں کو اِعلام کہ یہ قربانیاں ہیں جو اپنے محل کی طرف لے جائی جارہی ہیں۔

ہدی پر سواری کرنا

یہ جائز ہے، اسی طرح کوئی اور انتفاع بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾(الحج:۳۳)

''ایک مدت تک ان سے مستفید ہولو، پھر کعبہ کی طرف لے جا کر قربان کردو۔''

ضحاک اور عطاء نے کہا: منافع سے مراد بوقتِ ضرورت ان پر سوار ہونا ہے، اسی طرح ان کی اون اور دودھ سے انتفاع، اجل مسمی سے مراد ہے کہ ان کے گلوں میں پٹے باندھ کر انہیں ہدی بنالیا جائے ﴿مَحِلُّهَآ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ کے بارے میں کہا: یعنی یومِ نحر جب منیٰ میں انہیں ذبح کیا جائے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نظر ایک شخص پر پڑی جو اونٹ ہانک رہا تھا اور خود پیدل چل رہا تھا، آپ نے فرمایا: ''اس پر سوار ہو جاؤ'' اس نے کہا: یہ حج کی ہدی ہے، آپ نے فرمایا: ((اِرْکَبْهَا وَيْلَكَ)) یعنی ڈانٹ کر فرمایا: ''اس پر سوار ہو جاؤ۔''[1] اسے بخاری، مسلم، ابو داود اور نسائی نے نقل کیا، یہ امام احمد، امام اسحاق اور امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور مذہب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اشد ضرورت ہو تو ان پر سوار ہو جاؤ۔

ذبح کا وقت

اس بارے میں اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک انہیں قربان کرنے کا وقت یوم نحر اور ایامِ تشریق ہیں (یعنی دس تا تیرہ ذوالحجہ تک) احمد کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((وَكُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ ذَبْحٌ)) ''کسی بھی یومِ تشریق میں حج کی قربانی ذبح کی جاسکتی ہے۔''[2] اور یہ ایام نکل گئے تو اس کی قضا دینا ہوگی، مالک اور احمد کے ہاں ذبح کا وقت چاہے واجب قربانی ہو یا نفل، ایامِ نحر ہیں، یہی تمتع اور قران کی ہدی کی نسبت احناف کی رائے ہے۔ البتہ نذر، کفارات اور نفل قربانی کسی بھی وقت ذبح کی جاسکتی ہے۔

ذبح کی جگہ

حج کی قربانی چاہے واجب ہو یا نفل، حدودِ حرم کے اندر ہی ذبح کرنا ہوگی، اہداء کرنے والا حرم کی کسی بھی جگہ ذبح کرسکتا ہے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''منیٰ سارا مذبح ہے اور مزدلفہ سارا موقف ہے اور مکہ کے تمام

---

[1] صحيح البخاري: ١٦٨٩، صحيح مسلم: ١٣٢٢. [2] صحيح، مسند أحمد: ١٦٧٠١، ابن حبان: ٣٨٥٤.

راستے (اور جگہیں) مذبح ہیں۔"[1] اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے نقل کیا، حاجی کی نسبت اولیٰ یہ ہے کہ وہ منیٰ میں ذبح کرے جبکہ معتمر مروہ کے پاس ذبح کرے کیونکہ یہ ان دونوں کے لیے تحلّل کی جگہ ہے، امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: انہیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے منیٰ میں فرمایا: "یہ منحر ہے اور منیٰ سارا ہی منحر ہے" جبکہ عمرہ میں مروہ کے بارے میں فرمایا تھا: "یہ منحر ہے اور مکہ کے تمام راستے منحر ہیں۔"[2]

اونٹ کو نحر کرنے اور دیگر جانوروں کے ذبح کا استحباب

مستحب ہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کیا جائے، اگلی بائیں ٹانگ بندھی ہو جبکہ یہ مندرجہ ذیل احادیث کے پیش نظر ہے:

① مسلم نے زیاد بن جبیر سے روایت نقل کی کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو دیکھا جو اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا ہے تو کہنے لگے: اسے اٹھا کر اس کی ٹانگیں باندھو کیونکہ یہ تمہارے نبی کی سنت ہے۔[3]

② سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ اونٹوں کو کھڑا کر کے ان کا بایاں پاؤں باندھ کر نحر کیا کرتے تھے، اسے ابوداود نے نقل کیا۔

③ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت: ﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ﴾ (الحج: ٣٦)

"سو ان پر اللہ کا نام لو اس حال میں کہ گھٹنا بندھے کھڑے ہوں۔"

کے بارے میں کہتے ہیں: "أَيْ قِيَاماً عَلٰى ثَلَاثٍ" یعنی تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے (اور ایک باندھ کر)۔ اسے حاکم نے نقل کیا۔

گائے اور غنم کو لٹا کر ذبح کرنا مستحب ہے، اگر انہیں نحر (یعنی کھڑا کر کے) اور اونٹ کو ذبح کرنا، بعض نے کہا: مکروہ ہے اور بعض کے مطابق کوئی کراہت نہیں، یہ بھی مستحب ہے کہ خود ذبح کرے اگر اچھے طریقہ سے کر سکتا ہے، وگرنہ مندوب یہ ہے کہ موقع پر موجود ہو، قصاب کو (اگر اس سے ذبح کرائے اور گوشت بنوائے) اس کی مزدوری قربانی سے نہ دے کیونکہ یہ جائز نہیں البتہ بطور تصدّق دینے میں حرج نہیں، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اپنی نگرانی میں آپ کے اونٹ ذبح کراؤں اور ان کی کھالیں اور جھولے تقسیم کر دوں اور حکم دیا کہ قصابوں کو ان میں سے (بطور اجرت) کچھ نہ دوں۔[4] فرمایا: "ان کی مزدوری ہم اپنے پاس سے دیں گے۔"[5] اسے جماعت نے نقل کیا، حدیث سے کسی سے ذبح کرا لینے کے جواز کی دلالت ملی اور قربانی کا گوشت، کھال اور جھولا تقسیم کر دینے کی (بقول محشی آئمہ حج کی قربانی کی کھال اور دیگر اجزاء فروخت کرنے کے عدم جواز پر متفق ہیں) اور یہ کہ قصاب کو بطورِ اجرت اس میں سے کچھ دینا جائز نہیں، حسن سے منقول ہے کہ قصاب کو کھال دے دینے میں حرج نہیں۔

---

① صحيح، سنن أبي داود: ١٩٣٧؛ سنن ابن ماجه: ٣٠٤٨. ② المؤطا امام مالك: ١/ ٣٩٣. ③ صحيح مسلم: ١٣٢٠. ④ صحيح البخاري: ١٧١٧. ⑤ صحيح، سنن أبي داود: ١٧٦٩؛ سنن ابن ماجه: ٣٠٩٩.

قربانی کا گوشت خود بھی کھانا

اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ﴾ ''سو ان میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو کھلاؤ۔'' (الحج: ۲۸) یہ امر بظاہر واجب اور نفل ہدی دونوں کو متناول ہے، فقہائے امصار کے مابین اس بابت اختلافِ آراء ہے، امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ حجِ تمتع، حجِ قران اور نفل ہدی کا گوشت خود بھی کھانے کے جواز کی رائے رکھتے ہیں دیگر سے نہ کھائے، امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: فدیۃ الاذی (یعنی کسی مجبوری کی وجہ سے مناسکِ حج کے برخلاف کوئی کام کر لینے کی پاداش میں عائد قربانی) شکار کر لینے کی پاداش میں عائد قربانی نیز مساکین کے لیے نذر کی قربانی اور نفلی قربانی کا گوشت نہ کھائے، اگر قبل ازمحل ذبح کرنی پڑ جائے (باقی کھا سکتا ہے) امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہدی کا گوشت کھانا جائز نہیں واجب دم کی طرح، شکار کرنے کے بدلے، افسادِ حج اور تمتع وقران کی اسی طرح نذر کی قربانی کا بھی، لیکن جو نفلی قربانی کی ہے، اس کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور ہدیہ وتصدق بھی کر سکتا ہے۔

کتنی مقدار میں کھائے؟

اس کی کوئی حد وقید نہیں، اسی طرح ہدیہ اور تصدق کرنے کی بھی، بعض نے کہا: نصف تصدق کر دے اور نصف اپنے لیے رکھ لے، بعض نے کہا: تین حصے کر لے ایک اپنے لیے، ایک بطورِ ہدیہ دینے اور ایک حصہ تصدق کرنے کے لیے۔

حلق (سر منڈوانا) یا تقصیر (بال چھوٹے کرانا)

کتاب وسنت اور اجماع سے یہ دونوں جائز وثابت ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ﴾(الفتح:۲۷)

''یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں اپنے سر منڈاتے ہوئے اور کتراتے ہوئے، ڈرتے نہیں ہو گے۔''

بخاری اور مسلم نے نبی کریم ﷺ کا فرمان نقل کیا کہ ''اللہ سر منڈوانے والوں پر رحم کرے۔'' عرض کی گئی: بال کٹوانے والوں پر؟ فرمایا: ''اللہ سر منڈوانے (والوں) پر رحم کرے۔'' عرض کی گئی: بال کٹوانے والوں پر؟ فرمایا: ''اللہ سر منڈوانے (والوں) پر رحم کرے۔'' عرض کی گئی: اور بال کٹوانے والوں پر؟ فرمایا: ''بال کٹوانے والوں پر بھی''[1] دونوں کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اور صحابہ کے ایک گروہ نے حلق کرایا تھا، جبکہ بعض صحابہ نے تقصیر کرائی تھی، حلق سے مراد استرے

---

[1] صحیح البخاری: ۱۷۲۷؛ صحیح مسلم: ۱۳۰۱.

وغیرہ کے ساتھ سر کے بال صاف کرا دینا یا (اگر بال کم ہیں تو) اکھیڑ دینا (موچنے سے) اگر اس ضمن میں (کم از کم) تین بالوں پر اقتصار کیا تو بھی جائز ہے، جبکہ تقصیر سے مراد ہے کہ انگلیوں کے پوروں کے بقدر بال چھوٹے کرائے، جمہور فقہاء نے اس کے حکم کے بارے میں اختلاف کیا تو اکثر کے نزدیک یہ واجب ہے، اس کے ترک کی صورت میں دم واجب ہوگا، شوافع کی رائے میں یہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

بال کٹوانے یا سر منڈوانے کا وقت

اس کا وقت دسویں ذوالحجہ کو کنکریاں مارنے کے بعد ہے، اگر اس کے ہمراہ قربانی ہے تو پہلے اسے ذبح کرے، پھر حجامت کرائے، معمر بن عبداللہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب منیٰ میں اپنی ہدی ذبح کی تو مجھے حکم دیا کہ آپ کے سر پر استرا پھیروں۔[1] اسے احمد اور طبرانی نے نقل کیا، عمرہ میں اس کا وقت سعی سے فراغت کے بعد ہے اور جس کے ہمراہ قربانی ہے وہ پہلے اسے ذبح کرے، واجب ہے کہ قربانی حرم کی حدود میں ذبح کرے، امام ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک ایامِ نحر (یعنی دس تا تیرہ ذوالحجہ) میں، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی یہی ہے جبکہ شافعی، محمد بن حسن اور احمد سے مشہور روایت یہ ہے کہ حلق و تقصیر حرم میں ایامِ نحر سے دیگر دنوں میں واجب ہے، اگر حلق کو ایامِ نحر سے موخر کیا تو یہ جائز ہے اور اس پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی، اس ضمن میں مستحب یہ ہے کہ داہنے حصہ سے آغاز کرے، پھر بایاں حصہ اور اس دوران میں رخ قبلہ کی طرف ہو اور اللہ اکبر کہے اور فارغ ہونے کے بعد نوافل پڑھے، وکیع کہتے ہیں: مجھے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بتلایا کہ میں نے (جب حج کیا تو) پانچ مناسک میں خطا کر دی اور حجام نے مجھے ان کی آگاہی دی اس کی تفصیل یہ بیان کی کہ جب میں نے سر منڈوانے کا ارادہ کیا تو ایک حجام کے پاس گیا اور پوچھا سر منڈوانے کی کیا اجرت لوگے؟ کہنے لگا: آپ عراقی ہو؟ میں نے کہا: ہاں! کہنے لگا: نسکِ حج میں بھاؤ تاؤ نہیں کیا جاتا، بیٹھ جاؤ! کہتے ہیں: میں جب بیٹھا تو میرا منہ قبلہ رخ نہ تھا، وہ بولا: اپنا چہرہ قبلہ کی طرف کر لو! کہتے ہیں: اس کے بعد میں نے اپنے سر کا بایاں حصہ اس کے آگے کیا تو بولا: پہلے دایاں حصہ میری طرف کرو، کہتے ہیں: اس نے جب استرا پھیرنا شروع کیا تو میں چپ بیٹھا رہا، کہنے لگا: اللہ اکبر پڑھتے رہو! پھر فارغ ہو کر جانے کو اٹھا تو بولا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: اپنی منزل کو، کہنے لگا: پہلے دو رکعتیں پڑھو، پھر جانا! میں نے سوچا کہ ایک حجام کو اتنی معلومات کیسے ہو سکتی ہیں، تو اس سے کہا: تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ کہنے لگا: میں نے عطاء بن ابی رباح کو دیکھا تھا کہ یہ سب کیا تھا، اسے محب طبری نے ذکر کیا۔

گنجے کے سر پر (ویسے ہی) استرا پھیر لینے کا استحباب

جمہور علماء کی رائے ہے کہ گنجے کی نسبت مستحب ہے کہ وہ ویسے ہی پورے سر پر استرا پھروالے۔ بقول ابن منذر رحمہ اللہ: ہم نے جن اہلِ علم سے دین حفظ کیا ان سب کا اجماع ہے کہ گنجا بھی سر پر استرا پھروائے گا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تو یہ واجب ہے۔

---

[1] ضعیف، مسند أحمد: ٦/ ٤٠٠؛ شعیب ارناؤط حفظہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا۔

ناخن کاٹنے اور مونچھ تراشنے کا استحباب

سر کو حلق یا تقصیر کرانے والے کے لیے مستحب ہے کہ مونچھ ترشوائے اور ناخن کاٹے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما حج یا عمرہ میں جب سر صاف کراتے تو داڑھی اور مونچھ کو بھی آراستہ کراتے تھے۔[1]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب آپ نے سر منڈوایا تو ساتھ اپنے ناخن بھی کاٹے۔[2]

عورتوں کو تقصیر کا حکم اور حلق سے ان کے لیے نہی

ابو داود وغیرہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواتین پر حلق نہیں، ان پر صرف تقصیر ہے۔''[3] حافظ رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا، ابن منذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے اس لیے کہ حلق ان کے حق میں مثلہ (کی مثل) ہے۔

عورتیں سر سے کتنی مقدار میں بال کٹوائیں؟

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ عورت جب تقصیر کرانا چاہے تو اپنے بال سر کے اگلے حصے میں جمع کر کے ان سے انگلی کے پورے کے بقدر کاٹ لے، امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: عورت اطراف کے بالوں میں سے کچھ کاٹ لے، یہ دونوں آثار سعید بن منصور نے نقل کیے، ایک قول ہے کہ اس ضمن میں کوئی حد مقرر نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: کم از کم جائز مقدار تین بال ہیں۔

طوافِ افاضہ

اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ طوافِ افاضہ ارکانِ حج میں سے ایک ہے اور اگر حاجی نے یہ نہ کیا تو اس کا حج باطل ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ لۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴾(الحج:۲۹) ''اس قدیم گھر کا خوب طواف کرو۔'' اس کے لیے امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نیت کا تعین ضروری ہے، باقی آئمہ کے نزدیک (علیحدہ سے نیت کی اب ضرورت نہیں بلکہ) حج کی نیت اس کے لیے بھی کافی و جاری ہے، بطورِ خاص اب نیت کی ضرورت نہیں، جمہور علماء کے نزدیک یہ سات چکر ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے میں ان میں سے حج کا رکن چار چکر ہیں اور اس کے ترک سے حج نہ ہوگا اور باقی تین واجب ہیں رکن نہیں، اگر حاجی نے یہ تین یا ان میں سے ایک کا ترک کیا تو اس نے ترکِ واجب کیا، اس کا حج ہو جائے گا، البتہ اس پر دم واجب ہوگا۔

---

[1] صحیح البخاری: ۵۸۹۲. [2] صحیح، مسند أحمد: ٤/ ٤٢؛ شعیب ارناؤوط حفظہ اللہ نے صحیح قرار دیا۔ [3] صحیح، سنن ابی داود: ۱۹۸۵.

طوافِ افاضہ کا وقت

امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا اول وقت دسویں ذوالحجہ (یعنی نویں اور دسویں کی درمیانی رات) کی نصف رات سے شروع ہو جاتا ہے اور اس کے آخری وقت کی کوئی حد نہیں، لیکن جب تک طوافِ افاضہ نہ کرے، جماع اس کے لیے حلال نہ ہوگا اور ایامِ تشریق سے اسے موخر کرنا دم کے وجوب کا باعث تو نہ بنے گا مگر یہ مکروہ ہے، اس کی ادائیگی کا افضل وقت دسویں ذوالحجہ کی قبل از دوپہر کا وقت ہے، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا وقت دس تاریخ کی طلوعِ فجر سے ہے، دونوں نے اس کے آخری وقت کے بارے میں باہم اختلاف کیا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں ایامِ نحر میں کسی بھی وقت کر لے اس سے تاخیر کی صورت میں دم لازم ہوگا، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک آخری یومِ تشریق (یعنی تیرہ ذوالحجہ) تک مؤخر کرنے میں حرج نہیں، البتہ اس کی تعجیل افضل ہے اور اس کا وقت ماہ ذوالحجہ کے آخر تک پھیلا ہوا ہے، اس سے بھی تاخیر لزومِ دم کا موجب ہوگی، مگر اس کا حج صحیح ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سارا ذوالحجہ اشہرِ حج میں سے ہے۔

عورتوں کے لیے طوافِ افاضہ کی تعجیل

اگر انہیں حیض آنے کا اندیشہ ہو تو مستحب ہے کہ وہ یومِ نحر میں جلد از جلد اس کی ادائیگی کر لیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حیض کے خدشہ کے مدنظر خواتین کو جلد از جلد اس سے سبکدوش ہو جانے کا حکم دیتی تھیں، بقول امام عطاء رحمہ اللہ اگر کسی عورت کو حیض کا ڈر ہو تو وہ کنکریاں مارنے اور ذبح کرنے سے قبل ہی مکہ جا کر طواف کر لے، رفعِ حیض (یا تاخیرِ حیض) کے لیے کوئی دوا استعمال کر لینے میں بھی حرج نہیں تاکہ آسانی سے طواف کر سکے۔ سعید بن منصور نے نقل کیا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس عورت کے بارے سوال ہوا جو رفعِ حیض کے لیے دوا خرید لے تاکہ حج کے مناسک پورے ہوں تو انہوں نے کوئی حرج خیال نہ کیا، بلکہ اس غرض سے ان کے لیے پیلو کے درخت کا پانی تجویز کیا، امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر اس صورت میں حیض کا رفع ہو جانا معتبر گردانا گیا ہے تو عدت پوری کرنے اور دیگر تمام صورتوں میں بھی یہی ہے، اسی طرح اس کے ساتھ یہ امر ملحق کیا جائے کہ بوقتِ ضرورت کوئی حیض آور دوا استعمال کرے (یعنی اسے بھی جائز قرار دیا جائے)۔

محصب میں آن اترنا

(بقول محشی یہ وادی بطحاء/ ابطح ہے جو جبلِ نور اور حجون کے درمیان واقع ہے) ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منیٰ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس وادی میں اترے اور یہاں ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں اور تھوڑی دیر آرام فرمایا (پھر مکہ میں داخل ہوئے) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی یہی کیا کرتے تھے۔[1] علماء کا اس کے استحباب کے بارے باہم اختلاف ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اس لیے اترے تھے کہ تاکہ پھر مدینہ روانگی میں آسانی رہے، یہ سنت نہیں تو جو چاہے یہاں اترے اور جو چاہے نہ اترے۔[2] بقول امام خطابی رحمہ اللہ لوگ ایسا کرتے رہے، پھر یہ متروک ہوا، امام ترمذی رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري: ١٧٦٨؛ صحيح مسلم: ١٣١٠. [2] صحيح، سنن أبي داود: ٢٠٠٨.

لکھتے ہیں: بعض اہل علم نے اس جگہ نزول کو مستحب قرار دیا ہے، لیکن وہ اسے واجب نہیں سمجھتے، اس جگہ نزول میں حکمت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا، اس امر پر جو اس نے اپنے رسول کو دشمنوں پر غالب کیا جنھوں نے ایک زمانہ میں بنی ہاشم اور بنی مطلب کا سماجی مقاطعہ کیا تھا کہ نہ ان سے رشتے ناطے کریں گے اور نہ کوئی لین دین حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالے کر دیا جائے، امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا مقصد اس جگہ میں شعائرِ اسلام کا اظہار تھا، جہاں مشرکینِ مکہ نے کفر کے شعائر کا اظہار اور اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا اور یہ آپ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ کفر و شرک کے شعائر کے مواضع میں شعائرِ توحید کی اقامت فرماتے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ طائف میں لات و عزیٰ کی جگہ مسجد تعمیر کی جائے۔

عمرہ

یہ اعتمار سے ماخوذ ہے جو زیارت ہے، یہاں مقصود کعبہ کی زیارت اور اس کے گرد طواف کرنا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی اور پھر حلق یا تقصیر ہے اور علماء کا اس کی مشروعیت پر اجماع ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ماہِ رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔''[1] (یعنی باعتبار ثواب، یہ نہیں کہ اس سے فریضۂ حج ساقط ہو جائے گا) اسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''عمرہ تا عمرہ درمیان کے سب گناہوں کا کفارہ ہے اور حجِ مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔''[2] اسے احمد اور شیخین نے نقل کیا، پہلے حدیث گزری ہے کہ ''پے در پے حج اور عمرے کیا کرو۔''[3]

بار بار عمرہ کرنا

① نافع کہتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں کئی سال پے در پے عمرے کیے، ہر سال دو دو عمرے کرتے رہے۔

② قاسم رحمہ اللہ راوی ہیں کہ ایک سال سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے تین عمرے کیے، ان سے پوچھا گیا کہ اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا؟ کہا: سبحان اللہ! ام المومنین پر کون اعتراض کرے؟ امام مالک رحمہ اللہ نے ایک برس میں ایک سے زائد عمرہ کرنے کو مکروہ قرار دیا۔

حج سے قبل اور اس کے اشہر میں عمرہ کرنے کا جواز

جائز ہے کہ اشہرِ حج میں عمرہ کرے، بغیر اس کے کہ حج بھی کرے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ شوال میں عمرہ کیا اور حج سے

---

① صحيح البخاري: ١٧٦٨؛ صحيح مسلم: ١٣١٠. ② صحيح البخاري: ١٧٧٣؛ صحيح مسلم: ١٣٤٩.
③ صحيح، سنن ابن ماجه: ٢٨٨٧.

قبل ہی مدینہ لوٹ آئے، اسی طرح حج ابھی نہ کیا ہو تو بھی عمرہ کرنا جائز ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تھا، امام طاوس رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ جاہلیت حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو افجر الفجور (یعنی سب سے بڑا فسق و فجور کا عمل) کہتے تھے، ان کے ہاں یہ مقولہ رائج تھا: ''إِذَا انْفَسَخَ صَفَرُ وَ بَدَأَ الدُّبْرُ وعَفَا الأَثَرُ حَلَّتِ الْعُمْرَةُ لِمَنِ اعْتَمَرَ'' جب صفر کا مہینہ ختم ہوا اور دبر یعنی اونٹ کے سم بعض نے کہا: اس کی کمر کا زخم ٹھیک ہو جائے اور راستوں سے حج کے نشانات جب ختم ہو جائیں تو عمرہ کرنا حلال ہوا۔ اسلام نے لوگوں کو اشہرِ حج میں بھی عمرے کرنے کا حکم دیا ہے تو اب قیامت تک اشہرِ حج میں بھی عمرے ہوتے رہیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کی تعداد

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے ہیں: ① عمرہ حدیبیہ ② عمرہ قضاء (یعنی حدیبیہ کے اگلے برس حسبِ معاہدہ کہ اب واپس چلے جائیں اور آمدہ برس آئیں)۔ ③ جعرانہ سے جو آپ نے عمرہ کیا (یہ فتح مکہ اور بعد ازاں محاصرۂ طائف کے بعد مدینہ واپس جاتے ہوئے)۔ ④ جو اپنے حج (یعنی حجِ وداع) کے ساتھ کیا۔[1] اسے احمد، ابوداود اور ابن ماجہ نے ثقہ سند سے نقل کیا۔

عمرے کا حکم

احناف اور مالک کے ہاں عمرہ سنت ہے، ان کی بنائے استدلال سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے بارے میں سوال ہوا کہ آیا یہ واجب ہے؟ تو جواب میں فرمایا: ''یہ افضل ہے کہ تم عمرہ کرو۔''[2] اسے احمد اور ترمذی نے تخریج کیا، بقول ترمذی یہ حسن صحیح ہے، شوافع اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ فرض ہے کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ (البقرۃ:١٩٦) ''اللہ کے لیے حج اور عمرہ کرو۔'' اس کا حج پر عطف ڈالا گیا ہے جو فرض ہے، لہٰذا یہ بھی فرض ہوا، اول رائے ارجح ہے، فتح العلام کے مؤلف لکھتے ہیں: اس باب میں کئی احادیث ہیں، مگر ان کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی، امام ترمذی رحمہ اللہ نے شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ عمرہ (کی فرضیت میں) کوئی چیز ثابت نہیں، یہ نفل ہے۔

عمرے کا وقت

جمہور علماء کے مطابق عمرہ سال کے تمام ایام میں ہو سکتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان پانچ ایام میں عمرہ کرنے کی کراہت کی رائے رکھتے ہیں: یومِ عرفہ، یومِ نحر، اور اس کے بعد کے تین ایامِ تشریق، ابو یوسف یوم عرفہ اور اس کے بعد کے تین ایام میں اس کی کراہت کے قائل ہیں، اشہرِ حج میں جوازِ عمرہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

---

① صحیح، سنن أبی داود: ١٩٩٣؛ سنن ترمذی: ٨١٦؛ سنن ابن ماجہ: ٣٠٠٣. ② ضعیف، سنن ترمذی: ٩٣١؛ مسند أحمد: ٣/ ٣١٦.

① بخاری نے عکرمہ بن خالد سے نقل کیا کہ میں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حج سے قبل عمرہ کرنے کے بارے میں پوچھا کہ ابھی فریضہ حج ادا نہ کیا ہو تو......؟ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں، عمرہ کر سکتے ہو۔[1] نبی کریم ﷺ نے بھی حج سے قبل عمرہ کیا تھا۔

② سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حائضہ ہوگئیں تو تمام مناسک ادا کیے ماسوائے طواف کے، جب حالِ طہر میں ہوئیں اور طواف کیا تو نبی کریم ﷺ سے کہا: آپ سب حج اور عمرہ کے ساتھ واپس ہوں گے اور میں نے صرف حج کیا ہے تو آپ نے ان کے بھائی سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ انہیں تنعیم لے کر جائیں (اور وہاں سے عمرہ کا احرام بندھوا کرلائیں) تو انہوں نے حج کے بعد ذوالحجہ میں ہی عمرہ ادا کیا۔[2] عمرے کا افضل وقت ماہِ رمضان ہے۔

عمرے کے میقات

عمرہ کرنے والا اگر سابق الذکر مواقیت کے پرے رہتا ہے تو وہ احرام کے بغیر ان سے آگے نہیں جا سکتا، چنانچہ بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا کہ زید بن جبیر نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ عمرے کا احرام کہاں سے باندھوں؟ انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے اہلِ نجد کے لیے قرن، اہلِ مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ اور اہلِ شام کے لیے جحفہ کو بطورِ میقات مقرر کیا تھا، اگر وہ میقات کے اندر رہتا ہے تب وہیں سے یا کسی بھی حدودِ حرم سے باہر جگہ سے احرام باندھے گا، اہلِ مکہ حدود سے باہر کسی جگہ جا کر احرام باندھ کر آئیں گے، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت گزری جس میں تھا کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں ان کے بھائی کے ہمراہ تنعیم بھیجا، تاکہ وہاں سے وہ عمرے کے لیے احرام باندھ کر آئیں۔

طوافِ وداع

اس کا یہ نام اس لیے پڑا کیونکہ اس کے بعد حاجی بیت اللہ کو الوداع کر کے واپس چلے جاتے ہیں، اسے طوافِ صدر بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ مکہ سے لوگوں کے صدور (یعنی روانگی) کے وقت ہوتا ہے، اس میں رمل نہیں ہوتا اور یہ آخری فعل ہے، جو غیر مکی لوگ سر انجام دیں گے، امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا کہ آخری نسک (یعنی حج کے ارکان کے ضمن میں آخری کام) بیت اللہ کا طواف ہے،[3] مکی اور حائضہ خواتین کے حق میں یہ مشروع نہیں اور اس کے ترک سے کوئی چیز لازم نہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: حائضہ کو رخصت ہے کہ وہ یہ طواف کیے بغیر ہی واپسی کا سفر شروع کر لے۔[4] اسے بخاری و مسلم نے نقل کیا، ایک روایت میں ہے: لوگوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا آخری فعل بیت اللہ میں ہو (یعنی آخری کام سفر شروع کرنے سے قبل طواف ہو) حائضہ سے اس کی تخفیف کی گئی، شیخین نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ وہ حائضہ ہوگئیں، پھر نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ تو ہمیں روکے رکھے گی۔'' عرض کی گئی کہ انہوں نے طوافِ افاضہ

---

① صحيح البخاري: ١٧٧٤. ② صحيح البخاري: ١٧٨٥. ③ المؤطا امام مالك: ١/ ٣٦٩.
④ صحيح البخاري: ١٧٦٠.

کرلیا تھا، فرمایا: ''تب نہیں۔''①

طوافِ وداع کا حکم

علماء اس کی مشروعیت پر متفق ہیں، کیونکہ مسلم اور ابو داود نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: ''لوگ سفر سے قبل آخری فعل بیت اللہ کا طواف کریں۔'' اس حکم کی نوعیت کے بارے میں اختلاف اقوال ہے امام مالک، امام داود (ظاہری) اور امام ابن منذر رحمہ اللہ قائل ہیں کہ یہ سنت ہے، اس کے ترک سے کوئی چیز واجب نہیں، یہی امام شافعی رحمہ اللہ نے اختیار کیا، احناف، حنابلہ اور امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ترک سے دم واجب ہوگا۔

طوافِ وداع کا وقت

یہ آدمی کے اپنے تمام اعمال سے فارغ ہونے کے بعد ہے سفر سے عین قبل، اس کے بعد وہ فوراً روانگی کرلے، کسی اور فعل مثلاً: خرید وفروخت میں مشغول نہ ہو اور نہ مقیم رہے اگر کوئی اور کام کرلیا تب دوبارہ طوافِ وداع کرے، البتہ سفر کے آغاز کے بعد راستے میں کوئی اور فعل مثلاً: ایسی خرید وفروخت کرسکتا ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو، مثلاً: کھانے پینے کی کوئی چیز خریدنا، تب اعادہ کی ضرورت نہیں، مودع کے لیے مستحب ہے کہ آخر دم وہ دعا پڑھے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، وہ یہ ہے:

''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ، حَمَلْتَنِيْ عَلٰى مَا سَخَّرْتَ لِيْ مِنْ خَلْقِكَ، وَسَتَرْتَنِيْ فِيْ بِلَادِكَ حَتّٰى بَلَّغْتَنِيْ بِنِعْمَتِكَ إِلٰى بَيْتِكَ وَأَعَنْتَنِيْ عَلٰى أَدَاءِ نُسُكِيْ، فَإِنْ كُنْتَ رَضِيْتَ عَنِّيْ فَازْدَدْ عَنِّيْ رِضاً وَإِلَّا فَمِنَ الْآنَ فَارْضَ عَنِّيْ قَبْلَ أَنْ تَنْأىٰ عَنْ بَيْتِكَ دَارِيْ فَهٰذَا أَوَانُ انْصِرَافِيْ إِنْ أَذِنْتَ لِيْ غَيْرَ مُسْتَبْدِلٍ بِكَ وَلَا بَيْتِكَ وَلَا رَاغِبٍ عَنْكَ وَلَا عَنْ بَيْتِكَ، اَللّٰهُمَّ فَأَصْحِبْنِيَ الْعَافِيَةَ فِيْ بَدَنِيْ وَالصِّحَّةَ فِيْ جِسْمِيْ وَالْعِصْمَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَأَحْسِنْ مُنْقَلَبِيْ وَارْزُقْنِيْ طَاعَتَكَ مَا أَبْقَيْتَنِيْ وَاجْمَعْ لِيْ بَيْنَ خَيْرَيِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ''

اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور میرے والدین بھی تیرے بندے ہیں، تو نے مجھے سواری دی اور اپنے فضل وکرم سے اپنے گھر پہنچایا اور مناسک ادا کرنے کی توفیق دی، اگر تو راضی ہوگیا ہے تو مزید راضی ہو جا، اگر نہیں تو اب سے راضی ہوجا، اس سے قبل کہ میں یہاں سے دور چلا جاؤں، یا اللہ! یہ میری واپسی کا وقت ہے، لیکن پھر آنے کا شوق ہے، اے اللہ! عافیت، صحت اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے واپسی کا سفر آسان بنا، اے اللہ! جب تک زندہ رہوں، تیری اطاعت کرتا رہوں اور مجھے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

① صحیح البخاری: ١٧٥٧.

امام شافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ بیت اللہ کو الوداع کہتے وقت ملتزم میں کچھ وقوف کرے (گویا کعبہ سے معانقہ کر کے الوداع ہو)۔

ادائیگیٔ حج کی کیفیت

حاجی جب میقات سے قریب ہو تو اس کے لیے مستحب ہے کہ مونچھیں کتروائے، ناخن کٹوائے، غسل یا وضو کرے، خوشبو لگائے اور احرام پہن لے، جب میقات پہنچے تو دو رکعتیں پڑھے اور نیت کرے (یہ سارے کام میقات پر بھی کیے جاسکتے ہیں) یہ نیت رکن ہے، اس کے بغیر نسک صحیح نہ ہوگا، نسک کا تعین کرنا کہ یہ حجِ افراد، تمتع یا قران ہے تو یہ فرض نہیں، اگر مطلق نیت کر لی اور کسی خاص نوع کی تعیین نہ کی تو بھی اس کا احرام صحیح ہے اور پھر (یعنی مطلق نیت کرنے کی صورت میں) ان مذکورہ تین میں سے کوئی بھی کر سکتا ہے، مجرد نیت کرنے کے ساتھ ہی اس کے لیے باآوازِ بلند تلبیہ پڑھنا مشروع ہو جائے گا بالخصوص جب (دورانِ سفر میں) کسی بلند جگہ پر چڑھے یا نشیب میں اترے یا کسی قافلہ یا اکیلے آدمی سے سامنا ہو اور سحری کے وقت اور فرض نمازوں کے بعد، اب وہ جماع اور اس کے دواعی، لڑائی جھگڑے اور فضولیات سے اجتناب کرے اور نہ شادی کرے اور نہ کرائے، سلا ہوا کپڑا زیبِ تن نہ کرے اور ایسا جوتا نہ پہنے جو پاؤں کا ٹخنوں سے اوپر والا حصہ ڈھانپ رہا ہو (یعنی صرف چپل پہنے) سر نہ ڈھانپے، خوشبو نہ لگائے اور بالوں کو صاف نہ کرائے اور نہ ہلکے کرائے، ناخن نہ کاٹے، خشکی کے کسی شکار سے متعرض نہ ہو اور نہ اس کا حکم، اشارہ اور مشورہ دے اور نہ اعانت کرے۔

مکہ پہنچ کر مستحب ہے کہ اس کی بالائی جانب سے داخل ہو، حدودِ حرم کے اندر کوئی درخت، پھول اور گھاس وغیرہ نہ کاٹے، اور اس وقت ذی طویٰ یا زاہر کے کنویں سے نہائے اگر ایسا کرنا میسر ہو، پھر کعبہ کا رخ کرے اور باب السلام سے مسنون دعائیں پڑھتا ہوا داخل ہو، خشوع اور تواضع کی کیفیت ہمہ وقت طاری رہنی چاہیے اور تلبیہ پڑھتا رہے، کعبہ پر جب نظر پڑے تو ہاتھ اٹھا کر اللہ سے اس کے فضل کی دعا کرے، اس کے بارے میں مستحب دعا کا ذکر گزرا، فوراً ہی حجرِ اسود کا رخ کرے اور اسے بوسہ دے یا ہاتھ کے ساتھ اسے چھوئے، اگر یہ ممکن نہیں تو اس کی طرف اشارہ کرے، پھر اس کے برابر کھڑا ہو کر ذکرِ مسنون کرے اور ماثور دعائیں پڑھے، پھر طواف شروع کرے اور اس دوران میں مستحب ہے کہ دایاں کندھا ننگا کرے اور پہلے تین چکروں میں رمل کرے بقیہ میں عام چال چلے، رکنِ یمانی کا استلام مسنون ہے اور ہر چکر میں (اگر ممکن ہو) حجرِ اسود کو بوسہ دے۔

طواف سے فارغ ہو کر یہ آیت پڑھتے ہوئے مقامِ ابراہیم کی طرف جائے: ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (البقرہ: ۱۲۵) اور دو رکعات ادا کرے، پھر سیر ہو کر زمزم پیئے، اس کے بعد ملتزم آئے اور خوب دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعائیں کرے، پھر حجرِ اسود کا استلام کر کے اور بوسہ دے کر بابِ صفا کی طرف سے صفا پر، یہ آیت پڑھتے ہوئے: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرہ: ۱۵۸) اس کے اوپر چڑھے اور کعبہ کی طرف رخ کرے، ماثور دعا پڑھے، پھر اتر آئے

اور جو چاہے دعائیں کرتا یا ذکر کرتا ہوا سعی شروع کرے، نشان زدہ حصے میں پہنچ کر ذرا تیز چلے، پھر یہ حصہ ختم ہونے پر عام چال چلے حتیٰ کہ مروہ پہنچے اور اس کے بھی اوپر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کرے اور دعا و ذکر کرے، اس کے ساتھ ہی ایک چکر مکمل ہوا، اسی نہج پر سات چکر مکمل کرے (یعنی مروہ سے واپس صفا کی طرف آئے، یہ اس کا دوسرا چکر ہوگا) ارجح رائے کے مطابق یہ سعی واجب ہے، اس کے کلی یا جزوی تارک پر دم واجب ہوگا، اگر محرم متمتع ہے تو اب سر پر استرا پھرائے یا کچھ بال کٹوالے، اس کے ساتھ ہی اس کا عمرہ مکمل ہوا اور وہ حلال ہوا اور احرام کی تمام بندشیں ختم ہوئیں، حتیٰ کہ جماع بھی، قران اور افراد کرنے والے اپنے احرام پر قائم رہیں گے، آٹھویں ذوالحجہ کے دن متمتع اپنی رہائش گاہ سے احرام باندھے اور سب منیٰ کا رخ کریں اور رات وہیں گزاریں گے، (نویں تاریخ کو) طلوعِ آفتاب کے بعد سب عرفات جائیں گے اور وہاں مسجدِ نمرہ (یا پورے عرفات میں جہاں بھی جگہ ملے) کے پاس جا اتریں اور غسل کریں (اگر ممکن ہو) اور ظہر و عصر کی نمازیں جمع تقدیم کر کے امام کے ہمراہ پڑھیں، اگر امام کے ساتھ ممکن نہیں تو اکیلا پڑھے گا تو جمع کر کے لیکن قصر، وقوف عرفہ کا آغاز زوال کے بعد ہوگا، صخرات یا اس کے قریب وقوف کرے، نبی کریم ﷺ کا محلِ وقوف صخرات تھا، جبلِ رحمت پر چڑھنا مسنون نہیں اور نہ ایسا کرنا چاہیے، اثنائے وقوف قبلہ رو ہو کر خوب دعا و ذکر اور گریہ زاری میں مشغول ہو، حتیٰ کہ رات داخل ہو جائے، پھر مزدلفہ کی طرف چل پڑے اور وہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کو جمع تاخیر کے ساتھ ادا کرے اور وہیں رات گزارے (یعنی دسویں تاریخ کی) طلوعِ فجر کے بعد (بعد از نماز) مشعر حرام کے پاس وقوف کرے اور روشنی پھیلنے تک اللہ کا ذکر کرے، پھر کنکریاں اکٹھی کر کے منیٰ کی طرف واپس ہو جائے، مشعر حرام کا وقوف واجب ہے، اس کے ترک سے دم لازم آئے گا، پھر کنکریاں مارے اور ذبح و حلق کرے، اس کے ساتھ ہی وہ احرام کی بندشوں سے آزاد ہو جائے گا البتہ جماع حلال نہ ہوگا، پھر مکہ جائے اور طوافِ افاضہ کرے، یہ طواف حج کا رکن ہے اور اسی طرح کرے جیسے طوافِ قدوم کیا تھا، اسے طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے، اگر وہ متمتع ہے تو طواف کے بعد سعی بھی کرے گا اور اگر مفرد یا قارن ہے اور طوافِ قدوم کے بعد سعی کر لی تھی تو اب اسے دوبارہ سعی کرنا لازم نہیں۔

اس کے بعد منیٰ کی طرف پلٹ جائے اور وہیں رات گزارے، منیٰ میں راتیں گزارنا واجب ہے، اس کے ترک کی صورت میں دم واجب ہوگا، گیارہویں تاریخ کا سورج ڈھلنے کے بعد تینوں جمرات کو کنکریاں مارنے جائے اور منیٰ سے متصل جمرہ سے آغاز کرے، پھر درمیان والے کے اور پھر جمرۂ عقبہ (یعنی جو گھاٹی کے پاس ہے) پہلے دو جمروں کو کنکریاں مار کر ذرا ہٹ آئے اور قبلہ رخ ہو کر وقوف کرے اور دعائیں کرے اور ذکر کرے، آخری جمرہ کے بعد یہ نہ کرے، ہر ایک کو سات سات کنکریاں مارے اور یہ سب غروب سے قبل ہو جانا چاہیے، بارہ تاریخ کو بھی یہی کرے، پھر اسے اختیار ہے کہ اسی روز غروبِ آفتاب سے قبل مکہ چلا جائے یا یہ کہ وہیں رات گزارے اور تیرہ تاریخ کو بھی تینوں جمرات کی رمی کر کے مکہ جائے (تیرہ کی رمی بھی مقدماً بارہ کو کی جا سکتی ہے اکثر کا آجکل یہی عمل ہے) پھر جب وطن واپسی کا ارادہ بنے تو مکہ میں اس کا آخری کام طوافِ وداع ہو، یہ طواف واجب ہے، اس کے تارک پر لازم ہے کہ اگر ممکن ہو تو واپس جا کر طوافِ وداع کرے، اگر ابھی میقات سے آگے نہیں

گزر او گرنہ ایک بکری قربان کرے، خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حج اور عمرہ دونوں کے اعمال ومناسک کی ترتیب کچھ یوں ہے:

① میقات سے احرام پہننا۔ ② طواف وسعی۔ ③ سر منڈوانا یا بال چھوٹے کرانا، عمرہ یہاں مکمل ہوا، حج میں مزید یہ ہے: ④ منیٰ روانگی۔ ⑤ وقوفِ عرفہ ⑥ جمرات کو کنکریاں مارنا۔ ⑦ طوافِ افاضہ (۸) منیٰ میں راتیں گزارنا، قربانی کرنا اور حلق یا تقصیر کرانا تو یہ عمرہ وحج کے اعمال کا خلاصہ ہے۔

وطن واپسی میں تعجیل کا استحباب

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سفر عذاب کا ایک قطعہ ہے، یہ تمہیں (مرغوب) طعام وشراب سے مانع ہوتا ہے تو اپنی حاجت پوری کر کے وطن واپسی کی جلدی کیا کرو۔''[1] اسے بخاری ومسلم نے نقل کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارا کوئی حج مکمل کر لے تو وطن واپسی میں جلدی کرے، یہ اس کے اجر میں اضافے کا باعث بنے گا۔''[2] اسے دارقطنی نے نقل کیا، مسلم نے سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہاجرین (یعنی جن صحابہ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی) حج وعمرہ کے بعد مکہ میں (زیادہ سے زیادہ) تین دن قیام کریں۔''[3]

احصار

احصار سے مراد منع وحبس ہے، قرآن میں ہے:

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾(البقرة:١٩٦)

''اگر رکاوٹ آ جائے تو جو جانور میسر ہو قربان کر دو۔''

اس آیت کا نزول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو حدیبیہ میں مسجد حرام سے روک لیے جانے کے موقع پر ہوا تھا، اس سے مراد عمرہ میں طواف سے اور حج میں وقوفِ عرفہ یا طوافِ افاضہ سے رکاوٹ پیش آنا، علماء کا اس سبب کے بارے میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ احصار ہوگا تو امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: احصار صرف دشمنوں کی طرف سے ہو، کیونکہ جس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وہاں اہلِ مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمراہی صحابہ کو آگے جانے سے روک دیا تھا، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے، لیکن اکثر علماء جن میں احناف اور امام احمد رحمہ اللہ بھی ہیں، کا موقف ہے کہ احصار سے مراد ہر وہ رکاوٹ ہے جو بیت اللہ سے روک لے، خواہ وہ دشمن ہو یا مرض ہو کہ سفر اور نقل وحرکت سے بیماری کے بڑھنے کا خدشہ ہو یا چوری چکاری کا ڈر ہو، یا راستہ میں عورت کے محرم کا انتقال ہوگیا ہو اور دیگر مانع اعذار و اسباب، حتیٰ کہ ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا تو

---

① صحيح البخاري:١٨٠٤؛صحيح مسلم:١٩٢٧. ② حسن، سنن دارقطني: ٢/ ٢٢٩. ③ صحيح مسلم: ١٣٥٢.

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دیا کہ وہ اب محصر ہے، ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ﴾ کا عموم ان حضرات کے اس قول کی بنائے استدلال ہے اور یہ کہ آیت کے نزول کا سبب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کا دشمنوں کی طرف سے احصار تھا تو عام کو اس کے سبب پر مقصور نہیں کیا جا سکتا، یہ دیگر آراء سے زیادہ قوی ہے۔

محصر پر بکری یا اس سے فائق کی قربانی ہے، آیت اس امر میں صریح ہے، محصر حسبِ استطاعت قربانی کرے جو اس کے لیے میسر ہو، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو روکا گیا تو آپ نے سر کا حلق کرایا، بیویوں سے قربت کی اور اپنی قربانی کو ذبح کیا، پھر آمدہ برس عمرہ (قضاء) ادا کیا۔[1] اسے بخاری نے تخریج کیا، اس سے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے کہ محصر پر واجب ہے کہ بکری، گائے یا اونٹ کی قربانی دے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ واجب نہیں، فتح العلام میں ہے کہ یہی موقف حق ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ قربانی اس لیے ذبح کی تھی کہ آپ اسے مدینہ سے لے کر چلے تھے (تو مناسب جانا کہ کم از کم اسے ہی قربان کر دیں) اور سبھی محصرین کے ساتھ قربانیاں نہ تھیں اور یہی اس فرمانِ الٰہی میں مراد ہے: ﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ﴾ (الفتح: ۲۵) ''قربانی کے جانوروں کو بھی روکے ہوئے تھے کہ وہ اپنی قربان گاہ تک پہنچیں۔'' اس کے وجوب پر کوئی دلالت نہیں۔

ہدیِ احصار کے ذبح کرنے کا محل

مؤلف فتح العلام لکھتے ہیں: علماء نے اس بابت اختلاف کیا ہے کہ حدیبیہ میں نبی کریم ﷺ نے حدودِ حرم کے اندر قربانی کی تھی یا حِل میں؟ آیتِ مذکورہ: ﴿أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ﴾ کا ظاہر یہ ہے کہ حِل میں ذبح کی تھی، بہر حال اس ضمن میں کئی اقوال ہیں: اول جمہور کا قول جو کہتے ہیں کہ جہاں رکاوٹ پیش آئے چاہے حرم ہو یا حل وہیں قربانی ذبح کر دے، دوسرا احناف کا جو کہتے ہیں کہ حرم کی حدود میں ہی کرے، تیسرا قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت کا ہے، جن کی رائے ہے کہ اگر کسی کے ہمراہ (قربانی) حرم میں بھیج سکتا ہے تو یہی واجب ہے اور وہ قربانی کو اس کے محل میں ذبح کیے جانے تک حلال نہ ہوگا اور اگر حرم نہیں بھیج سکتا، تب وہیں قربان کر دے۔

محصر کے ذمہ قضاء نہیں الّا یہ کہ ابھی فرض حج ادا نہ کیا ہو

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قولہ تعالیٰ: ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ جس نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا، پھر رکاوٹ پیش آ گئی تو اس کے ذمہ حسبِ استطاعت قربانی ذبح کرنا ہے۔ بکری یا اس سے مافوق، اگر یہ فرض حج کا موقع تھا، تب وہ قضا دے گا (یعنی اگلے برس یا جب بھی حالات سازگار ہوں) اور اگر دیگر ہو تب نہیں، امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: انہیں یہ حدیث پہنچی کہ نبی کریم ﷺ اور اصحابِ حدیبیہ نے قربانیاں کیں اور حلق کرایا اور ہر طواف سے

---

[1] صحیح البخاري: ۱۸۰۹.

ماقبل چیز سے حلال ہو گئے اور اس سے قبل کہ قربانیاں بیت اللہ تک پہنچیں، پھر کہیں مذکور نہیں کہ آپ نے ہمراہیوں میں سے کسی کو عمرہ کی قضا دینے کا حکم دیا ہو اور نہ اس کے لیے واپس ہوئے اور حدیبیہ حدودِ حرم سے باہر ہے،[1] اسے بخاری نے نقل کیا، امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جہاں رکاوٹ پیش آئے وہیں ذبح کرے اور حلال ہو جائے اور اس کے ذمہ قضا نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قضا کا ذکر نہیں کیا: لکھتے ہیں: ہمیں متعدد احادیث کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ہمراہ معروف صحابہ تھے اور یہ سبھی اگلے برس عمرہ کی قضا کے لیے نہ آئے تھے اور ان میں سے کئی بغیر ضرورت وعذر کے وہیں مدینہ میں رہے تھے تو اگر قضا لازم ہوتی تو انہیں ساتھ جانے کا حکم دیا جاتا، مزید کہا: اسے عمرہ قضا اس لیے کہا گیا کہ یہ اس مقاضات (یعنی معاہدہ) کے نتیجہ میں ادا کیا گیا تھا جو نبی کریم ﷺ اور قریشِ مکہ کے مابین ہوئی نہ کہ اس روکے گئے عمرہ کی قضا دیتے ہوئے۔

مرض وغیرہ کے عذر سے محرم کے حلال ہو جانے کی نیت پر احرام پہننے کا جواز

کثیر علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ محرم احرام پہنتے وقت مشروط نیت کر سکتا ہے کہ اگر بیمار ہو گیا تو حلال ہو جائے گا، مسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ ضباعہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا: ''حج کی نیت کر لو اور مشروط کر لو کہ جہاں رکاوٹ پیش آ گئی، وہیں حلال ہو جاؤں گی۔''[2] اگر مرض وغیرہ یا کسی بھی سبب سے رکنا پڑا اور بوقتِ احرام مشروط نیت کی تھی تو اب حلال ہو جائے اور اس کے ذمہ نہ قربانی ہو گی اور نہ روزے۔

غلافِ کعبہ

زمانۂ جاہلیت سے ہی کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا تھا، اسلام نے یہ رسم برقرار رکھی، واقدی نے اسماعیل بن ابراہیم بن ابی حبیبہ عن ابیہ سے نقل کیا کہ کعبہ کو جاہلیت میں اَنطاع پہنایا گیا (بقول محشی یہ نطع کی جمع ہے جو سرخ کھال سے تیار کردہ قالین کو کہتے ہیں) پھر نبی کریم ﷺ نے یمنی چادریں پہنائیں۔ سیدنا عمر وعثمان رضی اللہ عنہما نے قبطی چادریں پہنائیں (قبط کی طرف منسوب، یہ مصر میں تیار کی جاتی تھیں، سفید باریک کپڑا تھا) حجاج بن یوسف نے ریشمی غلاف پہنایا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی قربانیٔ حج کو قباطی چادریں اور انماط اوڑھایا کرتے تھے (نمط کی جمع، ایک نوع کے قالین تھے) مروی ہے کہ اولین غلافِ کعبہ اسعد حمیری جو تبع ہے (جس کا ذکر سورۃ الدخان میں ہوا) نے پہنایا، واقدی نے اسحاق بن ابی عبید بن ابو جعفر محمد بن علی سے نقل کیا کہ لوگ کعبہ کی طرف غلاف اِہداء کیا کرتے تھے، اسی طرح اونٹ بھی جن پر لائنیں بنی یمنی چادریں ڈالی جاتیں تو (اونٹ ذبح کر کے ان کی) یہ چادریں کعبہ کے پہناوے کے لیے بھیج دی جاتیں، یزید بن معاویہ رحمہ اللہ نے اپنے دور میں ریشمی غلاف پہنایا، سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کیا، انہوں نے (اپنے بھائی والیٔ عراق) مصعب بن زبیر کے ذمہ یہ کام لگایا تھا کہ وہ ہر سال

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المحصر، باب: ٤، قال لیس علی المحصر بدل. [2] صحیح مسلم: ۱۲۰۸.

غلافِ کعبہ تیار کرا کے بھیجا کریں جو عاشورا (یعنی دسویں محرم) کے دن کعبہ کو پہنایا جاتا تھا، سعید بن منصور نے نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہر سال پرانا غلافِ کعبہ اتار کر حجاج میں تقسیم کر دیتے جو مکہ میں درختوں پر اسے ڈال کر سایہ حاصل کرتے۔

کعبہ کی تطییب

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں، کعبہ کو خوشبو لگایا کرو کہ کیونکہ یہ اس کی تطہیر میں سے ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم دیا ہے، سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے سارے کعبہ کے اندرون کو خوشبو لگائی جبکہ وہ روزانہ ایک رطل خوشبودار لکڑی وہاں مہکایا کرتے تھے اور جمعہ کے روز دو رطل۔

حرم میں الحاد سے نہی

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (الحج: ٢٥)
''جس نے اس میں ظالمانہ روش اختیار کی، ہم اسے عذابِ الیم کا مزہ چکھائیں گے۔''

ابوداود نے موسیٰ بن باذان سے نقل کیا کہ میں سیدنا یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حرم میں کھانے پینے کی اشیا کا ذخیرہ کرنا (یعنی تاجروں کی طرف سے مگر لوگوں کو ان کی ضرورت ہو) اس میں الحاد ہے۔''[1] بخاری نے تاریخ کبیر میں سیدنا یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سنا: طعام کا ذخیرہ کرنا الحاد ہے،[2] احمد نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ وہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے جو اس وقت حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان سے کہا: اے ابن زبیر! حرم میں الحاد سے بچو، اللہ کی قسم! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''قریش کا ایک شخص (حرم میں الحاد کو) حلال کرے گا (یعنی فساد برپا کرے گا)''[3] ایک روایت میں ہے کہ ''قریش کا ایک شخص حرم میں الحاد کرے گا، اگر اس کے گناہ اور سب جن وانس کے گناہ تولے جائیں تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔'' تو بچنا کہ کہیں تم اس کا مصداق نہ بن جاؤ، مجاہد کا قول ہے کہ مکہ میں جس طرح نیکیاں کئی گنا زیادہ ثواب کی مستوجب بنتی ہیں اسی طرح وہاں گناہ کا عذاب بھی مضاعف ہوگا، امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا، کیا سیئہ ایک سے زیادہ لکھی جاسکتی ہے؟ کہا: نہیں! اِلّا یہ کہ مکہ میں ہو اور یہ اس کی تعظیم کی مدِ نظر ہے۔

کعبہ کے خلاف جنگ

بخاری اور مسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک لشکر کعبہ سے جنگ کرنے (یعنی اسے گرانے)

---

[1] ضعيف، سنن أبي داود: ٢٠٢٠. [2] التاريخ الكبير: ١٠٨٣. [3] صحيح، مسند أحمد: ٢/ ١٩٦، ٢١٩.

کے لیے آئے گا تو ایک میدان میں سب لشکر والوں کو اول تا آخر دھنسا دیا جائے گا۔'' کہتی ہیں: میں نے کہا: یا رسول اللہ! ان میں تو ان کے بازار بھی ہوں گے (بقول محشی یعنی بازاروں میں کئی صالحین بھی ہوتے ہیں جو اپنی ضروریات کے تحت ادھر آئے ہوتے ہیں، بقول مترجم مقصد یہ تھا کہ کئی ان کے ہمراہ ایسے ہوں گے جو اس ارادہ و نیت میں ان کے ساتھ شامل نہ ہوں گے بلکہ اپنی دکانداری کی وجہ سے ادھر ہوں گے) آپ نے فرمایا: ''دھنسائے تو سبھی جائیں گے، پھر سب کو ان کے حسبِ نیت (روزِ قیامت) اٹھایا جائے گا۔''①

تین مساجد کی طرف (بقصدِ تقرُّب وعبادت) سفر کرنے کا استحباب

سعید بن مسیب رحمہ اللہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پالان نہ باندھے جائیں (یعنی سفر نہ کیا جائے) مگر ان تین مساجد کی طرف: مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ۔''② اسے بخاری، مسلم اور ابو داود نے نقل کیا، ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''تین مساجد کی طرف ہی سفر کرنا چاہیے: مسجدِ کعبہ، میری مسجد اور مسجدِ ایلیاء (یعنی بیت المقدس)'' سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! زمین پر اولین مسجد کون سی تعمیر کی گئی؟ فرمایا: ''مسجدِ حرام۔'' عرض کی: پھر کون سی؟ فرمایا: ''مسجدِ اقصیٰ۔'' عرض کی: دونوں کے مابین کتنا عرصہ ہے؟ فرمایا: ''چالیس برس، جہاں بھی تمہیں نماز کا وقت آن ملے وہیں پڑھ لو۔''③ ان تین مساجد کی طرف سفر کرنا ان کے فضائل و امتیازات کے سبب مشروع کیا گیا ہے جو دیگر میں موجود نہیں، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری مسجد میں ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز ادا کرنے سے بھی افضل ہے ماسوئے مسجدِ حرام کے اور اس میں ایک نماز دیگر کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔''④ اسے احمد نے بسند صحیح نقل کیا، سیدنا انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری مسجد میں پے در پے چالیس نمازیں پڑھیں بغیر اس کے کہ کوئی نماز فوت ہو اس کے لیے آگ، عذاب اور نفاق سے براءت لکھ دی جاتی ہے۔''⑤ اسے احمد اور طبرانی نے صحیح سند سے نقل کیا، احادیث میں وارد ہے کہ مسجدِ اقصیٰ میں نماز کا ثواب مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی کے سوا دیگر مساجد میں ادائیگی نماز کی نسبت پانچ سو گنا زیادہ ہے۔⑥

مسجدِ نبوی میں دخول (اور روضہ مقدس کی) زیارت کے آداب

① مستحب ہے کہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ مسجدِ نبوی میں آیا جائے اور یہ کہ خوشبو لگی ہو اور اچھا لباس زیبِ تن کیا ہو، پہلے دایاں پاؤں داخل کرے اور کہے:

''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ، وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ، وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ، مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ،

---

① صحيح البخاري: ٢١١٨؛ صحيح مسلم: ٢٨٨٤. ② صحيح البخاري: ١١٨٩؛ صحيح مسلم: ١٣٩٧.
③ صحيح البخاري: ٣٣٦٦؛ صحيح مسلم: ٥٢٠. ④ سنن ابن ماجه: ١٤٠٦. ⑤ منكر، مسند أحمد: ٣/ ١٥٥؛ المعجم الاوسط للطبراني: ٥٤٤٠. ⑥ ضعيف، مسند البزار: ٤٢٢.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَسَلِّمْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"

②، ③ یہ بھی مستحب ہے کہ سب سے پہلے روضہ مقدس آئے، وہیں قریب ادب وخشوع کے ساتھ کہیں تحیۃ المسجد ادا کرے، نماز (یعنی تحیۃ المسجد) سے فارغ ہو کر روضہ مقدس کا رخ کرے، اس کی طرف منہ کرے، تب اس کی پشت قبلہ کی طرف ہوگی تو نبی کریم ﷺ کو ان الفاظ کے ساتھ سلام کہے:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا خِیْرَةَ خَلْقِ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهٖ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا خَیْرَ خَلْقِ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا حَبِیْبَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا سَیِّدَ الْمُرْسَلِیْنَ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَأَمِیْنُهٗ وَخِیْرَتُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَأَدَّیْتَ الْأَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْأُمَّةَ وَجَاهَدْتَ فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" (یہ الفاظ ماثور نہیں، کوئی سے بھی کہہ سکتا ہے)

④ پھر ایک گز داہنی طرف سر کے (یعنی آگے کی طرف) اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سلام کہے (نام لے کر) پھر ذرا آگے ہو کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کہے۔

⑤ پھر قبلہ رو ہو اور اپنے اور اہل وعیال اور دوست واحباب اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے، پھر چلا جائے۔

⑥ زائر کو چاہیے کہ اس موقع پر آواز اتنی ہی بلند رکھے کہ خود کو سنائے اور سرکاری کارندوں کو چاہیے کہ وہ (اگر غیر شرعی یا ادب کے منافی کوئی حرکت دیکھیں تو) نرمی سے منع کریں، وارد ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ آوازیں بلند کر رہے ہیں تو انہیں طلب کیا اور کہا: اگر اسی شہر کے باسی ہوتے تو تمہیں جسمانی سزا دیتا۔[1]

⑦ حجرہ مبارکہ کی جالی اور پتھر وغیرہ کو چھونے اور بوسہ دینے سے اجتناب کرے، اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا، ابوداود نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تم اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ اور نہ میری قبر کو عید (یعنی میلے ٹھیلے کی جگہ) بنانا، مجھ پر درود پڑھو کیونکہ وہ جہاں بھی پڑھو گے مجھ تک پہنچ جائے گا۔"[2] عبداللہ بن حسن کی ایک آدمی پر نظر پڑی جو نبی کریم ﷺ کے روضۂ مبارک کا قصد کر رہا ہے، تاکہ وہاں دعا کرے تو کہنے لگے: اے شخص! بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: "میری قبر کو عید نہ بنا لینا اور جہاں بھی درود پڑھو گے مجھ تک پہنچ جائے گا۔"[3] تو تم اور جو اندلس میں ہیں (اس لحاظ سے) ایک برابر ہیں (یعنی جیسے تمہارا درود نبی کریم ﷺ تک پہنچ رہا ہے ویسے ہی ان کا بھی پہنچ رہا ہے)۔

ریاضِ جنت میں کثرتِ عبادت کا استحباب

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے منبر اور گھر (یعنی حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا)

---

① صحيح البخاري: ٤٧٠. ② صحيح، سنن أبي داود: ٢٠٤٢. ③ حسن، مسند أحمد: ٢/ ٣٦٧.

کی درمیانی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض پر ہے (یعنی جہاں روزِ قیامت حوضِ کوثر ہوگا)۔''[1]

مسجدِ قباء میں آنے اور اس میں نماز پڑھنے کا استحباب

نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ ہر ہفتے والے دن سوار یا پیدل مسجدِ قباء میں آتے اور دو رکعت نفل پڑھتے، آپ نے اس کی ترغیب دلائی اور فرمایا: ''جس نے اپنے گھر میں وضو کیا، پھر مسجد قباء آیا تو اس میں نماز ادا کی (نفل یا فرض) تو اس کے لیے عمرہ کی مثل اجر ہے۔''[2] اسے احمد، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے تخریج کیا اور کہا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔

فضائلِ مدینہ

بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک وقت آئے گا کہ ایمان مدینہ کی طرف ایسے سمٹ جائے گا جیسے سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتا ہے۔''[3] طبرانی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے درست سند کے ساتھ نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ اسلام کا قبہ، ایمان کا دار، ارضِ ہجرت اور حلال وحرام (کی پہچان) کا ٹھکانہ ہے۔''[4] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ مدینہ میں چیزوں کے بھاؤ بڑھ گئے اور تنگی عام ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''صبر کرو اور بشارت حاصل کرو، میں نے تمہارے پیمانوں میں برکت (کی دعا) کر دی ہے، کھاؤ اور متفرق نہ ہو (یعنی اکٹھے کھانا کھاؤ) کہ ایک آدمی کا کھانا دو، دو کا چار اور چار کا پانچ یا چھ کو (اس برکت کے فیض سے) کافی ہوگا، جس نے مدینہ کی سختیوں اور تنگیوں پر صبر کیا، میں روزِ قیامت اس کا گواہ اور سفارشی بنوں گا اور برکت اتحاد میں ہے جو اعراض کرتا ہوا یہاں سے نکل گیا، اللہ اس کا نعم البدل لے آئے گا اور جس نے برائی کی نیت سے مدینہ کا قصد کیا، اللہ اسے اس طرح گھلا دے گا (یعنی اسے تاراج اور اس کا بیڑا غرق کرے گا) جیسے پانی میں نمک گھلتا ہے۔''[5] اسے بزار نے جید سند سے نقل کیا۔

مدینہ میں موت آنے کی فضیلت

طبرانی نے بسندِ حسن ثقیف قبیلہ کی ایک یتیم لڑکی سے روایت نقل کی جو نبی کریم ﷺ کے پاس رہتی تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تم میں سے کر سکے کہ مدینہ میں اسے موت آئے وہ یہی کرے کیونکہ جو یہاں فوت ہوگا میں روزِ قیامت اس کا گواہ۔ یا فرمایا:۔ سفارشی بنوں گا۔''[6] اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دعا کیا کرتے تھے کہ انہیں مدینہ میں موت آئے، چنانچہ بخاری نے زید بن اسلم عن ابیہ سے نقل کیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی: اے اللہ! میری موت تیری راہ میں شہادت کی موت ہو اور وہ بھی تیرے رسول کے شہر میں۔[7]

---

[1] صحیح البخاری:١١٩٦. [2] صحیح البخاری: ١١٩٤؛ صحیح، سنن ابن ماجہ: ١٤١٢. [3] صحیح البخاری: ١٨٧٦. [4] ضعیف، المعجم الاوسط للطبرانی: ٥٦١٤. [5] ضعیف، مسند البزار: ١١٨٥. [6] صحیح، سنن ابن ماجہ:٣١١٢؛مسند أحمد:٥٤٣٧؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ٢٤/ ١٩٤، رقم ٧٤٧. [7] صحیح البخاری: ١٨٩٠.

فقہ السنۃ فقہی احکام ومسائل پر مشتمل ایک عظیم کتاب ہے جس میں مؤلف نے ترتیب کے ساتھ ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے جو روزمرہ زندگی میں ایک مسلمان کو پیش آتے ہیں۔ کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر اکثر دینی مدارس اور وفاق المدارس میں اس کے مخصوص حصے شاملِ نصاب کیے گئے ہیں۔

زیر نظر تالیف ''فقہ السنہ مترجم'' جہاں طلبا، علما اور اساتذہ کے لیے مفید ہے وہاں عوام الناس کے لیے بھی دینی احکام سے آشنائی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

اس کتاب کے مصنف فضیلۃ الشیخ سید سابق عرب کے معروف عالم دین ہیں اور مترجم پروفیسر ڈاکٹر عبدالکبیر محسن علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، جبکہ محقق: محدث العصر استاذ محترم علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل ہے ''مکتبہ اسلامیہ'' کو جو وطن عزیز کا معروف و مقبول ادارہ ہے۔ قلیل عرصے میں کئی علمی، تحقیقی اور معیاری کتب کی اشاعت اس ادارے کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ہم دعا گو ہیں کہ جن احباب نے بھی اس علم و تحقیق کے ذخیرے کو منظر عام پر لانے کے لیے کوشش کی ہے اللہ رب العزت دنیا و آخرت میں انھیں کامیاب و کامران فرمائے۔ آمین

ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

2514800008

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: بادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

www.maktabaislamiapk.com
Facebook.com/maktabaislamia1
maktabaislamiapk@gmail.com